پرواز

طاہر جاوید مغل

پرواز

طاہر جاوید مغل

پرواز

سردیوں کا آغاز تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر زرد اور بے جان تھی۔ ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں نے صبح رات کی باسی روٹی اور لسی کا ناشتہ کیا تھا۔ دوپہر کو کچھ بھی نہیں کھا سکا تھا۔ سردیوں میں تو بھوک ویسے بھی زیادہ لگتی ہے۔ میں کیکر کے درخت سے ٹیک لگا کر کھیت کی منڈیر پر بیٹھا تھا اور میرے سامنے ایک تیز رفتار شام کے سائے تیزی سے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔

اچانک ایک دبی دبی سی آواز کانوں میں پڑی جیسے کوئی غصے سے گرجا ہو۔ پھر کسی کے چلانے کی دھیمی سی آواز سماعت سے ٹکرائی میں نے مڑ کر دیکھا۔ عقب میں دور تک کماد کے کھیت

تھے۔ یہ کافی اونچے کھیت تھے، تقریباً سات آٹھ فٹ بلند! ان کے اندر چھوٹی بڑی پگڈنڈیاں تھیں۔ آواز ان کھیتوں میں سے ہی کہیں سے ابھری تھی۔ چلانے کی آواز مردانہ تھی۔ یہ آواز دوسری مرتبہ ابھری تو میں اپنی پھٹی پرانی چپل کو گھسیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ کھیتوں کے اندر کوئی شخص مصیبت میں ہے۔ ایک تنگ پگڈنڈی پر کبھی چلتا اور کبھی بھاگتا ہوا میں موقع کی طرف بڑھا۔ اس دوران میں دبی دبی آوازیں ایک دو بار مزید سنائی دیں۔ اتفاقاً ارد گرد دور تک کوئی متنفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک جگہ مجھے فصل کے اندر تھوڑی ہلچل نظر آئی۔ یہاں پاس ہی کچے رستے پر ایک چھوٹا تانگا اور دو گھوڑے بھی کھڑے تھے۔ مجھے فصل کے اندر سے کسی شخص کی جھلک نظر آئی۔ وہ کسی دوسرے شخص پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے چند لمحے کے لئے سوچا پھر تیزی سے کھیت میں داخل ہو گیا۔ "کون ہے وائی؟" میں نے مخصوص دیہاتی انداز میں پکار کر کہا۔

اندر موجود افراد نے میری طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ یہ دو بندے تھے اور تیسرے کو زمین پر گرا کر بری طرح مار رہے تھے۔ یہ تینوں میرے لئے اجنبی تھے تاہم یہ اسی علاقے کے لگتے تھے۔ مارنے والے جواں سال اور ہٹے کٹے تھے۔ زمین پر گرا ہوا شخص بھی صحتمند تھا وہ درمیانی عمر کا تھا۔ اس کا تہ بند کھل گیا تھا اور وہ تقریباً عریاں ہو رہا تھا۔ کڑھائی دار ریشمی قمیض بھی پھٹ گئی تھی اور مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اس شخص کی ناک سے خون جاری تھا اور یہ

خون اس کی گھنی مونچھوں کو بھگو رہا تھا۔ حملہ آوروں میں سے دراز قد شخص نے زخمی کو گردن سے دبوچا اور اس کا سر زمین کی طرف جھکاتے ہوئے بولا۔ "ناک سے لکیریں نکال۔۔۔۔ اور معافی مانگ۔۔۔۔ میں کہتا ہوں نکال لکیریں۔" اس نے پورا زور لگا کر زخمی کا سر زمین سے قریب تر کیا۔

زخمی مزاحمت کر رہا تھا اور اپنی گردن حملہ آور کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش میں تھا۔

دوسرے حملہ آور نے اپنی دیسی جوتی کی بھرپور ٹھوکر زخمی کے چہرے پر رسید کی اور غلیظ گالیاں بکنے لگا۔

"کیا ہوا ہے بھراجی؟" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

غضب ناک حملہ آوروں نے ایک ساتھ مڑ کر میری طرف دیکھا پھر مجھے خاطر میں لائے بغیر دوبارہ زخمی کی خاطر تواضع میں مصروف ہو گئے۔ دراز قد دھاڑا۔ "لکیریں نکال نہیں تو تیری ماں بہن سے لکیریں نکلوا دوں گا۔"

زخمی پھر فریادی انداز میں چلایا اور ایک التجا بھری نظر مجھ پر ڈالی۔ جوتی کی ٹھوکر سے اس کا چہرہ مزید لہولہان ہو گیا تھا۔ میں نے ان کے درمیان آتے ہوئے کہا۔ "بھراجی! بہت ہو گیا ہے اس کے ساتھ۔ اب جانے دو۔۔۔۔۔ماف کر دو۔"

دراز قد شخص نے ایک نظر میری خستہ حالی پر ڈالی اور دھکا دیتے ہوئے بولا۔ "جا اپنا کام کر تو۔"

"پر بھراجی اس نے کیا کیا ہے؟"

"بدمعاشی کرتا ہے۔ اس کی تو۔۔۔۔۔" وہ پھر گالیاں دینے لگا اور زخمی کو پٹاخ پٹاخ تھپڑ رسید کرنے لگا۔

"چلو جانے دو جی۔۔۔۔۔" میں باقاعدہ دراز قد شخص اور زخمی کے درمیان آ گیا۔

دراز قد دہاڑا۔ "اوئے تجھے کہا ہے نا، تیری جرورت نہیں ہے۔ تو جیادہ ماما بننے کی کوشش نہ کر۔" اس مرتبہ دراز قد نے مجھے گردن سے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس کے منہ سے دیسی شراب کی بو آئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ اگر میں نے ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تو ہو سکتا ہے، یہ دونوں اس زخمی کی جان ہی لے لیں۔

میں نے کہا۔ "دیکھو! یہ ہمارے پنڈ کے کھیت ہیں۔ تم لوگ یہاں۔۔۔۔۔" ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ درمیانے قد کے حملہ آور نے میری گردن پر زوردار گھونسا رسید کیا۔ میں لڑکھڑا کر یک دم پیچھے گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا میٹر بھی گھوم گیا۔ بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکیں اور خون میں وہی جوش پیدا ہوا جو لڑکپن سے میرا ساتھی رہا تھا۔ میں نے پنجوں کے بل اچھل اچھل کر ایک دھواں دھار ٹکر دراز قد کے چہرے پر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دور جا گرا۔ دوسرا شخص میری طرف لپکا۔ شاید وہ مجھے اپنے "جن جھپے" میں لینا چاہتا تھا۔ میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر اس کی توند میں ٹھوکر رسید کی۔ وہ تکلیف سے دہرا ہوا تو میں نے زوردار دوہتڑ مار کر اسے اوندھا لٹا دیا۔ اسی دوران گراری دار چاقو کھلنے کی آواز کانوں میں پڑی۔ دراز قد حملہ آور نے اپنے تہ بند کی ڈب میں سے چاقو نکال لیا تھا۔ اس کا چہرہ شراب اور غصے کی حدت سے تمتما رہا تھا۔ میری ٹکر نے اس کے دونوں ہونٹ پھاڑ دیے تھے۔ دراز قد فوری طور پر مجھ پر حملہ آور نہیں ہوا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں چاقو دیکھ کر ہی بھاگ جاؤں گا لیکن جب میں تنا کھڑا رہا اور نہ صرف کھڑا رہا بلکہ زمین پر پڑی ہوئی ایک لاٹھی بھی اٹھالی تو دراز قد کا طیش سوا ہو گیا۔ اس نے مجھے گالی دی اور سچ مچ چاقو استعمال کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ تاہم اسی دوران تین چار افراد بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ یہ ہمارے ہی پنڈ

کے لوگ تھے۔انہوں نے مخصوص دیہاتی انداز میں "اوئے۔۔۔۔۔اوئے" کی آوازیں نکالیں۔ان میں سے ایک دو کے ہاتھوں میں لاٹھیاں بھی تھیں انہیں دیکھ کر چاقو برادر ٹھٹک گیا۔یہ لوگ دلیر ہو کر میرے اور چاقو برادر کے درمیان آ گئے۔

چاقو برادر مسلسل گالیاں دے رہا تھا۔اس کا ساتھی بھی اچھل اچھل کر جوش دکھا رہا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی اب حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں افراد گالیاں بکتے اور دھمکیاں دیتے ہوئے کچے رستے کی طرف گئے اور اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔میں نے دو افراد کے ساتھ مل کر زخمی کو زمین سے اٹھایا اس کا تہ بند کس کے باندھا اور کپڑے جھاڑے۔اس کے ایک پاؤں پر سخت چوٹ آئی تھی اور یہ وزن نہیں سہار رہا تھا۔ایک آنکھ بھی نیلی ہو رہی تھی۔ہم اسے سہارا دیتے ہوئے کھیتوں سے باہر لائے۔کھیت مزدور،اللہ رکھے نے اپنی لوئی صاف جگہ پر بچھا دی اور "زخمی" ٹاہلی کے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔اس نے اپنی زخمی ٹانگ لمبی کر رکھی تھی۔ماشکی نور محمد کا پتر شریف بھاگ کر گیا اور امین جٹ کے ڈیرے سے تھوڑی سی سواہ (راکھ) لے آیا۔میں نے یہ سواہ استعمال کر کے زخمی کے دو تین زخموں کا خون بند کیا اور دو جگہ پٹی بھی باندھ دی۔

شریف سواہ کے ساتھ نیم گرم دودھ میں تھوڑا سا دیسی گھی بھی ملا کر لایا تھا۔زخمی نے دودھ کا یہ ایک فٹ لمبا گلاس ایک ہی سانس میں ڈکار لیا اور قدرے اطمینان محسوس کیا۔

ہمارے پنڈ کے ماسٹر عطا صاحب بھی ان دو چار تماشائیوں میں موجود تھے۔وہ مجھے ایک طرف لے گئے اور بولے۔"خاورے! پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کی عادت تجھے ایک دن لے بیٹھے گی۔سانڈوں کی لڑائی میں تیرے میرے جیسے ڈڈوبے موتے ہی مارے جاتے ہیں۔پتا نہیں یہ لوگ کون تھے اور اب کیا کریں گے؟"

"پر ماسٹر صاحب! آپ ہی تو کتابوں میں پڑھاتے ہیں کہ مصیبت میں کسی کی مدد کرنا سب سے بڑی عبادت ہے۔۔۔۔۔اور جس نے ایک انسان کی جان بچائی اس نے سمجھو لاکھوں کروڑوں انسانوں کی جان بچائی۔"

"اوئے نامعقولا! غیروں کی جان بچانے سے اپنوں کی جان بچانا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔پہلے اپنی بیمار ماں کی جان بچا لے۔اور اپنی بہن کی جان بچا لے جس کے پنڈے پر کپڑا ہے اور نہ پیٹ میں دانہ ہے۔۔۔۔۔اور اپنی طرف بھی دیکھ لے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر صاحب! جس طرح امیری کی شان ہوتی ہے اسی طرح غریبی کی بھی ایک شان ہوتی ہے اور پھر وہ غریبی جو ایمان داری کی وجہ سے ہو، اس کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔"

"تو بس ٹھیک ہے۔ اس غریبی کو بغل میں لے کر ناچتا رہ۔ کسی دن کسی چودھری وڈیرے کی داڑھ کے نیچے آئے گا نا تو عقل ٹھکانے آئے گی۔" ماسٹر عطا نے جل بھن کر کہا اور اپنی کھٹارا سائیکل پر سوار ہو کر نکل گئے۔ وہ اس مار پیٹ والے معاملے میں ملوث ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

زخمی نے اپنا نام رونق علی بتایا۔ وہ چودہ پندرہ میل دور راجوال گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس نے ہمیں یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ راجوال کے جاگیر دار ارباب کا رشتے دار ہے۔ اس کے کوائف سن کر مجھ سمیت سارے رعب میں آ گئے۔ راجوال گاؤں علاقے میں مشہور تھا۔ یہاں کے چودھری صاحب کو جاگیر دار جی کہا جاتا تھا۔ اور ان کی زمین کو پتا نہیں کیوں جاگیر کا نام دیا جاتا تھا۔ یہ نہری زمین تھی اور اس میں دو تین گاؤں آتے تھے۔۔۔۔۔ جس کسی نے راجوال کو جانا ہوتا تھا کہتا تھا کہ میں جاگیر کو جا رہا ہوں۔ بس یہ نام نسل در نسل زبان پر چڑھا ہوا

تھا۔۔۔۔۔ حالانکہ سنا یہی گیا تھا کہ جاگیر دار ارباب عام سا چودھری ہے۔۔۔۔۔ ارد گرد کے علاقے میں اس کے ہم پلہ چودھری اور زمیندار موجود تھے مگر انہیں جاگیر دار کوئی نہیں کہتا تھا۔

رونق علی اپنی بول چال اور لباس وغیرہ سے بھی خوش حال شخص نظر آتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ دونوں بندے جو اس سے لڑے ہیں۔ ایک قریبی موضع شادپور کے رہائشی ہیں اور ان سے کوئی پرانا جھگڑا چل رہا ہے۔ رونق علی نے بتایا۔ "میں ایک واقف کار سے یہ دیسی تانگا خرید کر لایا ہوں۔ یہاں سے گزر رہا تھا کہ ان دونوں کتوں سے ملاقات ہو گئی۔ یہ گھوڑوں پر سوار میرے سامنے سے گزرے۔ میں نے کچھ نہیں کہا پر یہ گھوم کر واپس آ گئے۔ کہنے لگے تم نے ہمیں گھور کر کیوں دیکھا ہے۔ بس اسی گل پر لڑائی شڑائی شروع ہو گئی۔"

رونق علی مجھ سے بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ میں پچیس چھبیس سال کا تھا اور وہ مجھ سے عمر میں تین چار سال بڑا ہی ہو گا۔ وہ اپنے موٹے ہاتھ سے بار بار میری پیٹھ تھپک رہا تھا۔ پوچھنے لگا۔ "نام شام کیا ہے تمہارا؟"

"شاہ خاور۔ ساتھ والے گاؤں مراد پور کا رہنے والا ہوں۔"

"تونے جی داری دکھائی ہے بھئی۔۔۔۔ تو نہ ہوتا تو ان کتوں نے مجھے ٹھیک ٹھاک چھٹل کر دینا تھا۔ تجھے انعام شام ملنا چاہیے۔"

وہ انعام کے ساتھ شام لگا رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے لڑائی کے ساتھ شڑائی کہا تھا۔ شاید لفظ کو اس طرح دہرانا اس کی عادت تھی۔

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "چودھری جی! آپ کی مدد کرنا میرا فرض تھا۔ مجھ انعام کی تمنا نہیں لیکن اگر آپ۔" میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"ہاں بولو۔" رونق علی نے میری حوصلہ افزائی کی۔

"اگر آپ مجھے کوئی چھوٹی موٹی نوکری دے سکیں۔ تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

رونق علی نے مجھے سرتاپا دیکھا۔ نظروں نظروں میں جیسے میرے ورزشی جسم کو ٹٹولا۔ رگ پٹھوں کا جائزہ لیا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "کیا کر سکتے ہو تم؟"

"جو آپ کہیں گے جی۔ تھوڑا پڑھا لکھا بھی ہوں مگر محنت مزدوری بھی کر لوں گا۔۔۔۔ بلکہ ہر طرح کی محنت مزدوری کر لوں گا۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"کتنا پڑھے ہو؟"

"میں نے ایف اے کیا ہے جی۔" میں نے جان بوجھ کر اپنی تعلیم کم بتائی۔۔۔۔ کیونکہ اگر میں بتاتا کہ گریجویٹ ہوں تو وہ مجھے محنت مزدوری والے خانے سے نکال دیتا اور مجھے فی الوقت نوکری کی اشد ضرورت تھی۔۔۔۔ چاہے کیسی بھی ہو۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "اس کے لئے تو تمہیں راجوال آنا پڑے گا۔ وہیں پر کچھ کیا جا سکتا ہے۔" پھر ذرا توقف سے ہنسنے لگا۔ "بلکہ ایسا کرو کہ تم میرے ساتھ ہی چلو۔ اب مجھ سے تانگا چلانا مشکل ہو جائے گا۔ تم مجھے راجوال چھوڑ آؤ۔ وہاں والی صاحب سے تمہاری بات شات بھی کرا دیتے ہیں۔" یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ راجوال میں جاگیردار ارباب کو والی صاحب بھی کہا جاتا ہے۔

کچھ ہی دیر میں سب کچھ طے ہو گیا۔ میں رونق علی کو سہارا دے کر دیسی تانگے تک لایا اور اسے سوار کرا دیا۔ اس کے بعد میں خود بھی بیٹھ گیا۔ تانگے کا گھوڑا ہانکنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کم از کم میرے لیے تو مشکل نہیں تھا۔ اب تک کی زندگی ایسے ہی کاموں میں گزری تھی۔

دیسی تانگے میں بیٹھنے کی جگہ بہت مختصر ہوتی ہے مگر یہ عام تانگوں سے بہت سبک رو ہوتا ہے۔ اس میں سپرنگ وغیرہ لگے ہوتے ہیں۔ گھوڑا بھی عام تانگوں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور اور تیز ہوتا ہے۔ راستے میں میرے اور رونق علی کے درمیان گفتگو جاری رہی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ رونق علی ایک خوش مزاج اور خوش خوراک شخص ہے۔ طبیعت میں تھوڑی سی رنگینی اور شیخی خوری ہے۔۔۔۔ ہم دشوار گزار راستے پر سفر کرتے ہوئے قریباً ڈھائی گھنٹے میں راجوال کے نواح میں پہنچ سکے۔ یہ ضلع سیالکوٹ کا بالکل اندرونی علاقہ تھا۔ رستے کچے تھے۔ ابھی یہاں کے بہت سے دیہات میں بجلی نہیں پہنچی تھی۔ راجوال بھی بجلی سے محروم تھا۔

ہم تقریباً آٹھ بجے گاؤں پہنچے۔ گاؤں کافی بڑا تھا اور جاگیردار کی دو منزلہ حویلی دور ہی سے نظر آجاتی تھی۔ تاہم باقی گاؤں کی طرح یہ حویلی بھی نیم تاریک تھی۔ نچلی منزل پر ہی دو چار جگہ لالٹینوں کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ رکھوالی کے کتے شور مچا رہے تھے اور حویلی کے پھاٹک پر دو تین خوش رنگ تانگے کھڑے تھے۔ تانگوں کے گھوڑے سردی میں سکڑے سمٹے نظر آتے تھے۔ ہم پھاٹک سے گزر کر حویلی کے وسیع احاطے میں پہنچ گئے۔

رونق علی کی آنکھ بالکل سوج گئی تھی۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کو گرم چادر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ رونق علی کو زخمی دیکھ کر ایک دم کئی افراد ہمارے گرد جمع ہوگئے۔ یہ زیادہ تر حویلی کے ملازم پیشہ ہی تھے۔ دو مسلح پہرے داروں نے رونق کو سہارا دے کر تانگے سے اتارا اور اندر لے گئے۔ کچھ دیر بعد مجھے بھی اندر بلا لیا گیا۔ دیہات میں سردیوں کی رات سات آٹھ بجے ہی شروع ہو جاتی ہے حویلی بھی سوئی سوئی محسوس ہو رہی تھی لیکن ہمارے پہنچتے ہی ہلچل کے آثار نظر آنے لگے۔ رونق علی کو کسی اندرونی کمرے میں لے جایا جا چکا تھا۔ ایک پہرے دار کی زبانی معلوم ہوا کہ والی صاحب بھی جاگ گئے ہیں اور رونق کی خیر خیریت دریافت کر رہے ہیں۔ میرے گرد اکٹھے ہو جانے والے افراد نے مجھ سے بھی سوال جواب شروع کر دیے۔ میں نے انہیں مختصراً ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

کچھ دیر بعد میں نے جاگیردار ارباب کو دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے صرف ایک مرتبہ دور سے ان کی ایک مختصر جھلک دیکھی تھی۔ یہ تین چار سال پہلے کی بات ہے۔ وہ اپنے محافظوں کے ساتھ ایک جیپ پر سوار سالانہ میلے کی گہما گہمی دیکھتے ہوئے گزرے تھے۔ آج میں انہیں قریب سے دیکھ رہا تھا۔ ان کی عمر 60 سال کے لگ

بھگ تھی۔ چہرے سے تھکن ظاہر ہوتی تھی۔ کلین شیو چہرہ اور سر پر لگا ہوا خضاب بھی ان کے عمر کو گھٹا کر دکھانے میں ناکام تھا۔ وہ سفید تہ بند اور بوسکی کی قمیص پہنے ہوئے تھے۔ کسی زمانے میں وہ یقیناً خوش شکل رہے ہوں گے لیکن اب اس خوش شکلی کے مٹے مٹے آثار چہرے پر ایک دو جگہ ہی دکھائی دیتے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی کمرے میں موجود سارے افراد کھڑے ہو گئے۔ میں نے بھی تقلید کی۔

"تمہارا نام ہی شاہ خاور ہے؟" والی صاحب نے جیسے رسماً پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولے۔ "رونق علی نے تمہاری جی داری کی تعریف کی ہے۔ تمہیں کوئی چوٹ شوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں جی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اگر ان دونوں بندوں کے خلاف گواہی دینی پڑی تو دے لو گے؟"

"آپ کا حکم ہو گا تو کیوں نہیں دوں گا جی۔" میں نے اطاعت مندی سے کہا۔

انہوں نے مجھے سرتاپا دیکھا پھر بولے۔ "ٹھیک ہے۔ آرام کرو۔ صبح بات کریں گے۔"

اگلے روز دوپہر کے وقت ایک ملازم مجھے مردانے سے زنان خانے میں لے گیا۔ یہاں ایک سجے سجائے کمرے میں رونق علی ایک رنگین پلنگ پر ٹانگیں پسارے لیٹا تھا۔ اس کے سرہانے کی طرف کھانے پینے کی کئی اشیار کھی تھیں۔۔۔۔۔ جن میں برفی، باداموں والا گڑ، گاجر کا مربا اور پھل فروٹ تھے۔

رونق نے مجھے اپنے سامنے موڑھے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے والی صاحب سے گل شل کی ہے۔ وہ مان گئے ہیں۔ اب تم حویلی کے ملازم ہو۔ تنخواہ بھی مناسب ہی ہو گی۔ فصل آئے گی تو دانے شانے بھی ملیں گے۔ تم نے پنڈ جانا ہے تو ہو آؤ۔ گھر والوں کو بتاؤ آؤ اور اگر اپنا بستر اشستر الانا ہے تو وہ بھی لے آؤ۔"

میں نے کہا۔ "پر مجھے کام کیا کرنا ہو گا؟"

"اوئے، کام شام کی تجھے کیا فکر ہے۔ یہ فکر تو ہمیں کرنی چاہیے۔ کوئی اچھا سا کام بھی تجھے بتا دیں گے۔" پھر اس نے ذرا توقف کر کے کہا۔ "اگر فوری طور پر کوئی کام کرنا ہے تو پھر الماری کے اوپر سے یہ شیشہ پکڑ کر دینا مجھے۔"

لکڑی کی منقش الماری کے اوپر ایک گول آئینہ رکھا تھا۔ میں نے اٹھا کر رونق علی کو دیا۔ اس نے اپنا چہرہ دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ "ایک آنکھ تو بالکل بند ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ دو چار دن تک تو باہر بھی نہیں نکل سکتا۔ عورتیں سمجھیں گی، رونق علی آنکھ مار رہا ہے۔" اپنی بات پر وہ خود ہی ہنس دیا۔ اس کے مزاج میں کافی بے تکلفی تھی۔

میں اسی روز گھر واپس آگیا۔ والدہ میرے لیے پریشان تھیں۔ کچھ یہی حال چھوٹی بہن عارفہ کا بھی تھا۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی اور تھا۔ وہ کچھ سال پہلے دبئی گیا تھا بعد میں بیوی کو بھی وہیں لے گیا۔ اب وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ کبھی کبھار اس کی خیر خبر تو آجاتی تھی لیکن وہ خود نہیں آتا تھا۔ اور نہ اس نے آنا تھا۔ اب میں ہی ماں اور چھوٹی بہن کا واحد کفیل تھا۔ کچھ عرصہ پہلے میں روزگار کے لیے لاہور بھی گیا تھا مگر لاہور مجھے راس آیا اور نہ میں لاہور کو۔ ایک دو جگہ چھوٹی موٹی نوکری بھی ملی۔ آخری نوکری ایک آٹے کی مل میں وین ڈرائیور کی تھی۔ اس معمولی سی ڈھائی ہزار روپے والی نوکری میں بھی ایک تنازعہ کھڑا ہو گیا اور تین چار مہینے پہلے میں بالکل بددل ہو کر اپنے پنڈ واپس آگیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ شہر مجھے راس آیا تھا اور نہ ہی وہاں میرا دل لگا تھا۔ ایک عجیب سی گھٹن اور بے گانگی تھی جس نے تمام عرصہ مجھے جکڑے

رکھا۔ پنڈ کی ٹھنڈی صاف ہواؤں اور کھیتوں کھلیانوں میں واپس آکر مجھے ایسے ہی لگا جیسے مچھلی واپس پانی میں آگئی ہو۔ بے روزگاری تو یہاں بھی تھی مگر یہاں وہ دھواں، وہ شور اور وہ بے گانہ پن نہیں تھا جس میں میری سانس بند ہونے لگتی تھی۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اپنی بے روزگاری کی کچھ اتنی زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔ ایک سال کا اناج میرے گھر میں موجود تھا اور گاؤں میں جس کے گھر ایک سال کے دانے ہوں، وہ سمجھو بادشاہ ہوتا ہے۔ رہی نوکری کی بات تو وہ مجھے کسی بھی جگہ کسی بھی وقت مل سکتی تھی۔ بس اچھی نوکری کے ساتھ میرا آمنا سامنا ہونے کی دیر تھی۔ میں جانتا تھا کہ میرے اندر بہت صلاحیت تھی اور یہ صلاحیت مجھے بہت اوپر تک لے جاسکتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں۔۔۔۔۔ مجھے اپنے بازوؤں پر پورا بھروسا تھا۔ شاید فاقہ مستی یعنی فاقے میں مستی کا محاورہ میرے ہی جیسے لوگوں کے لئے بنا ہے۔

ماں میرے جانے پر افسردہ ہو گئی۔ مقامی رواج کے مطابق میں ماں کو بے بے ہی کہتا تھا اور اس لفظ میں اتنا مزہ آتا تھا کہ امی، اماں اور ماں جیسے پیارے لفظ بھی اس کے سامنے ہیچ محسوس

ہوتے تھے۔ میں نے کہا۔ "بے بے جی! پریشان ہونے کی لوڑ نہیں۔ میں ہر دسویں پندرہویں روز چکر لگا لیا کروں گا۔ آخر لاہور سے بھی تو آجاتا تھا۔ یہ تو کوئی پینڈا ہی نہیں۔"

"پر پتا تو چلے بھائی جان! تمہیں وہاں کام کیا کرنا ہے؟"

"کام کوئی خاص نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جاگیردار کی ایک بیٹی ہے۔ بڑی پیاری سی۔ عمر یہی کوئی بیس بائیس سال ہوگی۔ بس مجھے اس کے ساتھ رہنا ہے دن رات۔۔۔۔ اس کا پہرے دار بن کر!"

"ہائے ربا!" عارفہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ کیا گل ہوئی۔ دن کو بھی اور رات کو بھی۔"

"ہاں بھئی، رات کو اس کے کمرے میں اس کے پاس منجی ڈال کر سوؤں گا۔ رات کو تو پہرے داری کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے نا۔" میں نے بے پر کی اڑائی۔

"نہیں نہیں۔ یہ کام ٹھیک نہیں۔" بے بے نے کہا۔ "کوئی نیا سیاپا نہ پڑ جائے۔ جوان کڑی اور جوان منڈا اکٹھے ہوں گے تو کچھ نہ کچھ ضرور ہو جاتا ہے۔ اور یہ وڈیرے جاگیردار ایسے معاملوں میں بندے کی جان تک نکال دیتے ہیں۔۔۔۔ نہ نہ۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تو پھر کیا کروں۔ اب بھی نوکری نہ کی تو دو چار مہینے میں دانے ختم۔۔۔۔ اور نوبت فاقوں تک آجائے گی۔" میں نے کہا اور چہرے پر گہرا غم طاری کر لیا۔

"نہیں خاورے! اس کا کوئی حل نکال ان سے کہہ کہ کوئی اور کام دیں۔ یہ پہرے داری والا کام تو ویسے بھی خطرے والا ہے۔" بے بے جی پریشان تھیں۔ ان کی کمزور انگلیاں میرے بالوں کو بار بار میری پیشانی پر سے ہٹا رہی تھیں۔

میں نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔ "تو ٹھیک ہے بے بے جی! ایسا کرتا ہوں، نوکری شروع ہوتے ہی اس کڑی کو بہن کہہ دیتا ہوں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ایک پلی پلائی خوبصورت اور امیر کبیر بہن بھی مل جائے گی۔"

اس مرتبہ عارفہ کے پریشان ہونے کی باری تھی۔ اس نے میرے بال مٹھی میں جکڑے۔ "خبردار بھائی! اگر میرے علاوہ کسی اور کو بہن بنایا تو۔۔۔۔ میں اس کی گت (چٹیا) کاٹ دوں گی۔ تم میرے اکیلے بھائی ہو۔۔۔۔ اور میں تمہاری اکیلی بہن ہوں۔"

"خدا سے خیر مانگ کملی ہو گئی ہے۔" بے بے جی نے اسے ڈانٹا۔ "اللہ سوہنا سلامت رکھے تیرے دوجے بھرا کو۔ دور ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو تیرا اپنا ہی خون۔"

"کوئی نہیں ہے اپنا خون۔ ہوتا تو اس طرح دور رہتا۔" عارفہ نے مجھ سے چمٹتے ہوئے کہا پھر کسی ننھی بچی کی طرح اپنا سر میری گود میں گھسا دیا۔

اگلے روز میں والی جی کی حویلی میں واپس پہنچ گیا۔ دو چار روز میں مجھے حویلی کو، راجوال کو اور راجوال کے رہن سہن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں وہ سب کچھ تھا جو پنجاب کے دور دراز دیہات کا خاصا ہوتا ہے۔ خاص طور سے ایسے دیہات میں جہاں کوئی زور آور وڈیرا یا چودھری رہائش پذیر ہوتا ہے۔ گھوڑوں کے اصطبل، اصیل نسل کے مویشی، شکاری کتے، شکاری باز، مسلح پہرے داروں کے جتھے، سبھی کچھ یہاں موجود تھا۔ والی جی کی کوئی بیٹی نہیں تھی، صرف تین بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا کوئی چودہ پندرہ سال پہلے ایک جھگڑے میں قتل ہو گیا تھا۔ چھوٹا بیٹا ایک قریبی قصبے میں چاول کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ تیسرا بیٹا جس کی عمر بہ مشکل سات آٹھ سال تھی، حویلی میں ہی رہتا تھا۔ یہ بیٹا والی صاحب کی دوسری بیوی سے تھا۔ والی صاحب کی پچاس پچپن سالہ پہلی بیوی تنہائی پسند عورت تھی اور جاگیر ہی کے ایک دوسرے گاؤں میں رہتی تھی۔ اسے بڑی بیگم جی کہا جاتا تھا۔ اس کی دیکھ بھال اس کا چھوٹا بیٹا ہی کرتا تھا۔ یہ چھوٹا بیٹا بھی خوشحال تھا۔ چاول کے کاروبار میں اس نے کافی روپیا کمایا تھا۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اتنے بڑے گاؤں میں ایک بھی اسکول نہیں۔۔۔۔۔اور صرف اس گاؤں کی ہی بات نہیں تھی، ارد گرد کے پورے علاقے میں نہ کوئی سڑک تھی، نہ شفاخانہ اور نہ اسکول۔ والی جی کی جاگیر میں بھی صرف ایک پرائمری اسکول تھا اور یہ اسکول بھی راجوال کے بجائے ایک دوسرے گاؤں نکووال میں تھا۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ وڈیرے اور چودھری اچھے ہوں یا برے، ان کے دل میں یہ خواہش ضرور چھپی رہتی ہے کہ سڑک اور سڑک پر چلتی ہوئی نئی روشنی اور تعلیم ان کے علاقوں میں نہ پہنچے۔

حویلی کے احاطے سے باہر مرد ملازموں کے رہنے کے لئے ایک قطار میں کمرے بنائے گئے تھے۔ نیچی چھتوں والے ان کمروں کے فرش کچے تھے۔ دیواریں بھی گارے اور مٹی کی تھیں۔ انہیں بھوسہ ملی ہوئی چکنی مٹی سے پوتا جاتا تھا۔ ہر کمرے کا ایک ہی دروازہ تھا جو پختہ لکڑی سے بنا ہوا تھا اور بس ایک ہی کھڑکی تھی۔ ہمارے علاقے کے پچانوے فیصد گھروں کے کمروں کا نقشہ یہی تھا۔ منشی جی نے مجھے بھی ایک کمرا الاٹ کر دیا۔ چند دن تک تو میں بالکل فارغ رہا پھر مجھے ایک ڈیوٹی سونپ دی گئی۔ یہ ڈیوٹی میرے شایانِ شان ہرگز نہیں تھی لیکن میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ جیسا بھی کام مجھے یہاں ملے گا، کروں گا اور دل و جان سے

کروں گا۔ منشی منظور مجھے مویشی خانے میں لے گیا۔اس نے مجھے نیلی بار کی چھ عدد بھینسیں دکھائیں۔مجھے بتایا گیا کہ صبح اور شام ان بھینسوں کا دودھ دھونا اور حویلی میں پہنچانا میرا کام ہے۔یہ خاصی تگڑی بھینسیں تھیں۔ایک بھینس دو وقت میں اوسطاً پندرہ کلو دودھ دیتی تھی۔مددگار کے طور پر ایک مسلی لڑکا میرے ساتھ کر دیا گیا تھا۔

صبح اور شام کے وقت ہم دودھ دھوتے اور پتیل کی صاف ستھری بالٹیوں میں بھر کر زنان خانے کے دروازے تک پہنچا آتے۔اس کام کے دوران میں تین چار مرتبہ والی صاحب سے بھی آمنا سامنا ہوا۔ان کی شخصیت میں رعب تھا لیکن وہ ہمیشہ تھکے تھکے اور بیمار نظر آئے۔ والی صاحب کے ساتھ ایک دو بار ایک خوبرو عورت بھی نظر آئی۔تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا۔بلکہ اسے لڑکی کہنا ہی زیادہ مناسب تھا۔اس کی عمر پچیس برس کے لگ بھگ تھی تاہم وہ کم عمر دکھائی دیتی تھی۔وہ ہمیشہ قیمتی لباس میں ہوتی۔کام دار اوڑھنی اس کے سر اور سینے کو ڈھانپے رکھتی تھی۔شروع میں میں نے سمجھا کہ وہ والی صاحب کی بھتیجی یا بھانجی وغیرہ ہے۔لیکن پھر ایک دن شکاری کتوں اور بازوں کے رکھوالے

عسکری نے مجھے بتایا۔"اوئے کھوتیا! کہیں والی صاحب کے سامنے کوئی الٹی سیدھی بات نہ کہہ دینا۔یہ والی صاحب کی دوسری گھر والی ہیں۔ان کو ہی بیگم جی کہا جاتا ہے۔"

میں سٹپٹا گیا۔"یہ ہیں بیگم جی؟"

"کیوں۔۔۔۔۔یہ کیوں نہیں ہو سکتیں بیگم جی؟"

"مم۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے عسکری چاچا! والی صاحب کے سامنے تو وہ بالکل چھوٹی سی۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے، کچھ زیادہ فرق نہیں ہے ان کی عمروں کا؟"

"اوئے، باندرا! تو نے یہاں نوکری کرنی ہے یا سرپنچ بن کر عمروں کا حساب کتاب نکالنا ہے۔ اوئے۔۔۔۔۔اوئے عقل کو ہتھ مار۔۔۔۔۔ورنہ مرغا بنا دیں گے اور تیرے اوپر بٹھا دیں گے پنڈ کے سب سے موٹے بندے کو۔۔۔۔۔اور دوسری بات یہ ہے کہ تو نے مجھے چاچا کس حساب میں کہا ہے۔کیا میں تجھے ستر بچھتر سال کا نظر آتا ہوں؟ تیرے جیسے لڑکوں سے زیادہ ساہ ست ہے میرے اندر۔نہیں تو آزما کر دیکھ لے۔"

میں نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔"نہیں۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔غلطی ہو گئی چاچا۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے بھا جی، کہاں آپ اور کہاں میں۔"

"اگر یہاں رہنا ہے بچہ جی تو منہ سنبھال کر بات کرنا ہوگی۔۔۔۔اور ہاں، یہ نظر بھی نیچی رکھنی ہوگی۔"

میں نے اطاعت مندی سے سر ہلایا اور اپنے صافے سے عسکری کے کندھے پر لگی ہوئی گرد جھاڑی۔اسی دوران زنان خانے کی طرف سے ایک موٹی بھدی عورت تیزی سے نمودار ہوئی۔اس کا نام فیروزاں تھا۔حویلی میں یہ ہیڈ ملازمہ کی حیثیت رکھتی تھی۔اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔اس نے پریشان لہجے میں کہا۔"منشی صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو نہیں آیا آج۔کل والی صاحب سے چھٹی لے کر گیا تھا۔"عسکری نے کہا۔

"ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟ شوکت کا بھی پتا نہیں کہاں دفعہ ہو گیا ہے۔ بیگم جی پریشان ہیں۔"

"کیا کوئی تار آیا ہے؟"عسکری نے فیروزاں کے ہاتھ میں کاغذ دیکھ کر پوچھا۔

"آہو۔ڈاک والا ڈیرے پر دے کر چلا گیا تھا۔وہاں سے ماشکی بشیر لایا ہے۔اللہ خیر کرے۔بیگم جی کی وڈی بھین کی طبیعت بھی خراب تھی۔۔۔۔اب کیا کروں۔۔۔۔کس سے پڑھواؤں۔"

ایک ملازم نے کہا۔"پٹواری جی کا چھوٹا پتر نذیراں شاید دو چار لفظ پڑھ لے۔۔۔۔مگر اس نے آج تاریخ پر جانا تھا۔پتا نہیں گھر پر ہوگا یا نہیں۔"

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا، زنان خانے کے بڑے دروازے کے پیچھے بیگم جی خود موجود تھیں۔اپنی ریشمی اوڑھنی کی اوٹ میں وہ واقعی پریشان نظر آرہی تھیں۔اسی دوران میں مجھے رونق علی کی شکل نظر آئی۔وہ ریشمی لاچہ کرتے میں تھا اور ذرا لنگڑاتا ہوا آرہا تھا۔اس نے دور ہی سے ہانک لگائی۔"او خاورے! تو بھی تو تھوڑا بہت پڑھ شڑھ لیتا ہے۔پڑھ لیتا ہے کہ ایسے ہی اڑائی تھی۔"

میں چند لمحے تذبذب میں رہا پھر فیروزاں کے ہاتھ سے تار لے لیا۔تار کا مضمون میرے لئے بالکل آسان تھا لیکن میں نے "ایف اے" کا بھرم رکھنے کے لئے، کچھ دیر اس پر غور کیا اور پھر اٹک اٹک کر پڑھا۔تار کا ترجمہ یہ تھا۔"تمہاری بڑی بہن بالکل خیریت سے ہے۔ہم ڈسکے کے اسپتال میں ہیں۔اللہ نے ایک چاند سا بیٹا دیا ہے۔ملک رب نواز۔"

جونہی میں نے تار پڑھا۔بیگم جی جذباتی ہو کر دروازے کی اوٹ سے نکل آئیں۔انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے تار میرے ہاتھ سے پکڑ لیا۔اسے آنکھیں کھول کر دیکھا اور بے ساختہ

ہونٹوں سے لگایا۔اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں۔"تم نے بڑی چنگی خبر پہنچائی ہے۔تمہارے منہ میں گھی شکر۔"اس کے بعد وہ فیروزاں سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"جانیں فیروزاں! پیالی میں شکر لا۔"

فیروزاں بھاری کولہے مٹکاتی تیزی سے اندر لپک گئی۔بیگم جی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ان کی ناک میں چمکتا ہوا کوکا مجھے ہمیشہ سے زیادہ چمک دار محسوس ہوا لیکن پھر فوراً مجھے عسکری کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔اگر یہاں رہنا ہے تو نظر نیچی رکھنی ہو گی۔میں نے فوراً نظر جھکا لی۔

بیگم جی نے ایک بار پھر بڑے اشتیاق سے تار سنا۔یہ تار بیگم جی کے بہنوئی، یعنی ملک رب نواز کی طرف سے تھا۔معلوم ہوا کہ ملک نواز کے گھر یہ نرینہ اولاد بڑی منتوں مرادوں سے بارہ سال کے بعد ہوئی ہے۔

فیروزاں ایک شیشے کی منقش پیالی میں گھی شکر لے آئی۔بیگم جی اتنی خوش تھیں کہ انہوں نے چمچ اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں ڈالنا چاہا لیکن پھر ایک دم وہ ٹھٹک گئیں۔انہوں نے پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔"لو، منہ میٹھا کر لو۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں نے منہ میٹھا کیا۔پھر باقی ملازموں نے کیا۔بیگم جی نے رونق علی سے کہا۔"ماما! یہ تو اچھا بھلا پڑھ لیتا ہے، تم نے اسے دودھ دھونے پر کیوں لگایا ہوا ہے؟"

"تو کیا کروں؟"

"اسے کوئی اچھا کام دو۔۔۔۔۔اور نہیں تو منشی کے ساتھ لگا دو۔سیپ (مزدوری) کا حساب کتاب رکھنے کے لئے۔"

"ٹھیک ہے بلقیس۔"رونق نے سر جھکا کر کہا۔

اگلے روز مجھے منشی منظور کے ساتھ لگا دیا گیا۔ایک ہفتے کے اندر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ منشی منظور کا حساب بڑا ڈھیلا ڈھالا ہے۔میں نے سیپ کے کھاتوں میں کئی غلطیاں دیکھیں لیکن منشی کی دل شکنی کے خیال سے ان کا ذکر نہیں کیا۔ایک دن میں نے حویلی کے باغیچے میں بیگم جی کے ساتھ سات آٹھ سال کا ایک خوش شکل لڑکا دیکھا۔بیگم جی کی عمر کے لحاظ سے وہ ان کا چھوٹا بھائی لگتا تھا مگر عسکری پہلوان نے یہ بتا کر مجھے پھر حیران کر دیا کہ یہ بیگم جی کا اکلوتا بیٹا ہے۔بچے کے ہاتھ میں پکی لکڑی کا ایک بھدا سا بلا تھا اور وہ اس پر ربڑ کی گیند اچھال رہا تھا۔وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔میں بھی مسکرا دیا۔

قارئین! میں اپنی اس کہانی میں آپ کو جو کچھ بتاؤں گا سچ بتاؤں گا۔اپنے دل کی ہر واردات سے آپ کو پوری طرح آگاہ کروں گا۔ ممکن ہے کہ میری باتیں کچھ عجیب لگیں، کچھ بے ڈھنگی محسوس ہوں اور کچھ میں آپ کو شدید جذباتی پن نظر آئے لیکن جو کچھ بھی ہوگا۔۔۔۔ہوگا بالکل سچ۔اب اس سچ کو آپ کیا نام دیتے ہیں یہ آپ کی صوابدید پر ہے۔

میں نے کہیں سنا تھا کہ جوان عورت اور مرد کے درمیان اَن دیکھا مقناطیس ہوتا ہے۔جب وہ ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں تو یہ مقناطیس انہیں کھینچتا ہے۔کہیں کم کہیں زیادہ، کبھی تھوڑا کبھی بہت، لیکن وہ اپنا اثر دکھاتا ضرور ہے۔میں آپ سے بیگم جی کی بات کرنے لگا ہوں اور اس لمحے کی بات کرنے لگا ہوں جب وہ گھی شکر والا چمچ لیے میرے بالکل سامنے کھڑی تھیں۔ایک لحظے کے لئے یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ اپنا ہاتھ میرے منہ کی طرف بڑھانے لگیں ہیں۔۔۔۔وہ بڑی جذباتی کیفیت میں تھیں۔ان کے رخسار سرخ ہو رہے تھے۔ریشمی اوڑھنی شہد رنگ بالوں سے ڈھلک گئی تھی اور ان کی شفاف بلوری گردن گریبان تک نظر آ رہی تھی۔ پچھلے کئی دن سے ایسا ہو رہا ہے کہ میں رات کو اپنے کوارٹر نما کمرے میں سونے کے لئے آنکھیں بند کرتا تو وہ منظر میری نگاہوں کے سامنے کسی تصویر کی

طرح کھل جاتا۔میرا دل اس منظر کی طرف اور اس منظر میں نظر آنے والی کی طرف کھنچتا چلا جاتا۔یہ کوئی رومانی یا سفلی قسم کے احساسات نہیں تھے۔۔۔۔۔بس ایک خوشبودار سی کیفیت تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔اس سے پہلے بھی گاؤں میں اور گاؤں سے باہر میں نے بہت سی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھا تھا۔ان میں سے کئی بڑی بھلی صورت والی بھی تھیں لیکن جو کیفیت مجھے بیگم جی کو دیکھ کر محسوس ہوئی، ایسی کبھی نہیں ہوئی تھی۔شاید پیار کا آغاز اسی طرح ہوا کرتا ہے۔مگر میری سمجھ میں تو یہ پیار ویار بالکل نہیں تھا۔بس ایک وابستگی تھی۔

جب سے میں نے دودھ دھونا بند کیا تھا، بیگم جی سے آمنا سامنا بھی کم ہوتا تھا۔میرا زیادہ وقت مردانے میں منشی منظور کے ساتھ کھاتوں میں سر کھپاتے یا اس کی پلپلی ٹانگیں دباتے گزرتا تھا۔منشی کو بدن دبوانے کا چسکا تھا۔آتے جاتے کو آواز دیکھ کر مٹھی چاپی پر لگا لیتا تھا۔۔۔۔میں نے اس کی اس ضرورت کو بڑے اچھے طریقے سے پورا کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ مجھ سے خوش تھا۔

ایک دن تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی شام کے فوراً بعد رونق علی نے مٹی کی انگیٹھی سلگوالی تھی اور بستر پر لوئی اوڑھے بیٹھا تھا۔ ابھی اسے بیٹھے آدھ پون گھنٹا ہی ہوا تھا مگر اس کے ارد گرد مونگ پھلی، چلغوزے اور اخروٹ کے چھلکے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید چار پانچ گھنٹے سے یہاں بیٹھا ہے۔ وہ اب مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ وہ بیگم جی کو اپنی بھانجی بتاتا تھا مگر مجھے علم ہو چکا تھا کہ وہ ان کا دور پار کا رشتے دار ہے اور بیگم جی اسے مروتاً "ماما" کہہ دیتی ہیں۔ رونق نے تھوڑی سی برانڈی بھی پی رکھی تھی اور بڑے نشیلے انداز میں مجھے رس گلے اور نوخیز لڑکی کی مشترکہ خصوصیات بتا رہا تھا۔ وہ بولا۔ "رس گلا بھی چٹا ہوتا ہے، ہمارے علاقے کی عورت بھی چٹی ہوتی ہے۔ دونوں رس سے بھرے ہوتے ہیں۔ دونوں کی خوشبو بالکل اپنے پاس لانے سے ہی آتی ہے۔ دونوں کو منہ لگاتے ہی منہ مٹھا ہو جاتا ہے۔۔۔۔"

"لیکن پھر رس گلا تو غائب ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ ""عورت ہم کو غائب کر دیتی ہے۔ کچھ دیر کے لئے ہی سہی پر غائب تو کر دیتی ہے۔"

"پھر آپ نے اب تک کسی رس گلے سے شادی کیوں نہیں کی؟ میرا مطلب ہے کسی عورت سے؟"

وہ مسکرایا۔ "رس گلے سے شادی کر لو تو پھر رس گلا ہی کھانا پڑتا ہے جبکہ مٹھائی کے ڈبے میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ برفی، قلاقند، گلاب جامن، جلیبی شلیبی۔ ہر شے کا اپنا ایک وکھرا سواد ہوتا ہے۔"

شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھ اس کے رہن سہن کا اب اچھی طرح علم ہو چکا تھا۔ وہ خاصا رنگین مزاج تھا۔ حویلی میں ہونے والی مختلف تقریبات میں ڈسکہ شہر سے ناچنے والیاں آتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی گوجرانوالہ سے بھی آتی تھیں۔ رونق علی ایسے ہی دنوں کے انتظار میں رہتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا لیکن ایک خوبی اس میں تھی۔ اس نے اپنے علاقے کی کسی عورت سے کبھی تعلق نہیں بنایا تھا بلکہ بری نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ ہاں، ہنسی مذاق اور بات ہے۔ غالباً اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ شریف عورت کے ساتھ گناہ کا تعلق ہی گناہ ہوتا ہے۔

ہماری گفتگو جاری تھی کہ سات آٹھ سالہ حامد چوکڑیاں بھرتا ہوا ادھر سے گزرا۔ وہ کسی نوکرانی کی کوئی چیز چھین کر بھاگا تھا۔ وہ "چھوٹے مالک۔۔۔۔۔ چھوٹے مالک" پکارتی اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ رونق علی نے چونکتے ہوئے کہا۔ "ہاں خاورے! مجھے یاد آیا۔ والی

صاحب کہہ رہے تھے کہ حامد کی پڑھائی شروع کرانی ہے۔وہ کسی ماسٹر شاسٹر کاانتظام کرنے کو کہہ رہے تھے۔کیوں نہ تم اسے پڑھادیا کرو۔اردو،انگریزی تو تمہیں بھی آتی ہے۔"

"میں نے کبھی پڑھایا تو نہیں لیکن آپ کہتے ہیں تو کوشش کرلوں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے،میں تمہاری سفارش کرتاہوں۔۔۔۔لیکن یہ چلغوزے جو تم لائے ہو بڑے سوادی ہیں۔"

میں نے رونق علی کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔"میں اس بار پنڈ گیا تو اکٹھے ہی دوڈھائی کلو لے آؤں گا۔"

چارپانچ روز بعد میری ترقی ہوگئی۔میری تنخواہ پانچ سوروپے اضافے کے ساتھ تین ہزار روپے ہوگئی۔اس کے ساتھ ہی مجھے چھوٹے مالک حامد کو پڑھانے کی ذمے داری سونپ دی گئی۔

حامد لاڈپیار سے بگڑاہوااور قدرے اڑیل بچہ تھالیکن میں نے چند دن میں ہی اس کی نبضیں ڈھونڈلیں اور وہ میری بات ماننے لگ گیا۔وہ علاقے کے حاکم کا بیٹا تھااور اسے حکم ماننا آتا ہی نہیں تھا۔میں بھی اسے حکم نہیں دیتا تھا۔بس ایک راہ دکھادیتا تھااور کوشش کرتا تھا کہ وہ خود

ہی اس راہ پر چل پڑے۔میں نے پرانے طریقے کے مطابق اس کی لکھائی،کاپی کے بجائے تختی پر شروع کرائی۔اور حقیقت یہی ہے کہ کانے کے قلم سے لکڑی کی تختی پر مشق کرنے والے اکثر خوش خط ثابت ہوتے ہیں۔

حامد کو پڑھاتے ہوئے میرے اپنے بچپن کی یادیں بھی تازہ ہوگئیں۔میں اور میرا بڑا بھائی گاچی کے ساتھ بڑے اہتمام سے تختیاں پوچا کرتے تھے۔گیلی گیلی گاچی کو ہاتھ سے ہموار کرنے کے بعد تختی سوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھ دی جاتی تھی۔اس دوران میں مٹی کی دوات کے اندر سیاہی اور کپڑے کا چھوٹا سا ٹکڑا ڈال کر روشنائی تیار کی جاتی تھی۔۔۔۔

دوات کو دونوں پاؤں کے اندر دبا کر سرکنڈے کے الٹے قلم کو اس میں یوں چلایا جاتا تھا جیسے لسی کے گڑوے میں مدانی چلائی جاتی ہے۔سرکنڈے کے قلم کو تراشنااور اس میں مناسب جگہ پر"ٹک"دینا بھی ایک فن سمجھا جاتا ہے۔

ایک دن میں اور حامد اس سارے عمل سے گزر رہے تھے،اچانک مجھے محسوس ہوا کہ بیگم جی کھڑکی میں کھڑی ہیں اور محویت سے ہمیں دیکھ رہی ہیں۔وہ واقعی موجود تھیں۔میں نے دیکھا تو وہ مسکراتی ہوئی اندر آگئیں۔ان کی ناک کے کوکے نے لشکارامارا،میں نے جلدی سے

نظر جھکالی۔ وہ حامد کی لکھائی دیکھتے ہوئے بولیں۔ "خاورے! آج کل شہر کے اسکولوں میں تو تختیاں وغیرہ نہیں لکھی جاتیں۔"

"شہر تو کیا بیگم جی! اب تو پنڈوں میں بھی یہ رواج بس کہیں کہیں ہے۔ اسی لئے لوگوں کی لکھائیاں خراب ہیں۔"

"ابھی تو یہ حامدی بھی کیڑے مکوڑے ہی ڈال رہا ہے۔"

"دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا جی۔"

"تم بھی لکھ کر دیکھو امی! بڑا مزہ آئے گا۔" حامد نے تختی ماں کی طرف بڑھائی۔

"حامد! تم نہیں کہتے، آپ کہتے ہیں۔" میں نے اسے سمجھایا۔ اس نے سنی ان سنی کر دی۔

بیگم جی نے مسکراتے ہوئے تختی پکڑی اور ہمارے قریب ہی موڑھے پر بیٹھ گئیں۔ میں نے روشنائی سے لتھڑا ہوا قلم اپنے رومال سے صاف کیا اور بیگم جی کی طرف بڑھا دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ پڑھی لکھی نہیں ہیں اور انہوں نے اس بات کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ انہوں نے بالکل چھوٹے بچوں کی طرح اب پ لکھنے کی کوشش کی۔ ج پر آکر وہ اٹک گئیں۔

ان سے ج کا دائرہ نہیں بن پا رہا تھا۔ کبھی وہ بڑی یے کی طرح لمبا ہو جاتا تھا کبھی م کی طرح نیچے چلا جاتا تھا۔ حامد ہنسنے لگا۔ وہ بھی ہنسنے لگیں۔ ان لمحوں میں وہ راجوال کی بیگم جی کے بجائے ایک عام سی لڑکی نظر آرہی تھیں۔ میں نے پہلے انہیں خود لکھ کر دکھایا۔۔۔۔۔ پھر انہوں نے لکھا مگر اس بار بھی ٹھیک نہیں لکھا گیا۔ میں حامد کا ہاتھ پکڑ کر اسے لکھنا سکھاتا تھا۔ اسی طرح بیگم جی کا ہاتھ پکڑ کر میں نے "ج" کا دائرہ بنایا۔ پھر چ پھر ح۔۔۔۔۔ اچانک میرے جسم میں ہزار پاور کی برقی رو دوڑ گئی۔ میرا ذہن بیگم جی کے لمس کی طرف منتقل ہو گیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ خبر نہیں کہ انہوں نے میرے اس عمل کو محسوس کیا یا نہیں۔

انہوں نے دو تین لفظ اور لکھے پھر قلم دوات حامد کی طرف بڑھا دی۔ ان کی انگلیوں پر بھی روشنائی لگ گئی تھی۔ وہ ہاتھ صاف کرنے کے لئے دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اپنا رومال ان کی طرف بڑھا دیا۔ اسی دوران میں آہٹ ہوئی اور دروازے پر والی صاحب نمودار ہو گئے۔ پتا نہیں کیوں، میرا دل یکبارگی شدت سے دھڑک اٹھا۔ والی صاحب نے کمرے کا جائزہ لیا پھر مسکراتے ہوئے بولے۔ "یہاں کیا چل رہا ہے بھئی؟"

میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ والی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پھر سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں جھجکتے ہوئے بیٹھ گیا۔ بیگم جی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے بھی کچی جماعت میں داخلہ لے لیا ہے۔"

والی صاحب بے تکلف انداز میں بولے۔ "پھر تو بھئی مجھے بھی چار لفظ پڑھنے پڑیں گے۔ آج تم کچی میں ہو کل پکی میں ہو جاؤ گی۔ اتنی پڑھا کو زنانی کا خاوند چٹا ان پڑھ ہو، یہ تو ٹھیک نہیں نا۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے والی صاحب کو اچانک کھانسی ہونے لگی۔ پھر یہ کھانسی بڑھتی گئی۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ موڑھے پر بیٹھ گئے۔ بیگم جی لپک کر باہر گئیں اور شیشے کے گلاس میں پانی لے آئیں۔ دو گھونٹ پانی پی کر والی صاحب کی سانس بحال ہو گئی۔ انہوں نے سردیوں کے ساتھ ہی شروع ہو جانے والی کھانسی کا شکوہ کیا۔

میں کچھ دیر جھجکتا رہا پھر مودب لہجے میں کہا۔ "والی صاحب! کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟"

وہ بولے۔ "ڈاکٹروں کو گولی مارو۔ ان کی دوائیں تو بندے کو اندر سے ساڑ دیتی ہیں۔ ہمارا اپنا حکیم ہے یہاں، اچھی دوا دیتا ہے۔ پر اس بار پتا نہیں کیوں اس کی دوا بھی کام نہیں کر رہی۔"

بیگم جی بولیں۔ "آپ سے کہا بھی تھا کہ نکوال سے مولوی بشارت کو بلا لیں، وہ بھی اچھی دوا دیتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "والی جی! ہمارے پنڈ کے پاس ایک سنیاسی کا ڈیرا ہے۔ بابا عیسیٰ کہتے ہیں اسے۔ بڑی تھوڑی سی دوا دیتا ہے۔۔۔۔ پر بیماری کو جڑ سے نکال دیتا ہے۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں آپ کی طبیعت بتا کر وہاں سے دوا لاؤں؟"

تھوڑی سی پس و پیش کے بعد والی صاحب نے رضامندی ظاہر کر دی۔ وہ شاید دو منٹ کے لئے کمرے میں آئے تھے مگر جب بیماریوں اور ان کے علاج کا ذکر شروع ہوا تو وہ آدھ پون گھنٹے تک وہاں موجود رہے۔ روایتی وڈیروں اور زمینداروں کی نسبت وہ مختلف مزاج کے مالک تھے۔ غالباً! عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کا دھیما پن بھی ان کے اندر آ گیا تھا۔

اگلے روز میں صبح سویرے گھوڑی پر زین ڈال کر نکل گیا۔ دوپہر کو ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی، آلو پالک کے ساتھ کھائی۔ باداموں والے گڑ کے چاول کھائے۔ اوپر سے چائی کی

مزید ارلسی نمک اور کالی مرچ ڈال کر پی۔ اس کے بعد عارفہ کے ساتھ تھوڑی سی دھینگا مشتی کرنے کے بعد واپس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ بے بے جی نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"ہائے میں مر گئی۔ گھوڑی پر اتنا لمبا پینڈا کر کے آیا ہے اور ابھی پھر واپس جا رہا ہے۔ میں نہیں جانے دوں گی۔ آج کی رات آرام کر۔"

"کیا کروں بے بے جی! نوکری ہی ایسی ہے۔ اور آپ کو تو پتا ہے نوکری کیا اور نخرا کیا۔"

"نہیں نہیں۔۔۔۔ ہمیں نہیں چاہیے، ایسی نادر شاہی نوکری۔" بے بے جی روہانسی ہو گئیں۔

انہیں بہ مشکل منا کر میں واپس روانہ ہو گیا۔ جن دنوں جسم میں ترنگ ہوتی ہے اور جوان خون اچھالے مارتا ہے تو کاہلی پاس بھی نہیں پھٹکتی۔ اگر مجھے ضرورت محسوس ہوتی تو میں ایک ہی بار میں راجوال اور اپنے پنڈ کے درمیان تین پھیرے لگا سکتا تھا۔ میں نے سب سے پہلے چاچے عیسیٰ کو ڈھونڈا وہ اپنے ٹھکانے پر کم ہی بیٹھتا تھا، بس بیلے میں اور ویران رکھوں میں گھومتا رہتا تھا۔۔۔۔ اس کی نگاہ بھی اب اتنی تیز نہیں رہی تھی۔ میں نے اس سے چند پڑیاں دوائی کی لیں۔ نذرانے میں اسے دس روپے دیے۔ اس کے بعد رونق علی کے لئے پورے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ڈھائی سیر چلغوزے قصبے کے بازار سے خریدے۔۔۔۔ حامد کے لئے ربڑ کی ایک رنگ دار گیند لی اور سخت ٹھنڈ میں گھوڑی دوڑتا قریباً تین گھنٹے میں واپس جاگیر پہنچ گیا۔

دوائی والی صاحب تک پہنچ گئی۔ مجھے شدت سے دوائی کے نتیجے کا انتظار تھا۔ تیسرے روز جب میں اخلاقاً منشی منظور کی ٹانگیں دبانے میں مصروف تھا، فیروزاں نے آ کر بتایا کہ والی صاحب نے بلایا ہے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ مردانے کی بیٹھک میں پہنچا۔ والی صاحب کندھوں پر گرم شال ڈالے رنگ دار کرسی پر بیٹھے تھے، ان کا چہیتا دیو ہیکل کتا "ہیرا" کرسی کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ اس کے نکیلے دانت اور سرخ لمبی زبان دیکھنے والے کے دل میں ہیبت پیدا کرتے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "جل تو جلال تو" مجھے پتا تھا کہ بہ ظاہر دھیمے نظر آنے کے باوجود والی صاحب کبھی کبھی سخت طیش میں بھی آ جاتے تھے۔

بہر حال، خیریت گزری۔ والی صاحب نے کہا۔ "بھئی! تمہاری دوائی نے کام دکھایا ہے۔ کھانسی ٹھیک ہو گئی ہے۔ ریشہ بھی کم ہے۔ تین دن کی پڑیاں ابھی ہیں۔"

"میرا خیال ہے جی۔۔۔۔ کہ اور کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" میں نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔

انہوں نے مجھے ایک چھوٹے موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ حکیموں، سنیاسیوں، جوگیوں اور ان کے علاج کے طریقوں کی باتیں کرنے لگے۔ یہ باتیں شروع ہوئیں تو لمبی ہوتی چلی گئیں۔ یہ بات میری سمجھ میں اچھی طرح آ گئی تھی کہ "طب اور صحت" والی جی کا پسندیدہ موضوع ہے۔ جب ہم باتیں کر رہے تھے تو بیگم جی کسی کام سے بیٹھک میں آئیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح دلکش لباس میں تھیں۔ ان کے لمبے قد پر ہر طرح کے کپڑے سج جاتے تھے۔ وہ کمر بالکل سیدھی رکھ کر چلتی تھیں اور یہ بناوٹی انداز نہیں تھا۔ سیدھا چلنے سے ان کا قد کچھ اور بھی دراز دکھائی دیتا تھا۔ والی صاحب کا قد درمیانہ تھا۔

مجھے اور والی صاحب کو محو گفتگو دیکھ کر بیگم جی کو اچھا لگا۔ میں نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ میرا والی صاحب کے پاس بیٹھنا اور انہیں گفتگو میں مصروف رکھنا انہیں بھلا لگتا تھا۔

انہوں نے والی صاحب کے قریب جھک کر ان کے کان میں کوئی بات کہی اور واپس چلی گئیں۔ والی صاحب ایک بار پھر میری لائی ہوئی دوا کی تعریف کرنے لگے۔ دیسی دواؤں سے مجھے بھی انکار نہیں تھا۔ خاص طور سے اچھے حکیموں کو تو میں دور دراز علاقوں میں خدا کی نعمت سمجھتا ہوں۔ مگر فی الوقت والی صاحب کی تعریفوں کی حق دار کوئی دیسی نہیں

"انگریزی" دوائی تھی۔ درحقیقت میں نے والی صاحب کو بابے عیسٰی والی دوا دی ہی نہیں تھی۔ اس کے دیے ہوئے سفوف کے بجائے میں نے ایک اینٹی بایوٹک دوا پیس کر والی صاحب کو کھلائی تھی اور اس نے خاطر خواہ اثر کیا تھا۔ میں والی صاحب کا مزاج سمجھ گیا تھا۔ میں لاکھ کوشش کرتا مگر وہ انگریزی دوا ہرگز نہ لیتے۔

چند دن میں والی صاحب کو سر درد کی شکایت ہوئی تو میں نے پھر سنیاسی کی پڑیا کے نام پر انہیں انگریزی دوا کھلائی اور شاباشی لی۔ دوا کے علاوہ وہ میرے چھوٹے چھوٹے طبّی مشوروں کو بھی قدر کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ دوسرے تیسرے روز ہی سہی مگر پندرہ بیس منٹ کے لئے والی جی سے میری ملاقات ضرور ہو جاتی تھی۔ حویلی میں چاچے عسکری کو اہم حیثیت تھی۔ وہ ایک طرح سے یہاں کا "میر شکار" ہونے کے ساتھ ساتھ "سردار محافظ" بھی تھا۔ اس کے لاکھ برا ماننے کے باوجود میں اسے عسکری چاچا ہی کہتا تھا۔ چاچا عسکری پرلے درجے کا خوشامد پسند تھا۔ وہ قریباً دو کم پچاس سال کا تھا مگر اس کی خواہش تھی کہ اسے تیس سے زیادہ کا نہ سمجھا جائے۔ میں نے اسے پچیس کا سمجھنا شروع کر دیا تھا اور موقع محل کے مطابق اس کے کسرتی جسم اور اس کی جی داری کی تعریف بھی کرتا رہتا تھا۔ منشی منظور کی طرح چاچا

عسکری بھی مجھ سے خوش تھا اور میرے مضبوط جسم کے پیشِ نظر مجھے کبھی نیڈو اور کبھی ہیرو کا خطاب دیتا تھا۔

میں نے قارئین سے وعدہ کیا ہے کہ اپنی دلی کیفیات کے بارے میں جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ مجھے معلوم نہیں، میری ان باتوں میں آپ کے لئے کوئی دلچسپی ہو گی یا نہیں مگر جو حقیقتِ حال ہے، وہ میں بیان کر رہا ہوں۔ میں نہ چاہنے کے باوجود بیگم جی میں دلچسپی محسوس کر رہا تھا۔ کوئی چیز تھی جو مجھے اندر سے بیگم جی کی طرف کھینچتی تھی۔ میں انہیں دیکھنا چاہتا تھا اور ان سے قریب ہونا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ بالکل ناممکن اور از حد خطرناک ہے مگر دل کے اندر مسلسل چلنے والے معاملے پر مجھے اختیار نہیں تھا۔ جتنی دفعہ بیگم جی سے ملاقات ہوتی تھی، میرے اندر موجود جذبہ شدت پکڑ رہا تھا۔ میں کوئی گانا سنتا تو دھیان بیگم جی کی طرف چلا جاتا، کوئی کتاب پڑھتا تو ان کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی۔ گاؤں کے اندر ہی ہونے والی شادی کی ایک تقریب میں بیگم جی کو شاندار لباس اور ہلکی سی لپ اسٹک کے ساتھ دیکھا تو کئی دن ان کی شکل نگاہوں میں گھومتی رہی۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت تو نہیں تھیں لیکن ان کے اندر کچھ تھا۔ کچھ بہت پیارا۔۔۔۔۔بہت خوشبودار اور پاکیزہ! جیسے

صبح سویرے ہری ہری فصل پر پڑی ہوئی اوس یا کنوئیں کے اول سے کھال کی طرف جاتا ہوا چمکیلا پانی۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ کئی کئی دن ان سے سامنا نہ ہوتا۔ ایسے دنوں میں، میں بار بار ان کی شکل نگاہوں میں لانے کی کوشش کرتا۔ کبھی کامیابی ہو جاتی کبھی نہ ہوتی۔

ایک دن جب میں اپنے کچے کمرے کے اندر لالٹین کی لو مدھم کیے، کھدر کے پھول دار لحاف میں لیٹا تھا اور کھڑکی سے باہر گاؤں کی لمبی ٹھنڈی کالی رات آہستہ آہستہ سنسان گلی کوچوں میں رینگ رہی تھی، میں نے خود کو سمجھایا اور دل ہی دل میں کہا۔ دیکھ خاورے! یہ جو کچھ تو سوچ رہا ہے، یہ کسی طور بھی مناسب نہیں ہے۔ یہ بہت گھٹیا سا راستہ ہے۔ شاید اگر بیگم جی کو تیرے خیالوں کی بھنک بھی پڑ جائے تو وہ تجھے کھڑے کھڑے حویلی سے نکال دیں۔ وہ تجھے مسکرا کر دیکھتیں ہیں تیرے ساتھ مہربانی سے پیش آتی ہیں تو اس کا مطلب یہ کیسے ہو گیا کہ وہ بری عورت ہیں۔۔۔۔۔اور پھر والی جی کے بارے میں سوچ۔ انہوں نے تجھ پر اعتماد کر رکھا ہے۔ تجھے گھر میں آنے جانے کا راستہ دیا ہوا ہے۔ تیری حیثیت ان کی جوتیوں میں بیٹھنے کی ہے لیکن وہ تجھے اپنے برابر بیٹھنے کی عزت دیتے ہیں۔ تجھے شرم کرنی چاہیے۔ ڈوب مرنا چاہیے۔" میں پسینے میں نہا گیا۔

میں نے سوچا، مجھے اس معاملے کو یہیں ختم کر دینا چاہیے۔ اپنے دل سے ہر خیال کو کھرچ دینا چاہیے۔ ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔ محبت کرنے۔۔۔۔ چاہے جانے اور چاہے کے اور بھی موقعے ملیں گے اور پھر وہ محاورہ بھی ذہن میں آیا کہ آٹھ گھر تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے۔۔۔۔ یعنی میں جس گھر کا نمک کھا رہا تھا اسی میں سیندھ لگانے کی سوچ رہا تھا۔

میں نے خود کو بہت برا بھلا کہا۔ مگر ایک خیال بدستور ذہن میں جڑ پکڑے ہوئے تھا اور وہ یہ کہ کچھ بھی ہے۔۔۔۔ یہ معاملہ کچھ نہ کچھ آگے بڑھے گا ضرور۔۔۔۔۔ دو مہینے بعد، چھ مہینے بعد یا پھر سال دو سال بعد۔۔۔۔ مگر اس معاملے کو آگے بڑھنا ہے۔

میں آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا، میرے اس خیال کی وجہ کیا ہے۔ کیا بیگم جی کے رویے میں کوئی ایسی بات ہے جو بہ ظاہر نظر نہیں آ رہی لیکن میرے حوصلے کو بڑھا رہی ہے۔ جواب تقریباً نفی میں تھا۔ میں بہت دیر تک اپنے آپ میں الجھتا رہا۔ دل کی عجیب کیفیت تھی۔ پھر میں نے اپنے کردار اور اپنے رویے کے اچھے برے پہلوؤں پر غور کیا۔ میرے دل میں خواہش جاگی کہ میں اپنے آپ کو بہتر کروں۔ کس لئے؟ اس جذبے کے لئے جو میں اپنے اندر بیگم جی کے لیے محسوس کرتا ہوں۔ میں پھر کہہ رہا ہوں، آپ کو میری باتیں عجیب محسوس

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہوں گی۔ اس دن وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے اپنے ساتھ کچھ عہد کیے۔ پہلا عہد شراب کے حوالے سے تھا۔ میں شراب کا رسیا تو نہیں تھا مگر کبھی کبھار، مہینے یا دو مہینے میں ایک دفعہ دوستوں کے ساتھ اس بد کام میں شریک ہو جاتا تھا۔ میں نے تہیہ کیا کہ اب اس حرام شے کو کبھی منہ نہیں لگاؤں گا۔ دوسرا عہد سگریٹ نوشی کے حوالے سے تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آج ہی سے سگریٹ پینا کم کر دوں گا۔ یہ کمی ہر ماہ جاری رہے گی اور زیادہ سے زیادہ چار ماہ کے اندر سگریٹ یکسر ختم کر دوں گا۔ یاروں دوستوں میں میرا ایک دوست رشید عرف چھیدا رنگ باز طبیعت کا مالک تھا۔ جتنے بھی الٹے سیدھے کام ہوتے تھے، ان میں وہ پیش پیش ہوتا تھا۔ میں نے عہد کیا کہ آج سے شیدے کے ساتھ میل جول بالکل ختم ہے۔ خود سے کیے گئے ان وعدوں کے بعد میں نے خود کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

یہ صورتِ حال کسی حد تک جذبات کا نتیجہ لگتی ہے لیکن جب عمر کے موسم بہار میں لہو کے اندر پہلی چنگاریاں جاگتی ہیں تو دل کی وارداتیں بڑی عجیب بلکہ کبھی کبھی مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ تاہم ان کی گہرائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دو دن کے بادلوں کے بعد ہلکی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ گاؤں کی عورتیں کپڑے دھونے کے لئے کنوئیں کی طرف جا رہی تھیں۔ بارش میں مویشیوں کے لیے چارے کا انتظام بہت مشکل ہوتا ہے، اس لیے جب بارش کے بعد دھوپ نکلتی ہے تو مویشیوں کے ساتھ ساتھ چرواہے بھی نہال ہو جاتے ہیں۔ بھینسوں کی ایک طویل قطار گھنٹیاں بجاتی کھلے میدان کی طرف رواں تھی۔ دو دن سے گھروں میں دبکی ہوئی بکریاں اور مرغیاں وغیرہ ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ میں بھی کھیس کی بکل مار کر تیز تیز چلتا فدا محمد کے بیلنے کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں گنے کے رس سے گڑ بنایا جا رہا تھا۔ گڑ نہ بھی ملتا مگر تاپنے کو آگ تو مل ہی جاتی تھی۔

مگر میں ابھی حویلی سے نکلا نہیں تھا کہ ملازمہ تاجو کو دیکھا وہ بڑے سائز کی گول چنگیر کو لال رومال سے ڈھانپے زنان خانے سے نکلی اور رونق علی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ چاچے عسکری نے مجھے آنکھ ماری۔ "اوئے ہیرو! لگتا ہے آج چنگا چوکھا ہے۔ جا تو بھی دیسی گھی سے ذرا گلا تر کر لے۔"

مجھے واقعی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں تاجو کے پیچھے پیچھے ہی رونق کے کمرے میں پہنچ گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اتفاقاً آ گیا ہوں۔ چاچے عسکری کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ کھانے

میں دیگر اشیا کے علاوہ گرما گرم حلوہ بھی موجود تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ رونق کچھ اداس ہے۔ اس نے جواں سال تاجو کو واپس جاتے ہوئے بھی غور سے نہیں دیکھا۔

"آجا۔۔۔۔ آجا کھاورے! دو چار برکیاں (لقمے) تو بھی لے لے۔" رونق نے صلح ماری۔

میں تو پہلے ہی اشارے کا منتظر تھا۔ دوپہر کے اس کھانے میں دیسی گھی سے چپڑی ہوئی تندور کی روٹیاں تھیں۔۔۔۔ دیسی مرغی کا سالن، گھر کا اچار جس میں ہری مرچوں اور نبو کے ساتھ کچے آم کی پھاڑیاں بھی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر ہانڈی میں دیر تک پکے ہوئے سرخی مائل دودھ کا ایک فٹ لمبا گلاس جس پر تہ در تہ ملائی چڑھی ہوئی تھی۔ اسے کاڑھنی کا دودھ کہا جاتا ہے۔ اس کی لذت کچھ پینے والے ہی جانتے ہیں۔ بہر حال، یہ تھا رونق علی کا پرہیزی کھانا۔ بقول اس کے کچھ مہینوں سے اس کی نبض کنپٹیوں میں ٹھکا ٹھک چلتی تھی اور ذرا تیز چلنے سے آنکھوں کے سامنے نامعقول جالے سے آتے تھے۔ میں نے کھانے میں رونق علی کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ اس کی رفتار خاصی کم تھی۔ جلد ہی وہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے رونق بھائی! کچھ بجھے بجھے لگتے ہیں آپ؟"

"نہیں ایسی تو کوئی گل نہیں۔"

"شاید کل کے لئے بھوک سنبھال کر رکھ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ ایک دن بعد رونق علی کے مقامی یار چودھری نادر کے پانچ سالہ بیٹے کی ختنے تھے۔ اس موقع پر کھانے پینے اور گانے بجانے کا انتظام تھا۔

رونق نے بے زاری سے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں بھئی! وہ پروگرام بھی کینسل کر دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"خاورے! جب دل پریشان ہو تو پھر اس طرح کی رونق شونق چنگی نہیں لگتی۔"

"اوہو۔۔۔۔۔ کچھ پریشانی ہے رونق بھائی!"

وہ کچھ دیر چھپانے کی کوشش کرتا رہا پھر بولا۔ "کبھی کبھی لگتا ہے کہ والی جی اب بڈھے ہو گئے ہیں۔ ان کے سوچتے سوچتے میں وقت گزر جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ وقت پر اک ٹانکا سو ٹانکوں سے بچا لیتا ہے۔ یہ جھگڑے شگھڑے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اگر وقت پر ان کا سدباب نہ کیا جائے تو بعد میں مصیبت وڈی ہو جاتی ہے۔"

"رونق بھائی! کہیں آپ اسی جھگڑے کی بات تو نہیں کر رہے جو ہمارے پنڈ کے پاس۔۔۔۔۔؟"

"ہاں ہاں، وہی بکھیڑا ہے یار!"

"آپ نے تو کہا تھا کہ ان دونوں بندوں کے خلاف والی جی پکی رپورٹ کروا رہے ہیں۔ اب وہ سال ڈیڑھ سال باہر نہیں آئیں گے۔"

"بس، نہیں کروائی نا رپورٹ شپورٹ۔ سوچ میں پڑ گئے۔ دیلا گزر گیا۔ اب ان کا حوصلہ اور بڑھ گیا ہے۔"

"پر رپورٹ کیوں نہ کروائی؟"

رونق نے دائیں بائیں دیکھا پھر ذرا دھمی آواز میں بولا۔ "جب بندے نے لڑنا نہیں ہوتا نا پھر نہ لڑنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ کوئی بھی نکمونا بہانہ مل جائے، وہ ہتھیار کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ آج کل اپنے والی جی کا بھی یہی حال ہے۔ وہ دو بندے جو میرے ہتھے لگے تھے۔ لیاقت کالے کے پالتو کتے ہیں۔ لیاقت کالے کو جانتے ہو تم؟"

"نہیں۔"

"نواں نواں بدمعاش ہے۔ آٹھ دس مہینے پہلے جیل سے چھوٹا ہے۔ پولیس والوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ سنا ہے، اس کا کوئی ماما چاچا، ایم پی اے ہے۔ والی جی اسے منہ لگانا نہیں چاہتے پر وہ ٹوٹے چھتر کی طرح بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ آس پاس کے زمینداروں کو پہلے آپس میں لڑاتا ہے پھر ان سے بھتّا شتّا لیتا ہے۔۔۔۔ پر کتے کے بچے نے جو کچھ کرنا ہے، اپنے علاقے میں کرتا رہے۔۔۔۔ ہمارے لوگوں کو تو تنگ نہ کرے۔"

"اب کیا کیا ہے اس نے؟"

جواب میں رونق نے جو کچھ بتایا، اس کا لب لباب یہ تھا۔ ڈھائی تین ماہ پہلے ہمارے پنڈ کے پاس رونق پر جن دو کن ٹٹوں نے حملہ کیا تھا، وہ لیاقت کالے کے ساتھی ہی تھے۔ بعد میں لیاقت کالے نے والی جی کے پاس ایک بندہ بھیج کر والی جی کا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور انہوں نے ان کن ٹٹوں کے خلاف رپورٹ درج کرانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب لیاقت کالے نے پھر کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے رہائشی گاؤں "قلعہ والا" کے اندر سے گزرنے والا راستہ جاگیر کے لوگوں کے لیے بند کر دیا تھا۔ اب جاگیر یا آس پاس کے جن دیہاتیوں کو نہر

یا نہر سے آگے پکی سڑک کی طرف جانا ہوتا تھا، انہیں ڈھائی تین میل کا چکر لگانا پڑتا تھا۔ یہ سراسر زیادتی تھی مگر ابھی تک اس کے خلاف کسی نے آواز نہیں اٹھائی تھی۔ کل راجوال ہی کے کچھ باراتیوں نے ٹریکٹر ٹرالی پر سوار ہو کر قلعہ والا کے اندر سے گزرنا چاہا۔ انہیں بہت جلدی تھی مگر لیاقت کالے کے کارندوں نے ان کی ایک نہیں سنی۔ دولہا کے بھائی نے ذرا اونچے لہجے میں بات کی تو لیاقت کالے کے غنڈوں نے اس کو مارنا شروع کر دیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ کر اسے عورتوں کے سامنے ہی ننگا کر دیا۔ اس کے علاوہ بھی دو تین باراتیوں کو جوتے مارے اور ان سے لکیریں نکلوائیں۔"

یہ ساری بات سننے اور سمجھنے کے بعد میں نے رونق علی کو پیشکش کی کہ میں اس معاملے کو دیکھتا ہوں اور خود جا کر لیاقت سے بات کرتا ہوں۔

"اس سے کیا ہونا ہے خاورے! جھگڑا شگھڑا ہی بڑھنا ہے۔"

"جھگڑا تو اب بھی بڑھ ہی رہا ہے۔ ہو سکتا ہے معاملہ سدھر جائے۔ بات چیت کرنے سے کم از کم یہ تو پتا چل جائے گا کہ وہ حرامی کہتا کیا ہے۔"

"ایسے لوگوں سے گل بات کا کوئی فائدہ شائدہ نہیں ہوتا خاورے! یہ تو صرف مار کٹائی کی زبان ہی سمجھتے ہیں۔"

"چلیں، کوئی بات نہیں۔ وہ مار کٹائی کی طرف آئے گا تو ہم نے بھی کوئی چوڑیاں تو نہیں پہنی ہوئیں۔"

"پر والی جی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"ہم ان سے اجازت لیں گے ہی نہیں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" رونق نے چونک کر پوچھا۔

میں نے چند سیکنڈ تک سوچنے کے بعد کہا۔ "دیکھو رونق بھائی! ایسا کرتے ہیں، میں اس معاملے کو اپنے طور پر دیکھتا ہوں۔ میں لیاقت کالے سے ملتا ہوں۔ اگر مسئلہ گل سے حل نہ ہوا تو کیا ہو گا؟ جھگڑا ہی ہو جائے گا نا اور یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں اس جھڑے میں لیاقت کو بے بے یاد کرا دوں۔"

"اور اگر اس نے تمہیں بے بے یاد دلا دی تو۔"

"تو بھی تمہاری یا والی جی کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہ میری ذاتی بے عزتی ہو گی۔ ہاں۔۔۔۔۔ اگر۔۔۔۔۔ لیاقت کو بے بے یاد آئی تو پھر آپ لوگ سامنے آجانا۔ ایک بات آپ کو بھی اچھی طرح پتا ہو گی۔ مار کھانے والے غنڈے کا ساتھ کوئی کم ہی دیتا ہے۔"

ہمارے سامنے دودھ پتی کی پیالیاں رکھی تھیں۔ ہم چسکیاں لیتے رہے اور اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ آخر ایک پروگرام طے ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تیسرے روز میں ایک تانگے پر سوار قریباً آٹھ میل کا فاصلہ طے کر کے "قلعہ والا" پہنچا۔ میں بالکل اکیلا تھا۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس ایک "کوکوں والی لاٹھی" کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ دیہات میں جب تیز دھوپ نکلتی ہے تو فضا میں کچی دیواروں، گوبر اور ہریالی کی عجیب سی بو رچ بس جاتی ہے۔ کسی اور کا تو نہیں پتا لیکن مجھے یہ بو ایک مہک کی طرح لگتی ہے۔ اس کی تاثیر سب سے جدا ہوتی ہے۔ میں ایک خطرناک کام کے لئے جا رہا تھا، اس کے باوجود ارد گرد کے ماحول میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس

اشارے سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب خون میں جوش ہوتا ہے تو خطرات دل میں پریشانی جگانے کے بجائے ترنگ جگاتے ہیں۔ مسائل کے اژدہے کیڑوں مکوڑوں کی طرح حقیر نظر آتے ہیں اور انہیں کچل کر آگے اور آگے بڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

میں ایک دفعہ پہلے بھی "قلعہ والا" آ چکا تھا۔ یہ خاصا بڑا گاؤں ہے۔ گہرے مٹیالے پانی والی چھوٹی نہر اس کے پاس سے گزرتی ہے۔ کئی جگہوں پر اس نہر سے آنکھیں چرا کر گزرنا پڑتا ہے۔ بھیگی قمیصوں اور ننگی ٹانگوں والی عورتیں یہاں چھپا چھپ کپڑے دھویا کرتی ہیں۔ ننگ دھڑنگ بچے ان کے گرد اٹھکیلیاں کیا کرتے ہیں۔ میں نے اپنا تانگا گاؤں کے اندر سے گزرنے والے راستے پر ڈالا تو حسب توقع ایک لمبے بانس نے میرا راستہ روک لیا۔ کرتے لاچے اور پگڑی والے دو بندے میرے سامنے آ گئے۔ ایک کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔

"کدھر جانا ہے جواناں؟" لاٹھی بردار نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"مکھن وال!" میں نے سوچا سمجھا جواب دیا۔

"مکھن وال کا راستہ اوپر سے ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ سے ایک خیالی نیم دائرہ کھینچتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہم تو پچھلے وی سال سے ادھر سے ہی گزر رہے ہیں۔"

"بس اب اکیسواں سال شروع ہو گیا ہے۔ اب اوپر سے جاؤ۔" اس نے درشت لہجے میں کہا اور باقاعدہ میرے گھوڑی کی باگ پکڑ کر اس کا رخ موڑ دیا۔

میں چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ باقاعدہ جھگڑا شروع ہو گیا۔ ایک بندے نے مجھے دھکا دیا۔ میں نے اس سے زیادہ زور کے ساتھ اسے دھکا دیا۔ لاٹھی بردار میرے سامنے آگیا اور خونی لہجے میں بولا۔ "اوئے! تو چاہتا کیا ہے۔ کیا چاہتا ہے تو۔"

"میں نے بتایا تو ہے۔ مجھے اس وڈے چودھری سے ملاؤ جس نے یہ راستہ بند کیا ہے۔"

لاٹھی بردار نے لاٹھی سونت لی مگر اس سے پہلے کہ بات بڑھ جاتی، دو تین افراد بیچ میں آ گئے۔ ایک تنومند شخص تنگ آ کر بولا۔ "چلو ٹھیک ہے، لے جاؤ اس کو لیاقت صاحب کے پاس۔ خود ہی اس کی طبیعت ٹھیک کر لیتے ہیں۔"

میرے تانگے گھوڑے کو ایک طرف باندھ دیا گیا۔ لیاقت کالے کا ڈیرا بالکل پاس ہی تھا۔ یہ گاؤں کی بیرونی حد تھی۔ پھاٹک نما دروازے کے سامنے تین چار گھوڑے کھڑے تھے۔ احاطے میں گوبر اور چارہ وغیرہ بکھرا ہوا تھا۔ مجھے یوں اندر لے جایا گیا جیسے تھانے میں

تھانیدار کے سامنے پیش کیا جارہا ہو۔میرے چاروں طرف لاٹھیاں تھیں۔احاطے میں ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا دونوں ہاتھ اوپر کیے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔اس کے کپڑوں اور چہرے سے غربت ٹپکتی تھی۔رو رو کر لڑکے کی ناک بہنے لگی تھی۔لگتا تھا کہ اس کو پہلے مارا پیٹا گیا ہے اور اب سزا کے طور پر یہاں کھڑا کر دیا گیا ہے۔

مجھے چارپائی پر بٹھادیا گیا۔میرے چاروں طرف گھورتی ہوئی آنکھیں تھیں۔چار پانچ منٹ بعد اندر سے ایک چوڑا چکلا شخص برآمد ہوا۔عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔اس کے بال منتشر اور آنکھیں نشے کے سبب سوجی ہوئی تھیں۔اس کی صبح شاید تھوڑی ہی دیر پہلے ہوئی تھی۔یہی لیاقت کالا تھا۔وہ کچھ زیادہ کالا بھی نہیں تھا۔شاید اس کے باقی بہن بھائی زیادہ گورے ہوں گے جس کی وجہ سے اسے کالا کہا جانے لگا۔اس نے مجھے سرخ آنکھوں سے گھورا اور شاہانہ انداز میں موڑھے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔"ہاں کاکا بَلّی! تجھے کونسی شے تنگ کر رہی ہے؟"

میں نے بالکل مرعوب ہوئے بغیر کہا۔"اس بات کا تجھے بھی اچھی طرح پتا ہو گا۔"

میرے لب و لہجے اور انداز نے اسے ایک دم چونکا دیا۔اس نے دھیان سے مجھے دیکھا اور نظروں نظروں میں تولا۔اس کی عقل نے تھوڑا سا کام کیا۔وہ اِرد گرد دیکھ کر بولا۔

"اوئے! یہاں کیا مجمع لگایا ہوا ہے، چلو اپنا اپنا کام کرو۔"

اس کے کارندے اِرد گرد منتشر ہو گئے۔دو تین لاٹھی برادر ذرا پرے تو ہٹ گئے مگر دور نہیں گئے۔میں نے بے خوفی سے کہا۔"لیاقت صاحب! اگر ہم کمرے میں جا کر ذرا آرام سے گل کر لیں تو شاید یہ ہم دونوں کے حق میں اچھا ہو گا۔"

میرے لب و لہجے نے اسے ایک بار پھر چونکایا۔وہ پھنکارا۔"پہلے تو بتا کہ آیا کہاں سے ہے اور ہے کون؟"

"یہ بات بھی اندر جا کر ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔"

وہ مجھے قہرناک نظروں سے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ہم ایک اندر کے کمرے میں چلے گئے۔یہاں کچی دیواروں پر آسیہ اور انجمن کے پوسٹر لگے تھے۔ایک طرف شراب کی خالی بوتل لڑھکی ہوئی تھی۔کھونٹی پر رائفل جھول رہی تھی۔"ہاں، اب بتاؤ۔۔۔۔۔کہاں سے تشریفاں لائے ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"اپنے ہی علاقے کا ہوں۔ آسمان سے نہیں اترا ہوں۔ یہ رستہ جو تم نے بند کیا ہے، یہاں سے ہم ہمیشہ گزرتے رہے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے بڑے گزرتے رہے ہیں۔ یہ شاہراہ عام ہے۔"

"شاہراہ عام ہو گی، پر اب نہیں ہے۔ تم لوگوں نے اس پنڈ کے لوگوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ یہاں سے رات دن تانگے اور ٹرالیاں گزرتی ہیں۔ یہ راستہ کسی کے پیو کا نہیں، پنڈ والوں کا ہے۔"

"دیکھو لیاقت! اگر تمہاری یہ بات مان لی جائے تو پھر کوئی رستہ بھی کسی کے باپ کا نہیں۔ کل ہم بھی اپنے پنڈ مراد پور کا رستہ بند کر دیں گے، پرسوں نکو وال والے ناکا لگا کر بیٹھ جائیں گے۔ اگر تم لوگوں کا کوئی مسئلہ ہے تو پنچایت بلاؤ۔ مل بیٹھ کر کوئی حل نکالتے ہیں۔۔۔۔۔"

میں نے بڑے مناسب لفظوں میں اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ میری کچھ باتیں شاید اس کے دل کو بھی لگیں لیکن اس کے اندر کی اکڑ خانی اسے میری تجویز ماننے سے روک رہی تھی۔ وہ اپنی ہی بات کرتا رہا اور دم بدم لال پیلا ہوتا رہا۔ وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کہیں تمہیں راجوال والوں نے تو نہیں بھیجا۔ اگر انہوں نے بھیجا ہے تو انہیں بتا دو۔۔۔۔۔ اس بات کو جتنا بڑھائیں گے، بڑھتی جائے گی۔۔۔۔۔ لمبا چوڑا بھانبھڑ بن جائے گا۔"

"میں کسی راجوال والے کو نہیں جانتا اور نہ مجھے کسی نے بھیجا ہے۔ میں اپنے کام سے جا رہا تھا، تمہارے بندوں نے میرا راستہ روکا ہے۔" میں نے ذرا توقف کیا اور ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "اور ایک بات میں تمہیں بالکل ٹھیک ٹھیک بتا دوں، تم لوگوں نے بڑی غلط جگہ متھا لگا لیا ہے۔۔۔۔۔ اس کا انجام اچھا نہیں ہونا۔۔۔۔۔ یہ پتنگ پیچا بڑا لمبا چلا جائے گا۔ تو شکل سے عقل والا لگتا ہے، میں اب بھی تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ یہ رستہ کھول دے یا پھر پنچایت بلا لے۔"

اس نے بھڑک کر کہا۔ "اوئے! میں خود ہی پنچایت ہوں۔ جو میں نے کہہ دیا، وہی فیصلہ ہے۔"

"لیکن پنچایت۔۔۔۔۔"

"اوئے! ہم نے کر لی ہے اپنی پنچایت۔ تو جا اپنا کام کر۔ یہ رستہ نہیں کھلنا ہے اور نہ کھلے گا۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔"تیرے بندوں نے مجھے دھکے دیے ہیں اور گالیاں بکی ہیں۔ بہرحال، یہ رستہ تو ضرور کھلے گا۔اچھے طریقے سے کھل جائے تو بہتر ہے۔۔۔۔تو بھی سوچ لے، میں بھی سوچ لیتا ہوں۔"

"اور میرا خیال ہے کہ تو یہاں سے نکل جا۔ میرے بندے بھڑک گئے تو پھر تیرے لیے منجی (چارپائی) منگوانی پڑے گی۔"

"تیرے بندوں میں اتنا ساہ ست نہیں ہے لیاقتے۔" میں نے اعتماد سے کہا۔

وہ ایک دم تن کر کھڑا ہو گیا۔اس کا رنگ خون کے دباؤ سے گہرا سانولا ہو گیا اور آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ وہ اپنی جسمانی قوت کے زعم میں مجھ پر پل پڑے گا پھر اس نے خود کو سنبھالا اور دروازے کی طرف اشارے کرتے ہوئے دہاڑا۔"جا چلا جا یہاں سے۔"

میں باہر نکل آیا۔کارندے اپنی لاٹھیاں سونتے مجھے گھور رہے تھے۔احاطے کے ایک کونے میں جواں سال لڑکا۔۔۔۔بہ دستور ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ایک عورت زمین پر بیٹھی لیاقت کے پہلوان نما کارندے سے معافیاں مانگ رہی تھی۔پتا نہیں وہ لڑکے کی ماں تھی یا بڑی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

بہن۔وہ ننگے سر تھی۔کارندوں کی تیز برچھی جیسی نظریں اس کے جسم سے آر پار ہو رہی تھیں۔وہ گھگیائی۔"اللہ واسطے! اب اسے گھر جانے دو۔میں کل تڑکے اسے پھر لے آؤں گی۔"

"تڑکے واپس لانے کی لوڑ نہیں۔" پہلوان نما شخص گرجا۔"یہ ابھی روپیا واپس کر دے، ابھی گھر چلا جائے۔"

چودھریوں، نمبرداروں اور دیہاتی بدمعاشوں کے ڈیروں پر یہ سب چلتا رہتا ہے۔اب پتا نہیں، یہ لڑکا کس عتاب میں گرفتار تھا۔شاید چوری یا قرضے وغیرہ کا معاملہ تھا۔

میں تانگے پر بیٹھ کر واپس آ گیا۔راستے میں دو تین دیہات میں ٹھہرا۔دو چودھری صاحبان سے ملا۔ایک دیہہ کے دو چار معزز لوگوں سے بات کی۔میں نے اندازہ لگایا کہ "قلعہ والا" کا راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ سارے ہی نالاں ہیں مگر خوامخواہ لیاقت کالے کے متھے لگنا نہیں چاہتے۔ان میں سے ایک چودھری رمضان تو لیاقت کو باقاعدہ بھتا بھی دیتا تھا۔

میں رات گئے راجوال واپس پہنچا۔ رونق میرا انتظار کر رہا تھا۔ ملازموں کی زبانی پتا چلا کہ وہ کئی بار میرے بارے میں پوچھ چکا ہے۔ میں نے رونق کے پاس جانے سے پہلے گرم چادر کی بکل مار لی۔ میں اپنی گردن کی وہ تازہ خراشیں چھپانا چاہتا تھا جو آج دوپہر لیاقت کے کارندوں کے ساتھ ہاتھا پائی میں آئی تھیں۔

رونق علی شنیل کا لحاف ٹانگوں پر لیے نیم دراز تھا اور بیٹری والا ریڈیو سن رہا تھا۔ "ہاں بھئی، خیر خیریت ہے نا؟"

"بالکل خیریت ہے اور آپ کی نیک مطلوب ہے۔"

"لیاقت سے ملاقات ہوئی؟"

"بالکل ہوئی۔ آپ کسی طرح کی کوئی پریشانی نہ لیں۔ ایک دو دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"پر یار! تفصیل تو بتا۔"

"تفصیل شفصیل کوئی نہیں۔" میں نے رونق علی کے انداز میں کہا۔ "آپ خمیرہ شمیرہ کھا کر آرام سے سو جائیں۔" میں نے دیسی گھی کی ریوڑیوں والا لفافہ اس کے لحاف میں سرکا دیا۔

اگلے دو دن میں نے بڑے اطمینان سے انتظار کیا کہ شاید کوئی اچھی تبدیلی رونما ہو جائے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ راستہ کھلا اور نہ پنچایت بیٹھنے کا کوئی ذکر ہوا۔ تیسرے روز میں صبح سویرے اپنے پنڈ پہنچ گیا۔ وہاں سے میں نے اپنے لنگوٹیے یار تیمور کو اور ایک دوسرے دوست نادر کو لیا اور پروگرام کے مطابق نہر کی پٹڑی پر پہنچ گیا۔ یہ وہی نہر تھی جو قلعہ والا کے پاس سے گزرتی تھی۔ مجھے ایک دن پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ لیاقت کالا کسی باغ پر اپنا ناجائز قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ہر سوموار اور جمعہ کو قریبی موضع بوریکی میں آتا ہے اور آج جمعہ تھا۔

ہم پٹڑی کے پاس ہی اپنی گھوڑیاں درختوں میں باندھ کر گھاس پر چادریں بچھا کر بیٹھ گئے اور گپ شپ لگانے لگے۔ رات کی سیاہی چھٹ گئی اور دن کا اجالا تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ مگر اس اجالے کو بھی گہری دھند نے ڈھانپ رکھا تھا۔ چاروں طرف اوس میں بھیگے ہوئے مکئی کے کھیت تھے اور خاموشی تھی۔ ہمارے اندازے سے کوئی ایک گھنٹہ تاخیر کے ساتھ لیاقت

کالا اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ کھیتوں کے درمیانی راستے پر پہنچا۔ وہ اپنے مقبوضہ باغیچے کی طرف جارہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لیاقت کی ڈب میں ہر وقت بھرا ہوا پستول رہتا ہے۔ ایک پستول ہمارے پاس بھی موجود تھا۔ یہ تیمور کی گرم چادر کے نیچے تھا۔ تیمور کے پاس شاموں والی چمکیلی لاٹھی بھی تھی۔ ایک ایسی ہی لاٹھی میرے پاس بھی تھی۔۔۔۔۔ اسے "چوڑیوں والی لاٹھی" بھی کہا جاتا ہے۔ بہ وقت ضرورت اس پر برچھی یا چھری چڑھائی جاسکتی ہے۔ ایک تیز چھری میں نے اپنے تہ بند کی ڈب میں لپیٹی ہوئی تھی۔ اس سخت سردی میں بھی لیاقت کالے نے پتلی سی قمیص پہنی ہوئی تھی اور اس کا گریبان کھلا ہوا تھا۔ یہ بھی اپنی جسمانی طاقت کا رعب گانٹھنے کا ایک طریقہ تھا۔ تین دن پہلے میں نے اسے ڈیرے پر بھی ایسے ہی لباس میں دیکھا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔ مجھے پہچان کر لیاقت کالے کا چہرہ پہلے متغیر ہوا پھر اس کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔" اس نے نتھنے پھلائے۔

"ہاں، یہی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے تجھے بندے کا پتر بننے کا مشورہ دیا تھا پر تو نہیں بنا۔"

لیاقت کا ہاتھ اپنی ناف کی طرف بڑھا۔

میں نے تیزی سے وارننگ دی۔ "دیکھ لیاقے! پستول ہمارے پاس بھی ہے۔ گولی چلی تو پھر دونوں طرف سے چلے گی۔"

وہ جست لگا کر اپنی مشکی گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور میرے عین سامنے آکر بولا۔ "کیا چاہتا ہے تو؟"

"ہتھ جوڑی۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

لیاقت کے توانا بازوؤں کی مچھلیاں جیسے پھڑک اٹھیں۔ اس نے مجھے سرتاپا گھورا۔ وہ تن و توش میں مجھ سے زیادہ تھا۔ ہتھ جوڑی کے لفظ نے اس کے پورے جسم میں جیسے برقی رو دوڑا دی۔ ہمارے علاقوں میں "ہتھ جوڑی" کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ بھی ہوتی ہے کہ دو بندوں کی لڑائی میں کوئی تیسرہ بندہ دخل نہیں دے گا۔ لیاقت نے دانت پیسے اور زیر لب بڑبڑا کر مجھے کوئی گالی دی۔ میرے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اس نے بھی اپنے ایک ساتھی کے ہاتھ سے لاٹھی پکڑ لی۔ اس کی آنکھوں میں دم بہ دم خون اترتا آرہا تھا۔ چہرہ طیش سے بھیانک ہو گیا تھا۔ میرے اور لیاقے کے درمیان چھوٹا سا مکالمہ

ہوا جس کا اختتام ایک چنگھاڑ پر ہوا۔ لیاقت نے اس چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر لاٹھی کا پہلا وار کیا تھا۔ اگلے تین چار منٹ میں میرے اور لیاقت کے درمیان زوردار لاٹھیاں چلیں۔ میں نے اپنے سر پر پگڑی کس لی تھی لیکن لیاقے نے اپنے طاقت کے گھمنڈ میں یہ تکلف نہیں کیا تھا۔ نتیجے میں میرے ایک زور دار وار سے اس کا سر پھٹ گیا اور خون چہرے پر بہہ آیا۔ مجھے بھی گردن اور کندھوں پر دو سخت چوٹیں لگیں لیکن میں جما رہا۔ لیاقت لڑنے کے ساتھ ساتھ گالیاں بھی بک رہا تھا۔ اچانک اس کی لاٹھی میرے وار سے ٹوٹ گئی۔ میں نے اس موقع پر اسے پہلی گالی دی اور اسے دوسری لاٹھی لینے کا موقع دیا۔

ایک بار پھر مکئی کے کھیتوں میں گہری دھند کے اندر کھٹا کھٹ لاٹھیاں چلنے لگیں۔ نہر کی پٹڑی پر سے لوگ گزر رہے تھے۔ کئی سائیکل اور تانگا سواروں نے تماشا دیکھنے کے لئے اپنا رخ مکئی کے کھیتوں کی طرف موڑ لیا۔ اگلے صرف تین چار منٹ کے اندر نہ صرف گھمنڈی کا گھمنڈ ٹوٹا بلکہ اس کی دائیں کلائی بھی ٹوٹ گئی۔ لڑائی کے بالکل آخری مرحلے میں لیاقت نے دائیں ہاتھ سے اپنا پستول نکالا تھا۔ میں نے لاٹھی کے جچے تلے وار سے نہ صرف اس کی کلائی کی موٹی ہڈی توڑ دی بلکہ پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ تیمور نے بھاگ کر پستول

اپنے قبضے میں لے لیا۔ میں نے لاٹھی سے ہی لیاقت کی ٹھیک ٹھاک مار لگائی اور لہولہان کر دیا۔ اس کے دونوں ساتھی دم بہ خود کھڑے تھے۔ یہاں درجنوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ لیاقت کے ساتھیوں کو معلوم تھا کہ اس موقع پر انہوں نے دخل اندازی کی تو لوگ ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔ لیاقت بے دم ہو گیا تو میں پیچھے ہٹ گیا۔

اگلے صرف دس بارہ گھنٹوں میں لیاقت کی درگت کی خبر دور و نزدیک پھیل گئی۔ میں راجوال پہنچا تو مجھ سے پہلے ہی یہ خبر وہاں بھی پہنچ چکی تھی۔ سب حیران تھے مگر ابھی تک کسی کو یہ پتا نہیں تھا کہ لیاقت کالے کو دوبدو مقابلے میں چاروں شانے چت کرنے والا ہے کون؟

میں سیدھا رونق علی کے پاس پہنچا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس نے پُرجوش انداز میں میرا شانہ تھپکا اور میری خیر خیریت دریافت کی۔ ویسے تو میرے پنڈے پر بھی کئی چوٹیں آئی تھیں مگر نظر آنے والی چوٹ گردن اور ٹھوڑی کی تھی۔ خون وغیرہ نہیں نکلا تھا، بس سوزش تھی۔

"اوئے! تُو تو چھپا رستم نکلا خاورے۔۔۔۔۔ کمال کر دیا۔ تجھے پتا لگا ہے۔ بوریکی کے کچھ لوگوں نے بھی لیاقے کے بندوں کی پھینٹی لگائی ہے اور انہیں باغ سے نکال باہر کیا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا ہے۔"

"ایک اور اطلاع ہے۔۔۔۔ پولیس نے لیاقت کا بالکل ساتھ شاتھ نہیں دیا۔ بوریکی کے تھانیدار نے کہا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے۔ بلکہ نئی اطلاع کے مطابق وہ ایم پی اے بھی لیاقت کو برا بھلا کہہ رہا ہے جسے یہ اپنا ماما، چاچا بتاتا ہے۔"

"کیا خیال ہے رونق بھائی! اب والی صاحب میری اس کاروائی کی ذمے داری قبول کریں گے؟"

"ضرور کریں گے اور انہیں کرنی چاہیے۔ میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ بڑے حیران شیران ہو رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ یہ منڈا تو ہر فن مولا لگتا ہے۔ کہاں ماسٹری، کہاں ڈنڈا سوٹا اور کہاں حکمت سنیاسی کی باتیں۔ میرا خیال ہے، وہ ابھی تمہیں اپنے پاس بلائیں گے۔"

قریباً آدھ گھنٹے بعد والی صاحب سے میری ملاقات ان کے کمرے میں ہوئی۔ انہوں نے مجھے دستی شاباش دی اور اپنے ساتھ بٹھا کر دودھ پتی پلائی۔ کچھ دیر کے لئے بیگم جی بھی کمرے میں آئیں۔ ان کے چہرے سے بھی خوشی اور تعریف کا اظہار ہوتا تھا۔ انہیں دیکھ کر پتا نہیں

کیوں مجھے لگا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، اس کے پیچھے بیگم جی کی ہی دی ہوئی طاقت اور توانائی تھی۔ کافی دیر اس اہم واقعے کے بارے میں بات ہوتی رہی۔

سردی میں اضافے کی وجہ سے والی جی کے ایک گھٹنے میں درد تھا۔ اسی وجہ سے وہ مردانے میں نہیں آسکے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں کل ان کے دوالے کر آؤں گا۔ وہ بولے۔" تم سنیاسی کو یہیں لے آنا۔ ایک دو دن اس کی خدمت بھی ہو جائے گی۔۔۔۔ اور وہ ٹھیک سے دیکھ بھی لے گا۔"

"یہی تو مسئلہ ہے والی جی! وہ کہیں جاتا نہیں ہے۔ بالکل من موجی ہے۔ اس کا تو کوئی ایک ٹھکانا بھی نہیں۔ ہر بار اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے۔"

اور یہ باتیں صحیح تھیں۔ بابا عیسیٰ گلے میں جھولا لٹکائے اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا تھا۔ ضرورت مند پوچھ پاچھ کر اس تک پہنچتے تھے۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک اور اچھی خبر ملی۔ پتا چلا کہ قلعہ والا کا بند راستہ کھل گیا ہے اور لوگوں کی آزادانہ آمد و رفت شروع ہو گئی ہے۔ صحیح کہتے ہیں، جب خوف و ہراس کا بت ٹوٹتا ہے تو اس کے گرنے سے دہشت کی پوری عمارت ہی ملیامیٹ ہو جاتی ہے۔

لیاقت کالے والے واقعے کے بعد حویلی میں میری اہمیت بڑھ گئی۔میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا۔اس کے علاوہ مجھے کبھی کبھی ان مشوروں میں بھی شریک کیا جانے لگا جن میں حویلی کے خاص لوگ شریک ہوتے تھے۔ان خاص لوگوں میں والی جی کا تایازاد بھائی چودھری عزیز، رونق علی، چاچا عسکری اور منشی منظور وغیرہ شامل تھے۔میں نے سب سے بنا کر رکھی ہوئی تھی، اس لیے میری موجودگی سب کے لئے قابل قبول تھی۔لیاقت کالا بالکل دب گیا تھا۔اس کا پشت پناہ ایم پی اے بھی اس کے مخالف ہو گیا تھا۔اس نے ایک ملاقات میں والی جی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔

حامد کی پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔میں روزانہ سہ پہر کے وقت تقریباً تین گھنٹے اس کام میں صرف کرتا تھا۔حامد لاڈ پیار سے بگڑا ہوا بچہ تھا۔اڑیل گھوڑے جیسا۔۔۔۔۔جس پر غلبہ پانے کے لئے خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔میں نے اس کی دلچسپیاں دریافت کر لی تھیں اور ان دلچسپیوں کے ذریعے اس پر کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔حامد کی پڑھائی کے وقت اکثر بیگم جی سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔وہ ان پڑھ تھیں مگر ان کی گفتگو میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ تھا۔وہ ہمدرد بھی تھیں۔ملازموں سے ان کا سلوک بڑا اچھا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ ملازموں کو اکثر استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں دیتی رہتی تھیں لیکن بخشش کے انداز میں نہیں، تحفے کے انداز میں ہوتی تھی۔میں نے محسوس کیا تھا کہ اپنے ارد گرد والوں کو تحفے تحائف دے کر وہ بڑی خوشی محسوس کرتی ہیں۔خاص طور سے تہواروں اور خاص خاص موقعوں پر وہ اس معاملے میں بڑی سرگرم نظر آتی تھیں۔

میں حامد کو پڑھانے جاتا تو وہ اکثر اپنے ہاتھ سے بنی ہوئی کوئی چیز میرے کھانے کے لیے بھیج دیتیں یا خود لے آتیں۔وہ مرغ پلاؤ بہت مزیدار بناتی تھیں۔

ایک دن انہوں نے گاجر کا حلوہ بھیجا جو دیسی گھی میں تربتر تھا۔اس میں بادام اور ابلے ہوئے دیسی انڈے تھے۔میں حلوہ کھا چکا تو وہ سبز چائے لے کر آ گئیں۔"یہ آپ اتنی تکلیف کیوں کرتی ہیں؟"

"تکلیف نہیں ہمدردی ہے۔" وہ مسکرائیں۔"حلوہ کھا کر گرم گرم چائے نہ پئیں تو اکثر گلا خراب ہو جاتا ہے۔"

"لگتا ہے، آپ گلے کی بہت احتیاط کرتی ہیں۔اسی لیے آپ کا گلا اتنا صاف ہے۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔"پرسوں "ترنجن "میں آپ عورتوں میں بیٹھی ہوئی ہیر گا رہی تھیں۔آواز یہاں تک پہنچ رہی تھی۔آپ اچھا گاتی ہیں۔"

بیگم جی کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔یوں لگا کہ ایک لحظے کے لئے کوکے کا لشکارا بھی بڑھ گیا۔وہ ذرا سا شرمائیں پھر سنبھل کر بولیں۔"نہیں۔۔۔۔وہ تو ایسے ہی تا جو مجھے کھینچ کر لے گئی تھی۔"

"اسی لیے لے گئی تھی نا کہ آپ کی آواز اچھی ہے۔"میں نے صدقِ دل سے کہا۔

"اچھا،چا پیو۔۔۔۔ٹھنڈی ہو جائے گی۔"انہوں نے بات بدلی اور تیزی سے باہر چلی گئیں۔

نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ میری "تعریف "بیگم جی کو بری نہیں لگی۔۔۔۔شاید اچھی لگی ہے اور یہ بے جا تعریف بھی نہیں تھی۔ان کی آواز واقعی دلکش تھی۔اس سے پہلے ملازمہ فیروزاں نے مجھے بتایا تھا کہ بیگم جی بڑی اچھی ہیر گاتی ہیں۔پرسوں اس کا ثبوت بھی مہیا ہو گیا تھا۔ابھی ترنجن جاری تھا اور امید تھی کہ جلد ہی دوبارہ یہ آواز سننے کو ملے گی۔۔۔۔"ترنجن "کا مطلب ہوتا ہے عورتوں کا مل بیٹھ کر چرخا کاتنا اور گپ شپ لگانا۔

گزرنے والے وقت کے ساتھ یہ خوبصورت مصروفیات ناپید ہو رہی ہیں لیکن دور دراز علاقوں میں ابھی ان کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا۔خاص طور سے جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں، یہ مصروفیات موجود تھیں۔ترنجن عام طور پر سردیوں کی طویل راتوں میں ہوتا ہے۔جب عورتیں لحاف پیٹ کر یا پھر مٹی کی انگیٹھیاں جلا کر چرخوں پر سوت کاتتی ہیں۔گیت گائے جاتے ہیں۔اٹکھیلیاں ہوتی ہیں۔چڑوے،ریوڑیاں اور باداموں والا گڑ،ترنجن کی خاص سوغاتیں ہیں لیکن سردیوں میں کبھی کبھی کھلی ہوئی دھوپ میں بھی چرخے کاتے جاتے ہیں۔ تین چار روز بعد ایسا ہی ہوا۔اس سہ پہر کو حامد کو پڑھانے گیا تو پتا چلا کہ لڑکیوں اور جوان ملازماؤں نے صحن میں چرخے رکھے ہوئے ہیں اور سوت کاتا جا رہا ہے۔

میں نے حامد کو پڑھانا کیا تھا،میرا دھیان مسلسل ان آوازوں کی طرف لگا رہا جو صحن سے ابھر رہی تھیں۔میرا دل چاہا کہ کم از کم ایک نظر تو صحن میں ڈالوں۔حامد نے تختی ٹھیک ہی پوچی تھی مگر میں نے پھر سے پوچنے کے لیے صحن میں بھیج دیا۔وہ چلا گیا تو میں نے ساتھ والے کمرے میں جا کر کھڑکی ذرا سی کھولی اور صحن میں جھانکا۔تین عورتوں میں تیزی سے کاتنے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ان کے قریب روئی کی کٹی پونیاں رکھی تھیں اور انہیں جلد از جلد ان پونیوں

کو ختم کرنا تھا۔ان تینوں میں سے ایک بیگم جی تھیں۔چرخے پر ان کا دایاں ہاتھ تیزی سے
چل رہا تھا۔چوڑیاں رنگ برنگی جھلک کھا رہی تھیں۔مشقت سے ان کا چہرہ انار کی طرح
سرخ تھا۔روئی کی پونی کو تکلے سے لگاتیں پھر دھاگا بٹنے کے لئے ہاتھ کو اوپر تک اٹھاتیں۔ان
کی اوڑھنی ڈھلک گئی تھی اور جسم نمایاں ہو رہا تھا۔

ایک بڑی عمر کی عورت چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔"بلقیس بس تین پونیاں رہ گئی ہیں۔جلدی کر
جلدی کر۔"

میں نے ایک جھلک دیکھ کر کھڑکی بند کر دی۔کچھ دیر بعد زبردست شور ابھرا۔"جیت
گئے۔۔۔۔جیت گئے" کی آوازیں بلند ہوئیں۔شاید ایک دوسری عورت جیت گئی تھی۔

جیتنے والیوں نے گدا ڈالنا شروع کر دیا۔یہ تالیاں بجا کر ناچنے کا ایک انداز ہوتا تھا۔میں واپس
آ کر بیٹھ چکا تھا۔حامد بھی تختی سخت دھوپ میں ڈال کر لوٹ آیا تھا۔آتے آتے وہ زردے
کی پلیٹ لایا تھا۔باہر ترنجن کا ہنسی کھیل جاری تھا۔پانچ دس منٹ بعد میرے خون میں میٹھا
میٹھا درد جاگ گیا۔باہر بیگم جی ہیر گا رہی تھیں۔مجھ تک بہت مدھم آواز ہی پہنچ رہی تھی مگر
جتنی پہنچ رہی تھی،دل میں اتر رہی تھی۔پتا نہیں کیوں۔۔۔۔پتا نہیں کیوں،مجھے لگا جیسے

بیگم جی مجھے سنانے کے لیے گا رہی ہیں۔حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا پھر بھی "دل خوش
فہم" یہی سوچ رہا تھا۔

اسی دوران میں کھنکھارنے کی آواز آئی اور والی جی ایک ملازم سمیت اندر آ گئے۔میں نے
کھڑے ہو کر سلام کیا۔مودب ملازم نے جلدی سے رنگین پایوں والی کرسی والی جی کے
قریب کر دی۔وہ بیٹھ گئے۔انہوں نے قیمتی گرم شال لپیٹ رکھی تھی۔تلے دار کھسا چمک رہا
تھا۔وہ کچھ دیر تک اپنی جوان بیوی کے گانے کی مدھم آواز سنتے رہے پھر آواز بند ہو گئی اور وہ
میری طرف متوجہ ہو گئے۔

انہوں نے حامد کی پڑھائی وغیرہ کے بارے میں پوچھا پھر بولے۔"پچھلے ہفتے پہرے دار
ملازموں میں سے سات آٹھ بندے کام چھوڑ گئے ہیں۔یہ ایک ہی پنڈ کے تھے۔ان کی خالی
جگہ پُر کرنی ہے۔اس کے علاوہ میں چاہتا ہوں کہ ڈیرے اور حویلی کے لیے کم از کم تین
درجن بندے اور بھرتی کیے جائیں،عسکری کہہ رہا تھا کہ تیس چالیس گھوڑے بھی اب
بالکل تیار ہیں۔اور ان کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔"

"میرے لیے کوئی حکم ہو تو بتائیں جی۔"

"تمہارے پنڈ سے کچھ جنے (بندے) نکل آئیں گے ؟"

"کیوں نہیں جی۔۔۔۔۔کچھ نہیں تو سات آٹھ منڈے تو اپنی برادری میں ہی ہوں گے۔ پنڈ سے بھی دس پندرہ کا انتظام ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے، یہ کام کرو تم۔ اگر کسی کے پاس اپنی رائفل اور لائسنس ہو تو یہ اور بھی چنگی بات ہے۔ اس کو زیادہ تنخواہ دیں گے۔"

"آپ بے فکر رہیں جی! بندوبست ہو جائے گا۔۔۔۔۔ لیکن میرا ایک مشورہ ہے اگر آپ برا نہ مانیں تو۔"

"کہو کہو۔"

"اس سے پہلے یہ کام چاچا عسکری کرتا تھا۔ بہتر ہے کہ ہم اب بھی اسے ہی اس کام میں آگے رکھیں میرا مطلب ہے وہ کسی طرح محسوس نہ کرے۔"

والی جی نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا اور میرا مدعا سمجھتے ہوئے بولے۔ ""ٹھیک ہے۔ میں اس سے کہوں گا کہ وہ تم سے لڑکوں کی بھرتی کے بارے میں مشورہ کرے۔۔۔۔۔ پر یہ کام کرنا تم نے ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے جی! میں پرسوں تک پنڈ چلا جاؤں گا۔ ایک دو دن مجھے وہاں رہنا پڑے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ تم آج ہی چلے جاؤ۔ بدھ تک واپس آ جاؤ گے بدھ کو مجھے کوس پور جانا ہے۔ ایک دوست کے پتر کی شادی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی ساتھ ہی چلو۔"

"مم۔۔۔۔۔ میں؟"

"ہاں، ذرا گھوم پھر آؤ گے۔" والی جی نے کہا۔

میری سمجھ میں یہی آیا کہ شاید والی جی مجھے محافظ کی حیثیت سے لے جانا چاہتے ہیں۔ لیاقت کالے والے واقعے کے بعد وہ مجھ پر خاصا اعتماد کرنے لگے تھے۔۔۔۔۔ اور میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ والی جی کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ کوئی پریشانی جو آج کل انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ لڑکوں کی بھرتی کی بات کر رہے تھے۔۔۔۔۔ وہ پچھلے قریباً آدھ گھنٹے

سے میرے پاس بیٹھے تھے اور میں ایک اور چیز نوٹ کر رہا تھا۔ اپنی گرم شال کے اندر والی جی کا بایاں ہاتھ بے حرکت تھا۔ شاید وہ کوئی چوٹ وغیرہ لگی تھی جسے وہ چھپا رہے تھے۔

والی جی کے ساتھ جانے والی بات سے میرے دل میں کُھد بُد ہوئی۔ وہ شادی پر جانے کی بات کر رہے تھے۔ امید تھی کہ بیگم جی بھی ساتھ ہوں گی۔

اسی روز چاچے عسکری سے میرا مشورہ ہوا۔ میں نے چاچے عسکری کو ساتھ لیا اور اپنے پنڈ چلا گیا۔ چاچا عسکری قریباً 48 سال کا تھا۔ دس پندرہ سال پہلے وہ یقیناً شہ زور رہا ہوگا۔ اب بھی وہ دو تین بندوں کو آسانی سے لمبا لٹا سکتا تھا۔ وہ اسلحہ شناس بھی تھا۔ گھوڑوں، عقابوں اور کتوں کے بارے میں اس کی معلومات وسیع تھیں۔ اس کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزرا۔

دو تین دن میں ہم نے پنڈ سے ایک درجن بندے "جاگیر" کی ملازمت کے لیے چن لیے۔ ان میں میرا قریبی یار تیمور اور ایک چچیرا بھائی باگو بھی تھا۔ بہن اور بے بے میری ترقی دیکھ کر خوش تھیں۔ میری مالی حالت بھی اب کچھ بہتر تھی۔ میں نے عارفہ اور بے بے کو نئے کپڑے سلوانے کے لیے پیسے دیے اور گھر کے خرچے کے لیے بھی رقم دی۔

ہم نئی بھرتی کو لے کر راجوال واپس پہنچے تو والی جی کوس پور جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ وہ بھرتی کے سلسلے میں میری کارکردگی سے خوش ہوئے اور پانچ سو روپے نقد انعام دیا۔ حویلی میں گاڑی کے نام پر بس ایک جیپ تھی۔ یہ پرانے ماڈل کی لینڈ روور تھی۔ اس کا ڈرائیور صوفی اسلم زیادہ تر اسے ٹھیک ٹھاک کرانے میں ہی مصروف رہتا تھا۔ والی جی سفر کے لیے عام طور پر گھوڑا یا تانگا ہی استعمال کرتے تھے مگر آج یہ جیپ ذرا چمکی ہوئی تھی اور سفر کے لیے تیار نظر آتی تھی۔ جیپ کو اسٹارٹ حالت میں دیکھنے کے لیے راجوال کے بہت سے بچے اس کے ارد گرد جمع ہو چکے تھے۔ صوفی اسلم جیپ کو اندر باہر سے چیک کر رہا تھا ۔۔۔۔ جیسے یہ جہاز ہو اور صوفی اسلم پائلٹ!

میرے اور عسکری کے علاوہ دو افراد اور تھے جنہیں گھوڑوں پر سوار جیپ کے پیچھے رہنا تھا۔ عسکری کے پاس رائفل تھی۔ میرے پاس پستول جبکہ باقی دونوں افراد لاٹھیوں اور چھوٹے دستے کی کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔

ہم بارہ بجے کے قریب روانہ ہوئے۔ جیپ میں والی جی، حامد، رونق علی اور بیگم جی کے علاوہ ان کی کوئی رشتے دار عورت بھی تھیں۔ اس کے علاوہ ہیڈ ملازمہ فیروزاں تھی جو ہمیشہ سے

زیادہ چوکس نظر آتی تھی۔ بیگم جی شال میں لپٹی ہوئی تھیں۔ تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زرق برق لباس میں ہیں۔ جیپ میں داخل ہوتے وقت انہوں نے مجھے دیکھا۔ نگاہوں کے ٹکراؤ سے جیسے ایک شعلہ سا لپک گیا۔

یہ بڑا مزیدار سفر تھا۔ کچے پکے راستے، کماد، مکئی اور سرسوں کے کھیت! ان کھیتوں پر پھیلی ہوئی سردیوں کی دھوپ اور ہلکی ہوا جو جیپ کی اڑاتی ہوئی گرد کو ہماری طرف لانے کے بجائے بائیں طرف دھکیل دیتی تھی۔

میں نے عسکری کے برابر گھوڑا دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ "چاچا! دن بڑے چھوٹے ہیں۔ ابھی شام ہو جائے گی، ہم چانن چانن میں کوس پور پہنچ جائیں گے؟"

"ہو سکتا ہے۔"

"پر تم تو کہتے تھے، راستے میں کسی چودھری رمضان کے گھر بھی رکنا ہے۔"

"مجھے لگتا ہے اگر ہمیں وہاں سے نکلنے میں دیر ہو گئی پھر آج رات وہیں رہیں گے۔ باقی کا پینڈا کل کر لیں گے۔"

ہمارے گھوڑے کسی جگہ جیپ کے قریب پہنچ جاتے تو حامد کھڑکی میں سے سر نکالتا اور پکارتا "ماسٹر جی!"

میں ہاتھ ہلا کر اسے جواب دیتا۔ ایک نہر کی پُلی پر گزرتے ہوئے اس نے مجھے اشارے سے قریب بلایا۔ میں گھوڑا بڑھا کر کھڑکی کے پاس گیا تو اس نے کیلوں کا ایک گچھا میری طرف بڑھا دیا۔ "ماسٹر جی! کاف۔۔۔۔۔ کیلا۔" وہ شوخی سے بولا۔

میرا اندازہ تھا کہ اس سفر میں والی جی کو کسی طرح کا خطرہ بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ علاقے میں ان کے کئی سجن دشمن موجود تھے۔ خطرہ واقعی موجود تھا۔ اور یہ پیش بھی آیا لیکن ایسا خطرہ تھا جس کے بارے میں والی جی نے سوچا تک نہیں ہو گا اور نہ ہی ہمارے ذہنوں میں تھا۔ یہ بالکل اور طرح کا خطرہ تھا اور بالکل اچانک سامنے آیا۔ اسے حادثہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

راستے میں ایک جگہ چھوٹی نہر کے کنارے بڑا اچھا منظر تھا۔ کیکر اور ٹاہلی کے درختوں کے نیچے دور تک سرسوں کے سبز اور زرد کھیت بچھے ہوئے تھے۔ بچے غلیلوں کے ذریعے چڑیاں مارتے پھر رہے تھے۔ سائفن میں کچھ لوگ ٹھٹھرے ہوئے پانی کے اندر جال سے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔۔۔۔۔ ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے سب لوگ جیپ میں سے نکل آئے۔

ہم نے گھوڑے کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے روک دیے اور ان کو بھی تازہ دم ہونے کا موقع دیا۔ میں گاہے بہ گاہے کن انکھیوں سے بیگم جی کو دیکھ لیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس ماحول سے بہت خوش ہیں۔ ان کے اندر ترنگ سی جاگی ہوئی تھی۔ وہ گہرے سانس لے رہی تھیں پھر انہوں نے جوتی اتاری اور تاجو کے ساتھ نہر کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈبو کر بیٹھ گئیں۔

والی کی مدھم آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ وہ بیوی کو کہہ رہے تھے۔ "ٹھنڈ لگ جائے گی۔ واپس آجاؤ۔"

انہوں نے شاید مسکراتے ہوئے سنی ان سنی کر دی۔ دفعتاً چلانے کی زوردار آواز آئی۔ یہ چھوٹا حامد تھا۔ وہ بیگم جی اور جیپ کے درمیان تھا۔ ہم بیگم جی سے کچھ فاصلے پر تھے۔ حامد کے چلانے کی وجہ شہد کی مکھیاں تھیں۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ شرارتی حامد نے مکھیوں کے ایک بڑے چھتے میں پتھر دے مارا تھا۔ اب مکھیاں سنسناتی ہوئی اس پر جھپٹ رہی تھیں، یہ بڑی مکھیاں تھیں۔ حامد نے چلاتے ہوئے زین پر ایک لوٹ لگائی۔

بیگم جی نے دیکھا اور اس کی طرف دوڑیں۔ ان کی جھپٹ میں ایک ماں کی ساری بے قراری شامل تھی۔ حامد تو دوڑ کر جیپ میں گھس گیا مگر بیگم جی کی قمیص کانٹے دار جھاڑیوں میں پھنس گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل گر گئیں۔

مکھیوں کا حملہ خوفناک تھا۔ میرے ساتھی گھڑ سوار اضطراری طور پر مخالف سمت میں بھاگے۔ ان میں سے دو نے نہر میں چھلانگیں لگا دیں۔ تاجو بھی نہر میں کود گئی۔ مکھیوں کی یلغار سے بچنے کے لیے جیپ کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے بیگم جی جیپ اور نہر کے درمیان بالکل تنہا نظر آئیں۔ میں دیوانہ وار آگے بڑھا۔ پندرہ بیس قدم کا فاصلہ طے کرتے کرتے میں نے اپنی گرم موٹی چادر اپنے جسم سے اتار لی تھی۔ میں نے یہ چادر بیگم جی کے اوپر پھینکی اور ان کے بالائی جسم کو ڈھانپ دیا۔

جیپ کی گرد سے بچنے کے لیے ہم نے چہروں پر منڈاسے باندھ رکھے تھے۔ میرا چہرہ تو بچا رہا مگر مکھیاں ٹھک ٹھک کی آواز کے ساتھ میرے ہاتھوں اور سینے سے ٹکرائیں۔ یہ بڑا تکلیف دہ ڈنک ہوتا ہے تاہم اس وقت میرا سارا دھیان ہی بیگم جی کی طرف تھا۔ کانٹے دار خشک جھاڑیوں نے انہیں پکڑا ہوا تھا۔ میں نے زور لگا کر انہیں اپنی طرف کھینچا، ان کی ریشمی قمیص

پہلو سے بغل تک پھٹتی چلی گئی۔ میں نے انہیں اپنے کلاوے میں لے لیا اور چادر سمیت انہیں جیپ کے اندر پہنچا دیا۔ وہ اپنے پاؤں پر چل کر ہی گئی تھیں تاہم ان کا تین چوتھائی وزن میرے بازوؤں پر تھا۔

والی جی نے مجھے بھی جیپ کے اندر کھینچ لیا۔ چند مکھیاں اندر بھی گھسیں انہوں نے دو چار جگہ ڈنک بھی چلائے مگر انہیں مار دیا گیا۔

بیگم جی نے اوپر سے چادر ہٹائی۔ انکا پہلو اوپر تک عریاں نظر آرہا تھا۔۔۔۔ اپنے زیریں لباس کو چھپانے کے لیے انہوں نے پھر چادر اپنے گرد لپیٹ لی۔

"تم ٹھیک تو ہو نا؟" بیگم جی نے حامد کو سر تا پا ٹٹولا۔

اس نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ فساد کی جڑ تھا، تاہم معجزانہ طور پر اسے ایک دو ڈنگ ہی لگے تھے۔ خوشی اور غصے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بیگم جی نے اسے کئی طمانچے رسید کیے۔ "خبیث۔۔۔۔ الو کا پٹھا۔" ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فیروزاں نے حامد کو کھینچ لیا۔

میرے ہاتھوں اور چھاتی پر ڈنک لگے تھے۔ والی جی نے پُر تشویش لہجے میں کہا۔ "تمہیں تو کافی کاٹا ہے۔"

ڈرائیور اسلم جیپ کو چلا کر نہر کے کنارے لے گیا۔ مکھیاں اب منتشر ہو رہی تھیں۔ غلیلیوں سے شکار کرنے والے بچے بھاگ گئے تھے۔ دور سائفن پر مچھلیاں پکڑتے ہوئے دیہاتی بھی خوف زدہ دکھائی دے رہے تھے۔ تاجو تیراک تھی۔ وہ ٹھوڑی تک پانی میں ڈوب کر بیٹھی ہوئی تھی۔ جب خطرہ ٹل گیا تو وہ باہر نکل آئی اور بھیگے کپڑوں کے ساتھ بھاگ کر جیپ میں گھس آئی۔

ڈرائیور اسلم نے ایک سیٹ کے نیچے سے لوہے کی ایک بڑی چابی نکالی۔ رونق علی نے کہیں سے ایک "پانا" ڈھونڈ لیا جہاں جہاں ڈنک لگے تھے وہاں لوہے کے ان اوزاروں کو رگڑا جانے لگا۔

میں جیپ سے باہر نکل آیا۔ عسکری نے کہا۔ "تمہارا گھوڑا کہیں بھاگ گیا ہے۔"

واقعہ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ باقی دو گھڑ سوار اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

قریباً آدھ گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد گھوڑا دستیاب ہوا۔ اسے کافی ڈنک لگے تھے۔ ہم نے چن چن کر یہ ڈنک نکالے۔ اس کی حالت مزید سفر کے قابل نہیں تھی۔ وہ مسلسل اچھل رہا تھا اور بے قراری ظاہر کر رہا تھا۔ آنکھیں سوجن سے بند ہوتی جا رہی تھیں۔

میں نے والی جی سے کہا۔ "اگر آپ چاہتے ہیں تو میں اسے لے کر واپس چلا جاتا ہوں۔"

"نہیں نہیں، تم ساتھ رہو گے۔" والی جی نے جلدی سے کہا۔

پھر انہوں نے عسکری کے ایک ساتھی کو ہدایت کی کہ وہ زخمی گھوڑے کو لے کر واپس چلا جائے۔

رونق علی اور تاجو کے سوا تقریباً سبھی کے چہرے محفوظ رہے تھے۔ رونق کی اسی آنکھ کے نیچے ڈنک لگا تھا جو کچھ عرصہ پہلے جھگڑے میں بھی زخمی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھ ایک بار پھر بند ہوتی جا رہی تھی۔ یہ عجیب اتفاق تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود میں دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔

ہم قریباً ایک گھنٹے بعد وہاں سے روانہ ہوئے اور رات آٹھ بجے کے بعد چودھری رمضان کے گاؤں پہنچ سکے۔ چودھری ملک رمضان، والی جی کے دوست احباب میں سے تھا۔ میں نے

اندازہ لگایا کہ والی جی اور بیگم جی یہاں پہلے بھی آتے جاتے رہے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ حامد نے یہاں پہنچتے ہی حویلی کے لمبے لمبے برانڈوں میں بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی اور اہل خانہ سے گھل مل گیا تھا۔ ہمیں حویلی کے رہائشی حصے کے ساتھ ہی واقعی چھوٹے سے مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ جانوروں کو چارہ وغیرہ ڈال دیا گیا۔ ہمارے زخموں کی مرہم پٹی کے لیے مقامی حکیم صاحب فوراً پہنچ گئے۔ میری چھاتی اور بازوؤں پر جگہ جگہ چونا لگایا گیا۔ کھانے کے لیے بھی دوا دی گئی۔ "بخار ہو جائے گا۔۔۔۔ مگر پریشان نہیں ہونا۔" حکیم صاحب نے تسلی دی۔

"بخار تو ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے پیارے! آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔" یہ رونق علی کی آواز تھی۔ وہ مجھے آنکھ مارتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ لیکن نہیں وہ آنکھ نہیں مار رہا تھا۔ اس کی آنکھ ویسے ہی بند ہو گئی تھی۔

وہ میری تیاداری کے لئے آیا تھا۔۔۔۔ لیکن آدھ پون گھنٹے تک اپنی ہی سنا کر چلا گیا۔ میری حوصلہ افزائی کی اس نے صرف ایک بات کی اور وہ یہ کہ والی جی مجھ سے بہت خوش ہیں۔

رات تک مجھے خاصا تیز بخار ہو گیا۔ کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ملک رمضان نے کھانے میں جتنا بھی تکلف کیا تھا۔ سب دھرے کا دھرا رہ گیا۔ رات دس بجے کے قریب والی جی اور بیگم جی ملک رمضان کے ہمراہ میری مزاج پرسی کے لیے آئے۔ والی جی نے کہا۔

"اگر تکلیف زیادہ ہے تو تمہیں شہر بھیجنے کا انتظام کر دیتے ہیں۔"

"نہیں نہیں میں کل تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ہر گز قبول نہیں تھا کہ میں اس خوشگوار سفر سے علیٰحدہ کر دیا جاؤں۔۔۔۔۔ اپنے گھوڑے کی طرح!

دس پندرہ منٹ میرے پاس بیٹھ کر والی جی اٹھ گئے۔ باقی بھی چلے گئے۔ میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ اپنے سایے کو دیکھتا رہا جو لالٹین کی روشنی سے بن رہا تھا۔ والی جی کی موجودگی میں، میں نے اپنی کراہیں روکی ہوئی تھیں مگر ان کے جانے کے بعد پھر ہائے ہائے کرنے پر مجبور ہو گیا۔ درد کافی زیادہ تھا۔ اچانک ایک بار پھر مجھے خاموش ہونا پڑا۔ بیگم جی دوبارہ کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ ان کے ساتھ حامد بھی تھا اس کے ایک بازو پر بھی دو تین جگہ چونا لگا ہوا تھا۔ تاہم وہ اپنی پوری مستی میں تھا۔ "یہ کہتا ہے کہ میں نے بھی ماسٹر جی کا پتا لینا ہے۔" بیگم جی نے حامد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ "اب لو نا پتا۔" بیگم جی نے اسے ٹہوکا دیا۔

وہ تھوڑی دیر شرارت سے مسکراتا رہا پھر ایک دم کھلکھلا کر ہنسا اور واپس بھاگ گیا۔

"حامد۔۔۔۔۔ حامد!" بیگم جی اسے پکارتی رہ گئیں۔

"بڑا شیطان ہے۔" بیگم جی نے افسوس کے انداز میں کہا۔

"نہیں نہیں بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میں نے بیگم جی کو تسلی دی لیکن دل ہی دل میں میں نے بھی وہی کہا جو انہوں نے کہا تھا۔ "بڑا شیطان ہے۔۔۔۔۔ بلکہ شیطان کے بھی کان کاٹتا ہے۔ اگر کل ایک آدھ مکھی اس کی دھوتی میں بھی گھس جاتی تو تھوڑا سا سبق ملتا اسے۔"

بیگم جی ابھی تک میرے سرہانے کھڑی تھیں۔ "بخار بہت زیادہ تو نہیں؟" انہوں نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، وہ ذرا سا جھکیں اور ان کا نرم گداز ہاتھ میری پیشانی پر آ گیا۔ وہ چند لمحے تھے مگر جیسے صدیوں کی تاثیر رکھتے تھے۔ مجھے لگا کہ ان کے ہاتھ کا لمس میری روح تک اتر گیا ہے پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئیں، جیسے وہ کچھ اور کہنا سننا نہیں چاہتی

تھیں۔ بس انہوں نے وقت سے چند لمحے چرائے تھے، مجھے چھوا تھا اور باہر نکل گئی تھیں۔ میں ساری رات اس واقعے کے اثر کھویا رہا۔ اس لمس کو ہزار معنی پہناتا رہا اور خود ہی رد کرتا رہا۔

مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ درد اور بخار سے اتنی جلدی افاقہ محسوس ہوگا۔ بہر حال، اگلی صبح دس بجے کے لگ بھگ میں سو کر اٹھا تو خود کو کافی بہتر محسوس کیا۔ اب پتا نہیں، یہ بیگم جی کے ہاتھ کے لمس کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ بارہ بجے کے لگ بھگ ہم اس گاؤں سے اپنی اصل منزل کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ حکیم صاحب نے مجھے ڈھیر سارا پانی پینے کا مشورہ دیا تھا۔ والی جی نے مٹی کی دو چھوٹی صرائیاں صاف میٹھے پانی سے بھروائیں اور ایک محافظ کے گھوڑے پر لدوا دیں۔ یہ محافظ یہیں سے ہمارے ساتھ روانہ ہو رہا تھا۔ مجھے سختی سے ہدایت کی گئی کہ میں گاہے بہ گاہے یہ پانی پیتا رہوں۔

والی جی اور ان کی بیگم دونوں میرا بہت خیال رکھنے لگے تھے۔ خاص طور سے کل والے واقعے کے بعد ان کی توجہ مزید بڑھ گئی تھی۔ یہ بات طے ہے کہ جب مالک کسی نئے ملازم کو ضرورت سے زیادہ توجہ اور اہمیت دیتے ہیں تو اس کے ارد گرد اس کا کوئی نہ کوئی حاسد بھی

پیدا ہو جاتا ہے۔ میری بڑی احتیاط کے باوجود میرے بھی ایک دو حاسد پیدا ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک "حاسد صاحب" باقاعدہ ہمارے ہمسفر بھی تھے۔ ان کا ذکر میں بھی آگے چل کر کروں گا۔ میرے ساتھ جو بھی پیش آیا، میں بلا کم و کاست بیان کرتا چلا جا رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم ان میں سے کون سی چیز پڑھنے والوں کے لیے زیادہ دلچسپی کا باعث ہوں گی اور کونسی کم۔ بہر طور لکھ وہی رہا ہوں جو کچھ پیش آیا۔

ہم رات دس بجے کے قریب کوس پور پہنچے۔ یہاں ایک بڑے جنریٹر کے ذریعے لائٹنگ وغیرہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ چودھری کی کوٹھی نما حویلی رنگ برنگے قمقموں سے سجی ہوئی تھی۔ گاؤں کی دو چار گلیاں بھی روشنی سے آراستہ کی گئی تھیں۔ ڈھولک بج رہی تھی۔ ناچ گانے کی صدائیں دور ہی سے کانوں میں پڑنے لگیں۔ ہمارا استقبال بڑے اچھے طریقے سے کیا گیا۔ والی جی اور اہل خانہ کوٹھی نما حویلی میں چلے گئے۔ ہمیں مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں طویل برآمدوں میں صاف ستھرے بستر لگے تھے۔ مٹی کی انگیٹھیاں دہک رہی تھیں اور حقے بھی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ پہلے ہماری تواضع حسب رواج دودھ جلیبی سے کی گئی پھر دیگی کھانا آ گیا۔ رات مزے میں گزری۔ اگلے روز تک میری طبیعت بالکل فٹ ہو گئی۔

جو رہی سہی کسر تھی وہ بیگم جی یعنی بلقیس کی دید نے پوری کر دی۔ یہاں پہنچتے ہی بیگم بلقیس کو اہم حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ آج شام مہندی کی رسم تھی۔ پہلے لڑکی والوں نے مہندی لے کر آنا تھا۔ لڑکی والوں کو زچ کرنے کے لیے کون کون سے گانے گائے جائیں گے اور انہیں کس کس طرح سے نیچا دکھانے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ ساری منصوبہ بندیاں بیگم بلقیس اور ان کی ایک چھوٹی بہن فرزانہ کی ہدایت میں پروان چڑھ رہی تھیں۔ کبھی وہ عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ گانوں کی ریہرسل کرتی نظر آتی تھیں۔ کبھی مہندی گھوٹنے والیوں کا ہاتھ بٹاتی دکھائی دیتی تھیں۔ سہ پہر کے وقت میں نے بیگم بلقیس کو حویلی کی چھت پر دیکھا۔ وہاں وہ لڑکیوں کے ساتھ اوڑھنیوں اور چادروں کو بسنتی رنگ میں رنگ رہی تھیں۔

چاچا عسکری بولا۔ "دیکھ رہے ہو بیگم جی کو ہر جگہ یہی چمکتی نظر آتی ہیں۔ لگتا ہے کوئی الہڑ کڑی ہو۔"

"عام طور پر تو یہ چپ چپ ہی رہتی ہیں۔"

"اصل میں اپنی حویلی کے اندر سب ہی ان سے بڑے ہیں۔ والی جی بھی اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ باہر گھومنا پھرنا کم ہے۔ اس لیے جب کوئی ایسا خوشی کا موقع ہوتا ہے، یہ ایک دم کھل اٹھتی ہیں ویسے طبیعت کی بہت اچھی ہے یہ کڑی۔ سب تعریف کرتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ میری گرم چادر دیکھ رہے ہو نا۔ یہ میرے لئے اسپیشل وزیر آباد سے جا کر لائی تھی۔ ہر کسی کا خیال رکھتی ہے۔ مالی گلاب دین کی چار بیٹیاں ہیں۔ ان میں سے تین کے ہاتھ اسی کی کوشش اور مدد سے پیلے ہوئے ہیں۔"

شام ہوتے ہی مہندی کی رسم شروع ہو گئی۔ لڑکی والے بھی اسی گاؤں کے تھے۔ رنگ برنگے کپڑوں والی لڑکیاں اور عورتیں تیزی سے حویلی کے اندر آنے جانے لگیں۔ لالٹینوں اور موم بتیوں کی روشنی میں ان کا سرخی پوڈر اور گہنے چمک رہے تھے۔ ریشمی لاچوں اور کرتوں والے دیہاتی لڑکے پٹاخے چھوڑ رہے تھے اور کبھی کبھی ہوائی فائرنگ بھی کرتے تھے۔ پھر جنریٹر چل پڑا اور روشنیوں رنگوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس سارے ہنگامے میں میری نگاہ صرف اور صرف بیگم بلقیس کو ڈھونڈتی تھی۔ پتا نہیں کیوں میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ وہ بن ٹھن کر کیسی لگتی ہیں۔

کچھ دیر بعد لڑکی والے آ گئے۔ ہنگامہ عروج پر پہنچ گیا۔ ناچ کا مقابلہ ہوا، گانے گائے گئے، ایک دوسرے پر آوازیں کسی گئیں۔ ڈھولک تو لگتا تھا کہ پھٹ ہی جائے گی۔ آخر میں مہندی کے لیے چھینا جھپٹی ہوئی۔ تاہم یہ سب کچھ زنان خانے میں تھا۔ ہم صرف آوازیں سن سکتے تھے۔ پوری تقریب ختم ہو گئی مگر بیگم جی کی جھلک نہیں دیکھ سکا۔ رات کو افسردہ سا بستر پر پڑا تھا کہ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔ تاجو آئی اور اس نے بیگم جی کی طرف سے میرے بخار کا حال پوچھا۔

اگلے روز دوپہر کو معلوم ہو سکا کہ والی جی مجھے اصرار کے ساتھ یہاں کیوں لے کر آئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہاں مردانے کے احاطے میں لٹھی بازی کا نمائشی مقابلہ ہے۔

والی جی نے مجھ سے پوچھا۔ "کیسی طبیعت ہے خاورے؟"

"بالکل ٹھیک ہوں جی۔"

"تھوڑا سا شغل میلہ ہو جائے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جو آپ کا حکم ہو۔"

"لو تم نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ کیسا شغل میلہ۔ فٹ سے کہہ دیا جو حکم۔"

"جب حکم آپ کا ہے تو مجھے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

انہوں نے مسکرا کر تعریفی نظروں سے دیکھا اور بولے۔

"چودھری معشوق کے پاس بڑے پائے کے لٹھ باز ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام بلال ہے۔ سنا ہے تم نے یہ نام؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

والی جی بولے۔ "امرتسر کا جٹ ہے۔ بڑے مقابلے کیے ہوئے ہیں اس نے۔ پر مجھے لگتا ہے کہ تم اسے لٹھ بازی میں ہرا دو گے۔"

"اگر آپ کہتے ہیں تو میں کوشش کروں گا جی لیکن مجھے نہیں پتا کہ وہ کیسے لاٹھی چلاتا ہے۔"

"اتنی خاص نہیں ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، اندھوں میں کانا راجا۔ وہ تم سے پہلے ایک دو مقابلے اور بھی کرے گا۔ ان مقابلوں سے ہی تمہیں اس کے طور طریقے کا پتا چل جائے گا۔"

والی جی نے اگلے روز کا کہا تھا مگر مجھے اسی روز بلال کے طور طریقے کا پتا چل گیا۔ وہ حویلی کے باغیچے میں اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مشق کر رہا تھا۔ اس کا قد کاٹھ بڑا رعب دار تھا۔ ساڑھے چھ فٹ سے کم لمبائی نہیں ہو گی۔ چھاتی چوڑی اور بالوں سے بھری ہوئی تھی۔ اسکی شکل دیکھ کر ہی ایک عام بندہ دم بہ خود ہو سکتا تھا۔ لیکن دیکھنے والی آنکھ جب گہرائی میں دیکھتی ہے تو خامیوں خوبیوں کا پتا چل جاتا ہے۔ میں نے بلال کو صرف پانچ چھ منٹ دیکھا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا بایاں کندھا دائیں کندھے کی طرح تیزی سے کام نہیں کرتا۔ یقیناً اسے ماضی قریب میں کوئی چوٹ وغیرہ لگی تھی اور یہی چوٹ لٹھی بازی میں اس کی خفیہ کمزوری بن گئی تھی۔ اب وہ تجربے کی زور سے اپنی اس کمی کو پورا کر رہا تھا۔ شاید والی جی والی بات درست تھی۔ اندھوں میں کانا راجا! میرے دل نے گواہی دی کہ میں آسانی کے ساتھ اسے چت کر دوں گا۔

مگر اس رات ایک مزیدار واقعہ ہوا۔ بیگم بلقیس کی ہمراز نوکرانی تاجو میرے پاس آئی میں اس وقت حویلی کے پچھواڑے کھیتوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ بولی۔ "خاور! تمہارے لیے بیگم جی کا خاص سنا (پیغام) ہے۔"

میرا دل دھڑک اٹھا۔ "کیسا سنا؟"

وہ بولی۔ "تم کو تو پتا ہی ہو گا کہ کل لٹھ بازی کا مقابلہ ہونا ہے والی جی تمہارا مقابلہ یہاں کے ایک لٹھ باز بلال سے کرا رہے ہیں۔"

"ہاں، مجھے پتا ہے۔ تم اصل بات بتاؤ۔"

"اصل بات یہ ہے بھرا خاور کہ بلال بیگم جی کے پنڈ کا رہنے والا ہے۔ بیگم جی سے اس کی دور کی رشتے داری ہے۔ وہ بیگم جی کو بہن بھی کہتا ہے۔"

"تو پھر؟" میں نے پوچھا۔

وہ رازداری کا انداز اختیار کر کے بہت دھیمے لہجے میں بولی۔ "دراصل بیگم جی چاہتی ہیں کہ تم بلال کے ساتھ لڑائی نہ کرو۔ انہیں ڈر ہے کہ وہ تم سے ہار جائے گا اور اس کی بے عزتی ہو گی۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"بیگم جی چاہتی ہیں کہ تم بخار شخار کا بہانہ کر لو اور اس مقابلے میں حصہ نہ لو۔"

میرے دل میں پھلجڑی سی چھوٹی۔ایک ساتھ دو طرح کی خوشی محسوس ہوئی۔ پہلی خوشی اس بات کی کہ بیگم جی نے مقابلے سے پہلے ہی میری برتری کو محسوس کیا تھا۔دوسری یہ کہ انہوں نے مجھے اس قابل جانا تھا کہ اپنی ہمراز ملازمہ کے ہاتھ پیغام بھجوایا۔اس میں ایک طرح کی نہایت خوشگوار اپنائیت کا احساس تھا۔ظاہر ہے کہ یہ بیگم جی کا ہی پیغام تھا تاجو جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

مجھے یوں لگا، جیسے میں کل میدان میں اپنے حریف کو زیر کر لیتا اور سینکڑوں لوگ مجھے کندھوں پر اٹھا کر میری جیت کی خوشی مناتے اور مجھے پھولوں سے لاد دیتے تو بھی اتنی راحت نہ ملتی جتنی اب ملی ہے۔ کبھی کبھی بندے کو آزمائش کے بغیر سرخروئی اور مقابلے کے بغیر جیت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ بالکل الگ طرح کا احساس ہوتا ہے۔

میں نے تاجو سے کہا۔"بیگم جی سے کہہ دو کہ بے فکر رہیں۔اگر ان کا حکم ہے تو میں کل نہیں لڑوں گا۔"

رات کو سونے سے پہلے، میں نے کھیس کی بکل ماری اور والی جی کو بتادیا کہ میرے بازو اور چھاتی میں شدید درد ہے اور بخار کی کیفیت بھی دوبارہ محسوس ہو رہی ہے۔

والی جی بجھ گئے۔وہ کل کے مقابلے کے سلسلے میں بڑے پُرجوش تھے اور انہیں یقین تھا کہ میں آسانی کے ساتھ بلال کو ہرا دوں گا۔انہوں نے کہا۔"تم دوا وغیرہ کھا کر آرام کرو۔ابھی پندرہ سولہ گھنٹے پڑے ہیں۔اللہ نے چاہا تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

میں نے سوچا"دوا تو بیمار کو ٹھیک کر سکتی ہے۔ٹھیک کو کیسے ٹھیک کرے گی؟"

ظاہر تھا، والی جی کے حصے میں مایوسی ہی آئی۔ میں صبح دس گیارہ بجے تک بستر پر پڑا رہا۔ چھاتی اور بازوؤں پر جہاں جہاں مکھیوں کے ڈنک لگے تھے، جلد نیلی ہو رہی تھی۔ معمولی سا درد بھی تھا مگر میں نے اس درد کو بڑھا چڑھا لیا اور مقابلے سے رخصت لے لی۔

والی جی کی مایوسی پر افسوس تو ہوا مگر میں اپنے دل کا کیا کرتا؟ میں نے اپنے دو حاسدوں کا ذکر کیا تھا۔ان میں سے ایک حاسد تو والی جی کے وہی تایازاد بھائی چودھری عزیز تھے۔یہ ہر اہم اور غیر اہم معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔انہوں نے باقاعدہ میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔"بخار وغیرہ تو نہیں ہے اسے۔بلکہ مجھے تو یہ کمزوری لگتی ہے۔ جسم ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

رونق علی نے بھی میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔"ہاں، پنڈا تو زیادہ گرم نہیں ہے۔"

چودھری عزیز نے تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔" یہ ٹھنڈا ابخار ہے۔ کئی لوگوں کو کام کے وقت چڑھ جاتا ہے۔۔۔۔اور کھانے کے وقت اتر جاتا ہے۔"

چودھری عزیز کی بات تیر کی طرح دل میں لگی لیکن میں اس درد کو چھپا گیا۔

سہ پہر کے وقت چودھری معشوق کی کوٹھی نما حویلی کے سامنے میدان میں لٹھ بازی کے مقابلے ہوئے۔ یہ دلچسپ مقابلے تھے۔ میرا دل حصہ لینے کو مچل مچل جاتا لیکن کسی سے کیے وعدہ کا پاس بھی تو کرنا تھا۔

ان مقابلوں میں حصہ لینے والے اپنے سر اور چہرے کو بڑی اچھی طرح وزنی پگڑیوں میں چھپا لیتے تھے۔ سر کو چوٹ سے محفوظ کرنے کے لیے لوہے یا تانبے کی تھالی بھی پگڑی کے اندر رکھی جاتی تھی۔ ایسے مقابلوں میں عام طور پر کھڑی لاٹھی کا استعمال "فاؤل" ہوتا ہے یعنی لاٹھی کو نیزے کی طرح استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ ڈھولچی مسلسل ڈھول بجا رہے تھے۔ دو منصف لڑائی کا فیصلہ کرتے تھے اور کوئی سنگین چوٹ لگنے سے پہلے ہی حریفوں کو چھڑا دیتے تھے۔ ایسے مقابلے بھی ہوئے جن میں ایک کے مقابلے میں دو یا تین بندے آئے۔

میری دست برداری کے بعد بلال کا مقابلہ چاچے عسکری کے سب سے خاص شاگرد نصراللہ سے ہوا۔ بلال نے ایک مختصر مقابلے کے بعد نصراللہ کو ہرا دیا۔ نصراللہ کے ہاتھ سے لاٹھی نکل گئی اور وہ پشت کے بل گر گیا۔ میرے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکتی رہیں۔۔۔۔اور دل میں نقارہ سا بجتا رہا۔ بہر طور، یہ وقت کسی نہ کسی طور گزر ہی گیا۔

رات چاندنی تھی۔ کھانا وغیرہ کھا کر بیٹھے ہی تھے کہ حویلی کے اندرونی احاطے سے والی جی کی لینڈ رور جیپ نکلتی دکھائی دی۔ ہمارے قریب آ کر وہ رک گئی۔ اندر والی جی اور بیگم بلقیس کے علاوہ رونق، حامد اور مقامی چودھری معشوق صاحب کی بیوی موجود تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ قریبی ٹیلے کے کھنڈر دیکھنے جا رہے ہیں۔ اس جگہ کو مقامی زبان میں "تھے" کہا جاتا تھا اور یہاں سکھوں کے زمانے کی کچھ ٹوٹی پھوٹی دیواریں موجود تھیں۔

حامد شور مچا رہا تھا کہ وہ ماسٹر جی کو یعنی مجھے بھی ساتھ لے کر جائے گا۔ رونق علی نے بھی حامد کی آواز میں آواز ملائی۔ نتیجے کے طور پر میں بھی جیپ کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا۔ یہاں ایک محافظ پہلے سے موجود تھا۔ جیپ ہچکولے کھاتی آگے بڑھنے لگی۔ مکئی اور کماد کے کھیتوں کے درمیان سفر کرتے ہم جلد ہی "تھے" پر پہنچ گئے۔ بیگم بلقیس پر وہی مستانہ موڈ طاری تھا

جس کا مظاہرہ میں پچھلے دو دن سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بات بات پر ہنس رہی تھیں اور چہک رہی تھیں۔ اندازہ ہوا کہ اتنی سردی میں رات کے وقت اس سیر سپاٹے کا پروگرام بلقیس کے اصرار پر ہی بنا ہے۔ شاید چاچا عسکری ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ بیگم بلقیس کو سیر و تفریح کے مواقع کم کم ہی ملتے تھے۔ جیپ میں ان کے ساتھ میری براہ راست کوئی بات نہیں ہوئی۔ بس انہوں نے ایک بار اگلی نشستوں سے آواز دے کر پوچھا۔ "کیا حال ہے تمہارا؟"

"اب کچھ بہتر ہوں بیگم جی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

ایک جگہ جیپ روک دی گئی اور سب نیچے اتر آئے۔ ٹیلے کی چڑھائی کافی دشوار تھی۔ ہم چاند کی روشنی اور لالٹینوں کی رہنمائی میں سنبھل سنبھل کر اوپر چڑھ گئے۔ یہاں ہوا زیادہ کاٹ دار تھی، تاہم ارد گرد کا منظر خوبصورت تھا۔ حد نگاہ تک چاندنی تھی اور سرسبز کھیت تھے۔ ان کھیتوں میں کہیں کہیں ڈیروں اور کنوؤں کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح چمکتی تھیں۔

عقب میں دور قریباً ایک میل کے فاصلے پر کوس پور کی جگمگاتی حویلی بھی دکھائی دیتی تھی۔ اس جگمگاہٹ کو کہرے کی ہلکی سی چادر نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کسی وقت دور کسی ہل چلانے والی کی ٹخ ٹخ ہوا کے دوش پر تیر کر کانوں تک پہنچتی یا پھر کسی ٹریکٹر کی گھر گھر سنائی دیتی۔

چاندنی میں اس جگہ کا منظر واقعی مسحور کن تھا۔ ہم سب اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ والی جی، رونق اور مقامی چودھرائن ذرا آگے نکل گئے۔ بیگم جی حامد اور تاجو مجھ سے پیچھے تھے۔ وہ ایک ڈھلوان کے منظر میں محو تھے۔ والی جی نے انہیں اوپر سے پکارا تو وہ بھی چوٹی کی طرف بڑھنے لگے اور تب وہ خوشبودار لمحہ آیا جس نے مجھے سرتاپا سرشار کر دیا۔ یہ کوئی بناوٹی لمحہ نہیں تھا۔ نہ ہی اس لمحے کو وجود دینے میں کسی کوشش کا دخل تھا۔ بس جو ہوا اچانک اور خود بہ خود ہوا۔ بیگم بلقیس اوپر آ رہی تھیں۔ میں ان سے چند قدم آگے تھے۔ انہوں نے اوپر چڑھنے کے لیے ایک قدرتی سیڑھی پر پاؤں رکھا لیکن چڑھ نہیں سکیں اور ہنسنے لگیں۔ ہنستے ہنستے انہوں نے دوبارہ کوشش کی مگر جب ہنسی چھوٹ جائے تو زور کم ہو جاتا ہے۔ ان کی دوسری کوشش بھی تقریباً ناکام رہی۔ اس موقع پر بالکل میکانکی انداز میں، میں نے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جسے انہوں نے تھام لیا۔ میں نے تھوڑا سا زور لگا کر انہیں اوپر کھینچ لیا۔ اس ہاتھ کی نرمی، اس لمحے کی حرارت اس کیفیت کا گداز میرے لیے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ مجھے نہیں معلوم اوپر سے والی جی نے یہ منظر دیکھا یا نہیں اور اگر دیکھا تو ان کے کیا تاثرات تھے؟ ان لمحوں میں میں جیسے مبہوت سا ہو گیا تھا۔ بیگم جی اور حامد تیزی سے قدم اٹھاتے اوپر چلے گئے۔ میں بھی اپنی دھڑکنیں سنبھالتا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔ اوپر ایک چار دیواری

تھی جس میں بہت ساجھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ایک دو برجیاں سی تھیں۔یہاں چاندنی خوب روشن تھی اور ہر شے نکھری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔لالٹینیں ایک درخت کی ٹہنیوں سے لٹکادی گئیں اور سب لوگ ایک دری بچھا کر گھاس پر بیٹھ گئے۔ڈرائیور صوفی اسلم، گن مین اور میں کچھ دور کھڑے رہے۔پھر رونق علی ہمارے پاس آگیا۔اس کے کوٹ کی جیبیں خشک میوے سے بھری ہوئی تھیں۔اس نے مٹھیاں بھر کر چلغوزے اور کشمش ہماری جیبوں میں بھی ٹھونس دیں۔ایک اونچی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔"کہتے ہیں کہ یہاں کبھی جنوں بھوتوں کا بسیرا تھا مگر پھر بیس تیس سال پہلے ایک باباجی فیروز شاہ یہاں آئے۔انہوں نے یہاں چلہ شلہ کاٹا اور ساری ہوائی چیزوں شیزوں کو یہاں سے مار دوڑایا۔اب یہ جگہ بالکل پاک صاف ہے۔پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کوئی شرارت وغیرہ نہیں کرنی چاہیے۔بابا فیروز شاہ نے اس جگہ کو پاک صاف کرنے کے بعد ایک پری یہاں چھوڑی ہوئی ہے۔وہ اس جگہ کی حفاظت کرتی ہے۔بڑی بھلی مانس پری ہے۔بیوہ ہے مگر کنواری ہے۔ دراصل رخصتی سے پہلے ہی اسے طلاق شلاق ہو گئی تھی۔"

"ماشاءاللہ! آپ کی تو بڑی معلومات ہیں پری کے بارے میں۔"میں نے تعریف کی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"یار! مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔میری اس سوجی ہوئی آنکھ نے مجھے کہیں بے موت مروا دینا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کے گھوڑے! دیکھنے والے کو تو یہی لگتا ہے نا کہ میں آنکھ مار رہا ہوں۔اس غلط فہمی میں یہاں کی پری نے مجھے دھر لیا تو پھر؟"

ہم ہنسنے لگے۔اسی دوران میں حامد نے چھوٹا ٹیپ ریکارڈ لگا دیا۔پنجابی کے نغمے گونجنے لگے۔ ساڈے کولوں سوہنا مکھڑا چھپان لئی۔۔۔۔سجناں نے بوہے اگے چق تان لئی۔اس کے بعد زبیدہ خانم کی میٹھی مدھر آواز فضا میں گونجی۔۔۔۔اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے۔

اسی ماحول میں موسیقی کی ان لہروں نے سماں باندھ دیا۔اچانک میری نظر بیگم جی پر پڑی۔ والی جی ایک شکستہ منڈیر پر بیٹھے تھے۔بیگم جی ان کی جوتی اتار رہی تھیں۔یہ ایک براؤن مکیشن تھی۔دراصل اوپر آتے ہوئے والی جی کی ایک جوتی کیچڑ میں لتھڑ گئی تھی۔بیگم جی نے جوتی اتاری پھر وہیں پاؤں کے بل بیٹھ کر ایک کپڑے سے اسے صاف کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ان کی ناک کا کوکا چمک رہا تھا۔ان لمحوں میں وہ بے حد خدمت گار اور

محبت کرنے والی بیوی نظر آئی تھیں۔ لیکن اس ایک منظر میں دو منظر تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان میں سے کون سا منظر اہم ہے۔ دونوں مناظر کی الگ الگ تاثیر تھی۔ بیگم جی جس انداز میں جوتی چمکا رہی تھیں، ان کا گریبان دور تک نظر آ رہا تھا۔ کچھ کرامت شاید ان کے اپنے گھٹنے کے دباؤ نے بھی دکھائی تھی۔ لالٹینوں کی روشنی میں ان کا چمکیلا شفاف جسم ایک دم ہیجان خیز نظر آنے لگا تھا۔ وہ اس منظر سے بالکل بے خبر دکھائی دیتی تھیں لیکن کیا وہ واقعی بے خبر تھیں۔ چند لحظے کے لیے۔۔۔۔ صرف چند لحظے کے لیے مجھے لگا جیسے وہ بے خبر نہیں ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ میں ان سے فقط دس بارہ گز کے فاصلے پر موجود ہوں اور چور نظروں سے انہیں دیکھ رہا ہوں۔

رسیلے سر فضا میں تھے۔۔۔۔ اساں جان کی میٹ لئی اکھ وے۔۔۔۔ جھوٹی موٹی دا پا لیا ای کِکھ وے۔۔۔۔ تے ساڈھے ول تک سجناں۔۔۔۔

یہ سر چاندنی میں پھیل رہے تھے سردی سے لپٹ رہے تھے اور پھر اسی طرح لپٹے لپٹے کہرے میں گم ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد گانا بدل گیا اور منظر بدل گیا۔ بیگم جی اٹھ گئیں۔ ہم "تھے" سے واپس آ گئے۔

اگلے روز دوپہر کو شادی کی تقریب تھی۔ میں بے صبری سے دوپہر کا انتظار کرنے لگا۔ دل میں شدید خواہش تھی کہ بیگم بلقیس کو بنا سنورا دیکھوں۔ ان کے جسم میں مچلتی ہوئی شوخی کو محسوس کروں۔ ان کے سینے سے ابلتی ہوئی ہنسی ان کے تھرکتے ہوئے پاؤں جو چلتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ ناچ رہے ہیں۔

شادی کی تقریب بڑی رنگا رنگ تھی۔ بینڈ باجے کا شور تھا۔ ڈھنا ڈھن کولے پھٹ رہے تھے۔ رنگین کپڑوں اور سرخ پگڑیوں والے لڑکے لڈی ڈال رہے تھے۔ دولہا سفید گھوڑے پر تھا۔ زرتا سہرے نے اس کا مکھڑا چھپا رکھا تھا۔ دولہا کے بزرگ مٹھیاں بھر بھر کر سکے نچھاور کر رہے تھے اور ان سکوں پر گاؤں کے بچے ٹوٹ پڑتے تھے۔ پھر نوٹ نچھاور کیے جانے لگے اور نئے کڑکتے نوٹ پکڑنے کے لیے کئی "بڑے" بھی لوٹ مار میں شریک ہو گئے۔ ان میں سے کئی کے ہاتھ نالیوں کے کیچڑ میں لتھڑ گئے۔ برات گاؤں ہی کی ایک دوسری گلی میں پہنچی۔ یہاں مختلف رسمیں ادا کی گئیں۔ ایک رسم کے مطابق لڑکے کے خاندان کی عورتوں نے برات کا راستہ روک لیا اور زبردست قسم کی فقرے بازی شروع کر دی گئی۔ براتیوں پر خشک گوبر کے ٹکڑے اور کنکر پھینکے گئے۔ راستہ روکنے والی عورتوں

کی فقرے بازی کا جواب برات میں شامل عورتوں نے دیا۔انہوں نے باتوں باتوں اور گانوں کے بولوں کے ذریعے ان کا منہ بند کرنے کی کوشش کی۔ہم لوگ برات کے آخری سرے پر تھے۔وہاں تک۔۔۔۔۔بر سرپیکار عورتوں کی آوازیں تو نہیں پہنچتی تھیں تاہم ان کے تاثرات دیکھے جا سکتے تھے۔میں دیکھ رہا تھا کہ بیگم بلقیس کمانڈر کا کردار ادا کر رہی تھیں۔وہ جوابی کاروائی میں پیش پیش تھیں۔ان کا چمکیلا چہرہ اور رعب دار انداز حریف عورتوں کو متاثر کر رہا تھا۔میں پروانہ وار انہیں دیکھتا رہا۔پھر یہ قضیہ ختم ہو گیا۔دلہن والوں نے راستہ دے دیا اور براتی عورتیں برات سمیت شور مچاتی آگے بڑھ گئیں۔

دلہن والوں کا شمار علاقے کے خوش حال ترین زمینداروں میں ہوتا تھا۔انہوں نے برات کی آؤ بھگت میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔مقامی رواج کے مطابق شروع میں مٹھائی اور دودھ سے تواضع کی گئی۔بکرے اور دیسی مرغی کے علاوہ مچھلی، تیتر وغیرہ کا گوشت بھی وافر مقدار میں پکایا گیا تھا۔ڈسکے سے اسپیشل حلوائی بلوائے گئے تھے اور خاص لوگوں کے لئے نشے پانی کا انتظام بھی تھا۔بھانڈوں کی ٹولیاں لوگوں کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر رہی تھیں اور رنگ برنگی رسموں نے مہمانوں اور میزبانوں کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔مثلاً جوتا چھپائی گوڈا پکڑی،

دودھ پلائی، واگ پھڑائی وغیرہ وغیرہ۔حویلی کے اندر ہی رسمیں نہیں ہو رہی تھیں باہر بھی کئی طرح کے ہنگامے موجود تھے۔لیکن ان سارے ہنگاموں میں موجود ہونے کے باوجود میں موجود نہیں تھا۔میرا دھیان جیسے ایک ہی جگہ اٹک کر رہ گیا تھا میری نگاہیں جیسے ایک ہی چہرے کو دیکھنے کے لئے ترس رہی تھیں۔

بہت سے شور وغل اور شغل میلے کے بعد شام کے وقت برات دلہن کو لے کر واپس آ گئی۔پتا نہیں کیوں میں بہت اداس تھا۔میرے اندر جیسے ایک خلا تھا اور وہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔اس رات میرے دل کی عجیب کیفیت ہو گئی۔لالٹین کی روشنی میں ایک تنہا کمرے کے اندر میں دیر تک ٹہلتا رہا اور ٹھنڈے دل سے سوچتا رہا خود کو سمجھتا رہا۔میں نے خود سے کہا۔"شاہ خاور! یہ چپکے چپکے تم کس طرح چل پڑے ہو؟ یہ کیا ہوتا جا رہا ہے تم کو؟ کیا تمہاری عقل کام نہیں کر رہی؟ تم بیگم جی کو کیا سمجھتے ہو؟ کیا وہ خدانا خواستہ کوئی بد چلن عورت ہیں؟ کیا وہ نہیں جانتیں کہ وہ شادی شدہ ہیں۔۔۔۔۔ایک ماں ہیں۔کیا یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ تمہارے ساتھ کوئی رشتہ جوڑیں گی؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔اور نہ ایسا ہونا چاہیے۔"

پھر میرا دھیان والی جی کی طرف چلا گیا۔ انہوں نے مجھے کتنی عزت دی۔ مجھ پر بھروسا کیا تھا۔ وہ مجھے ملازم کی بجائے گھر کا فرد سمجھنے لگے تھے۔ کیا میں ان کے اعتماد کو دھوکا دھوں گا؟ نہیں، ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا۔

مگر پھر دل کے اندر سے ایک دوسری آواز گونجی۔ "لیکن شاہ خاور! تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ تم بیگم جی کو چاہنے لگے ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ دوسری طرف بھی کچھ موجود ہو۔ کوئی جذبہ کوئی احساس!"

پہلی آواز نے کہا۔ "دوسری طرف کچھ نہیں۔ بیگم جی اور طرح کی عورت ہیں۔ وہ پنج وقت کی نمازی ہیں۔ وہ ایک وفا شعار بیوی ہیں۔ جو کچھ ہے، تمہاری طرف ہے اور اس کو بے راہ روی کہتے ہیں۔ یہی کردار کی کمزوری ہوتی ہے۔"

دوسری آواز نے فوراً جواب دیا۔ "یہ بے راہ روی نہیں، یہ محبت ہے۔ اور محبت کی تو خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ منہ زور ہوتی ہے۔ وہیں ہوتی ہے جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے۔ اسی راستے پر چلتی ہے جو راستہ اس کے لیے ممنوع ہوتا ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

پہلی آواز نے کہا۔ "کچھ بھی ہے۔ تم ایسے بازاری اور گھٹیا انداز میں بیگم جی کے بارے میں نہیں سوچ سکتے اور نہ والی جی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا سکتے ہو۔"

میں نے بہت ندامت محسوس کی اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ کہا، آپ کو عجیب سا لگے گا۔ لیکن جو لوگ عشق و محبت کے گردابوں میں پھنستے ہیں، وہ ایسے ہی ہاتھ پاؤں چلایا کرتے ہیں۔ ان سے ایسی ہی جذباتی حرکتیں سرزد ہوا کرتی ہیں۔

میں لالٹین کے قریب بیٹھ گیا۔ لالٹین کی چمنی دہکی ہوئی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر میں نے اپنا ہاتھ چمنی کی طرف بڑھایا تاکہ اسے داغ دوں۔ مگر فوراً ہی خیال آیا۔۔۔۔ داغا ہوا ہاتھ ہر کسی کو نظر آئے گا۔ سب پوچھیں گے، کیا ہوا؟ میں نے ہاتھ کے بجائے اپنی کلائی اندر کی طرف سے داغ دی۔ بدن میں درد کی شدید لہریں اٹھیں، گوشت جلنے کی بو آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میری پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ میں پیچھے ہٹا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں آپ کو ٹھیک سے بتا نہیں سکتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ شاید یہ خود کو ایک طرح کی سزا تھی۔ یا پھر ایک حلف اور ایک عہد تھا۔ ہاں، شاید یہ حلف ہی تھا۔ میں نے ان لمحوں میں خود سے وعدہ کیا کہ بیگم جی کے بارے میں گھٹیا اور سفلی خیالات کبھی ذہن میں نہیں آنے دوں گا۔ اگر بیگم

جی سے میرے تعلق نے "محبت" کی شکل اختیار کی بھی تو یہ خاموش محبت ہو گی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے مستقبل کی طویل منصوبہ بندی کی۔۔۔۔اور اس منصوبہ بندی میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اگر اس "رسم وراہ" میں کبھی۔۔۔۔ کبھی کسی وقت کسی اتفاق کے تحت بیگم جی کو چھونے کا موقع آیا بھی تو میرے چھونے کی حد صرف ان کے ہاتھوں تک ہو گی۔ میں کسی بھی صورت اس سے آگے نہیں بڑھوں گا۔۔۔۔بس ان کے ہاتھوں کا لمس ہی میرے لیے آخری حد ہو گا۔

اب سوچتا ہوں تو یہ ساری باتیں بڑی بچگانا اور مہمل لگتی ہیں۔ مگر اس وقت میں ان باتوں کو بے حد سنجیدگی سے لے رہا تھا اور اس سنجیدگی کا ثبوت میری کہنی اور ہاتھ کا درمیانی حصہ تھا، جہاں سے گوشت بے طرح جل گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد میں نے خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ندامت اور شرمندگی کے ایک گہرے گڑھے میں گرتے گرتے بچ گیا ہوں۔

شادی کی تقریب میں شرکت کے بعد ہم کوس پور سے راجوال واپس آگئے۔ چند دن خیریت سے گزرے۔ حویلی میں میری اہمیت بڑھتی جا رہی تھی۔ حامد نے مجھے ماسٹر جی کے بجائے

ماسٹر چاچا کہنا شروع کر دیا۔ بیگم جی مجھے بے تکلفی سے خاور یا خاورے کہتی تھیں۔ والی جی بھی اسی انداز سے مخاطب کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ کبھی کبھی مجھے "ہر فن مولا" کا خطاب بھی دیتے تھے۔ شہد کی مکھیوں والے واقعے میں میرا زخمی ہونے والا گھوڑا اب صحت مند تھا۔

ایک رات حویلی میں ایک نقب زن گھس آیا۔ یہ کوئی "پڑی داس" یعنی خانہ بدوش تھا۔ اندھیرے میں نظر نہ آنے کے لیے اس نے بالکل کالے کپڑے پہن رکھتے تھے۔ چہرے پر کالک مل رکھی تھی۔ یعنی پکڑے جانے سے پہلے ہی اپنا منہ کالا کیا ہوا تھا۔ رونق علی کو عام طور پر رات گئے بھی بھوک لگ جاتی تھی اور وہ اٹھ کر باورچی خانے کا رخ کرتا تھا۔ اس رات رونق علی کا یہی پیٹو پن کام آگیا۔ وہ چاول کھانے کے لئے باورچی خانے کی طرف جا رہا تھا اچانک اس نے کھسر پھسر محسوس کی۔ یہ چور تھا جو لوہے کی سلاخ کے ذریعے کچی دیوار میں نقب لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رونق علی نے اسے دبوچ لیا مگر چور کا ایک ساتھی بھی موجود تھا۔ اس نے رونق علی کی آنکھوں میں پسی ہوئی مرچیں ڈال دیں۔ رونق علی نے کافی شور مچایا

مگر یہ شور چوکیداروں تک پہنچتے پہنچتے چور بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک تو بچ نکلا دوسرے کو رکھوالی کے کتوں نے دبوچ لیا۔

اس واقعے کے بعد والی جی نے سخت ضرورت محسوس کی کہ کسی ایسی پریشانی کے وقت ملازمین کو فوری طور پر اطلاع ہونی چاہیے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ملازمین کے رہائشی کوارٹر یا کمرے حویلی کی چار دیواری سے باہر تھے۔ رات کو وسیع احاطہ پار کر کے ہی ان تک پہنچا جا سکتا تھا۔ بارش وغیرہ کے موقع پر ملازموں تک رسائی اور بھی مشکل ہو جاتی تھی۔ میں نے والی جی کو اس کا ایک حل بتایا اور یہ حل انہیں پسند آیا۔

تین چار روز بعد والی جی اور چودھری عزیز کو ایک تاریخ پر لاہور جانا تھا۔ میں بھی جیپ میں ان کے ساتھ لاہور آ گیا۔ ہم جیسے دور دراز کے دیہاتوں کے لیے لاہور ایک انوکھا شہر ہوتا ہے لیکن میرے لیے یہ جگہ اجنبی نہیں تھی۔ میں کچھ عرصہ یہاں رہا تھا اور یہاں کی سڑکوں کی خاک چھانی تھی۔ والی جی اور ان کے ساتھی کچہری چلے گئے جبکہ میں شاہ عالم مارکیٹ پہنچا۔ یہاں کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک انٹر کام دیکھا تھا۔ یہ ڈرائی سیل سے چلتا تھا۔ تھوڑی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سی کوشش سے مجھے یہ اٹھارہ واٹ کا انٹر کام مل گیا۔ میں نے اس کے لیے بیٹری سیل کے بجائے دو چھوٹی بیٹریاں حاصل کیں اور دیگر چھوٹے موٹے لوازمات بھی خرید لیے۔

گاؤں واپس پہنچ کر اس انٹر کام کو انسٹال کر دیا گیا۔ ایک ریسیور والی جی کی رہائش گاہ میں اور دوسرا چاچا عسکری کے کوارٹر میں لگایا گیا۔ یہ سارا کام میں نے خود ہی کیا۔

انٹر کام کو ٹیسٹ کرنے کے لیے میں نے کوارٹر سے والی جی کو "بیل" دی۔ والی جی نے ریسیور اٹھایا اور خوش ہوئے اور کہنے لگے۔ "تم واقعی ہر فن مولا ہو۔"

پھر حامد نے ریسیور تھام لیا۔ "ماسٹر چاچا! تم کو میری آواز آ رہی ہے؟"

"بالکل بیٹا جی!"

"بس تو ٹھیک ہے آج سے تم مجھ کو اس ٹیلی فون پر ہی پڑھایا کرو گے بڑا مزہ آئے گا۔"

رونق علی نے ریسیور تھام کر کہا۔ "خاورے! یہ بڑا خچرا ہے اس کا مطلب ہے ٹیلی فون پر پڑھے گا تو تم اس کے کان شان نہیں کھینچ سکو گے۔ ویسے یہ کام تم نے کمال کا کیا ہے۔ میری طرف سے شاباش!"

یہ انٹر کام حویلی میں ایک بالکل نئی شے تھا۔ چھوٹے بڑے سب حیران ہو رہے تھے۔ ملازم بھی خوش تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اب ان کی ڈیوٹی سخت ہو گئی ہے۔ رات دن میں کسی بھی وقت انہیں حویلی کے اندر سے آواز دی جا سکے گی۔ میں نے انٹر کام بنایا نہیں تھا، صرف شہر سے خرید کر لایا تھا اور لگایا تھا۔ لیکن یہاں سب مجھے وہی عزت دے رہے تھے جو انٹر کام کے موجد کو دی گئی ہو گی۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ انٹر کام آگے چل کر میری زندگی میں کیا انقلاب لائے گا اور مجھے کس کس طرح متاثر کرے گا۔

ایک دن چاچے عسکری کو والی جی کے حکم پر صبح سویرے اٹھ کر سفر کے لیے دو گھوڑے تیار کرنا پڑے۔ چاچا عسکری سٹپٹا کر مجھے کہنے لگا۔ """یار یہ جو تو نے بمبو کاٹ لگایا ہے، اس نے ہمارا دو کانوں میں سر کر دیا ہے۔ ہر وقت بجتا رہتا ہے۔" چاچے عسکری کے منہ سے نکلنے والے بمبو کاٹ کا لفظ اتنا مقبول ہوا کہ چھوٹے بڑے سب انٹر کام کو بمبو کاٹ کہنے لگے۔ انٹر کام یعنی بمبو کاٹ پر کسی وقت بیگم جی سے بھی تھوڑی بہت بات ہو جاتی تھی۔ جیسے ایک روز

انہوں نے مجھے بتایا۔ "حامد کی طبیعت آج ٹھیک نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے چھٹی کر لی ہے۔ آج تم بھی چھٹی کر لو۔"

ایک روز انہوں نے کہا۔ "ماما رونق کی آنکھ ٹھیک نہیں ہو رہی۔ تم اپنے سنیاسی سے ماما کے لیے بھی کوئی دوا لا دو۔"

میں نے وعدہ کیا کہ میں لا دوں گا۔

والی جی کا لاڈلا پالتو کتا ہیرا بیمار تھا۔ چاچا عسکری اسے لے کر گوجرانوالہ گیا مگر پھر اسے لاہور جانا پڑا۔ پتا چلا کہ چاچا عسکری وہاں دو چار روز رہے گا اور جانوروں کے اسپتال سے کتے کا علاج ہو گا۔ انٹر کام چاچا عسکری کے کمرے میں تھا۔۔۔۔ رابطے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی انٹر کام والے کمرے میں موجود ہو۔ منشی منظور کے مشورے پر میں نے اپنا ضروری سامان اٹھایا اور چاچے عسکری والے کمرے میں شفٹ ہو گیا۔ یہ صورتِ حال مجھے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ دل میں ایک امید سی تھی کہ میں جلد ہی انٹر کام پر بیگم جی کی آواز بھی سنوں گا۔ کبھی کبھی امیدیں پوری ہونے میں عمریں بیت جاتی ہیں لیکن کئی وقت ایسے قبولیت والے ہوتے ہیں کہ ادھر دل میں تمنا پیدا ہوتی ہے ادھر سب کچھ تمنا کے عین مطابق ہو جاتا ہے۔ رات

کے دس گیارہ بجے تھے۔انٹر کام کی گھنٹی بجی۔میں نے ٹرانزسٹر ریڈیو بند کیا اور لحاف سے نکل کر ریسیور اٹھایا۔دوسری طرف بیگم جی کی مترنم آواز سنائی دی۔

"چاچا! میں بلقیس بول رہی ہوں۔"

"میں چاچا عسکری نہیں خاور ہوں۔"

"اوہ، خاور تم! میں نے تم سے ہی بات کرنی تھی۔" انہوں نے کہا اور میرا دل دھڑک اٹھا۔

"جی کہیں۔"

"وہ دراصل والی جی کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ویسے تو وہ انگریزی دوا نہیں کھاتے مگر ڈسپرین وغیرہ کھا لیتے ہیں۔تمہارے پاس ہے کوئی گولی؟"

"بالکل جی۔میں ایسی چیزیں تو ضرور رکھتا ہوں۔"

"تو پھر آجاؤ۔ان کو اپنے ہاتھ سے کھلا دو۔وہ تمہاری بات مان بھی لیتے ہیں۔"

میں نے ڈسپرین کا آدھا پتا لیا۔۔۔۔۔مجھے معلوم تھا کہ وہ پریشان بھی ہوں گے۔سر درد بھی شاید اسی وجہ سے شروع ہوا تھا۔میں نے سکون بخش دوا لیگزوٹانل کی ایک گولی بھی لے لی۔

تاہم اسے پیس لیا۔گرم چادر لپیٹ کر اور طویل احاطہ پار کر کے میں ٹھٹھرتا ہوا حویلی میں پہنچا تو بیگم جی میرا ہی انتظار کر رہی تھیں۔میں نے والی جی کو ڈسپرین کی دو گولیاں کھلائی اور ساتھ میں سکون بخش دوا کی آدھی گولی بھی دی۔ذرا پس و پیش کے بعد انہوں نے وہ بھی کھالی۔ ایک دفعہ پہلے بھی میں نے انہیں یہ دوا سنیاسی کی دوا کہہ کر دی تھی اور انہیں فائدہ ہوا تھا۔ بیگم جی کے کہنے پر تاجو میرے لیے نیم گرم دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے آئی۔کاڑھنی کا یہ سرخی مائل دودھ پینے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔اس کے اوپر ملائی جس پر چکنائی کے چھوٹے چھوٹے دھبے ہوتے ہیں، اپنی خوشبو اور حلاوت کے لحاظ سے بے مثال ہے۔لیکن ایسی نعمتیں شہروں میں کہاں ہوتی ہیں۔

کچھ ہی دیر میں والی جی کا سر درد کم ہو گیا اور میں اجازت لے کر واپس آگیا۔قریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے بمبوکاٹ یعنی انٹر کام پر بیل کی۔بیگم جی نے ریسیور اٹھایا اور مجھے بتایا کہ وہ اب بہتر ہیں اور سو رہے ہیں۔

"کسی بات کی پریشانی لی ہوئی ہے انہوں نے؟ میں نے پوچھا۔

"ہاں ایسی ہی کوئی بات ہے۔" بیگم جی نے کہا۔ "پہلے میں سمجھ رہی تھی شاید ہیرے کی بیماری سے پریشان ہیں۔۔۔۔ مگر کوئی اور معاملہ ہے۔ تمہیں پتا ہے نا ان کے ہتھ پر بھی چوٹ لگی ہے۔ پتا نہیں کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔ میں تو گھر کے اندر ہوتی ہوں، مجھے اب کیا پتا۔

"جھگڑے وغیرہ کا تو مجھے بھی کوئی پتا نہیں۔ ہاں مجھے بھی اندازہ ہوا تھا کہ ان کے ہاتھ پر چوٹ شوٹ لگی ہے۔"

"چلو، اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ پہلے سے تو کچھ بہتر ہیں۔ آج حامد سے بھی ہنس کھیل رہے تھے۔"

کچھ دیر بعد باتوں کا رخ کوس پور میں ہونے والی شادی کی طرف مڑ گیا۔ بھڑوں کے اس حملے کی بات ہوئی جس میں بیگم بلقیس سخت مصیبت میں پھنس گئی تھیں۔ پھر بیگم بلقیس نے شکریے کے انداز میں کہا۔ "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے میری بات مان لی۔"

"کونسی بات جی؟"

"وہی بلال سے لڑائی نہ کرنے والی بات۔ مجھے پتا تھا کہ بلال تم سے جیت نہیں سکتا۔ اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ تم سے ہارے اور میرے سامنے شرمندہ ہو۔ تمہارا نہ لڑنا مجھے بہت اچھا لگا۔"

"یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے بیگم جی۔" میں نے دل کی گہرائی سے کہا۔ "آپ کے لیے۔۔۔۔ جان بھی حاضر ہے۔" آخری الفاظ بے ساختہ میری زبان سے نکل گئے۔

لائن پر کچھ دیر عجیب سی خاموشی طاری رہی پھر بیگم بلقیس نے کہا۔ "تم بہت اپنے اپنے سے لگتے ہو۔ ایسے لگتا ہے، ہم سب کو تمہاری عادت پڑ گئی ہے۔"

میرے سینے میں پھلجڑیاں سی چھوٹ گئیں۔ "تمہاری عادت سی پڑ گئی ہے" کے الفاظ انہوں نے چند دن پہلے بھی استعمال کیے تھے، اب دوسری دفعہ کر رہی تھیں۔ یہ بڑے حوصلہ افزا الفاظ تھے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھیں ہم سب کو مجھ سمیت تمہاری عادت سی پڑ گئی ہے۔ تمہیں دیکھنے کی عادت، تم سے باتیں کرنے کی عادت۔۔۔۔ تمہیں اپنے آس پاس رکھنے کی عادت!

اس دن میرے اور بیگم جی کے درمیان آدھ پون گھنٹے تک بات ہوئی۔ان کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ ایک بیوی کی حیثیت سے والی جی کا بے حد خیال رکھتی ہیں۔

ان کے مسائل اوران کی ضروریات کے بارے میں سوچتی رہتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے لب و لہجے میں ایک عجیب سی ترنگ اور لچک بھی صاف محسوس ہوتی تھی۔مجھ سے باتیں کرتے ہوئے کسی وقت ان کا لہجہ بہت بے تکلفی کا ہو جاتا تھا۔اوراب مجھے لگنے لگا تھا کہ وہ میری دوری اور غیر حاضری کو محسوس کرنے لگی ہیں۔ان کا ایک فقرہ میرے دل میں کسی نگینے کی طرح مسلسل جگمگانے لگا۔۔۔۔بلکہ یہ دو فقرے تھے۔ایک تو یہ کہ "ہم سب کو تمہاری عادت سی پڑ گئی ہے۔"اور دوسرا فقرہ شادی والی تقریب کے حوالے سے تھا۔انہوں نے کہا۔"برات چلنے کے بعد تو تم کہیں نظر ہی نہیں آئے تھے۔"

یہ بڑا دل گداز جملہ تھا۔اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ مجھے دیکھنا چاہتی تھیں۔ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے ارد گرد موجود رہوں۔اس کے سوااور کیا مطلب ہو سکتا تھا؟

گفتگو ختم ہونے کے بعد میں تادیر سوچتا رہا کہ ان فقروں کے جواب میں،میں نے بھی کوئی چمکیلا فقرہ کہا ہوتا۔مثلاً!یہی کہہ دیا ہوتا کہ آپ کو ہی نہیں مجھے بھی آپ سب کی عادت سی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

پڑ گئی ہے۔میں نے تہیہ کر لیا کہ اگلی ملاقات میں موقع ملا تو کم از کم یہ فقرہ تو ضرور کہہ دوں گا۔

عسکری چاچا ابھی لاہور سے لوٹا نہیں تھا۔ایک دن چھوڑ کر پھر بیگم جی سے بات ہوئی۔اس بار انہوں نے ہی رابطہ کیا تھا۔انہوں نے بتایا۔"والی جی کو آج پھر درد ہو رہا ہے۔میں نے ڈسپرین کی صرف ایک گولی دی ہے۔"

"کچھ فرق پڑا؟"

"ہاں،سو رہے ہیں۔میں نے تم سے پوچھنا تھا کہ اگر رات کو درد کا کہیں تو ایک گولی اور دے دوں؟"

"بالکل،بلکہ دو بھی دے سکتی ہیں۔پانی میں گھول کر دیں تو زیادہ اچھا ہے ہینڈ پمپ کا پانی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ ابال لیا کریں۔"

"نہیں،اب ٹھیک ہیں ان شاءاللہ ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"حامد کہاں ہے؟"

"وہ بھی آج جلدی سو گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ ماسٹر چاچا کل ٹیسٹ لیں گے۔ کہتے تھے جلدی سو کر جلدی اٹھنا اور پھر تیاری کرنا۔"

"ہاں، میں نے کہا تھا۔۔۔۔انگریزی میں اس کو کافی مشکل ہو رہی ہے۔ حساب اور ڈرائنگ میں بھی کمزور ہے۔"

"ہاں، اس کی ڈرائنگ تو کل میں نے بھی دیکھی تھی۔ میری تصویر بنائی ہوئی تھی۔ خیر، میری تصویر تو ٹھیک ہی بنائی ہوئی تھی۔ میں ایسی ہی تو ہوں۔۔۔۔بے ڈھنگی سی!" بیگم جی کے لہجے میں مسکراہٹ تھی۔

"آپ حامد کی بنائی ہوئی تصویر کے بالکل الٹ ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

دوسری طرف تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر بیگم جی نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی تک شادی نہیں کی؟"

"بس جی! ہونے لگی تھی ایک جگہ۔۔۔۔پر سسرال والے کہتے تھے شہر میں رہنا ہوگا۔ میں اڑ گیا۔ سچی بات ہے جی، مجھے اپنے کھیتوں کھلیانوں اور اپنے پنڈوں کے کچے پکے رستوں سے عشق ہے۔ میں ان کے بغیر رہ نہیں سکتا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"لڑکی کیسی تھی؟"

"اچھی ہی تھی، پر میری اس سے کبھی بات نہیں ہوئی۔ بڑوں نے ہی آپس میں بات کی تھی۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"بس جی، جب قسمت میں ہو گی، شادی بھی ہو جائے گی لیکن اپنی شادی سے پہلے مجھے اپنی بہن کی شادی کرنی ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔"

باتوں کا سلسلہ چلا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ ہم قریباً دو گھنٹے تک بات کرتے رہے۔ بیگم جی نے میرے حالات کے بارے میں کافی کچھ پوچھا۔ اپنے حالات اور مسائل کے بارے میں بھی بتایا۔ ان کے لب و لہجے میں نمایاں لگاوٹ تھی۔ پھر بات کرتے کرتے وہ ایک دم چونک گئیں۔ بولی "مجھے لگتا ہے والی جی اٹھ گئے ہیں۔۔۔۔میں انہیں دیکھتی ہوں۔" انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔

ان کے لہجے میں جو رازداری کا انداز تھا۔ اس نے میری رگوں میں سنسنی پھیلا دی۔۔۔۔ اور جسم میں ایک میٹھا میٹھا سا درد جگا دیا۔

حامد نے میرے امی ابو کے عنوان سے جو تصویر بنائی تھی وہ واقعی بے ڈھنگی سی تھی اگلے روز میں نے اس سے تین چار بار یہ تصویر بنوائی۔اس کی بنائی ہوئی آخری تصویر بہتر تھی۔میں نے اس سے رنگ بھروائے۔

رات کو انٹر کام یعنی بمبو کاٹ پر بیگم جی سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا۔"خاور! لگتا ہے تم نے آج سارے ٹائم میں حامد سے بس تصویر ہی بنوائی ہے۔"

"یہ ضروری ہو گیا تھا جی۔"میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"حامد کہتا ہے،اس نے میرے کپڑوں میں پیلا رنگ بھرا تھا مگر ماسٹر چاچا نے کہا کہ خاکی اور کالا رنگ بھرو۔"

"یہ رنگ آپ کو بہت اچھا لگتا ہے۔"میں نے بے ساختہ کہا اور پھر ڈر گیا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائیں۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بیگم جی کی ہنسی سنائی دی۔

"تم نے کب دیکھا مجھے خاکی اور کالا رنگ پہنے ہوئے۔"

"جب ہم ملک رمضان صاحب کے گاؤں میں رات گزارنے کے بعد کوس پور روانہ ہوئے تھے۔"

"تمہاری یاداشت تو بڑی پکی ہے۔"انہوں نے غالباً شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہر معاملے میں نہیں لیکن کچھ باتیں مجھے یاد رہ جاتی ہیں۔"میں نے حوصلہ پا کر جواب دیا۔

اس دن بھی ہم نے کافی دیر تک باتیں کیں۔ان باتوں میں والی جی کے بارے میں بھی بہت سی باتیں شامل تھیں۔بیگم جی کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ والی جی سے محبت کرتی ہیں۔ان کی پریشانی بیگم جی کو پریشان کرتی ہے اور ان کی دوری انہیں سخت ناپسند ہے لیکن پھر یہ سب کیا تھا جو ہو رہا تھا اور بہ تدریج خوبصورتی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

اس رات انٹر کام بند کرنے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا۔کیا ہمارے درمیان جو کچھ تھا وہ آگے چل کر محبت بننے والا تھا کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک عورت ایک ہی وقت میں دو مردوں سے محبت کرے اور یہ محبت سچی بھی ہو۔کیا یہ ممکن ہے؟ان گنت سوالات تھے مگر جواب کوئی نہ تھا۔بس ایک تیز بہاؤ تھا جس میں میں بے خودی کے عالم میں بہتا چلا جا رہا تھا۔اگلے روز معلوم ہوا کہ لاہور میں والی جی کے لاڈلے پالتو کتے ہیرے کی حالت تشویش ناک ہے۔

اسے شدید قسم کا نمونیہ تھا۔ سینئر ویٹرنری ڈاکٹر نے اسے تقریباً لاعلاج قرار دیا تھا۔ والی جی اسی روز افسردگی کے عالم میں لاہور روانہ ہوگئے۔ انہوں نے وہاں ایک تاریخ بھی بھگتنا تھی۔ امکان تھا کہ ان کی واپسی تین چار روز بعد ہی ہو سکے گی۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کا تایازاد بھائی چودھری عزیز ہی حویلی کا کرتا دھرتا تھا۔ حسبِ توقع اس رات نو دس بجے ہی بیگم جی کی کال آگئی۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ میں لحاف میں دبکا ہوا ریوڑیاں اور بھنے ہوئے چاول (چڑوے) کھا رہا تھا۔ انٹرکام یعنی بمبوکاٹ کا ریسیور میرے پاس ہی رکھا تھا اور نظر گاہے بہ گاہے اس کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ بیل ہونے پر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف بیگم جی کی کھنکتی آواز ہی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ لگتا ہے کہ مجھے بھی آپ کی عادت ہوگئی ہے۔''

انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کسی چیز کی عادت ہونا اچھی بات نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی بہت پریشانی ہوتی ہے۔''

''لیکن دل کا کیا کیا جائے۔ یہ تو اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے نا جی۔''

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہماری باتوں میں جھجک کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس رات بھی ہم نے دیر تک باتیں کیں۔ آج تو والی جی بھی حویلی میں نہیں تھے مکمل آزادی تھی۔ حویلی کے کسی اندرونی کمرے میں بیگم جی رنگیلے پلنگ پر دراز تھیں اور میں یہاں اپنے کوارٹر نما ڈھارے میں انگیٹھی کے سامنے پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ میرے عقب میں لالٹین رکھی ہوئی تھی سامنے ہلکے نیلے رنگ کی کچی دیوار پر میرا بہت بڑا سایہ بنا رہی تھی۔ رات طویل سرد اور تاریک تھی۔ باہر پھاٹک کے پاس رکھوالی کے کتے گاہے بگاہے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے تھے اور نصر اللہ کی دور افتادہ آواز آئی تھی جو انہیں پچکارنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہم دونوں دھیمی آواز میں بولتے چلے جا رہے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی اور ششدر رہ گیا۔ ہمیں باتیں کرتے ہوئے تین گھنٹے ہو چلے تھے مگر لگتا تھا کہ دس پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ بیگم جی نے اپنی پسند ناپسند بتائی۔ وہ کون سے کھانے پسند کرتی ہیں۔ ریڈیو پر کس قسم کے پروگرام سنتی ہیں اور کیسے کپڑے ان کو اچھے لگتے ہیں۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا۔ بیگم جی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میری زندہ دلی اور دلیری سے متاثر ہیں۔ خاص طور سے لڑائی بھڑائی میں میری مہارت اور بے خوفی ان کو بہت پسند آئی تھی۔ اس سلسلے میں کچھ کردار رونق علی نے بھی ادا کیا تھا۔ اس نے میرے بارے میں بیگم جی کو بڑھا چڑھا کر بتایا تھا اور کہا تھا کہ میں کئی موقعوں پر اکیلا ہی سات آٹھ

بندوں کو آگے لگا چکا ہوں اور یہ کہ پورے ضلع میں شاید ہی کوئی بندہ لٹھی بازی اور لڑائی بھڑائی میں میرا مقابلہ کر سکتا ہو۔

میں نے کہا۔ "رونق علی صاحب بہت مخولیا ہیں بیگم جی۔ ان کی باتوں پر نہ جائیں۔"

"تم بھی کچھ کم مخولیا نہیں ہو۔"

باتوں باتوں میں ان کے ہیر پڑھنے کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے کہا۔ "میں اس بارے میں آپ کی تعریف کرنا چاہتا ہوں لیکن کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں تعریف کے بدلے تعریف کر رہا ہوں۔"

"چلو نہیں سمجھتی۔" وہ ہنسیں۔

"یقین کریں آپ بہت اچھا گاتی ہیں۔ آپ کی آواز کانوں میں نہیں دل میں اترتی ہیں۔"

اچانک انہوں نے ایک ایسا فقرہ کہا جس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ بولیں۔ "سناؤں؟"

"یعنی۔۔۔۔۔ یعنی اس بمبو کاٹ پر؟" میں ہکلایا۔

"اگر تم کہو تو۔۔۔۔۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"مم۔۔۔۔۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا کہ آپ میرے لیے گا سکتی ہیں۔"

"یہ کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں۔"

"پلیز۔۔۔۔۔ میں خود کو بڑا خوش قسمت سمجھوں گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ ان لمحوں میں ہم دونوں بالکل نوخیز لڑکی لڑکے کی طرح ایکٹ کر رہے ہیں۔ ان نئی کونپلوں کی طرح جو محبت بھری ہوا کے پہلے پُرجوش لمس کو محسوس کرتی ہیں اور والہانہ لہلہانے لگتی ہیں۔ بیگم جی بڑے خاص موڈ میں تھیں۔ یہ ترنگ سی بھری ہوئی کیفیت تھی۔ وہ جیسے کسی بھی ذریعے سے اس ترنگ کا اظہار چاہتی تھیں اور یہ اظہار ہیر سنانے کی صورت میں ظاہر ہو گیا تھا۔ بہ ظاہر یہ سب کچھ بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ رات کو سناٹے میں جب گلی کوچے نیند میں ڈوبے ہوئے تھے اور کھیتوں کھلیانوں میں یخ ہوا سر لائے مار رہی تھی، کوئی انٹر کام پر ہیر وارث شاہ سنانے کی بات کر رہا تھا۔

خود ہی پیشکش کرنے کے بعد وہ کچھ دیر پس و پیش کرتی رہیں پھر لائن پر خاموشی چھا گئی۔ میں نے چند لمحوں کے لیے سمجھا، شاید وہ ریسیور کریڈل پر رکھ کر چلی گئی ہیں۔ لیکن پھر ایک دم ریسیور پر ان کی آواز گونجی اور میں حیران رہ گیا۔ وہ ہیر پڑھ رہی تھیں لیکن پوری آواز سے

نہیں۔انہوں نے اپنی آواز باریک کرلی تھی۔اسے موسیقی کی زبان میں گلے میں گانا کہا جاتا ہے۔۔۔۔۔یہ آواز تھی یا جادو تھا۔میں دھڑکتے دل کے ساتھ سنتا رہ گیا۔۔۔۔

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹ بولیں، کون وچھڑے یار ملاوندا ای

ایسا کوئی نہ ملیا، میں ڈھونڈ تھکی، جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندا ای

اک جٹ دے کھیت نوں اگ لگی، ویکھاں آن کے کدوں، بجھاوندا ای

ایک باز توں ال نے ماس کھویا، دیکھاں آن کے کدوں چھڈاوندا ای

بول ختم کرنے کے بعد انہوں نے چند سیکنڈ کی خاموشی اختیار کی پھر بڑی ادا سے پوچھا۔

"بس؟

"کمال ہے۔آپ نے تو حیران کر دیا۔۔۔۔۔جی چاہتا ہے۔بس آپ پڑھتی جائیں اور میں سنتا جاؤں۔"

"بنا رہے ہو؟"

"بالکل نہیں۔۔۔۔۔جو کہہ رہا ہوں، دل کی گہرائی سے کہہ رہا ہوں۔"اور حقیقت بھی یہی تھی۔ہو سکتا ہے میرے الفاظ میں بیس فیصد اضافی تعریف شامل ہو لیکن باقی اسی پچاسی فیصد تعریف سچ اور صرف سچ تھی۔

"پلیز! تھوڑا سا اور سنائیں۔"میں نے رومانی لہجے میں کہا۔

رسمی پس وپیش کے بعد انہوں نے چند شعر پڑھے۔پھر آخر میں پھر اسی ادا سے پوچھا۔

"بس؟"

ان کی یہ سوالیہ "بس"ایک میٹھے تیر کی طرح دل میں لگتی تھی۔"نہیں!"میں نے بھی ادا سے کہا۔"کچھ اور۔"

وہ ہنسیں۔"دیکھو، کتنی الو لگ رہی ہوں میں۔چوکڑی مار کر بستر پر بیٹھی ہوں اور فون پر تمہیں ہیر سنا رہی ہوں۔"

"میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا، کہ آپ میرے لیے ہیر پڑھیں گی۔مجھے اپنے کانوں کی خوش قسمتی پر حیرت ہو رہی ہے۔"

"والی جی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ تم ہر فن مولا ہو۔ شاعروں جیسی باتیں بھی کرتے ہو، ڈنڈا سوٹا بھی چلاتے ہو۔۔۔۔۔رج کے مذاقیے بھی ہو۔۔۔۔۔اور تمہاری دوائیں بھی اثر دکھاتی ہیں۔"

میں نے دل میں سوچا۔ "بیگم جی! تم بھی تو عجیب ہو۔ والی جی سے محبت بھی کرتی ہو، نماز روزے کا بھی خیال ہے۔ اور تمہاری آنکھوں سے میرے لیے وہ پیغام بھی نشر ہوتے ہیں جن کی خوبصورتی پر سو جان سے فدا ہونے کو دل چاہتا ہے۔"

اس رات میرے اور بیگم جی کے درمیان قریباً پانچ گھنٹے تک بات ہوئی۔ جی ہاں، پورے پانچ گھنٹے! یہ ان دنوں کی بات ہے جب موبائل وغیرہ کا کہیں تصور بھی نہیں تھا۔ ان پانچ گھنٹوں میں انہوں نے مجھے کئی بار ہیر سنائی اور آخر میں ہر بار بڑی جان لیوا ادا سے پوچھا۔ "بس؟"

اس رات ہم دونوں کے درمیان تکلف کے کئی پردے گر گئے۔ میں نے ہمت کر کے بیگم جی کو بیگم جی کے بجائے "بلقیس صاحبہ" کہہ کر مخاطب کیا اور انہوں نے برا نہیں مانا۔ میں انہیں بلقیس صاحبہ کہہ کر مخاطب کرتا رہا اور وہ مجھے خاور کہتی رہیں۔ ہمارے درمیان طے ہوا کہ ہم روزانہ کم از کم ایک بار انٹر کام پر ضرور بات کریں گے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اگلے روز میں حامد کو پڑھانے گیا تو بلقیس اندر کے برآمدے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ اوڑھنی میں لپٹا ہوا ان کا چہرہ ایسے ہی دکھائی دیتا تھا جیسے بادلوں کے گھیرے میں چاند! میں ان کی بس ایک جھلک دیکھ کر حامد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد تاجو میرے لیے گاجر کا حلوہ لے آئی ساتھ میں نیم گرم اور نیم سرخ دودھ سے لبالب بھرا ہوا گلاس۔ حامد اب پہلے سے کافی سدھر گیا تھا۔ وہ اب تک مجھے "تم" کہہ کر بلاتا تھا مگر اب آپ کہنے لگا تھا۔ کل اسے مجھ سے تھوڑی سی جھڑکیاں پڑی تھیں مگر آج اس نے اچھا کام کیا تھا۔ تختی بھی صحیح لکھی تھی۔ میں نے اسے شاباش دی اور اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا اور میری گود میں چڑھ بیٹھا۔ دروازے کی اوٹ سے بیگم بلقیس حامد اور میرا لاڈ دیکھ رہی تھیں اور خوش ہو رہی تھیں۔ اچانک حامد کی کہنی سے میری کلائی کا کھرنڈ چھل گیا۔ میں نے جلدی سے آستین چڑھائی۔ یہ میرے جذباتی پن کا وہ زخم تھا جو لالٹین کے ساتھ داغنے جانے سے آیا تھا۔

خون رسنے لگا۔ حامد بھی پریشان ہو گیا۔ بلقیس اندر آ گئیں۔ "کیا ہوا خاور! یہ خون کیسے نکلا؟" میں نے انہیں زخم دکھایا۔ "یہ کیسے ہوا؟" انہوں نے دردمندی سے پوچھا۔

مجھے ان کے سوال کا مزہ آیا۔ایک بار تو جی میں آئی کہہ دوں کہ یہ آپ ہی کا دیا ہوا ہے لیکن پھر میں نے بہانہ بنایا کہ نیند کی حالت میں بازو لالٹین سے لگ گیا تھا۔انہوں نے اندر سے لال دوا لا کر دی۔جب وہ مجھے دوا تھما رہی تھیں،ان کی انگلیاں میری انگلیوں سے ٹکرائیں اور جسم میں سنسنی کی عجیب لہریں دوڑ گئیں۔میں نے خود ہی زخم پر دوا لگائی اور آستین اڑس لی۔

رات پھر سر پر تھی۔طویل، سرد اور بھیدوں بھری رات! جب لالٹین کی مدھم روشنی میں بمبو کاٹ جاگتا تھا اور چاچے عسکری کے کمرے میں دنیا جہان کے رنگ اتر آتے تھے۔

اس رات بھی بیگم بلقیس کی کال نو دس بجے کے درمیان آئی۔میں حسبِ معمول چاچے عسکری کے کمرے میں تھا۔ساتھ والا کمرا خالی تھا کیونکہ وہ میرا تھا دوسری طرف والے کمرے میں ہیڈ مالی گلاب دین اور اس کا بیٹا گلزار ہوتے تھے۔گلزار کی ڈیوٹی آج کل گاؤں سے باہر مچھلی کے تالاب پر لگی ہوئی تھی۔گلاب دین بہت اونچا سنتا تھا۔مجھے مطلق فکر نہیں ہوتی تھی کہ میری دھیمی آوازیں کسی کے کانوں تک پہنچیں گی۔پھر بھی احتیاطاً کسی وقت میں لحاف کے اندر منہ گھسا لیتا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس رات بھی ہم نے محو ہو کر گفتگو کی۔حوصلے آہستہ آہستہ بڑھتے جا رہے تھے۔میری درخواست پر بیگم بلقیس نے پھر اپنی مدھر آواز کا جادو جگایا۔یقیناً انہیں تسلی تھی کہ ان کی آواز سنی نہیں جا سکتی ورنہ وہ ایسا رسک کیوں لیتیں؟ میں نے تہہ دل سے ان پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے۔تین گھنٹے کی گفتگو کے بعد میری کمر اکڑ سی گئی۔میں نے بستر پر نیم دراز ہو کر پھول دار چھینٹ کا لحاف اپنے اوپر لے لیا۔۔۔۔لحاف کے اندر ان کی آواز ابھری تو لگا جیسے وہ میرے ساتھ ہی لحاف کے اندر ہیں۔

"آپ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بستر پر آدھی لیٹی ہوئی ہوں۔پاؤں انگیٹھی کے اوپر ہیں۔۔۔۔اور۔۔۔۔تم؟"

"میں بھی لیٹ گیا ہوں۔۔۔۔لحاف کے اندر۔۔۔۔یوں لگ رہا ہے جیسے آپ بھی لحاف کے اندر سے ہی بول رہی ہیں۔" وہ ہنس پڑیں۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ان باتوں میں ایک طرح کا منہ زور بہاؤ تھا جو بہ تدریج گفتگو کو ایک خاص طرف لے جا رہا تھا۔اب ہمیں بات کرتے ہوئے پانچ گھنٹے ہو چکے تھے۔"تم بھی گا سکتے ہو؟" انہوں نے سوئے سوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔"

"تم تو ہر فن مولا ہو۔ ضرور گاتے ہوگے۔"

"مگر اتنی ہمت نہیں کہ بلقیس صاحبہ کے سامنے گا سکوں۔" میں نے کہا۔

وہ خاموش ہو گئیں۔ ان کی سانسوں کی آواز ریسیور پر سنائی دیتی رہی۔ شاید میری سانسوں کی آواز بھی جاتی ہو گی۔ کئی سیکنڈ کے بعد میں نے کہا۔ "آپ کی باتوں کی طرح آپ کی خاموشی بھی اچھی لگتی ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، بند کر دیتی ہوں۔"

"نہیں، دور ہونے والی خاموشی نہیں۔۔۔۔ پاس رہنے والی خاموشی!" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"اچھا، چلو کچھ دیر خاموش ہو جاتے ہیں۔" وہ بولیں۔

ہم خاموش ہو گئے۔ ایک دوسرے کی قربت کو محسوس کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی سانسوں کی آہٹ سنتے رہے۔ ایکا ایکی میرے اندر کچھ ہونے لگا۔ کوئی لہر سی چلنے لگی۔ کوئی

نظام حرکت میں آگیا۔ میں بولا تو میری آواز جذبات کے بوجھ تلے لرز رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "ایسا نہیں لگتا کہ ہم ایک دوسرے کے پاس ہیں؟ ایک ہی کمرے میں۔۔۔۔ ایک ہی جگہ؟"

"ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"آپ کس کروٹ لیٹی ہیں؟"

"بائیں پر!"

"اور میں دائیں پر۔۔۔۔ یعنی ایک دوسرے کے سامنے ایک دوسرے کی سانسیں سن رہے ہیں۔ بالکل ایسا ہی لگتا ہے نا؟" انہوں نے ایک بار پھر "ہوں" میں جواب دیا۔ اس "ہوں" میں کچھ ایسی بات تھی کہ میری رگوں میں لہو کی جگہ آگ دوڑنے لگی۔ میں نے بے ساختہ کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ آپ کا منہ میرے منہ کے بالکل سامنے ہے۔" وہ ہولے سے ہنسیں اور ایک بار پھر مختصر ہوں کہا۔

یہ بڑی حوصلہ افزا "ہُوں" تھی۔ میں نے چند سیکنڈ تک حوصلہ جمع کیا اور پھر ماؤتھ پیس سے ہونٹ لگا کر چومنے کی آواز پیدا کی۔ دوسری طرف گھمبیر خاموشی تھی۔ خاموشی طویل ہوئی تو میں نے پوچھا۔ "آواز آئی؟"

انہوں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے صرف "ہاں" کہا۔

"تو آپ نے جواب نہیں دیا؟"

"ایسی بات کا بھلا کیا جواب ہو سکتا ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"اچھا، اللہ حافظ۔" میں نے لرزاں لہجے میں کہا اور انٹر کام بند کر دیا۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ اگر گفتگو جاری رہی تو وہ کہیں کوئی سخت بات نہ کہہ دیں۔

میں بستر پر چت لیٹ گیا۔ دل میں میٹھا میٹھا درد چٹکیاں لے رہا تھا۔ آج جو پیش رفت ہوئی وہ ناقابلِ یقین تھی۔ آج سے تین چار ماہ پہلے میں کسی ایسی صورتِ حال کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن ابھی کچھ دیر پہلے میری "آخری کاروائی" کا ردعمل کیا ہوا ہے، اس کے بارے میں، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اگلے روز میں حامد کو پڑھانے بھی نہ جا سکا۔ ایک طرح کی خوف آمیز جھجک تھی جو بلقیس صاحبہ کا سامنا کرنے سے روک رہی تھی۔ پتا نہیں تھا کہ ان کا رویہ کیا ہونا ہے؟ اگر ان کی کسی بات سے مجھے رنج پہنچتا تو شاید میرے لیے یہاں راجوال میں رہنا بھی مشکل ہو جاتا۔ ان معاملوں میں، میں بے حد حساس واقع ہوا تھا۔ رات کو ان کی کال بھی نہیں آئی۔ کال کے نہ آنے سے دل میں مزید وسوسے جاگے۔ کہیں میں حد سے آگے تو نہیں بڑھ گیا؟

اگلے روز میں حامد کو پڑھانے تو گیا مگر بلقیس صاحب سے آمنا سامنا نہیں ہوا۔ رات تک کا وقت میں نے بڑی مشکل سے کاٹا۔ والی جی اور چاچا عسکری ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آئے تھے۔ معلوم ہوا کہ انہیں کل آنا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آج رات بات نہ ہوئی تو پھر ہو سکتا ہے تین چار دن مزید نہ ہو۔ میں نے نو بجے سے ہی کال کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ دیہات میں نو بجے کا وقت کافی سمجھا جاتا ہے۔ دس بجے اور پھر گیارہ بج گئے۔ ٹرانزسٹر پر گانوں کا فرمائشی پروگرام بھی ختم ہو گیا۔ کچے فرش پر سگریٹ کے کئی ٹکڑے جمع ہو چکے تھے۔ میرا پیمانہ صبر لبریز تھا۔ میں نے سوچا، میں خود کال کر لیتا ہوں۔ میرے ہاتھ ریسیور کی طرف بڑھے ہی تھے کہ گھنٹی ہو گئی۔ انٹر کام کی الیکٹرانکس گھنٹی عام ٹیلی فون کی گھنٹی سے

مختلف ہوتی ہے۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف بلقیس صاحبہ تھیں۔ "السلام علیکم!" انہوں نے مخصوص لہجے میں کہا۔

"وعلیکم السلام!" میں نے سکھ کا سانس لیا اور اس کے ساتھ ہی کہا۔ "میں کل آپ کا انتظار ہی کرتا رہا۔"

"کل پھر ترنجن تھا۔ ساتھ والے پنڈ سے دو چار سہیلیاں آئی ہوئی تھی۔ پہلے چرخہ چلتا رہا۔ پھر ٹپے گائے جانے لگے۔ میں نے سوچا اگر جلدی ختم ہو گیا تو تم سے بات کروں گی مگر وہاں تو ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیا۔ مغلوں کی دو کڑیوں کے درمیان تیزی سے کروشیا چلانے کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ وہ شور پڑا کہ کچھ نہ پوچھو۔ آخر میں خالہ برکتے نے "بات" شروع کر دی۔ پھولاں بادشاہ زادی کی "بات" (کہانی) اتنی لمبی تھی کہ فجر کی بانگیں ہو گئیں اور ککڑ بولنے لگے۔"

"چلو آپ نے تو خالہ برکتے کی بات سن لی۔ میں تو بغیر بات کے ہی آخری پہر تک جاگتا رہا۔"

"ویسے میں بھی پریشان تھی۔"

"کیوں؟"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تم حامد کو پڑھانے بھی تو نہیں آئے تھے۔ مجھے لگا کہ شاید تم مجھ سے ناراض ہو گئے ہو۔" انہوں نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔

"کس بات پر ناراض؟"

وہ شرمیلے انداز میں ہنسیں۔ "اسی بات پر!"

"کچھ بتائیں گی تو پتا چلے گا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولیں۔ "میں نے تمہارے سوال کا جواب جو نہیں دیا تھا۔"

دل میں پھلجڑیاں سی چھوٹ گئیں۔ ان کا اشارہ پچھلی گفتگو کے آخری لمحوں کی طرف تھا۔

"چلیں، کوئی بات نہیں۔" میں نے فراخ دلی سے کہا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ایک بار پھر ہونٹوں کو ماؤس پیس سے لگا کر چومنے کی آواز پیدا کی۔ جواب میں ان کی ہنسی بڑی دلفریب تھی۔

اس رات بھی ہماری بے تکلف گفتگو جاری رہی جیسا کہ میں نے کہا ہے، یہ ایک بہاؤ سا تھا جس میں ہم بہتے چلے جا رہے تھے۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ یہ بالکل غلط راستہ ہے۔۔۔۔۔

گفتگو کے دوران میں ایک جگہ اچانک بیگم بلقیس خاموش ہو گئیں۔ میں کتنی دیر ہیلو ہیلو کرتا رہا مگر آواز نہیں آئی۔ بس قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ رابطہ ہوا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا۔ "بھائیا جی آگئے تھے۔ آدھی رات کو حقے کی چلم کے لیے گڑ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ "بھائیا جی سے ان کی مراد والی جی کے تایازاد چودھری عزیز تھے۔

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

پھر کیا۔ میں نے رضائی اوپر کھینچ لی اور تمہارے بمبوکاٹ کو بھی چھپالیا۔ لیکن مجھے لگتا ہے ان کو کچھ نہ کچھ شک تو ضرور ہوا ہے۔ بڑی تیز نظر ہے ان کی۔"

"کچھ کہا تو نہیں انہوں نے؟" میں نے پوچھا۔ بلقیس صاحبہ نے نفی میں جواب دیا۔

اگلے روز والی جی لوٹ آئے۔ اسپتال والوں نے ہیرے کو لاعلاج کر کے لوٹا دیا تھا۔ ہیرا واقعی کافی بوڑھا ہو چکا تھا۔ اب بیمار ہو کر اور بھی بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ اس کے چہرے کی کھال لٹکی ہوئی تھی اور بڑی بڑی آنکھوں میں ایک اندھیرا سا اترتا دکھائی دیتا تھا۔ شاید والی جی کی طرح والی جی کے اس شاندار کتے کے بھی اچھے دن گزر چکے تھے۔ کتے کے لیے ایک

ویٹرنری ڈاکٹر لاہور سے کتے کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس نے کتے کے کمرے میں دو انگیٹھیوں کا انتظام کیا۔ زمین پر موٹا نمدا بچھوایا۔۔۔۔ اور دیگر انتظامات کیے۔ ایک لحاظ سے یہ سب کچھ اس لیے تھا تاکہ ہیرے کے آخری چند دن اچھے طریقے سے گزر سکیں۔

والی جی کا دایاں ہاتھ ابھی تک ٹھیک طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس بارے میں رونق علی کو کریدا تو اس نے کہا۔ "مجھے بھی اس بارے میں دو دن پہلے ہی تھوڑا سا پتا چلا ہے۔ شام پور کی ایک کڑی ثمینہ غیر برادری کے ایک منڈے سے ملتی جلتی ہے۔ دونوں کی ملاقاتیں شام پور کے ایک کھیت میں ہوتی رہی ہیں۔ (شام پور جاگیر کے تین پنڈوں میں سے ایک تھا)۔ مخبری ہونے پر والی جی نے کڑی منڈے کو رنگے ہاتھوں پکڑا اور منڈے کو مار شار بھی لگائی۔ اسے مارتے ہوئے ہی والی جی کے ہتھ پر چوٹ لگی ہے۔ اپنے پنڈ کی کڑی کا معاملہ ہے۔ وقتی طور پر دبا شبا لیا گیا تھا، پر ایسی باتیں کب تک چھپی رہتی ہیں۔۔۔۔" کچھ کہتے کہتے رونق علی ایک دم چپ ہو گیا۔

"آپ کچھ اور کہنے لگے تھے۔"

کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد رونق علی بولا۔ "مجھے اس سارے معاملے میں کوئی گڑبڑ شڑبڑ لگتی ہے۔ جس منڈے کا نام لیا جا رہا ہے وہ بڑا اخرانٹ ہے۔ ثمینہ نام کی اس کڑی کو بھی میں چنگی طرح جانتا ہوں۔ وہ سیدھی سادی ہے اور سوہنی بھی ہے۔ پتا نہیں وہ اس لنگور کے چکر میں کیسے آگئی۔ مجھے تو یہ کوئی مجبوری کا معاملہ لگتا ہے۔ ویسے میں نے اپنی سی آئی ڈی لگائی ہوئی ہے، کچھ نہ کچھ پتا ضرور چلے گا۔ مجھے لگتا ہے اس منڈے نے کڑی کو کسی طرح پھنسایا ہوا ہے۔"

والی جی کے آنے کے بعد تین چار روز تو ہماری ٹیلی فونک گفتگو نہیں ہوئی مگر پھر سلسلہ دوبارہ چل نکلا۔ جس وقت ہماری بات چیت ہوتی والی جی یا تو سو رہے ہوتے تھے یا پھر موجود ہی نہیں ہوتے تھے۔ ہماری باتوں میں والی جی کا ذکر کثرت سے ہوتا تھا، خاص طور سے بلقیس صاحبہ تو بار بار ان کا ذکر چھیڑ دیتی تھیں۔ والی جی کی پریشانی، ان کے مسئلے! میں خود بھی دیکھ رہا تھا کہ والی جی کی ناقابل فہم پریشانی ہنوز برقرار ہے۔۔۔۔ یقیناً یہ صرف لڑکی ثمینہ والا معاملہ تو نہیں تھا کوئی اور بات بھی تھی۔ میں نے اس معاملے میں رونق علی سے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ اس کو "کلاس والے" کی شاندار برفی کھلائی۔ ساتھ میں الائچی والی دودھ پتی کا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

انتظام بھی کیا مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ رونق علی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ زمینداروں کے سو طرح کے بکھیڑے ہوتے ہیں۔ تین چار کیسوں کی تو تاریخیں ہی لاہور میں چل رہی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بیمار شمار بھی تو رہتے ہیں۔ خاص طور سے سخت گرمی اور سخت سردی میں ان کا برا حال ہو جاتا ہے۔

مجھے لگا کہ اس بارے میں رونق علی کو زیادہ پتا نہیں۔ رونق علی کا زیادہ وقت کھانے پینے یا ڈسکے کے چکر لگانے میں گزر جاتا تھا۔ مجھے ٹوہ لگی تھی کہ وہاں کسی نوراں بائی سے اس کا ملنا جلنا ہے۔

ایک رات مجھے والی جی کی پریشانی کے بارے میں جاننے کا موقع مل گیا۔ یہ کالی رات تھی۔ تاروں کی روشنی بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ میں چاچے عسکری کے پاس بیٹھا تھا اور اسے مشورہ دے رہا تھا کہ وہ ایک شادی اور کر لے۔ اس کی پہلی بیوی تو اب صرف سر پر دوپٹا باندھ کر ہائے ہائے کرنے کے لیے رہ گئی ہے۔ ایسی باتیں چاچے عسکری کے دل کو لگتی تھیں اور وہ اندر سے خوش ہو جاتا تھا۔ ہماری گفتگو جارہی تھی کہ چاچے عسکری کے کمرے میں رکھے

ہوئے بمبوکاٹ کی گھنٹی بج اٹھی۔ چاچے عسکری نے ریسیور اٹھایا۔ "جی سرکار!" اس نے آواز سنے بغیر کہا۔

دوسری طرف والی جی تھے۔ چاچے عسکری نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا اور دو تین بار "اچھا جی۔۔۔۔۔ اچھا سرکار۔" کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

میں سوالیہ نظروں سے چاچے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بتایا۔ "والی جی نے کہیں جانا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ صوفی اسلم جیپ کا تیل پانی چیک کرلے۔"

"اتنی رات کو کہاں جانا ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" چاچے عسکری نے کہا۔

چاچا عسکری صوفی اسلم کو بتانے چلا گیا۔ میں کچھ دیر اس کے کمرے میں بیٹھا رہا اور انٹرکام کو تکتا رہا۔ پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پتا نہیں کیوں میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کچھ جاننے کی کوشش کروں۔ آخر اتنی سردی میں رات کو دس بجے کے لگ بھگ والی جی جیپ پر کہاں جا رہے تھے؟

قریباً پون گھنٹے بعد جب والی جی کی جیپ کچے راستے پر اچھلتی کودتی کھیتوں کی طرف روانہ ہوئی تو میں بھی ایک گھوڑی پر سوار اس کے پیچھے تھا۔ میں نے جیپ سے خاصا فاصلہ رکھا تھا۔ جیپ کی عقبی سرخ بتیاں میری راہنمائی کر رہی تھیں۔ میں نے سردی اور شناخت سے بچنے کے لیے اپنا منہ سر ایک گرم چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ یہ کچا راستہ مکئی اور کماد کے وسیع و عریض کھیتوں کے اندر سے بل کھاتا گزرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر جیپ کی رفتار زیادہ تیز نہ ہوئی تو میں آسانی سے پیچھا جاری رکھ سکوں گا۔۔۔۔ اور رفتار تیز ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ ٹریکٹر ٹرالیوں اور بیل گاڑیوں نے بارشی پانی میں چل چل کر راستے کا حشر نشر کر رکھا تھا۔ جیپ کے اندر والی جی، چودھری عزیز اور ایک گن مین بیٹھے تھے۔ جیپ کی ہچکولے کھاتی روشنیاں آگے بڑھتی رہیں۔ کہیں کہیں جب جیپ اور گھوڑی کا درمیانی فاصلہ زیادہ ہوا تو میں نے اپنی گہری نسواری گھوڑی کھیتوں میں ڈال دی اور ایک طرح کا شارٹ کٹ لگا کر پھر جیپ کے نزدیک پہنچ گیا۔

سردیوں کی راتوں میں دیہاتی علاقے کا نقشہ عجیب ہوتا ہے۔ اوس میں بھیگے ہوئے سنسان راستے۔۔۔۔ حد نگاہ تک خاموش کھڑے کھیت اور ان کھیتوں میں کہیں کہیں ڈیروں کی

مدھم روشنیاں! ان روشنیوں کے گرد اکثر سفید دھند دکھائی دیتی ہے اور سردی کے احساس میں اضافہ کرتی ہے۔ جہاں کھیتوں کو تازہ پانی لگ رہا ہوتا ہے، وہاں سے ہلکا ہلکا دھواں نکلتا ہے۔ ٹھٹھرے ہوئے کتے شور مچاتے ہیں اور بھاگ بھاگ کر اپنے جسم کو گرم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بس کہیں کسی ڈھارے کی آڑ میں دو چار بندے گرم چادروں کی بکلیں مارے آگ تاپتے نظر آجاتے ہیں یا پھر کوئی مجبور کاشت کار لالٹین اور لاٹھی تھامے، کندھے پر کسّی رکھے حرکت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ میں ان مناظر کے درمیان سے گزرتا جیپ کی سرخ روشنیوں کا پیچھا کرتا رہا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ جیپ کا رخ قریبی گاؤں عاقل پور کی طرف ہے۔

درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچ کر جیپ رک گئی۔ یہاں پکی اینٹوں سے بنا ہوا ایک بہت بڑا گودام سا تھا۔ اس گودام کی چار دیواری مٹی اور گارے کی تھی۔ یہ گودام قریباً چار کینال میں پھیلا ہوا تھا۔ میں نے گھوڑی کو کافی فاصلے پر روک دیا اور ایک کیکر سے باندھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ والی جی، چودھری عزیز اور گن مین وغیرہ جیپ سے نکلے۔ ایک بڑی ٹارچ روشن کرکے وہ گودام کی دیوار کے آس پاس کا جائزہ لینے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ زمینیں والی جی

کی ہیں اور ان کی حد عاقل پور کے نمبر دار شہاب موکھل کی زمین سے ملتی ہے۔ یقیناً یہاں کوئی گڑبڑ تھی۔ دور سے صاف تو دکھائی نہیں دیتا تھا مگر پتا چلتا تھا کہ والی جی کی زمین میں پانی وغیرہ کھڑا ہے۔ یہ عجیب سی بُو والا پانی تھا اور گودام کی طرف سے آیا تھا۔ یہاں مجھے ایک چھوٹا سا فش فارم بھی دکھائی دیا۔ والی جی اور ان کے ساتھی کچھ دیر تک فش فارم کا جائزہ بھی لیتے رہے پھر وہ جیپ پر سوار ہوئے اور واپس ہو گئے۔

اگلے روز صبح دس بجے کے قریب میں گھوڑی پر سوار ہو کر پھر عاقل پور پہنچ گیا۔ گھوڑی کے ساتھ دو تھیلے لٹک رہے تھے۔ میرے پاس ایک شاٹ گن بھی تھی۔ اس شاٹ گن سے میں نے راستے میں چار پانچ فاختائیں ماریں۔ دو چار جل ککڑ شکار کیے اور انہیں جیبی چاقو سے ذبح کرکے تھیلے میں ڈال لیا۔ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں کسی خاص مقصد سے نہیں بلکہ شکار کرتے ہوئے اس طرف آنکلا ہوں۔ رات جس جگہ والی جی رکے تھے، میں وہاں پہنچا تو دور ہی سے ایک خاص طرح کی بدبو نتھنوں میں گھسنے لگی۔ یہ رات والی بو سے علیٰحدہ تھی اور فش فارم سے آرہی تھی۔ میں فش فارم پر پہنچا۔ فارم کا رکھوالا ہیڈ مالی گلاب دین کا بیٹا گلزار تھا۔ وہ بہت افسردہ سا ایک طرف بیٹھا تھا۔ میں فش فارم کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ فارم کے

پانی پر بے شمار مردہ مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ یہ پلی ہوئی رہو اور تھیلا مچھلیاں تھیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ سینکڑوں مچھلیاں اس بدبودار پانی کی وجہ سے مری ہیں جو گودام کی طرف سے آیا ہے۔ دکھ اور غصے کی ایک شدید لہر نے مجھے سرتاپا جھنجھوڑ دیا۔

"یہ کیا ہوا بھائی؟" میں نے گلزار سے پوچھا۔

"وہی جو پہلے ہوتا رہا ہے۔" گلزار نامی نوجوان نے افسردگی سے کہا۔ "موکھلوں نے شرارت کی ہے۔ اپنے کارخانے کا گندا پانی ہماری طرف چھوڑ دیا ہے۔" گلزار نے گودام نما عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

"تو یہ کارخانہ ہے؟" میں نے نوجوان سے پوچھا۔

"آہو جی۔ پہلے گودام تھا۔ اب یہ لوگ یہاں کوئی کام شام کرنے لگے ہیں۔ بڑا جہریلا پانی نکلتا ہے یہاں سے۔"

تب میں نے دھیان سے دیکھا۔ گودام یا کارخانے کی دیوار میں تازہ تازہ سوراخ کیا گیا تھا۔ اس سوراخ میں سیوریج کا ایک بڑا پائپ دھرا تھا۔ کارخانے کا پانی یقیناً اسی پائپ سے گزر کر کھیتوں تک اور پھر فش فارم تک پہنچا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کب ہوا ہے یہ؟"

"کل شام جی۔ میں وانڈے گیا ہوا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی شکیل یہاں تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا، کیا ہوا ہے۔"

"والی جی نے موکھلوں سے پوچھا نہیں؟"

"پوچھا تو جرور ہوگا جی۔۔۔۔ پر وہ لوک تو اپنی من مانی کرتے ہیں۔ ہمیں تو۔۔۔۔ یہی لگتا ہے کہ انہوں نے والی جی کو دبایا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"بس جی، ہم تو ملاجم لوک ہیں۔ ہمیں اندر کی باتوں کا زیادہ پتا نہیں۔ بس یہی اندازا ہے کہ موکھل اس جمین (زمین) کو والی جی سے لینا چاہتے ہیں۔ شاید ان کا ارادہ یہاں کارکھانہ بنانے کا ہے۔ اس لیے بات بے بات تنگ کرتے ہیں۔ آپ تو حویلی میں رہتے ہیں نا۔ آپ کو باہر کے حالات کا کم ہی پتا ہوگا۔ پچھلے مہینے بھی یہاں۔۔۔۔"

گلزار بولتے بولتے چپ ہو گیا۔اس کی آنکھوں میں ڈر کا سایہ سا لہرا گیا تھا۔میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔مجھے سفید شلوار قمیض والے دو بندے نظر آئے،وہ گودام کے اندر سے نکل کر ہماری طرف آ رہے تھے۔۔۔۔۔ مجھے لگا،میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی ہے۔

دونوں افراد کے پالش شدہ سیاہ جوتے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ان کے سفید کھڑ کھڑاتے کلف لگے کپڑوں سے ایک طرح کا غرور جھلکتا تھا۔میں نے ایک نگاہ گلزار کے زرد چہرے پر ڈالی اور اس سے پوچھا۔"یہ کون ہیں؟"

گلزار بولا۔"دائیں طرف چھوٹا موکھل ہے۔ساتھ میں اس کے مامے کا پتر ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں مردہ مچھلیوں کا جائزہ لیتے ہمارے پاس پہنچ گئے۔گلزار نے جس کو چھوٹا موکھل بتایا تھا،اس کی عمر پچیس چھبیس سال رہی ہو گی۔اس کی آنکھیں بھوری، بال ہلکے بھورے اور جبڑا خاسا چوڑا تھا۔اس کے ساتھی کا حلیہ بھی ملتا جلتا تھا۔چھوٹے موکھل نے استہزائیہ نظروں سے گلزار کو دیکھا اور بولا۔"اوئے! یہ تمہاری رہو مچھلیوں کو کیا بیماری پڑ گئی ہے؟"

گلزار نے جھجکتے ہوئے کہا۔"آپ کو سب پتا ہے چودھری صاحب!"

"اوئے! یہ کیا بات کر رہا ہے۔یہاں کار کھوالا تو ہے اور پتا ہم کو ہو گا۔۔۔۔۔اور سنا ہے کہ۔۔۔۔۔وہ تیرا والٹری صاحب بھی یہاں آیا ہوا تھا رات کو؟"

وہ والی صاحب کو تحقیر آمیز انداز میں والٹری صاحب کہہ رہا تھا۔

گلزار نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔میں نے کہا۔"یہ آپ کس کی بات کر رہے ہو؟"

چھوٹے موکھل نے مجھے بالکل نظر انداز کرتے ہوئے گلزار سے پوچھا۔"اوئے! یہ مانو بلی کون ہے؟"اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

گلزار کے بجائے چھوٹے موکھل کا ساتھی بولا۔"والٹری کی پالتو لگتی ہے۔شاید نئی بھرتی کے ساتھ آئی ہو گی۔"

میرے اندر آگ سی دہکنے لگی۔رگ پٹھے تن گئے۔میں نے کہا۔"تم لوگ منہ سنبھال کر بات کرو تو اچھا ہے۔اور یہ والٹری۔۔۔۔۔والٹری تم کس کو کہہ رہے ہو؟"

چھوٹا موکھل سرخ انگارہ ہو گیا۔تاہم بڑے اطمینان سے گلزار کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"والٹری اس کے خفیہ ابّے کا نام ہے۔کیا وہ اندر خانے تمہارا ابھی کچھ لگتا ہے؟"

میں لڑنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔۔ہر گز نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے یہاں کی صورتِ حال کا درست علم ہی نہیں تھا۔ مگر چھوٹے موکھل نے جو بات کہہ دی تھی وہ بہت بڑی تھی۔اب اس کا جواب دیے بغیر چارہ نہیں تھا۔میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی۔اس چادر میں مجھے بس چھوٹے موکھل کا چہرہ نظر آتا رہا، باقی سب کچھ بھول گیا۔

چھوٹے موکھل کے شاید وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کو اتنا سخت جواب اور اتنی جلدی ملے گا۔میرا طوفانی گھونسا اس کے تھوبڑے پر لگا تو وہ اچھل کر اپنے ہی کارخانے کے بدبودار پانی میں جا گرا۔

اس کا ساتھی پہلے تو ہکا بکا رہا پھر چنگھاڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔میں نے اس کی پسلیوں میں کہنی کی دو سخت ضربیں لگائیں۔جونہی اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی، میں نے پلٹ کر اس کے چہرے پر گھونسوں کی بارش کر دی۔یہی وقت تھا جب میں نے دیکھا کہ کارخانے کے اندر سے نمودار ہونے والے چار پانچ بندے بھاگتے اور للکارے مارتے ہوئے میری طرف آ رہے ہیں۔ان میں سے دو تین کے ہاتھ میں ہاکیاں تھیں۔آناً فاناً وہ میرے سر پر پہنچ گئے۔اگلے تین چار منٹ میں اس فش فارم کے کنارے ان سنسان کھیتوں کے درمیان زبردست رن پڑا۔آپ

نے فلموں، ڈراموں وغیرہ میں ایسے مناظر اکثر دیکھے ہوں گے اور بارہا سوچا بھی ہو گا کہ یہ ساری افسانوی باتیں ہوتی ہیں۔اکیلا بندہ پانچ چھ بندوں کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے؟ لیکن ایسا ہوتا ہے۔بہت سے لوگ ایسا کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں لیکن ایک بڑی ٹھوس بات میں آپ کو بتادوں، یہ سب کچھ سیکھنے سے یا کوشش کرنے سے نہیں مل سکتا۔نہ ہی اپنی جسمانی طاقت بڑھانے سے یہ صلاحیت حاصل ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے، اس سے تھوڑا بہت فرق پڑ جاتا ہو مگر حقیقت یہی ہے کہ لڑائی بھڑائی کی صلاحیت فطری ہوتی ہے اور اس کا تعلق اس اندرونی آگ سے ہوتا ہے جو بندے کے اندر گہرائی میں جلتی ہے اور بھڑکتی ہے۔۔۔۔پھر وہ شخص چاہے دبلا پتلا ہو، فن حرب سے بالکل ناآشنا ہو، بے وسیلہ ہو، بے آسرا ہو مگر وہ موقع پڑنے پر لڑ پڑتا ہے، بھڑ جاتا ہے۔مر جاتا ہے اور مار دیتا ہے۔قدرت جب کوئی اضافی چیز دیتی ہے تو پھر کچھ لیتی بھی ہے۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں میں لڑائی بھڑائی کی صلاحیت نہیں ہوتی انہیں قدرت نے کچھ اور اضافی صلاحیتیں دے رکھی ہوں اور یہ صلاحیتیں لڑائی بھڑائی سے کہیں زیادہ اہم ہوں۔

بہر حال، تین چار منٹ کے اس گھمسان کے رن میں، میں نے چھوٹے موکھل اور اس کے ساتھیوں کو دن میں تارے دکھا دیے۔ لڑائی کے آخری مرحلے میں، میں نے ایک ڈشکرے سے ہاکی چھین لی۔۔۔۔۔ میری گھمائی ہوئی ہاکی کی چوٹ جس جس کو لگی، وہ پھر وہاں ٹھہرا نہیں۔ سب سے پہلے چھوٹے موکھل کا سر پھٹا۔ وہ غلیظ گالیاں نکالتا اور دھمکیاں دیتا ہوا گودام کی طرف بھاگا۔ وہ چلا رہا تھا۔ "حرامزادو! دیکھ لوں گا۔۔۔۔ آج سب کو دیکھ لوں گا۔ آج گولیاں چلیں گی۔"

اس کے جانے کے بعد باقی افراد بھی اسی طرح گالیاں بکتے اور دھمکیاں دیتے ہوئے گودام کی طرف نکل گئے۔ ان میں سے اکثر کے چہروں پر تسلی بخش چوٹیں آئی تھیں۔ راہ فرار اختیار کرتے وقت ان کے چہرے حیرت زدہ تھے۔ یقیناً انہیں ہر گز توقع نہیں تھی کہ ایک اکیلا شخص اتنی شدید مزاحمت کرے گا اور انہیں آناً فاناً آگے لگا لے گا۔

اس سارے واقعے کے دوران میں فش فارم کا چوکیدار گلزار دم بہ خود کھڑا رہا تھا۔۔۔۔۔ اب بھی وہ کانپ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "یہ بہت برا ہوا ہے بھرا جی اب یہ لوگ ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔"

"کیا کر لیں گے؟" میں نے کپڑوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔

"یہ۔۔۔۔۔ یہ ابھی اسلحہ لے کر آجائیں گے۔ ہم کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" اس کے ساتھ ہی وہ اپنے گھوڑے کی طرف بھاگا جو ایک بیری کے نیچے بندھا ہوا تھا۔

وہ اتنا ڈر گیا تھا کہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنا بھی بھول گیا تھا۔ میں نے کمرے کو تالا لگایا اور خود بھی گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ ایک دو منٹ کے اندر ہم وہاں سے نکل گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

راجوال پہنچ کر میں نے رونق علی کو ساری صورتِ حال بتائی۔ اس کا رنگ بھی زرد ہو گیا۔ وہ پریشان لہجے میں بولا۔ "یار! یہ کام خراب ہوا ہے تم سے۔ اب موکھل اس کا بڑا سخت جواب دیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم سے کہا کس نے تھا وہاں جانے کو؟"

"میں نے بتایا تھا نا، میں تو شکار کرنے اس طرف نکل گیا تھا۔ میں نے کوئی منصوبہ تھوڑا ہی بنایا ہوا تھا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ وہاں کوئی چکر چل رہا ہے۔"

"پھر بھی کسی طرح کی حرکت کرنے سے پہلے تمہیں گلزار وغیرہ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔"

"رونق بھائی! چھوٹے موکھل نے بات ہی ایسی کر دی تھی کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ والی جی کے بارے میں بھی سخت بدتمیزی کر رہا تھا۔"

"اچھا، تم یہیں ٹھہرو۔ میں والی جی کو بتا کے آتا ہوں ساری بات۔" رونق علی نے کہا اور اپنی توند مٹکاتا ہوا باہر چلا گیا۔

میں وہیں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ آدھ پون گھنٹا گزر گیا مگر رونق علی واپس آیا اور نہ اندر کی صورتِ حال کا پتا چلا۔ بس ایک تبدیلی میں نے محسوس کی اور وہ یہ کہ حویلی کے بڑے پھاٹک کے پاس پہرے داروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ گھڑ برادر پہرے دار بھی اپنے کتوں کے ساتھ حویلی کے ارد گرد چکر لگانے لگے۔ لگتا تھا کہ والی صاحب اور چودھری عزیز وغیرہ کچھ زیادہ ہی محتاط ہو گئے ہیں۔ انہیں اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں موکھل براہ راست حویلی پر ہی نہ چڑھ دوڑیں۔

قریباً آدھ گھنٹا مزید گزرا اور پھر میں نے تین عدد سرپٹ گھڑ سواروں کو دیکھا۔ وہ راجوال ہی کے تھے۔ ان میں سے دو کے کپڑے لہولہان ہو رہے تھے۔ تیسرے کا سر پھٹا ہوا تھا۔ یہ

تیسرا شخص چاچے عسکری کا شاگرد خاص نصر اللہ تھا۔ میں دوڑ کر پھاٹک پر پہنچا۔ "کیا ہوا نصر اللہ؟" میں نے پوچھا۔

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "موکھلوں نے ڈیرے پر ہلا بولا ہے۔ تیس پینتیس بندے تھے۔۔۔۔ انہوں نے گولیاں بھی چلائی ہیں۔ ڈیرے کے دو کمروں کو آگ لگا دی ہے۔۔۔۔"

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ تو یہ تھا موکھلوں کا جواب! اسی دوران میں والی جی، چودھری عزیز اور رونق وغیرہ بھی باہر آ گئے۔ والی جی کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ انہوں نے ذرا ناراض نظروں سے میری طرف دیکھا پھر نصر اللہ وغیرہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نصر اللہ نے ہانپی ہوئی سانسوں کے ساتھ تفصیل بتائی اور آخر میں کہا۔ "برکت کو رائفل کی گولی لگی ہے۔ شریف کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ عباس ان دونوں کو ریڑھے پر لا رہا ہے۔ ملتانی کو وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پر کچھ آگے جا کر اور اس کے منہ پر کالک مل کر اسے واپس بھیج دیا ہے۔" عباس، ملتانی وغیرہ کے کارندوں کے نام تھے۔

اسی دوران میں وہ ریڑھا بھی نظر آ گیا جس پر دونوں زخمی آرہے تھے۔ ریڑھے پر روئی کا گدا بچھا کر دونوں زخمیوں کو اس پر لٹایا گیا تھا۔ برکت نامی کارندے کو رائفل کی گولی لگی تھی مگر شکر کا مقام تھا کہ بازو کا گوشت پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ ہاں، شریف کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور ریڑھے پر لگنے والے جھٹکوں نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ ڈیرے داروں کی ہانڈی روٹی پکانے کے لیے ایک درمیانی عمر کی کشمیری عورت صفیہ بھی ڈیرے پر موجود تھی۔ وہ بھی ریڑھے پر آئی تھی۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ اس کے ساتھ کھینچا تانی کی گئی تھی۔ اس کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ اسے کئی جگہ بے دردی سے نوچا گیا تھا۔ اس نے اپنے جسم پر نیلگوں نشان دکھائے جن مین سے خون رس رہا تھا۔

چودھری عزیز نے نصراللہ سے پوچھا۔ "ڈیرے کی آگ بجھائی ہے یا وہ بھی جلتی چھوڑ آئے ہو؟"

"نہیں جی، آگ تو بجھا کر آئے ہیں پر۔۔۔۔۔ پتا نہیں جی۔۔۔۔۔ کہ وہ خبیث پھر آ جائیں۔ وہ بہت غصے میں تھے اور بار بار پوچھ رہے تھے کہ وہ تمہارا وڈا بدمعاش کہاں ہے۔ اس کو

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سامنے لاؤ۔ ہم ابھی اس کے ٹوٹے کریں گے۔ ہمیں نہیں پتا کہ وہ کس کی بات کر رہے تھے۔ لگتا ہے کہ ہمارے کسی بندے کے ساتھ آج ان کا جھگڑا ہوا ہے۔"

چودھری عزیز نے خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا اور منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

کچھ ہی دیر میں مقامی حکیم اور پہلوان وغیرہ آ گئے۔ زخمیوں کی مرہم پٹی شروع ہو گئی۔ پہلوان نے، جسے خلیفہ جی کہا جا رہا تھا۔ شریف کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے گرد سیدھی لکڑیاں رکھنے کے بعد پٹی لپیٹنا شروع کر دی۔

اس واقعے کے بعد حویلی میں ہلچل سی نظر آنے لگی تھی۔ چہرے سراسیمہ دکھائی دے رہے تھے۔ سرگوشیاں کی جا رہی تھیں۔ تنہائی ملتے ہی چودھری عزیز مجھ پر برس پڑا۔ "تمہیں کیا ضرورت تھی اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کی؟ اور اگر اتنی ہی دلیری چڑھی ہوئی تھی تو پھر وہاں سے بھاگے کیوں تھے؟ ادھر ہی رک کر ڈانگ سوٹا کرنا تھا ان سے۔"

"میں نے رونق صاحب کو سب کچھ بتایا ہے جی۔ جو کچھ ہوا بالکل اتفاقی طور پر ہوا۔ مجھے بالکل بھی پتا نہیں تھا کہ ان لوگوں سے پہلے ہی جھگڑا وغیرہ چل رہا ہے۔ میں نے وہاں سے آتے ساتھ ہی رونق صاحب کو ساری تفصیل بتا دی تھی۔"

"دراصل،اس میں تھوڑی سی غلطی ہماری بھی ہے۔"رونق علی نے چودھری عزیز کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔"ہم سمجھتے رہے کہ وہ لوگ حویلی کی طرف آئیں گے،پر وہ باغ والے ڈیرے کی طرف چلے گئے۔"

"سانپ کی لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں۔یہ سوچو کہ اب کیا کرنا ہے۔اس بات کو بڑھانا ہے یا یہیں پر ختم کرنے کی کوشش کرنی ہے۔"والی جی نے کہا۔

قریباً ایک گھنٹے تک صلاح مشورہ ہوتا رہا۔اس واقعے کی خبر بڑی تیزی سے ارد گرد کے دیہات تک پہنچ گئی۔والی جی کے عزیز،رشتے دار اور ہم خیال زمیندار حویلی پہنچنے لگے۔پھاٹک کے سامنے کئی ایک سجے سجائے تانگے جمع ہو گئے۔کئی افراد کے ساتھ گن مین بھی موجود تھے۔یہ گن مین کارندے اور کوچوان احاطے میں اور پھاٹک کے ارد گرد دکھائی دینے لگے۔ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے اور وہ بھڑکیلے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔حویلی کی بہت بڑی بیٹھک میں دروازے بند کر کے کافی دیر تک صلاح مشورہ ہوتا رہا۔کچھ دیر بعد چاچا عسکری باہر آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ مجھے بھی اندر طلب کیا گیا ہے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں اندر پہنچا۔بیٹھک میں بڑے بڑے موڑھوں پر اور رنگ دار پلنگوں پر اونچی پگڑیوں والے کوئی دو درجن چودھری اور زمیندار موجود تھے۔حقے گڑگڑائے جا رہے تھے اور چائے کی پیالیاں یہاں وہاں دھری تھیں۔والی جی نے مجھے ایک موڑھے پر بیٹھنے کا حکم دیا اور کہا کہ میں واقعے کی تفصیل بتاؤں۔میں نے وہ سب کچھ گوش گزار دیا جو پہلے کیا تھا۔میں نے کہا،مجھے بالکل خبر نہیں تھی کہ وہاں فش فارم پر کیا چکر چل رہا ہے۔ان لوگوں نے گالی دی جو مجھ سے برداشت نہیں ہوئی اور میں لڑ پڑا۔میں نے لڑائی کی ساری تفصیل بتائی۔۔۔۔بیچ بیچ میں چودھریوں نے سوالات بھی کیے۔

آخر میں والی جی نے اپنی کرسی پر پہلو بدلا اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔"میرے خیال میں ہم اس معاملے کو جتنا بڑھائیں گے بڑھتا جائے گا۔مجھے چودھری فیاض کا یہ مشورہ ٹھیک لگ رہا ہے کہ ہم اپنی تیاری پوری رکھیں اور حالات کا رخ دیکھیں۔اگر یہ بات یہیں پر بس ہو جاتی ہے تو پھر ٹھیک ہے لیکن اگر موکھلوں کی طرف سے کوئی نئی شرارت ہوتی ہے تو پھر ہم چپ نہیں رہیں گے۔اس کا ٹھیک ٹھاک جواب دیں گے۔"

چودھری عزیز نے کہا۔"پر بھائیا جی! انہوں نے گولی چلائی ہے، ہمارے ڈیڑے کو آگ لگائی ہے۔ ہماری ملازمہ کے ساتھ بد تمیزی کی ہے۔"

والی جی بولے۔"ٹھیک ہے کہ ان لوگوں نے زیادتی کی ہے، پر وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہل ہماری طرف سے ہوئی ہے۔ ہمارے بندے نے مچھلی فارم پر ان کے بندوں کے سر پھاڑے ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو ابھی تک حساب برابر ہے۔ اگر ان لوگوں نے ڈیرے پر مار کٹائی کی ہے تو ہمارے اکیلے بندے نے بھی ان کے چھ سات ڈشکروں کو آگے لگایا ہے۔ اور ان میں خیر سے چھوٹا موکھل بھی شامل تھا۔ اب یہ بات چھپی نہیں رہنی ہے کہ ان کے چھ سات بندے اکیلے بندے کے سامنے بھی نہ ٹھہر سکے اور بھاگ گئے۔"

"لیکن اصل جھگڑا تو پھر بھی اپنی جگہ ہے نا۔" چودھری عزیز نے کہا۔"وہ آئے دن کوئی نہ کوئی حرکت کرتے رہتے ہیں۔ اب کوئی پچاس ہزار روپے کی مچھلی ضائع ہوئی ہے ان کی وجہ سے۔۔۔۔اس سے پہلے انہوں نے۔۔۔۔"

والی جی نے ہاتھ اٹھا کر چودھری عزیز کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولے۔"یہ سب کچھ ٹھیک ہے اور یہ سارا ایک علیحدہ معاملہ ہے۔ اس کے بارے میں گل بات ہو رہی ہے۔ اگر گل بات سے معاملہ طے نہ ہوا تو پھر قانون تو ہے ہی۔۔۔۔"

میری موجودگی میں دس پندرہ منٹ مزید بات چیت ہوئی پھر مجھے باہر بھیج دیا گیا۔۔۔۔ میرے باہر آنے سے پہلے ایک دو چودھریوں نے میری جی داری کی تعریف کی اور شاباش دی۔

گیٹ پر ایک ٹریکٹر ٹرالی کھڑی تھی۔ اس ٹرالی میں والی جی کے بڑے بیٹے اعجاز کے کارندے تھے۔ ان پندرہ بیس افراد میں سے تین چار کے پاس پکی رائفلیں تھیں۔ باقی بھی لاٹھیوں وغیرہ سے مسلح تھے۔ اعجاز، والی جی کی پہلی بیوی سے تھا اور چاول صاف کرنے کا کاروبار کرتا تھا۔

باہر آکر میں نے مچھلی فارم کے نگران گلزار کو ڈھونڈا اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں نے اس سے کہا۔"یار! مجھے تفصیل سے بتاؤ، یہ سارا معاملہ ہے کیا؟"

گلزار نے کہا۔ "بھرا جی! جہاں تک مجھے پتا ہے، موکھلوں کا یہ گودام پہلے پہل چاول رکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہ کافی پرانی گل ہے، کوئی وی سال پہلے کی۔ ان دنوں ساتھ والی جمین بے آباد ہی تھی۔ موکھلوں کے باپ نے جواب اللہ بخشے ہو چکا ہے، گندے پانی کا ایک پائپ ہماری جمین کے نیچے سے گزارا تھا۔ یہ پائپ آگے جا کر چھپڑ میں گرتا ہے۔ اب اسی پائپ کو بہانہ بنا کر موکھلوں نے رولا ڈالا ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جمین کے اندر سے ہمارا پائپ گزر رہا ہے۔۔۔۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ہماری جمین ہے۔ در اصل بھرا جی۔۔۔۔ ان کی نجر اس ساری کی ساری جمین پر ہے۔ میرے انداجے کے مطابق وہ والی جی کو اونے پونے پیسے دے کر یہ ساری جمین اپنے کارکھانے کے لیے لینا چاہتے ہیں۔"

"اس کارخانے میں یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ٹھیک سے پتا نہیں جی۔ ٹریکٹر ٹرالیوں میں جانور کی کھالیں آتی ہیں یہاں۔ بڑی بو آتی ہے۔"

"کھالوں کو صاف کرتے ہیں؟"

"ہاں جی۔ ڈاکیا لطیف یہی بتا رہا تھا۔ کھالوں کو دھوتے اور سکھاتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد گلزار چلا گیا مگر میں بے چینی سے اپنے مختصر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ رگوں میں جوان خون اچھالے مار رہا تھا۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ والی جی کی حالت اس تھکے ہوئے بوڑھے بادشاہ کی سی ہے جو حالات سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو چکا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جتنا وقت بھی خیر و عافیت سے گزر جائے، غنیمت ہے۔ اس کی کمزوری اور مصلحت اندیشی اس کے ساتھیوں پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے اور وہ بھی حالات سے نظریں چرا رہے ہیں۔

موکھلوں نے دھمکی دی تھی کہ وہ مجھے ڈھونڈیں گے اور میں جہاں بھی ملوں گا، وہ میری ہڈی پسلی توڑ کر چارپائی پر ڈال دیں گے۔۔۔۔ تو میں کیوں اس انتظار میں رہتا کہ وہ مجھے ڈھونڈیں اور میرے ساتھ اپنا کھاتا کھولیں۔۔۔۔ کیوں نہ میں خود انہیں ڈھونڈ لیتا اور ان سے کہتا کہ بھئی! جو سانپ تم نے نکالنا ہے، آج ہی نکال لو۔

میں نے ساری صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اس وقت والی جی کے بہت سے عزیز اور یار دوست حویلی میں جمع تھے۔ چالیس پچاس مسلح کارندے بھی جمع ہو چکے تھے۔ والی جی کے اپنے کارندے بھی الرٹ نظر آتے تھے۔ تو جو کچھ بعد میں ہونا تھا، کیوں نہ آج ہی ہو جاتا۔ میں جو

کچھ سوچ رہا تھا، اس میں والی جی اور ان کے ساتھیوں کو ناراض ہونے کا اندیشہ تو تھا، مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ خاموشی ہمیں زیادہ مہنگی پڑے گی۔

سہ پہر دو ڈھائی بجے کا وقت تھا جب میں نے عسکری سے پوچھا کہ اب باغ والے ڈیرے پر کون ہے؟

"کوئی بھی نہیں۔ سارے وہاں سے آ گئے ہیں۔"

"اس طرح ڈیرا خالی چھوڑنے سے تو ان کی ہمت اور بڑھے گی۔"

"دراصل موکھلوں کا ایک کھوہ ہمارے ڈیرے سے بس دو پیلی (کھیتی) کے فاصلے پر ہے، ابھی موکل بُھوتے ہوئے ہیں۔ اگر ڈیرے پر ہمارے بندے ہوئے تو پھر لڑائی ہو سکتی ہے۔"

"تو لڑائی کے ڈر سے اب ڈیرا خالی رہے گا؟"

"نہیں۔۔۔۔بس وقتی طور پر۔ کل تک معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے گا تو نصراللہ وغیرہ چلے جائیں گے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"پر وہاں جو آگ لگائی تھی، وہ پھر بھڑک اٹھی تو کیا ہو گا؟"

"ہاں، یہ ڈر تو ہے۔" عسکری نے کہا۔

"میں ڈیرے کا چکر لگانے جا رہا ہوں۔" میں نے پورے عزم سے کہا۔

عسکری نے مجھے گھورا۔ "نہیں نہیں۔۔۔۔۔یہ ٹھیک نہیں۔ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔"

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ٹھیک ہو جائے۔ آج کل کا رواج ہی یہ ہے۔ ڈرنے والے کو اور ڈرایا جاتا ہے۔ اور پھر میں اپنے ڈیرے پر جا رہا ہوں، کسی دوسرے کی حد میں تو نہیں گھس رہا۔"

"والی جی نے بہت ناراض ہونا ہے۔"

"تو ہو جائیں ناراض۔ نوکری سے ہی نکال دیں گے نا۔"

"تم ان سے بات کر لو۔ ہو سکتا ہے، اجازت دے دیں۔"

"تم خود بات کر لو چاچا۔۔۔۔ان سے کہنا، خاور ڈیرے کا چکر لگانے گیا ہے۔ ہوا چل رہی ہے، دیکھنے گیا ہے کہ کہیں آگ پھر نہ بھڑک اٹھے۔"

چاچا عسکری مجھے روکتا رہ گیا۔ میں آناً فاناً گھوڑی پر بیٹھا اور حویلی کے پھاٹک سے نکل آیا۔ ارد گرد موجود کارندے مجھے پُر تجسس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ بات ہر کسی کے کان تک پہنچ چکی تھی کہ اکیلے ایک بندے نے موکھلوں کے چھ سات بندوں کی دوڑ لگوائی ہے۔

بھرا ہوا پستول میری قمیض کے نیچے تھا۔ میں کچے راستوں پر گھوڑی دوڑاتا ہوا بیس پچیس منٹ میں باغ والے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ دو جلے ہوئے کمروں میں سے اٹھنے والا ہلکا ہلکا دھواں دور ہی سے نظر آرہا تھا۔ میں نے گھوڑی ڈیرے کے اندر داخل کر دی۔ توڑ پھوڑ کے آثار نظر آرہے تھے۔ ایک دو دیواروں پر گولیاں لگی ہوئی تھیں۔ سامنے ہی قریباً دو تین کھیتوں کے فاصلے پر موکھلوں کا کھوہ تھا۔ کھوہ کو ایک اونٹنی چلا رہی تھی۔ موکھلوں کے گھوڑے اور ان کے مسلح کارندے چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔

میں نے ہینڈ پمپ چلایا اور ملبے میں سے جہاں جہاں دھواں اٹھ رہا تھا وہاں چھڑکاؤ کیا۔ میری نظریں اور میرے کان موکھلوں کے کھوہ کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔ پھر ایک دم میرے سینے میں دھڑکن کا نقارہ گونج اٹھا۔ میں نے موکھلوں کے آٹھ دس گھڑ سوار دیکھے، وہ کھوہ کی طرف سے تیزی کے ساتھ ڈیرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے دس پندرہ پیدل

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کارندے بھی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں چمکارے مار رہی تھیں۔ ان کے پگڑ اور رنگ برنگے لاچے، جیسے جوش سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔

میں نے اپنے عقب میں راجوال کی طرف دیکھا۔ راجوال سے آنے والا راستہ خالی دکھائی دیتا تھا مگر مجھے امید تھی کہ یہ زیادہ دیر خالی نہیں رہے گا۔ مجھے یقین تھا کہ چاچے عسکری کی اطلاع کے بعد والی جی نے میرے پیچھے گھڑ سوار روانہ کر دیے ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ ان گھڑ سواروں سے کہا گیا ہو، وہ مجھے ڈیرے سے بہ حفاظت واپس لے آئیں۔

دو تین منٹ میں موکھل میرے سر پر پہنچ گئے۔ مجھے ٹھیک سے پہچاننے کے بعد ان کی آنکھیں قہر برسانے لگیں۔ چھوٹا موکھل سب سے آگے تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی تھی۔ وہ جست لگا کر گھوڑے سے اترا اور پھنکارا۔ "اچھا ہے تو خود چل کر آگیا ہے۔ نہیں تو ہم نے تجھے تیری ماں کی بغل سے بھی کھینچ کر نکال لینا تھا۔"

ایک دوسرا شخص بولا۔ "لگتا ہے، جوانی کچھ زیادہ ہی اچھالے مار رہی ہے اس کے اندر۔" پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "چلو بھئی! نکالو اس کا چار پانچ سیر خون۔۔۔۔ طبیعت بحال کرو ذرا اس کی۔"

چار پانچ افراد گھوڑوں سے چھلانگیں لگا کر نیچے اتر آئے۔انہوں نے رائفلیں میری طرف سیدھی نہیں کی تھیں۔ میں نے بھی پستول نہیں نکالا۔وہ مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ڈر بھی رہے تھے۔یقیناً ان کی آنکھوں کے سامنے آج صبح والے مناظر گھوم رہے تھے۔۔۔۔۔پھر اچانک ایک شخص کا داؤ چل گیا۔اس پہلوان نما شخص نے پیچھے سے آکر وزنی لاٹھی کی بھرپور ضرب میرے سر کے عقبی حصے پر لگائی۔لاٹھی نے ہوا کو کاٹتے ہوئے جب "شائیں" کی آواز پیدا کی تو مجھے خطرے کا احساس ہوا لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچے اور میں گھٹنوں کے بل گر گیا۔ موکھلوں کے بندے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔پہلوان نما شخص نے مجھے پیچھے سے اپنے جپھّے میں جکڑ لیا اور باقی اندھا دھند مارنے لگے۔وہ بے دریغ مجھ پر گھونسے ٹھوکریں برسا رہے تھے۔ اچانک مجھے موقع مل گیا۔میں نے پہلوان کی ناک پر سر کے پچھلے حصے کی ٹکر رسید کر کے خود کو اس کے جن جپھّے سے چھڑا لیا۔اس کے ساتھ ہی آج سویرے والا منظر پھر دہرایا جانے لگا۔میں نے اپنے ارد گرد موجود افراد کو کڑے ہاتھوں لیا۔میری دھواں دھار ٹکروں اور گھونسوں نے ان میں کھلبلی مچا دی۔بہر حال، وہ تعداد میں زیادہ تھے۔کسی بھی وقت میں چاروں شانے چت ہو سکتا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

یہی وقت تھا جب مجھے کمک مل گئی۔ڈیرے کے عقب سے ہوائی فائرنگ کی آواز سنائی دی پھر میرے گھڑ سوار ساتھی للکارے مارتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ان میں میرا لنگوٹیا یار تیمور۔۔۔۔۔باگو، ملتانی اور چاچا عسکری سب سے آگے تھے۔

"تگڑا ہو جا خاورے! ہم آگئے ہیں۔" تیمور نے نعرہ مستانہ بلند کیا۔

پلک جھپکتے میں ڈیرے کے اندر اور باہر گھمسان کا رن پڑ گیا۔دونوں طرف سے زبردست لاٹھیاں چلنے لگیں۔شروع میں دونوں فریقوں نے گولی چلانے سے گریز کیا۔لیکن پھر کسی ایک کی طرف سے گولی چلائی گئی اور اس کے ساتھ ہی صورتِ حال سنگین تر ہو گئی۔تڑاتڑ فائرنگ ہونے لگی۔میں نے موکھلوں کے ایک بندے کو گولی کھا کر بھینس کی کھرلی میں گرتے ہوئے دیکھا۔چاچے عسکری کو گولی لگی اور وہ کراہتا ہوا میرے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔میں بھی اپنا پستول نکال چکا تھا۔ایک دیوار کی آڑ لے کر میں بھی گولی چلانے لگا۔لگتا تھا کہ صورتِ حال خراب تر ہو جائے گی اور آٹھ دس لاشیں گر جائیں گی مگر اچانک درختوں کی طرف سے سیٹیوں کی آواز سنائی دی۔یہ پولیس کے گھڑ سوار تھے جو درختوں سے نکل کر موقعہ واردات کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"نکل جاؤ بھئی !" میرے کانوں میں چھوٹے موکھل کی آواز پڑی۔

دیکھتے ہی دیکھتے موکھل اور اس کے کارندے اور عزیز اپنے کنوئیں کی طرف واپس بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ سب کماد کی لمبی فصل میں گھس گئے۔ بس گھڑسواروں کے بالائی دھڑ فصل سے باہر نظر آتے رہے۔

میرے اندازے کے عین مطابق پولیس والوں نے بھی جان بوجھ کر دیر لگائی تا کہ موکھلوں کو بھاگنے کا موقع مل جائے اور خوامخواہ ان کا پولیس سے ٹاکرا نہ ہو۔

موقعے پر تقریباً تین منٹ تک فائرنگ ہوئی تھی۔ تاہم اس فائرنگ میں کوئی شدید جانی نقصان نہیں ہوا۔ دونوں طرف کے دو دو بندے زخمی ہوئے۔ ہاں، لاٹھیوں وغیرہ کے زخم کافی لوگوں کو آئے۔ موکھلوں کا ایک اضافی نقصان بھی ہوا۔ ان کے ایک قیمتی گھوڑے کے سر پر رائفل کی گولی لگی اور وہ مردہ حالت میں ڈیرے کے سامنے ہی پڑا رہ گیا۔

اس لڑائی میں کسی کی ہار جیت تو نہیں ہوئی تھی، تاہم اس سے راجوال والوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ خاص طور سے حویلی والوں کو یقین ہو گیا کہ موکھلوں سے ٹکر

لینا ناممکن نہیں ہے۔ ان کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ بھی دیا جا سکے تو کم از کم اینٹ سے ضرور دیا جا سکتا ہے۔

پولیس نے دونوں پارٹیوں کے تین تین بندوں کو حراست میں لیا۔ موکھلوں کی طرف سے جو پرچہ درج کروایا گیا، اس میں میرا نام نمایاں تھا۔ تھانیدار افضال ساہی مجھے گرفتار کرنا چاہتا تھا مگر والی جی نے میری گرفتاری دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا اثر ورسوخ کام آیا اور تھانیدار نے تعداد پوری کرنے کے لیے ایک اور کارندے کی گرفتاری ڈال دی۔

در حقیقت اس لڑائی کے بعد والی جی اور ان کے قریبی ساتھیوں نے خود کو ایک دم ہلکا پھلکا اور خوش باش محسوس کیا۔ موکھلوں کی زیادتی کا جواب نہ دے سکنے کا جو ذہنی احساس ان کے دلوں کو افسردہ کر رہا تھا، وہ اب ختم ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے کے بعد میرا بھی خاصا چرچا ہوا۔ خاص طور سے یہ بات دیکھتے ہی دیکھتے ہر ایک کی زبان پر آگئی کہ میں نے مچھلی فارم کی لڑائی میں تن تنہا موکھلوں کے چھ سات بندوں کو بھگایا ہے۔ اپنے ساتھیوں اور گاؤں کے لوگوں کی آنکھوں میں، میں تحسین کے جذبات صاف طور پر محسوس کر رہا تھا۔ رونق

علی میری کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا۔ وہ مجھے اپنی دریافت سمجھتا تھا اور اس وجہ سے میری کسی کامیابی کی خوشی اسے ضرورت سے زیادہ ہوتی تھی۔

چاچے عسکری کی مرہم پٹی پہلے گاؤں میں کی گئی۔ پھر اسے مزید علاج اور ڈاکٹری ملاحظے کے لیے ڈسکے بھیج دیا گیا۔ گولی اس کے ماس کے اندر ہی تھی۔ چاچے عسکری کے ڈسکے جانے سے مجھے ایک بار پھر اس کے کمرے میں سونے اور بیگم بلقیس سے رات کو باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ بیگم بلقیس کا فون رات دس بجے کے لگ بھگ آیا۔ انہوں نے سب سے پہلے میری خیر خیریت پوچھی پھر مسکراتے لہجے میں بولیں۔

"ہر طرف تمہاری ہی باتیں ہو رہی ہیں بھئی۔ سارے تمہاری تعریف کر رہے ہیں۔"

"مجھے ساروں سے غرض نہیں۔ اگر آپ اور والی جی مجھ سے خوش ہیں تو پھر میرے لیے واقعی خوشی کی بات ہے۔"

"والی جی بھی خوش ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے سامنے تمہاری زیادہ تعریف نہیں کر رہے کہ تم کہیں زیادہ ہی نڈر نہ ہو جاؤ لیکن وہ اندر سے بہت خوش ہیں۔ کہہ رہے تھے، اس منڈے میں بات ہے۔"

"اور آپ کیا کہتی ہیں؟"

"ہاں بھئی، منڈے میں بات ہے۔" انہوں نے کہا اور دبی آواز میں ہنسنے لگیں۔ پھر ذرا سنبھل کر بولیں۔ "تم بہت خطرناک ہو۔ تم جان بوجھ کر باغ والے ڈیرے پر گئے تھے۔ آگ دیکھنے کا تو بس بہانہ ہی تھا۔ تم چاہتے تھے کہ جو ہونا ہے، آج ہو جائے۔"

میرے جسم پر کئی چھوٹی موٹی چوٹیں تھیں مگر لحاف کی خوشگوار گرمی اور بیگم جی کی باتوں کی مزیدار حرارت نے ساری تکلیف بھلا دی۔ یخ بستہ، سرسراتی ہوئی رات کی آغوش میں ہماری باتیں طویل ہوتی چلی گئیں۔ بہت جلد ہم اپنی اصل ڈگر پر آ گئے۔ وہ ڈگر جس پر چلتے ہوئے عجیب سی جوش کا احساس ہوتا تھا۔ سانسیں تیز چلنے لگتی تھیں، دھڑکن بڑھ جاتی تھی۔ بدن میں میٹھا میٹھا۔۔۔۔لذت دیتا درد جاگتا تھا اور کسی کو حقیقت میں چھونے اور محسوس کرنے کی خواہش بہت بڑھ جاتی تھی۔ ہم اب بہت بے باک ہو چکے تھے۔ خاص طور سے میں کچھ زیادہ ہی کھلتا جا رہا تھا۔ میں نے ہونٹوں سے چومنے کی آواز پیدا کی اور کہا۔ "پوچھیں، کہاں پیار کیا؟"

وہ شرم سے بوجھل لہجے میں بولیں۔ "کہاں؟"

"پیشانی پر۔۔۔۔اور اب؟" میں نے دوبارہ چومنے کی آواز نکالی۔

"کہاں؟"

"آپ کی پیاری سی ناک پر۔۔۔۔اور اب؟" پھر چومنے کی آواز نکالی۔

"کہاں؟"

"آپ کے۔۔۔ہو۔۔نٹو۔۔ں۔۔۔پر۔"

اور پھر یہ سلسلہ حسب معمول چلتا رہا۔ بمبو کاٹ پر ہماری سرگوشیاں سرسراتی رہیں۔ کچھ دیر بعد بیگم جی نے ایک گہری درد بھری سانس لی اور بولیں۔ "خاور! ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس سے؟"

"اس سے آگے جانے سے۔"

"کیا مطلب؟"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ہم یہاں تک آ تو گئے ہیں۔ اب اس کے بعد جو کچھ ہو گا، وہ بہت خطرناک ہے۔ تم جانتے ہی ہو، یہ مردوں کی دنیا ہے۔ ان کی بڑی بڑی غلطیاں معاف ہو جاتی ہیں مگر عورت کی چھوٹی سی غلطی پر قیامت آ جاتی ہے۔۔۔۔اور پھر ایسی عورت جو بیاہی ہوئی بھی ہو۔"

"بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

وہ بولیں۔ "کبھی تم نے سوچا ہے کہ جو کچھ۔۔۔۔ہم کر رہے ہیں اس کا آخر کیا ہو گا۔ وہ کیا کہتے ہیں انجام!"

"ذہن میں سوچ تو آتی ہے لیکن پھر آپ کی سوچ اتنی تیزی سے آتی ہے کہ باقی ہر سوچ پر حاوی ہو جاتی ہے۔"

"پر میں سوچتی ہوں اور ایک دم کانپ جاتی ہوں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ بیگم جی کو اندازہ ہوا کہ گفتگو کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئی ہے اور میں بھی ایک دم بجھ گیا ہوں۔ انہوں نے میری ٹمٹماتی روشنی کو تیز کرنے کے لیے ایک دم موضوع بدلا اور ہنستے ہوئے بولیں۔ "آج کل گھر میں ہر وقت تمہاری ہی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔۔۔۔حامد بھی کسی نہ کسی بہانے سے تمہارا ذکر چھیڑتا رہتا ہے۔ آج ماسٹر چاچا نے مجھے

شاباش دی۔۔۔۔آج ماسٹر چاچانے میرے ساتھ گیند بلا کھیلا۔کل میں اور ماسٹر چاچا مچھلیاں پکڑنے جائیں گے۔۔۔۔پرسوں پتاہے نا، تم سارادن اندر نہیں آئے تھے۔پتاہے والی جی نے کیا کہا؟"

"کیا کہا۔"

"نہیں رہنے دو۔" وہ ادا سے بولیں۔

"دیکھیں،اب آپ آدھی بات کررہی ہیں۔یہ ٹھیک نہیں۔"

وہ شرمیلے انداز میں ہنس کر کہنے لگیں۔"شام کے وقت والی جی مجھ سے بولے، صبح سے میرے سر میں درد ہورہاہے۔میں کہتا تھا کہ ایک دو گولی لے کر کھاؤں گا مگر وہ تمہارا چہیتا ماسٹر صاحب آج آیا ہی نہیں۔میں ایک دم ٹھٹک گئی۔میں نے کہا۔میرا چہیتا کیوں ہونے لگا؟ چہیتا تو آپ کا ہے۔ایک دن نظر نہ آئے تو آپ کو اوازاری ہونے لگتی ہے۔ مسکرا کر کہنے لگے، چلو میرا ہی سہی لیکن وہ ہے کہاں؟"

بیگم جی کی بات نے مجھے بھی ٹھٹکا دیا۔پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی مجھے بھی احساس ہوتا تھا کہ والی جی اتنے بے خبر نہیں، جتنا ہم انہیں سمجھتے ہیں۔انہیں کچھ نہ کچھ خبر ہے۔اگر خبر ہے تو پھر وہ

چپ کیوں ہیں؟ کیا جان بوجھ کر ڈھیل دے رہے ہیں؟ کیا وہ پکے ثبوتوں کے ساتھ پکڑنا چاہتے ہیں؟ کیا ان کا خیال ہے کہ ہمارا تعلق صرف ہنسنے بولنے تک محدود رہے گا اور وہ اس حوالے سے تھوڑی سی رعایت دے رہے ہیں؟ کئی سوال ذہن میں ابھرے لیکن حتمی جواب کوئی نہیں تھا۔

ہماری گفتگو نے ایک بار پھر رومانی انداز اختیار کیا اور رات کے ڈھائی تین بجے کے قریب ختم ہوئی۔گفتگو کے دوران میں، میں جب بھی کوئی فقرہ شروع کرنے سے پہلے کہتا۔۔۔۔ "یقین کریں" وہ فوراً ذرا شوخی سے میری بات کاٹتیں اور کہتیں "نہیں کرتی" ان کی سوالیہ "بس؟" کی طرح یہ بھی ان کی ایک خوبصورت ادا تھی۔۔۔۔انسان کی فطرت ہے کہ وہ ایک جگہ ٹھہرنا نہیں چاہتا۔دلکش سے دلکش مناظر بھی بہت جلد اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی کشش کھو دیتے ہیں۔وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے۔نئے رستے اور نئے منظر دیکھنا چاہتا ہے۔دیوار کے پار کیا ہے؟ اس پہاڑ کی دوسری طرف کیا ہے۔۔۔۔سمندر کا اگلا کنارہ کہاں ہے؟ اس طرح کے سوالوں کے بیج قدرت نے انسان کی فطرت میں بو دیے ہیں۔

چند اور راتیں گزریں اور پھر بمبو کاٹ پر ہونے والی گرم گرم گفتگو بھی مجھے کم دلچسپ محسوس ہونے لگی۔ اس گفتگو کے عموماً تین حصے ہوتے تھے۔ ایک حصے میں بیگم بلقیس اپنی گھریلو باتیں کرتی تھیں، اپنے میکے اور اپنے بھائی بہنوں کی باتیں سناتی تھیں۔ ایک حصے میں میری درخواست پر وہ اپنی آواز کا جادو جگاتی تھیں۔ ہیر پڑھتی تھیں، کوئی لوک گیت گاتی تھیں اور آخر میں ہمیشہ بڑی ادا سے پوچھتی تھیں۔۔۔۔۔ بس؟ گفتگو کا تیسرا حصہ خالص رومانی ہوتا تھا۔ ہم تصور میں ایک دوسرے کے بالکل قریب آجاتے تھے۔ لیکن اب تصور کی دلکشی کم ہوتی جارہی تھی اور حقیقی لمس کی ضرورت بڑھ رہی تھی۔ کم از کم میرے ساتھ ایسا ہی تھا۔

پھر ایک رات ایک عجیب اتفاق ہوا۔ میں اپنے گاؤں مراد پور سے والی جی کے لیے باداموں والی دوا لے کر آیا۔ یہ دوا میری بے بے جی ہم بہن بھائیوں کے لیے بنایا کرتی تھیں اور خاص طور سے میرے لیے کیونکہ میں پڑھائی میں سر کھپاتا تھا۔ اب ذرا یہ بھی سن لیں کہ یہ دوا کیا تھی؟ ایک سیر چھلے اور کوٹے ہوئے باداموں میں ایک سیر چینی اور ایک سیر دیسی گھی! باداموں کو یہاں تک بھونا جاتا تھا کہ وہ نیم سرخ ہو جائیں۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ

یہ کتنی مزیدار چیز ہوتی ہو گی۔ پھر بے بے جی اس کو دوائی کیوں کہتی تھیں، اس میں بھی ایک رمز تھی۔ یہ مٹھائی (یعنی دوا) عام طور پر میری دماغی توانائی کے لیے بنا کرتی تھی۔ لیکن چھوٹی بہن عارفہ اور اس کی دو تین سہیلیاں از حد چٹوری تھیں۔ وہ اس کشتے پر بھی ہاتھ صاف کر جاتی تھیں، لہذا بے بے جی نے اسے دوائی کا نام دے دیا تھا اور مجھے دو ٹائم کھلاتی بھی دوائی کے انداز میں تھیں۔ دو چمچ بھر کر منہ میں ڈالتی تھیں اور اوپر سے کاڑھنی کا گرم گرم دودھ پلا دیتی تھیں۔

میں نے بے بے جی سے خاص فرمائش کر کے یہ دوا والی جی کے لیے بنوائی تھی۔۔۔۔۔ جب میں راجوال پہنچا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ میں نے انٹر کام کے ذریعے والی جی کو بتانا چاہا کہ میں دوا لے کر آگیا ہوں۔ والی جی کے بجائے بیگم بلقیس سے رابطہ ہوا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں دوا لے آیا ہوں۔

وہ بولیں۔ "وہ شام سے تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ابھی جاگ رہے ہیں، تم لے آؤ۔"

راستے میں ایک جگہ گھوڑی پھسل گئی تھی اور میرے کپڑے کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے۔ میں نے ٹرنک میں سے نکال کر نیا لاچہ کرتا پہنا اور منہ ہاتھ دھویا۔ حویلی کے اندر پہنچا تو زنان

خانے کے دروازے پر ہی بیگم بلقیس کھڑی تھیں۔ رات کے سناٹے نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایک دو کمروں میں ہی لالٹینوں کی روشنی تھی۔ میں نے دوا والا وزنی شاپر جو تھیلے میں محفوظ تھا، بیگم بلقیس کو تھما کر واپس جانا چاہا تو وہ بولیں۔ "انہیں خود دو۔۔۔۔۔ اور استعمال کا طریقہ بھی بتاؤ۔"

میں بیگم بلقیس کے پیچھے چلتا اور ان کے کمر کے دلکش ہلکوروں کو چور نظروں سے دیکھتا ہوا، والی جی کے کمرے تک پہنچا۔ وہ رنگین پلنگ پر نیم دراز تھے۔ شہنیل کا نہایت خوبصورت لحاف ان کے سینے تک کھچا ہوا تھا اور وہ سو چکے تھے۔

انہیں سوتا دیکھ کر میں اور بیگم بلقیس واپس پلٹ آئے۔ ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ اندرونی کمروں کے اندر سے گزرتے ہوئے میرا دل یک دم نہایت شدت سے دھڑکنے لگا۔ بیگم بلقیس مجھ سے ایک قدم آگے تھیں۔ میں نے اچانک ان کا بازو تھام کر انہیں روک لیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکیں۔ وحشی ہرنی کی طرح دائیں بائیں دیکھا۔ پھر دیوار کے ساتھ لگ گئیں۔ انہوں نے اپنا رخ ایسا رکھا کہ اگر خدانخواستہ والی جی یا فیروزاں میں سے کوئی جاگتا یا ہماری طرف آتا تو وہ اسے دیکھ سکتی تھیں۔ یقیناً انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ دو

پیار کرنے والوں کے درمیان شاید کوئی خفیہ زبان ہوتی ہے جو ایک دوسرے کی خواہشات اور نیتوں کو سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ایک دو سیکنڈ کے لیے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر پھر مجھے آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ میں نے انہیں بانہوں میں بھر لیا۔ ان کا لمس میرے لیے ناقابل فراموش تھا۔ یہ ایک ناقابل بیان کیفیت تھی۔ میرے ہونٹ ان کے چہرے سے ہمکلام ہوئے۔ میرے پاؤں جیسے زمین پر نہیں تھے، میں ست رنگی ہواؤں کے دوش پر اڑ رہا تھا۔ انہوں نے بھی عجب دلیری اور الہڑپن سے میرے رخسار کو چوما۔ یہ صرف تیس چالیس سکینڈ تھے مگر صدیوں جیسی تاثیر رکھتے تھے۔

اچانک بیگم بلقیس نے مجھے جھٹکے سے پیچھے دھکیل دیا۔ کوئی آ رہا تھا۔ وہ مڑیں اور تیزی سے ایک قریبی دروازہ کھول کر اوجھل ہو گئیں۔ میں بھی خود کو سنبھال کر برآمدے کی طرف مڑ گیا۔ دفعتاً چودھری عزیز کی بھاری بھرکم آواز نے میرے قدم روک لیے۔ "کون ہے؟" چودھری نے بلند آہنگ میں پوچھا۔

"میں ہوں جی خاور۔" میں نے رکتے ہوئے جواب دیا۔

چودھری کے ہاتھ میں حقے کی لوہے کی پتریوں والی چلم تھی۔آج شاید وہ پھر رات کے وقت چلم کے لیے گڑ ڈھونڈنے نکلا ہوا تھا۔"یہاں کیا کر رہے ہو؟"چودھری نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"مراد پور سے والی جی کے لیے دوائی لے کر آیا ہوں۔وہی دینے آیا تھا۔"

"والی جی تو سو رہے ہیں۔ابھی تمہارے ساتھ کون تھا یہاں؟"

"کوئی بھی نہیں جی۔"

چودھری عزیز نے شک بھری نظروں سے دائیں بائیں دیکھا پھر نہایت خشک لہجے میں بولا۔
"رات کو اس طرح یہاں نہ آیا کرو۔کوئی چیز بھیجنی ہو تو منشی منظور یا بابے گلاب کے ہاتھ بھیجا کرو۔"

"ٹھیک ہے جی۔"میں نے کہا اور کان لپیٹ کر واپس آ گیا۔

اگلے چوبیس گھنٹوں تک مجھے دھڑکا لگا رہا کہ کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو گئی ہو۔اس رات بیگم بلقیس سے بمبوکاٹ پر رابطہ بھی نہیں ہو سکا۔تاہم آثار سے نظر آتا تھا کہ خیریت ہی ہے۔

بیگم بلقیس کے لمس کا تصور ایک تیز نشے کی طرح میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔میں جتنی مرتبہ ان دلکش لمحوں کو یاد کرتا تھا۔اتنی مرتبہ ایک سرور انگیز کیفیت سے لبریز ہو جاتا تھا۔تین چار ماہ پہلے میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ بیگم بلقیس جو میرے لیے آسمان پر چمکنے والے ایک دور دراز ستارے کی طرح ہیں۔میرے اس قدر قریب ہو جائیں گی۔۔۔۔۔میں نے اپنے بازو پر جلنے کا پرانا نشان دیکھا اور اپنی سابقہ خیالات پر خود ہی مسکرانے لگا۔میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ اگر زندگی میں کبھی بیگم بلقیس کو چھونے کا موقع آیا بھی تو میں صرف ان کے ہاتھوں کو چھوؤں گا۔اس سے آگے نہیں۔۔۔۔۔ہر گز نہیں۔وہ سارے خام خیال ،وقت کے دھارے میں تنکوں کی طرح بہہ گئے تھے۔اب میں آگے کی سوچ رہا تھا۔۔۔۔۔ اور آگے کی سوچ رہا تھا۔بدن میں بار بار میٹھا درد جاگتا تھا۔یہ درد کمر کے نیچے زیریں حصے سے شروع ہوتا تھا،پورے بدن میں سرسراتا اور سینے میں پہنچ کر آگ کی طرح دہکنے لگتا تھا۔میں تصور ہی تصور میں بیگم بلقیس کے قریب ہوتا تھا،قریب تر ہوتا تھا۔سچ کہتے ہیں کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔عقل،ہوش اور مصلحت کے ساتھ اس کا تعلق کم کم ہی ہوتا ہے۔

بیگم بلقیس سے رابطہ دوسرے دن بھی نہیں ہوا۔ میں سہ پہر کے وقت حامد کو پڑھانے گیا۔ وہاں بھی عجیب طرح کی سرد مہری محسوس ہوئی۔ بیگم بلقیس سامنے آئیں نہ انہوں نے حسبِ معمول کھانے کی کوئی شے بھیجی۔ تاجو بھی دکھائی نہیں دی۔ رات کو بھی میں منتظر رہا مگر خاموش بمبو کاٹ میں جان نہیں پڑی۔ شاید وہ دور رہ کر میری تڑپ کو بڑھا رہی تھیں یا پھر ہو سکتا ہے اس میں شرم جھجک وغیرہ کا عمل دخل ہو۔

تیسری رات گیارہ بجے کے لگ بھگ انٹر کام کی بیل ہوئی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف بیگم بلقیس تھیں۔ وہ بہت مدھم لہجے میں بول رہی تھیں اور ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ "خاور! کام بہت خراب ہو گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے۔۔۔۔۔ والی جی کو۔۔۔۔۔ سارا پتا چل گیا ہے۔"

"کک۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟"

"شاید عزیز بھاجی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے والی جی کے بہت کان بھرے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ۔۔۔۔۔" بیگم بلقیس کی آواز بھرا گئی اور وہ بول نہ سکیں۔

"کیا لگتا ہے آپ کو؟"

"مجھے لگتا ہے کہ شاید دو چار دن پہلے والی جی نے بھی کہیں مجھے فون پر باتیں کرتے سن لیا ہے۔ وہ چار پانچ دن سے چپ چپ تھے اور پرسوں والی بات کے بعد تو وہ بالکل ہی چپ ہیں۔ دو دن سے انہوں نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ مجھ سے اور حامد سے بات تک نہیں کرتے۔ اب بھی شام سے کمرے میں بند ہیں۔ اندر سے کنڈی لگائی ہوئی ہے۔ مم۔۔۔۔۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے خاور!" وہ سسک پڑیں۔

"آپ حوصلہ رکھیں۔ کچھ نہیں ہو گا۔" میں نے کہا تاہم اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود مجھے بھی محسوس ہوا۔

لائن پر کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر بیگم بلقیس کی دھیمی آواز ابھری۔ "خاور! ہم سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ پر جو ہونا تھا، ہو گیا۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ نہ ہو کوئی بڑی مصیبت پڑ جائے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"لیکن اگر۔۔۔۔۔"

"نہیں خاور۔۔۔۔۔کچھ مت کہو۔ جو میں نے کہا ہے، وہ کرو۔ اب تم چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔اور ہو سکے تو کچھ دنوں کے لیے شہر کی طرف نکل جاؤ۔۔۔۔۔اور خاور! پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔" آخری الفاظ کہتے ہوئے ان کی آواز پھر بھرا گئی۔

"آپ سے دور کیسے رہوں گا؟"

"سمجھو میں مر گئی ہوں تمہارے لیے۔۔۔۔۔اب میں پھر فون نہیں کر سکوں گی۔۔۔۔۔ خدا حافظ!" انہوں نے کہا اور جلدی سے انٹر کام بند کر دیا۔

میں اپنی جگہ سناٹے میں بیٹھا رہ گیا۔ خیالات کے حسین محل ٹوٹ کر بکھر گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ بہر حال، یہ بات تو ظاہر تھی کہ یہاں میرے لیے سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اب مجھے یہاں سے جانا ہو گا۔

اگر مجھے جانا تھا تو پھر میرے لیے بہتر تھا کہ رات کے اندھیرے میں خاموشی سے ہی نکل جاؤں۔ میرا سامان تو تھا لیکن مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ اس سامان میں سے مجھے بس دو چار چیزیں ہی زیادہ عزیز تھیں۔ ان کا تعلق بیگم بلقیس سے تھا۔ ایک بغیر بازو کا سویٹر تھا۔ جو انہوں نے مجھے دیا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے راز داری سے بتایا تھا کہ یہ انہوں نے خود بنا ہے۔

ایک وہ رومال تھا جو بیگم بلقیس نے تختی لکھتے ہوئے استعمال کیا تھا۔ اس سے انہوں نے اپنی سیاہی میں لتھڑی ہوئی انگلیاں پونچھیں تھیں۔ اس طرح کی ایک دو چیزیں اور تھیں۔ یہ چیزیں اور کچھ دیگر سامان میں نے ایک چھوٹے بیگ میں ڈال لیا۔ میں خوف زدہ بالکل نہیں تھا۔ ہاں، یہ خیال ضرور تھا کہ میرے یہاں موجود رہنے سے بیگم بلقیس کی مصیبت میں اضافہ نہ ہو جائے۔

میں نے اصطبل سے اپنی گھوڑی نکالی اور روانہ ہو گیا۔ نصر اللہ اور ایک دوسرے ساتھی نے پوچھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ میں نے گول مول بات کی اور انہیں بتایا کہ ایک ضروری کام سے گاؤں جانا پڑ گیا ہے۔ یہ چاندنی رات تھی۔ ہوا یخ بستہ تھی۔ میں عجیب کیفیت میں اس گاؤں کو چھوڑ رہا تھا جہاں پچھلے چند ماہ کے اندر مجھے زندگی کی انوکھی خوشیاں ملی تھیں۔ جہاں میرے اندر جینے اور آگے بڑھنے کی بے مثال ترنگ جاگی تھی۔ ہاں، یہی گاؤں تھا جہاں ایک حویلی تھی، حویلی میں ایک کچا کمرا تھا۔ کمرے میں ایک بمبو کاٹ تھا۔ سرد تاریک راتوں میں اس کمرے کے اندر انگیٹھی کی خوش نما روشنی میں بمبو کاٹ کے اندر زندگی جاگتی تھی اور اس کی آواز میں دنیا جہاں کے رنگ سمٹ آتے تھے۔ گھوڑی آگے بڑھ رہی تھی اور سب کچھ

پیچھے رہتا جارہا تھا۔ گھوڑی کے قدم بھی جیسے افسردگی کے عالم میں اٹھ رہے تھے۔۔۔۔۔
جیسے وہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ میں ہمیشہ کے لیے یہ گلی کوچے چھوڑ جاؤں۔ میرا ارادہ تھا کہ
گاؤں سے چھ سات میل آگے آنے کے بعد گھوڑی کو چاچے عسکری کے پنڈ میں اس کے گھر
چھوڑ دوں گا۔ وہاں سے کوئی اسے خود ہی راجوال پہنچادے گا۔ یوں تو یہ گھوڑی والی جی نے
مجھے دی ہوئی تھی مگر جب میں ان کا ملازم ہی نہیں رہا تھا تو پھر گھوڑی بھی میری نہیں تھی۔

رات کے وقت دیہاتی علاقے کا جو عالم ہوتا ہے، وہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ آج فرق
صرف یہ تھا کہ چاندنی رات تھی اور سردی معمول سے زیادہ تھی۔ میں نے اپنا منہ، سر اچھی
طرح گرم صافے میں لپیٹ رکھا تھا۔ لوئی کی بکل بھی ماری ہوئی تھی، اس کے باوجود ٹھنڈی
ہوا سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ میرے آگے ایک چوراہا سا تھا۔ اچانک میں چونکا۔ کیچڑ
میں لتھڑا ہوا ایک ٹریکٹر بڑی تیزی کے ساتھ میرے سامنے سے گزرا۔ ٹریکٹر پر جگہ نہ
ہونے کے باوجود سات آٹھ بندے سوار تھے۔ وہ چیونٹیوں کی طرح ٹریکٹر سے چمٹے ہوئے
تھے۔ چار پانچ بندے جگہ نہ ملنے کے سبب ٹریکٹر کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ان کے
کندھوں پر کدالیں اور کسیاں وغیرہ تھیں۔ میرے چونکنے کی وجہ ٹریکٹر کا رنگ تھا۔ یہ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

رنگ غالباً خود ہی کیا گیا تھا۔ یہ کالا ٹریکٹر میں نے جھگڑے کے وقت موکھلوں کے کھوہ پر
دیکھا تھا۔

اس افراتفری کے عالم میں۔۔۔۔۔ اور اس وقت یہ لوگ کہاں جا رہے تھے؟ میرے ذہن
میں شک جاگا۔ میں ٹریکٹر کی آواز پر اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ والی جی کا مچھلی فارم یہاں سے
قریب ہی تھا۔ تین چار منٹ میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ میں نے گھوڑی کماد کے ایک کھیت کی آڑ
میں روک لی۔۔۔۔۔ وہاں کا منظر دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ یہاں اس سنسان رات میں دن
کی سی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ یہاں والی جی کی زمین پر کم از کم پچاس ساٹھ افراد موجود تھے۔
ایک ٹریکٹر ٹرالی اور دو گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ چاند کی روشنی میں والی جی کی زمین پر
اندھادھند بنیادوں کی کھدائی ہو رہی تھی۔ ایک طرف کی بنیاد جو قریباً دو سو فٹ لمبی تھی،
کھودی جا چکی تھی اور اس کے اندر کوئی ایک درجن معمار تیزی کے ساتھ اینٹوں کی دیوار چنتے
جا رہے تھے۔

"شاوا بھئی شاوا۔۔۔۔۔ سپیڈ پکڑو۔" کسی نے پکار کر کہا۔

میں سناٹے میں تھا اور میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ آدھی رات کو یہاں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ وہ زمین جس پر موکھل اپنا حق جتا رہے تھے، سخت خطرے میں تھی۔ اس پر قبضہ جمانے کے لیے شب خون مارا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی گھوڑی واپس موڑی اور جتنی رفتار سے ممکن تھا۔ اسے دوڑاتا ہوا واپس راجوال پہنچ گیا۔ سب سے پہلے میں نے نصر اللہ اور منشی منظور کو یہ خبر پہنچائی، وہ ہکا بکا رہ گئے۔ میں نے نصر اللہ سے کہا۔ "والی جی تک یہ خبر پہنچانی ہے لیکن ایک دم نہیں۔ وہ نیند سے جاگیں گے۔ انہیں بہت جھٹکا لگے گا۔ وہ پہلے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"تو پہلے بیگم جی تک اطلاع پہنچاؤ اور انہیں بتادو کہ طریقے سے والی جی کو خبر کردیں۔"

جب نصر اللہ اطلاع دینے کے لیے حویلی کے اندر گیا، میں نے اپنے ساتھیوں تیمور، باگو اور کرامت وغیرہ کو جگایا اور فوراً گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈالنے کی ہدایت کی۔ پانچ دس منٹ کے اندر پچیس افراد کا ایک دستہ تیار ہو گیا۔ ان میں سے چھ سات کے پاس رائفلیں تھیں، باقی کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ اسی دوران میں والی جی اور چودھری عزیز پریشان

چہروں کے ساتھ ہماری طرف آتے دکھائی دیے۔ ان کے پیچھے پیچھے رونق علی اپنی توند ہلاتا اور ڈگمگاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ "کیا ہوا ہے؟" والی جی نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں والی جی! ایویں بیس تیس بندے ہیں۔ چوروں کی طرح اندھیرے کا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور چور کے کوئی پاؤں نہیں ہوتے۔ ابھی ذرا دیر میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگیں گے۔" میں نے حوصلے سے کہا۔

"لیکن اگر۔"

"کچھ نہیں ہوگا والی جی۔۔۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بے شک آرام کریں۔ بس چودھری عزیز کو باقی بندوں کے ساتھ میرے پیچھے بھیج دیں۔ اللہ نے چاہا تو آج ہم ان خبیثوں کو ان کے گھروں تک چھوڑ کے آئیں گے۔"

چودھری عزیز جو ہر موقعے پر میری بات کاٹتا تھا، اس وقت خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے کے سوا کچھ نہیں کر رہا تھا۔ دو تین منٹ میں سب کچھ طے ہو گیا۔ میں تیار گھڑسواروں کے ساتھ موقعے کی طرف جا رہا تھا۔۔۔۔ باقی افراد کو والی جی اور چودھری عزیز کے ساتھ

ہمارے پیچھے آنا تھا۔ ہم برق رفتاری سے روانہ ہوئے تو والی جی نے دوبارہ آواز لگائی۔

"ہماری طرف سے گولی چلنے میں پہل نہ ہو۔"

چند روز پہلے باغ والے ڈیرے پر جو واقعہ ہوا تھا، اس کے بعد ہمارے حوصلے کافی بڑھ چکے تھے۔ والی جی کے عام کارندے جن کے رنگ موکھلوں کا نام سنتے ہی پیلے پڑ جاتے تھے، اب جوش میں دکھائی دیتے تھے۔

موقعے پر پہنچنے سے ذرا دیر پہلے ہی ہم نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ میرے ہاتھ میں 38 بور کا پستول تھا اور میں سب سے آگے تھا۔ جونہی ہم مچھلی فارم کے سامنے پہنچے، موکھلوں اور ان کے کارندوں میں کھلبلی مچ گئی۔ معماروں کے ہاتھ رک گئے۔ رائفلیں کندھوں سے اتر آئیں اور کلہاڑیاں لاٹھیاں سونت لی گئیں۔ میں عین اس جگہ پہنچا جہاں بنیاد بھری جا رہی تھی۔

میں گھوڑی سے اترا اور ٹھوکر مار کر دو فٹ اونچی دیوار کی چند اینٹیں گرا دیں۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں گرجا۔

دونوں طرف سے للکارے گونجے اور رائفلیں سیدھی کر لی گئیں۔ "ٹھہرو ٹھہرو۔۔۔۔ گولی نہیں چلانا۔" ایک لمبا تڑنگا شخص دہاڑ کر بولا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے سامنے آگیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے مجھے سر تا پا گھورا۔

"تم ہماری زمین پر کھڑے ہو۔ یہ تم سے میں پوچھتا ہوں کہ کون ہو تم؟" میں نے کہا۔

"یہ زمین کسی کی ماں بہن کو جہیز میں نہیں ملی ہے، یہ ہماری زمین ہے۔ ہمارے پاس ثبوت ہیں اس کے۔"

"ثبوت ہیں تو عدالتوں میں پیش کرو۔۔۔۔ اور ایک منٹ کے اندر اندر نکلو یہاں سے، ورنہ چارپائیوں پر جاؤ گے۔" میں نے بے خوفی سے کہا۔

"اوئے۔۔۔۔ اوئے چمچے! منہ سنبھال کر بات کر، نہیں تو کھڑے کھڑے زمین میں دھنسا دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے گالی دی۔

جواباً میں نے بھی اسے اسی "وزن" کی گالی سے نوازا۔اس نے ایک دم بھڑک کر میرے منہ پر زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔میں نے جواب میں اس سے زیادہ طاقت کا تھپڑ مارا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ایسے انداز میں جواب دوں گا۔

اس سے پہلے کہ وہ پستول میری طرف سیدھا کر کے فائر کرتا،میں نے اپنے 38 بور سے اس کے بازو میں گولی ماری۔وہ ڈکرا کر ایک طرف جھکتا چلا گیا۔دونوں طرف کے افراد بھڑکیں مارتے ہوئے ایک دوسرے پر پل پڑے۔میں نے نیچے جھک کر ایک موکھل کی کلہاڑی کا وار بچایا۔میرے عقب میں موجود باگو نے موکھل کے سینے پر ریوالور سے گولی چلائی۔۔۔۔۔وہ جھٹکے سے ایک کھدی ہوئی بنیاد میں جا گرا۔

دونوں طرف کے افراد نے بھاگ بھاگ کر مختلف چیزوں کے پیچھے پناہ لے لی اور اندھادھند فائرنگ ہونے لگی۔معمار اور مزدور وغیرہ اپنی جانیں بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔میں اور تیمور دو دیگر افراد کے ساتھ نئی اینٹوں کے ایک چٹے کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔فائرنگ سے بچنے کے لیے اور جوابی فائر کے لئے یہ بڑی موزوں جگہ تھی۔۔۔۔۔چاندنی رات میں ہر طرف شعلے سے لپک رہے تھے۔۔۔۔۔گولیاں، سیٹیاں بجاتی نامعلوم سمتوں میں پرواز

کر رہی تھیں۔اچانک نصراللہ کے ایک قریبی ساتھی کو گولی لگی اور وہ کراہتا ہوا اپنے پہلو پر گر گیا۔میں نے اس کی سیون ایم ایم رائفل اٹھا لی اور ایک اگلی پوزیشن پر پہنچ کر فائرنگ کرنے لگا۔

یہی وقت تھا جب ہمارے عقب سے درجنوں گھڑسواروں کا شور سنائی دیا۔وہ للکارے مارتے اور ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے آرہے تھے۔یہ ہمارے ساتھی تھے۔ان کے ساتھ والی جی اور چودھری عزیز وغیرہ بھی تھے۔جب موکھلوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو ایک دم اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر گودام کی طرف پسپا ہونے لگے۔وہ فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹتے جارہے تھے۔کچھ الٹے پاؤں بھاگ رہے تھے اور کچھ پیٹھ پھیر کر!

میں اپنی پوزیشن چھوڑ کر دوڑا اور پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہوئے ایک موکھل کو عقب سے دبوچ کر زمین پر گرا لیا۔پھر میں اسے گھسیٹ کر ایک جیپ کی اوٹ میں ہو گیا۔۔۔۔۔یہ میں نے ایک خطرناک کام کیا تھا۔کوئی بھی آوارہ گولی میرا مزاج پوچھ سکتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ کام کرنا ضروری ہے۔

موکھل فائرنگ کرتے ہوئے اپنے گودام کے اندر گھس گئے اور آہنی دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ کمک کے آجانے سے راجوال والوں کے حوصلے ایک دم بڑھ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ کا خیال تھا کہ ہمیں پیچھا کرتے ہوئے گودام کے اندر گھس جانا چاہیے۔

لیکن ایسا کرنا خطرناک تھا۔ والی جی نے اپنے بپھرے ہوئے ساتھیوں کو اس ارادے سے باز رکھا۔ جو مسلح افراد آگے چلے گئے تھے، ان کو بھی واپس بلالیا۔ گودام کے اندر سے ان پر فائرنگ ہوسکتی تھی۔ فضا میں خوفناک سراسیمگی تھی۔ موقعے پر دو لاشیں پڑی تھیں۔ ایک ہماری تھی، ایک موکھلوں کی۔

ہماری طرف سے جان ہارنے والا نصراللہ کا وہی ساتھی تھا جس کی رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ گولی اس کی گردن چیر کر نکل گئی تھی اور وہ موقعے پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ موکھلوں کی طرف سے مرنے والا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس کے منہ اور کپڑوں سے دیسی شراب کی بو آرہی تھی۔ تھری ناٹ تھری کی دو گولیاں اس کے پیٹ میں لگی تھیں ایک کمر پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ اس کا خون بنیاد کی تازہ اینٹوں پر پھیلا ہوا تھا۔۔۔۔ دیہاتی زبان میں کہا جاسکتا تھا کہ زمین کے اس ٹکڑے نے انسانی خون چکھ لیا ہے، اب یہ زمین آدم خور ہو جائے گی۔

ہمارے چار ساتھی گولیاں اور کلہاڑیوں سے زخمی ہوئے تھے۔ ان میں سے دو کو اسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ میں نے والی جی سے کہا۔ "مجھے اجازت دیں۔ میں ان کو ڈسکہ اسپتال لے جاتا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔۔۔ تم یہیں رہو۔" والی جی نے عجیب انداز میں کہا۔ "میں صوفی اسلم اور نصراللہ کو اپنی گاڑی میں بھیج دیتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ان کے تین چار بندے بھی ضرور زخمی ہوئے ہیں۔ وہ بھی زخمیوں کو ڈسکے کے اسپتال میں ہی لے جائیں گے۔ یہ نہ ہو کہ وہاں پھر ٹاکرا ہو جائے۔"

میری بات میں وزن تھا۔ والی جی نے حکم دیا کہ زخمیوں کے ساتھ آٹھ دس مسلح بندے جائیں گے اور بالکل چوکس رہیں گے۔

جس تنومند موکھل کو میں نے بھاگتے ہوئے پکڑا تھا، وہ ادھیڑ عمر تھا۔ وہ ذرہ بھر خوف زدہ نہیں تھا۔ وہ بار بار منہ سے خون تھوک رہا تھا اور ہمیں خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ جب بھی دھمکی دیتا، کوئی نہ کوئی شخص اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کر دیتا۔۔۔۔ لیکن وہ دھمکیاں دینے اور گالیاں بکنے سے باز نہیں آرہا تھا۔

والی جی نے کہا۔"اس کے ہتھ پیر باندھ دو اور اس کے گندے منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔"

اس نے والی جی کی طرف تھوکا اور بولا۔"تیرا بڑا برا حشر ہونا ہے والڑی۔اسی زمین پر تیرے خانوادے کی لاشیں نہ گھسیٹیں تو ہم اپنے پیو کے نہیں۔"

چودھری عزیز مجھے ایک طرف لے گیا اور سخت لہجے میں بولا۔"اس بندے کو پکڑنے کی کیا لوڑ تھی؟ یہ چھوٹے موکھل کا ماما ہے۔دل کا مریض بھی ہے۔اسے کچھ ہو گیا تو مشکل پڑ جائے گی۔"

میں نے کہا۔"چودھری صاحب!میرے خیال میں آپ ایک بات بھول رہے ہیں۔یہاں مچھلی فارم پر ہمارے کتنے بندے تھے؟"

"دو تھے۔"چودھری عزیز نے چونک کر کہا۔"شیرا اور فتح محمد۔"

"وہ دونوں اب یہاں کہیں نظر نہیں آ رہے۔یہاں کام شروع کرنے سے پہلے یہ لوگ انہیں پکڑ کر گودام میں لے گئے ہوں گے۔اب ان دونوں کو چھڑانے کے لیے ہمارے پاس موکھلوں کا کوئی بندہ تو ہے۔"

چودھری عزیز نے پہلی بار ذرا تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

کچھ دیر میں راجوال سے کچھ اور لوگ بھی لاٹھیاں، کلہاڑیاں لے کر پہنچ گئے۔یہ لوگ ایک ٹریکٹر ٹرالی پر سوار ہو کر آئے تھے۔

ہم صبح تک موقعے پر موجود رہے پھر اطلاع ملی کہ پولیس لاشوں کو قبضے میں لینے کے لیے پہنچ رہی ہے۔اب فوری لڑائی کا خطرہ ٹل چکا تھا۔والی جی نے مجھے اور باگو کو موقعے سے ہٹ جانے کی ہدایت کی۔انہوں نے نصراللہ کو ہمارے ساتھ کیا۔اس وقت سورج کی پہلی کرنیں،اوس سے بھیگے ہوئے پودوں اور کھیتوں کو چمکا رہی تھیں جب ہم راجوال پہنچے۔گاؤں کے زیادہ تر لوگ ابھی گھروں کے اندر تھے۔شاید بہت سوں کو یہ پتا بھی نہ ہوگا کہ رات کو مچھلی فارم پر کتنا سنگین واقعہ ہوا ہے۔والی جی کی ہدایت کے مطابق نصراللہ ہمیں حویلی کے پچھواڑے بڑے اصطبل میں لے گیا۔یہاں گرے ہاؤنڈ کتے راتب کے انتظار میں منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔اور پنجروں میں عقاب،شاہین وغیرہ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ہمارے گھوڑے ایک چھپر تلے باندھ دیے گئے۔نصراللہ ہمیں اصطبل کے ایک نیم تاریک کمرے میں لے گیا۔یہاں پرالی کے بڑے بڑے گٹھے پڑے تھے۔دو بندوں نے مل کر گٹھوں کو

تیزی سے ہٹانا شروع کیا۔ اور تب مجھے پہلی بار پتا چلا کہ یہاں اصطبل کے اندر نیچے کو جاتی ہوئی سیڑھیاں ہیں اور ایک تہ خانہ ہے۔

تہ خانہ تین کمروں پر مشتمل تھا۔ درودیوار کچے تھے تاہم ان کی لپائی کی گئی تھی۔ یہاں چار پانچ چار پائیاں، مٹی کے گھڑے، لالٹینیں اور روزمرہ استعمال کے برتن وغیرہ موجود تھے۔ والی جی نے مجھے بتادیا تھا کہ ہم دونوں کو کچھ دن یہاں روپوش رہنا ہے۔ یاد رہے کہ موکھلوں کا جو بندہ ہلاک ہوا تھا، اسے باگو کے ہاتھ سے ہی گولی لگی تھی۔

ہم اس تہ خانے میں پورے تین دن رہے۔ صرف صبح سویرے کچھ دیر کے لیے ہم باہر نکلتے تھے اور ضروریات سے فارغ ہو کر دوبارہ تہ خانے میں چلے جاتے۔ باہر کے حالات کی ہمیں کچھ زیادہ خبر نہیں تھی۔ ہم زیادہ تر بیٹری والا ریڈیو سنتے رہتے، تاش کھیلتے رہتے یا پھر گپ شپ لگاتے۔ زیادہ وقت لحافوں کے اندر گزارنا پڑتا تھا کیونکہ یہاں حرارت کے لیے انگیٹھی نہیں جلائی جاسکتی تھی۔ دھواں وغیرہ نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ تین وقت بہترین کھانا ہمیں مل رہا تھا۔ ہماری دیکھ بھال کی ذمے داری اصطبل کے دو ملازموں شیدے

اور عبیداللہ کی تھی۔ انہی کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ لڑائی میں زخمی ہونے والے دونوں بندوں کی حالت اب بہتر ہے۔

یہ چوتھے روز دوپہر کی بات ہے، رونق علی خود تہ خانے میں داخل ہوا۔ وہ ہمارے لیے مولی والے پراٹھے پکوا کر لایا تھا۔ ساتھ میں چائی کی نمکین لسی اور گاجر کا حلوہ تھا۔ میرے ذہن میں باہر کی صورتِ حال کے حوالے سے بے شمار سوال کلبلا رہے تھے۔ سب سے اہم سوال تو یہی تھا کہ جھگڑے کا کیا بنا؟

رونق علی نے کہا۔ "کافی چنگی خبریں ہیں۔ نیا ایس ایچ اؤ اور رانا شبیر سیانا بندہ ہے۔ والی جی کی عزت بھی کرتا ہے۔ اس نے دونوں پارٹیوں کو اچھے مشورے دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لمبی چوڑی گرفتاریاں نہیں ہوئیں اور نہ ہی کچھ زیادہ مال پانی خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔"

"یہ کیسا پولیس والا ہے رونق بھائی؟ کہیں جعلی تو نہیں ہے؟"

"نہیں یار! اچھے برے بندے تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ والی جی اور چھوٹے موکھل سے بات شات کر کے اس نے بڑا مناسب وقوعہ بنایا ہے۔ دونوں طرف کا ایک ایک بندہ مرا ہے۔ اس

نے دونوں پر ایک دوسرے کا قتل ڈال دیا ہے۔ شدید زخمیوں کا کوئی بھی ذکر شکر نہیں کیا گیا۔"

"شرے اور فتح محمد کا کیا بنا؟"

"ایسے معاملوں میں تمہارا دماغ بڑا کام کرتا ہے۔ تمہارا یہ اندازہ بالکل درست تھا کہ موکھل ان دونوں کو پکڑ کر گودام میں لے گئے ہیں۔ یہ مسئلہ پولیس کو بتائے بغیر ہی حل کیا گیا ہے۔ ہم نے موکھلوں کے مامے تاج دین کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے شیرے اور فتح محمد کو آزاد کر دیا ہے۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مچھلی فارم کی زمین والا معاملہ اب کچھ ٹھنڈا پڑ جائے گا؟" میں نے رونق علی سے پوچھا۔

اس نے اپنا بڑا سا چہرہ نفی میں ہلایا اور بولا۔ "ایسے جھگڑے شگھڑے آسانی سے کہاں ختم ہوتے ہیں شہزادے۔۔۔۔۔اور یہ جھگڑا تو اب شروع ہوا ہے۔ آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔"

"قبضہ تو جگہ پر ہمارا ہی ہے نا؟"

"قبضہ تو بالکل اپنا ہے، پر ان کا پانی والا پائپ ہماری زمین پر ہی ہے۔۔۔۔۔اور گندا پانی دن رات تالاب میں جمع ہو رہا ہے۔ اب انہوں نے ہماری طرف ایک دروازہ بھی نکال لیا ہے۔ دو چار روز تک بڑا موکھل بھی پنڈ واپس آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے آنے کے بعد معاملے میں اور گرمی شرمی آ جائے۔"

"بڑا موکھل کہاں ہے؟"

"ان کی کچھ زمینیں رحیم یار خان میں بھی ہیں۔ وہ وہاں گیا ہوا ہے۔"

رونق علی سے گفتگو کے دوران میں ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ والی جی کا پیارا کتا ہیرا بالآخر مر گیا ہے۔ والی جی چند دن اس کے لئے بہت پریشان رہے ہیں۔ رونق سے مختلف موضوعات پر بات چیت جاری رہی۔

"ہمیں اور کتنے دن یہاں رہنا پڑے گا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو والی جی ہی بتا سکتے ہیں۔ ویسے میرے خیال میں اب حالات ٹھیک ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسی ہفتے تمہیں باہر نکال لیں۔ ویسے ایک کام تم سے گڑ بڑ والا ہوا ہے۔ تم نے جس بندے کو تھپڑ کے جواب میں تھپڑ مارا تھا، پتا ہے وہ کون ہے؟"

"کون ہے؟"

"بڑی بھیڑی شے ہے۔ بہت بھیڑی شے ہے۔"

"اس بھیڑی شے کا نام بھی تو بتائیں۔" باگو نے کہا۔

رونق علی مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔"میں نے تم سے شام پور کی ایک کڑی ثمینہ کا ذکر کیا تھا نا جو غیر برادری کے ایک بندے سے ملتی ہے؟"

"ہاں، بتایا تو تھا آپ نے۔۔۔۔ والی جی نے ثمینہ اور اس بندے کو ایک کھیت سے موقعے پر پکڑا تھا اور مارا پیٹا بھی تھا۔"

رونق علی نے اثبات میں سر ہلایا۔"یہی وہ خانہ خراب ہے۔اس کو موکھل پاشا کہتے ہیں۔ یہ بڑے موکھل کے دادے گاؤں کا ہے۔ یہاں زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔اس کا باپ اپنے پنڈ میں پھیری لگا کر پکوڑے بیچتا تھا، پر یہ یہاں چودھری بن کر پھر رہا ہے۔ بڑی آکڑ شاکڑ ہے اس میں۔"

"کر لیں گے جی ٹھیک اس کی آکڑ۔" میں نے لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

رونق علی نے جہازی سائز کے پراٹھے کے چوتھے حصے کو لقمہ بنا کر منہ میں رکھا اور مجھے موکھل پاشا کے بارے میں مزید باتیں بتانے لگا۔اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ کچھ دن پہلے پیش آنے والے واقعے میں والی جی نے موکھل پاشا کو مارا وغیرہ نہیں تھا۔ انہوں نے بس اسے بالوں سے پکڑا تھا۔ جواب میں اس نے اتنی زور سے والی جی کا ہاتھ جھٹکا تھا کہ ان کی کلائی اتر گئی۔ وہ ابھی تک خلیفے سے کلائی کی مالش کرواتے تھے۔

رونق علی قریباً دو گھنٹے ہمارے ساتھ موجود رہا۔اس دوران میں اس نے بیگم بلقیس کے بارے میں کسی حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ میں اس کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شاید اس گڑبڑ کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں ہے۔

میں پچھلے چار دن سے مسلسل اندیشوں میں مبتلا تھا۔ میں چار دن پہلے جن حالات میں راجوال چھوڑ کر جانے لگا تھا، یقیناً وہ اب بھی موجود تھے۔ میرے کانوں میں بار بار وہ گفتگو گونجتی رہتی تھی جو بدھ کی شب بیگم بلقیس نے مجھ سے کی تھی۔ان کی لرزتی ہوئی آواز، ان کی سسکی، ان کا خوف! جو کچھ بھی تھا، وہ بڑی ہمت والی تھیں۔اس کے باوجود وہ ڈری ہوئی تھیں۔

کسی وقت خوامخوہ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی تھی۔ میں سوچنے لگتا تھا، کہیں ایسا تو نہیں کہ والی جی نے کسی سازش کے تحت مجھے یہاں بھیجا ہو۔ اب اگر اس تہ خانے میں میرے اور باگو کے ساتھ کچھ ہو جاتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونا تھی۔ ہمیں مار کر اسی تہ خانے کے کچے فرش میں یوں گاڑا جا سکتا تھا کہ کسی کو ہمارا نام و نشان تک نہ ملتا۔ یا پھر ہمیں قتل کر کے ہماری لاشیں کھیتوں میں پھینکی جا سکتی تھیں اور اس کا الزام بہ آسانی موکھلوں پر دھرا جا سکتا تھا۔

مگر پھر میں والی جی کی صورت ذہن میں لاتا اور ان کے رویے پر غور کرتا۔ میرا دل گواہی دینے لگتا کہ میں غلط سوچ رہا ہوں۔ والی جی ایسا نہیں کریں گے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ چند دن بعد جب حالات ٹھیک ہو جائیں، وہ مجھے اپنی حویلی اور نوکری سے نکال دیں اور حکم دیں کہ میں دوبارہ اپنی شکل نہ دکھاؤں لیکن وہ میرے ساتھ اس طرح کی زیادتی نہیں کریں گے۔

میں نے بتایا ہے کہ اس کچے تہ خانے میں ہمیں ہر طرح کی سہولت حاصل تھی۔۔۔۔۔ سوائے اس کے کہ اصطبل کی ہلکی سی بو آتی تھی اور وہ بھی اس وقت جب یہاں کا اکلوتا دروازہ کھلتا تھا۔ اس تہ خانے کے تین چار کمرے تھے۔ اندرونی دیواروں میں سلاخ دار

کھڑکیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ کمروں کے دروازے علیحدہ علیحدہ تھے۔ یہ ساتویں آٹھویں روز کی بات ہے۔۔۔۔۔ میں ریڈیو پر کسان بھائیوں کا پروگرام سنتے سنتے سو گیا۔ مجھے باگو نے جھنجھوڑ کر جگایا۔

"کیا ہوا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا اور میرا ہاتھ پستول کی طرف گیا۔

"وہ دیکھو۔۔۔۔۔ نویں پروہنے آئے ہیں۔" باگو نے کھڑکی میں سے ایک ساتھ والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ بیس بائیس سال کی ایک لڑکی چارپائی پر بیٹھی تھی اور چہرہ ہاتھوں میں چھپائے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کے جسم پر عام دیہاتی لباس تھا۔ اپنے حلیے سے وہ کسی غریب گھرانے کی لگتی تھی۔

چند لمحے بعد لڑکی روتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور کمرے کا دروازہ پیٹنے لگی۔ "مجھے یہاں سے نکالو۔ خدا کے لئے نکالو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے گناہ ہوں۔"

کچھ دیر تک دروازہ پیٹنے اور دہائی دینے کے بعد وہ بے دم سی ہو کر کچے فرش پر ہی بیٹھ گئی۔ اس کی پشت دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ لڑکی قبول صورت تھی۔ پہلی نظر میں مجھے اس کے چہرے پر معصومیت اور سچائی نظر آئی۔

باگو نے کھڑکی اس طرح بند کر رکھی تھی کہ دونوں پٹ کے درمیان دو تین انچ کی درز باقی رہ گئی تھی۔ ہم تو لڑکی کو دیکھ سکتے تھے مگر شاید وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں لڑکی کا طویل سایہ دیوار پر لرزتا دکھائی دیتا تھا۔

"کون لایا ہے اسے یہاں؟" میں نے باگو سے پوچھا۔

"چودھری عزیز صاحب اور ان کے دو بندے ابھی چھوڑ کر گئے ہیں۔"

"معاملہ کیا ہے؟"

"پتا نہیں۔۔۔۔۔ یہ اندر نہیں گھس رہی تھی۔ چودھری عزیز صاحب نے اسے دو تین چپیڑیں بھی ماری ہیں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

چند منٹ بعد ہماری دیکھ بھال کرنے والا رشید عرف شیدا اندر آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ کڑی کس چکر میں یہاں تاڑی گئی ہے۔ یہ شکل سے تو بڑی معصوم سی لگتی ہے۔"

"شکل پر نہ جاؤ خاور صیب! یہ ایک نمبر کی ففے کٹنی۔۔۔ چالو کڑی ہے۔" شیدے نے دبی آواز میں کہا۔

"کوئی چن چڑھایا ہے اس نے؟" باگو نے پوچھا۔

"کوئی ایک چن؟ چن پر چن چڑھا رہی ہے۔ والی جی تک نے منت ترلا کر کے دیکھا، پر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی۔ غیر برادری کے بندے سے ملتی ہے۔۔۔۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ دشمن برادری کے بندے سے ملتی ہے۔ سارے پنڈ کی عزت مٹی میں ملا رہی ہے۔"

میں نے چونک کر کہا۔ "کہیں یہ وہی کڑی ثمینہ تو نہیں جو کچھ دن پہلے کھیتوں میں پکڑی گئی تھی؟"

"آہو جی! وہی ہے۔ یہ موکھلوں کے منڈے سے ملتی ہے۔ سنا ہے کہ وہ کھیتوں میں ہی اس کے ساتھ برا بھلا کر کے جاتا ہے۔ اس سورنی کو بھی ذلیل ہونے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ لاکھ منع

کرنے پر بھی بھاگی جاتی ہے اس بدمعاش کے پاس آج سویرے پھر پکڑی گئی ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے، والی جی اسے چھت سے الٹا لٹکا کر اس کی چمڑی اتروا دیں۔۔۔۔"

"پیو بھرا (والد اور بھائی) وغیرہ نہیں ہیں اس کے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی نہیں ہے جی۔ اسی لیے تو مچھری پھرتی ہے۔ بس ایک ماں ہے، اس کو یہ کچھ سمجھتی نہیں۔ تین بہنیں اس سے بڑی ہیں۔ وہ بھی غیر شادی شدہ ہیں۔ اپنے کرتوتوں سے ان کی بیڑیوں میں بھی وٹے ڈال رہی ہے۔"

"وہ منڈا کون ہے؟" میں نے تصدیق کرنے کے لیے شیدے سے پوچھا۔

"پاشا نام ہے جی اس کا۔ موکھل پاشا بھی کہتے ہیں۔ یہ وہی لمبا چوڑا ہدوش ہے جی، جس نے آپ کو تھپڑ مارا تھا اور پھر آپ نے بھی اسے تھپڑ مارا تھا۔ ویسے وہ بندہ بہت زیادہ خطرناک ہے۔ آپ کو اس کی طرف سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔"

شاید شیدے کے ساتھ ہماری گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں لڑکی ثمینہ نے پھر واویلا شروع کر دیا۔ وہ رونے چلانے لگی اور دروازے پر دوہتڑ مارنے لگی۔ وہ دھمکی دے رہی تھی کہ اپنی جان لے لے گی۔ شیدا باہر والوں کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے

لیے واپس چلا گیا۔ لڑکی کچھ دیر تک رو پیٹ کر اور تھک ہار کر پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چوڑیاں ٹوٹ جانے سے اس کی کلائیوں سے خون رس رہا تھا۔

میں اور باگو دھیمی آوازوں کے ساتھ اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ "یہ کوئی پیار شیار کا معاملہ ہے شاید۔" باگو نے خیال ظاہر کیا۔

"ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔۔۔۔" میں نے کہا۔ "یہ کڑی عمر میں موکھل پاشا سے کافی چھوٹی نظر آتی ہے۔ ویسے بھی پاشا شکل سے ایک نمبر کا خرانٹ اور ڈھاڈا لگتا ہے۔ یہ بالکل معصوم گھگی (فاختہ) کی طرح ہے۔ اور ہوا اس لیے سکتا ہے کہ پیار محبت کرنے والے شکل، عمر، ذات شات کچھ نہیں دیکھتے۔"

لڑکی قریباً پانچ گھنٹے تک اسی تہ خانے میں رہی۔ رو رو کر اس نے برا حال کر لیا تھا۔ اس کی حالت پر ترس آنے لگا۔ کبھی وہ اللہ سے مدد مانگنے لگتی اور کبھی ان بندوں سے جنھوں نے اسے یہاں بند کیا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ ہم بھی اس کے آس پاس موجود ہیں۔ وہ ہمیں بھی کئی بار پکار چکی تھی مگر ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

قریباً شام کے وقت تہ خانے کا دروازہ کھلا اور میں نے والی جی کو دیکھا۔ چودھری عزیز ان کے ساتھ تھا۔ وہ مسلح کارندے بھی تھے۔ جونہی ایک کارندے نے لڑکی کے کمرے والا دروازہ کھولا، وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور والی جی کے قدموں میں گر گئی۔ "مجھے معاف کر دیں والی جی۔۔۔۔۔ مجھے معافی دے دیں۔۔۔۔۔ میں اب۔۔۔۔۔ کہیں نہیں جاؤں گی۔ جیسا کہیں گے، ویسا کروں گی۔"

"یہ تو تم پہلے بھی کہتی رہی ہو۔" والی جی نے بھاری آواز میں کہا۔

"بس جی غلطی ہو گئی جی۔ اب نہیں ہو گی۔ ہم آپ کے نوکر ہیں جی۔۔۔۔۔ ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ آپ کے حکم پر جان بھی دے سکتے ہیں۔"

"جان دے سکتی ہو۔۔۔۔۔ پر اس زانی کے ساتھ کھیتوں میں گھسنا بند نہیں کر سکتی ہو۔" چودھری عزیز نے زہریلے لہجے میں کہا۔ اس نے ایک جھٹکے سے لڑکی کو والی جی کے قدموں سے پیچھے ہٹایا اور پھنکار کر کہا۔ "اس کی باتوں پر نہ جائیں بھائی جی! یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں ہے۔ اس کو بند رہنے دیں یہاں دو چار ہفتے اور اس کے ساتھ دو تین بوہلی کتے بھی باندھ دیں یہاں۔۔۔۔۔ یہ کتوں کے ساتھ رہنے کے لائق ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

لڑکی ثمینہ کا رنگ زرد تر ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر والی جی کے پاؤں سے چمٹ گئی اور منت ساجت کرنے لگی۔ اس کی اوڑھنی اتر گئی تھی اور وہ ننگے سر تھی۔ والی جی نے جھک کر اس کی اوڑھنی اٹھائی اور سر ڈھانپا۔ پھر انہوں نے اسے پیچھے ہٹ کر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح ایک کونے میں سمٹ گئی۔ اس کی عمر بیس برس سے زیادہ نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے اپنا پہلا اندازہ غلط محسوس ہوا۔

اس کی سیاہ آنکھوں میں خوف وہراس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ خاص طور سے وہ چودھری عزیز سے خوفزدہ نظر آتی تھی۔ والی جی نے چودھری عزیز کے کان میں ہولے سے کچھ کہا۔ وہ لڑکی کو آتشیں نظروں سے دیکھتا اور برا بھلا کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ دونوں کارندے بھی باہر نکل گئے۔ بس ایک کارندہ دروازے سے باہر موجود رہا۔ والی جی نے لڑکی کو نسبتاً نرم لہجے میں کچھ سمجھایا بجھایا۔ ان کی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ بس کوئی کوئی لفظ کانوں میں پڑتا تھا۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ لڑکی کو موکھل پاشا سے نہ ملنے کی وارننگ دے رہے ہیں۔ لڑکی بار بار وعدہ کر رہی تھی کہ اب ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ وہ ان کی ہدایت پر چلے گی اور برادری کی عزت خراب نہیں کرے گی۔

کچھ دیر بعد والی جی نے دروازے سے باہر کھڑے کارندے کو اندر بلایا اور اسے لڑکی کو باہر لے جانے کے لیے کہا۔ یہ لڑکی والا معاملہ ختم ہوا تو والی جی ہماری طرف آ گئے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ میں والی جی کے چہرے کے تاثرات سے جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ ان کا موڈ کیسا ہے۔ چہرہ سپاٹ تھا۔ کبھی کبھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گہری طبیعت کے مالک ہیں۔

انہوں نے مجھے نارمل لہجے میں مخاطب کیا اور بولے۔ "مجھے پتا ہے، یہاں تم لوگوں کا دم گھٹ رہا ہو گا مگر مجبوری تھی۔ بہر حال، اب تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ دو چار دن کی بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ ہمارے لیے بالکل پریشان نہ ہوں جی۔ آپ جہاں بھی رکھیں گے ہم وہاں خوش ہوں گے۔"

"بہر حال، اس رات جو کچھ ہوا بہت اچھا ہوا۔ اگر تمہیں پتا نہ چلتا کہ وہاں فارم پر کیا ہو رہا ہے تو ان لوگوں نے حد بندی کر کے وہاں قبضہ کر جانا تھا۔ لیکن مجھے یہ پتا نہیں چلا کہ تم آدھی رات کو وہاں پہنچ کیسے گئے؟"

میں اس جواب کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں راجوال کو خداحافظ کہہ کر یہاں سے رخصت ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "پتا نہیں کیوں ایک دم میرا دل کرنے لگا کہ ماں جی کو دیکھوں۔ عجیب سی پریشانی لگی تھی۔ میں نے گھوڑی پکڑی اور چل دیا۔ ارادہ تھا کہ راتوں رات گاؤں سے ہو کر واپس آ جاؤں گا۔ شفیع محمد کے کھوہ پر پہنچا تو مجھے موکھلوں کا کالا ٹریکٹر نظر آیا۔ اس پر سات آٹھ بندے چڑھے ہوئے تھے۔ کچھ بندے ٹریکٹر کے پیچھے پیچھے بھی بھاگے جا رہے تھے۔ مجھے شک پڑا اور میں ان کے پیچھے چل دیا۔"

والی جی نے گہری سانس لی اور ہولے سے بولے۔ "یہ زمین بھی تو ماں ہی کی طرح ہوتی ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ گئے۔ ثمینہ کے حوالے سے انہوں نے کچھ بتایا، نہ ہم نے پوچھا۔

وہ چلے گئے اور میں سوچتا رہا۔ والی جی کا رویہ سمجھ سے باہر تھا۔ یقیناً وہ میرے اور بیگم بلقیس کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے، اس کے باوجود انہوں نے ابھی تک مجھ پر کچھ ظاہر کیا تھا نہ مجھے یہاں سے دفع ہونے کا حکم دیا تھا۔ شاید وہ کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کوئی ایسا طریقہ کہ میں ان کے قریب رہ سکوں۔ موکھلوں کے

ساتھ حالات بہت بگڑ گئے تھے اور والی جی کو مضبوط بازوؤں کی ضرورت تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا کہ وہ مضبوط بازوؤں کی خاطر اپنی آن بان داؤ پر لگانے کو تیار تھے۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے پیسے کے زور پر بڑے سے بڑے پھنے خان کو اپنے محافظوں میں شامل کر سکتے تھے۔۔۔۔ اگر وہ میرے بارے میں نرمی سے سوچ رہے تھے تو اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ شاید میں ان کے مزاج کے ہم آہنگ ہو کر ان کی ضرورت بن گیا تھا۔ وہ مجھ سے ہر موضوع پر کھل کر اور بے تکلفی سے بات کرتے تھے۔

اسی ہفتے ہمیں اس کچے تہ خانے سے نکال لیا گیا۔ میں ایک بار پھر حویلی سے باہر اسی کوارٹر نما کمرے میں پہنچ گیا جہاں اس سے پہلے رہ رہا تھا۔ والی جی کی ہدایت تھی کہ فی الحال میں راجوال سے باہر نہ نکلوں۔ میں اپنی والدہ اور بہن سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن والی جی کی ہدایت پر عمل کرنا بھی ضروری تھا۔ بہر حال، والی جی نے اپنے طور پر میری والدہ اور بہن کی خیریت دریافت کروائی تھی۔۔۔۔ اور انہیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ دونوں چند روز کے لیے اپنے کسی عزیز رشتے دار کے ہاں چلی جائیں۔ وہ دونوں ایک قریبی گاؤں سکھیرا میں چلی گئی تھیں۔ وہاں ہمارے ننھیالی تھے۔

کہنے کو تو میں اپنے ٹھکانے پر واپس آ گیا تھا لیکن باقی کے حالات بدل گئے تھے۔ حامد کے لیے ایک اور ماسٹر کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ حویلی کے اندر میرا آنا جانا بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اگر والی جی نے مجھ سے کوئی بات کرنا بھی ہوتی تو خود باہر آ کر کرتے۔۔۔۔ وہ مجھے مردانے میں بھی نہیں بلاتے تھے۔ عسکری اپنے کندھے کے زخم سے صحت یاب ہو کر واپس آ گیا تھا۔ تاہم ہر تیسرے چوتھے روز اسے مرہم پٹی کے لیے ڈسکہ اسپتال جانا پڑتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کا کمرا میرے استعمال میں آ جایا کرتا تھا مگر اب پہلے جیسا نہیں تھا۔ اب وہاں نصر اللہ سوتا تھا اور وہی بمبو کاٹ پر حویلی سے آنے والے پیغام وغیرہ سنتا تھا۔

والدہ اور عارفہ چند دن نانا کے گھر رہ کر واپس مراد پور آ گئی تھیں اور خیریت سے تھیں۔ میں ایک بار ان سے مل آیا اور تسلی تشفی دے آیا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بیگم بلقیس سے میرا رابطہ بالکل منقطع تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ حویلی میں موجود ہی نہیں ہیں۔ میں ان کے حوالے سے بہت فکر مند تھا۔ ایک دن خوش قسمتی سے مجھے موقع مل گیا۔

عسکری ڈسکے گیا ہوا تھا، والی جی بھی تاریخ پر لاہور گئے ہوئے تھے۔ میں نے نصر اللہ کو بہانے سے ماجھو حلوائی کی طرف گرم جلیبی اور اچھی نسل کی مونگ پھلی لانے کے لیے بھیج دیا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے انٹر کام پر حویلی میں رابطہ کیا۔ ڈر یہ تھا کہ چودھری عزیز یا فیروزاں میں سے کوئی انٹر کام نہ اٹھا لے۔ دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز بیگم بلقیس کی تھی۔ یہ بچھڑی ہوئی آواز سن کر سینے میں شادیانہ سا بج گیا۔

"کیسی ہیں آپ؟" میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"بس ٹھیک۔" انہوں نے بہت مدھم اور ڈری ہوئی سی آواز میں جواب دیا۔

"آپ کے لیے بہت پریشان تھا میں۔"

وہ ذرا توقف سے بولیں۔ "تم نے تو گاؤں چھوڑ کر چلے جانا تھا۔"

"میں تو جا رہا تھا۔ اس کے بعد آپ کو معلوم ہی ہے جو کچھ ہوا۔ اب جھگڑا چل نکلا ہے، شاید اسی لئے والی جی چاہ رہے ہیں کہ میں فی الحال یہاں رہوں۔"

"ہاں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔" بیگم بلقیس نے بہ دستور افسردہ آواز میں کہا۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔"

بیگم بلقیس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "خاور! جو کچھ ہو گیا، وہ ہو گیا۔ اب ہمیں بالکل سنبھل جانا چاہیے۔" ان کی آواز میں گھمبیر سنجیدگی تھی۔

"کیا اب میں آپ کی آواز بھی نہیں سن سکوں گا؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم اپنے آپ کو خوامخواہ مصیبت میں ڈال دیں گے۔ ویسے بھی اب میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے والی جی کو کسی طرح کا صدمہ ہو۔ ہمیں اب بہت محتاط رہنا ہو گا۔"

"لیکن۔۔۔۔ کبھی کبھار۔" میں نے التجا کے لہجے میں کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں۔ "بس یہی ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ تاریخ پر جائیں۔ چاچا عسکری بھی کمرے میں نہ ہو اور تم اس طرح رابطہ کر لو۔" وہ بہ دستور دھیمی آواز میں بول رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ وہ چودہ پندرہ تاریخ کو تو ضرور جاتے ہیں۔"

"لیکن ضروری تو نہیں کہ چاچا عسکری بھی ان دنوں گیا ہوا ہو۔"

"اس کا میں کچھ نہ کچھ کرلوں گا۔" میں نے کہا۔

"تم والی جی کو ہر طرح راضی رکھنے کی کوشش کرو۔ انہیں کوئی ایک پریشانی نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ ثمینہ والا معاملہ بھی انہیں بہت پریشان کرتا ہے۔ وہ بھی خبیث ایسی ڈھیٹ ہے کہ لاکھ منع کرنے پر بھی باز نہیں آرہی۔ وہ پکا بدمعاش ہے جس کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔"

"کیا یہ حویلی میں نوکری بھی کرتی رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ نہیں، اس کی ماں کرتی تھی اور اس سے پہلے اُس کی ماں کرتی تھی۔ سمجھو کہ یہ حویلی کے خاندانی ملازم رہے ہیں۔ پھر کسی بات پر ثمینہ کی ماں دلشاد، والی جی سے ناراض ہوگئی اور حویلی چھوڑ کر شام پور گاؤں چلی گئی۔ اپنی پانچوں بیٹیوں کو بھی ساتھ لے گئی۔"

"میں نے تو سنا تھا کہ یہ چار بہنیں ہیں۔"

"نہیں، پانچ تھیں۔ بڑی کا نام آسیہ تھا۔ وہ کوئی تین سال پہلے بیمار ہو کر مرگئی تھی۔ اب چار ہیں اور چاروں شادی کے لائق ہیں۔ بلکہ بڑی دو کی تو عمریں بھی گزرتی جارہی ہیں اور شادی کسی کی نہیں ہوئی۔ اب سنا ہے کہ کہیں پر بڑی دو لڑکیوں کی بات چل رہی ہے لیکن جس

طرح کے کرتوت یہ چھوٹی کررہی ہے، ہوسکتا ہے کہ ان کی بات بھی بگڑ جائے۔ یہ خاندانی ملازم رہے ہیں اس لیے والی جی کو ان کے بُرے بھلے کی فکر ہے۔"

"لیکن ان کی ماں دلشاد نے حویلی چھوڑی کیوں تھی؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بس ایویں چھوٹی سی بات تھی۔ کچھ پیسے مانگے تھے اس نے۔ بھائی عزیز (چودھری عزیز) نے "نہ" کہہ دی۔ اس بات پر اس نے جھگڑا کیا اور حویلی چھوڑ گئی۔ وہ اچھی تو بڑی تھی لیکن اس میں اکڑ بھی تھی۔ بس اسی اکڑ نے اسے خجل خراب کیا۔ اب خراب حالت میں ہے۔ ایک دو چھوٹے چھوٹے زمیندار ہیں جن کے گھروں میں بیٹیاں کام کرتی ہیں۔"

"خود کیا کرتی ہے؟"

"خود تو سات آٹھ سال سے کچھ نہیں کرتی۔ گوڈوں کا درد ہے۔ یہاں حویلی میں بھی اس کی بڑی بیٹی آسیہ ہی کام کرتی تھی۔ وہ ان سب میں اچھی تھی۔ اس وچاری کی اپنی عمر بھی ستائیس اٹھائیس سال ہوچکی تھی۔۔۔۔۔ اس کا نکاح ہوا تھا، پر رخصتی سے پہلے ہی طلاق ہوگئی تھی۔ بندہ شرابی کبابی نکل آیا تھا۔ اب اس نے اپنے ویاہ کا خیال ہی دل سے نکال دیا تھا۔ اس کی ایک

ہی تمنا تھی کہ اس کی چھوٹی چاروں بہنوں کی شادیاں جلد سے جلد ہو جائیں۔ حویلی سے جانے کے بعد بھی اس نے اپنی بہنوں کے لیے بڑی محنت مشقت کی۔ مگر پھر بیمار ہو گئی اور ایسی بستر سے لگی کہ اٹھی ہی نہیں۔"

بیگم بلقیس نے ذرا توقف کیا اور بولیں۔ "میں یہ سب تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ تمہیں ثمینہ کے حالات کا پتا ہو اور والی جی تم سے اس بارے میں کوئی بات کریں تو تم مشورہ دے سکو۔"

یکایک دوسری طرف سے کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ بیگم بلقیس سرگوشی میں بولیں۔ "ٹھیک ہے۔ میں بند کرتی ہوں۔ چودہ پندرہ تاریخ کو موقع ملا تو بات کریں گے۔"

بمبوکاٹ خاموش ہو گیا۔ بیگم بلقیس کا رازدارانہ انداز مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ جب وہ سرگوشی میں بات کرتی تھیں تو دیر تک میرے لہو میں خوشگوار ہلچل مچی رہتی تھی۔

بیگم بلقیس کو جیسے خود اپنی سمجھ بھی نہیں آ رہی تھی۔ اپنی گفتگو کے ایک فقرے میں انہوں نے رابطہ بالکل منقطع کرنے کی بات کی تھی۔ لیکن اگلے ہی فقرے میں انہوں نے مجھے امید

بھی دلا دی تھی کہ کم از کم گفتگو کی حد تک رابطہ برقرار رہ سکتا ہے۔ یہ میرے لئے خوش آئند تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

زمین کے ٹکڑے کے لیے زبردست قسم کی مقدمے بازی شروع ہو چکی تھی۔ کارخانے کا پانی بہ دستور مچھلی فارم کی طرف آتا تھا۔ دروازہ بھی مچھلی فارم کی طرف بہ دستور کھلا ہوا تھا۔ تاہم موکھلوں نے اس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ بھی سنا جا رہا تھا کہ وہ اس دروازے سے آمدورفت شروع کریں گے۔ اب دروازے پر اندر کی طرف تالا پڑا رہتا تھا۔

درحقیقت اب موکھلوں میں پہلے جیسی تیزی اور تن فن باقی نہیں رہی تھی۔ وہ قدم سوچ کر اٹھا رہے تھے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں اچھی طرح آ رہی تھی کہ راجوال والے پوری طرح جاگ رہے ہیں اور اگر وہ اینٹ پھینکیں گے تو دوسری طرف سے بھی اینٹ ہی آئے گی۔۔۔۔اور ہو سکتا ہے کہ پتھر بھی آ جائے۔ ڈر تھا کہ بڑے موکھل کے آنے کے بعد

کوئی بڑا ہنگامہ ہو گا لیکن ابھی تک خیریت ہی گزر رہی تھی۔ پچھلے جھگڑے میں میری چلائی ہوئی گولی موکھل پاشا کے بازو میں لگی تھی تاہم اسے معمولی زخم آیا تھا۔

ایک دن رونق علی میرے پاس میرے کمرے میں آیا۔ میں تو اب حویلی میں جاتا نہیں تھا۔ یہ رات کے آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ رونق علی کا پیٹ خوب کسا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ کہیں سے دو چار چرغے اور اسی مناسبت سے روغنی نان وغیرہ پیٹ میں ٹھونس کر آیا ہے۔ "کہاں سے آ رہے ہو رونق بھائی؟" میں نے پوچھا۔

"ڈسکے گیا ہوا تھا۔ بس تھوڑا سا جشن منایا ہے اس خوشی کے موقع پر۔"

"خوشی کا موقع؟ کس کی خوشی؟"

"تمہاری خوشی بھائی۔"

"چنگی بات ہے رونق بھائی۔ میری خوشی اور جشن آپ خود ہی منا آئے۔ اور یہ کیسی خوشی ہے کہ مجھے خود بھی نہیں پتا۔"

"تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں جس طرح کا جشن مناتا ہوں، تمہیں پتا ہی ہے۔ بس ذرا گانا شانا سنتا ہوں۔ تم ان چیزوں سے پرہیز کرتے ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ خوشی تمہاری ترقی کی خوشی ہے۔ شاید والی جی نے ابھی تمہیں بتایا نہیں۔ چلو، میں ہی بتا دیتا ہوں۔۔۔۔ عسکری کا تو تمہیں پتا ہے۔ لڑائی میں پھٹّل ہونے کے بعد بیمار شمار رہتا ہے۔ اس نے خود کہا ہے کہ اب اس سے بھاگ دوڑ نہیں ہوتی۔ عسکری کی خالی جگہ پُر کرنے کے لیے دو نام تھے۔ ایک تمہارا، دوسرا انصر اللہ کا۔ قرعہ تمہارے نام کا نکلا ہے۔ اب تم جاگیر کے سالار محافظ ہو۔"

یہ سنتے ہی ایک دم مجھے مسرت کا احساس ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی بھاری ذمے داری کا خیال بھی آیا۔ رونق علی دراز میں سے لڈوؤں کا ڈبہ نکال لایا اور کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے لڈو کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرے ہاتھ پر چپت مارا۔ "نہیں۔۔۔۔ یہ تمہاری طرف سے ہیں۔ پہلے ان کی رقم شقم ادا کرو۔ میری یہی مہربانی ہے کہ میں لیتا آیا ہوں۔"

میں نے اسے دو سو روپے دیے۔ وہ بولا۔ "میں بس ایک دو ہی کھاؤں گا۔ آج کل بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے۔ اور وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔۔ کولاسٹرول بھی!"

"کولیسٹرول تو بڑھے گا ہی۔ آپ پانی کے علاوہ ہر شے میں مکھن ڈال کر استعمال کرتے ہیں۔"

"اوئے، مکھن سے کچھ نہیں ہوتا شوتا۔ مکھن تو ٹھنڈا ہوتا ہے۔"

"پر کبھی کبھی ٹھنڈا بھی کر دیتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" رونق علی نے پورا لڈو منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

میں نے سنی ان سنی کر دی۔ رونق علی نے دو تین لڈو کھانے کا کہا تھا مگر ہوا اس کے برعکس۔۔۔۔ بس دو تین لڈو ہی بچے۔ پھر وہ کہنے لگا۔ "دیکھو۔ یہ جو دو سو روپیا میں نے تم سے لیا ہے اگر جیب میں رکھوں گا تو یہ بڑی زیادتی ہو گی۔ چلو، اس کی بھی جلیبیاں شلیبیاں منگوالو۔ لیکن جلیبیاں اس وقت ملیں گی نہیں۔۔۔۔ چلو ریوڑیاں ہی منگوالو۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ ریوڑیوں سے میرا بلڈ پریشر ٹھیک رہتا ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ہاں، ریوڑیاں بھی کافی ٹھنڈی ہوتی ہیں جی۔ خاص طور سے ان پر جو تل لگے ہوتے ہیں، وہ تو ٹھنڈے ٹھار ہوتے ہیں۔"

"یار! تم تو مذاق کرنے لگتے ہو۔۔۔۔ چلو، جو جی چاہے منگوالو۔ لیکن کچھ منگواؤ ضرور۔ مجھے خوشی اور غم کے موقع پر بھوک بھی کچھ زیادہ لگتی ہے۔"

"سیانے شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہماری زندگی بس دو ہی حالتوں کا نام ہے۔۔۔۔ خوشی اور غم!"

"اچھا، یہ پڑھے لکھوں والی چکر دار باتیں چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کہیں اس خبیث پاشا سے آمنا سامنا تو نہیں ہوا۔"

"آمنا سامنا کیا ہونا تھا۔ والی جی کے کہنے کے مطابق میں پنڈ کی حد سے باہر ہی نہیں گیا ہوں۔"

"بس اس کی طرف سے ہوشیار رہنے کی لوڑ ہے۔ وہ تھپڑ والی بات بھولے گا نہیں۔ بدلہ لینے کے لیے موقعے کی تاک شاک میں ہو گا۔"

"جب سامنے آئے گا تو دیکھ لیں گے جی۔ ہماری ہی طرح دو ہاتھوں پاؤں اور ایک سر والا بندہ ہے نا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، پر اس کی خصلت بڑی بھیڑی ہے۔ وہ پڑی واس (خانہ بدوش) لڑکے والی بات کا پتا ہے تجھے؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ رونق علی بولا۔ "یہ ڈھائی تین سال پہلے کی بات ہے۔ پڑی واسوں کا ایک منڈا موکھلوں کے کھیتوں سے آلو نکالتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ اس حرامی نے اس جرم کی سزا منڈے کو یہ دی کہ اسے بھوکے شیر کے آگے ڈال دیا۔"

"شیر کے آگے؟ شیر کہاں سے آگیا؟"

"اس حرامی نے ایک دھاری دار شیر رکھا ہوا ہے۔ زیادہ بڑا نہیں ہے، پر ہے تو شیر۔ اس کو سنگلیاں ڈال کر دیہات میں گھماتا ہے اور لوگوں پر دہشت ڈالتا ہے۔ سنا ہے، اس نے جانور رکھنے کا لائسنس شائیسنس بھی لیا ہوا ہے۔"

یہ واقعی حیران کن اطلاع تھی۔ میں نے کہا۔ "آپ لڑکے کی بات بتا رہے تھے۔"

"ہاں۔۔۔۔ دراصل تھوڑا بہت قصور پڑی واسوں کا بھی تھا۔ وہ رات کے وقت موکھلوں کی پیلیوں (کھیتوں) سے آلو شالو اکھاڑ کر لے جاتے تھے۔ موکھلوں نے انہیں دو چار دفعہ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

منع شنع بھی کیا۔ پھر ایک رات وہ لڑکا پکڑا گیا۔ موکھل پاشا نے اس روتے کرلاتے منڈے کو شیر کے آگے ڈال دیا۔ حویلی کے احاطے میں وہ منڈا شیر کے آگے آگے بھاگتا رہا اور دہائی دیتا رہا۔ شیر نے اسے پکڑا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو چبا لیا اور اس کی گردن بھی پیچھے سے اکھیڑ دی۔ ڈر کے مارے منڈے کا کوئی وارث اس کے پیچھے نہیں آیا۔ موکھل اپنی حویلی میں ہی ایک دو دن اس کی مرہم پٹی کرتے رہے۔ وہ منڈا مر گیا۔"

"پولیس تک بات نہیں گئی؟"

"گئی ہوگی۔ پر وہ کہتے ہیں نا جس کی لاٹھی شاٹھی اسی کی بھینس شینس۔ پاشا نے مشہور کیا کہ منڈا چوری کی نیت سے ہتھیار لے کر حویلی کے اندر گھسا تھا اور اسے شیر نے نہیں، رکھوالی کے کتوں نے بھنبھوڑا ہے۔ پڑی واس تو ایسے ڈرے کہ اپنے ڈیرے اٹھا کر کہیں غائب شائب ہو گئے۔ پر بعد میں ساتھ والے پنڈ شریف والا کے ایک ماسٹر اشرف نے منڈے کے ماں پیو کو ڈھونڈا اور کہا کہ وہ موکھل پاشا کے خلاف قتل کی رپورٹ شپورٹ درج کرائیں۔ رپورٹ شپورٹ بھی ہوئی، پر تمہیں کہا ہے نا۔۔۔۔ ہمارے جیسے دور دراز علاقوں میں

کمزور کا کچھ نہیں بنتا اور نہ ہی اس کی کوئی سنتا ہے۔ الٹا کمزور کی مدد کرنے والا بھی پھنستا ہے۔"

"کیا ماسٹر اشرف بھی پھنس گیا؟"

"بالکل پھنس گیا بھئی۔ اور لوگوں کو پکا یقین ہے کہ ماسٹر اور اس کے گھر والوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے پیچھے پاشا کا ہاتھ ہی تھا۔"

اس کے بعد رونق علی نے مجھے اس موقعے کا سب سے لرزہ خیز حصہ سنایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ ماسٹر اشرف نے مقتول کے وارثوں کو مقدمہ کرنے پر اکسایا تھا اور سینہ تان کر گواہی وغیرہ بھی دی تھی، اس لیے موکھلوں کو رنج تھا۔ بعد میں مقدمہ تو خارج ہو گیا پر موکھلوں کے دل میں رنج رہا۔۔۔۔ خاص طور سے موکھل پاشا کے دل میں۔ ماسٹر اشرف کی تنخواہ معمولی تھی۔ گزر بسر کے لیے ماسٹر اشرف کا چھوٹا بھائی گھر میں ہی دیسی طرز کی ماچسیں بناتا تھا۔ اشرف کی بیوی اور دو بچے بھی اس کام میں شریک ہوتے تھے۔۔۔۔ کوئی ایک سال پہلے ان کے گھر رکھی ہوئی گندھک یا پٹاس میں زوردار دھماکا ہوا اور سارا گھر دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ ماسٹر اشرف کے گھر میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ ماسٹر اشرف کے علاوہ اس کی

بیوی، دو بچے اور چھوٹا بھائی جل کر خاکستر ہو گئے۔ بہ ظاہر یہ ایک حادثہ تھا لیکن علاقے کے واقف حال لوگ جانتے تھے کہ یہ حادثہ کیوں ہوا اور کس نے کیا۔ عام لوگوں کو بھی یقین تھا اور ہے کہ اس کے پیچھے موکھل پاشا کا ہاتھ تھا۔

موکھل پاشا کے بارے میں تفصیل جاننے کے بعد میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس سنسنی میں ڈر کی آمیزش نہیں تھی بلکہ ایک طرح کی ترنگ تھی اور اس ترنگ سے یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ میں اس خطرناک بندے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھوں۔ پھر مجھے اس معصوم ثمینہ کا خیال آیا اور مجھے تعجب ہونے لگا کہ اگر پاشا واقعی اتنا خطرناک اور غلط کار ہے تو پھر ثمینہ نے اس سے یارانہ کیوں بنایا ہوا ہے؟ کہیں رونق علی کے قیافے کے مطابق وہ واقعی کسی چکر میں تو نہیں پھنسی ہوئی؟ اگر ایسا تھا تو پھر اسے مدد کی ضرورت تھی لیکن مدد تو تب ہوتی جب حقیقت کا پتا چلتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چاچے عسکری کی جگہ لینے کے بعد میری مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ نصراللہ میرے معاون کا کردار ادا کر رہا تھا۔ میں نے نصراللہ کو پوری عزت اور محبت دی تھی۔ اسے مجھ سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ ہم سائیسوں کی مدد سے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتے۔ اسلحے کو دیکھتے بھالتے، بندوں کو چوکس رکھتے۔ شکاری جانوروں یعنی کتوں اور بازوں وغیرہ کے نگران بھی مجھ سے رابطے میں رہتے اور اپنی رپورٹیں دیتے رہتے۔

ان ساری مصروفیات میں بھی بیگم بلقیس کا خیال چند لمحوں کے لیے بھی ذہن سے نہیں نکلتا تھا۔ اتفاقاً چودہ پندرہ تاریخ کو والی جی راجوال سے باہر نہیں گئے۔ مجھے مزید دو ہفتے انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران میں، میں نے ایک بہت اہم کام کیا۔ کچھ لائسنسی بندوقوں کی مرمت کروانے کے لیے میں گوجرانوالہ گیا تو لاہور کا بھی چکر لگا آیا۔ لاہور کی شاہ عالم مارکیٹ سے میں نے 18 واٹ کا ایک اور انٹرکام خریدا اور اس کا تار اور کنیکٹر وغیرہ لیا۔ راجوال واپس پہنچنے کے دو دن بعد مجھے ایک سنہری موقع مل گیا۔ میں نے چاچے عسکری کے کمرے میں چھت کے پاس سے انٹرکام کا تار ڈھونڈا اور اس تار کو نئے تار سے منسلک کر دیا۔ نئے تار کو چھت کی سرکیوں کے اندر سے گزار گزار کر میں اپنے کمرے تک لے آیا۔ یہ سارا کام میں

نے اس طریقے سے کیا کہ آسانی سے کسی کی نگاہ میں نہ آسکے۔ سچ کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔

اب دوسرا انٹرکام میرے کمرے کے اندر چوبی الماری کے ایک دراز میں مقفل تھا اور میں بے چینی سے کسی اچھے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ اچھا وقت دو ہفتے بعد آیا۔ والی جی اور چودھری عزیز دونوں کو تاریخ پر جانا پڑا۔ رات کو میں نے بیگم بلقیس سے رابطہ کیا۔۔۔۔ ہمارے درمیان دیر تک باتیں ہوئیں۔ لیکن اب میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ گفتگو میں کافی محتاط ہیں۔ میں اب انہیں بیگم بلقیس کے بجائے صرف بلقیس کہنے لگا تھا۔

میں نے کہا۔ "بلقیس! آپ کو کیسا لگتا ہے؟ مجھے تو لگتا ہے کہ شاید ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں۔ کہیں یہ۔۔۔۔ واپسی کا سفر تو نہیں ہو گیا؟"

وہ پہلی بار ذرا سا ہنسیں اور دلنواز لہجے میں ایک جملہ کہا۔ "اب واپسی شاید ممکن نہیں ہے خاور!"

میرے دل کے بجھتے ہوئے دیے میں جیسے پھر سے تیل پڑ گیا۔ میں نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔ "میں آپ کی آواز کو ترس رہا ہوں۔"

"بول تو رہی ہوں دو گھنٹے سے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر کانوں کو کچھ اور عادت بھی پڑ گئی ہے۔"

وہ پھیکے انداز میں ہنسیں۔ "نہیں۔۔۔۔۔اب بس۔"

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ کہیں واپسی تو شروع نہیں ہو گئی؟"

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہیں پھر میرے اصرار پر انہوں نے ہیر وارث شاہ کا ایک ایسا بند سنایا جس میں ناقابل مزاحمت محبت کے ساتھ ساتھ مجبوریوں اور ناموافق حالات کا تذکرہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ اس ناطاقتی، نارسائی اور خوف کا بیان تھا جو ہمیشہ عورت ذات کے ساتھ منسلک رہے ہیں۔ آخر میں پھر امید کی ایک کرن سی تھی۔

سچ بات تو یہ ہے کہ ان کے گانے سے بھی زیادہ مجھے ان کی سوالیہ "بس" کا مزہ آتا تھا جو گانے کے آخر میں کہتی تھیں۔ اس مرتبہ بھی آخر میں انہوں نے بڑے دل ربا انداز میں "بس؟" کہا اور میں پوری جان سے تڑپ گیا۔

میں نے کہا۔ "کاش! آپ سامنے ہوتیں تو۔۔۔۔۔"

وہ میری بات سمجھتے ہوئے شرمیلے انداز میں بولیں۔ "تو۔۔۔۔۔اب کچھ نہیں۔ بس اب سنبھل جانا چاہیے۔"

وہ سنبھلنے کی بات تو کرتی تھیں مگر ایسے میٹھے انداز میں کہ مزید بکھرنے کو دل چاہنے لگتا تھا۔

والی صاحب دو دن مزید نہیں آئے اور ہمارے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔ چاچے عسکری والا کمرا اب مستقل طور پر منشی منظور کو دے دیا گیا تھا۔ منشی منظور ہی حویلی سے پیغام رسانی کا ذمے دار ٹھہرا تھا۔ وہ جلدی سو جاتا تھا۔ پھر بھی میں محتاط رہتا تھا کہ کسی وقت وہ اپنی طرف سے ریسیور نہ اٹھالے۔ یہ عجیب سا بہاؤ تھا جس میں ہم دونوں نے سب کچھ جانتے بوجھتے پھر بہنا شروع کر دیا تھا۔

میرے گھر کی مالی حالت اب کافی بہتر تھی۔ والدہ اور عارفہ مجھ سے خوش تھیں۔ والدہ نے اصرار کر کے مجھ سے نیلی بار کی ایک بھینس منگوالی۔ اس کے سینگ مڑے ہوئے تھے اور پنڈا خوب چمک دار تھا۔ صبح اور شام کا دودھ ملا کر کوئی پندرہ کلو ہو جاتا تھا۔ والدہ یعنی بے بے دودھ کو خدا کا نور کہتی تھیں۔ اس "نور" کو سنبھالنے، جمانے، بلونے اور اس میں سے مکھن نکالنے میں انہیں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ سارا دن بس اسی کام میں لگی رہتی تھیں۔ میں گاؤں جاتا تو

وہ جہاں بھی ہوتیں، میں انہیں پکڑ کر چارپائی پر لٹاتا اور ان کے پاؤں دبانا شروع کر دیتا۔ ان کے پاؤں دبانے میں جو راحت ملتی تھی اس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں۔ عارفہ ہر وقت میری شادی کی بات کرتی رہتی۔

میں کہتا۔ "تو بڑی نخچری ہے۔ شادی ویاہ کی باتیں اس لیے چھیڑتی ہے کہ پھر تیری شادی کی باتیں بھی ہوں۔"

"نہیں جی! مجھے کوئی شوق نہیں ہے ویاہ کرانے کا۔"

میں کہتا۔ "شوق تو مجھے بھی نہیں تھا مگر دیکھو، اب پڑ گیا ہے۔ جاگیردار صاحب کی ایک نہیں تین بیٹیاں ہیں اور تینوں ایک سے بڑھ کر ایک سوہنی۔ تینوں میں دوڑ لگی ہوئی ہے کہ کون مجھ پر حاوی ہوتی ہے۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ مجھے ایک نہیں دو۔۔۔۔ بلکہ شاید تین شادیاں کرنی پڑیں گی۔"

وہ تنک کر کہتی۔ "کبھی آپ کہتے ہیں کہ میرے ہتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں، کبھی اکٹھی تین ووہٹیوں کے لاڈلے بنتے ہیں۔"

"بس اسی بات سے ڈر لگتا ہے بہن میری۔۔۔۔ اگر لکیریں واقعی سچی ہوتی ہیں تو پھر کوئی بھی گڑبڑ گھوٹالا ہو سکتا ہے۔ کیا پتا، وہ تینوں آپس میں ہی لڑ پڑیں اور کوئی ایک بھی ہتھ نہ آئے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ آپ بس ناٹک رچاتے ہیں، وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔"

بے بے بڑی سنجیدگی سے کہتیں۔ "دیکھ پتر خاور! اب اللہ سوہنے نے ہمارا ہتھ سوکھا کر دیا ہے۔ جو تھوڑا بہت قرضہ تھا وہ بھی اتر گیا ہے۔ اب سب سے پہلے ہم دو کچے پکے کوٹھے بنا لیں۔ جب تک کوٹھے بنتے ہیں، میں تیرے لیے کوئی چنگی سی کڑی ڈھونڈ لیتی ہوں۔ میں سچ کہتی ہوں خاورے! اب تو تیرے سر پر سہرا دیکھنے کی آس میں جی رہی ہوں۔" ان کی دن بہ دن بوڑھی ہوتی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمک جاتی۔

ہمارے گھر میں بس ایک ہی قابل استعمال کمرا تھا۔ ہمیں ایک یا دو کمروں کی شدید ضرورت تھی۔ اب دیہات میں کہیں کہیں پکے کوٹھے بننے شروع ہو گئے تھے۔ میرا دل بھی چاہتا تھا کہ ہمارے پنڈ میں پہلا پکا کوٹھا ہمارا ہو۔ اس لیے میں ہر مہینے پیسے جمع کر رہا تھا اور اب بے بے

جی کے جستی ٹرنک میں کوئی آٹھ ہزار روپے اکٹھے ہو چکے تھے۔ایک روز میں نے بے بے سے وعدہ کیا کہ چھوٹی عید کے فوراً بعد کوٹھے بنوانا شروع کرادوں گا۔

راجوال میں حالات ٹھیک جا رہے تھے۔دو نمبر بمبو کاٹ اپنا کام بڑے اچھے طریقے سے کر رہا تھا۔بیگم بلقیس سے رابطہ جاری تھا۔اب کبھی کبھی والی جی کی موجودگی میں بھی بیگم بلقیس بات کرنے کا موقع نکال لیتی تھیں۔جب والی جی سو رہے ہوتے، وہ انٹر کام پر ایک بیل کر کے بند کر دیتیں۔منشی منظور کو کچھ اندازہ نہ ہوتا کہ بیل کیوں ہوئی ہے۔وہ اکثر ریسیور ہی نہ اٹھاتا۔کبھی کبھی ریسیور اٹھا لیتا اور ایک دو دفعہ ہیلو کہہ کر بند کر دیتا۔میرے والے انٹر کام پر بہت مدھم بیل ہوتی تھی۔منشی منظور کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں کال کرتا اور بیگم بلقیس کی بے مثال آواز کا رس میرے کانوں میں ٹپکنا شروع ہو جاتا۔میں جانتا ہوں، یہ سب کچھ غلط تھا مگر اس کے ہونے یا نہ ہونے پر ہمارا بس نہیں تھا۔خاص طور سے میرا تو بالکل بھی نہیں تھا۔میں سرتاپا بیگم بلقیس کی محبت میں ڈوب چکا تھا۔جسم کے ایک ایک روئیں میں ان کی چاہت بس چکی تھی۔اور میں جانتا تھا کہ وہ ایک بیوی ہیں، ایک جوان

ہوتے بچے کی ماں ہیں اور ان کی عزت کے ساتھ والی جی کی اور پوری جاگیر کی عزت وابستہ ہے۔

ایک دن میں نے کہا۔"بلقیس! میں آپ کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب۔"

"دیکھیں، آپ ہمیشہ مجھے کچھ نہ کچھ دیتی ہی رہتی ہیں۔آپ کی درجنوں چیزیں میرے پاس جمع ہو چکی ہیں لیکن میں آج تک آپ کو کچھ نہیں دے سکا۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔بس تم نے کہہ دیا، مجھے مل گیا۔"

"نہیں، اس طرح نہیں۔۔۔۔۔میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس عید پر آپ کو کچھ دوں اور دیکھیں آپ نے انکار نہیں کرنا۔"

"نہیں خاور! یہ ٹھیک نہیں۔"

وہ نہ نہ کرتی رہیں اور میں اپنی بات پر اڑا رہا۔

بیگم بلقیس سے بات ہونے کے بعد میں نے سوچنا شروع کیا کہ انہیں کیا دیا جائے۔۔۔۔ میں نے بازار میں خریداری نہیں کی تھی۔اس کام میں مجھے ذرہ بھر دلچسپی نہیں۔۔۔۔ کبھی شادی بیاہ کے موقع پر بے بے جی یا عارفہ بہت زور لگا تیں کہ میں خریداری کے لیے ان کے ساتھ ڈسکے تک ہی چلا جاؤں لیکن میں مان کر نہیں دیتا تھا۔سو بہانے بناتا تھا اور بالآخر جان چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا۔اب زندگی میں پہلی بار میرا دل بازار جانے کو اور خریداری کرنے کو چاہا۔۔۔۔اور اس طرح چاہا کہ میں باقی سب کچھ بھول گیا۔

میں پورے دو دن سوچتا رہا کہ اس کو کیا تحفہ دوں جو میری رگ جاں سے بھی قریب ہو چکا ہے۔ہر تحفہ حقیر اور ہر ارادہ چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔کوئی ایسی چیز درکار تھی جو مختصر ہو اور قیمتی بھی۔ظاہر ہے یہ کوئی طلائی زیور ہی ہو سکتا تھا۔۔۔۔

مجھے پتا تھا کہ بیگم بلقیس ایک جاگیر دار کی بیوی ہیں اور ان کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک گہنا ہو گا۔شادی کے موقعے پر میں نے انہیں نہایت قیمتی ہار اور جھمکے پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ایک جاگیر دار اور ایک ملازم پیشہ کا مقابلہ کہاں ہو سکتا تھا؟لیکن کم از کم اس تحفے کے حوالے سے میں پیچھے رہنا نہیں چاہتا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں ایک دن لاہور پہنچا اور روزے کی حالت میں سارا دن سوہا بازار کے چکر لگاتا رہا۔سوہا بازار کی دکانیں سونے چاندی کے زیورات سے بھری ہوئی تھیں۔ان میں کئی بہت بیش قیمت تھے تاہم میری جیب میں صرف وہ آٹھ ہزار روپے تھے جو میں نے کئی ماہ میں جمع کیے تھے تاکہ دو کوٹھے بن سکیں۔تلاش بسیار کے بعد مجھے ایک ہار بیگم بلقیس کے شایان شان محسوس ہوا۔اس میں سچے نگینے بھی لگے ہوئے تھے۔یہ نہایت خوبصورت چیز تھی۔صراف نے اس کی قیمت اٹھارہ ہزار بتائی۔اس دور کے حساب سے یہ کافی قیمت تھی۔

میں دل میں ارادہ کر چکا تھا کہ اب کچھ بھی ہو یہی ہار لینا ہے،لہذا میں لاہور واپس آگیا۔اگلے تین چار روز میں نے پیسوں کے انتظام میں گزار دیے۔رونق علی نے تین ہزار روپے دیے۔یاروں دوستوں سے تھوڑا تھوڑا ادھار لیا۔اپنی دو ذاتی چیزیں بیچیں جن میں ایک ولایتی رائفل اور سونے کے دو تعویز(خالی ڈبیاں)شامل تھے۔میں دوبارہ لاہور پہنچا اور جب مطلوبہ ہار میرے ہاتھ میں آیا تو یوں لگا کہ زندگی کی ایک بہت بڑی خوشی حاصل ہو گئی ہے۔محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔یہ بندے سے ایسے ایسے کام کراتی ہے جو وہ عام حالات میں سوچ بھی نہیں سکتا۔میں نے حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ میں نے قریباً پانچ روز اس ہار کے

لیے مسلسل بھاگ دوڑ کرتے گزارے ہیں لیکن مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے یہ عرصہ زمین پر خجل خراب ہوتے نہیں ہواؤں میں اڑتے ہوئے گزارا ہے۔

میں نے ایک چھوٹا سا عید کارڈ بھی لے لیا تھا مگر اس پر لکھا کچھ نہیں تھا۔ میں نے یہ چیزیں پیک کر لیں، اب انہیں بیگم بلقیس تک پہنچانے کا مرحلہ تھا۔ میں حویلی کے اندر جاتا نہیں تھا اور وہ باہر آتی نہیں تھیں۔ اب آمنا سامنا ہو تو کیسے؟ میں مختلف طریقے سوچتا رہا۔ اسی دوران میں اتفاقاً میری مشکل آسان ہو گئی۔ شاید اسی کو قسمت کا زور مارنا کہتے ہیں۔ یہ عید سے بس چار پانچ دن پہلے کی بات ہے۔ رات کے نو بجے ہوں گے۔ میں کمرے میں تھا اور نصراللہ کے ساتھ بیٹھا مونگ پھلی ٹھکور رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں بیل ہوئی، چند سیکنڈ بعد دروازے پر منشی منظور نمودار ہوا اور بولا۔

"خاورے! تجھے والی جی بلا رہے ہیں۔"

"کہاں؟" میں نے چونک کر کہا۔

"بمبو کاٹ پر!"

میں جلدی سے دوسرے کمرے میں گیا۔ انٹر کام پر والی جی کراہ رہے تھے۔ "کیا ہوا جناب؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

وہ کراہتے ہوئے بولے۔ "آج روزہ رکھا تھا۔ افطاری کے بعد سے سینے میں سخت سڑن پڑ رہی ہے۔ الٹی بھی آئی ہے۔ مولوی بشارت نے دو پڑیاں دی تھیں، پر کچھ فرق نہیں پڑا۔ اگر تمہارے پاس کوئی دوا ہے تو۔۔۔۔۔"

"کیوں نہیں جی۔۔۔۔۔ ہے دوا۔"

"تو پھر لے آؤ۔" انہوں نے کراہتے ہوئے کہا۔

اب مسئلہ وہی تھا۔ والی جی انگریزی دوا کھاتے نہیں تھے۔ الٹی کی دوا "گریوی نیٹ" تو میں نے پیس کر رکھی ہوئی تھی۔ سینے میں جلن کی معروف دوا جیلوسل ٹکیوں کی شکل میں تھی۔ میں نے نصراللہ کو باہر بھیج کر جیلوسل کی پانچ چھ ٹکیاں بھی اسٹیل کے گلاس میں پیس کر اخبار کے کاغذ میں پڑیوں کی طرح لپیٹ لیں۔ متلی کی دوا گریوی نیٹ بھی میں نے اسی میں مکس کر لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے الماری کی مقفل دراز میں سے چھوٹا پیکٹ بھی نکال لیا۔ عید کارڈ اور ہار والا پیکٹ!

کئی ماہ بعد میں حویلی میں داخل ہوا اور والی جی کے کمرے میں پہنچا۔ انہیں تکلیف میں دیکھ کر مجھے حقیقی پریشانی ہوتی تھی۔ بیگم بلقیس والی جی کو پیالی سے پانی پلا رہی تھیں۔ انہوں نے اوڑھنی کو اس طرح سر پر ڈھلکا رکھا تھا کہ چہرے پر چھوٹا سا گھونگھٹ بن گیا تھا۔ میرے آنے کے بعد وہ باہر چلی گئیں۔ تاجو ہمارے آس پاس ہی موجود رہی۔ میں نے والی جی کو دوا کھلائی۔ ان کے پاس بیٹھ کر ان کا حال احوال دریافت کرتا رہا۔ ایک دم میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "والی جی! ایک چھوٹی پڑیا تو رہ ہی گئی ہے، میں ابھی لے کر آیا۔"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

دراصل مجھے قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا تھا کہ بیگم بلقیس زنان خانے کے داخلی دروازے کی طرف جا رہی ہیں۔ اب اگر میں داخلی دروازے کی طرف جاتا تو ان سے آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا اور بالکل اسی طرح ہوا جس طرح میں نے سوچا تھا۔ بیگم بلقیس داخلی دروازے کی طرف سے ہو کر واپس آ رہی تھیں اور میں جا رہا تھا۔ ہماری ملاقات ایک تنگ راہداری میں ہوئی۔ وہ اپنی گرم شال میں کچھ سمٹی ہوئی سی تھیں۔

شاید انہیں پہلے سے اندازہ تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ وہ قریب پہنچیں تو میں نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے ہار والا پیکٹ نکالا اور ان کی طرف بڑھایا۔

یہ خطرناک لمحے تھے۔ تاجو ارد گرد موجود تھی اور حامد بھی جاگ رہا تھا۔ فیروزاں کی آواز کہیں پاس سے آ رہی تھی۔ بیگم بلقیس نے عجیب انداز سے نفی میں سر ہلایا اور بدن چرا کر میرے پاس سے گزرنا چاہا میں نے ایک بار پھر پیکٹ انہیں تھمانے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ شال سے باہر نہیں نکالے اور تیزی کے ساتھ میرے پاس سے گزریں۔

ان ساعتوں میں ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ نے مجھے گھیرا۔ میں نے مشینی انداز میں ہاتھ کو حرکت دی اور پیکٹ بیگم بلقیس کے سامنے فرش پر پھینک دیا۔ انہوں نے پیکٹ کو گرتے دیکھا مگر اسے اٹھائے بغیر کمرے میں چلی گئیں۔ میں بھی لمبے ڈگ بھرتا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے ایک لمحے کے لیے مڑ کر دیکھا۔ بیگم بلقیس دوبارہ کمرے سے نمودار ہوئیں۔ انہوں نے پیکٹ اٹھا کر اپنی شال کے نیچے چھپایا اور اندر چلی گئیں۔

میں درد کی دوا بیسکو پین کی ایک پسی ہوئی ٹکیا کی پڑیا لے کر واپس آ گیا۔۔۔۔اور والی جی سے کہا کہ وہ درد کے وقت اسے استعمال کر سکتے ہیں۔

حویلی سے اپنے کمرے میں واپس آ کر میں دیر تک آج کے واقعے کے بارے میں سوچتا رہا۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب انٹر کام کی ایک بیل ہوئی۔ منشی منظور آج کل اونچا سنانے والا آلہ استعمال کر رہا تھا پھر بھی وہ ایک مختصر بیل سے جاگنے والا کہاں تھا۔ یہ بیل بیگم بلقیس کی طرف سے اشارہ تھی۔ میں نے انٹر کام پر ان سے رابطہ کیا۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔

"بہت بری بات ہے۔۔۔۔بہت ہی بری بات ہے۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"کیا مطلب؟"

"اتنا مہنگا تحفہ۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔میں یہ نہیں لوں گی۔"

"آپ نے لیا ہی کب ہے۔ میں تو پھینک کر آ گیا ہوں۔"

"اور ہاں۔۔۔۔یہ کیا حرکت تھی؟ یہ کیوں کیا تم نے۔۔۔۔اگر کوئی دیکھ لیتا تو پھر؟"

"پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ بلکہ تب تو میرا دل چاہا تھا کہ اسے کہیں دور پھینکوں۔ کہیں کوڑے وغیرہ میں۔"

"خاور! یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟"

میں نے گہری سانس لی۔ "بلقیس! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کے لیے مستقل خطرہ بنا ہوا ہوں۔ آپ کی زندگی بھی میری وجہ سے مشکل میں ہے۔ اس کے ساتھ یہ احساس بھی ہے کہ والی جی کو دھوکا دے رہا ہوں۔ کسی وقت دل چاہتا ہے کہ واقعی سب کچھ چھوڑ کے چلا جاؤں۔ کہیں بہت دور۔۔۔۔جہاں مجھ تک آپ کی کوئی خبر نہ پہنچے اور نہ میری خبر آپ کو ہو۔۔۔۔کبھی نہ ہو۔"

"لگتا ہے ناراض ہو گئے ہو؟"

"نہیں بلقیس! یہ ناراضگی اپنے آپ سے ہے۔ یہ بات بھی بار بار ذہن میں آتی ہے کہ آخر اس سلسلے کا انجام کیا ہو گا۔ اور جس چیز کو کوئی انجام ہی نہ دیا جا سکتا ہو، اسے جاری رکھنے سے حاصل؟"

اسی دوران میں والی جی کے مسلسل کھانسنے کی آواز آئی۔ بیگم بلقیس نے کہا۔ "اچھا، میں انہیں دیکھتی ہوں۔۔۔۔ بعد میں بات کریں گے۔"

اس کے ساتھ ہی انٹر کام یعنی بمبو کاٹ بند ہو گیا۔

اگلے روز رات کو نو بجے کے لگ بھگ مجھے والی جی کے بلاوے پر پھر حویلی میں جانا پڑا۔ ان کی متلی اب ٹھیک تھی لیکن شام سے پیٹ میں مسلسل درد ہو رہا تھا۔ رنگ زرد دکھائی دیتا تھا۔ والی جی کو ڈسکہ جانے اور ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دینا فضول تھا۔ انہوں نے ماننا ہی نہیں تھا۔ میں نے انہیں پسی ہوئی بیسکوپین کھلائی اور پسی ہوئی جیلوسل کی ایک پڑیا بھی دی۔

میں ان کے پاس ہی بیٹھا رہا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ چودھری عزیز بیوی بچوں سمیت کسی شادی پر گوجرانوالہ میں تھا۔ درد کش دوا نے جلد ہی اثر کیا اور والی جی کی تکلیف بہ تدریج کم ہونے لگی۔ وہ بولے۔ "خاور! یہ تیری دوائیں ہیں تو سنیاسی، پر ان میں سے بُو وہی منحوس انگریزی دواؤں والی آتی ہے۔"

"آرام تو دیتی ہیں نا جی۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ مولوی بشارت کے نسخوں میں تو جیسے کوئی اثر ہی نہیں رہا۔ لگتا ہے جب سے اس نے دوجا ویاہ کیا ہے اس کے کام میں برکت ختم ہو گئی ہے یا پھر یہ خود بچت کے نام پر برکت نکال لیتا ہے۔"

ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں چونکہ ہر دوسرے تیسرے روز مچھلی فارم کا چکر لگا کر آتا تھا، اس لیے والی جی مجھ سے وہاں کی صورتِ حال دریافت کرنے لگے۔

پھر انہوں نے ایک قریبی زمیندار سے دس نئے گھوڑے خریدنے کی بات چھیڑ دی۔ ان کا خیال تھا کہ سودے سے پہلے میں ایک بار چاچے عسکری کو ساتھ لے جا کر گھوڑوں کو دیکھ آؤں۔ باتیں کرتے کرتے ان کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور وہ سو گئے۔ درد سے نجات کے بعد عموماً مریض کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

آج تاجو بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ بس کبھی کبھی قریبی کمروں سے قدموں کی مدھم چاپ ابھرتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ بیگم بلقیس ہی تھیں۔ میں اب جانا چاہتا تھا۔ میں کمرے کے دروازے تک پہنچا اور کھنکھار کر گلا صاف کیا تا کہ گھر والوں کو پتا چل جائے کہ میں جا رہا ہوں۔ اس وقت قریبی دروازے پر بیگم بلقیس نمودار ہوئیں۔

"جارہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا اور زنان خانے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے کے لیے راہداری میں داخل ہوا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہیں اور میری طرف دیکھتی رہیں۔ اچانک میرے رگ وپے میں سنسنی دوڑ گئی۔ دل کی دھڑکنیں پورے جسم میں گونجنے لگیں۔ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی ناک کا کوکا لشکارے مار رہا تھا۔ ہونٹوں پر ایک دبی سی مسکراہٹ تھی۔ میرے پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ میں بیگم بلقیس کے مقابل قریباً چار فٹ کی دوری پر کھڑا رہ گیا۔ یہ بڑے معنی خیز لمحے تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے شیریں لہجے میں کہا۔ "اب کھڑے کیوں ہو، جاتے کیوں نہیں؟"

میں نے لرزتی آواز میں کہا۔ "آپ کہتی ہیں تو چلا جاتا ہوں۔" میں کہہ تو رہا تھا مگر میرا سراپا گواہی دے رہا تھا کہ میں پتھر ہو چکا ہوں۔ اب یہاں سے ہلنا میرے لیے بے حد دشوار کام ہوگا۔ کوکے کے لشکارے کے سوا ہر چیز میری نظر میں دھندلا گئی تھی۔

ان کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں لرزے۔ پھر انہوں نے بڑی ادا سے میری کلائی تھام لی اور الٹے پاؤں چلتے ہوئے مجھے ایک نیم تاریک کمرے میں لے آئیں۔ اس کمرے میں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

لالٹین وغیرہ نہیں تھی۔ بس قریبی کمرے کے نیم وا دروازے سے مدھم روشنی یہاں پہنچ رہی تھی۔ اس دوسرے کمرے میں حامد شہنیل کے لحاف کے نیچے سو رہا تھا۔ اس کے ارد گرد کاپیاں بکھری ہوئی تھیں۔ فیروزاں بھی شاید آس پاس کے کسی کمرے میں سو رہی تھی۔ وہ میری کلائی تھامے، الٹے قدموں پیچھے ہٹتی گئیں اور پھر ایک منقش چوبی الماری سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئیں۔ یہ ایک ایسی دعوت تھی جس سے انکار کرنا یا جس کو قبول کرنے میں تاخیر کرنا میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔

میں نے ان کو بانہوں میں لے لیا۔ میرے ہونٹ مہینوں سے ان کے چہرے کو ترس رہے تھے۔ ان کے لباس کی سرسراہٹ، بدن کی خوشبو، چہرے کا نمک، کوکے کا لشکارا۔۔۔۔ یہ سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہو گیا اور ایک ایسی جان فزا کیفیت میں ڈھل گیا جس نے مجھے یکلخت ہواؤں میں اڑا دیا۔ میرے ہاتھ گستاخ ہونے لگے۔ میں نے ان کے کان میں سرگوشی کی۔ "کیوں اتنا پیار کرتا ہوں آپ سے کیوں کرتا ہوں؟"

اس ہانپی ہوئی سرگوشی کا جواب ہانپی ہوئی سانسوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ احاطے سے پار کوئی گھوڑا ہنہنایا۔ کسی اونگھتے ہوئے پہرے دار نے دو تین بار کھانسی کی اور ایک بار پھر گہری

خاموشی چھا گئی۔ "ناراض ہو گئے تھے؟" بیگم بلقیس نے میرے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

"آپ سے کیسے ناراض ہو سکتا ہوں۔" میں نے کہا اور ایک بار پھر ان میں گم ہونے لگا۔ ان کی پشت پر چوبی الماری ہل رہی تھی اور آہٹ پیدا کر رہی تھی۔ "اب بس کرو۔" انہوں نے کہا اور ایک ادا سے مجھے پیچھے ہٹا دیا۔

کسی قریبی کمرے سے فیروزاں کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ "نی تاجو۔۔۔۔ تھوڑا سا پانی پلا دے۔"

بیگم بلقیس نے کہا۔ "اچھا۔ اب تم جاؤ۔"

میں واپس مڑا مگر دو قدم چل کر پھر بیگم بلقیس کی طرف آ گیا۔ ایک عجیب سی جذبات انگیز شوخی نے مجھے پھر ان کے چہرے پر جھکا دیا۔ "او ہو اب جاؤ بھی۔" انہوں نے ہولے سے دھکیلا۔

"بمبو کاٹ پر بات کریں گی؟"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اچھا بابا کروں گی۔"

"کتنی دیر میں؟"

"ایک گھنٹے تک۔"

میں واپس آ گیا۔ میرے روئیں روئیں میں خوشی ناچ رہی تھی۔ ایک ایسی مستی جس میں ہر طرح کے اندیشے، خدشات غرق ہو کر رہ گئے تھے۔ مجھے اپنے آپ سے ان کی خوشبو آ رہی تھی۔ ان کے دل نواز چہرے کا نمک میرے ہونٹوں کے رستے میرے پورے جسم میں سرایت کر گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس دل نشیں ملاقات کے مناظر کو تصور میں بسا کر آنکھیں بند کر لوں اور سو جاؤں لیکن ابھی کچھ دیر میں ان کی کال آنا تھی۔

میں انٹر کام کے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ جونہی ان کی طرف سے بیل ہوئی، میں نے فوراً ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو!" بیگم بلقیس کی شیریں آواز کانوں میں گونجی۔

"ہیلو! اب تو آپ کے بغیر تھوڑی دیر گزارنا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔"

"اور اگر لمبی جدائی پڑ گئی تو۔۔۔۔"

"پھر جینا مشکل ہو جائے گا۔" وہ خاموش رہیں۔ میں نے پوچھا۔ "فیروزاں کو شک تو نہیں ہوا۔" انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ "اور تاجو آج کہاں گئی ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ آج ماں باپ سے ملنے گئی ہوئی تھی۔"

"گئی ہوئی تھی یا آپ نے بھیجا تھا؟" میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"جو بھی تم سمجھ لو۔" وہ شرمیلے انداز میں مسکراتے لہجے میں بولیں۔

"والی جی اب ٹھیک ہیں؟"

"ہاں۔۔۔۔اور ان کو ٹھیک رکھنا تمہاری ہی ذمے داری ہے۔"

"کیوں نہیں جی۔"

انہوں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "خاور! والی جی کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہ ہر معاملے میں تم پر بہت بھروسا کرنے لگے ہیں۔ تمہارے موجود ہونے سے ان کو بہت سہارا ملتا ہے۔ ان سے دور مت ہونا۔ تم۔۔۔۔تم ان کی ضرورت بن گئے ہو۔"

"نہیں بلقیس! آپ اس بارے میں بالکل بے فکر رہیں۔"

"کل تمہارے آنے سے انہیں بہت فائدہ ہوا۔ دو دن سے بالکل گم صم تھے لیکن تم سے باتیں کرتے رہے۔ دوائی سے ان کی طبیعت بھی بہتر ہوئی۔"

"آپ کے لیے اور ان کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔" میں نے کہا اور خلوص دل سے کہا۔

"موکھلوں کی طرف سے کوئی نئی شرارت تو نہیں ہوئی؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی تک تو معاملہ کنٹرول ہے۔ بس قانونی کاروائی ہو رہی ہے۔"

"اور وہ ثمینہ والا معاملہ؟ میرا مطلب ہے، اب تو نہیں مل رہی وہ موکھلوں کے بندے سے؟"

"نہیں۔ ابھی تک تو کوئی ایسی اطلاع نہیں ہے جی۔"

"وہ اس بات کا بھی دل پر بڑا اثر لے رہے ہیں۔ کچھ بھی ہے، یہ لوگ حویلی کے پرانے ملازم تھے۔۔۔۔بلکہ جدّی ملازم کہنا چاہیے۔"

"آپ بالکل بے فکر رہیں جی۔ میں نے اور نصراللہ نے سارے معاملے پر گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ہم تقریباً ایک گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ایک بار پھر ہار کا تذکرہ بھی ہوا۔ بیگم بلقیس بار بار کہہ رہی تھیں کہ میں نے اتنا مہنگا تحفہ کیوں خریدا؟ والی جی کو بیگم بلقیس کے سارے زیورات کا علم تھا۔اس لیے بیگم بلقیس نے یہ ہار ایک تکیے میں چھپا کر جستی پیٹی کے سامان میں سب سے نیچے رکھ دیا تھا۔

بات ختم ہونے کے بعد بھی میں دیر تک بیگم بلقیس کے بارے میں سوچتا رہا۔وہ ایک معما تھیں۔۔۔۔ان کے محسوسات کو سمجھنا میرے لیے ایک نہایت دشوار کام تھا۔کل میں نے ان سے ناراضگی کا اظہار کیا تھا اور افسردہ دلی سے خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید میں راجوال چھوڑ جاؤں لیکن آج صورت حال بالکل بدلی ہوئی تھی۔کسی وقت یوں لگتا تھا کہ وہ والی جی کی خاطر مجھ سے محبت کرتی ہیں۔۔۔۔یا پھر شاید مجھ سے محبت کرتے رہنے کے لیے انہوں نے ایک جواز ڈھونڈ لیا تھا۔انہوں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کیا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہی ہیں، بے شک غلط ہے لیکن اس میں ان کے محبوب شوہر کی بہتری شامل ہے۔۔۔۔ ان کو ایک مضبوط سہارا مل رہا ہے۔

ایک بار پھر وہی سوال ذہن میں ابھرتا تھا۔کیا ایک عورت دو مردوں سے پُرخلوص محبت کر سکتی ہے؟

میں بستر پر نیم دراز ہو کر سوچتا رہا۔انگیٹھی کی راکھ میں نیم سرخ انگارے چمکتے رہے۔ کبھی کبھی رات کے سناٹے میں حویلی کے پہرے دار کی آواز گونجتی رہی۔"جاگتے رہو بھئی۔" میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔۔۔۔میں اونگھنے لگا۔۔۔۔اس سے پہلے کہ میں سو جاتا، دروازے پر دستک ہوئی۔سردی میں گرم رضائی سے نکلنا بھی کام رکھتا ہے۔میں نے وہیں سے پوچھا۔

"کون ہے بھئی؟"

"میں نصر اللہ۔"دبی دبی آواز آئی۔آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

نصر اللہ اندر آ گیا۔اس کا چہرہ متغیر تھا۔میں نے لالٹین کی روشنی میں اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔"خیر تو ہے؟"

"خیر ہے۔۔۔۔۔ لیکن گڑ بڑ بھی ہے۔" اس نے اپنے اونی دستانوں والے ہاتھ انگیٹھی کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔ ہفتے اور منگل کی رات نصر اللہ تین گھنٹے کا گشت لگاتا تھا۔ آج بھی وہ گشت سے آیا تھا۔

"کیا گڑ بڑ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کڑی ثمینہ باز نہیں آ رہی۔ الو کی پٹھی آج پھر پاشے سے ملی ہے۔ میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

اطلاع واقعی کافی حیران کن تھی۔ "کہاں دیکھا ہے تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"شام پور سے باہر۔ نمبردار سعید کھوکھر کے پرانے کھوہ (کنوئیں) پر۔ میرے ساتھ نذیر اور ملتانی بھی گشت پر تھے۔ روہی کے پاس سے وہ دونوں "رکھ" کی طرف نکل گئے۔ میں نے شام پور کا چکر کاٹنا تھا۔ ابھی میں سعید کے ڈیرے کے پاس تھا کہ مجھے وہ نظر آ گیا۔۔۔۔۔"

"کون۔۔۔۔۔ پاشا؟"

نصر اللہ نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے تفصیل بتائی۔ جس جگہ کو سعید کا کھوہ کہا جاتا تھا، وہ بے آباد پڑی تھی۔ کھوہ کسی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ کھوہ کے ساتھ جو دو تین کچے کمرے تھے، وہ بھی ڈھے چکے تھے۔ شاید ایک ٹوٹے پھوٹے کمرے کی چھت سلامت تھی۔ نصر اللہ نے پاشا کو انہی کمروں سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ وہ جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ نصر اللہ نے خود کو جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے کر لیا۔ وہ اس کے پاس سے ہو کر نکلا۔ نصر اللہ وہیں کھڑا رہا۔ دو تین منٹ بعد اس نے ایک اور پرچھانواں دیکھا۔ یہ ثمینہ تھی۔ مدھم چاندنی میں وہ سکڑی سمٹی نکلی اور پھر کماد کے کھیتوں میں گھس کر شام پور کی طرف چلی گئی۔

"تم نے اچھی طرح دیکھا تھا۔۔۔۔۔ وہ ثمینہ ہی تھی؟"

"ایک سو ایک فیصد جی۔ اور پاشا بھی مجھ سے بس تین چار گز کے فاصلے سے گزرا ہے۔" نصر اللہ کی آواز میں اب بھی ہلکی سی لرزش موجود تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہ کوئی عام چکر نہیں ہے۔ کافی پکا اور گہرا معاملہ لگتا ہے۔"

"پتا نہیں، یہ کڑی کیسے پھنس گئی ہے اس ہدوش کے شکنجے میں۔اس کی عزت تو مشکل ہی بچی ہو گی۔مجھے تو ڈر ہے کہ اس کی جان بھی نہ چلی جائے۔۔۔۔۔یہ بہت غلط بندہ ہے۔"

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

صبح سویرے میں اور نصر اللہ گھوڑیوں پر سوار شام پور پہنچے۔ابھی اندھیرا پوری طرح چھٹا نہیں تھا۔ہر شے اوس میں بھیگی اور ٹھٹھری ہوئی تھی۔جوہڑوں کے اوپر برف کی پتلی تہہ جمی ہوئی تھی۔تازہ پانی کی کھالوں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھتا تھا۔

سعید کھوکھر کے مسمار شدہ کنوئیں پر ہو کا عالم طاری تھا۔کنوئیں کے پاس واقع دو کچے ڈھارے گر چکے تھے۔۔۔۔تاہم ایک کی چھت جزوی طور پر سلامت تھی۔یہاں پرالی کے چند گٹھے پڑے تھے اور کچے فرش پر خشک اُپلوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔میں نے ٹارچ جلا کر دیکھا،پرالی کے درمیان بیٹھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ بنائی گئی تھی۔جیسے گھونسلے ہوں۔یہاں مجھے بھنے ہوئے مرغ کی کچھ ہڈیاں پڑی نظر آئیں۔یقیناً یہ مرغ یہاں رات کو ہی کھایا گیا تھا۔سگریٹ کے کچھ ٹکڑے بھی کچے فرش پر پڑے تھے۔ہم نے پرالی کو اِدھر

اُدھر کیا تو قریباً دو فٹ کی گہرائی سے سگریٹوں کا ایک پیکٹ اور شراب کے دو سیل بند ادّھے دستیاب ہوئے۔یقیناً ان سارے لوازمات کا تعلق پاشے اور ثمینہ سے ہی تھا۔

"یہ دیکھو جی!" نصر اللہ نے کچے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

ذرا دھیان سے دیکھنے پر ایک زنانہ اور ایک مردانہ جوتے کے نشان صاف پہچانے جاتے تھے۔

"اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں پھر یہاں آئیں گے۔ان کو رنگے ہاتھوں پکڑا جا سکتا ہے۔" نصر اللہ نے کہا۔

میں خاموش رہا۔میرے کانوں میں بیگم بلقیس کے الفاظ گونج رہے تھے۔انہوں نے کہا تھا۔ ثمینہ اور اس کی ماں دلشاد حویلی کے جدی ملازموں میں سے ہیں اور ان کے لیے والی جی بہت فکر مند رہتے ہیں۔اس جوڑے کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا مطلب تو یہ ہوتا کہ ثمینہ کی بدنامی کے پوسٹر بھی دیواروں پر لگ جاتے۔

مذکورہ جگہ دیکھنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ میں اس واقعے کی اطلاع والی جی کو دے کر ان کی پریشانی میں ہرگز اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے نصراللہ کو بھی تاکید کر دی کہ وہ فی الحال یہ خبر صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھے۔

اگلے روز شام کے فوراً بعد میں حویلی سے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے اصطبل سے اپنی گھوڑی نکالی۔۔۔۔ کارندے اور محافظ وغیرہ اب مجھے ادب سے سلام کرتے تھے اور مجھے دیکھتے ہی میرے لئے راستہ چھوڑتے تھے۔ ظاہر ہے، اب میں سالار جی تھا۔ چاچے عسکری کی طرح مجھے بھی والی جی کی طرف سے ایک سرخ پگڑی دی گئی تھی۔ یہ پگڑی امتیاز اور اختیار کا نشان تھی۔ گئے وقتوں سے یہ خاص پگڑی جاگیر کے سالار محافظ کے لیے مخصوص تھی۔

بہرحال، فی الوقت یہ پگڑی میرے سر پر نہیں تھی۔ میں شلوار قمیض اور واسکٹ میں تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے میں نے حسبِ رواج ایک گرم لوئی میں منہ سر لپیٹ رکھا تھا۔ حویلی سے تھوڑی دور میں نے چودھری عزیز کو دیکھا۔ وہ ایک سجے سجائے تانگے پر حویلی کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے حسبِ عادت رعونت سے جواب دیا۔ اس کی رعونت کو نظرانداز کرتے ہوئے میں شام پور کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ویسے بیگم بلقیس

کے حوالے سے چودھری عزیز نے ابھی تک مجھ سے کسی طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ اب تک اس نے یہی ظاہر کیا تھا جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ مگر میں جانتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں خاص طرح کی ناپسندیدگی میرے لیے موجود ہے اور بڑھتی جا رہی ہے۔

وسیع و عریض کھیتوں کے درمیان شام پور، نیم روشن گھروں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ تھا۔ اس کے ارد گرد کتے شور مچاتے تھے اور اس کے اندر جانے والے راستے ٹھنڈ میں ٹھٹھرے ہوئے سانپوں کی طرح بے حرکت پڑے تھے۔ گاؤں کے عین وسط میں ہلکی دھند میں لپٹے ہوئے مسجد کے مینار نظر آ رہے تھے۔ چارے سے لدے ہوئے ایک سست رو گدھے کے قریب سے گھوڑی دوڑاتا ہوا میں گاؤں میں داخل ہو گیا۔ دلشاد کا گھر ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ میں ساری معلومات پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔ میں نے لکڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند سیکنڈ بعد اندر سے ایک محتاط آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"میں شاہ خاور ہوں۔ والی جی کی طرف سے آیا ہوں۔ ثمینہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

دروازے کی دوسری طرف چند سیکنڈ کے لیے ایک سہمی ہوئی سی خاموشی رہی۔ پھر وہی آواز دوبارہ ابھری۔ "کیا کام ہے آپ کو؟"

اس مرتبہ مجھے ذرا عزت سے پکارا گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ غائبانہ طور پر مجھے اور میری حیثیت کو جانتے ہیں۔ میں نے کہا۔ "میں یہاں کھڑے کھڑے کچھ نہیں کہہ سکتا، آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔" پھر میں نے ذرا توقف سے پوچھا۔ "آپ ثمینہ کی والدہ ہیں؟" توقع کے مطابق اس سوال کا جواب "ہاں" میں آیا۔ میں نے کہا۔

"اماں جی! پریشان ہونے کی کوئی لوڑ نہیں۔ آپ ماں بجا ہیں اور آپ کی بیٹیاں میری بہنوں کی طرح ہیں۔ آپ دروازہ کھولیں۔ میں بس آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

کچھ دیر تک اندر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ غالباً دروازے کی درزوں سے مجھے اچھی طرح دیکھا بھی گیا۔ پھر ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ وہ پچاس کے قریب دکھائی دیتی تھی۔ لباس اور چہرے سے غربت ٹپکتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک تمکنت تھی اور ایک طرح کا وقار تھا۔

میں نے سلام کیا۔ عورت مجھے برآمدے سے گزار کر ایک کمرے میں لے گئی۔ یہاں ایک پرانے جستی ٹرنک کے اوپر مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ وہی دیا جس میں روئی کی بتی اور سرسوں کا تیل ہوتا ہے اور جس کی لَو رات کے وقت دیہات کے کچے کمروں کو عجیب سی اسراریت

دیتی ہے۔ ایک طرف اوپر نیچے تین چار پائیاں رکھی تھیں۔ ان چارپائیوں پر کچھ رنگ برنگے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے مختصر برآمدے میں بھی ایسے چند چمکیلے لباس دیکھے تھے۔۔۔۔۔ مجھے بیگم بلقیس کی بات یاد آئی۔ چند روز پہلے بلقیس بیگم نے بتایا تھا کہ دلشاد کی دو بڑی بیٹیوں کے رشتے کی بات کہیں چل رہی تھی۔

دلشاد کی آنکھوں میں ڈرے ہوئے سے سوالات تھے۔ میں نے پہلے اپنی بے تکلف باتوں سے اسے نارمل کرنے کی کوشش کی اور جب وہ قدرے نارمل نظر آنے لگی تو میں اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ میں نے اس کی سب سے چھوٹی بیٹی ثمینہ کا ذکر چھیڑا اور بتایا کہ والی جی اس کی طرف سے پریشان ہیں۔

دلشاد کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آئے۔ اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "میری بچیوں کے لیے کسی کو پریشان ہونے کی کوئی لوڑ نہیں ہے۔"

"لیکن اماں جی! جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے بعد پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ بھی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ وہ بندہ نہ صرف غیر برادری کا ہے بلکہ دشمن پارٹی کا ہے۔ اس میں ہم سب کی عزت بے عزتی کا سوال ہے۔"

"عزت بے عزتی کی باتیں میں ارباب (والی جی) سے بہتر سمجھتی ہوں۔" دلشاد کے لہجے میں زہر پوشیدہ تھا۔ "اور جہاں تک ثمینہ کی بات کر رہے ہو، وہ بات اب پرانی ہو چکی ہے۔ ٹھیک ہے، میری دھی سے ایک غلطی ہوئی ہے لیکن غلطی کس سے نہیں ہوتی؟ کون غلطی نہیں کرتا۔ اس پنڈ میں اور کتنی غلطیاں ہو رہی ہیں۔ ان کی طرف کسی کی نظر کیوں نہیں جاتی؟ اور جہاں تک میری دھی کی بات ہے اب وہ سنبھل گئی ہے۔ میں نے سنبھال لیا ہے اسے۔ مہربانی کر کے اس کے بارے میں کوئی فکر مند نہ ہو۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اب ثمینہ کا موکھل پاشا سے کوئی رابطہ نہیں ہے؟"

"نہیں ہے۔" دلشاد نے غصے اور وثوق سے کہا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "اماں جی! میں یہاں کوئی تھانے دار بن کر نہیں آیا۔ حالانکہ میں ایسا کر بھی سکتا ہوں۔ میں صرف آپ کے ہمدرد کے طور پر یہاں موجود ہوں۔ مجھے کچھ باتوں کا پتا چلا ہے اور میں نے یہ باتیں ابھی تک والی جی کو بھی نہیں بتائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ثمینہ کو یہاں لائیں، میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

میرے لب و لہجے نے اماں دلشاد کو چونکا دیا۔ وہ کچھ دیر تذبذب میں رہی لیکن میرے اصرار پر اسے ثمینہ کو کمرے میں لانا پڑا۔ ثمینہ کو آج میں دوسری مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ پہلی مرتبہ تب دیکھا تھا جب وہ اصطبل کے تہ خانے میں تھی اور باہر نکلنے کے لیے رو پیٹ رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھنے پر اس کے چہرے سے بھی پہلے جو چیز نظر آتی تھی، وہ اس کی معصومیت تھی۔۔۔۔ اس کی نگاہیں نیچی تھیں اور وہ اپنے پاؤں کے ناخن سے کمرے کے کچے فرش کو مسلسل کھرچ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پر تازہ تازہ مہندی لگی تھی۔

میں نے اماں دلشاد سے کہا۔ "اماں جی! یہ میری چھوٹی بہن کی طرح ہے۔ آپ ذرا باہر چلی جائیں۔ میں اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اماں دلشاد نے باہر جانے سے انکار کیا مگر میں نے نرمی اور حکمت سے اسے قائل کر لیا۔ میں نے ثمینہ کو آڑے ہاتھ لیتے ہوئے پوچھا کہ وہ صاف صاف بتائے کہ چاہتی کیا ہے؟"

اس کے لہجے میں اور جسم میں لرزش نمودار ہو گئی۔ "میں نے کیا کیا ہے جی۔"

"تم وہ سب کچھ کر رہی ہو جس کو نہ کرنے کا تمہیں بار بار کہا گیا ہے اور جس سے باز آجانے کا تم نے رو رو کر وعدہ بھی کیا تھا۔ تم پھر اس بدمعاش سے مل رہی ہو اور ہم سب کو ذلیل و خوار کرانے پر تلی ہوئی ہو۔" میں نے دھیمے مگر پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں کسی سے نہیں مل رہی۔ میں نے تو باہر قدم بھی نہیں رکھا۔" وہ ہکلائی۔

"اور کل رات کو تمہاری روح سعید کے کھوہ پر پہنچی ہوئی تھی۔ اور وہاں پرالی کے ڈھیر میں تمہاری روح ہی اس غنڈے کے ساتھ گھس کر بیٹھی ہوئی تھی۔" میں نے واسکٹ کی جیب سے شراب کا سیل بند ادّھا نکالا اور سگریٹوں کا وہ بند پیکٹ بھی جو پرالی میں سے ملا تھا۔ وہ گنگ ہو گئی۔

میں نے کہا۔ "میرے بندوں نے تم دونوں کو وہاں ڈھارے سے نکلتے دیکھا ہے اور ڈھارے کے اندر تم دونوں کا کھرا اب بھی ویسے کا ویسے پڑا ہے۔ کہتی ہو تو وہاں پہنچ کر دکھا دیتا ہوں۔"

ثمینہ کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ اوڑھنی کے اندر اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپتے جا رہے تھے۔۔۔۔۔ وہ ایک دم سے رونے لگی۔ اس کے موٹے آنسو بارش کے قطروں کی طرح تواتر سے اس کے مہندی لگے ہاتھوں پر گرتے چلے گئے۔

میں نے اپنے لہجے کو ذرا نرم کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو ثمینہ جس طرح سے تم چل رہی ہو، تم پر بڑا سخت وقت آنے والا ہے۔ اگر اس وقت سے بچنا چاہتی ہو تو مجھے کھل کر بتا دو کہ تم چاہتی کیا ہو؟ میں وعدہ کرتا ہوں جو کچھ تم بتاؤ گی، میں اپنے تک رکھوں گا۔ والی جی تک کو بھی نہیں بتاؤں گا جس طرح ہو سکا، تمہاری مدد بھی کروں گا۔" وہ خاموش رہی اور سر جھکا کر سسکیاں بھرتی رہی۔

"میرے ہوتے تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے مزید تسلی دی۔ "میں اپنی زبان کے کہے پر کٹ مرنے والا بندہ ہوں۔" کچھ دیر تک اس کے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد میں نے کہا۔ "کیا وہ تم سے کسی طرح کی زبردستی کر رہا ہے؟ کسی طرح کا دباؤ ہے تم پر؟"

چند سیکنڈ تک ساکت رہنے کے بعد اس نے اوڑھنی کے نیچے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر کیا ہے۔۔۔۔۔ کیا تم اسے پسند کرتی ہو؟" وہ چپ رہی۔ میں نے دو بار مزید یہی سوال دہرایا۔ آخر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سسکنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا وہ بھی تمہیں پسند کرتا ہے۔ شادی کرنا چاہتا ہے تم سے؟" اس نے روتے روتے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا تم جانتی ہو کہ وہ دشمن پارٹی کا بندہ ہے اور اس کے بارے میں اور بھی بہت کچھ مشہور ہے۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "کچھ بھی ہے۔۔۔۔۔ میں اسے پسند کرتی ہوں۔ اس کا گھر بسانا چاہتی ہوں۔ لوگوں کا تو کام ہی باتیں کرنا ہے۔ وہ رائی کا پہاڑ بناتے ہیں۔۔۔۔۔"

میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سیدھی سادی لڑکی کس طرح پاشے جیسے شخص کے چکر میں گرفتار ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا، یکا یک کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور اماں دلشاد دندناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، اس نے ثمینہ کو بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور اس پر چلاتے ہوئے کئی زوردار دوہتڑ اس کے سر پر مارے۔ "حرامزادی، کتی۔۔۔۔۔ ڈائن۔۔۔۔۔ میرے کلیجے کو کچا کھانے

والی۔۔۔۔۔ تو پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہ گئی۔ تجھے زندہ کیوں نہ دفن کر دیا ہم نے؟" وہ بولتی چلی گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کمرے کے دروازے سے لگ کر اندر ہونے والی باتیں سنتی رہی ہے۔

میں نے ثمینہ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ اماں دلشاد بے انتہا طیش میں تھی۔ وہ ثمینہ کو مارتے ہوئے اس کے اوپر ہی گر گئی۔ اوپر نیچے رکھی ہوئی تینوں چارپائیاں بھی ڈھے گئیں۔ پڑچھتی پر بڑی ترتیب سے رکھی ہوئی چینی کی پیالیاں اور پلیٹیں گر کر ٹوٹ گئیں۔

میں نے ڈھال بن کر ثمینہ کو بچایا۔ ایک اور لڑکی دبی آواز میں چلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے اماں دلشاد کو تھام لیا۔ یقیناً یہ اس کی بیٹیوں میں سے ایک تھی۔ اماں دلشاد نے دل دوز آواز میں ثمینہ اور دیگر بیٹیوں کو کوسا۔ "یہ کیوں زندہ ہیں؟ مر جاتیں یہ حرامزادیاں۔ ان کے نصیب سڑے ہوئے تھے تو پھر یہ خود بھی سڑ گئی ہوتیں۔ مرنے والا مر گیا اور مجھے عذابوں میں ڈال گیا۔"

میں نے اماں دلشاد کو بہ مشکل سنبھالا۔ دوسری لڑکی، ثمینہ کو کلاوے میں لے کر باہر چلی گئی۔

اماں دلشاد کچھ دیر تک روتی رہی پھر بولی۔"اس مرن جوگی نے قسم کھائی تھی کہ اب اس منڈے سے نہیں ملے گی۔اگر ملے گی تو میرا مرا ہوا منہ دیکھے گی۔پر یہ پھر بھی اس کے پاس گئی ہے۔اس نے ہماری عزت نیلام کرنے پر کمر باندھی ہوئی ہے۔ایسی اولاد کے تو ٹوٹے کر دینے چاہئیں۔۔۔۔"

"بچی ہے اماں جی! آپ پریشان نہ ہوں۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔آپ بس ذرا اس کی نگرانی سخت کر دیں۔اسے بتائیں کہ اگراب والی جی نے اسے پکڑ لیا تو آسانی سے چھوڑیں گے نہیں۔ میں بھی سمجھاتا ہوں اسے۔اور واقعی یہ کام بہت خطرناک ہے۔"

"پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اسے؟ کسی نے تعویذ پلا دیے ہیں؟ یہ میری سب سے چنگی کڑی تھی، سب سے سمجھدار۔ بڑی بہنوں کو بھی سمجھاتی تھی۔سب کی ہمدرد، سب کی خیر خواہ۔۔۔۔ پر اب تو اسے اپنے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ایسی اس کتے کے چکر میں پڑی ہے کہ سب کچھ بھول گئی ہے۔حرامزادی یہ بھی نہیں دیکھ رہی کہ سو منتوں مرادوں کے بعد بڑی بہنوں کے ہتھ پیلے ہونے لگے ہیں۔اگر اس کے کرتوتوں سے ان کا کام بگڑ گیا تو کیا ہو گا۔وہ دونوں وچاریاں اس کی وجہ سے دن رات سہمی ہوئی ہیں۔۔۔۔"

میں قریباً مزید آدھ گھنٹا اماں دلشاد کے گھر رہا۔میں نے اماں دلشاد کی موجودگی میں ہی ایک بار پھر ثمینہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔اس کے رخساروں پر طمانچوں کے نشان تھے اور ایک باچھ سے تھوڑا تھوڑا خون بھی رس رہا تھا۔وہ بس اوڑھنی کی اوٹ میں مسلسل روتی ہی رہی۔ دوبارہ آنے کا کہہ کر میں رات آٹھ بجے کے قریب اماں دلشاد کے گھر سے نکلا۔باہر نکلنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر اپنا منہ سر، گرم چادر اور مفلر میں لپیٹ لیا۔میں نے اماں کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی کو میرے بارے میں نہ بتائے۔یہی کہہ دے کہ کوئی رشتے دار ملنے آیا تھا۔ دروازے سے باہر میری گھوڑی کھڑی تھی۔میں سوار ہو کر چل دیا۔گلی خالی تھی۔ایک دو کتے دیہاتی انداز میں پروٹوکول دینے کے لیے میرے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔گلی کے موڑ پر چادر میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی نما عورت تیزی سے میرے سامنے آئی اور ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے مجھے رکنے کا کہا۔

میں رک گیا۔"میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میں نے آواز سے پہچان لیا۔یہ وہی بڑی عمر کی لڑکی تھی جو کچھ دیر پہلے ثمینہ کو اماں دلشاد کی مار سے بچانے کے لیے کمرے میں آئی تھی۔"کون ہو تم؟"میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"میں ثمینہ کی سب سے بڑی بہن شاداں ہوں۔"

"ثمینہ کی سب سے بڑی بہن تو فوت ہو چکی ہے۔"

"ہاں، میں اس کے بعد سب سے بڑی ہوں۔ میں آپ کو ایک بہت ضروری بات بتانا چاہتی ہوں۔ کیا آپ کل ڈیگر (عصر) کے بعد میاں جی کے قبرستان میں آ سکتے ہیں؟"

"اگر تم کہتی ہو تو پہنچ جاؤں گا۔" میں نے الجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے، کل ڈیگر کے بعد میں وہیں ملوں گی؟" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور تیزی سے گھر کی طرف چلی گئی۔

جس کو وہ میاں جی کا قبرستان کہہ رہی تھی، یہ درختوں سے گھرا ہوا ایک چھوٹا سا قبرستان تھا اور گاؤں سے کوئی دو فرلانگ باہر تھا۔ جاگیر کا بڑا قبرستان ڈیڑھ دو میل آگے تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں راجوال کی طرف روانہ ہو گیا لیکن ذہن اماں دلشاد، ثمینہ اور شاداں میں ہی اٹکا رہا۔ شاداں غالباً میرے نکلنے سے پہلے ہی گھر سے باہر آ گئی تھی اور اس نے مجھے راستے میں روک لیا۔ یقیناً وہ کوئی ایسی خاص بات بتانا چاہتی تھی جس کا ذکر وہ ماں اور بہنوں کے سامنے نہیں کر سکتی تھی۔ میرے اندر تجسس گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اگلے روز میں مقررہ وقت سے تھوڑی دیر پہلے ہی میاں جی کے قبرستان کے قریب پہنچ گیا۔ میں ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے قبرستان پر نظر رکھی جا سکے۔ میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے یہاں رک کر کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ کوئی ایک دو راہ گیروں نے مجھے پہچانا بھی ہو مگر کسی نے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے مگر شاداں نامی وہ لڑکی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ قبرستان میں ایک درمیانی عمر کی عورت کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ کسی تازہ تازہ مرنے والے کی قبر پر فاتحہ خوانی کر رہی تھی۔ چند کوے ایک جنتر پر ستا رہے تھے۔ جنتر کے نیچے ایک بکری خودرو گھاس پر منہ مار رہی تھی۔ میں یونہی اِدھر اُدھر گھومتا رہا جیسے فاتحہ خوانی کے لیے کسی خاص قبر کی تلاش ہو۔

آہستہ آہستہ شام کا اندھیرا اقرب و جوار کو ڈھانپنے لگا۔ شاداں نہیں آئی۔ ایک بار دل چاہا کہ آج پھر اماں دلشاد کے گھر کا رخ کروں لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔۔۔۔اور واپس آ گیا۔ ذہن میں کئی طرح کی الجھنیں تھیں۔ کسی وقت لگتا تھا کہ ثمینہ اور پاشا والا معاملہ واقعی عشق اور محبت کا معاملہ ہے۔ کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور میں خود بھی اسی قول کا شکار تھا، لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ثمینہ کسی مجبوری کے گھیرے میں ہو۔

نصراللہ کو میں ساری صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا۔ اگلے روز نصراللہ نے ایک ایسے بندے کی ڈیوٹی قبرستان پر لگائی جو اماں دلشاد اور اس کی بیٹیوں کو پہچان سکتا تھا۔ غفور نامی اس بندے کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ عصر کے بعد میاں جی کے قبرستان پر نظر رکھے اور دیکھے کہ شاداں وہاں فاتحہ خوانی کے لیے آتی ہے یا نہیں۔۔۔۔ نصراللہ ہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ اماں دلشاد کی سب سے بڑی بیٹی آسیہ کی قبر اسی قبرستان میں ہے اور عین ممکن تھا کہ اس نے فاتحہ خوانی کے بہانے وہاں آنا ہو۔ غفور دو دن وہاں جاتا رہا مگر میری توقع کے عین مطابق شاداں وہاں نہیں آئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہو گئی ہے یا کسی وجہ سے اس نے مجھے کچھ بتانے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ اسی دوران میں عید کے دن آ گئے اور یہ معاملہ کچھ دنوں کے لیے پس منظر میں چلا گیا۔ بہر حال، اس بات کی مجھے تسلی تھی کہ ثمینہ جلد ہی پاشے سے نہیں ملے گی۔

دیہات میں عید کا اپنا ہی ایک انداز ہوتا ہے۔ گھروں کو لیپا پوتا جاتا ہے۔ دیواروں پر نقش و نگار بنائے جاتے ہیں۔ چوڑیاں اور سرخی پاؤڈر بیچنے والی عورتیں گلیوں کے چکر لگاتی ہیں اور

گھروں کے صحنوں میں دھڑا دھڑ سلائی مشینیں چلتی ہیں۔ حویلی کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ یہاں ایک بازار لگ گیا تھا اور عورتیں یہاں عید کی خریداری کرتی تھیں۔

ایک دن میرا یار تیمور میرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ہم بچپن کے لنگوٹیے تھے۔ ایک دوسرے کی کوئی بات ہم سے چھپی نہیں رہتی تھی۔ بیگم بلقیس والی بات بھی نہیں چھپی تھی۔ باتیں کرتے کرتے اچانک تیمور نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "لے بھائی خاورے! تیری ہیر آ گئی ہے اپنی سہیلیوں سمیت۔" میں نے کھڑکی سے جھانکا اور دھڑکنیں زیر و زبر ہو گئیں۔

بیگم بلقیس اپنی بہن فرزانہ اور کچھ دیگر عورتوں کے ساتھ خریداری کے لیے آئی تھیں۔ تاجو اور فیروزاں وغیرہ بھی ہمراہ تھیں۔ میں نے آہ بھری۔ "ہاں یار! واقعی ایسے نظر آ رہی ہیں جیسے سہیلیوں کے درمیان ہیر۔۔۔۔ یا پھر تاروں کے درمیان چاند!"

"لیکن یہ چاند یہاں لینے کیا آیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ یہ تو سستا سا بازار ہے۔" تیمور نے سرگوشی کی۔

"پر اب ان کے آنے سے تو سستا نہیں رہانا۔"

تیمور نے گہری سانس لی۔ "خاورے! تم تو شاعر ہوتے جا رہے ہو۔ پر سچی بات میں بار بار کہوں گا، مجھے اس سارے معاملے کا انجام کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ چودھری عزیز اور والی جی اندر ہی اندر غصہ جمع کر رہے ہیں۔ کسی دن دھماکا ہو جائے گا۔"

"اب تو جو کچھ بھی ہو۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی بیگم بلقیس کا فقرہ کانوں میں گونجنے لگا۔ "اب واپسی ناممکن ہے خاور!"

میں بہ دستور کھڑکی کے راستے عید بازار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج یہاں خاصا رش تھا۔ عورتیں، بچے، مرد سب موجود تھے۔ قریبی دیہات سے بھی عورتیں، چوڑیاں وغیرہ خریدنے کے لیے یہاں پہنچ جاتی تھیں۔ بیگم بلقیس کی چال ڈھال میں ایک عجیب سی باوقار کشش تھی۔ وہ کمر بالکل سیدھی رکھ کر چلتی تھیں اور اپنے قد سے زیادہ لمبی لگتی تھیں۔ وہ دیگر لڑکیوں کے ساتھ مخالف سمت جا رہی تھیں اور ایک لڑکی کی طرح ہی نظر آتی تھیں۔ حالانکہ حامد کی عمر اب نو سال سے کم نہیں تھی۔ میں انہیں دیکھتا رہا اور اتنے فاصلے سے بھی ان کی کمر کے لوچ اور قدموں کے آہنگ کو محسوس کرتا رہا۔

"کیا نظروں نظروں میں کھا جانے کا ارادہ ہے؟" تیمور نے فقرہ کسا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اس دیوانے دل کے ارادے تو مت ہی پوچھ۔ لگتا ہے کہ میں ساری عمر اس چکر سے نکل نہیں سکوں گا۔"

اور وہ جو تیری بے بے بیٹھی ہوئی ہے مراد پور میں۔ رات دن تیرے سر پر سہرا دیکھنے کے سفنے دیکھ رہی ہے۔"

"اس کا کوئی قصور نہیں۔۔۔۔۔اور نہ قصور میرا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

بیگم بلقیس دیگر عورتوں کے ہمراہ آگے نکل گئی تھیں۔ اب میں انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان کا تازہ تازہ تصور آنکھوں میں بسا کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ آج کل پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا تھا۔ ہر وقت نیم تاریک کمرے میں آخری ملاقات کے مناظر ذہن میں گھومتے رہتے تھے۔ اپنی گستاخیاں اور بیگم بلقیس کی نیم رضامندیاں ذہن میں آتی تھیں اور لہو میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگتی تھیں۔ دل گواہی دینے لگتا تھا کہ اگلی ملاقات میں ہم مزید آگے بڑھیں گے۔ بیگم بلقیس مجھے مزید قریب آنے کا موقع دیں گی۔ میں اپنی دلی کیفیت چھپا نہیں رہا ہوں۔ میری محبت میں جہاں لطیف ترین احساسات پوری شدت سے موجود تھے، وہاں جسمانی تقاضے بھی پوری طاقت سے پائے جاتے تھے۔

"اوئے! یہ کیا ہوا؟" تیمور کی آواز نے مجھے چونکایا۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کھڑکی سے باہر عید بازار میں ہلچل نظر آرہی تھی۔ عورتیں اور بچے ہراساں انداز میں بازار سے باہر نکل رہے تھے۔ پھر میں نے ایک ہانپتے ہوئے شخص کو دیکھا جو تیز تیز بول کر لوگوں کو کچھ بتا رہا تھا۔ ایک دم چلانے کی بہت سی آوازیں ابھریں اور خریدار بھرّامار کر بازار سے باہر بھاگے۔

میں اور تیمور بھی بری طرح چونکے۔ میں نے تکیے کے نیچے سے پستول نکالا۔ ہم دونوں بھاگتے ہوئے باہر آئے۔ عورتیں، مرد، بچے۔۔۔۔۔ گھروں کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ افراتفری میں ایک جلیبی فروش کی ریڑھی الٹ گئی۔ جلتا ہوا گیس سلنڈر لڑھک کر ایک دکان میں گھس گیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور آناً فاناً دکان نے آگ پکڑ لی۔

"کیا ہوا؟" میں نے ایک شخص کو زبردستی روکا اور جھنجھوڑ کر پوچھا۔

اس نے جو جواب دیا، وہ ہرگز میرے گمان میں نہیں تھا۔ وہ دہشت زدہ آواز میں بولا۔ "شیر آرہا ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ خود کو چھڑا کر دوڑا۔

میں نے اس ٹولی کو دیکھا جس میں بیگم بلقیس بھی موجود تھیں۔ یہ ٹولی بھی گرتی پڑتی گاؤں کی طرف بھاگی آرہی تھی۔ بیگم بلقیس پیچھے تھیں۔ بھگدڑ میں ایک تین چار سالہ بچہ نیچے گر گیا تھا اور چلا رہا تھا۔ بیگم بلقیس نے رک کر اسے اٹھایا اور وہ بھی بھاگتی ہوئی میری طرف آئیں۔ ان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے میرے قریب رک کر انہوں نے کہا۔

"دیکھو خاور۔۔۔۔۔ آگے جا کر دیکھو کیا ہو رہا ہے؟"

ہماری گھوڑیاں پاس ہی کھڑی تھیں۔ میں اور تیمور جست لگا کر سوار ہوئے۔ میں نے نصراللہ سے کہا۔ "بندے لے کر ہمارے پیچھے آؤ۔"

نصراللہ اصطبل کی طرف بھاگا اور ہم اس سمت میں دوڑے جدھر سے مرد و زن لپکے چلے آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو تین عارضی دکانوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ ہر طرف بچوں کے کھلونے اور چوڑیاں اور رنگ برنگے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔

قریب ہی موجود تین اور گھڑ سوار محافظ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے اور ہم برق رفتاری سے آگے بڑھے۔ گاؤں سے آگے کھیت تھے۔ کھیتوں میں بھی ہمیں درجنوں افراد نظر آئے جو اپنی کسیّاں اور دیگر اوزار اٹھائے گاؤں کی طرف بھاگے آرہے تھے۔

ہم نے ایک ایسے ہی حواس باختہ کاشت کار کو روک کر پوچھا۔اس نے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔"موکھلوں نے شیر کھلا چھوڑ دیا ہے۔اس نے دو بندوں کو مار دیا ہے اور اب پنڈ کی طرف آرہا ہے۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ یہ افریقا کا جنگل نہیں تھا، تحصیل ڈسکہ کا علاقہ تھا۔یہاں جیتے جاگتے لوگ رہتے تھے اور یہاں بھوکے شیر کو کھلا چھوڑنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔شاید کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔

ہم نے پھر گھوڑیاں دوڑائیں۔راستے میں فق چہروں والے افراد نے چلا چلا کر ہمیں بتایا کہ آگے شیر ہے۔۔۔۔اور لوگوں کو مار رہا ہے۔شام پور گاؤں سے ذرا پہلے جاگیر کی حد کے پاس ہی ہمیں کھیتوں میں بہت سے افراد ایک جگہ جمع نظر آئے۔یہ افراد دو ٹولیوں میں تھے اور دونوں ٹولیوں میں کوئی ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ تھا۔قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ دور والی ٹولی موکھلوں کی ہے اور مکئی کے کھیتوں میں پاس والی ٹولی ہمارے لوگوں کی ہے۔ایک ٹریکٹر ٹرالی پر دو زخمیوں کو گاؤں کی طرف بھیجا جارہا تھا۔یہ دونوں جاگیر کے کھیت مزدور تھے ان کے کپڑے لہولہان ہو رہے تھے۔بہر حال، دونوں ہوش میں تھے۔ایک تیسرے زخمی کی

موقعے پر ہی مرہم پٹی کی جارہی تھی۔اس کی دھوتی کو لنگوٹ کی طرح باندھ کر اس کی سانولی ٹانگیں ننگی کر دی گئی تھیں۔مجھے زخمی کی ایک ران کی پچھلی طرف پنجے کا گھاؤ صاف نظر آیا۔

میں نے سب سے پہلے اسی شخص سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔اس نے روتے ہوئے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ یہاں چار پانچ بندے اور تین عورتیں کھیت میں کام کر رہی تھیں۔اتنے میں اچانک دھاری دار شیر کھیت میں گھس آیا۔اس نے حملہ کر دیا۔کھیت مزدور روتے چلاتے بھاگے تو شیر نے ان کا پیچھا کیا۔ساتھ والی پیلی میں ایک اور بندے کو بھنبھوڑ دیا پھر کماد میں گھس گیا۔اتنے میں موکھل بھی دو گاڑیوں میں وہاں پہنچ گئے۔ایک لوڈر پر بڑا سا پنجرہ بھی رکھا ہوا تھا۔انہوں نے کھلے شیر کو گھیر گھار کر پھر پنجرے میں بند کر دیا۔۔۔۔اور گاڑی کو واپس لے گئے۔اس واقعے میں کل تین بندے زخمی ہوئے تھے۔ان میں سے ایک کو خشک روہی نالے میں گرنے سے چوٹیں آئی تھیں۔

بہر حال، کچھ بھی تھا، یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔موکھلوں نے منصوبے کے ساتھ جاگیر کے لوگوں میں خوف وہراس پھیلانے کی کوشش کی تھی اور پوری طرح کامیاب ہوئے تھے۔یہ بڑی سنگین شرارت تھی۔

میں نے موقعے پر موجود لوگوں سے پوچھا۔ "موکھل پاشا بھی ساتھ تھا؟"

"بالکل جی!" ایک ڈرے ہوئے گاڈی نے جواب دیا۔ "وہ اب بھی یہیں ہے۔ وہ دیکھیں، وہ سامنے ٹریکٹر کے پاس کھڑا ہے۔ نیلے کرتے والا!"

میں نے بہ غور دیکھا اور میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ شخص دشمن نمبر ایک بنتا جارہا تھا۔ اسی دوران نصراللہ قریباً تین درجن مسلح گھڑ سواروں کے ساتھ دھول اڑاتا موقعے پر پہنچ گیا۔ موکھلوں کی طرف بھی کافی بندے جمع تھے۔ میں نے تمام اندیشے بلائے طاق رکھتے ہوئے گھوڑی کو موکھلوں کی طرف ایڑ لگادی۔ مجھے آگے بڑھتے دیکھ کر میرے ساتھی بھی ایک جانباز دستے کی طرح میرے پیچھے آئے۔ پچھلے دو واقعات کی وجہ سے ان کے حوصلے بلند تھے۔ چند ہی سیکنڈ میں موکھل اور ہم آمنے سامنے تھے۔ میں جست لگا کر گھوڑی سے اترا اور بے خوفی سے سیدھا موکھل پاشا کی طرف بڑھا۔ دونوں طرف سے رائفلیں کھٹا کھٹ تیار ہو گئیں۔ میں نے بے دھڑک موکھل پاشا کا گریبان پکڑا اور جھنجھوڑ کر پوچھا۔

"کیا چاہتا ہے تو۔۔۔۔ کیا چاہتا ہے؟" میری للکار دور تک گونجی۔

موکھل پاشا کی گہری بھوری آنکھوں میں چند لمحے کے لیے حیرت نظر آئی پھر اس نے میرا گریبان پکڑ لیا اور دھاڑا۔ "اپنی اوقات میں رہ اوئے۔ نئیں تو ادھر لاشیں گریں گی۔"

"لاشوں سے کسی اور کو ڈرانا۔ تیرے جیسوں کو اپنے پیشاب میں بہاتا ہوں حرامزادے۔"

میں نے اسے طاقت سے جھنجھوڑا۔

دو ادھیڑ عمر افراد درمیان میں آئے اور مجھے پاشا سے دور ہٹانے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں کوئی آواز آئی۔ "پلس آگئی ہے۔"

ایس ایچ او رانا شبیر اور اس کا دستہ بڑی تیزی سے گھوڑے دوڑتا ہوا موقعے پر پہنچ گیا۔ بہت سے پولیس والے ہمارے اور موکھلوں کے درمیان کھڑے ہوگئے۔ یہ رانا شبیر کی دلیری ہی تھی۔ ورنہ فائر کھل جاتا تو سب سے پہلے پولیس والے ہی نشانہ بنتے۔ رانا شبیر نے دونوں طرف سے ہتھیار نیچے کرنے کا حکم دیا اور دونوں پارٹیوں کو موقعے سے تیس تیس قدم پیچھے ہٹا دیا۔ میں بھی موکھل پاشا کو خونی نظروں سے دیکھتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

اسی دوران میں چودھری عزیز بھی چند سواروں کے ساتھ موقعے پر پہنچ گیا۔ دونوں طرف سے بڑی عمر کے بندے آگے آئے اور زبانی جنگ شروع ہوئی۔ موکھلوں کا ایک شخص ایس

اینچ اوٗرانا شبیر سے مخاطب تھا اور کہہ رہا تھا۔ "یہ جھوٹ بکتے ہیں۔ یہ زنانے تو کتے کی مار نہیں سہہ سکتے، ان پر شیر چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو غلطی سے باہر نکل گیا تھا۔ ہم اس کے پیچھے آئے اور اسے پکڑ کر پنجرے میں بند کر لیا۔"

میں نے پکار کر کہا۔ "فکر نہ کرو۔ تم سے غلطی ہوئی ہے تو ہمارے نشانے بھی اتنے ٹھیک نہیں۔ ایسی ایسی غلط جگہوں پر گولیاں ماریں گے کہ مرنے کے بعد بھی شرماتے رہو گے۔"

موکھل پاشا نے زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ کوئی جوابی فقرہ کہا جو ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ سکا۔ تاہم فقرے کی حرارت ہوا میں تیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میں نے عید اپنے گاؤں میں بے بے جی اور عارفہ کے ساتھ منائی تھی۔ مگر جس طرح ہنگامی حالات میں چھٹیاں منسوخ ہو جاتی ہیں، اسی طرح والی جی نے مجھے بھی راجوال میں رہنے کا پابند کر دیا۔ میں عید کے روز بس ایک دو گھنٹے کے لیے بے بے جی اور عارفہ کے پاس رہ کر

واپس آ گیا۔ بے بے جی پوچھتی ہی رہ گئیں کہ کوٹھے کب شروع کرنے ہیں؟ میں نے بس گول مول جواب دے دیا۔

عید کے روز ہی میرے واپس آ جانے سے رونق علی بہت خوش تھا اس کی خوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں باداموں والی دوائی (یعنی مٹھائی) بھی لے کر آیا تھا۔ یہ مٹھائی تازہ تازہ بنی ہوئی زیادہ مزیدار ہوتی ہے۔ میرے بیٹھے بیٹھے وہ قریباً آدھ کلو کھا گیا۔ میں نے کہا۔ "رونق بھائی! آپ نے کہا تھا کہ آپ خوشی میں زیادہ کھاتے ہیں یا غم میں۔ اب یہ جو آدھ کلو بادام آپ نے فنا کیے ہیں، اس کی وجہ غم ہے یا خوشی؟"

وہ سنجیدگی سے بولا۔ "غم!"

"کیا مطلب؟"

اس نے ایک گہری سانس لی اور دیوار سے ٹیک لگا کر کہنے لگا۔ "یار! مجھے لگتا ہے کہ تمہارے اور چودھری عزیز کے تعلقات کچھ گڑبڑ ہوتے جا رہے ہیں۔"

"اب کیا ہوا ہے؟"

"بس وہی لڑائی والے واقعے کی بات شات کر رہے تھے۔انہیں اعتراض ہے کہ جب بازار میں بھگدڑ شگدڑ مچی تو وہ بھی موقعے پر ہی موجود تھے لیکن تم نے ان سے مشورہ نہیں کیا اور خود ہی نصراللہ سے کہہ دیا کہ بندے لے کر میرے پیچھے آجاؤ۔"

"رونق بھائی! وہ مشورے کا وقت کہاں تھا۔اس وقت تو لگ رہا تھا کہ پتا نہیں کیا طوفان آگیا ہے۔لوگ بہت ڈرے ہوئے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ شیر واقعی راجوال کی طرف آرہا ہے۔"

"پر وہ کہتے ہیں کہ اگر وہاں کھلم کھلا لڑائی شروع ہو جاتی تو اس کا ذمے دار کون ہوتا۔"

"اگر مجھے سالار بنایا گیا ہے تو میری بھی کوئی ذمے داری ہے۔اور میں آپ کو ایک بات بتاؤں رونق بھائی! چودھری عزیز بس مجھے یہاں سے نکالنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں۔میں ان کو پہلے ہی اچھا نہیں لگا۔"

چودھری عزیز کا رویہ واقعی خراب ہوتا جا رہا تھا۔میرا اندازہ تھا کہ چودھری عزیز کو اس بات کا بھی پتا چل گیا ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں، میں حویلی کے اندر آتا جاتا رہا ہوں۔پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے بھگدڑ کے موقعے پر بیگم بلقیس کو مجھ سے بات کرتے دیکھا ہو۔اس

صورتِ حال کی وجہ سے وہ اندر ہی اندر زہر گھول رہا تھا۔بہر حال، جب تک اس کا زہر اس کے اندر تھا مجھے پروا نہیں تھی۔اس کے علاوہ یہ بات میں بہ خوبی جان رہا تھا کہ اس حویلی میں چودھری عزیز کے اپنے ڈھکے چھپے مفادات بھی ہیں۔

عید آئی اور گزر گئی مگر۔۔۔۔کچھ روکھی پھیکی رہی۔لوگ دہشت اور خوف کے نرغے سے نکل نہیں سکے۔ایک رات پھر بمبو کاٹ پر بیگم بلقیس سے بات ہوئی۔

انہوں نے کہا۔"خاور! یقین نہیں آرہا کہ موکھل اس دشمنی میں اتنا آگے جا سکتے ہیں۔ایسی باتیں تو کہانیوں اور فلموں میں ہوتی ہیں۔انہوں نے ایک بھوکے درندے کو جیتے جاگتے لوگوں کی طرف چھوڑ دیا۔وہ تو شکر ہے کہ بچ بچا ہو گیا۔ورنہ کسی کی جان بھی جا سکتی تھی۔یقین کرو، بچے ابھی تک سہمے ہوئے ہیں۔حامد گھر سے ہی نہیں نکلتا۔"

"ہاں، سب پر اثر ہے لیکن ایک دو ہفتے میں ٹھیک ہو جائے گا۔آج کافی بندے کھیتوں پر بھی گئے ہیں۔ایس ایچ او صاحب بھی بڑا تعاون کر رہے ہیں۔جن چار پانچ کھیتوں میں واقعہ ہوا ہے، وہاں انہوں نے پولیس کے بندے بھی بٹھائے ہیں۔ہمارے اپنے بندے بھی وہاں دو دن سے گشت کر رہے ہیں۔"

"جو بندہ زیادہ زخمی ہوا تھا، اس کا کیا بنا؟"

"اب وہ ٹھیک ہے۔ اس کی طرف سے رپورٹ بھی درج کرائی گئی ہے۔ کل شہر سے ڈی ایس پی بھی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے وڈے موکھل کو بڑی سخت وارننگ دی ہے اور کہا ہے کہ آئندہ ایسا واقعہ ہوا تو جانور کو متعلقہ محکمے کے حوالے کر دیا جائے گا اور ذمے داروں کے خلاف سخت کاروائی ہو گی۔"

"تم نے اپنی آنکھوں سے شیر دیکھا تھا؟" بیگم بلقیس نے پوچھا۔

"نہیں، تب تک وہ اسے گاڑی میں ڈال کر واپس لے جا چکے تھے۔ پر ایسا شیر میں نے ڈیرہ غازی خان کے ایک وڈیرے کے پاس دیکھا تھا۔ اس کے پیلے پنڈے پر کالی دھاریاں ہوتی ہیں۔ اسے بنگالی ٹائیگر بھی کہتے ہیں۔۔۔۔ یہ بغیر دھاریوں والے شیر سے زیادہ پھرتیلا اور خون خوار ہوتا ہے۔"

"اچھا چھوڑو۔ خوامخواہ ڈرنے ڈرانے والی باتیں ہیں۔ اب کوئی اور بات کرو۔"

"اور بات تو پھر ایک ہی ہو سکتی ہے۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"وہ کیا؟"

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر شوخ ہو کر ہونٹوں سے چومنے کی آواز پیدا کی۔ اب وہ میرے اصرار پر کبھی کبھی میرے ہی انداز میں جواب بھی دیتی تھیں لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ "آپ نے جواب نہیں دیا۔"

"نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو پھر۔۔۔۔ وہ بتا دیں جو ٹھیک ہے؟"

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔" انہوں نے کہا اور دل نواز انداز میں ہنس دیں۔ ذرا دیر بعد کہنے لگیں۔ "کبھی کبھی لگتا ہے کہ ہم بالکل نوجوان لڑکے لڑکی کی طرح باتیں کر رہے ہیں۔"

"تو ہم کون سا بوڑھے ہیں۔"

"ایسے نوجوان بھی تو نہیں۔ میری عمر چھبیس سے اوپر ہے۔"

"لیکن آپ اپنی عمر سے پانچ چھ سال چھوٹی لگتی ہیں۔"

"والی جی ٹھیک کہتے ہیں تم ہر فن مولا ہو۔ شاعری بھی کر سکتے ہو۔ بندے کو باتوں باتوں میں گھما کر رکھ دیتے ہو۔ حامد اکثر تمہارے سنائے ہوئے لطیفے اور مزاقیہ باتیں مجھے اور والی جی کو سناتا رہتا ہے۔"

"والی جی اب کیسے ہیں؟"

"بس ٹھیک ہیں اور نہیں بھی۔ کسی وقت بہت خوش لگتے ہیں، کسی وقت گم صم ہو جاتے ہیں۔"

"کبھی میرے حوالے سے تو کوئی بات نہیں کہی؟"

بیگم بلقیس نے ذرا توقف کیا اور بولیں۔ "کھلم کھلا تو نہیں کی، پر اشاروں مجھے ایک دو دفعہ اونچ نیچ سمجھائی ہے۔ بتایا ہے کہ غلطی انسان سے ہوتی ہے لیکن غلطی سے سیکھ لینا ہی عقل مندی ہے۔ اور یہ بھی کہ اس طرح کی باتیں چھپی نہیں رہ سکتیں اور جھوٹ، جھوٹ ہی ہوتا ہے۔"

"والی جی کا رویہ سمجھ سے باہر ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ عام چودھریوں زمینداروں سے بہت وکھرے ہیں خاور! اور میں سمجھتی ہوں کہ ان کے اندر برداشت اور حوصلہ بھی بہت ہے۔ اور میرے خیال میں اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے جو ان کے رویے کو سخت نہیں ہونے دیتی۔ وہ تمہیں پسند کرتے ہیں۔ تمہاری ہمت اور دلیری سے ان کو بھی طاقت ملتی ہے۔"

"بلقیس! کیا وہ آپ سے محبت کرتے ہیں۔"

اس کا جواب بیگم بلقیس نے عجیب دیا۔ کہنے لگیں۔ "ان کا تو پتا نہیں مگر ان کی محبت میرے روئیں روئیں میں رچی ہوئی ہے۔"

وہ کسی وقت عجیب بات کہہ دیتی تھیں اور ایسی ہی باتیں ان کو میرے لیے معمابناتی تھیں۔ وہ آج کہہ رہی تھیں کہ والی جی کی محبت ان کے روئیں روئیں میں رچی ہوئی ہے اور چند دن پہلے وہ میرے ساتھ حویلی کے نیم تاریک کمرے میں تھیں اور ان کی پشت پر چوبی الماری تھی۔۔۔۔۔ جو میرے جذبات کی یورش میں ہولے ہولے ہلتی تھی۔۔۔۔۔ اور پھر مجھے وہ بات یاد آئی جو ایک دن بیگم بلقیس نے روانی میں کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا، یہ زمانہ مردوں

کی غلطیاں تو معاف کرتا ہے لیکن عورتوں کی نہیں۔ کیا اس بات میں یہ اشارہ تھا کہ والی جی سے بھی کوئی خاص غلطی ہوئی ہے؟

ہر دوسرے یا تیسرے دن بیگم بلقیس کے ساتھ میری نیم شب کی خمار آلود گفتگو ہوتی رہی۔ انٹرکام کا "ایکس ٹینشن" میں نے اتنی صفائی سے لگایا تھا کہ کسی کی نظر میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے اور تیمور کے سوا اس کا علم کسی کو نہیں تھا۔۔۔۔۔ ثمینہ اور اماں دلشاد والا معاملہ بھی ابھی تک وہیں رکا ہوا تھا۔ بنگالی ٹائیگر والے واقعے کے بعد سے ارد گرد کے دیہات میں دہشت موجود تھی۔ یقیناً اس دہشت کا اثر اماں دلشاد اور اس کی چاروں بیٹیوں پر بھی تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان ماں بیٹیوں سے کوئی بھی بات اگلوانے کے لیے یہ مناسب وقت نہیں ہے میں چند روز اور انتظار کرنا چاہتا تھا۔

اور پھر وہ یادگار دن آ گیا جس میں صبح سے شام تک بلقیس کی شیریں آواز مسلسل میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ چھوٹی عید سے قریباً تین ہفتے بعد کا ایک خوشگوار دن تھا۔ پورا گاؤں سونا سونا تھا۔ دراصل قریبی گاؤں مکھن وال کا سالانہ میلہ تھا۔ وہاں مویشیوں کی منڈی بھی لگی تھی۔ لوگ ذوق شوق سے شریک ہوتے تھے۔ آج گاؤں

راجوال کی بیشتر آبادی صبح سویرے ہی میلہ دیکھنے چلی گئی تھی۔ گھوڑوں پر، بیل گاڑیوں اور تانگوں پر۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ بائیسکلوں پر بھی لوگ گئے تھے۔ حویلی سے بھی ایک بھری ہوئی ٹرالی میلے کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ اس پر رنگ برنگ کپڑوں والی عورتیں اور بچے لدے تھے۔ ڈھولچی بھی بیٹھے تھے۔ ٹریکٹر ٹرالی پر زور شور سے پنجابی گانے بجائے جا رہے تھے۔ سن وے بلوری اکھ والیا۔ اساں دل تیرے نال لا لیا۔ اور پھر۔۔۔۔۔ سن ونجلی دی ٹھڑی تان وے۔۔۔۔۔ میں تاہو ہو گئی قربان وے۔

والی جی کی طرف سے مجھے ہدایت تھی کہ میں گاؤں میں ہی موجود رہوں۔ حویلی کے تیس چالیس گھڑسواروں کے لیے بھی یہی ہدایت تھی۔ موکھلوں کے ساتھ چپقلش کی وجہ سے ایسی احتیاط لازمی تھی۔ میں نے صبح سات بجے کے قریب والی جی کی لینڈ روور کو گاؤں سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس میں مجھے والی جی، چودھری عزیز اور حامد وغیر نظر آئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ بیگم بلقیس بھی ہوں گی مگر جب نو بجے کے قریب انہوں نے بمبوکاٹ پر اپنی موجودگی کا اشارہ دیا تو میں حیران رہ گیا۔

میں نے انہیں کال کی۔ "آپ گئی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"گئی ہوئی ہوں مگر تمہارے بمبو کاٹ کو اپنے ساتھ ہی میلے پر لے گئی ہوں۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"حیرت ہے، والی جی آپ کو چھوڑ گئے۔"

"دراصل صبح سے سر میں سخت درد تھا۔ تھوڑی دیر پہلے تمہارے سنیاسی صاحب کی دو پڑیاں ایک ساتھ کھائی ہیں۔ اب ٹھیک ہوں۔"

"واقعی ٹھیک ہیں یا دوائی لے کر آ جاؤں۔" میں نے انہیں چھیڑا۔

"نہیں نہیں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں چھوٹے سنیاسی جی۔" وہ میری بات سمجھ کر ہنسیں۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "یقین کریں بلقیس۔۔۔۔۔"

"نہیں کرتی۔" انہوں نے حسب عادت ادا سے کہا۔

"یقین کریں بلقیس۔۔۔۔۔ جو وقت آپ کے بغیر گزرتا ہے، عذاب ہوتا ہے۔ آپ کی آواز کانوں میں نہ پڑے تو کان بہرے ہونے لگتے ہیں۔ آپ نے کیا کر دیا ہے؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ ہوا ہے خود ہی ہوا ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"جب آپ سے بات نہیں ہوتی، دل میں بہت سے وسوسے جاگتے ہیں۔ کہیں یہ نہ ہو گیا ہو، کہیں یہ نہ ہو گیا ہو۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" انہوں نے کہا۔ "ویسے بھی عورت کو تو مرد سے کہیں زیادہ سوچیں ہوتی ہیں اور کہیں زیادہ وسوسے۔"

"کسی وقت ڈر لگتا ہے۔ کہیں آپ سے دور نہ ہو جاؤں۔۔۔۔۔ یقین کریں کہ۔۔۔۔۔"

"نہیں کرتی۔" انہوں نے کہا اور ہم دونوں ہنس دیے۔

وہ بڑی خوبصورتی سے سنجیدہ گفتگو کو ہلکی پھلکی گفتگو کی طرف موڑ دیتی تھیں۔ حویلی کے زنان خانے میں نوکرانیوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس دن ہم نے بڑے سکون سے دل کھول کر گفتگو کی۔ میرے پُر زور اصرار پر کافی عرصے بعد انہوں نے مجھے ہیر وارث شاہ بھی سنائی۔ ہم نے ہر موضوع پر جی بھر کر باتیں کیں۔ ہنستے بھی رہے۔ کبھی کبھی تھوڑے سنجیدہ بھی ہوتے رہے۔ رمزیہ گفتگو، نرم گرم سرگوشیاں سب کچھ ہوا۔ انٹر کام پر ہی ہم نے دوپہر کا کھانا بھی کھایا۔ حویلی کے ملازمین اور مہمانوں وغیرہ کے لیے ہر روز دو دیگیں پکتی تھیں۔

آج بریانی پکی ہوئی تھی۔ میں اپنی پلیٹ کمرے میں اٹھالایا۔ بیگم بلقیس کے پاس آلو انڈے کا سالن اور تندوری روٹی تھی۔ ساتھ میں مکئی کی میٹھی روٹی جو ملائی میں پکاتے ہیں۔

"میرے ہاتھ سے لقمہ لیں گی؟" میں نے بمبوکاٹ پر پوچھا۔

"دے دو۔"

"منہ کھولیں۔"

"لو، کھول دیا۔"

"یہ لیں۔" میں نے خیالی لقمہ ان کے منہ میں رکھا اور پوچھا۔ "سوادی ہے؟"

"تمہارے ہاتھ کا ہو گا تو سوادی کیوں نہ ہو گا۔"

"لیں، اب مجھے کھلائیں۔" میں نے کہا۔

وہ بھی موڈ میں تھیں۔ انہوں نے میرے والا عمل دہرایا۔ میں نے کہا۔ "آپ کو درد نہیں ہوا؟"

"کیوں؟"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"بھئی! میں نے آپ کی انگلیوں پر کاٹا ہے۔"

"کچھ درد اتنے مزیدار ہوتے ہیں کہ۔۔۔۔درد ہوتا ہی نہیں۔" وہ ہنسیں۔ انداز میں خوبصورت سادگی تھی۔

میں نے کہا۔ "مرچیں کچھ زیادہ تھیں۔ منہ جل گیا ہے۔ کوئی میٹھی چیز ہے آپ کے پاس؟"

"مکئی کی روٹی ہے۔"

"چھوڑیں جی۔ مکئی کی روٹی بھی کوئی منہ میٹھا کرنے والی چیز ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ اور ہونٹ ماؤتھ پیس کے ساتھ لگا کر آواز پیدا کی۔ وہ ذرا شرمیلے انداز میں ہنسنے لگیں۔۔۔۔

"کیا بات ہے۔ آپ بس ہنس دیتی ہیں۔۔۔۔پیار کا جواب پیار سے نہیں دیتیں؟ چلیں، جواب دیں۔" وہ کچھ دیر "نہ نہ" کرتی رہیں لیکن آخر انہوں نے بھی ماؤتھ پیس سے ہونٹ لگا کر چومنے کی آواز پیدا کی۔۔۔۔اور اپنی جانی پہچانی ادا کے ساتھ کہا۔ "بس؟"

میں نہیں جانتا تھا کہ طویل جدائی سے پہلے یہ ایک طرح سے ان کا الوداعی بوسہ ہے۔ شام تک ہم ہنستے کھیلتے رہے۔ پھر تین دن بعد بات کرنے کا کہہ کر ہم نے بمبوکاٹ بند کر دیا۔

تین دن گزر گئے۔۔۔۔ پانچ چھ دن بھی گزر گئے مگر بیگم بلقیس کی طرف سے رابطہ نہیں ہوا۔ حامد یا تاجو وغیرہ کی شکل بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ فضا میں گھٹن سی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ اکتوبر کی چوبیس تاریخ تھی۔۔۔۔ والد کی وفات کی وجہ سے یہ تاریخ مجھے یاد رہتی تھی۔ اکتوبر کے آخری دنوں میں دیہاتی علاقے پوری طرح سردی کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ درختوں سے زرد پتے گرتے تھے اور گہرے نیلے آسمان کے نیچے کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر اداسی گشت کرتی تھی۔ رات کے وقت میں اور والی جی جیپ پر سوار ہو کر مچھلی فارم کا چکر لگا کر آئے۔ راستے میں وہ مجھے مقدمے کی صورتِ حال سے آگاہ کرتے رہے۔ وہ بعض اوقات مجھ سے ایسی باتیں بھی کر جاتے تھے جو شاید چودھری عزیز سے بھی نہ کرتے ہوں۔ میں بھی حسبِ حال ان کو اپنی رائے دیتا تھا۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ بیگم بلقیس کی کال آئی تو میں کھل اٹھا۔ ہمارے درمیان چند رسمی باتیں ہوئیں۔ ان باتوں کے دوران میں ہی میں نے محسوس کر لیا کہ بیگم بلقیس

کی "ٹون" کچھ بدلی ہوئی ہے۔ کوئی بہت گھمبیر بات کہنے سے پہلے بندے کے لہجے میں بوجھل پن آجاتا ہے۔ وہ بیگم بلقیس کے لہجے میں بھی تھا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اصل موضوع پر آگئیں۔

"خاور! آج تم سے ایک وعدہ لینا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔"

میرے سینے میں لہر دوڑ گئی۔ "آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"خاور! آگے چل کر حالات جو بھی ہوں مگر تم والی جی کو تنہا نہیں چھوڑو گے۔ ان کے ساتھ تمہارا تعلق اسی طرح قائم رہے گا۔"

"آپ کہیں جا رہی ہیں؟" میں نے نہایت دل گرفتہ لہجے میں پوچھا۔

"جا تو نہیں رہی۔۔۔۔ لیکن خاور! جیسے پہلے بھی ہمارے درمیان کئی دفعہ بات ہوئی ہے۔۔۔۔ ہمیں اب سنبھلنا پڑے گا۔۔۔۔ اگر نہیں سنبھلیں گے تو بہت کچھ برباد ہو جائے گا۔ اور اب مجھ میں اور دکھ سہنے کی ہمت نہیں۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ بلقیس بیگم کی گفتگو میں پچھلے کئی دنوں سے موجودہ صورتِ حال کا تھوڑا تھوڑا رنگ موجود تھا۔ وہ جیسے مجھے اس صورتِ حال کے لئے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھیں اور اب سب کچھ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں ہمارے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ بڑی دکھ آمیز اور بوجھل تھی۔ بیگم بلقیس کا لہجہ بار بار بھیگ رہا تھا۔ میری آواز بھی بار بار بھرا جاتی تھی۔ وہ مجھ سے قربانی مانگ رہی تھی اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا رہی تھی کہ میں والی جی سے اپنے تعلقات پوری طرح بحال رکھوں۔ ان کے ساتھ اپنی محبت میں کسی طرح کی کمی نہیں آنے دوں گا۔۔۔۔ وہ محسوس کر رہی تھیں کہ والی جی سازشوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ چودھری عزیز کا نام لئے بغیر انہوں نے اس کی طرف سے بھی اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔

میں نے کہا۔ "میری طاقت تو آپ ہیں بلقیس! آپ کے بغیر میں کچھ نہیں ہوں۔"

"یہ طاقت اب بھی تمہارے ساتھ ہے خاور! ہم ایک دوسرے کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے اور۔۔۔۔ یہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ محبت میں سب کچھ ہی حاصل کر لیا جائے۔ ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی تو۔۔۔۔ محبت۔۔۔۔ ہو سکتی ہے۔"

مجھے کئی دنوں سے احساس ہو رہا تھا کہ حویلی کے اندر کچھ ہو رہا ہے۔ آج وہ احساس درست ثابت ہوا تھا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ فیصلہ کر چکی ہیں۔ ان کو قائل کر کے ناکامی اور مایوسی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں تھا۔ اس موقع پر باوقار خاموشی زیادہ مناسب تھی۔ ہماری گفتگو بوجھل انداز میں شروع ہوئی تھی اور نہایت دکھی انداز میں ختم ہوئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ شاید وہ ایک بار پھر فون کریں گی لیکن انہوں نے نہیں کیا۔ جسم اور روح کو کچل دینے والا اور برداشت کو ریزہ ریزہ کر دینے والا ہجر کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اس کی طوالت کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا اور نہ ہی شدت کا۔۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نئی نئی جدائی تھی، کچھ زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی اور دل کے کسی گوشے میں یہ روشن امید تھی کہ بیگم بلقیس سخت دل نہیں ہو سکتیں۔ وہ جلد ہی اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں گی۔ اور ٹھٹھری ہوئی راتوں میں، آج کل خاموش رہنے والا بمبوکاٹ پھر سے جاگ جائے گا۔

میرے کان رات کو اس اکلوتی بیل پر لگے رہتے جو بیگم بلقیس کی طرف سے رابطہ کرنے کا اشارہ ہوتی تھی۔

ایک ایسی ہی اداس شام کا ذکر ہے۔ سورج ڈوبتے ہی ہلکی دُھند پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ رونق علی کب سے گپ شپ کرنے اور بیمار منشی منظور کی بوڑھی ٹانگیں دبانے کے بعد اپنے کمرے میں آیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"سالار جی! ایک عورت ملنے آئی ہے جی آپ سے۔۔۔۔" گلاب دین کے بیٹے گلزار نے مؤدب لہجے میں کہا۔

"کون ہے؟ چلو لے آؤ۔" میں نے کہا۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور ایک عورت نما لڑکی اندر آگئی۔ اس نے اپنا منہ سر اچھی طرح چادر میں لپیٹ رکھا تھا صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ تھوڑی سی کوشش سے میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ اماں دلشاد کی بڑی بیٹی شاداں تھی اس کا سارا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لئے موڑھا دیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی پھر دل دوز آواز میں بولی۔ "خاور صاحب! ثمینہ کی مدد کریں جی۔ وہ بڑی

مشکل میں ہے۔ اس مرن جوگے پاشے نے اسے بری طرح پھنسایا ہوا ہے۔ اس نے میری بہن کو کہیں کا نہیں چھوڑنا۔۔۔۔" پھر ایک دم سے اس نے رونا شروع کر دیا۔

اس کے رونے کی آواز بلند ہوتی گئی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔ "دیکھو شاداں! میں تو کئی دن سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم نے مجھے میاں جی کے قبرستان میں بلایا تھا۔۔۔۔ اور پھر بلا کر بھول گئیں۔ میں دو تین دن تک تمہیں وہاں دیکھتا رہا۔"

"میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں جی۔ میں نے آنا تھا پر میرا حوصلہ نہیں پڑا۔ وہ شیر کو کھلا چھوڑنے والا واقعہ بھی ہو گیا۔ اس کے بعد میں اور ڈر گئی۔ اب بھی میں بڑی مشکل سے آئی ہوں سالار صاحب! یہاں میری ایک سہیلی صغراں ہے۔ کپڑے وغیرہ سیتی ہے۔ میری شادی کے کپڑے وہی سی رہی ہے۔ میں رات اس کے پاس رہ کر سویرے واپس جاؤں گی۔ بس اپنے کپڑے دیکھنے کے بہانے ہی میں آئی ہوں۔"

"سہیلی کو پتا ہے کہ تم میری طرف آئی ہو؟"

"آہو جی۔ وہ میری بڑی گوڑی سہیلی ہے۔ کسی کو بتائے گی نہیں۔ لیکن میں زیادہ دیر آپ کے پاس نہیں رک سکتی۔

بس جلدی جلدی آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ تم نے جو کہنا ہے، بے فکر ہو کر کہو۔ تم جو بتاؤ گی وہ صرف اور صرف مجھ تک رہے گا۔"

شاداں نے ڈری نظروں سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ظاہر ہے کہ میں کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگا سکتا تھا۔ میں نے اسے بس بھیڑ دیا تھا۔ دونوں تختوں کے درمیان تھوڑی سی درز تھی جس سے کسی وقت ٹھنڈی ہوا کا جھونکا سا اندر آ جاتا تھا اور کمرے کی حرارت میں گم ہو جاتا تھا۔

وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ "میں نے آپ کے بارے میں بہت سنا ہے جی۔ آپ نے موکھلوں سے ٹکر لی ہے اور انہیں سبق سکھایا ہے۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ آپ نے مچھلی فارم پر اکیلے ہی موکھلوں کے چھ سات بندوں کو مار بھگایا تھا۔ میں منہ پر آپ کی تعریف کرنا نہیں چاہتی لیکن سچ یہی ہے کہ یہاں جاگیر میں سب آپ کو بہت عزت دیتے ہیں۔ سب لوگوں نے آپ سے بہت امیدیں لگا لی ہیں سالار صاحب! اور ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ آپ ہمیں۔۔۔۔۔ اس بہت برے چکر سے نکال

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سکتے ہیں۔۔۔۔۔ جس میں ہم پھنسے ہوئے ہیں۔" آخری الفاظ کہتے کہتے وہ ایک بار پھر زار و قطار رونے لگی۔

میں نے کہا۔ "تم خود ہی کہتی ہو کہ تمہارے پاس وقت تھوڑا ہے اگر یہ وقت روتے ہوئے گزار دو گی تو بات کب کرو گی؟"

کچھ دیر ہچکیاں لینے کے بعد اس نے خود کو سنبھال لیا اور پست سے لہجے میں بولی۔ "سالار صاحب! میری چھوٹی بہن ثمینہ کا کوئی قصور نہیں۔۔۔۔۔ وہ تو چنگی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔۔۔۔۔ اصل قصوروار۔۔۔۔۔ اصل قصوروار میں ہوں۔ میں ہی نصیباں سڑی ہوں جس کی وجہ سے ثمینہ برباد ہو رہی ہے، ہم سب برباد ہو رہے ہیں۔ سالار صاحب! کسی طرح میری بہن کو بچا لیں۔ وہ بے موت ماری جا رہی ہے۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ میرے اوپر قربان ہو رہی ہے، مجھ کو اور مجھ سے چھوٹی بہن کو سہاگن دیکھنے کے لئے وہ اپنی زندگی اجاڑ رہی ہے۔ لیکن اس کی عزت اور زندگی کے بدلے میں نے لال جوڑا نہیں پہننا ہے۔ اگر زندگی ہی اجڑنی ہے تو پھر میری اجڑے۔ وہ بے گناہ کیوں ماری جائے۔ بس میں نے سوچ لیا ہے، میں نے ایسا نہیں ہونے دینا۔" وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

"تم کس ناطے سے خود کو قصوروار کہہ رہی ہو؟"

"میں ہر لحاظ سے قصوروار ہوں جی۔۔۔۔۔ یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے۔ یہ میں نصیباں سڑی تھی جو سب سے پہلے اس جانور پاشے سے ملی تھی اور پھر اس کے جال میں پھنسی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ پتا نہیں تھا، یہ پاشا کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ یہ مجھے کھیتوں میں خرگوش پکڑتے ہوئے ملا تھا۔ ساتھ میں اس کا کتا بھی تھا۔ اس نے مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کیں۔ بس اس دن سے ہی بد قسمتی شروع ہو گئی۔۔۔۔۔"

"تم کہنا چاہتی ہو کہ تم نے پاشے سے ملنا شروع کر دیا؟"

شاداں نے نقاب کو ذرا ڈھیلا کر کے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "آپ کو پتا ہے جی کہ لڑکیوں کے رشتے ملنے کتنے مشکل ہوتے ہیں اور پھر جب لڑکی غریب اور عام صورت کی ہو تو ماں باپ کا بوجھ اور بڑھ جاتا ہے۔ ہماری بڑی بہن بھی شادی سے پہلے ہی مر گئی تھی۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی۔ میرے ساتھ بھی وہی کچھ ہو رہا تھا اور مجھ کو اپنے سے زیادہ فکر اپنی چھوٹی بہنوں کی تھی۔ میں ہی بن بیاہی رہتی تو چھوٹیوں کی باری کہاں آنا تھی۔ اپنی طرف سے میں ہوشیار بنی۔ سوچا کہ اپنی بڈھی ماں کا

بوجھ ہلکا کروں۔ اگر منڈا چنگا ہے اور مجھ کو دو وقت کی روٹی دے سکتا ہے تو اس کو اپنے ہاتھ میں کروں۔ ان دنوں مجھے اس کتے کی خصلت کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ دن رات ایک ہی بات کہتا تھا، میں تجھ سے ویاہ کرنا چاہتا ہوں۔ تجھ کو رانی بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ ہم قسمت کی ماری لڑکیوں کی یہی کمزوری ہوتی ہے۔ ایک چھت اور عزت کی روٹی کے لئے ترلے لیتی رہتی ہیں۔ کوئی بھی ہو، کیسا بھی ہو، بے شک بعد میں کتے جیسا سلوک کرے۔ پر چار بندوں کے ساتھ ویاہ کر لے جائے۔۔۔۔۔"

وہ بول رہی تھی اور اس کی چادر آنسوؤں سے تر ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے ناک میں آنے والے پانی کو چادر سے صاف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "پاشا مجھ کو سبز باغ دکھاتا رہا اور میں دیکھتی رہی جی۔ پھر مجھے پتا چلا کہ وہ تو موکھلوں کا رشتے دار ہے اور حویلی میں رہتا ہے۔ اس کی بڑی شان ہے اور اس کی کئی باتیں مشہور ہیں۔ بہتر تھا کہ میں اس وقت ہی سنبھل جاتی۔ سمجھ جاتی کہ موکھلوں کی حویلی میں رہنے والا اور لاکھوں میں کھیلنے والا پاشا مجھ جیسی عام شکل کی لڑکی کو کہاں ویاہ کر لے جائے گا۔ اور میں لڑکی بھی کہاں تھی۔۔۔۔۔ چھبیس ستائیس سال کی لڑکی کہاں ہوتی ہے۔ پر میں خود کو دھوکا دیتی رہی

۔پاشے کے ہر جھوٹ کو آخری جھوٹ سمجھ کر سہتی رہی۔۔۔۔۔اور پھر ایک۔۔۔۔۔ایک دن۔۔۔۔۔سالار صاحب ایک دن وہی ہوا جو مجھ جیسی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔"

شاداں نے بہت ہمت کر کے بات مکمل کی اور چہرہ چادر میں چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس بار میں نے اسے رونے دیا۔

ایک دومنٹ میں اس کے دل کا غبار کچھ کم ہوا تو اس نے تر بتر چہرے کے ساتھ میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور بولی۔"پتا نہیں کیوں۔۔۔۔۔پتا نہیں کیوں۔۔۔۔۔میں آپ کو سب کچھ بتاتی جا رہی ہوں۔اب میری اور میری بہنوں کی رہی سہی عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔اگر یہ باتیں پھیل گئیں تو ہم چاروں بہنوں کے پاس موت کو گلے لگانے کے سوا کوئی رستہ نہیں رہے گا۔ہم چاروں کی قبریں بن جائیں گی سالار جی۔۔۔۔۔"

میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ اگر اس نے مجھ پر اتنا بڑا بھروسہ کیا ہے تو اب اتنا ہی بڑا دل بھی رکھے۔یہ سمجھے کہ جو کچھ مجھے بتا رہی ہے۔اپنے کسی بھائی یا باپ کو بتا رہی ہے۔

میرے اظہار ہمدردی نے اسے اور بھی بلکنے پر مجبور کر دیا۔اس نے آگے کو جھک کر دونوں کہنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹکائیں اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔انگیٹھی کی سرخ روشنی اس کے

بائیں ہاتھ کی سستی سی چاندی کی انگوٹھی پر پڑ رہی تھی۔شاید یہ اس منگنی وغیرہ کی انگوٹھی تھی۔وہ دل دوز آواز میں بولی۔"میرے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے سالار صاحب! بڑی زیادتی ہوئی ہے۔پاشے نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔۔۔۔۔اس نے میری تصویریں بھی اتاری تھیں۔وہ تصویریں اس کے پاس ہیں۔اب بھی اس کے پاس ہیں۔وہ ان تصویروں کی دھمکیاں دیتا ہے۔مجھے ہر جگہ نشر کرنے کا کہتا ہے۔اس نے ہمیں ایسے جال میں جکڑا ہوا ہے کہ کبھی کبھی لگتا ہے مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔"

"تم نے خود دیکھی ہیں وہ تصویریں؟"

شاداں کا چہرہ چادر کی اوٹ میں تھا۔اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ان تصویروں کی وجہ سے ہی اب ثمینہ موکھل پاشا کے پاس پھنسی ہوئی ہے؟"

"بالکل ایسا ہی ہے جی۔"اس کی آواز گلے سے نکل نہیں پا رہی تھی۔وہ ہمت کر کے بمشکل بولی۔"اس کتے نے ہم بہنوں کو بہت رولا ہے جی۔سمجھیں کہ ہمیں کئی بار مارا ہے اور زندہ کیا ہے۔ان تصویروں کے زور پر اس نے۔۔۔۔۔مجھ سے۔۔۔۔۔ہر بات منوائی۔۔۔۔۔

پھر ایک دن کہنے لگا کہ اب وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا۔اب میں آزاد رہ سکتی ہوں۔اور مجھے تصویروں کے بارے میں بھی فکر مند ہونے کی کوئی لوڑ نہیں۔۔۔۔۔کیونکہ وہ سب اس نے پھاڑ کر جلادی ہیں۔۔۔۔۔اور یہ سب کچھ اس نے اس لئے کیا ہے کہ وہ مجھ سے واقعی محبت کرتا ہے بس مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکا۔اس نے مجھے ہر تسلی دی اور پھر۔۔۔۔۔واقعی کوئی ایک سال تک اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔مجھے تسلی ہو گئی۔مجھے یہ بھی یقین ہونے لگا شاید اس نے سچ مچ تصویریں جلادی ہیں۔دوبارہ مالمہ تب خراب ہوا جب میری اور مجھ سے چھوٹی زرینہ کی شادی کی بات شروع ہوئی۔میری بڑھی ماں نے نجل خراب ہو ہو کر اور لوگوں کے دروازے کھڑکا کھڑکا کر اور دعائیں مانگ مانگ کر پتا نہیں کس طرح ہم دونوں بہنوں کے لئے ور ڈھونڈا۔یہ دو بھرا ہیں۔لوہارا کام کرتے ہیں اور پسرور کی طرف کے ایک پنڈ میں رہتے ہیں۔"

ہوا کی وجہ سے کمرے کا دروازہ ذرا مزید کھل گیا اور شاداں سہم کر چپ ہو گئی۔میں نے اٹھ کر دروازہ پھر بند کیا۔شاداں کی بات کچھ سمجھ میں آرہی تھی۔اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ آگے کیا کہنے والی ہے۔ہوس کار کی ہوس دوبارہ سے جگانے کے لئے معمولی سا جواز بھی بہت ہوتا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہے۔یہاں تو ایک مضبوط جواز تصویروں کی صورت میں موجود تھا۔۔۔۔۔پھر پاشا کو شاداں سے دور ہوئے ایک سال کا عرصہ بھی گزر چکا تھا۔غالباً یہ دیکھ کر کہ "چڑیا" یہاں سے ہمیشہ کے لئے اڑنے والی ہے۔اس کے اندر کے شکاری کو "شیطان" نے پھر سے ہلا شیری دی تھی اور وہ تصویروں کے زور پر ایک بار پھر بے آسرا شاداں پر مسلط ہو گیا تھا۔

اگلے پانچ دس منٹ میں شاداں نے آتشیں آنسوؤں کے درمیان جو کچھ بتایا، وہ میرے مندرجہ بالا اندازے کے عین مطابق تھا۔لیکن یہاں ایک بات تھوڑی سی مختلف ہوئی اور وہ یہ کہ یہاں اس غم ناک کہانی میں ثمینہ داخل ہو گئی۔

شاداں نے دل دوز لہجے میں کہا۔"میں سمجھتی ہوں جی کہ ثمینہ ہم چاروں بہنوں میں سب سے زیادہ سمجھ دار اور ہمدرد ہے۔وہ ہر ایک کا خیال رکھتی ہے۔مجھ پر بھی اس کی گہری نظر تھی۔گھر میں ہم دونوں بہنوں کی منگنی کے لئے ڈھولکی بج رہی تھی اور میں کمروں میں چھپ چھپ کر رو رہی تھی۔ثمینہ نے دیکھ لیا۔۔۔۔۔اور سمجھ لیا کہ میرے لئے کوئی بہت پریشانی والی بات ہے۔ایک دن جب اماں اور مجھ سے چھوٹی دونوں بہنیں بازار گئی ہوئی تھیں۔ثمینہ نے کمرے کا دروازہ بند کر کے مجھے گھیر لیا۔۔۔۔۔اور اس وقت تک میری

جان نہیں چھوڑی جب تک میں نے روتے ہوئے ایک ایک بات اسے نہیں بتادی۔میں نے اسے بتایا کہ پاشا مجھے دھمکا رہا ہے۔۔۔۔اور پھر سے ملنے پر زور دے رہا ہے۔۔۔۔وہ کہہ رہا تھا کہ ایک آخری بار مل جاؤ اور اپنی تصویریں بھی مجھ سے لے جاؤ۔"

"تو پھر تم ملنے گئیں اس سے؟"

"نہیں جی۔"شاداں نے آنسو پونچھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔"ثمینہ نے مجھے جانے سے منع کر دیا۔اس نے کہا، آپا تم نہ جاؤ۔اور بالکل بے فکر ہو جاؤ۔اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں ہو گا۔میں نے کہا۔۔۔۔لیکن اگر ہو گیا تو پھر؟ وہ ہمارے رشتے تڑوانے کی دھمکیاں دے رہا ہے، ماں جیتے جی مر جائے گی۔میرے اور ثمینہ کے درمیان کافی بحث ہوئی۔اس نے میری ایک نہیں چلنے دی۔اس نے مجھے حکم سنایا کہ بس اب میں اس شیطان سے ملنے نہیں جاؤں گی۔ اس نے مجھ سے یہ جھوٹ بولا کہ اس کی ایک پکی سہیلی عاصمہ موکھل پاشا کی بہن کے ساتھ اسکول میں پڑھتی رہی ہے۔وہ اس کے ساتھ جا کر پاشا کی بہن سے ملے گی اور سب ٹھیک کر لے گی۔میں اس کی باتوں میں آ گئی۔"شاداں نے آخری فقرہ بے حد تاسف سے کہا اور اس کی غلافی آنکھوں میں غم کے گہرے سائے رینگ گئے۔

چند سیکنڈز خاموش رہ کر وہ بولی۔"دو تین دن بعد مجھے ثمینہ سے ہی پتا چلا کہ وہ پاشے سے ملی تھی۔اس نے اپنی طرف سے پاشے کو غیرت دلائی ہے اور اس کے منت ترلے بھی کئے ہیں۔اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ایک دو دن تک تصویریں اور ان کے نیگیٹے (نیگیٹیو) واپس کر دے گا۔میں ثمینہ سے پوچھتی ہی رہی کہ وہ پاشے کی بہن سے بھی ملی ہے یا نہیں۔اس نے میری باتوں کا گول مول جواب دیا، چھ سات دن بعد وہ تصویریں واپس لے آئی۔یہ ساری تصویریں نہیں تھیں اور ان کے نیگیٹے بھی نہیں تھے۔ثمینہ نے مجھے تسلی دی کہ نیگیٹے پاشے کے ایک دوست کے پاس ہیں اور وہ گوجرانولہ گیا ہوا ہے۔جیسے ہی وہ واپس آیا۔باقی تصویریں اور نیگیٹے بھی مل جائیں گے۔بس جی! جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کرتا ہے، ہم بہنیں بھی کر رہی تھیں۔۔۔۔یہ سوچ کر وقت کو دھکا دے رہی تھیں کہ شاید۔۔۔۔سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔

"ثمینہ نے تمہیں اندر کی بات نہیں بتائی؟"میں نے پوچھا۔

"نہیں جی۔بس وہ یہی کہتی رہی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔پھر ایک دن ہمارے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔پتا چلا کہ ثمینہ پاشے کے ساتھ کھیتوں میں پکڑی گئی ہے۔اسے پکڑنے والے خود

والی جی تھے۔ پہلے تو یہ بات چھپی رہی مگر آہستہ آہستہ پھیل گئی۔ ہماری بڑی بدنامی ہوئی۔ ایک موقعے پر تو ایسے لگا کہ ہم دونوں بہنوں کے رشتے ٹوٹ جائیں گے مگر پھر معاملہ سنبھل گیا۔ ہم سب نے ثمینہ کو بہت برا بھلا کہا۔ ان میں، میں بھی شامل تھی۔ میرے سوا کسی کو پتا نہیں تھا کہ ثمینہ نے یہ سب کیوں کیا ہے۔ ماں نے بھی ثمینہ کو بڑا مارا اور بد دعائیں دیں۔ ثمینہ نے رو رو کر ماں سے معافیاں مانگیں۔۔۔۔۔ اور کہا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے۔ اب وہ ایسا نہیں کرے گی۔

اس "موت جو گے" پاشے نے ثمینہ کو اس چکر میں پھنسایا ہوا ہے کہ وہ اسے تصویریں دے دے گا لیکن شرط یہ ہے کہ اپنی بہن کی جگہ۔۔۔۔۔ یعنی میری جگہ وہ اس سے ملتی رہے۔۔۔۔۔ اگر نہیں ملے گی تو پھر میری تصویریں میرے سسرالیوں کے پاس پہنچ جائیں گی اور یہ دونوں شادیاں نہیں ہو سکیں گی۔"

پاشے کے ساتھ ثمینہ کا تعلق کہاں تک پہنچا ہے؟ میں نے ڈھکے چھپے لہجے میں پوچھا۔

وہ میرا سوال سمجھ کر کانپ گئی۔ ہاتھ جوڑ کر اس نے چھت کی طرف دیکھا اور بولی۔ "اللہ نہ کرے جی کہ اس کا حال بھی میرے جیسا ہو۔ بس مجھے اسی بات کا ڈر ہے۔۔۔۔۔ دن رات

دل کو یہی خوف لگا رہتا ہے۔ میں نے۔۔۔۔۔ ثمینہ سے کہا تھا۔۔۔۔۔ کچھ بھی ہو جائے، تم نے اس خبیث سے کسی بند جگہ پر نہیں ملنا، کھیت شیت کی بات پھر بھی اور ہے۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے عورت شور وغیرہ ڈال سکتی ہے۔۔۔۔۔"

"تمھیں پتہ ہے کہ کچھ دن پہلے ثمینہ پھر پاشے سے ملتی ہوئی پکڑی گئی تھی۔ اور والی جی اسے ڈرانے کے لئے حویلی لے گئے تھے؟"

"ہاں جی۔ ہمیں پتا چل گیا تھا۔ اس روز ماں جی نے کہا تھا کہ وہ گلے میں پھندا ڈال کر مر جائیں گی۔ ثمینہ نے اس کے پاؤں پکڑ لئے تھے اور قسمیں کھائی تھیں کہ اب وہ پاشے سے نہیں ملے گی۔" شاداں نے کہا۔

"لیکن وہ پھر ملی۔۔۔۔۔ اور اس بار جہاں ملی، وہ کھلی جگہ بھی نہیں تھی۔ سعید کھوکھر کے کنوئیں کا ڈھارا (کمرا) تھا۔ اور وہاں سے شراب اور سگریٹ بھی نکلے ہیں۔"

"ہاں جی! وہ اتنا خرانٹ ہے کہ باتوں باتوں میں بندے کی مت مار دیتا ہے۔ اس نے تصویروں کی دھمکی دے کر ثمینہ کو وہاں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ صرف باتیں چاہتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن وہاں اس نے شراب پی اور ثمینہ پر اپنی نیت خراب کرنے لگا۔ ثمینہ نے اس

کی بات نہیں مانی تو اس کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے ثمینہ کو چپیڑیں ماریں اور غصے میں ابلتا ہوا چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے کہا کہ وہ اسے تین چار دن سوچنے کا موقع دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ تصویریں ان تک پہنچا دے گا جن تک پہنچنی چاہئیں۔

"اب صورتِ حال کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ لرزاں آواز میں بولی۔ "پتا نہیں کیوں میں آپ کو سب کچھ بتاتی جا رہی ہوں۔ میں اس سے پہلے آپ سے صرف ایک بار ملی ہوں۔۔۔۔ پر میرا دل کہتا ہے۔۔۔۔ میں آپ پر بھروسہ کروں۔۔۔۔ آپ میری مدد کریں گے۔"

"تمہارا دل صحیح کہتا ہے شاداں۔۔۔۔ تم بالکل ٹھیک جگہ پر ہو۔"

چند کانپتی سانسیں لینے کے بعد شاداں نے کہا۔ "سالار صاحب! کل رات میں نے پھر ثمینہ کو کہیں باہر سے آتے دیکھا ہے۔ آدھی رات کا وقت ہو گا۔ اس نے بڑے آرام سے باہر کا دروازہ کھولا۔ اسے کنڈی لگائی اور کمرے میں آ گئی۔ ہم دونوں کی چارپائیاں ساتھ ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ وہ بستر پر گھس کر لیٹ گئی۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ اس سے کچھ پوچھ سکوں۔ کچھ دیر بعد جب وہ سو گئی تو میں اٹھی۔۔۔۔ میں نے لالٹین اونچی کر کے اسے دیکھا۔ اس

کے گالوں پر خشک آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ میں نے اس کی وینی (کلائی) دیکھی۔ اس پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نشان تھے اور خون رسا ہوا تھا۔ میرا دل رونے لگا۔ وہ پھر پاشے سے ملنے گئی تھی۔ شاید پاشے نے اس سے کھینچا تانی بھی کی تھی۔ اصل میں وہ وچاری چاہتی ہے کہ کسی طرح بھی ہو، یہ کچھ ہفتے خیریت سے گزر جائیں اور ہم دونوں بہنوں کی رخصتی ہو جائے۔ پر مجھے لگ رہا ہے۔۔۔۔ مجھے لگ رہا ہے کہ ہماری رخصتی کے چکر میں وہ نمانی۔۔۔۔"

شاداں بات مکمل نہ کر سکی اور دوپٹے کے پلو میں منہ چھپا کر پھر آنسو بہانے لگی۔ اس کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس کی طرح اب ثمینہ کی عزت بھی شدید خطرے میں ہے اور وہ کسی بھی وقت اس خبیث کے گندے بوجھ تلے روندی جا سکتی ہے۔

یہ کوئی انوکھی واردات نہیں تھی۔ بلیک میلنگ کا وہی پرانا چکر تھا جس کے بارے میں بہت کچھ کہا سنا جاتا ہے۔ عیار قسم کے عورت باز۔۔۔۔ عورت کو مستقل طور پر اپنے شکنجے میں رکھنے کے لئے یا پھر مالدار عورت سے مال وغیرہ اینٹھنے کے لئے ایسے حربے استعمال کرتے

ہیں۔۔۔۔اور بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ اکثر کامیاب بھی رہتے ہیں۔ایسے معاملوں میں کبھی آواز اور کبھی تصویر یا تحریر استعمال کی جاتی ہے۔

شاداں اب جلدی میں تھی اور واپس جانا چاہ رہی تھی۔ میں نے اس سے چند ضروری باتیں پوچھیں اور پھر تسلی تشفی دے کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ جانے سے پہلے وہ ایک دم زمین پر بیٹھ گئی اور میرے پاؤں پکڑ لئے۔وہ کربناک آواز میں بولی۔"سالار جی! آپ نے جو کرنا ہے جلدی کریں۔۔۔۔لیکن کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جس کی وجہ سے ہماری ماں کو اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لینی پڑ جائے۔اگر ایسا ہوا تو میں بھی اس کے ساتھ ہی مر جاؤں گی۔ ہمارے گھر سے ایک نہیں دو میتیں اٹھیں گی۔"

میں نے اسے قدموں سے اٹھایا اور اس کے سر پر چادر درست کی۔وہ اپنی سسکیاں روکتی ہوئی واپس چلی گئی۔ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ وہ دو دن بعد ہر صورت میں مجھے عصر کے بعد میاں جی کے قبرستان میں ملے گی۔

میں اب تک اچھی طرح جان چکا تھا کہ موکھل پاشا خطرناک ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت کمینہ اور گھٹیا بھی ہے۔وہ گھٹیا ترین بلیک میلروں والا وہی حربہ استعمال کر رہا تھا جو سب

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کے لئے جانا پہچانا ہے۔وہ ساری تصویریں اور ان کے نیگٹیو واپس نہیں کر رہا تھا اور اگر کر بھی دیتا تو جب تک اس کی نیت ٹھیک نہیں تھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔۔۔۔نیگٹیوز کی بھی ایک سے زائد کاپیاں اس کے پاس ہو سکتی تھیں۔

شاداں نے مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں جو کچھ بتایا اس سے یہی اندازہ ہوا کہ جن دنوں شاداں اور پاشا کا معاملہ عروج پر تھا، وہ شاداں کو بہلا پھسلا کر اپنے ایک یار کی بیٹھک میں لے گیا تھا۔ جلد ہی شادی کے جھوٹے وعدے پر اس نے شاداں کی عزت خراب کی تھی۔اس عمل سے پہلے یا دوران میں اسے کوئی نشہ آور شے کھلائی گئی تھی۔وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو گئی تھی۔یہ سب کچھ دن کے وقت ہوا تھا۔ایک عام سے اسٹل کیمرے کے ساتھ موکھل پاشا نے بد قسمت شاداں کی عریاں تصویریں اتار لی تھیں۔۔۔۔اور اب ان تصویروں ہی کی وجہ سے ایثار پیشہ ثمینہ۔۔۔۔۔موکھل کے نشانے پر تھی۔

شاداں کا کہنا تو یہی تھا کہ وہ ابھی تک موکھل کے شکنجے میں پوری طرح آنے سے بچی ہوئی ہے۔مگر اس بارے میں ابھی بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔وہ چوکس ضرور تھی لیکن جنگل میں ہرن بھی تو کچھ کم چوکس نہیں ہوتا۔درندے کی بھوک میں اتنی لپک ہوتی ہے کہ

وہ کسی نہ کسی طور۔۔۔۔۔ جلد یا بدیر اسے چھاپ ہی لیتا ہے۔ شاداں ٹھیک کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔اسے اور اس کی بہنوں کو فوری مدد کی ضرورت تھی۔ یہ ایک سنگین مرحلہ تھا۔ دونوں بڑی بہنوں کی شادی میں بس سات آٹھ ہفتے رہ گئے تھے۔ موکھل پاشا بھی وقت کی اہمیت کو سمجھتا تھا، انہی دنوں میں سادہ دل ثمینہ نے پوری کوشش کرنی تھی کہ وہ کسی طرح موکھل کو روکنے اور اس سے تصویریں وغیرہ واپس لینے میں کامیاب ہو جائے۔ کبھی کبھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خبیث، ثمینہ کو بھی وہی سبز باغ دکھا رہا ہے جو اس سے پہلے شاداں کو دکھاتا رہا ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ خود کو ثمینہ کی محبت میں گرفتار بتا رہا ہو اور اس سے شادی کی باتیں بھی کرتا ہو۔ اماں دلشاد کے گھر میں ثمینہ سے میری جو گفتگو ہوئی تھی۔ اس سے بھی اسی طرف اشارہ ملتا تھا۔ ثمینہ نے کہا تھا کہ وہ پاشا سے محبت کرتی ہے۔

میں اپنے مختصر کمرے میں چہل قدمی کرتے ہوئے اس بارے میں سوچنے لگا۔ اتنے میں ساتھ والے کمرے میں انٹرکام کی گھنٹی ہونے لگی۔ جب بھی انٹرکام کی گھنٹی ہوتی تھی، ایک تیز گھنٹی میرے اندر بھی بج اٹھتی تھی۔ دل میں آس جاگتی تھی کہ شاید یہ میرا ہی فون ہو۔

بیگم بلقیس مجھ سے بات کرنا چاہتی ہو یا پھر والی جی نے مجھے کسی کام سے حویلی کے اندر بلایا ہو۔۔۔۔۔ یا پھر۔۔۔۔۔

کئی طرح کے امکان ذہن میں جگمگا اٹھتے تھے اور یہ جگمگاہٹ دن میں کئی بار ہوتی تھی کیونکہ کئی بار ساتھ والے کمرے میں گھنٹی بجتی تھی۔ اس بار بھی انٹرکام کی بیل نے مجھے چونکایا۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا تو میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ یہ ملتانی تھا۔ اس نے کہا۔ "بمبو کاٹ پر آپ کی کال ہے جی۔" چھوٹے بڑے سب انٹرکام کو اب بڑی روانی سے بمبو کاٹ ہی کہتے تھے۔

"کون ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"پتا نہیں جی۔ چاچے منظور نے کہا ہے کہ آپ کو بلاؤں۔"

میں دھڑکتے دل کے ساتھ منشی منظور کے کمرے میں پہنچا اور کریڈل اٹھایا۔ دوسری طرف والی جی تھے۔ انہوں نے کہا۔ خاور! اپنے پنڈ کا ایک چکر لگا آؤ۔"

"کیوں جی؟ خیریت ہے نا؟"

"ہاں جی خیریت ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ وہ ہماری ملازمہ فیروزاں اپنے کسی کام سے تمہارے پنڈ گئی ہوئی تھی۔ ابھی شام کو واپس آئی ہے۔ وہ تمہاری والدہ سے بھی ملی ہے۔ تمہاری والدہ نے ہی کہا ہے کہ خاور آکر مل جائے۔"

والی جی سے بات ختم کرنے کے فوراً بعد میں نے گھوڑی پر کاٹھی ڈلوائی اور پنڈ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کچے کمرے میں لالٹین کی مدھم لو تھی۔ عارفہ بڑے لاڈ سے میری گود میں سر رکھ کر لیٹی ہوئی تھی۔ بے بے جی کے چہرے پر ایک بوجھل سی کیفیت تھی جیسے وہ کوئی گھمبیر بات کہنے والی ہوں۔ میں سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ آخر انہوں نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "خاور پتر! میرا دل چاہتا ہے کہ تو یہ نوکری چھوڑ دے۔ بس تو ہمارے پاس آ جا۔ ہمیں نہیں چاہئیں زیادہ پیسے۔ پتا نہیں اب کتنے دن جینا ہے میں تجھے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن بے بے جی۔۔۔۔"

"نہیں میں نے اب تیری بات نہیں سننی۔ تیرا وہاں جو کام ہے، بس ایک دو ہفتے میں نبیڑ لے۔ میں تیرے لئے کڑی ڈھونڈنے میں لگی ہوئی ہوں۔ دو تین مہینے میں، میں نے تیرا ویاہ کر دینا ہے۔"

میں نے شرارت سے عارفہ کی طرف دیکھا۔ "میں جانتا ہوں۔ یہ سب تیری پڑھائی ہوئی پٹیاں ہیں۔ تو اپنا راستہ صاف کرنا چاہتی ہے۔"

عارفہ نے میری طرف مکا کسا۔ بے بے جی نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "خاورے! یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔

پرسوں ساری رات ہم ماں دھی جاگتی رہی ہیں۔۔۔۔"

"کیا ہوا بے بے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

بے بے جی نے عارفہ کی طرف دیکھا عارفہ بھی ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بے بے جی نے جو کچھ بتایا، وہ واقعی پریشان کن تھا۔ انہوں نے

بتایا کہ رات کو ایک گھڑ سوار گھر کے ارد گرد چکر اتارہا۔ وہ ایک دو بار دروازے کے بالکل سامنے بھی کھڑا ہوا۔ پھر آدھی رات کو ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی صحن میں کودا ہے۔ شاید یہ دو بندے تھے۔ بے بے جی اور عارفہ جاگ گئیں اور کمرے کے اندر سہمی بیٹھی رہیں۔ اتنے میں ٹھیکری پہرے والوں کی آوز آئی اور وہ جو کوئی بھی تھا، باہر نکل گیا۔ سویرے چانن ہونے کے بعد بے بے جی کمرے سے باہر آئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ باہر دروازے کی کنڈی اندر سے اتری ہوئی ہے۔ کچے صحن میں مردانہ جوتی کے نشان بھی نظر آئے۔ ماں بیٹی نے ابھی تک یہ بات اپنے تک ہی رکھی ہوئی تھی۔

پوری بات سننے کے فوراً بعد میرا دھیان موکھلوں کی طرف ہی گیا۔ مجھے ان کی طرف سے کئی طرح کے اندیشے پہلے سے ہی موجود تھے۔ میں نے ایک دن خود بھی پنڈ میں ایک ایسی شکل دیکھی تھی جو کچھ عرصہ پہلے موکھلوں کے گودام کے سامنے نظر آئی تھی۔ یہ سب کچھ خطرناک تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ لڑائی جھگڑے اور دشمن داری میں سب سے زیادہ خطرے عورتوں کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ مرد کھیتوں کھلیانوں اور میدانوں میں دشمنی کی آگ بھڑکاتے ہیں اور گھروں کی چار دیواری میں بیٹھی بے گناہ مائیں اور بیٹیاں اس

کی زد میں آجاتی ہیں۔ جب سے موکھلوں کے ساتھ تنازعہ ہوا تھا، میرا دھیان مسلسل اپنی ماں اور بہن کی طرف لگا رہتا تھا۔ اس دن بے بے جی کی اطلاع سننے کے بعد میں نے کھل کر اپنے دل کی بات کر دی۔

میں نے کہا۔ "بے بے جی! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ آپ اور عارفہ اب یہاں نہیں رہیں گی۔ میں نے آپ دونوں کے لیے ایک بڑا اچھا ٹھکانا ڈھونڈ لیا ہے۔"

"نہیں خاورے! ہمارے لیے یہی ٹھکانا اچھا ہے۔ بس تُو یہ نوکری چھوڑ کر ہمارے پاس آ جا۔ ہمیں کوئی ڈر خطرہ نہیں ہے۔"

"بے بے جی! یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ ڈر خطرہ پھر بھی رہتا ہے۔"

"پھر کیسے رہے گا، جب تُو نوکری ہی چھوڑ دے گا؟ یہ سارے سیاپے اس نوکری کی وجہ سے ہی تو ہیں۔ تیری کسی سے کون سی ذاتی دشمنی ہے۔ بس ہم نے نہیں کرنی یہ نوکری۔۔۔۔ ہم روکھی سوکھی کھالیں گے۔ پرائی آگ میں اپنے آپ کو نہیں جلائیں گے۔"

"بے بے جی! آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں اس طرح نوکری نہیں چھوڑ سکتا۔۔۔۔"

"کیوں نہیں چھوڑ سکتا؟ کیوں نہیں چھوڑ سکتا؟" بے بے جی ایک دم بپھر کر بولیں۔

"دیکھیں، میں آپ کو ساری باتیں نہیں بتا سکتا لیکن۔۔۔۔"

"تُو ساری باتیں نہیں بتا سکتا پر میں بتا سکتی ہوں۔" انہوں نے طیش سے میری بات کاٹی۔ "میں سب جانتی ہوں۔ مجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ تو اس زنانی کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ اس کا مرید بنا ہوا ہے۔"

میرے سر پر جیسے کسی نے وزنی لٹھ دے ماری۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ بے بے جی کافی کچھ جان گئی ہیں۔ غالباً انہیں شک تو پہلے ہی سے تھا، اب کسی ذریعے سے تصدیق بھی ہو گئی تھی۔۔۔۔ وہ ایک بار بولیں تو پھر بولتی چلی گئیں۔ "تُو کیا سمجھتا ہے۔۔۔۔ بس تیری ہی آنکھیں ہیں؟ سب کی آنکھیں ہیں۔ سب دیکھتے ہیں۔ تجھے ہی نظر نہیں آتا۔ ابھی تک لوگ کانوں میں باتیں کرتے ہیں۔ کسی کو شک ہے، کسی کو یقین۔ بہت جلد ساروں کو یقین ہو جائے گا اور پھر کانوں میں باتیں نہیں ہوں گی۔"

"بے بے جی۔۔۔۔ بے بے جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ سوچیں اگر کوئی بات ہے تو والی جی مجھے رہنے دیں جاگیر میں؟ وہ لوگ میرے ٹوٹے کر کے پھینک دیں۔"

"گھبراتا کیوں ہے، پھینک دیں گے کسی دن۔ وہ بڑھا بیمار والی جی ٹوٹے نہیں کرے گا تو حویلی میں سے کوئی اور کر دے گا۔ وہ بخشیں گے نہیں تجھے۔ یہ بڑے زہریلے لوگ ہوتے ہیں۔ ابھی انہیں تیری وجہ سے کوئی فائدہ نظر آ رہا ہو گا اس لیے چپ ہیں لیکن ماف کبھی نہیں کریں گے وہ۔۔۔۔ انہیں اپنی بدمعاش زنانی میں کوئی گناہ نظر نہیں آتا۔ ساری ملاقاتیں تیرے ہی گلے ڈالنی ہیں انہوں نے۔ میں ان قصائیوں کو بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔"

بے بے جی نے بیگم بلقیس کے لیے جو لفظ استعمال کیا، اس نے میرے دل کو کچوکا لگایا۔ میں نے بے بے جی کے پاؤں تھامتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "بے بے جی! کسی نے آپ کو غلط بتایا ہے، ایسی نہیں ہے وہ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔"

"چپ کر جا۔۔۔۔ مجھے سبق نا پڑھا۔ میں تیری ماں ہوں۔ میں نے پیدا کیا ہے تجھے۔۔۔۔ تُو نے مجھے پیدا نہیں کیا۔۔۔۔ دس سال کے بچے کی ماں ہے وہ اور تجھ سے پیار کی پینگیں ڈال رہی ہے۔ بڑی دیکھی ہیں اس طرح کی ففے کٹنیاں۔ رات کو اپنے خصموں کو سلا کر یارانے پالنے نکل پڑتی ہیں۔ اسے حیا نہیں آتی۔۔۔۔ بے شرم بے غیرت۔ ایسی

زنانی کو تو چوک میں الٹا لٹکا کر گولا مار دینا چاہئیے۔" عارفہ نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھا اور انہیں چپ کرانے کی کوشش کی۔

بے بے جی طیش میں تھیں۔ میں نے ان کے سامنے سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔

ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ یہ کون ہو سکتا تھا جس نے بے بے جی کو اس انداز میں طیش دلایا تھا؟ جب میں نے انہیں کچھ دنوں کے لیے نانا کے گھر بھیجا تھا، وہ ٹھٹک گئی تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ انہوں نے خود ہی ٹوہ لگائی ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ۔۔۔۔۔

میرا دھیان چودھری عزیز کی طرف جانے لگا۔ یہ وہ شخص تھا جو مجھے حویلی اور جاگیر سے دور دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے اس نے والی جی کے کان بھی بھرے تھے لیکن والی جی ایک بہت خاص فطرت کے مالک شخص تھے۔ انہوں نے وہ ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تھا جس کی شاید چودھری عزیز کو توقع تھی۔ عین ممکن تھا کہ ادھر سے قدرے مایوس ہو کر چودھری نے اس طرف کام دکھایا ہو۔ وہ گھڑ سواروں والی بات بھی معما تھی۔

میں نے اگلے روز دوپہر تک کچھ نہیں کھایا۔ عارفہ بھی بھوکی رہی۔ بے بے جی کا غصہ کچھ کم ہوا تو انہوں نے روٹی پکائی اور عارفہ سے کہا کہ مجھے کھلائے۔ رات تک ان کا غصہ مزید کم

ہوا۔ میں نے مناسب لفظوں میں انہیں صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلایا۔ میں نے ان سے کہا کہ آئندہ میں ان کی باتوں پر عمل کروں گا۔ لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اور جو خطرے پیدا ہو چکے ہیں، ان کا سدِ باب تو کرنا ہے۔ میں نے موکھلوں کے ساتھ اپنے تنازعے کی تفصیل بتائی۔

میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ موکھلوں کے ساتھ تنازعہ بہت شدت اختیار کرنے والا ہے۔ میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اپنی والدہ اور بہن کے لیے تھوڑا سا خطرہ بھی مول نہیں لینا۔ میں ان کے لیے ایک بہت مناسب ٹھکانے کا انتظام کر چکا تھا۔ اگلے چھ سات روز میں، میں نے بڑی حکمت، محبت اور کوشش کے ساتھ بے بے جی اور عارفہ کو گاؤں سے گوجرانوالہ پہنچا دیا۔ یہاں ہمارے ہی گاؤں کا ایک لڑکا رشید بٹ اپنی دکان کرتا تھا۔ رشید بٹ میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ بٹ ہونے کے باوجود اس نے لوہے کا کام سیکھا تھا۔ گوجرانوالہ میں وہ مستری بٹ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اب وہ اپنے دو بھائیوں سمیت مستقل طور پر گوجرانوالہ منتقل ہو چکا تھا۔ وہیں پر تینوں بھائیوں نے شادیاں بھی کی تھیں۔ رشید بٹ پر مجھے بے حد اعتماد تھا۔

جس روز میں والدہ اور بہن کو گوجرانوالہ میں چھوڑ کر واپس پنڈ پہنچا، اسی روز موکھل پاشا سے میری ملاقات بھی ہو گئی۔ یہ بڑی ڈرامائی ملاقات تھی۔ میں تانگے پر سوار جاگیر کی طرف جا رہا تھا۔ کوچوان کے علاوہ راجوال کے دو اور بندے بھی تانگے پر سوار تھے۔ تانگا چھوٹی نہر کی پُلی پر پہنچا تو سامنے سے موکھل پاشا کا سجا سجایا تانگا آ گیا۔ پُلی پر سے بس ایک تانگا گزر سکتا تھا۔ دونوں تانگے آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ہمارا تانگا کافی آگے آ گیا تھا۔ اصولی طور پر موکھل پاشا کے تانگے کو پیچھے ہٹنا چاہئیے تھا لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹا۔ میں نے پاشا کو اور پاشا نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے کہا۔ "تانگا پیچھے ہٹاؤ۔"

پاشا کی بھوری آنکھوں میں بجلی سی چمکی۔ "یہ موکھلوں کا تانگا ہے یہ پیچھے نہیں ہٹتا۔" اس نے پھنکار کر کہا۔ اس کے ساتھ تین یا چار مسلح بندے موجود تھے۔

ہمارے تانگے میں کوچوان سمیت تمام افراد کے چہرے زرد ہو گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہاں زبردست پھڈا ہونے والا ہے۔ میں نے کہا۔ "یہ راجوال کا تانگا ہے۔۔۔۔ اور یہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔"

میں نے کوچوان سے کہا اور اس نے دھکیل دھکال کر تانگے کو پُلی سے نیچے اتار لیا۔ موکھل پاشا کے چہرے پر فتح مندی کی چمک نمودار ہوئی۔ گردن کچھ اور اکڑ گئی۔ اس کے تانگے نے جب پل پار کر لیا تو میں نے اسے روک لیا۔ "پاشے! تم سے ایک بات کرنی ہے۔" میں نے کہا۔

"کرو۔" وہ تانگے پر بیٹھے بیٹھے بولا۔ میں تانگے کے پاس کھڑا تھا۔

"یہ بات کرنے کے لیے تمہیں چار پانچ منٹ کے لیے نیچے آنا پڑے گا۔"

اس نے چوکنی نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ چارے کے دو فٹ اونچے کھیتوں میں دور تک کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہمارے تانگے میں موجود بندوں کے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں نے پاشے کی مزید تسلی کے لیے قمیص کے نیچے سے اپنا پستول نکالا اور اس کی ساری گولیاں نکال کر اسے اپنے تانگے کی سیٹ پر رکھ دیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور موکھل پاشا پلی سے کچھ دور پرالی کے ایک بہت بڑے ڈھیر کے عقب میں کھڑے تھے۔ پاشے کی بھوری آنکھوں میں عیاری اور خباثت چمکارے مار رہی تھی۔

"کیا کوئی خاص بات ہے؟" پاشے نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے بات کرنے سے پہلے ہی پاشا جان گیا ہے کہ میں ثمینہ کے بارے میں کچھ کہنے لگا ہوں۔ شاید ثمینہ نے اسے شام پور میں میری آمد کے بارے میں بتادیا تھا۔۔۔۔اور یہ بھی بتادیا تھا کہ میں اس معاملے کی تفتیش میں لگا ہوا ہوں۔ میں نے غور سے اس کا تمتماتا چہرہ دیکھا اور میرے اندر آگ سی سلگنے لگی۔ یہی شخص تھا جس نے اماں دلشاد کی بے آسرا بیٹی شاداں کو تاراج کیا تھا اور اب اس کی چھوٹی بہن ثمینہ کو اپنی حرص کے جال میں جکڑ رہا تھا۔ ہاں، یہی تھا وہ جو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا تھا اور بے رحم عیاری کی ساری خصوصیات اپنے اندر رکھتا تھا۔ میں اندرونی غضب سے پھٹ پڑتا تو شاید اسی جگہ فیصلہ ہو جاتا۔ وہ مجھے گولیوں سے چھلنی کر دیتا یا میں اس کی ٹانگیں چیر دیتا۔ لیکن اس کی ٹانگیں چیرنے سے بھی اماں دلشاد اور اس کی روتی بلکتی بیٹیوں کا مسئلہ حل نہیں ہونا تھا۔ ان کی رہائی کے اشتہار پاشے کے قبضے میں تھے اور پاشے کی موت کے بعد بھی وہ دیواروں پر لگ سکتے تھے۔۔۔۔وہ تصویریں پاشے کی موت کے بعد بھی اتنی ہی خطرناک تھیں جتنی اب تھیں۔ پاشے کا کوئی ہمراز دوست انہیں منظرِ عام پر لا سکتا تھا۔

"کس سوچ میں پڑ گیا ہے؟ میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"ہاں، ٹائم تو واقعی تمہارے پاس زیادہ نہیں ہے۔ تمہیں جو بھی فیصلہ کرنا ہے بس اگلے آٹھ پہر میں کرنا ہے۔"

"کس کی بات کر رہا ہے؟"

"ثمینہ کی بات کر رہا ہوں۔۔۔۔اور شاداں کی تصویروں کی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بے خوفی سے ہنسا۔ "مجھے پتا تھا۔ یہ چھپکلی۔۔۔۔شہتیر کو جھپا ضرور مارے گی۔۔۔چل خیر بتا۔ کیا چاہتا ہے تُو؟"

"تم نے اپنی کاری گری کا خیر سے کافی فائدہ اٹھالیا ہے۔ ایک کی عزت لوٹ لی ہے اور دوسری کے ساتھ بھی پتا نہیں کیا کچھ کر چکا ہے۔ اب بھلائی اسی میں ہے کہ اس معاملے کو ختم کر دے۔ وہ تصویریں اور نیگٹیو ہمیں واپس کر دے۔"

"تُو پتا نہیں کیا اونگی بونگی مار رہا ہے یا پھر کسی نے تجھے الو بنایا ہے۔ میرے پاس کسی کی تصویریں نہیں ہیں۔ اور اگر۔۔۔۔ہوتیں بھی تو تُو پوچھنے والا کون ہے۔۔۔۔کیا اب علاقے کی تھانے داری رانا شبیر کی بجائے تیرے ہتھ میں آگئی ہے؟"

میں نے موکھل پاشا کی چمکارے مارتی اور شعلے اگلتی آنکھوں میں دیکھا۔اور ایک ہی لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں۔۔۔۔۔ہر گز نہیں۔۔۔۔۔

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔"دیکھ پاشا! میں بندے کو مہلت ضرور دیتا ہوں۔تیرے پاس بھی کل اس وقت تک کا ٹائم ہے۔اپنے اچھے برے کے بارے میں اچھی طرح سوچ لے۔اور ایک درخواست بھی ہے تجھ سے۔جو فیصلہ بھی کرنا بہت نیک نیتی سے کرنا۔اگر تُو واقعی تصویریں واپس کر دے گا تو پھر۔۔۔۔کم از کم یہ معاملہ تو یہیں ختم ہو جائے گا۔"

وہ بھڑک کر بولا۔"اوئے! یہ مہلتیں شہلتیں اپنے پاس رکھ۔جو سپ نکالنا ہے ابھی نکال لے۔"

"نہیں۔۔۔۔ابھی نہیں۔"میں نے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا تانگے کی طرف واپس چلا گیا۔

رات گئے تک میں بے چین رہا۔مجھے بندے کی خصلت دیکھنا آگئی تھی اور پاشا کی خصلت مجھے سمجھا رہی تھی کہ اس نے اماں دلشاد کی بیٹیوں کو بہت رولنا ہے۔اس معاملے میں اس کی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہوس اور دشمنی دونوں کی تسکین ہوتی تھی۔بے شک اماں دلشاد اور اس کی بیٹیاں حویلی چھوڑ چکی تھیں مگر والی جی کے خاندان سے ان کا پرانا ناتا تھا۔اب موکھل پاشا نے انہیں اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور وہ یقیناً انہیں جکڑ کر سرشاری اور فتح مندی محسوس کرتا تھا۔ایک طرف اس نے اپنے لیے عیاشی کا سامان پیدا کیا تھا تو دوسری طرف راجوالوں کے سینوں پر مونگ بھی دل رہا تھا۔خاص طور سے والی جی اس صورتِ حال سے کافی پریشان تھے۔

تیمور اور میں دیر تک مشورے کرتے رہے۔ہم نے کئی طریقوں پر غور کیا لیکن کوئی طریقہ بھی مکمل طور پر محفوظ نہیں تھا۔یہاں تک کہ ہم کسی طرح پاشے کو جان سے بھی مار دیتے تو بھی شاداں کی عریاں تصویریں اپنا کام دکھا سکتی تھیں۔

"پھر کیا کرنا ہے؟"آخر تیمور نے تھک کر کہا۔

"ابھی کچھ نہیں کرنا۔ابھی صرف سوچنا ہے۔آٹھ پہر کی مہلت پوری ہونے دو۔"

"اس کا مطلب ہے، تمہارے دماغ میں کچھ ہے؟"

"ہاں تومی!" میں نے کچی دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "میں اس حرامی کو ایک ایسا جواب دینا چاہتا ہوں جو یہ مدت تک یاد رکھے اور اس جیسے دوسرے حرامیوں کو بھی سبق حاصل ہو۔"

"کوئی اشارہ تو دو۔۔۔۔" تیمور نے کہا۔

"بس یہ سمجھ لو کہ پاشے جیسے بہت کم حرام زادوں کے ساتھ کسی نے اس طرح کا کام کیا ہو گا۔ لیکن ابھی کچھ نہیں۔ ابھی آٹھ پہر پورے ہونے دو۔۔۔۔"

آٹھ پہر پورے ہونے کے بعد میں مچھلی فارم پہنچا۔ مچھلی فارم اب گندے پانی کا ایک بڑا جوہڑ بن چکا تھا۔ اس طرف کا سارا رقبہ برباد ہو گیا تھا۔ مقدمے کی کاروائی جاری تھی۔ میں نے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ایک موکھل کو پیغام دے کر موکھل پاشا کی طرف بھیجا۔ پیغام یہ تھا کہ آٹھ پہر پورے ہو گئے ہیں، اس کا کیا جواب ہے۔

میں نے تقریباً ایک گھنٹا شیرے اور فتح محمد کے پاس بیٹھ کر انتظار کیا لیکن ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میرا اندازہ تھا کہ موکھل پاشا اس وقت نشے میں دُھت پڑا ہو گا۔ کوئی رکھیل

یا جوان نوکرانی اس کی بغل میں ہو گی۔ اس نے پیغام لے جانے والے کی ماں بہن ایک کی ہو گی اور ہو سکتا ہے مجھے بھی گالیاں دی ہوں۔ میں دو بجے کے قریب راجوال واپس آ گیا۔

پچھلے سات آٹھ روز میں نصراللہ کے ساتھی شبیر کے ذریعے میں موکھل پاشا کے متعلق اہم معلومات حاصل کر چکا تھا۔ کچھ دن پہلے ثمینہ کی بڑی بہن شاداں نے پاشا کی ایک بہن کا ذکر کیا تھا۔ میں نے اس بہن کے بارے میں ٹوہ لگوائی تھی۔ یہ موکھل کی، باپ کی طرف سے سوتیلی بہن تھی۔ اس کا نام مختاراں تھا مگر اسے مکھاں مکھاں کہا جاتا تھا۔ کوئی ایک سال پہلے اسے طلاق ہو گئی تھی۔ بچہ کوئی نہیں تھا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ میاں بیوی میں جھگڑے کے بعد موکھل پاشا نے مکھاں کے شوہر کو بُری طرح مارا پیٹا تھا اور اسے مردانہ صفات سے محروم کر دیا تھا۔ کم از کم کہا تو یہی جاتا تھا۔ بہر طور مکھاں اب اپنے ایک مامے کے ساتھ مناواں گاؤں میں رہتی تھی۔ میں یہ گھر دیکھ چکا تھا اور مکھاں کے دونوں ماموں کا ڈیرا بھی ملاحظہ کر چکا تھا۔ دونوں ماموں کو حنیف ڈپو والا اور شریف ڈپو والا کہا جاتا تھا۔

جس گھر میں مکھاں رہتی تھی، اس میں مکھاں کے دونوں ماموں کے علاوہ ایک ماموزاد بھائی اور ایک نوکر بھی رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک مامی بھی تھی۔ ڈیرا گاؤں سے ایک ڈیڑھ

میل دور تھا۔ مرد شام کے بعد ہی گھر لوٹتے تھے۔ شام کے وقت عام طور پر روزانہ ڈیرے پر شراب کا دور بھی چلتا تھا۔

اگلے روز میں اور تیمور اپنے تانگے پر لمبا سفر کر کے ڈسکے پہنچے۔ راستے میں تیمور مجھ سے مسلسل پوچھتا رہا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ میں پہلے تو اسے ٹالتا رہا پھر بتا دیا کہ ڈسکے کی فلاں گلی میں جا رہے ہیں۔ گلی کا نام سن کر تیمور چونکا۔ یہ گلی رنگ بازی کے لیے مشہور تھی۔ شراب، ناچ گانا اور جوا۔۔۔۔ سب کچھ یہاں چلتا تھا۔

"وہاں کرنا کیا ہے؟" تیمور نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہی جو سارے شریف شرفا کرتے ہیں۔ اپنا رونق علی بھی کرتا ہے۔"

"یار تُو مذاق کر رہا ہے۔"

"مذاق کی اس میں کیا بات ہے۔۔۔۔ کیا ہم یہاں آتے نہیں رہے؟ اور ایک بار تو پتا ہے، سب کچھ ہی ہو گیا تھا۔"

"وہ تو پرانی بات ہے۔ اب تو تُو خیر سے توبہ شوبہ کر چکا ہے۔ کر چکا ہے یا نہیں؟"

"یار! جس کے لیے توبہ کی تھی، اب وہی منہ پھیر رہی ہے تو توبہ میں کیا اثر رہ جانا ہے۔" میں نے انگڑائی لے کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"یعنی، تیرا مطلب ہے۔۔۔۔؟"

"ہاں یار تومی! بلقیس کا غم یوں غلط کرنا چاہتا ہوں کہ بس کچھ یاد نہ رہے۔"

"اس نے تانگا چلاتے چلاتے بڑے دھیان سے میری طرف دیکھا پھر سگریٹ کا لمبا کش لے کر بولا۔ "تُو مجھے اُلو بنا رہا ہے، بات کچھ اور ہے؟"

"چل پھر اور بات ہے تو ساجے کے ٹو کے گھر کے سامنے تانگا روک لے۔"

ساجا کے ٹو ہم دونوں کا مشترکہ دوست تھا۔ کبھی کبھار جب ہم شغل میلے کے لیے ادھر کا رُخ کرتے تھے تو سجاد یعنی ساجا کے ٹو بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاتا تھا۔ اب کافی عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

دو منٹ بعد ہم ساجے کے ٹو کے گھر کے سامنے کھڑے تھے اور وہ کے ٹو سگریٹ کا دھواں ہمارے منہ پر پھینکتے ہوئے ذرا حیرت سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ کے ٹو کو اچھی طرح

معلوم تھا کہ آج کل میں جاگیر کی ملازمت کر رہا ہوں اور وہاں میرا کافی ٹھکا شہکا ہے۔ کوئی تین مہینے پہلے وہ مجھ سے ملنے میرے گاؤں مراد آباد بھی آیا تھا۔

رسمی باتوں کے فوراً بعد میں اصل موضوع پر آگیا۔ میں نے کے ٹو سے کہا۔ "دو زبردست قسم کی پٹاکا ڈانسروں کا انتظام کرنا ہے اور ساتھ میں دو بڑی بوتلیں شراب بھی۔"

"کیا تیرے کاکے کے ختنے ہیں؟"

"کاکے کو اب بھول جاؤ۔ لگتا ہے گنگارام اب کنوارا ہی مرے گا۔" تیمور نے مجھ پر چوٹ کی۔

میں نے کہا۔ "یار! مذاق بعد میں ہوتا رہے گا۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ دو بڑی اچھی سی ڈانسریں چن لو۔ ان سے رات گزارنے کی بات بھی کر لو اور ابھی اسی وقت نانواں دے دو۔" نانواں ایک مقامی لفظ تھا جو یار لوگ طوائفوں کے ایڈوانس کے لیے استعمال کرتے تھے۔

"پر بُک کہاں کے لیے کرنا ہے؟"

"خاص مناواں پنڈ کے لیے۔ اور یہ لو۔۔۔۔۔ نانوے کی رقم۔۔۔۔۔ پورے آٹھ ہزار ہیں۔ لیکن اسی میں سب کچھ کرنا ہے۔ دونوں طوائفیں، تین سازندے، شراب اور رستے کا کھانا پینا۔ سمجھ رہے ہو نا۔۔۔۔۔ اور ہاں، تانگے اور کوچوان کا خرچا بھی۔"

کے ٹو نے لمبا کش کھینچ کر اثبات میں سر ہلایا۔ اگلے پانچ دس منٹ میں سب کچھ طے ہو گیا۔ اپنی کوئی شناخت دیے بغیر کے ٹو نے دو طوائفیں مناواں کے لیے بُک کرنی تھیں۔ ایڈریس مکھاں کے دونوں ماموں کے ڈیرے کا تھا۔ طوائفوں کو اپنے لوازمات کے ساتھ شام کے فوراً بعد ڈیرے پر پہنچ جانا تھا اور ڈیرے داروں کو بتانا تھا کہ انہیں ان کے کسی دوست نے ڈسکے سے بُک کر کے یہاں بھیجا ہے اور نانواں وغیرہ بھی دے دیا ہے۔ یعنی یہ ڈیرے والوں کے لیے ایک طرح سے سرپرائز تحفہ تھا۔ رنگین مزاج زمینداروں اور چودھریوں وغیرہ میں اس قسم کی شوخیوں کا ہمیشہ رواج رہا ہے۔

ہم کے ٹو کے گھر بیٹھے رہے۔ ہماری موجودگی میں ہی وہ گیا اور سارا کام خوش اسلوبی سے کر کے واپس آگیا۔ اس نے بس ایک اضافی کام کیا تھا اور وہ یہ کہ جب نائیکہ نے پوچھا کہ لڑکیوں کو بُک کروانے والا اصل بندہ کون ہے تو ساجے نے یونہی کہہ دیا کہ قلعہ والا گاؤں کا

بندہ ہے۔ساجی کی بس یونہی کہی ہوئی یہ بات آگے چل کر ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوئی۔ہم نے دوپہر کا کھانا کے ٹو کے ساتھ کھایا اور واپس آگئے۔مجھے پوری امید تھی کہ پلان پوری طرح کامیاب رہے گا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں اور تیمور گھوڑیوں پر سوار مناواں گاؤں پہنچ گئے۔کڑاکے کی سردی تھی۔شام ہوتے ہی دُھند پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔ہم نے گرم چادروں کی بکلیں اس طرح مار رکھی تھیں کہ چہرے بھی چادروں میں چھپ گئے تھے۔ہم دونوں کے پاس بھرے ہوئے پستول تھے۔اس کے علاوہ تیمور کے پاس کپڑے کا ایک چھوٹا سا تھیلا بھی تھا۔ہم نے گھوڑیاں، گاؤں کی آبادی سے باہر ہی درختوں میں باندھ دیں۔۔۔۔حنیف اور شریف کے گھر کا جائزہ ہم ایک دو دن پہلے ہی لے چکے تھے۔گھر کا احاطہ کافی کھلا تھا۔چار دیواری بھی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ہم بڑی احتیاط کے ساتھ پچھواڑے کی طرف سے گھر میں داخل ہوگئے۔احاطے کی ایک طرف چھپر تھے جن کے نیچے بھینسیں اور ایک دو بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ایک بھینس عجیب انداز میں ڈکرا رہی تھی۔شاید اسے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ایک آدھ دن میں بچہ ہونے والا تھا۔احاطے میں مکمل تاریکی تھی۔بس ایک دو کمروں کے دروازوں میں سے مدھم روشنی باہر آتی تھی۔

ایک عورت تیز قدموں سے باہر نکلی۔اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی بالٹی تھی اور وہ اس میں ہاتھ چلاتی ہوئی آرہی تھی۔وہ اس خطرے سے بے خبر تھی جو ہم دونوں کی شکل میں تھا اور ایک تاریک کونے میں چھپا ہوا تھا۔"یہ نوکرانی ہے۔" تیمور نے جواں سال عورت کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

اس نے چھوٹی بالٹی ڈکرانے والی بھینس کے سامنے رکھی۔شاید چارے میں کوئی دوائی وغیرہ ملائی گئی تھی۔اس نے اپنی روانی میں بھینس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔"نی کیہہ رولا پایا ہوا ای۔اس ویلے تے تہانوں سنڈے دے سوا کچھ نظر ہی نئیں آندا۔"

یہی وقت تھا جب میں نے لپک کر نوکرانی کو دبوچ لیا۔میری چوڑی ہتھیلی نے اس کے منہ کو اتنے اچھے طریقے سے دبایا تھا کہ وہ بس گھٹی گھٹی سی آوازیں نکال پائی تھی۔اس کا گرم گداز جسم پوری شدت سے میری بانہوں میں مچلا لیکن پھر میری سرسراتی سرگوشی نے اسے ساکت کر دیا تھا۔"یہ دیکھ! میرے ہاتھوں میں پستول ہے۔" میں نے کہا۔"اگر شور مچائے

گی تو اسی جگہ ڈھیر کر دوں گا۔ چپ رہے گی تو تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ ذرا دیر میں چلے جائیں گے۔"

نوکرانی کی گھگی بندھ گئی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ پوری طرح ڈر گئی ہے اور ہدایت کے مطابق عمل کرے گی تو میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹالیا۔ "گھر میں اور کون کون ہے؟' میں نے پستول اس کی گردن پر رکھے رکھے مدھم آواز میں پوچھا۔

اس نے دہشت سے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "خالہ جی اور چھوٹی باجی۔ بب۔۔۔۔۔ بس دونوں ہیں۔" اس کے ساتھ ہی وہ منت ترلا کرنے لگی کہ ہم اسے کچھ نہ کہیں۔

یہ صورتِ حال ہماری توقع کے عین مطابق تھی۔ گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ وہ ڈیرے پر موج میلے میں مصروف ہو گئے تھے۔

میں نے تیمور کو اشارہ کیا۔ وہ نوکرانی کو پستول کے ڈراوے سے احاطے کے ایک کمرے میں لے گیا۔ نوکرانی نے جس کو خالہ کہا تھا وہ یقیناً مکھاں کی ماں تھی اور باجی مکھاں خود تھی۔ دونوں جس کمرے میں موجود تھیں، وہاں دروازے کی درزوں سے مدھم روشنی باہر آرہی تھی۔ میرے سینے میں آگ سی بھڑک رہی تھی۔ پاشا جیسے بدفطرت اور عیار لوگوں

کے لیے میں ایسی ہی آگ محسوس کرتا ہوں اور پھر پاشا والے واقعے کا تعلق والی جی اور بلقیس سے تھا۔ اور ان دونوں کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میرے ذہن میں ابھی تک والی جی کی وہ اتری ہوئی کلائی موجود تھی جسے انہوں نے کئی ہفتے اپنی چادر کے نیچے چھپائے رکھا تھا۔ اس کلائی کو اپنے منہ زور جھٹکے سے زخمی کرنے والا موکھل پاشا ہی تھا اور اب جو کچھ وہ سیدھی سادی ثمینہ کے ساتھ کر رہا تھا، وہ بھی قابلِ معافی نہیں تھا۔

میں نے کمرے کے بند دروازے کو تھپتھپایا تو وہ کھل گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ مکھاں کی ماں ہو گی مگر وہ مکھاں خود تھی۔ میرا منہ سر چادر کے ڈھاٹے میں چھپا ہوا تھا۔ مکھاں نے مجھے پہچاننے کی کوشش کی۔ "کون ہے؟" اس نے بوجھل آواز میں پوچھا۔

میں نے تیزی سے اندر گھس کر اسے دبوچ لیا۔ وہ صرف ایک بار گھٹی گھٹی آواز میں چلا سکی۔ پھر میں نے اس کا منہ پوری طاقت سے ڈھانپ لیا۔ وہ خاصی لمبی تڑنگی تھی اور اس کے جسم میں اتھری گھوڑی جیسی طاقت تھی۔ اسے سنبھالنے میں مجھے اپنی پوری طاقت صرف کرنی پڑی۔ بیس تیس سیکنڈ گزرنے کے باوجود جب اس کی مزاحمت کم نہ ہوئی تو میں نے اس کے کان سے ذرا اوپر پستول کے دستے سے ضرب لگائی۔ وہ ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ کمرے کے

اندر سے چرس کی بُو آ رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کمرے میں اکیلی ہے۔۔۔۔۔ لیکن پھر یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ میں نے ذرا دھیان سے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ قریبی چارپائی پر بھی لحاف موجود تھا اور لحاف کے نیچے بھی کوئی موجود تھا۔

میں مکھاں کے لمبے تڑنگے جسم کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ یہ خالی تھا اور یہاں بھی لالٹین کی روشنی موجود تھی۔ کنپٹی پر لگنے والی چوٹ مکھاں کے لیے توقع سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوئی تھی۔ وہ ایک دم سے نڈھال ہو گئی تھی۔

صرف دس منٹ کے بعد کمرے کا نقشہ یہ تھا کہ مکھاں کے دونوں ہاتھ اور پاؤں نائیلون کی رسی سے بندھے ہوئے تھے اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ وہ غوں غاں کی مدھم آوازیں نکال رہی تھی۔ لگتا تھا، مجھے حسبِ توفیق گالیاں دے رہی ہے۔ اس کے بال بکھر چکے تھے اور جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی نہیں تھا۔

قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ مکھاں کی اُدھیڑ عمر ماسی ساتھ والے کمرے میں استراحت کر رہی تھی اور اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ وہ حقہ پیتی تھی اور چلم میں چرس ملا کر رکھتی تھی۔ اب بھی وہ چرس کے ہلارے میں تھی۔۔۔۔۔ مجھے

نہیں معلوم کہ پڑھنے والے اس صورتِ حال کو کس انداز سے لیں گے۔ بہر حال، میں کچھ بھی چھپا نہیں رہا ہوں۔ آج اتنے برس بعد سوچتا ہوں کہ شاید میرا طریقہ غلط تھا۔۔۔۔۔ میں برائی کو برائی سے ختم کرنے کی خطرناک کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ لوگ اپنی سفاکی اور اپنے ٹیڑھے پن میں اتنا آگے جا چکے ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ غلط طریقہ اختیار کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔

تیمور اپنے لوڈڈ پستول کے ساتھ نوکرانی پروین کے پاس موجود تھا۔ اس کی نگرانی کے ساتھ ساتھ تیمور نے باہر کے دروازے پر بھی نظر رکھی ہوئی تھی۔ اگر کوئی آ جاتا اور ہم خود کو خطرے میں محسوس کرتے تو آسانی کے ساتھ گھر کی پچھلی دیوار پھاند کر فرار ہو سکتے تھے۔۔۔۔۔ فی الوقت ہم اس چار دیواری میں پوری طرح حاوی تھے۔ اس بند کمرے میں بندھی ہوئی لاچار مکھاں کے ساتھ کچھ بھی کیا جا سکتا تھا مگر ایسی کوئی بات دور دور تک میرے ذہن میں نہیں تھی۔ میں صرف ایک کام کرنا چاہتا تھا۔ میں نے تیمور والا تھیلا کھولا۔ اس میں دو ٹارچوں اور پستول کے دو فالتو میگزینوں کے علاوہ ایک کیمرہ بھی موجود تھا۔ کیمرے کے ساتھ فلیش گن لگی ہوئی تھی۔ میں نے صرف تین چار منٹ کے اندر مکھاں کی دس

پندرہ تصویریں کھینچ لیں۔اس کے بعد میں نے اس کے جسم پر ایک لحاف پھینکا اور باہر نکل آیا۔ہماری یہ ساری کاروائی بہ مشکل 30 منٹ میں مکمل ہو گئی تھی۔نوکرانی پروین کو پوری طرح ڈرا دھمکا کر ہم نے ایک پچھلے کمرے میں بند کر دیا اور جس طرح گھر میں داخل ہوئے تھے،اسی طرح باہر نکل آئے۔کچھ دیر بعد جب ہم حنیف اور شریف ڈپو والا کے ڈیرے کے نزدیک سے گزرے تو وہاں روشنی نظر آئی اور چھنا چھن کی مدھم آوازیں بھی سنائی دیں۔طوائفیں اپنے کام میں مصروف تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات کے دو بج چکے تھے۔میں اور تیمور جاگ رہے تھے۔تیمور میرے ہی کمرے میں تھا۔ہم پوری طرح الرٹ تھے۔تیمور بولا۔"لگتا ہے کہ صبح تک کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔یہ تو پکی بات ہے کہ موکھل پاشا کا دھیان ہماری طرف ہی جانا ہے۔ہم نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ہے۔اب دیکھیں،پتھر کا جواب کس شکل میں آتا ہے۔"

"جس شکل میں بھی آیا، نمٹ لیں گے۔"میں نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"ایک بات میرے دماغ میں آ رہی ہے۔"تیمور نے کہا۔"کہیں موکھل پاشا کے غصے کا دریا اماں دلشاد کے گھر کی طرف نہ چل پڑے۔"

"وہاں کا انتظام میں نے کر دیا ہے۔پنڈ کے نمبردار کی حویلی اماں دلشاد کے گھر کے پاس ہی ہے۔میں نے نمبردار سلطان کو بتا دیا ہے کہ اماں دلشاد اور اس کی بیٹیوں کو موکھل پاشا کی طرف سے خطرہ ہو سکتا ہے۔وہ چوکس ہو گیا ہے۔میں نے باگو کے ساتھ تین بندوں کو بھی نمبردار کی حویلی میں بھیج دیا ہے۔"

"اگر تم کہو تو میں بھی چلا جاؤں؟"

"نہیں، تمہاری ضرورت یہاں زیادہ ہے۔اگر تم کہتے ہو تو صبح دو بندے اور بھیج دوں گا۔"

میں نے رونق علی اور نصراللہ سمیت کسی شخص کو اصل بات نہیں بتائی تھی لیکن سارے مسلح بندوں کو چوکس رکھا ہوا تھا۔میں نے انہیں بتایا تھا کہ موکھلوں کی طرف سے شرارت کا خطرہ ہے۔

رات خیریت سے کٹ گئی۔ صبح سویرے چودھری عزیز دندناتا ہوا میرے کمرے میں آ گیا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے بھئی۔۔۔۔۔ بندوں کو کیوں سولی پر ٹانگا ہوا ہے؟ وہ کہہ رہے ہیں کہ موکھلوں کی طرف سے چڑھائی کا خطرہ ہے۔"

"ہمیں ہوشیار رہنا چاہیئے جی۔ آج کل چھوٹا اور وڈا موکھل بڑی پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ پتا چلا ہے کہ کل رات کچھ اسلحہ وغیرہ بھی ایک گڈی میں چھپا کر لایا گیا ہے۔۔۔۔۔ پرسوں سارا دن پرانے اسلحے کی بھی صفائی ہوتی رہی ہے۔" میں نے بات بنائی۔

"اسلحے کی صفائی تو ہم بھی دو جے ہفتے کرتے ہیں۔۔۔۔۔ تو کیا ہم نے بھی موکھلوں پر ہلا بولنا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ یا پھر کوئی اور بات ہے جو تم چھپا رہے ہو؟"

"آپ سے کیا چھپا سکتا ہوں جی۔"

"بہت کچھ چھپا سکتے ہو۔۔۔۔۔ اور چھپاتے ہو۔" چودھری عزیز کے لہجے میں زہر داخل ہو گیا تھا۔ شاید اس کا دھیان پچھلے واقعات کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نے اپنے بڑھتے ہوئے طیش کو بمشکل سنبھالا اور بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد انٹرکام پر والی جی نے بھی بات کی۔ میں نے ان کے سامنے بھی بندوں کی تیاری کے بارے میں یہی وضاحت کی جو چودھری

عزیز کے سامنے کی تھی۔۔۔۔۔ بالکل غیر متوقع اور حیرت انگیز طور پر سارا دن بھی کسی ہلچل کے بغیر گزر گیا۔

اب دو ہی باتیں ہو سکتی تھیں۔۔۔۔۔ یا تو اس واردات کے سلسلے میں موکھل پاشا اور اس کے دونوں ماموؤں وغیرہ کا دھیان کسی اور طرف چلا گیا تھا یا پھر وہ کوئی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

ماحول میں وہی تناؤ تھا جو کسی خطرے کے انتظار کے وقت ہوتا ہے۔ یہ تناؤ مجھے پسند تھا لیکن اگلے ایک دو دن میں جو حقیقت سامنے آئی، وہ بالکل مختلف تھی۔ اس صورتِ حال کے بارے میں ہم نے بالکل نہیں سوچا تھا۔ اور "صورتِ حال" یہ تھی کہ موکھل پاشا، اس کے دونوں ماموؤں یا کسی دیگر فرد کو اس واردات کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ مطلب یہ کہ گھر کی عورتوں نے اس واقعے کو مکمل طور پر چھپا لیا تھا اور عورتیں بھی تو بس دو ہی تھیں، مکھاں اور ملازمہ پروین! ممانی صاحبہ تو چرس کا سُوٹا لگا کر مردہ بھینس کی طرح پڑی رہی تھی۔

"یار! یہ کیا ہو گیا ہے؟ اینٹ کا جواب پتھر سے تو کیا مٹی کے ڈھیلے سے بھی نہیں آ رہا۔"

"بھئی، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ بعض دفعہ بندہ لڑائی جھگڑوں سے بچنا چاہتا ہے اور لڑائی جھگڑا سر پر چڑھتا ہے۔ کبھی کبھی الٹ ہوتا ہے۔"

چوتھے دن بھی صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ لگتا تھا کہ کہیں کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں نے بندوں کا ریڈ الرٹ ختم کر دیا۔

کیمرا رونق علی کا تھا، میں نے اسے واپس کر دیا تھا مگر فلم کی ریل بہت اچھی طرح سنبھال لی تھی۔ رونق علی کو بھی میں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

تیمور اور ساجے کے ٹوکا ایک یار بیلی ڈسکے میں فوٹو گرافی کی دکان چلاتا تھا۔ اس کے ذریعے ہم پوری رازداری سے اس فلم کو ڈویلپ اور پرنٹ کرا سکتے تھے۔ لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جو کچھ میں نے اب تک کیا تھا، وہ بھی مجبوری کی وجہ سے کیا تھا۔ اب میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ بغیر ضرورت کے تصویریں دھلواؤں۔

ثمینہ کی بڑی بہن شاداں سے میاں جی کے قبرستان میں صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں بدھ کو دوبارہ ملنے کا وعدہ ہوا تھا۔ آج بدھ تھا۔ میں گھوڑی پر راجوال سے نکلا اور عصر سے ذرا پہلے قبرستان پہنچ گیا۔ شاداں میرے آنے سے پہلے ہی قبرستان میں موجود

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تھی۔ پچھلی بار کی طرح وہ آج بھی اپنی بڑی بہن کی قبر پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ ساتھ والی پکی قبر کے سرہانے میں کھڑا ہو گیا۔ اس فاتحہ خوانی کے بہانے ہم نے مختصر بات چیت کر لی۔

آج شاداں معمول سے زیادہ دکھی نظر آ رہی تھی۔ اس کی شادی میں صرف چھ ہفتے رہ گئے تھے۔ موکھل پاشا منہ زوری کر رہا تھا۔ شاداں نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔ ثمینہ مجھے کچھ نہیں بتاتی لیکن مجھے اتنا پتا ہے، اس کتے نے اسے بھی میری طرح برباد کر کے چھوڑنا ہے۔"

"کوئی نئی بات ہوئی ہے؟" میں نے قبر کی طرف متوجہ رہتے ہوئے پوچھا۔

"وہ رات کو پھر جانا چاہتی تھی۔ پر میں جاگتی رہی۔ رات پچھلے پہر میری اکھ لگ گئی۔ ثمینہ نکل گئی۔ باہر کے دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے ہی لگایا تھا۔ وہ میرے تکیے کے نیچے چابی ڈھونڈتی رہی۔ میں جاگ گئی تو وہ رونے لگی۔ کہنے لگی، آپا مجھے جانے دو۔ نہیں تو ہم سارے برباد ہو جائیں گے۔ میں نے کہا برباد تو ویسے بھی ہو جائیں گے۔ میں تمہیں اس کتے کے پاس نہیں جانے دوں گی۔ اس نے میرے سامنے ہتھ جوڑ دیے اور بولی۔ آپا! وہ کتا ہے تو اسے پھاڑ کھانے دو مجھے۔ باقی سارے تو بچ جائیں گے۔ اس نے مجھ سے آخری وعدہ کیا ہے

کہ وہ سب کچھ واپس کر دے گا۔۔۔۔اور ہم دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھیں گے۔۔۔۔اس نے وعدہ کیا ہے۔ میں نے اسے چپیڑ ماری اور چپ ہو جانے کے لیے کہا۔ وہ صبح سے رو رہی ہے۔ وہ جانا چاہتی ہے۔ مجھے نہیں لگتا، میں اسے زیادہ دیر تک روک سکوں گی۔ پاشے نے اسے بہت ڈرایا ہوا ہے سالار جی !"

میں نے شاداں کو تسلی دی اور اسے بتایا کہ اس کے لیے خوشخبری ہے۔ کل تک موکھل پاشا سے ساری بات طے ہو جائے گی۔ وہ واقعی تمہیں کبھی دوبارہ اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔

وہ تفصیل پوچھتی رہی مگر میں نے ٹال دیا۔ میں نے کہا کہ وہ ثمینہ کو بھی جا کر تسلی دے۔

شام پور سے واپس آتے ہی میں نے فلم کی ریل نکالی اور اسے تیمور کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "ڈسکے جاؤ اور اسے ڈویلپ کرا لو۔"

"یعنی تصویریں بنوالوں؟"

"نہیں یار! بس نیگٹیو بنواؤ۔ صرف دو تصویریں پرنٹ کروانی ہیں۔ ان میں لڑکی کا بس چہرہ ہی آیا ہے۔ اور سارا کام پوری ذمہ داری سے ہونا چاہیئے۔"

تیمور سب کچھ سمجھ کر چلا گیا اور رات گیارہ بجے کے قریب واپس آیا۔ اس نے سارا کام ٹھیک کیا تھا۔ ساری فلم کے نیگٹیو بن گئے تھے لیکن تصویریں دو ہی پرنٹ کروائی تھیں۔ ایک تصویر میں مکھاں کا صرف چہرہ نظر آتا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں خوف آمیز طیش سے کھلی تھیں۔ چارپائی، تکیہ اور گندم رکھنے والے بڑولے کا کچھ حصہ بھی نظر آتا تھا۔ دوسری تصویر بھی کلوز اپ ہی تھی۔ تاہم اس میں وہ گردن اور کندھوں تک دکھائی دیتی تھی۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ بے لباس ہے۔ اس کی آنکھیں ہلکی بھوری تھیں اور اپنے سوتیلے بھائی ہی کی طرح اس کے چہرے پر بھی ایک خاص قسم کی کرختگی پائی جاتی تھی۔

اگلے روز صبح نو بجے کے لگ بھگ چھوٹی نہر کی پُلی پر میری اور پاشے کی ایک اور ملاقات ہوئی۔ میں نے ایک بندے کے ہاتھ اسے پیغام بھیجا تھا اور کہا تھا کہ وہ بغیر ہتھیار اور بغیر کسی کارندے کے دس بجے تک پُلی پر پہنچ جائے۔ میں بھی اکیلا اور بغیر ہتھیار کے آؤں گا، ایک بہت ضروری بات ہے، اگر یہ بات نہ ہوئی تو اس کا نقصان ہو گا۔

اور وہ آ گیا تھا۔

وہ نہتا نہیں تھا۔اس کی کلف لگی سفید قمیض کا ابھار بتا رہا تھا کہ وہ پستول لگا کر آیا ہے۔مجھے پہلے سے معلوم تھا۔پستول میں نے بھی لگایا ہوا تھا۔اس کے علاوہ بھی میرے ذہن میں پاشے کے حوالے سے ایک شک موجود تھا۔پرالی کے بہت بڑے ڈھیر کے پیچھے کیکر اور جنتر کی جھاڑیوں میں ہم آمنے سامنے کھڑے تھے۔دسمبر کی دھند ابھی پوری طرح چھٹی نہیں تھی۔دھند کے پیچھے سورج کا چہرہ بیمار اور کمزور تھا۔جھاڑیاں ٹنڈ منڈ تھیں اور گھاس پر کہرا جما ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟"اس نے تنک کر پوچھا۔

"تمہارا کیا اندازہ ہے۔۔۔۔کیا بات ہے؟"

"شاید اپنی اس کچھ لگتی کی تصویریں لینے آئے ہو"۔اس نے نتھنے پھلا کر کہا۔

"نہیں پاشے!آج تصویریں لینے نہیں آیا۔بس یہ کہنے آیا ہوں کہ انہیں بہت زیادہ سنبھال کر رکھنا۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اگر وہ تصویریں تو نے بہت زیادہ سنبھال کر نہ رکھیں تو پھر کچھ تصویریں مجھ سے بھی سنبھالی نہ جائیں گی۔"

"کیا کہنا چاہتا ہے؟"وہ چونکا

"میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے یہ سب کچھ کہنا پڑے۔لیکن پاشے!تُو نے بات کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ اس کے سوا چارہ نہیں۔دیکھ پاشے!شیشے کے گھر میں بیٹھ کر پتھر نہیں پھینکے جاتے۔عزت سب کی ایک جیسی ہوتی ہے لیکن تُو نے ایک غریب گھر کی عزت کو کھلونا بنایا ہوا ہے۔اب میں تجھے اس کھلونے سے اور نہیں کھیلنے دوں گا۔"

"جو بکنا ہے صاف صاف بک۔"پاشے کا چہرہ انگارہ ہو گیا اور مٹھیاں بھنچ گئیں۔

میں نے کہا۔"ایک تیری کچھ لگتی کی تصویریں میرے پاس بھی آگئی ہیں۔یہ چودہ پندرہ تصویریں ہیں۔ان میں سے دو تصویریں میں تجھے دکھا رہا ہوں۔باقی میرے پاس ہیں اور بالکل۔۔۔۔ہاں،بالکل محفوظ رہیں گی۔مگر اس وقت تک جب تک تیرے پاس والی تصویریں محفوظ رہیں گی۔"

"اوئے!کس کی تصویروں کی بات کر رہا ہے؟"

"گھر جا کر دیکھ لینا۔ خاکی رنگ کے لفافے میں ہیں۔ ڈاکیا کل تک پہنچا دے گا تجھے۔"

"اوئے۔۔۔۔اوئے!" پاشے نے بھڑک کر میرا گریبان تھام لیا۔ میں نے بھی اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اس نے اندھا دھند زور لگایا۔ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے ایک جھٹکا مارا تو وہ لڑکھڑا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پورے زور سے
چلایا۔ "راجے۔۔۔۔راجے۔۔۔۔جیرے !"

میرا اشک درست تھا، وہ اکیلا نہیں تھا۔ دور چارے کے کھیتوں میں بہ ظاہر یونہی کھڑے دو بندے بھاگے ہوئے ہماری طرف آئے۔ انہوں نے چادروں کے نیچے سے رائفلیں نکال لی تھیں۔

میں پاشے کی اس کمینگی کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے بھی آواز دی۔ "ملتانی، شوکے، مختارے!" میرے بندے بھی کماد کے ایک کھیت میں سے نکل آئے۔ اسلحہ ان کے ہاتھ میں بھی تھا۔ بہرحال، میں انہیں پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ وہ گولی چلانے میں پہل نہیں کریں گے۔

میں نے کہا۔ "پاشے! تیر جیسے کتے کی بات کا اعتبار کرنا، اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے۔ تُو گرم توے پر بھی پچھا رگڑے تو میں بھروسا نہ کروں۔"

"میں تیرے ٹوٹے کر دوں گا۔" وہ پھنکارا۔

"یہ شوق بھی جب چاہے پورا کر لینا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ مجھے خون خوار نظروں سے گھورتا رہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ پھر اس نے میرا گریبان چھوڑ کے اپنا گریبان چھڑایا اور پھنکارا۔ "مجھے لگتا ہے خاورے! ۔۔۔۔ تیرا آخری ویلا آگیا ہے۔ تو نہیں بچے گا اب۔۔۔۔ تو نہیں بچے گا۔"

اس نے اپنے بندوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور پھر انہیں اپنے ساتھ لیتا ہوا تند بگولے کی طرح اپنے تانگے کی طرف بڑھ گیا۔

اگلے چوبیس گھنٹوں میں زبردست تناؤ رہا۔ میں نے اپنے طور پر اماں دلشاد کے گھر کی حفاظت کا انتظام کر دیا تھا اور یہ تسلی بخش انتظام تھا۔ موکھلوں کے پنڈ گورا کے میں چاچے عسکری کا چھوڑا ہوا خاص مخبر رملی موجود تھا۔ یہ ذات کا نائی تھا اور راجوال سے اس کی وفاداری پکی تھی۔ رملی نے اگلے روز شام میں آکر مجھے گورا کے کے حالات بتائے۔ اس نے کہا کہ کل

دوپہر موکھل پاشا ایک بندے کے ساتھ ڈاک خانے گیا تھا اور وہاں سے کوئی رجسٹری خط لے کر آیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے کالے ٹریکٹر پر بیٹھ کر اپنے نانکے پنڈ مناواں گیا تھا۔ وہاں اس کی مترئی بہن (سوتیلی بہن) رہتی ہے۔ شاید وہ اس سے ملنے گیا تھا۔ واپس آیا تو وہ بہت سخت تپا ہوا تھا۔ اس نے بے تحاشا شراب پی۔ اس نے شراب پلانے والے لڑکے کو بھی کسی بات پر بُری طرح مارا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈالنے کا کہا۔ پندرہ وی گھڑ سوار تیار ہو گئے لیکن پھر رات گیارہ بجے کے قریب اس نے ارادہ بدل دیا۔ ایک بار پھر شراب پینے لگا اور رات گئے ایک نوکرانی کو جو اس کی رکھیل بھی ہے، لے کر کمرے میں گھس گیا۔

"اب وہ کیا کر رہا ہے؟"

رملی بولا۔ "میں پیشی کی بانگ پر وہاں سے نکلا تھا۔ وہ اس وقت بھی شراب پی رہا تھا۔ اس نے پالتو شیر کو بھی احاطے میں کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ پتا نہیں اس کے کیا ارادے ہیں۔"

اس رات بھی ہم بالکل چوکس رہے۔ مچھلی فارم پر بھی میں نے بندے بھیج دیئے تھے۔ ڈر تھا کہ موکھل اس طرف سے کوئی شرارت نہ کریں۔ زمین کا وہ ٹکڑا ہر وقت ان کی آنکھوں میں

کانٹا بن کر چبھتا تھا۔ رات کے وقت میں نے چند بندوں کے ساتھ تیمور اور نصراللہ کو بھی وہاں بھیج دیا۔ سب بندوں کو ہدایت یہی تھی کہ جھگڑے کی صورت میں وہ اسلحہ استعمال کرنے میں پہل نہیں کریں گے لیکن اگر دوسری طرف سے کاروائی ہوئی تو ڈٹ کر جواب دیں گے۔ اس اچانک بڑھ جانے والی ٹینشن کی اصل وجہ کسی کو پتا نہیں تھی، اس لیے نصراللہ سمیت دیگر ساتھی کچھ حیران بھی تھے۔

سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ظلم کرنے والے سے جتنا ڈرا جائے، اس کا جرم اتنا کی پھلتا پھولتا ہے۔۔۔۔ دو تین دن گزر گئے لیکن موکھل پاشا کی طرف سے کوئی جوابی کاروائی نہیں ہوئی۔ رات کو میرے کمرے میں بیٹھے ہوئے تیمور نے کہا۔

"لگتا ہے، شیر ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔"

"شیر نہیں، کاغذی شیر کہو بلکہ گھگھو گھوڑا۔ ایسے گھگھو گھوڑے ڈرنے والوں کو ڈراتے ہیں اور کھڑے رہنے والوں کے سامنے مانو بلی بن جاتے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، بات پاشے کی سمجھ میں آ گئی ہے؟"

"بالکل آگئی ہے۔مجھے یقین ہے کہ اس معاملے کو ٹھپ کرنے میں ہی اسے بہتری نظر آئے گی۔اگر تماشا لگائے گا تو پھر زیادہ مٹی اسی کنجر کے سر پر پڑے گی۔سوتیلی ہے لیکن ہے تو آخر بہن۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، بہن نے سب کچھ بتا دیا ہو گا؟"

"ظاہر ہے جب پاشے نے تصویریں دکھائی ہوں گی تو اسے بتانا ہی پڑا ہو گا کہ دودھاٹا پوشوں نے کاروائی ڈالی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ پھر بات سے بات نکلی ہو اور موکھلوں کو پتا چلا ہو کہ واردات اس لیے ہوئی کہ اس رات گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔اور مرد اس لیے نہیں تھا کہ ڈیرے پر کنجریاں ٹھمکے لگا رہی تھیں اور ان کو بستروں میں گھسیٹنے کا پروگرام بن رہا تھا۔اور کنجریوں کو بلایا کس نے تھا۔کیا پتا ان کنجریوں کی بے وجہ شامت آجائے۔ان سے تفتیشیں شروع ہو جائیں۔"

"ان کا کسی نے کیا بگاڑ لینا ہے۔ان کو تو رشوت دینے کے لیے پیسوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔" میں نے کہا تو تیمور نے قہقہہ لگایا۔

"لیکن ایک بات پکی ہے خاور! یہ سب کچھ پاشے کو آسانی سے ہضم نہیں ہونا۔اس نے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہے۔آج نہیں تو کل۔۔۔۔۔کل نہیں تو دو چار مہینے بعد۔"

"پر اسے یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ اس کی ہر اینٹ کا جواب پتھر سے آئے گا۔"

اسی دوران میں رونق علی توند مٹکاتا ہوا آگیا۔"یار خاورے! یہ میری نبض تو دیکھنا، کچھ تیز نہیں چل رہی؟" اس نے بازو میری طرف بڑھایا۔

"رونق بھائی! اب میں سالار ہوں۔میرے ٹائم کی قیمت ہے۔" میں نے اندازِ بے نیازی سے کہا۔

"میں مکا مار کر ناک کا نکوڑا بنا دیا کرتا ہوں۔یہ ساری تیری دی ہوئی ٹین شین ہے۔دن بہ دن موکھلوں کے ساتھ ہمارا پنگا بڑھتا جا رہا ہے۔ہر چوتھے دن کوئی چکر شکر چلا دیتا ہے۔۔۔۔۔تو اب وہاں پلی پر کس لیے لڑائی ہوئی تھی؟"

"بس وہی ہمارے قصبے میں گندا پانی چھوڑنے والی بات پر گرما گرمی ہوئی تھی۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"اچھا، تُو میری نبض دیکھ۔۔۔۔۔او نگی بونگی نہ مار۔"

میں نے نبض دیکھی۔ واقعی ٹھکا ٹھک چل رہی تھی۔

"بس رونق بھائی! آپ کے سپارے شپارے پڑھنے کا وقت آگیا ہے۔" میں نے رونق کے ہی انداز میں کہا۔

"میں مذاق شذاق نہیں کر رہا۔ میری طبیعت واقعی گڑبڑ ہے۔ دراصل پریشانی سے میری بھوک شوک بڑھ جاتی ہے۔ میں زیادہ کھالیتا ہوں۔ پھر یہ کنپٹیوں میں کھٹا کھٹ شروع ہو جاتی ہے۔"

"لیکن اگر موکھلوں کے ساتھ ہماری ٹینشن نہیں ہو گی تو آپ خوش ہو جائیں گے۔ خوشی میں آپ کی بھوک پھر بڑھ جائے گی اور پھر ٹھکا ٹھک، پھر بلڈ پریشر۔"

"یار! وہ خوشی کا بلڈ پریشر اتنی تکلیف نہیں دیتا۔"

"چلو یہ نئی ایجاد ہو گئی۔ خوشی کا بلڈ پریشر اور غمی کا بلڈ پریشر۔ دیکھو رونق بھائی! آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جائیں دو پلیٹ کشمش والا حلوہ کھائیں اور لمبی تان کر

سو جائیں۔ جب تک میں یہاں ہوں اور چودھری عزیز مجھے نکالنے میں ناکام ہیں، آپ کو خیر ہی خیر ہے۔"

"بھائی عزیز کا ذکر کیوں کر رہے ہو؟ کوئی نئی بات شات ہوئی ہے کیا؟"

"نئی تو نہیں لیکن ایک پرانی کا پتا چلا ہے۔"

"کھل کر بتاؤ۔"

"آپ کو پتا ہی ہے میری ماں مجھ سے کتنا غصہ ہوئی تھی بلکہ اب بھی غصے ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں یہ نوکری چھوڑ دوں۔ ماں کو الٹی سیدھی بتانے اور بھڑکانے والی فیروزاں ہی تھی۔ اور آپ کو پتا ہی ہے، فیروزاں چودھری عزیز کے اشاروں پر چلتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے چودھری کے کہنے پر ہی یہ سب کیا تھا۔"

کچھ دیر تک اس حوالے سے ہمارے درمیان بات ہوئی۔ اس گفتگو نے رونق کو مزید غم زدہ کر دیا۔ مزید غم زدہ ہونے کا مطلب تھا مزید چاول، قورمہ اور کشمش والا حلوہ۔۔۔۔۔ اور وہ ان تینوں چیزوں کو عبرت ناک عذاب سے دوچار کرنے کے لیے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد تیمور بھی چلا گیا۔

میں اپنے کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ میں اپنے پہلے والے کمرے میں ہی تھا۔ حالانکہ میرے سالار بننے کے بعد والی جی نے دو دفعہ پیشکش کی تھی کہ میں کسی بہتر کمرے میں منتقل ہو جاؤں۔ میں یہ کمرہ کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ یہ میرا کمرہ تھا۔۔۔۔۔وہ کمرہ جس میں، میں صرف اور صرف انتظار کرتا تھا۔ بمبوکاٹ سے ابھرنے والی آواز کا انتظار! لیکن وہ آواز کہیں نہیں تھی۔ بمبوکاٹ خاموش تھا۔ وہ مردہ ہو چکا تھا اور لگتا تھا کہ اب اس میں کبھی جان نہیں پڑے گی۔ بیگم بلقیس کو اوجھل ہوئے اب قریباً دس ماہ ہونے والے تھے۔ انہوں نے اپنی طرف آنے والے سب راستے یکسر بند کر دیئے تھے۔ اور مجھے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ جدائی کتنی طویل ہے۔ اس سے پہلے بھی دو چار مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ ہم نے آٹھ دس دن یا دو تین ہفتوں کے لیے رابطہ بند رکھا تھا۔۔۔۔ لیکن یہ بندش طے شدہ ہوتی تھی۔ میں ایک ایک دن گن کر کاٹتا تھا اور آخر وہ دن آجاتا تھا جب بندش کھل جاتی تھی۔ بیگم بلقیس کی آواز میرے کانوں کے راستے میرے لہو میں زندگی کو بحال کر دیتی تھی۔ لیکن اس مرتبہ تو پتا ہی نہیں تھا کہ کب تک چپ رہنا ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔ کہیں چپ ہی تو نہیں رہنا؟ اور حقیقت یہ ہے کہ میرے اندر بھی انا نے پَر پھیلا لیے تھے۔۔۔۔ اگر وہ مجھ سے دور رہنا چاہتی ہیں تو

ٹھیک ہے، وہ ایسا کر لیں۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب بھی رابطہ ہو گا، ان کی طرف سے ہی ہو گا۔ میں اپنی طرف سے کوئی کوشش کرنا نہیں چاہتا تھا اور میں اس کا مجاز بھی نہیں تھا۔

دروازے کو اندر سے کنڈی لگانے کے بعد میں کسی موہوم امید کے سہارے بمبوکاٹ یعنی انٹرکام کو مقفل الماری سے نکالتا تھا اور سامنے رکھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ میرے کان اس انتظار میں رہتے تھے کہ اس انٹرکام پر ایک بیل ہو اور پھر خاموشی چھا جائے۔ لیکن یہ اشارہ جیسے ایک دم کہیں کھو گیا تھا۔ ایک بیل ہونے کے بعد دوسری بیل تک کا وقفہ میرے لیے بڑا جاں گسل ہوتا تھا اور جب دوسری بیل ہو جاتی تھی تو سینے میں ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی اور درد کی یہ لہر ہر روز کئی بار دوڑتی تھی۔

اس روز بھی میں نے چوبی الماری کھولی لیکن انٹرکام کو دیکھ ایک دم چونک گیا۔ انٹرکام اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ وہ ہوا میں جھول رہا تھا۔ اس کے تار کو جیسے منشی منظور کے کمرے سے کھینچا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ میں نے الماری مقفل کی اور تار کا جائزہ لیا۔ تار چھت کی سرکیوں میں چھپا کر یہاں لایا گیا تھا۔۔۔۔ اور بالکل اوجھل تھا۔ سرکیوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ تار کو واقعی کھینچا گیا ہے۔ اسی دوران میں

دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ یہ منشی منظور تھا۔ میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں نے دروازہ کھولا۔ منشی منظور اپنے موٹے شیشوں کی عینک چمکاتا ہوا اندر آ گیا۔

"کیا حال ہے خاورے؟" اس نے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ "منجھی پر بیٹھو چاچا۔"

"نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دھیان سے کمرے کا جائزہ لے رہا ہے۔ جب میں اسے سگریٹ پیش کرنے کے لیے الماری کی طرف بڑھا تو مجھے لگا کہ وہ چھت پر نظر دوڑا رہا ہے۔ یقینی بات تھی کہ اسے شک ہو چکا ہے۔

میں نے الماری کا تالا کھولا تو وہ بولا۔ "اس الماری میں ایسا کیا ہے جو ہر وقت اس کو تالا ٹھوک کر رکھتے ہو؟"

"بس پیسے ہیں تھوڑے سے اور پستول وغیرہ ہوتا ہے۔"

اچانک میں ایک چیز دیکھ کر چونک گیا۔ اس پر پہلے میری نظر نہیں پڑی تھی۔ چھت کی سرکنڈے کی سرکیاں ایک جگہ سے کھسک گئی تھیں اور ان کے اندر سے انٹر کام کا کالا تار صاف دکھائی دیتا تھا جو الماری کے اندر جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ آج ہی ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ منشی منظور نے بھی تار دیکھ لیا ہے۔ یہ صورتِ حال تشویش ناک تھی۔

"لو چاچا! سگریٹ پیو۔ گولڈ لیف ہے، اصلی والا۔"

منشی منظور نے بے دلی سے سگریٹ لیا اور کھڑا ہو گیا۔

"اچھا، صبح پیوں گا حاجت کے ٹائم۔ آسانی رہتی ہے۔"

مجھے منشی منظور کے چہرے پر ایک دبی دبی سی مشکوک کیفیت نظر آئی۔ میں جانتا تھا کہ ماسی فیروزاں کی طرح منشی منظور بھی چودھری عزیز کے قریب ہے۔ در حقیقت چودھری عزیز نے ہی اسے چاچے عسکری والے کمرے میں پکا کرایا تھا۔

ایک دم میرے دل نے پکار کر کہا۔ "خاور! اگر منشی منظور یہاں سے چلا گیا تو تھوڑی دیر میں یہ خبر شاید پوری حویلی میں پھیل جائے گی کہ میرے کوارٹر میں بمبو کاٹ قسم کوئی خفیہ شے موجود ہے۔ میں نے منشی منظور کو باہر نکلتے نکلتے روک لیا۔

"چاچا! ایسے تو نہیں۔ دو منٹ تو بیٹھو۔۔۔۔ میں تمہاری ٹانگیں دبا دوں۔"

وہ "نہ نہ" کرتا رہا مگر میں نے اسے چارپائی پر بٹھا دیا اور کمرے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ "یہ کیا کر رہا ہے؟"

"تسلی سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ تجھے باداموں والی دوائی۔۔۔۔ نہیں مٹھائی کھلاتا ہوں۔"

"یار! کوئی زبردستی ہے۔" وہ جھلا کر بولا۔

"اچھا، نہ کھاؤ لیکن بتا تو دو۔"

"کیا بتاؤں؟"

"جو چھپا رہے ہو؟"

"کیا چھپا رہا ہوں؟"

"جو بتا نہیں رہے ہو۔۔۔۔ جو تمہارے دل میں ہے۔"

میں نے چھوٹے موڑھے پر بیٹھے بیٹھے اسے بڑے دھیان سے دیکھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔

"دیکھ۔۔۔۔ تیرے طور اطوار ٹھیک نہیں خاورے۔"

"تیرے بھی تو خراب ہو گئے ہیں چاچا۔ دیکھ، میں نے تیری خدمت میں کوئی کسر چھوڑی؟ تُو میری ہی مخبریوں میں لگ گیا ہے۔"

"کیسی مخبری؟"

"تجھے پتا ہے۔"

"مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"تجھے پتا ہے۔"

"اچھا پتا ہے۔ کر لے جو کرنا ہے۔۔۔۔ کر لے۔۔۔۔ کر لے۔" وہ ایک دم بھڑک کر بولا اور یکایک اٹھنے کی کوشش کی۔

میں نے اسے پھر کندھوں سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھا دیا۔ وہ سر تا پا غصے سے کانپ رہا تھا۔ موٹے شیشوں کے پیچھے لالچی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہاں، وہ لالچی آنکھیں ہی تھیں۔ منشی منظور صرف پیسے کا یار تھا۔ یقیناً اسے امید تھی کہ چودھری عزیز کے سامنے میرا

راز کھول کر وہ اچھا خاصا انعام حاصل کرے گا۔اور ہو سکتا ہے کہ اس کے بیٹے کی ترقی شرقی بھی ہو جائے۔

"تُو پچھتائے گا۔" منشی منظور پھنکارا۔

"کس خوشی میں؟"

"میں سب کو بتاؤں گا۔ایک ایک کو بتاؤں گا جو کچھ یہاں ہو رہا ہے۔"

"تو سب کو نہیں بتائے گا، صرف ایک کو بتائے گا۔۔۔۔کیونکہ اُسی کو بتانے سے مال تیرے ہاتھ آئے گا۔لیکن میں تجھے یہ سب کچھ نہیں کرنے دوں گا چاچا۔"

"کیا کرلے گا تُو؟"

"میں کچھ نہیں کروں گا، تیرے ہی کھاتے کریں گے۔وہ تیرا سارا کچھا چٹھا مالکوں کے آگے کھول دیں گے۔سیکڑوں کا نہیں ہزاروں کا ہیر پھیر ہے۔اور اب سے نہیں، ڈھائی تین سالوں سے چل رہا ہے۔"

منشی منظور کا تمتمایا ہوا چہرہ ایک دم دھیما پڑ گیا۔

"کک۔۔۔۔۔کیا کہنا چاہتا ہے تُو؟"

"چاچا منشی! تُو یہاں اکیلا ہی پڑھا لکھا نہیں ہے۔کسی اور کو بھی دو اور دو چار کا پتا ہے۔اور تیرے کھاتوں میں بہت سی جگہوں پر دو اور دو چار نہیں ہے۔کہیں تین ہے اور کہیں پانچ۔میں نے سب کچھ دیکھا ہوا ہے۔"

"دیکھ خاورے! تُو بات کو دوجی طرف لے جا رہا ہے۔" منشی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"میں نہیں چاچا، تم لے جا رہے ہو۔"

میں اٹھا۔الماری میں ایسے دو پرانے رجسٹر موجود تھے جن میں سے میں نے منشی منظور کے چند کھلے پکڑے تھے۔میں نے باقاعدہ وہاں نشان لگائے ہوئے تھے۔میں نے یہ رجسٹر منشی منظور کے سامنے کیے اور ایک رجسٹر پر دو تین صفحوں کی نشان دہی کی۔

منشی منظور کا رنگ پیلا پڑ گیا۔اس کا جسم اب بھی لرز رہا تھا لکن اب شاید غصے کی وجہ سے نہیں تھا۔

منشی منظور نے اتنی تیزی سے پینترا بدلا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔اس نے کانپتے ہاتھوں سے بوسیدہ رجسٹر بند کر کے ایک طرف رکھا اور بولا۔"خاور پُتر! میں کوئی تیرا دشمن نہیں ہوں۔نہ ہی میں نے کسی کو بتانا شانا ہے۔میں تو تجھے سمجھانا چاہتا ہوں۔یہ کام۔۔۔۔۔جو تُو کر رہا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔تجھے پتا ہی ہے،ایسی باتیں زیادہ دیر چھپی نہیں رہتیں۔بہت سے لوگوں کو تو اب بھی شک ہے۔جب یہ شک یقین میں بدل جائے گا تو تیرے لیے بڑی مصیبت آئے گی۔"

"جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو میں ڈروں کس بات سے؟"میں نے خود کو بے پرواہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"خیر،یہ بات تو اب تُو نہ کر خاورے۔اگر بمبو کاٹ کی یہ تار چوری چھپے تیرے کمرے میں گئی ہے تو اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔۔۔۔۔اور پھر۔۔۔۔۔"

"دیکھ چاچا!"میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"بیگم جی کے ساتھ خدانخواستہ میرا کوئی "اور" معاملہ نہیں ہے۔بس ہمارے درمیان کبھی کبھی گل بات ہوا کرتی تھی۔اب وہ بھی نہیں ہوتی۔تجھے اس بارے میں زیادہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"میں نے بوسیدہ رجسٹر کو ہاتھ میں ہلاتے ہوئے کہا۔

منشی منظور گھاگ شخص تھا، بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔یہاں بھی کچھ لے اور کچھ دے والا معاملہ تھا۔اگر ایک طرف انٹر کام کا تار تھا تو دوسری طرف وہ بہی کھاتے تھے جن میں گاہے بہ گاہے شدید قسم کی غلطیاں کی گئی تھیں۔کہیں مزدوری اصل سے زیادہ لکھی گئی تھی۔کہیں فصل کی برداشت کا گھپلا تھا۔کہیں آبیانے کو قلم کی مار ماری گئی تھی۔بے شک! یہ بہت بڑی رقمیں تو نہیں تھیں لیکن چوری تو چوری ہوتی ہے۔حویلی کے بہت سے دیگر لوگوں کی طرح منشی منظور کو بھی اب معلوم ہو چکا تھا کہ میں گریجویٹ ہوں۔وہ حساب کتاب میں میرے ساتھ ہرگز متھا نہیں لگا سکتا تھا۔منشی منظور جتنے جوش کے ساتھ میرے کمرے میں آیا تھا، اتنا ہی ٹھنڈا ہو کر واپس گیا تھا۔اب مجھے اس کی طرف سے کوئی ڈر نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چھ سات روز مزید گزر گئے۔ ثمینہ اور موکھل پاشا والا معاملہ بالکل ٹھیک رہا۔ پھر ایک روز جب والی جی صبح سویرے کیکر کی مسواک کرتے ہوئے کھیت کی طویل پگڈنڈی پر چہل قدمی کر رہے تھے، میں نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ میں نے ان پر انکشاف کیا کہ کس طرح پاشے کے ہاتھ شاداں کی کچھ تصویریں آ گئیں اور کس طرح اس نے ان تصویروں کے ذریعے دونوں بہنوں کو اپنے اشاروں پر نچایا۔ والی جی حیرت سے سنتے رہے اور درمیان میں مجھ سے سوالات بھی کرتے رہے۔ پھر میں نے انہیں اپنا وہ طریقہ کار بھی بتا دیا جس کے ذریعے میں نے منہ زور پاشے کے منہ میں لگام ڈالی تھی۔ میں نے پاشے کی سوتیلی بہن مکھاں سے اپنے سلوک کے بارے میں بھی سب کچھ والی جی کے گوش گزار کر دیا۔ روداد کے اس مرحلے پر وہ تھوڑے سے پریشان ہوئے لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ اس واقعے کو پندرہ بیس روز گزر چکے ہیں اور اب سب کچھ کنٹرول میں ہے تو ان کی پریشانی کچھ ماند پڑی۔

بہر حال، وہ آئندہ کے بارے میں پریشان تھے اور تھوڑے سے خفا بھی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے ضرورت سے زیادہ بے خوفی دکھائی ہے اور خطرہ مول لیا ہے۔ وہ بولے۔

"موکھل پاشا اس کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور دے گا۔"

"جواب اور سوال تو شروع ہو چکے ہیں جی۔ یہ تو کُھلی جنگ ہے۔ ہمیں ان حرام زادوں سے لڑنا ہی لڑنا ہے۔ پیچھے ہٹیں گے تو بھی، آگے بڑھیں گے تو بھی۔ اور کیوں نہ آگے بڑھ کر لڑا جائے۔"

یقیناً والی جی کے دل سے آواز آ رہی تھی کہ میری بات سو فیصد درست ہے لیکن ان کی پیشانی پر پسینے کی ہلکی سی نمی بھی دکھائی دینے لگی تھی۔

میں نے پہلی بار ہمت کر کے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ "آپ بالکل پریشان نہ ہوں جی۔ میں ان کو سنبھال لوں گا اور بڑے اچھے طریقے سے سنبھالوں گا۔ یہ میرا سر درد ہے۔"

"بہتر تو یہ ہے کسی طریقے سے دونوں طرف کی تصویریں ضائع کر دی جائیں۔" انہوں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

"مجھے امید ہے کہ یہ بات عنقریب پاشے کی بھی سمجھ میں آجائے گی۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور حویلی کی طرف واپس لوٹتے ہوئے کہا۔"خاور! میں چاہتا ہوں، دلشاد کی دونوں بیٹیوں کی شادی اچھے طریقے سے ہو جائے۔ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہو۔میرا مطلب ہے، پاشا کی طرف سے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔پاشا کی پوشل پر پاؤں رکھنے سے پہلے میں نے اماں دلشاد کے گھر کی حفاظت کا پورا انتظام کر لیا تھا۔وہاں نمبر دار کی حویلی میں ہمارے بندے موجود ہیں۔ہر وقت اماں دلشاد کے گھر پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔"

"دلشاد کو یہ سب پتا ہے؟"

"نہیں جناب! میں جانتا ہوں کہ آپ سے بگڑی ہوئی ہے۔اس کو آپ کی کسی طرح کی مدد قبول نہیں۔میں نے اسے اور اس کی بیٹیوں کو اس بارے میں بے خبر رکھا ہے۔"

والی جی نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"مجھے تمہاری سمجھ بوجھ پر بھروسا ہے۔"

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"جو پچھلی دوا تم لائے تھے،اس سے کچھ کمزوری سی ہوئی تھی۔اب نئی دوا سے ٹھیک ہوں۔مگر تمہارے سنیاسی سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔"

"بس جی،وہ سیلانی روح ہے۔اس سے ملنے کے لیے ہمیں ہی جانا پڑے گا اور پھر اسے ڈھونڈنے کے لیے جنگل خراب ہونا پڑے گا۔آپ کو تکلیف ہو گی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ہم نے درخت ضرور گننے ہیں۔ہمیں آم مل ہی رہے ہیں۔"

آج کل ایک ڈاکٹر صاحب کے مشورے سے ہی وٹامن کی دوا سر بیکس ٹی،والی جی کو پیس کر دے رہا تھا اور معدے کی جلن کے لیے پسی ہوئی جیلوسل چل رہی تھی۔مجھے اچھی طرح معلوم تھا جس دن والی جی کو پتا چل گیا کہ یہ انگریزی دوائیاں ہیں اور ڈاکٹر کے مشورے سے دی جا رہی ہیں تو وہ ان کو اٹھا کر پھینک دیں گے۔اور اگر فرض کریں میرے یا بیگم بلقیس کے مجبور کرنے سے کھائیں گے بھی تو انہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔۔۔۔کیونکہ ان کا یقین ہی نہیں ہے۔

میں اٹھنے لگا تو وہ بولے۔ "بلقیس شادی پر جانا چاہتی ہے۔ حالانکہ کسی نے بلایا نہیں مگر اس نے ارادہ کیا ہوا ہے۔ کہتی ہے کہ میں اماں دلشاد کی بیٹیوں کو اپنی طرف سے پیار دے کر رخصت کرنا چاہتی ہوں۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"اس کی حفاظت کا انتظام رکھنا ہے۔ اور شادی والے دن تم بھی وہاں شام پور میں موجود رہنا۔"

واپس آکر میں دیر تک سوچتا رہا۔ والی جی بے خبر نہیں تھے۔ پھر بھی وہ مجھے یہاں رکھے ہوئے تھے۔ کیا انہوں نے میرے لیے اپنے دل میں گنجائشیں پیدا کر لی تھیں یا پھر وہ بیگم بلقیس پر پابندیاں لگانے میں کامیاب رہے تھے۔۔۔۔ اور انہیں یقین تھا کہ وہ یہ پابندیاں نہ توڑیں گی۔ ان جیسا جہاندیدہ شخص یہ بات اچھی طرح جانتا ہو گا کہ جب تک میں یہاں ہوں، کسی بھی وقت خرابی کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

شاداں اور اس کی چھوٹی بہن زرینہ کی شادی کا دن خیر خیریت سے آگیا۔ بیگم بلقیس، ملازمہ فیروزاں کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے گئیں۔ وہ ایک پردے والے تانگے پر سوار

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تھیں۔ گھڑ سواروں کا ایک دستہ ان کے ساتھ گیا۔ اس دستے کا انچارج نصراللہ خود تھا۔ دو سادہ پوش پولیس اہلکار بھی ہمراہ تھے۔ جس وقت بیگم بلقیس تانگے پر سوار ہو رہی تھیں، میں ان سے صرف دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ میں نے آج انہیں دس گیارہ ماہ بعد دیکھا تھا۔ یوں لگا جیسے چند لمحوں کے لیے بنجر آنکھوں کی قسمت جاگ گئی ہے۔ انہوں نے سرخ لباس پہن رکھا تھا جیسے سورج کو شعلے پہنا دیے گئے ہوں۔ میں نے حسبِ رواج جھک کر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے نارمل انداز میں جواب دیا۔ چھوٹے حامد نے بھی آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ اب وہ بھی کم کم ہی نظر آتا تھا۔ ہر روز حامد سے ملنے، حویلی کے اندر جانے اور گاجر کا حلوہ یا گنے کے رس کی کھیر وغیرہ کھانے کی باتیں اب بھولی بسری یادیں بن گئی تھیں۔

بیگم بلقیس کے شام پور جانے کے کچھ دیر بعد میں بھی وہاں پہنچا۔ مجھے رات تک وہیں رہنا تھا۔ نمبردار کی حویلی میں ہمارے قریباً پچاس بندے موجود تھے اور وہ پوری طرح چوکس تھے۔ تاہم اماں دلشاد یا ان کے کسی عزیز کو اس بات کا پتا نہیں تھا۔

دونوں براتیں وقت پر ہی پہنچ گئیں۔ ہر طرف گہما گہمی ہو گئی۔ براتیں غریب گھرانوں سے آئی تھیں اس لیے زیادہ سج دھج نہیں تھی۔ پھر بھی گولے پھاڑے گئے۔ باجے وغیرہ بھی

بجائے گئے۔ دونوں براتیں تین ٹریکٹر ٹرالیوں پر پہنچی تھیں۔ ٹرالیوں، ٹریکٹروں کو جھنڈیوں، گلابوں اور سورج مکھی کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ جب رسمیں وغیرہ ہو رہی تھیں، تو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں شادی والے گھر سے باہر موجود تھا۔ ملازمہ تاجو گوٹے کناری والے کپڑے چمکاتی میرے پاس آئی اور ہولے سے بولی۔ "بیگم جی نے آج آپ سے کوئی بات کرنی ہے۔"

میرے کان سنسنا اٹھے۔ یوں لگا جیسے سینے میں ایک دم سینکڑوں شادیانے بج اٹھے۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ "ٹھیک ہے۔"

پچھلے گیارہ مہینے کا ایک ایک پل میں نے انتظار کی سولی پر لٹک کر گزارا تھا۔ بالآخر یہ برف ٹوٹی تھی اور میرے کانوں تک بیگم جی کا ایک پیغام پہنچا تھا۔ میرے لیے دھڑکنوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اپنے ارد گرد کی ہر شے ایک دم ناچتی محسوس ہوئی۔ یوں لگا جیسے سارے رنگ سارے لہجے اور سارے چہرے ایک دم زندہ ہو گئے ہیں۔ شام صرف سات آٹھ گھنٹے دور تھی لیکن یہ مجھے بہت طویل عرصہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں جلد از جلد شام سے اور بمبو کاٹ سے ملنا چاہتا تھا۔

نکاح ہو چکا تھا۔ چھوارے کھائے جا رہے تھے، بھانڈوں کی ٹولیاں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور دونوں دولہوں کے بزرگ بھانڈوں کو کچھ دے دلا کر رخصت کرنے کی فکر میں تھے۔

اچانک ملتانی تیزی سے میری طرف آیا۔ "سالار جی! گھڑ سوار آرہے ہیں۔"

یہ بڑا خطرناک فقرہ تھا۔ میرا جسم سنسنا اٹھا۔

"وہی ہیں؟"

"وہی لگتے ہیں جی! بیس پچیس کے قریب ہیں۔ چکر کاٹ کر قبرستان کی طرف سے آئیں گے۔"

اتنی دیر میں نصر اللہ بھی میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے کہا۔

"نصر اللہ! لگتا ہے پاشے کی شامت اسے یہاں لا رہی ہے۔"

نصر اللہ کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم آٹھ دس بندوں کے ساتھ یہاں براتیوں کے پاس رہو۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے جی۔" نصر اللہ نے چھاتی چوڑی کی۔

میں دوڑ کر گھوڑی پر سوار ہوا۔ تیمور، نمبر دار کے دروازے پر موجود تھا۔ میں نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ حویلی کے اندر سے گھڑ سواروں کو نکلنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا۔ ہم قبرستان کی طرف بڑھے۔ موقعے پر موجود لوگ کچھ ٹھٹکے مگر کسی کو بھی اصل صورتِ حال کا پتا نہیں چلا۔

میرا چچا زاد باگو میرے ساتھ گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ اس نے جوشیلے انداز میں پوچھا۔ "کتنے بندے ہیں جی؟"

"ملتانی بیس پچیس بتا رہا ہے لیکن اگر یہ موکھل ہی ہیں تو پھر اور بندے بھی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسری طرف سے آ رہے ہوں۔"

ہم گاؤں سے باہر نکلے ہی تھے کہ گھڑ سواروں کی گرد دکھائی دی۔ وہ قبرستان تک پہنچ چکے تھے۔ دفعتاً مجھے شک ہوا۔ مجھے لگا کہ بات وہ نہیں جو ہم سمجھ رہے ہیں۔ شاید۔۔۔۔۔ یہ موکھل پاشا اور اس کے ساتھی نہیں تھے۔ مجھے زیادہ تر گھڑ سواروں کے پاس لاٹھیاں اور

کلہاڑیاں وغیرہ نظر آئیں۔ میں نے باگو سے کہا۔ "تم ان کو روکو اور پوچھو کیا چاہتے ہیں۔ میں کماد کا چکر کاٹ کر دوسری طرف سے آتا ہوں۔ اور گولی نہیں چلنی چاہئیے۔"

"ٹھیک ہے جی!" باگو نے کہا۔ باگو میرا دوست تھا لیکن جب سے میں سالار بنا تھا، وہ مجھے عزت سے ہی بلاتا تھا۔

میں دو تین رائفل برداروں کو لے کر کماد کی دوسری طرف نکل گیا۔ کچھ آگے جا کر ہم نے گھوڑے کماد کے اندر ڈال دیے۔ پھر ایک جگہ گھوڑی روک کر میں نیچے اتر گیا۔ میرے پاس دس کارتوس والا ری پیٹر تھا۔ ساتھیوں کو وہیں رکنے کا کہہ کر میں احتیاط سے چلتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں باگو اور دیگر ساتھیوں نے آنے والوں کو روکا ہوا تھا۔ یہ جگہ گاؤں کی آبادی کے بالکل پاس تھی۔ کماد کے کنارے بولنے والوں کی بلند آوازیں آ رہی تھیں۔

میں نے کماد کے اندر سے آنے والے گھڑ سواروں کو دیکھا۔ ایک شخص نے للکار کر باگو سے کہا۔ "زیادہ بک بک نہ کر۔ سیدھی طرح بتا، جنج اس پنڈ میں آئی ہے کہ نہیں۔"

"آئی ہے۔۔۔۔۔ تو پھر؟"

"اس میں مرادا کون ہے؟"

"ہمیں نہیں پتا۔"

"پر ہمیں پتا ہے۔ ہم لبھ (ڈھونڈ) لیتے ہیں اسے۔"

"مرادے نے کیا کر دیا تمہارے ساتھ؟" باگو نے اکھڑ انداز میں پوچھا۔

"یہ ہم اسی کتے کے تخم کو بتائیں گے۔" ایک اور شخص نے بھاری آواز میں کہا۔

میں نے اس شخص کو دیکھا اور چونک گیا۔ یہ لیاقت کالا تھا۔ قلعہ والا کا وہی بدمعاش جس نے رستہ بند کیا تھا اور پھر ہتھ جوڑی کر کے میرے ہاتھوں بُری طرح پٹا تھا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آج یہ اچانک کہاں سے ٹپک پڑا ہے۔ حسبِ معمول اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں نشے سے سرخ تھیں۔ پچھلے دو ڈھائی سال میں، میں نے بس ایک دو مرتبہ ہی اسے دیکھا تھا۔

اس نے اپنے کارندوں کے ساتھ آگے بڑھنا چاہا۔ باگو نے سینہ تان کر اسے روکا۔ اس نے باگو کو گالی دی۔ جواب میں باگو نے بے دریغ اس پر لاٹھی چلائی جو اس کے کندھے پر لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں طرف کے افراد ایک دوسرے پر پل پڑے۔ للکارے گونجے، لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کی کھٹا کھٹ ابھری اور ہر طرف دھول پھیل گئی۔

میں تیزی سے باہر نکلا۔ میں نے طاقتور ری پیٹر سے یکے بعد دیگرے تین ہوائی فائر کیے اور للکار کر کہا۔ "رک جاؤ۔۔۔۔۔ ہاتھ روکو اپنے۔۔۔۔۔ رک جاؤ۔"

دھماکا خیز فائروں نے سب کو ٹھٹکا دیا۔ اکثر نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ان میں لیاقت کالا بھی تھا۔ میں دوڑ کر گھڑ سواروں کے درمیان آگیا۔ "خبردار! کوئی ہاتھ نہ چلائے۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

لڑائی رک گئی۔ پانچ دس سیکنڈ کی مارا ماری میں ہی تین افراد کے سر پھٹ گئے تھے۔ لیاقت کالے نے مجھے پہچانا اور اس کے گندمی چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ وہ جست لگا کر گھوڑی سے اتر آیا۔ اس کے کئی ساتھی بھی اتر آئے۔ ان میں سے جو مجھے پہچانتے تھے، وہ واضح طور پر ٹھٹکے ہوئے دکھائی دیئے۔ لیاقت کالے کے ہاتھ میں سیون ایم ایم رائفل تھی۔ وہ میرے سامنے آکر بولا۔ "کیا بات ہے۔۔۔۔۔ تم کیسے آئے ہو یہاں؟"

"میں اس لیے آیا ہوں کہ لڑائی نہ ہو۔ خوامخواہ سر پاٹیں گے۔ بازو شازو ٹوٹے گیں۔" بازو ٹوٹنے کا اشارہ پرانا واقعے کی طرف تھا۔ ہتھ جوڑی میں، میں نے ڈانگ مار کر لیاقے کی کلائی توڑ دی تھی۔

لیاقا بولا۔ "دیکھو! تم بیچ میں نہ آؤ۔ یہ ہمارا اور جانجیوں (براتیوں) کا معاملہ ہے۔ انہوں نے ہماری زنانیوں سے بدتمیزی کی ہے۔ ان کے کپڑے پھاڑے ہیں۔ انہیں کھیتوں میں کھینچا ہے۔ ان میں لاڑے کا کوئی یار مرادا ہے۔ اس بھین بدمعاش نے کیا ہے یہ سب کچھ۔ ہم اس کے ہتھ پیر توڑے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

"دیکھ لیاقے! یہ مت بھول، یہ جاگیر کا پنڈ ہے۔ یہاں جو برات آئی ہے، وہ ہماری برات ہے۔ ہم اپنے مہمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔ اگر کسی بندے نے کوئی غلط حرکت کی ہے تو اس کو سزا ملنی چاہیئے، پر یہ کوئی طریقہ نہیں کہ تم گھوڑے لے کر پنڈ پر ہی چڑھ دوڑو۔"

"تو ٹھیک ہے، اس بھین بدمعاش کو ہمارے حوالے کرو۔ ہم چلے جاتے ہیں۔" لیاقے کا کوئی نیا ساتھی لال پیلا ہو کر بولا۔ اس کی مونچھیں کافی بڑی تھیں۔

"ہوش کی بات کر موچھل پہلوان! بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں اور ان کی عزت بھی سانجھی ہوتی ہے۔ وہاں شادی ہو رہی ہے اور تم اپنا لچ تلا رہے ہو۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اوئے اوئے! موچھل کس کو کہا ہے؟" وہ شخص تڑخ کر بولا۔ اس سے پہلے کہ وہ بے خبری میں میرے گریبان پر ہاتھ ڈالتا لیاقت کالے نے اسے روک لیا۔

اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "دیکھ خاورے! ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ ہم بدلہ لیے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔"

"یہاں کھڑے کھڑے بات کرو گے تو پھر وہی کچھ ہو گا جو پہلے ہوا ہے۔ اپنے بندوں کو پیچھے ہٹاؤ۔ وہ سامنے کنواں ہے۔ وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

دونوں طرف کے لٹھ بردار ٹھنڈے پڑ گئے۔ ہم کنوئیں پر بچھی چارپائیوں پر جا بیٹھے۔ جن بندوں کے سر پھٹے تھے، وہ اپنے سر دھونے اور زخموں پر کپڑے باندھنے میں مصروف ہو گئے۔ لیاقت کالے نے کہا۔ "ابھی کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جنج ہمارے پنڈ میں سے گزری ہے۔ ان کی ایک ٹرالی کا ٹائر بیٹھ گیا تھا۔ یہ وہاں ٹائر وغیرہ بدل رہے تھے۔ ان میں سے کئی نے شراب پی رکھی ہے۔ ہماری زنانیاں کھیت میں تھیں۔ ان کے مراد نام کے بندے نے ان سے بدتمیزی کی ہے۔ ہمارے دو بندوں نے انہیں روکا تو ان کو بھی چپیڑیں ماریں اور گندی گالیاں دیں۔"

"وہ بندے کہاں ہیں؟"

"ان میں سے ایک یہ تمہارے سامنے ہے۔" لیاقے نے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔اس کے ایک ہونٹ سے تھوڑا ساخون رس رہا تھا۔شاید واقعی اسے تھپڑ وغیرہ پڑا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔"کیا واقعی تمہارے سامنے زنانیوں کے کپڑے پھاڑے گئے ہیں اور انہیں کھیتوں میں کھینچا گیا ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کتنی زنانیاں تھیں؟"

"تت۔۔۔۔تین۔" وہ ہکلایا۔

میں نے اس سے تھوڑے سے سوال جواب کیے۔جلد ہی اصل صورتِ حال سامنے آ گئی۔اصل معاملہ (جیسے کہ بعد میں پتا چلا) صرف اتنا تھا کہ مراد نامی نوجوان نے ایک کھیت میں شلجم دیکھے۔اس نے کھیت میں کام کرتی ایک جواں سال عورت سے پوچھا۔"یہ گونگلو (شلجم) تمہارے ہیں؟"

اس نے پتا نہیں کیا مطلب لیا۔وہ غصے میں آ گئی اور کوئی الٹا سیدھا جواب دیا۔اس سے بات بڑھ گئی۔پاس ہی دو بندے تھے،ان سے ہاتھا پائی ہوئی لیکن معاملہ رفع دفع ہو گیا۔کسی عورت سے بد تمیزی نہیں ہوئی تھی۔نہ اسے کھیت میں کھینچا گیا تھا۔بس ہاتھا پائی میں ایک عورت کی قمیض تھوڑی سی پھٹ گئی۔

میں نے لیاقت کالے کو ایک طرف لے جا کر سمجھایا۔۔۔۔اور اسے معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے کہا۔لیاقت کالے نے میرے ہاتھ اچھی طرح دیکھے ہوئے تھے۔ویسے بھی یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ معاملے کو بڑھایا چڑھایا گیا ہے۔بہر حال ٹانگ اوپر رکھنے کے لیے وہ مسلسل بول رہا تھا۔

میں نے باگو سے کہا۔"تم دو بندے لے کر جاؤ اور مراد نام کے اس لڑکے کو طریقے سے یہاں لے آؤ۔"

باگو گیا اور دس پندرہ منٹ میں مراد کو لے آیا۔وہ چھوٹے دولہے ارشد کا یار تھا۔فی الوقت وہ نشے میں نہیں لگتا تھا۔اس کے سامنے بھی ساری بات ہوئی۔جس عورت کی قمیض پھٹی تھی، اس کا بھائی اب بھی سخت غصے میں تھا۔میں نے مراد سے کہا کہ وہ اس بندے سے معافی

مانگے۔اس نے میرے کہنے کی لاج رکھی اور معافی مانگ لی۔ تھوڑی دیر بعد معاملہ رفع دفع ہو گیا اور لیاقت کالا اپنے ساتھیوں سمیت واپس چلا گیا۔

سہ پہر تک باقی کے سارے کام معمول کے مطابق ہوئے اور کسی طرح کی بدمزگی بھی نہیں ہوئی۔ چار بجے کے قریب شاداں اور زرینہ اپنے دولہوں کے ساتھ اپنے گھروں کو روانہ ہو گئیں۔ والی جی کی ہدایت کے مطابق میں نے دس مسلح گھڑ سواروں کو براتوں کے ساتھ بھیجا۔ وہ دونوں براتوں کو قریباً آدھے راستے تک چھوڑ کر آئے۔

۔۔۔۔اور اب مجھے انتظار تھا، بڑی شدت سے۔۔۔۔۔رات کا۔۔۔۔۔اور لالٹین کی مدھم روشنی اور سلگتی ہوئی انگیٹھی کا۔۔۔۔اور اس کے علاوہ بمبو کاٹ سے پھوٹنے والی آواز کا جو میری زندگی میں جان ڈالا کرتی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ بالآخر جمود ختم ہونے والا ہے۔ اس روز میں اتنا خوش تھا کہ میں نے اپنی قریباً ایک تہائی تنخواہ ایک ضرورت مند کو خیرات میں دے دی۔ اگر ساری ہوتی تو شاید وہ بھی دے دیتا۔

وہ رات بڑی کٹھن تھی۔ جیسے آگے کو سرکتی ہی نہیں تھی۔ میری نظریں مسلسل بمبو کاٹ پر لگی ہوئی تھیں اور وہ خاموش تھا۔ اس رات مجھے صحیح معنوں میں امید، انتظار اور پھر مایوسی کی

اصل کوفت کا اندازہ ہوا۔ میں نے ایک ایک پل گن گن کر گزارا مگر آس۔۔۔۔۔آس ہی رہی۔

اگلے روز دوپہر کو اتفاقاً میری نگاہ تاجو پر پڑی۔ وہ ایک ڈھولکی اٹھائے حویلی کی طرف جا رہی تھی۔ شاید آج پھر حویلی میں ترنجن جیسی کوئی محفل سجنی تھی۔ الہڑ مٹیاروں کے قہقہے گونجنے تھے اور بیگم بلقیس کی آواز نے در و دیوار کی قسمت جگانی تھی۔ کچھ بھی تھا، میں اب ان سارے مناظر سے بہت دور تھا۔ حویلی کے اندر قدم رکھے مجھے بہت دن گزر چکے تھے۔

ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ میں نے تاجو کو روک کر پوچھا۔

"بیگم جی نے کیا بات کہنا تھی؟"

وہ ایک دم ہنس پڑی۔"سالار جی! مجھے غلطی لگ گئی تھی۔ بیگم جی نے دراصل اماں دلشاد کے بڑے دیور کے بارے میں کہا تھا کہ میں نے اس سے بات کرنی ہے۔ اس کا نام بھی خاور ہے۔ میں سمجھی کہ وہ آپ کے لیے کہہ رہی ہیں۔ میں آپ کے پاس آ گئی۔"

تاجو تو یہ بات کہہ کر آگے بڑھ گئی اور میں پتھر کا بت بنا کھڑا رہا۔ بہ ظاہر تو یہ ایک معمولی واقعہ تھا مگر ان دنوں دل کی حالت کچھ ایسی تھی کہ اس واقعے نے مجھے بے حد دکھی کیا۔ ایک دم

امید بندھنے کے بعد یکایک ٹوٹی تھی۔ مجھے لگا، سینے کے اندر ایک گھاؤ سا لگ گیا ہے۔ شاید پہلی بار میری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی جاگی۔

بند کمرے میں بیگم بلقیس کا تصور میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ میں خاموشی کی زبان میں ان سے پوچھتا رہا۔

آپ تو اتنی سخت دل نہیں تھیں؟

آپ نے تو کہا تھا، اب کوئی واپسی نہیں؟

آپ تو جانتی تھیں، میرے لیے آپ کے بغیر چند دن بھی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔

۔۔۔۔ تیمور نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر آ گیا۔ میری سرخ آنکھوں کو دیکھ کر بولا۔ "خیریت ہے یار! آج تو بالکل دکھی ہیرو لگ رہے ہو۔۔۔۔؟"

"کیوں، دکھی ہونا جرم ہے؟"

"یار! تم کوئی ندیم، وحید مراد نہیں۔ سلطان راہی ہو۔۔۔۔ سلطان راہی۔"

"ہر سلطان راہی میں ندیم اور ہر ندیم میں تھوڑا تھوڑا سلطان راہی ہوتا ہے۔" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"کچھ زیادہ ہی اداس ہو؟"

"یار! دل چاہتا ہے۔۔۔۔ چلا ہی جاؤں یہاں سے۔ میرے بغیر بھی تو یہاں کے کام چلتے ہی تھے۔ میرے بعد بھی چلتے رہیں گے۔"

"پر تم نے کسی سے وعدہ کیا ہوا ہے شہزادے۔"

"وعدہ نبھانا اب مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ لگتا ہے کوئی باندھ کر مار رہا ہے مجھے۔ یہاں سے دور چلا جاؤں گا تو سکون میں آ جاؤں۔"

"اور زیادہ بے سکون ہو گئے تو؟"

"نہیں یار! وہ آس پاس بھی ہے اور بہت دور بھی ہے۔ یہ چیز زیادہ تکلیف دیتی ہے۔ اب یہ دیکھو۔۔۔۔ حویلی کے اندر ڈھولکی بج رہی ہے۔ عورتیں ہنس کھیل رہی ہیں۔ ان میں وہ بھی ہو گی۔ یہ سب کچھ میرے دل پر بہت زیادہ بوجھ ڈالتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ جو چاروں پاسے بکھیڑے ہیں، ان کا کیا ہو گا؟ والی جی کی حالت کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ وہ نہ بیماروں میں ہیں، نہ تندرستوں میں۔"

اسی دوران میں رونق علی تیز قدموں سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ تیمور اسے دور سے دیکھ کر بولا۔ "لو جی! بلڈ پریشر صاحب آ گئے ہیں۔"

رونق علی نے آتے ہی خبر سنائی۔ "مجھے کل سے ڈر تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو گا۔"

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"لیاقت کالے نے، قلعہ والا سے گزرنے والا رستہ پھر بند کر دیا ہے۔"

میں نے اپنے اندر طیش کی ایک بلند لہر محسوس کی۔ کل سب کچھ رفع دفع ہوا تھا مگر آج اس نے کاروائی ڈال دی تھی۔ "آپ کو کیسے پتا چلا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی دو گاڈی ڈسکے سے کھاد شاد لے کر آئے ہیں، انہوں نے بتایا ہے۔۔۔۔ اور اس دفعہ انہوں نے پکا کام کیا ہے۔ لیاقت کالے کا چاچا ایم پی اے حاجی امین خود موقعے پر پہنچا ہے اور اس نے اپنی نگرانی میں رستے پر بانس شانس لگوائے ہیں۔ ساتھ والے پنڈ مکھن وال کے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

زمینداروں کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ وہاں بڑے نعرے شعرے لگے ہیں کہ رستہ نہیں کھلنے دیں گے۔"

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "رستہ تو شام تک کھلوا لوں گا میں۔۔۔۔ اور ان کا باپ بھی کھولے گا۔ آپ بس والی صاحب کے کانوں سے یہ بات گزار دیں۔"

"نہیں خاور! اب ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا۔ لیاقت کالے نے اپنی سائیڈ بڑی پکی کر لی ہے۔ اب یہ پورا ایک گروپ بن گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو پلس کی حمایت شمایت بھی مل گئی ہو۔"

"بات حمایت کی نہیں رونق بھائی! حق سچ کی ہے۔ اور حق سچ یہی ہے کہ وہ عام رستہ ہے اور وہ بند نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن ہم کو اور بھی باتیں دیکھنی شیکھنی پڑیں گی۔ ہم چومکھی لڑائی نہیں لڑ سکتے۔ ایک طرف موکھلوں سے ٹین شین ہے۔ دوسری طرف قلعہ والوں سے متھا لگا لیں گے تو مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"پر اس معاملے میں پیچھے ہٹیں گے تو بھی دونوں پارٹیاں تیز ہوں گی۔" رونق نے تونڈ کھجائی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ سوچ میں پڑ گیا ہے۔ میں نے کہا۔ "آپ والی جی سے مشورہ کر لیں۔ مجھے جس طرح بھی حکم دیں گے، میں حاضر ہوں۔ ہمارے بندے، اسلحہ اور گھوڑے پوری طرح تیار ہیں۔"

اگلے روز حویلی میں ایک بڑا اکٹھ ہوا۔ والی جی کی برادری کے چیدہ چیدہ لوگ اور ان کے حمایتی زمیندار جمع ہوئے۔ صلاح مشورہ ہوتا رہا۔ پھر مجھے بھی مردانے کی بیٹھک میں بلا لیا گیا۔ یہاں پگڑیاں لہرا رہی تھیں، حقے گڑگڑا رہے تھے۔ چہروں پر گہری سنجیدگی تھی۔

اکٹھ میں میرے جوش و خروش کو سراہا گیا۔ لیکن فی الحال مجھے کسی بھی کارروائی سے روکا گیا اور انتظار کرنے کو کہا گیا۔ بہر حال چودھری عزیز اور اس کے کچھ حمایتی ایسے بھی تھے جنہوں نے ایک بار پھر مجھ پر من مانی کا الزام لگایا اور کہا کہ کل لیاقت سے بات چیت کرتے ہوئے مجھے حویلی سے بھی کسی ذمے دار شخص کو بلانا چاہئیے تھا۔

کچھ لوگوں سے اسی زبان میں بات کرنی چاہئیے جو وہ سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے موکھل پاشا سے جو بات کی تھی، وہ اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اب دونوں لڑکیوں کی شادی کے بعد بھی اس

کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہو سکتا ہے، کچھ دن تک وہ کسی طرح رابطہ کرے اور دونوں طرف کی تصویروں کو ضائع کرنے کی بات کرے۔

جہاں تک لیاقت کالے والا معاملہ تھا، میرا دل بُری طرح مچل رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر اس "غنڈہ صاحب" کی کارروائی کا منہ توڑ جواب دوں جو پہلے دیا تھا لیکن والی جی کی مجبوری آڑے آ رہی تھی۔ اگلے دن کی بات ہے۔ دوپہر کے وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا کہ کوئی شے اڑتی ہوئی آئی اور دروازے سے لگ کر اندر آ گئی۔ یہ ایک گیند تھی۔ ٹینس کی وہی گیند جو میں نے ایک مرتبہ حامد کو لا کر دی تھی۔ یہ بیتے دنوں کی طرح کافی بوسیدہ ہو چکی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد حامد بھی گیند ڈھونڈتا ہوا حویلی سے نکلا اور میرے کمرے میں آ گیا۔ وہ کبھی کبھار ہی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، قریب بٹھا کر اپنے ساتھ لگایا۔

"باداموں والی مٹھائی کھاؤ گے؟"

"نہیں ماسٹر چاچا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"امی نے منع کیا ہو گا؟"

"ہاں۔۔۔۔ نہیں۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"اور ملنے سے بھی منع کیا ہوا ہے؟"

"نہیں جی۔" اس نے کھسیانے انداز میں کہا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ میرے سوال کا جواب ہاں ہے۔

"پڑھائی ٹھیک جا رہی ہے؟" میں نے موضوع بدلا۔

"ہاں جی۔"

"دیکھو حامد! تمہارے ابا امی تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ خاص طور سے امی کی بڑی چاہت ہے کہ تم پڑھو، تم بڑے آدمی بنو۔ پھر یہاں ایک اسکول بناؤ اور اس کے ہیڈ ماسٹر بنو۔"

وہ ہنس پڑا۔ پھر اس نے ایک دم موضوع بدلا اور موکھل حویلی کے اس بنگالی شیر کی بات چھیڑ دی جس نے کچھ مہینے پہلے علاقے میں خوف وہراس پھیلایا تھا۔ حامد کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ بہت سے لوگ اب بھی اس واقعے کا اثر محسوس کرتے ہیں۔ خاص طور سے عورتیں اور بچے آبادی سے دور جانے سے ڈرتے ہیں۔

میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ اب شیر نہیں آئے گا اور اگر آئے گا تو ہم اسے بکری بنا دیں گے۔

"ماسٹر چاچا! آپ کیا کرو گے اس کے ساتھ؟"

"اس کی آنکھوں کے بالکل درمیان میں گولی ماریں گے اور پھر اس کی کھال اتار کر اس میں تُوڑی بھر کر حویلی کے سامنے لٹکا دیں گے۔ تم ایک دم بے فکر رہو۔"

اس کی آنکھوں میں اطمینان نظر آنے لگا، جیسے اسے یقین ہو کہ میں یہ کر سکتا ہوں۔ اس کی آنکھوں، ابھرے ہوئے رخساروں اور ناک میں ماں کی جھلک تھی۔ میں اسے دیکھتا تھا تو اس کے چہرے میں بلقیس کی مشابہتیں ڈھونڈتا رہتا تھا۔

حامد اٹھ کر گیا ہی تھا کہ منشی منظور آتا دکھائی دیا۔ آج کل منشی منظور سے تعلقات بالکل ٹھیک تھے۔ وہ جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل کر رہا تھا۔ اتنی بات تو میری بھی سمجھ میں آ چکی تھی کہ منشی کوئی لمبا چوڑا گپلا کرنے کا اہل نہیں۔ اب وہ مزید محتاط ہو چکا تھا۔

منشی منظور نے اندر آ کر مجھے خبر سنائی۔ "حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے دونوں ویری (دشمن) برادریاں ایک دوجے سے ہاتھ ملا رہی ہیں۔ کل پتا ہے کیا ہوا؟"

"بتاؤ چاچا۔"

"گوریکے میں موکھل حویلی میں مہیناوار اکٹھ ہوا ہے اور اس میں قلعہ والا کے دو تین لمبڑ بھی آئے ہیں۔ لمبڑ کا نام دراصل نمبر دار سے نکلا ہوا ہے۔ پنجاب کے دیہات میں یہ عام استعمال ہوتا ہے۔ قلعہ والا میں اتفاقاً نمبر داروں کے ساتھ آٹھ گھرانے رہائش رکھتے تھے۔ اس لیے اسے لمبڑوں کا پنڈ بھی کہا جاتا تھا۔

"تو اس سے کیا ہو گا چاچا؟"

"بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ کیا پتا کل کلاں دونوں برادریاں ہمارے خلاف ایکا ہی کر لیں۔"

"کر لیں ایکا۔۔۔۔ ہم بھی ایسے ایکے کر سکتے ہیں۔"

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ میری نظر ایک بندے پر پڑی۔ وہ تازی گھوڑی پر سوار گاؤں سے باہر جا رہا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والے اس شخص کو دیکھ کر میں چونکا۔ شاداں اور زرینہ کی شادی کے موقعے پر لیاقت سے جو جھگڑا ہوا تھا، اس میں یہ شخص بھی نظر آیا تھا۔ اس نے ایک دو کڑوی باتیں کی تھیں اور میں نے اسے موچھل پہلوان کہہ کر بلایا تھا۔ بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ لیاقے کا کوئی نیا ساتھی ہے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"یہ موچھل کون ہے؟" میں نے منشی منظور سے پوچھا۔

"اس کا نام جبارا ہے۔ قلعہ والا میں رہتا ہے۔ اس نے پہلی شادی موکھلوں میں کی تھی، پر شادی کے اگلے دن بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ اگلا دن بھی کیا، وہ سورج نکلنے سے پہلے ہی لٹ پٹ کر اپنے گھر پہنچ گئی تھی۔ اب دوسری شادی ہمارے پنڈ میں کی ہوئی ہے۔ ایک سال ہو گیا ہے۔ اس بیوی سے تو اب تک ٹھیک ہی ہے۔"

"کرتا کیا ہے؟"

"قلعہ والا میں اس کا زمیندارا ہے۔ اب لیاقت کالے سے کوئی رشتے داری بھی ہو گئی ہے۔ بڑے ٹھاٹ میں ہوتا ہے۔"

"پہلی بیوی کو کیوں طلاق دی؟"

"پتا نہیں۔ بس ایسے کام دشمنی اور بدلے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ لڑکی کے موکھل بھائی بہت بھڑکے تھے۔ اس کو جان سے مار دینا چاہتے تھے مگر پھر آہستہ آہستہ معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔"

میرے دماغ میں تھوڑی سی ہلچل پیدا ہوئی۔ جو بات ابھی منشی منظور نے کہی تھی، وہ کل ہمارا مخبر رملی بھی کہہ گیا تھا۔ رملی کا بھی اندازہ تھا کہ دونوں برادریاں یعنی موکھل اور لمبڑ ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔

تیمور قریب ہی دھوپ میں بیٹھا گنا چوس رہا تھا۔ میں نے اسے موچھل کے پیچھے دوڑایا اور کہا کہ اسے یہاں لے کر آئے۔ اسے چائے وغیرہ پلاتے ہیں۔ تیمور گیا اور واقعی اسے لے آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم اپنے پنڈ کے جنوائی ہو۔ تمہارے ساتھ ناراضگی اچھی نہیں لگی۔ ہمیں آپس کے معاملے مل بیٹھ کے طے کرنے چاہئیں۔"

وہ اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں بولتا رہا۔ اتنے میں پیالیوں میں دودھ پتی آگئی۔ دودھ پتی پیتے ہی وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ اسے کسی کام سے جلدی نکلنا ہے۔

پرانے بندوں کا قول ہے کہ بادشاہی اور زمینداری میں بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ وفاداریاں بڑھانی پڑتی ہیں اور کھوٹے سکوں پر گہری نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اسی طرح جوڑ توڑ بھی بہت ضروری عمل ہے۔ دوستیوں میں اضافہ کرنا اور دشمنوں کو الگ تھلگ کرنا بھی بادشاہ اور زمیندار دونوں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

اس روز رات کو میں اور تیمور پھر انگیٹھی کے سامنے بیٹھے تھے اور گولڈ لیف کے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ کمرے کے باہر رکھوالی کے کتوں کا شور تھا اور چوکیداروں کے آوازے تھے۔

میں نے کہا۔ "تومی! ایک کام کرنا ہے اور کل سویرے ہی کرنا ہے۔"

"فرماؤ۔" اس نے تہ بند پھیلا کر انگیٹھی کی حرارت اپنے اندر سمیٹتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یاد ہے جب ہم نے مکھاں کی تصویریں اتاری تھیں تو پہلے مکھاں کے دونوں ماموؤں کے لیے طوائفوں کا انتظام کیا تھا۔"

"بالکل۔۔۔۔اور انتظام کرنے کے لیے ہم نے ساجے کے ٹو کا منت ترلا کیا تھا۔"

"ساجے کے ٹو نے طوائفوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ انہیں کس نے بُک کیا ہے۔ بس اتنا کہہ دیا تھا کہ قلعہ والا سے بکنگ ہوئی ہے۔"

"ہاں، یہی ہوا تھا۔" تیمور نے کہا۔

"یہ جو وہاں قلعہ والا کا نام استعمال ہو گیا تھا تو یہ ہمیں بہت فائدہ دے سکتا ہے یار۔"

"وہ کس طرح؟"

"تمہیں پتا ہی ہے، موکھل پاشا آج کل پورے زور سے ہماری سی آئی ڈی پر لگا ہوا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ ہمارا رابطہ کن کن لوگوں سے ہے اور تصویروں والی کاروائی میں کس کس نے میری مدد کی۔ وہ دونوں طوائفوں کے پیچھے بھی ہتھ دھو کر پڑا ہوا ہے۔ کبھی ان کو اپنے پاس بلا لیتا ہے، کبھی ناچ گانا سننے کے بہانے ان کے پاس پہنچ جاتا ہے۔" تیمور نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ "اب اگر اس موقعے پر موکھلوں کو یہ پتا چلے کہ طوائفوں کو بُک کرانے والا بندہ قلعہ والا کا جبارا تھا تو کیسا رہے؟"

"میں سمجھا نہیں؟"

"اتنی مشکل بات نہیں۔ موکھل پہلے ہی جبار سے بیر رکھتے ہیں۔ جبارے کا یہاں راجوال میں بھی آنا جانا ہے۔ جب جبارے کا نام موکھل پاشا کے سامنے آئے گا تو بات فوراً اُس کے دل کو لگے گی۔ اسے یقین ہونے لگے گا کہ جبارے کے ہم سے رابطے ہیں، اگر یقین نہ بھی ہو تو شک ضرور ہو جائے گا اور شک بھی ہو گیا تو کچھ نہ کچھ ٹینشن ضرور پیدا ہو گی وہاں۔"

اب بات تیمور کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ اگر یہ لوگ ہمیں لتاڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہے تو ہمیں بھی ہر موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔" پھر اس نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "اچھا اچھا، اب سمجھ آ رہی ہے۔ تم نے کل اس موچھل کو اپنے ساتھ دودھ پتی کیوں پلائی تھی۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میں نے یہ چال موکھل اور لمبڑ برادری میں تھوڑا سا فاصلہ پیدا کرنے کے لیے چلی تھی مگر اس کا فائدہ میری توقع سے زیادہ ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی۔ تیمور نے میری ہدایات کے مطابق ڈانسروں کی نائیکہ گلشن کو ڈسکے میں ایک گمنام فون کرایا جس میں ڈانسروں کو بُک کروانے والے کا نام چودھری جبار بتایا گیا۔ اس کے بعد باقی کام آپوں آپ ہونے لگے۔ سب سے پہلے اطلاع ملی کہ موکھل پاشا "قلعہ والا" گیا تھا اور وہاں جبارے کے ساتھ اس کی سخت تلخ کلامی ہوئی ہے۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ موکھل پاشا کے بندوں نے پرانی پُل کے قریب جبارے کو تانگے سے اتار کر چھینٹی لگائی ہے اور اپنے

ساتھ موکھل حویلی لے جانے کی کوشش کی ہے۔ دیکھنے والوں نے بتایا کہ جبارے کی شلوار کا نالہ کاٹ دیا گیا تھا اور جبارے کو ستر چھپانے کے لیے شلوار کو ہاتھوں سے دبوچنا پڑا تھا۔ ان باتوں کی تصدیق ہمارا مخبر رملی بھی کر رہا تھا۔ دو دن بعد ملنے والی اطلاع بڑی سنسنی خیز تھی۔ پرانی پلی پر ہی لمبڑ اور موکھل برادری کے کچھ لوگوں میں لڑائی ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے ڈانگیں، کلہاڑیاں چلی تھیں اور فائر بھی ہوئے تھے۔ اس لڑائی میں کم از کم دس بندے زخمی ہوئے۔ ان میں سے ایک موکھل کے پیٹ میں چاقو کے زخم لگے تھے۔ یہ طلاق شدہ لڑکی کا بھائی تھا۔ یعنی وہی ایک رات کی دلہن جسے جبارے نے طلاق دی تھی۔ اس چاقو زنی کے الزام میں لیاقت کالا گرفتار ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی دونوں طرف کے کئی افراد کو ایس ایچ او رانا شبیر نے پکڑا تھا۔ دیہاتی لڑائیوں کی آگ ایسے ہی آناً فاناً بھڑکتی ہے۔

اندر کی بات کا کسی کو علم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ بہ ظاہر یہ جھگڑا تھا کہ جبارے نے شرارت کرتے ہوئے حنیف موکھل اور شریف موکھل کی طرف طوائفیں بھیجی تھیں۔ اب لیاقت کالے پر جو کیس بن رہا تھا، وہ کافی سخت تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ لمبڑوں نے بڑے ہی ہاتھ پاؤں چلائے تو لیاقت کالا سال ڈیڑھ سال پہلے سے باہر نہیں آئے گا۔

اگلے دو تین ہفتوں میں صورتِ حال بہت حد تک ہمارے گھر میں ہو گئی۔ لیاقت کالے اور اس کے دو ساتھیوں کے اندر ہو جانے سے لمبڑ گروپ کا مچ کافی حد تک مر گیا۔ پہلے تو یہ لوگ پنچایت کی بات ہی نہیں کرتے تھے لیکن اب وہ لوگ پنچایت بلانے پر آمادہ ہو گئے۔ والی جی نے بھی اثر ورسوخ استعمال کیا۔ تین دن تک جاری رہنے والی اس پنچایت کا نتیجہ یہ نکلا کہ راستہ پھر سے کھل گیا۔ پنچایت میں یہ بات طے ہوئی کہ اگلے ایک ڈیڑھ سال میں کچھ کھیتوں کے کنارے سے زمین خرید کر متبادل راستہ نکالنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس معاملے کے طے ہو جانے سے حالات ایک بار پھر معمول پر آ گئے۔ موکھل پاشا کی طرف سے بھی۔۔۔۔۔ فی الحال خیریت ہی تھی۔ بہ ظاہر اس نے اماں دلشاد کی بیٹیوں کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی تصویریں اس کے پاس اور میری میرے پاس تھیں۔ میں نے انہیں پوری ذمہ داری سے سنبھال رکھا تھا اور پاشا تک بھی ذمے داری والی بات پہنچا دی تھی۔ رقبے کے سلسلے میں جو مقدمے بنے تھے، وہ تین عدالتوں میں بہ دستور چل رہے تھے۔

بے بے جی اور عارفہ کا خیال میرے ذہن میں ہمیشہ رہتا تھا مگر میں ان سے زیادہ مل نہیں رہا تھا۔ اس کی بہت وجوہات تھیں۔ ایک تو میرے آنے جانے سے ان کا ٹھکانہ غیر محفوظ ہو سکتا

تھا۔ دوسرے مجھے پتا تھا کہ میں جتنی بار ملوں گا، بے بے جی میرے سر پر سہرا سجانے کی بات ہی کریں گی۔ سہرے کی بات ایک تیر کی طرح سیدھی میرے دل میں لگتی تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں بیگم بلقیس سے بے وفائی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میری یہ سوچ اتنی ہی عجیب تھی جتنی بیگم بلقیس سے میری محبت۔ شاید محبتیں ایسی ہی انوکھی اور بے دلیل ہوتی ہیں۔

کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ میں اب اپنے گھر والوں کے لیے کسی کام کا نہیں رہا۔ میں نے اس کا حل یہ نکالا تھا کہ اپنے روٹھے ہوئے بڑے بھائی باقر کو منا لیا تھا اور اسے واپس پاکستان آنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اب وہ میری جگہ والدہ اور بہن کے پاس رہے۔ میری آمدن اب معقول تھی۔۔۔۔۔ تیس چالیس ہزار درہم بڑے بھائی نے دے دیے تھے اور ہم نے گوجرانوالہ میں بٹ کے گھر کے پاس ہی ایک اچھا سا مکان خرید لیا تھا۔ عارفہ کے لیے ایک نہایت اچھا رشتہ بھی میری کوشش سے ہی مل گیا تھا۔

دن اور رات ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ صبحیں اور شامیں ایک دوجے کے تعاقب میں تھیں۔ چاندنی راتیں۔ لشکتی دوپہریں، جھومتے بادل، بارشیں اور ہوائیں سب

کچھ ویسا ہی تھا لیکن میرے کمرے میں لکڑی کی الماری میں رکھا ہوا میرا ابمو کاٹ خاموش تھا اور اس کی خاموشی مجھے کسی روگ کی طرح لگ چکی تھی۔ ہر رات آس بندھتی اور ہر صبح زخمی ہو کر دم توڑ دیتی تھی۔ اتنی سنگ دلی؟ اتنی بے حسی؟ کیا اوپر سے مہربان نظر آنے والے لوگ اندر سے اتنے پتھر دل ہوتے ہیں؟ اب قریباً ڈیڑھ برس ہونے والا تھا۔ بیگم بلقیس نے پلٹ کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ کبھی آمنا سامنا ہو جاتا تو میں سلام کرتا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر جواب دیتیں اور پھر۔۔۔۔۔ جیسے کوئی ناتا ہی نہیں تھا مجھ سے۔ گرمیوں کے آخر میں، میں قریباً ایک ماہ سخت بیمار بھی رہا۔ ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا جس کو ہم دیہات میں مہلتی بخار بھی کہتے ہیں۔ ان دنوں مجھے بہت آس رہی کہ شاید بیگم بلقیس کسی طرح میری خیریت دریافت کریں۔ خود نہ کریں کسی اور سے کرائیں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں۔۔۔۔۔ کچھ نہیں ہوا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتیں تو انٹر کام کا صرف ایک بٹن دبا کر مجھ سے رابطہ کر سکتی تھیں۔

میں اب بہت سنجیدگی سے راجوال چھوڑنے کا سوچنے لگا تھا۔ بیگم بلقیس کے قریب رہ کر ان کی بے رخی جھیلنا میرے لیے زیادہ مشکل تھا۔ دل کی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ اب میں کبھی کبھی والی جی کی طرف سے بھی بے پرواہ ہو جاتا تھا۔

اور پھر ان دنوں جب میں مایوسی کی انتہا کو چھو رہا تھا، حالات نے ایک کروٹ لی۔ سب کچھ اتنا غیر متوقع ہوا کہ میں ایک بار پھر چکرا گیا۔

یہ گاؤں ہی کی ایک شادی تھی۔ غریب گھرانے کی لڑکیوں کی شادیاں اکثر بیگم بلقیس اپنے خرچے پر کراتی رہتی تھیں۔ رات کا وقت تھا۔ لالٹینوں اور موم بتیوں کی روشنی میں مہندی کی رسم ہو رہی تھی۔ لڑکی کے جہیز میں جانے والا کچھ سامان چوبارے سے صحن میں اتارنا تھا۔ ایک جستی پیٹی اتاری جا رہی تھی کہ وہ سیڑھیوں میں پھنس گئی۔ اسے اتارنے کے لیے آدمیوں کی فوراً ضرورت پڑی۔ میں اور نصر اللہ بھی گھر کے اندر چلے گئے۔ ہم نے مل کر پیٹی نیچے اتاری۔ چھوٹا سا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ زیادہ تر خواتین تھیں۔ بیگم بلقیس کی جھلک بھی نظر آئی۔

تاجو نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے سالار جی! آج کل بہت چپ چپ ہیں۔ والی جی سے بھی کم ہی ملتے ہیں۔"

"کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

بیگم بلقیس تاجو کے پیچھے تھیں۔ ہولے سے بولیں۔

"میں مر جاؤں گی تو سب ٹھیک ہو جائیں گے۔"

میں گھر سے باہر آ گیا۔ مگران کا فقرہ مسلسل میرے کانوں میں گونجتا رہا۔ رات گئے تک میں جاگتا رہا اور غور کرتا رہا۔ گہرے سکوت میں ایک ہلکی سی آہٹ تو ہوئی تھی۔ دل میں پھر امید جاگنے لگی کہ شاید رابطہ بحال ہو۔ اس مرتبہ یہ امید۔۔۔۔۔۔ مایوسی میں نہیں بدلی۔

یہ اگلی شب کا واقعہ ہے۔ میں کسی نیم مردہ شخص کی طرح بستر پر لیٹا تھا۔ بیگم بلقیس کی بے حسی کا خیال آتا تھا تو آنکھیں خود بخود نم ہو جاتی تھیں۔ اچانک منشی منظور کے کمرے میں وہ اکلوتی بیل سنائی دی جس کا انتظار میں لاتعداد راتوں اور لاتعداد راتوں کے ان گنت پلوں سے کر رہا تھا۔ ہاں وہی اکلوتی بیل۔۔۔۔۔ میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ کیا یہ بیگم بلقیس کا ہی اشارہ تھا؟ تھوڑے سے وقفے کے بعد دوسری دفعہ بیل ہوئی تو میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ چند لمحے گہرا سکوت رہا پھر بیگم بلقیس کی بھولی بسری آواز سنائی دی۔

"ہیلو!"

"کیا حال ہے؟" ان کے لہجے سے دکھ، آنسو، اداسی سب کچھ عیاں تھا۔

"حال وہی ہے جو ہونا چاہیئے۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر لائن پر مہیب خاموشی رہی پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"ایک دو دفعہ پہلے بھی تم سے بات کرنے کا سوچا، پر نہیں کی۔"

"کیوں؟"

"مجھے پتا تھا تم بہت ناراض ہو۔ پتا نہیں بات کرو گے یا نہیں۔" میں یکسر خاموش رہا۔ انہوں نے کچھ دیر انتظار کے بعد کہا۔

"بہت ناراض ہو نا؟"

"میرا کیا حق ہے ناراض ہونے کا؟"

"معاف کر سکتے ہو؟" انہوں نے عجیب دکھ بھری ادا سے پوچھا۔

"معاف تو آپ مجھے کر دیں۔ میں اس دکھ اور انتظار کا بوجھ اور نہیں اٹھا سکتا۔ اب ختم کر دیں سب کچھ۔ مجھے آزاد کر دیں۔"

"تمہیں پتا نہیں خاور! مجھ پر کیا بیتتی رہی ہے اور میں تمہیں بتا کر اور دکھی کرنا بھی نہیں چاہتی۔ اب بھی تمہیں صرف اس لیے۔۔۔۔ فون کیا ہے کہ۔۔۔۔" ان کی آواز بھرا گئی

اور وہ چند سیکنڈ کے لیے چپ ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد حوصلہ جمع کر کے بولیں۔ "والی جی کو تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری توجہ کی، تمہاری محبت کی۔ ان کے ساتھ ٹھیک ہو جاؤ۔"

"ان کے ساتھ جتنا ٹھیک ہو سکتا ہوں اتنا تو ہوں۔"

"تم پہلے کی طرح ان کے پاس بیٹھتے نہیں، ہنستے بولتے نہیں، باتیں نہیں کرتے۔"

"میرے پاس ہنسی ہے ہی نہیں، تو کیسے ہنسوں؟"

"آجائے گی ہنسی۔۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بس ان کے ساتھ پہلے جیسے ہو جاؤ۔" وہ سنجیدگی سے بولیں۔

"بلقیس! اتنی سنگ دلی؟ اتنی سختی؟ اتنا انتظار؟ کیا آپ کو مجھ پر ترس نہیں آتا تھا؟"

"میں تمہیں کیا بتاؤں خاور! تم میری مجبوریاں نہیں سمجھ سکو گے۔"

"آپ مجھے کچھ نہ بتائیں۔ بس مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں نے بہت دکھ جھیلا ہے بلقیس! اب مجھے پھر سے کوئی نئی امید، کوئی نئی آس نہ دیں۔ اب ختم کر دیں سب کچھ۔" میرے سینے میں دکھ کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر میری کیفیت کو سمجھتے ہوئے گداز لہجے میں بولیں۔ "اچھا پھر بات کریں گے۔ شاید کل اسی وقت۔ میں ایک بیل کروں گی۔" میں چپ رہا۔ "اچھا خداحافظ۔" انہوں نے کہا اور انٹر کام بند کر دیا۔

میرے دل کی حالت کچھ عجیب تھی۔ کہنے کو تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اس سفر کو ختم کر دینا چاہتا ہوں لیکن یہ کہتے ہوئے میرے دل پر جو بیت رہی تھی، وہ مجھے ہی پتا تھا۔

بیگم بلقیس کا یہ فقرہ بار بار کانوں میں گونجنے لگا۔۔۔۔ آجائے گی ہنسی بھی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ امید افزا فقرہ تھا اور اس میں سے آس کی نئی کرنیں پھوٹتی تھیں۔

میں نے بڑی ہی بے قراری سے اگلی رات کا انتظار کیا۔ یہ ایک طرح سے "اسٹینڈ بائی" کا اشارہ تھا۔ کچھ دیر بعد دوسری بیل ہوتے ہی میں نے ریسیور اٹھالیا۔ ہم کچھ دیر خاموش رہا کرتے تھے تاکہ اگر دوسری طرف سے منشی منظور ریسیور اٹھائے بھی تو اس کے کان میں کوئی آواز نہ پڑے۔ اب بھی ہم نے ایسا ہی کیا تھا کچھ دیر بعد ہماری بات چیت شروع ہو گئی۔

شکوے شکایتیں ہوئیں۔ میں نے ان درد بھرے شب و روز کا ذکر کیا جن کا ایک ایک پل بیگم بلقیس کی کال کا انتظار کرتے گزرا تھا۔ میں نے ان سے بار بار پوچھا کہ وہ اتنا سخت دل کیسے ہو گئی تھیں جبکہ انہیں معلوم بھی تھا، میں ایک ایک سیکنڈ گن کر گزار رہا ہوں۔

شکوے شکایتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو ہماری گفتگو کی گھمبیرتا کچھ کم ہو گئی۔ اس گفتگو میں بیگم بلقیس نے اپنے پیارے انداز میں ایک فقرہ کہا اور یہ فقرہ کئی روز تک میرے کانوں میں گونجتا رہا۔ میں اس فقرے کی گرہیں کھولنے میں لگا رہا۔ میں نے ان سے کہا تھا۔ "آپ نے اب بھی کال کیوں کی؟ ڈیڑھ سال تو گزر گیا ہے۔۔۔۔ کچھ اور وقت گزرنے دینا تھا۔" جواب میں وہ بولیں۔ "اب بھی اپنے لیے تو کچھ نہیں کیا نا۔ تمہارے اور والی جی کے لیے ہی کیا ہے نا۔" یعنی میرے اور والی جی کے خوشگوار رابطے بحال کرنے کے لیے۔

اس فقرے کی گہرائی میں اترا جاتا تو اس میں یہ بات پوشیدہ تھی کہ وہ بھی اس دوری کو شدت سے محسوس کر رہی ہیں۔ میرے لیے تڑپی ہیں لیکن اب بھی وہ اپنے لیے نہیں، والی جی کے بہتر حالات کے لیے میری طرف آئی ہیں۔ اپنے اس فقرے سے انہوں نے تین کام لیے تھے۔ ایک طرف میری محبت کا ڈھکا چھپا اظہار تھا۔ دوسری طرف اپنی پسپائی چھپائی

تھی۔ تیسری طرف شاید انہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے مذہبی ذہن کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی یعنی مجھ سے دوبارہ رابطہ بحال کرنے کے لیے اخلاقی جواز ڈھونڈا تھا اور وہ جواز یہ تھا کہ اس کام میں ان کے شوہر کی بہتری شامل ہے۔

رات کے سنسناتے اندھیرے میں بمبو کاٹ پر ہونے والی تین چار ملاقاتوں میں ہی ہماری گفتگو پرانی ڈگر کی طرف لوٹنے لگی۔

"میرے کان ترس گئے ہیں۔" ایک رات میں نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔

"اب کیوں ترس رہے ہیں بھئی! اب بول تو رہی ہوں۔"

"صرف بولنے سے میری تسلی نہیں ہوگی۔۔۔۔ میں اپنی پرانی یادیں دہرانا چاہتا ہوں۔ آپ کی گائی ہوئی ہیر کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔"

"نہیں خاور! یہ ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی بھائیا عزیز آج کل بہت دیر سے سوتے ہیں۔ ان کے کان بھی بڑے تیز ہیں۔"

میں اصرار کرتا رہا لیکن وہ نہیں مانیں۔ میں نے کہا۔

"اچھا پھر مجھے "بس" کہہ کر سنا دیں۔"

"کیا مطلب؟"

"گیت کے آخر میں آپ پوچھا کرتی تھیں ناں۔۔۔۔ بس؟"

وہ ہنسنے لگیں۔ "خاور! کبھی کبھی تم بالکل بچے بن جاتے ہو۔"

"ہم دونوں ہی بچے تھے لیکن اب آپ سیانی ہو گئی ہیں۔"

میرے اصرار پر انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس؟"

"آپ کی بس پر بہت پیار آتا ہے۔ پتا ہے، کیا جی چاہتا ہے؟"

"کیا؟"

میں نے بھولے بسرے انداز میں چومنے کی آواز پیدا کی۔ وہ بس ہولے سے ہنس کر رہ گئیں۔

"جواب دیں نا بھئی۔" میں نے اصرار کیا۔

"نہیں خاور! یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں بھی ٹھیک نہیں ہوں؟"

"ہاں، تم بھی ٹھیک نہیں ہو۔اب میں تمہیں ٹھیک کروں گی۔۔۔۔۔ہم ایک دم پہلے جیسے ہو جائیں گے۔جب تم حامد کو پڑھانے آیا کرتے تھے، مزیدار باتیں کرتے تھے۔خود ہنستے تھے، ہم کو بھی ہنساتے تھے۔" بیگم بلقیس نے ملائم لہجے میں کہا۔

"واپسی؟"

"نہیں۔جو کچھ دل میں ہے، وہ تو اپنی جگہ ہے لیکن اب ہم سیدھے سیدھے چلیں گے۔۔۔۔۔سیدھی سیدھی باتیں کریں گے۔محبت سب کچھ پا لینے ہی کا نام تو نہیں ہے۔دور رہ کر بھی محبت ہو سکتی ہے۔اور خبردار! اپنے گھر والوں سے اپنا معاملہ صحیح کرو۔مجھے پتا چلا تھا تمہاری والدہ تم سے ناراض ہیں۔تم نے اپنی جگہ اپنے بڑے بھائی کو دبئی سے بلایا ہے اور اب والدہ اس کے پاس ہیں۔تم ان سے دور کیوں بھاگتے ہو؟"

"وہ شادی کا کہتی ہیں۔"

"تو کر لو نا شادی۔کوئی پیاری سی لڑکی ڈھونڈ لو۔ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔وقت گزر جائے تو بڑی مشکل ہوتی ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کیا آپ نے یہ نصیحتیں کرنے کے لیے ہی دوبارہ رابطہ شروع کیا ہے؟" میرا لہجہ بہت بوجھل تھا۔

"اوہو۔۔۔۔۔ایک تو تم ناراض بڑی چھیتی ہو جاتے ہو۔۔۔۔۔اچھا چلو، کوئی اور بات کرتے ہیں۔۔۔۔۔والی جی کے ساتھ شکار پر کب جاؤ گے؟ پچھلی دفعہ انہیں تمہارے ساتھ بہت مزہ آیا تھا۔"

میں خاموش رہا۔"ہیلو۔۔۔۔۔ہیلو!" انہوں نے دوبارہ کہا۔

پھر ذرا شوخی سے بولیں۔"ہیلو ہر فن مولا صاحب۔۔۔۔۔ہیلو"!

میں نے گھمبیر آواز میں کہا۔"بلقیس! ہر دم دل کو دھڑکا لگا رہتا ہے۔جس طرح آپ نے پہلے ایک دم چھوڑ دیا تھا، کہیں ایک بار پھر نہ چھوڑ جائیں۔"

"اچھا بابا! ہاتھ جوڑتی ہوں۔اب چھوڑو بھی وہ پہلے کی باتیں۔" انہوں نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

بیگم بلقیس سے دوبارہ رابطہ بحال ہونے کے بعد ان کے لیے طلب میرے اندر بڑی شدت سے ابھری تھی۔ ان کی باتیں جاں فزا تھیں لیکن میں ان باتوں سے آگے جانا چاہتا تھا۔ وہی ایک تیز رو بہاؤ جو کہیں پاؤں ٹکنے نہیں دیتا۔ والی جی مچھلی فارم والے رقبے کی ایک تاریخ پر گئے تو مجھے دیر تک بیگم بلقیس سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔

ہم نے بہت سی بھولی بسری باتیں کیں۔ جدائی کے دنوں کا تذکرہ ہوا۔۔۔۔ گفتگو کے دوران میں، میں چنچل ہو گیا۔ میں نے انٹر کام پر انہیں چوما اور جواب دینے پر اصرار کرتا رہا لیکن وہ ٹالتی رہیں۔ "نہیں خاور ے! میں نے خود سے کچھ وعدے کیے ہیں۔ انہیں نہ توڑو۔"

"سب سے پہلا وعدہ میرے ساتھ تھا اور وہ یہ تھا کہ واپسی نہیں ہو گی۔ یقین کریں کہ۔۔۔۔"

"نہیں کرتی۔" انہوں نے پرانی ادا کے ساتھ میری بات کاٹی۔ ہم دونوں ہنس دیئے۔

"اچھا، آپ جواب نہ دیں لیکن مجھے تو اس خوشی سے محروم نہ کریں۔ میں۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔ کو۔۔۔۔ چومنے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور ریسیور کے ماؤتھ پیس کو مختصر وقفوں سے چومتا رہا۔

"آپ کی پیشانی پر۔۔۔۔ آپ کی ناک کے کوکے پر۔۔۔۔ آپ کے ہونٹوں پر۔۔۔۔ آپ کی ٹھوڑی پر۔۔۔۔ آپ کی گردن پر۔۔۔۔ آپ کے۔۔۔۔"

"بس بس بہت ہو گیا۔" وہ یقیناً شرم سے لال ہو کر کہہ رہی تھیں۔ "کوئی اور بات کرو۔"

"مجھے تو آپ کے سامنے بس ایسی ہی باتیں آتی ہیں اور پتا نہیں کیا کر دیا ہے آپ نے۔۔۔۔ کوئی اور بات کرنی ہے تو آپ کریں۔"

"اچھا، وہ ثمینہ والا معاملہ کیسے حل کیا تھا تم نے؟ ایک موقعے پر تو لگتا تھا کہ پاشے سے دونوں بہنوں کی جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔"

"بس میں نے آپ کا نام لیا، منتر پڑھا اور دونوں بہنوں کو جو جن چمٹا ہوا تھا۔ وہ اُڑن چھو ہو گیا۔"

"کچھ نہ کچھ تو ضرور کیا ہو گا تم نے؟"

"نہیں، کچھ خاص نہیں بلقیس۔ بس وہی کیا جو لاتوں والے بھوتوں سے کیا جاتا ہے۔"

"دیکھو، تم بھی والی جی کی طرح مجھ سے چھپا رہے ہو۔ تم دونوں کی خصلت ایک جیسی ہے۔" انہوں نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ پاشے کے جن کو بوتل میں واپس بند کرنے کے لیے مجھے تصویروں والا انوکھا اور نازیبا کام کرنا پڑا تھا۔ بلکہ شاید "نازیبا" کا لفظ اس کے لیے معمولی تھا۔

"یہ پاشا بڑا خطرناک بندہ ہے خاور! ان دنوں مجھے تمہاری بہت فکر رہتی تھی۔۔۔۔ اور پھر وہ شیر کھلا چھوڑنے والا واقعہ ہو گیا۔ یقین کرو، اس واقعے کا بڑا اثر پڑا علاقے کے لوگوں پر۔ اتنے مہینے گزر گئے ہیں پر ابھی تک کھیتوں میں دور تک جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ خاص طور سے بچے بہت ڈرتے ہیں۔"

"شیر کو اور شیر والے کو بڑے ٹھیک جواب ملے ہیں بلقیس! اب وہ بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھائیں گے اور اگر اٹھائیں گے تو پہلے سے بھی سخت جواب ملے گا"۔

"اپنا خیال رکھا کرو خاور!" بیگم بلقیس نے عجیب لہجے میں کہا۔

"ایک وقت میں ایک ہی خیال رکھا جا سکتا ہے نا۔" میرا انداز معنی خیز تھا۔

"اچھا، ایک بات مجھے سچ سچ بتاؤ خاور! قلعہ والا کا راستہ کیسے کھلا تھا؟"

"جیسے رستے کھلتے ہیں۔ جیسے میرا اور آپ کا رستہ کھلا ہے۔"

"نہیں خاور! مجھے اصل بات بتاؤ۔ موکھلوں اور لمبڑوں کی لڑائی اتفاق سے ہو گئی تھی یا اس میں کوئی چکر تھا؟"

یہ بات بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں بیگم بلقیس کو بتادیا کہ دونوں پارٹیوں کا زور توڑنے کے لیے ہم نے کیا ترکیب آزمائی تھی۔

"تم بھی پاشے سے کم خطرناک نہیں ہو۔" وہ مسکراتے لہجے میں بولیں۔

"لیکن میری خطرناکی صرف پاشے جیسے لوگوں کے لیے ہے۔ اپنوں کے لیے تو میں ریشم سے زیادہ نرم ہوں۔ بالکل مصوروں اور شاعروں کی طرح۔ بلکہ دو تین دن پہلے تو میں نے باقاعدہ کچھ شعر بھی کہے ہیں۔"

"اوہو! تو یہ نوبت بھی آنی تھی۔"

"بالکل۔ اگر آپ کہیں تو زبانی سنا سکتا ہوں۔"

"سنائیں ہر فن مولا صاحب!"

"یہ شعر نہیں میرے اندر کا ڈر ہے۔۔۔۔۔ لیں سنیں۔

کچھ نہ کچھ ہو جانا ہے

تم نے پھر کھو جانا ہے

دکھ کی چادر تان کے پھر

قسمت نے سو جانا ہے

اس کو مت روکو اس نے

جانا ہے تو جانا ہے"

"ہائے میں مر گئی۔ اتنے دکھی شعر۔ تم اچھی اچھی باتیں کیوں نہیں کرتے ہو؟ مانا کہ تم ہر کام کر لیتے ہو مگر۔۔۔۔۔"

اچانک انہیں چپ ہونا پڑا۔ کوئی آہٹ سنائی دی تھی۔

"اچھا، ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ کل بھی آج والے ٹائم پر بات کریں گے۔" انہوں نے کہا اور بمبو کاٹ بند کر دیا۔

اگلے روز بادل تھے۔ صبح نو بجے کے لگ بھگ انٹر کام پر بیل ہوئی۔ یہ اکلوتی بیل نہیں تھی۔ نو منٹ بعد منشی منظور نے آ کر بتایا کہ والی جی بلا رہے ہیں۔ میں نے منشی کے کمرے میں جا کر ریسیور اٹھایا۔ والی جی بولے۔ "نکووال جانا ہے۔ بلقیس کی پھوپھی بہت بیمار ہیں۔۔۔۔۔ وہ ابھی جانا چاہتی ہے۔ نصر اللہ کے ساتھ آٹھ دس بندے بھیج دو۔ تیمور بھی چلا جائے تو بہتر ہے۔"

بیگم بلقیس کے ساتھ جو محافظ جاتے تھے، اکثر ان کا انچارج نصر اللہ ہی ہوتا تھا۔ اتفاقاً آج نصر اللہ موجود نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "والی جی! نصر اللہ تو اپنے پنڈ گیا ہوا ہے۔"

والی جی چند سیکنڈ خاموش رہے اور پھر بولے۔ "چلو پھر تم چلے جاؤ۔ تیمور کو یہیں رہنے دو۔ میں نے ذرا فارم تک جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے جی۔۔۔۔۔ جو حکم۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم دس گھڑ سوار بیگم بلقیس کی گاڑی کے پیچھے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ دو گھوڑے، گاڑی کے آگے آگے تھے۔ عام طور پر پچھلے گھڑ سواروں کو راستے کی گرد پھانکنی پڑتی تھی مگر رات چونکہ ہلکی بارش ہوئی تھی، اس لیے صورتِ حال ٹھیک تھی۔ گاڑی یعنی پرانے ماڈل کی لینڈ روور میں ڈرائیور صوفی اسلم کے علاوہ بیگم بلقیس اور تاجو موجود تھیں۔

ہم قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں نکووال پہنچے۔ نکووال کے نواح میں بھی ایک چھوٹا سا ٹیلا (تھے) موجود تھا۔ اس ٹیلے کو دیکھ کر مجھے کوس پور کا ٹیلا یاد آ گیا اور اس ٹیلے سے وابستہ دوسری باتیں بھی۔ وہ چاندنی رات جس میں جادو کی سی کیفیت تھی۔ بیگم بلقیس اور دیگر لوگ وہاں کھنڈروں کی سیر کے لیے گئے تھے۔ ایک بلندی پر چڑھنے کے لیے میں نے بے ساختہ بیگم بلقیس کو ہاتھ کا سہارا دیا تھا۔ اور پھر وہ منظر جب والی جی کے جوتے صاف کرتے ہوئے بیگم بلقیس کا جسم چاندی کی طرح چمکا تھا۔۔۔۔ اور چاندنی میں ڈوبتی ابھرتی ہوئی، وہ آواز۔۔۔۔ وہ پنجابی نغمہ، اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے۔ بہت کچھ تصور کے پردے پر نمایاں ہو گیا۔

بیگم بلقیس اپنے پھوپھا کی حویلی چلی گئیں۔ یہ حویلی گاؤں کے ایک کنارے پر واقع تھی۔ بیگم بلقیس کے اندر جانے کے بعد ہم ان کی گاڑی کے قریب موجود رہے۔ ہمارے لیے چائے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

پانی وہیں احاطے میں بھجوا دیا گیا۔ گاؤں کے لوگ جاگیر کے نئے سالار یعنی مجھے دیکھنے کا شوق رکھتے تھے۔ بہت سے بچے بھی ہمارے ارد گرد ہی منڈلا رہے تھے۔ میں ان سے باتیں کرنے لگا۔

اچانک میں نے ملتانی کو تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ وہ میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "سالار جی! وہاں فارم پر جھگڑا ہو گیا ہے۔ موکھلوں نے والی جی کو گھیر لیا ہے۔"

"کس نے بتایا؟"

"مکھن وال کا ایک بندہ بتا کر گیا ہے جی۔۔۔۔ وہ ادھر سے ہی آ رہا ہے۔ اس نے کہا ہے، وہاں گولی چل رہی ہے۔"

اس قسم کی کاروائی کا خطرہ موجود تھا۔ جب میں حویلی سے نکلا تھا تو والی جی نے بتایا تھا کہ انہوں نے مچھلی فارم پر جانا ہے۔ وہاں موکھلوں کے کارخانے سے ذرا ہٹ کر مچھلیوں کا نیا تالاب بنایا جا رہا تھا۔

میں نے چار ساتھیوں کو وہیں بیگم بلقیس کی حفاظت کے لیے چھوڑا اور خود گھوڑی پر سوار ہو کر باقی ساتھیوں سمیت فارم کی طرف بڑھا۔ فارم یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بس ڈھائی تین میل کا فاصلہ تھا۔ موکھلوں کا گاؤں گوریکے ہمارے بائیں طرف اور مچھلی فارم دائیں طرف تھا۔ ہم کچے راستے پر برق رفتاری سے گھوڑے دوڑاتے چلے گئے۔ ملتانی مجھے بتا رہا تھا کہ اطلاع کے مطابق کوئی پچاس بندے دو ٹریکٹر ٹرالیوں پر سوار ہو کر گوریکے سے مچھلی فارم پر پہنچے ہیں۔

میرے کان گولیوں کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ دیہاتی علاقے کے خاموش ماحول میں فائرنگ کی آواز کافی دور سے بھی سنائی دے جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہوا کا رُخ بھی مچھلی فارم سے ہماری طرف تھا۔ بہر حال، مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ پھر میں نے ایک اور چیز نوٹ کی۔ اگر ٹریکٹر ٹرالیاں یہاں سے گزر کر مچھلی فارم کی طرف گئی تھیں تو گیلے راستے پر ٹائروں کے تازہ نشان ہونے چاہئیے تھے۔ اس کے علاوہ مچھلی فارم تک جانے کا کوئی رستہ نہیں تھا۔ لیکن تازہ نشان دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ دفعتاً میری چھٹی حِس نے مجھے خبردار کیا کہ

کوئی چال چلی جا رہی ہے۔۔۔۔۔ میرا جسم سنسنا اٹھا۔ کہیں ہمیں مچھلی فارم کی طرف متوجہ کر کے بیگم بلقیس کو نقصان پہنچانے کا ارادہ تو نہیں کیا گیا؟

میں نے زور سے گھوڑی کی باگیں کھینچیں اور وہ کسی تیز رفتار گاڑی کی طرح پھسلتی ہوئی رک گئی۔ ساتھی بھی رک گئے۔

"کیا ہوا سالار جی؟" ملتانی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

میں نے چند لمحے تک تذبذب میں رہنے کے بعد ملتانی سے کہا۔ "مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔۔۔۔ تم اور برکت فارم پہنچو، ہم واپس جا رہے ہیں۔"

"کیوں جی؟"

"بس، جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔" میں نے کہا اور ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے گھوڑی کو موڑ کر ایڑ لگا دی۔

جن دنوں کا یہ واقعہ ہے، دفعہ 144 لگی ہوئی تھی اور اسلحہ لے کر چلنے پر سخت پابندی تھی۔ یہ فوجی حکومت تھی اور مظاہرے وغیرہ ہو رہے تھے۔ حالانکہ ہم بیگم بلقیس کی

محافظت کے لیے آئے تھے۔ مگر ہمارے پاس صرف لاٹھیاں اور چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں تھیں۔ صرف میں نے اپنی قمیض کے نیچے 38 بور کا پستول لگایا ہوا تھا۔ باقی دو رائفلیں نکووال میں رہ جانے والے ساتھیوں کے پاس تھیں۔

ہم ابھی نکووال سے تین چار فرلانگ ہی دور تھے کہ کچھ آوازیں آئیں اور میرا شبہ ایک ہی جست میں یقین کی منزل تک پہنچ گیا۔ یہ فائرنگ کی آوازیں تھیں اور گاؤں کے مشرقی کنارے سے آرہی تھیں جہاں بیگم بلقیس کے پھوپھا کی مکان نما حویلی تھی۔

ہم نے گھوڑوں کی رفتار اور تیز کر دی۔ تین چار منٹ کے اندر ہم موقعے پر تھے۔ یہاں کا نقشہ سنسنی خیز تھا۔ لوگ فائرنگ کی جگہ سے دور کھیتوں میں اور چھتوں پر کھڑے تھے۔ ہراس کی ایک لہر چاروں طرف پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔ حویلی کے سامنے امرودوں کا ایک باغ تھا جو اب اجڑ چکا تھا۔ اس میں چند کچے کوٹھے بنے ہوئے تھے۔ فائرنگ ان کوٹھوں کے پیچھے سے ہو رہی تھی۔ اس فائرنگ کا جواب حویلی کے اندر سے دیا جا رہا تھا۔

ہم ایک چکر کاٹ کر پچھلی طرف سے حویلی میں داخل ہو گئے۔ میں نے گھوڑی سے جست لگائی اور دوڑتا ہوا چھت پر پہنچا۔ اس کچی چھت کے ارد گرد تین فٹ اونچی کچی منڈیر موجود

تھی جس میں ہوا کے لیے رخنے سے بنے ہوئے تھے۔ میرے ساتھی اور حویلی کے دو ملازم اس منڈیر کے پیچھے موجود تھے اور بڑی دلیری سے فائرنگ کا جواب دے رہے تھے۔ چھت پر گولیوں کے گرم خول بکھرے ہوئے تھے۔ تاہم صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ حملہ کرنے والوں کا پلڑا بھاری ہے۔ حویلی کی چھت سے دو تین فائر ہوتے تھے تو ادھر سے آٹھ دس گولیاں چلتی تھیں۔ دو رائفلیں تو میرے ساتھیوں کے پاس تھیں۔ دو رائفلیں مالک مکان کے پاس تھیں اور وہ بھی استعمال ہو رہی تھیں۔ جونہی ہم لڑائی میں شامل ہوئے، ایک طرف جھکتا ہوا پلڑا ذرا ہموار ہو گیا۔ مالک مکان یعنی بیگم بلقیس کے پھوپھڑ کا ایک ملازم بڑے اطمینان اور اعتماد سے فائرنگ کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں روسی ساخت کی شکاری رائفل بیکال تھی۔ راجوال میں ہم ایسی رائفل مرغابیوں کے شکار میں استعمال کرتے تھے۔ میں نے اپنے ساتھی شبیر سے پوچھا۔ "بیگم جی تو ٹھیک ہیں؟"

"ٹھیک ہیں جی۔۔۔۔۔ پر ان کے پھوپھڑ جی کو گولی لگی ہے۔۔۔۔۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا جی۔منڈا سے باندھے ہوئے ہیں۔کسی حرام زادے کی شکل نظر نہیں آئی۔"

"کتنے ہیں؟"

"پندرہ وی سے کم نہیں ہوں گے۔ان کے ارادے بڑے خطرناک ہیں جی۔"شبیر نے رخنے کے اندر سے سیون ایم ایم رائفل کا سنگل فائر کرتے ہوئے کہا۔اس وقت میری نظر شبیر کے بازو پر پڑی۔وہاں کلہاڑی کے پھل کا گہرا کٹ تھا اور کُرتہ خون آلود ہو رہا تھا۔۔۔۔اندازہ ہوتا تھا کہ حملہ آوروں نے حویلی کے اندر گھسنے کی کوشش بھی کی ہے جو وقتی طور پر ناکام رہی۔

گولیاں ٹھس ٹھس کی پُر خطر آواز سے مٹی کی نو انچ موٹی منڈیر میں پیوست ہو رہی تھیں۔کچھ ہمارے سروں کے اوپر سے سرلائے مارتی گزر رہی تھیں۔اس سنسناتی آواز نے میرے جسم میں عجیب سی ترنگ بھر دی۔لہو میں شرارے سے چھوٹنے لگے۔میرا جی چاہا کہ ان لوگوں میں موکھل پاشا بھی شامل ہو اور میں آج اس کی ٹانگیں چیر کر اسے نکووال کے آوارہ کتوں کے سامنے پھینک سکوں۔

شبیر کے ایک ساتھی نے پکار کر مجھے مخاطب کیا اور باغ سے باہر ایک چوبارے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔"سالار جی!ایک بندہ وہاں چڑھا ہوا ہے۔اس کی گولی کسی کو بھی لگ سکتی ہے۔"

میں نے بھی یہ بات نوٹ کی تھی۔کچھ گولیاں خطرناک زاویے سے آ رہی تھیں۔یقیناً یہ اسی کچے چوبارے سے چلائی جا رہی تھیں۔میں نے اپنا پستول شبیر کو دیا اور اس کی سیون ایم ایم لے کر چھت سے نیچے اتر آیا۔یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ چوبارے والے کو کہاں سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔میں گلی میں جھک کر دوڑتا ہوا اس کچے ٹیلے (تھے) کی طرف گیا جو مکئی کے کھیتوں کے پاس سے شروع ہو جاتا تھا۔کچھ آوازوں نے مجھے اس طرف جانے سے منع کیا۔چند گولیاں سنسناتی ہوئی میرے قریب سے گزریں۔میں لپکتا ہوا ٹیلے پر پہنچ گیا۔اب میں چوبارے کے پہلو میں تھا۔یہاں سے مجھے وہ لمبا چوڑا ڈھاٹا پوش دکھائی دیا جو چوبارے کی چھت پر ایک تندور کے پیچھے موجود تھا اور مہلک فائر کر رہا تھا۔اس کے ہاتھوں کسی بھی وقت کسی کی جان جا سکتی تھی۔اس لیے اس پر سیدھا فائر کرنا کوئی جرم نہیں تھا۔یہ "مارو یا مرو" والی صورتِ حال تھی۔میں نے نشانہ لیا اور بے دریغ گولی چلائی۔وہ

تڑپ کر پہلو کے بل گرا اور میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ یہ کاروائی میں نے قریباً دو سو فٹ کی دوری سے کی تھی۔

یہاں سے مجھے کوئی اور شخص نظر نہیں آرہا تھا۔ تاہم میں نے باغ کی سمت فائرنگ جاری رکھی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ حملہ آور بھاگ رہے ہیں۔ میں نے ایک دو پرچھائیوں کو تیزی سے ٹنڈ منڈ درختوں میں حرکت کرتے دیکھا۔ پھر درختوں کے عقب میں کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ میں نے ٹیلے کے اوپر سے پکار کر کہا۔ "شبیر! وہ بھاگ رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں ٹیلے سے نیچے اترا اور تیزی سے اپنی چوکس گھوڑی کی طرف دوڑا۔ میرے آٹھ دس ساتھی بھی اپنے اپنے گھوڑوں کی طرف لپکے۔ ہم بھاگنے والوں کے پیچھے بھاگے۔۔۔۔ وہ ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے قریباً نصف فرلانگ دور جا چکے تھے۔ ان کی نیلے رنگ کی جیپ کی بس ایک جھلک میں نے دیکھی۔ اس کے ارد گرد گھوڑے تھے۔

ہم اندازاً ایک میل تک ان کے پیچھے گئے۔ پھر میں نے اپنے ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ہمارے پاس صرف دو رائفلیں اور ایک پستول تھا جبکہ وہ سب کے سب پوری طرح

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

مسلح تھے۔ کھلی جگہ پر اگر وہ پلٹ پڑتے تو ہمارا شدید نقصان کر سکتے تھے۔ میرے ساتھی نہایت پُرجوش تھے مگر میں نے انہیں روک لیا۔

ہم گاؤں میں واپس آئے تو جیسے پورا گاؤں بلقیس کے پھوپھا کی مکان نما حویلی کے گرد جمع ہو چکا تھا۔ بلقیس کے پھوپھا کو لگنے والی گولی ان کے ایک بازو کو چھید کر نکل گئی تھی۔ ان کی حالت تسلی بخش تھی۔ زخمی ہونے والے دیگر چار افراد میں سے دو کو گولی کے زخم آئے تھے جبکہ دو افراد کلہاڑیوں سے زخمی ہوئے تھے۔ بہر حال، یہ سب کچھ دیہاتی لڑائیوں میں معمول کا حصہ تھا۔ ابھی تک یہ بات پوری طرح کھل نہیں سکی تھی کہ حملہ آور کون ہیں۔ بہر حال، دھیان سب کا موکھلوں کی طرف ہی جا رہا تھا۔

مجھے اس بندے کا خیال آیا جو میری گولی سے زخمی ہو کر چوبارے میں گرا تھا۔ میں نے شبیر سے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

ہم احتیاط کے ساتھ اس چوبارے نما گھر میں داخل ہوئے۔ یہ کچا مکان تھا اور دو منزلہ نہیں تھا۔ دراصل یہ "تھے" کی ایک ڈھلوان پر تھا اس لیے اونچا نظر آتا تھا۔ مکان کے مکین

خوفزدہ ہو کر یہاں سے نکل گئے تھے اور اب بھی کافی فاصلے پر کھڑے تھے۔ "میرا خیال ہے جی، وہ حرامی دوسروں کے ساتھ ہی نکل گیا ہے۔" شبیر نے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ دیکھیں جی۔۔۔۔۔ یہ خون کے قطرے۔۔۔۔۔ یہ نیچے آرہے ہیں۔" شبیر نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ہم خون کے قطروں کو دیکھتے ہوئے صحن میں آئے۔ قطرے عقبی دیوار کی طرف جا رہے تھے۔ شبیر کا اندازہ درست معلوم ہوتا تھا۔ وہ بولا۔ "یہ دیکھیں جی سالار صاحب۔"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میرے ساتھ ساتھ وہ بھی چونکا۔ بائیں طرف پرالی کا ڈھیر تھا۔ اس میں سے ایک رائفل جھانک رہی تھی۔ مجھے ایک لحظے کی دیر ہوتی تو رائفل سے نکلنے والی گولی شبیر کو چاٹ جاتی۔ میں نے جست لگائی اور پہلو کی طرف سے رائفل کے اوپر گرا۔ ایک دھماکے سے گولی کچی زمین میں گئی۔ میں نے رائفل بردار کے منہ پر سر کی ٹکر رسید کی اور وہ ڈکراتا ہوا پرالی کے ڈھیر پر جا گرا۔ اس کی رائفل میرے نیچے دبی رہ گئی تھی۔ پرالی میں جیسے اسپرنگ لگے ہوئے تھے، وہ گرتے ہی اچھل کر میری طرف آیا۔ اس

مرتبہ اس کے ہاتھ میں شکاری چاقو تھا۔ یہ ایک پھرتیلے شخص کا نہایت زوردار حملہ تھا۔ میں بہ مشکل خود کو بچا سکا۔ پھر بھی ایک انگارے جیسا کٹ میرے بازو پر آگیا۔ حملہ آور چنگھاڑتا ہوا پھر میری طرف آیا۔ اس دفعہ میں نے پیچھے ہٹ کر دندانے دار چاقو کا وار بچایا اور وزنی رائفل اتنی طاقت سے اس کے تھوبڑے پر ماری کہ وہ مردہ چھپکلی کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ شبیر نے اسے چھاپ لیا اور مکمل طور پر بے بس کر دیا۔

لڑائی کے دوران میں ہی اس شخص کا ڈھاٹا کھل گیا تھا۔ وہ اجنبی تھا مگر اس کے چہرے مہرے سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ موکھلوں میں سے ہے۔

ٹیلے پر سے میں نے جو گولی چلائی تھی، وہ اس گرانڈیل شخص کی ران پر لگی تھی اور ابھی تک اندر ہی تھی۔ تھوبڑے پر رائفل کی شدید ضرب نے اسے نیم بے ہوش کر دیا تھا۔ پھر بھی احتیاطاً اس کی مشکیں کس دی گئی تھیں۔

بیگم بلقیس کے پھوپھا انور علی نے کہا۔ "بیٹا جی! مجھے خطرہ ہے کہ کہیں یہ لوگ اور بندوں کے ساتھ پلٹ کر نہ آجائیں۔"

"مجھے نہیں لگتا جی کہ اب یہ اتنی جلدی ایسی ہمت کریں گے۔"

"پھر بھی ہمیں احتیاط کرنی چاہئیے۔ تم بلقیس کو لے کر فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ اگر یہاں کوئی معاملہ ہوا تو ہم سنبھال لیں گے۔"

"ہاں جی! آپ گاڑی پر نکل جائیں یہاں سے۔" شبیر نے بھی مشورہ دیا۔

ایک دو منٹ کے اندر یہ طے ہو گیا کہ بیگم بلقیس کو یہاں سے نکال لینا چاہئیے۔ بیگم بلقیس اور دیگر عورتیں ابھی تک حویلی کے اندرونی کمروں میں تھیں اور انہیں باہر ہونے والے ہنگامے کی نوعیت کا زیادہ علم نہیں تھا۔ میں نے انور علی صاحب سے بھی کہہ دیا کہ وہ باہر کے حالات کی خبر بیگم بلقیس کو نہ ہونے دیں اور انہیں یہ پتا بھی نہ چلے کہ حملہ آور ان کے لیے آئے تھے۔

میرے زخمی بازو پر دو ساتھیوں نے اچھی طرح پٹی باندھ دی۔ میں خون آلود قمیض کے ساتھ بیگم بلقیس اور تاجو وغیرہ کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے انور علی صاحب سے ایک صاف قمیض منگوالی۔

آٹھ دس منٹ بعد صوفی اسلم، تاجو، بیگم بلقیس، شبیر اور میں گاڑی پر نکووال سے نکل رہے تھے۔ یہ ہماری اپنی جیپ نہیں تھی۔ احتیاطاً ہم نے گاؤں ہی میں موجود ایک دوسری گاڑی

استعمال کی تھی۔ یہ گہرے براؤن رنگ کی ٹویوٹا مارک ٹو تھی۔ یہ نہایت ڈھیٹ گاڑی، کچے راستوں پر جیپ ہی کی طرح چلتی ہے۔ نکووال سے نکلنے سے پہلے میں نے ایک اور کام کیا تھا۔ ہماری جیپ کی نشستوں کے نیچے چار رائفلیں چھپی ہوئی تھیں۔ ان رائفلوں کے قریباً دو سو راؤنڈ بھی نشستوں کے نیچے ہی موجود تھے۔ میں نے احتیاط کے طور پر یہ اسلحہ اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دیا تھا۔

صوفی اسلم ڈرائیور تھا مگر اس کی جگہ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی۔ اسلم اور شبیر میرے ساتھ والی نشست پر سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئے تھے۔ بیگم بلقیس اور تاجو پچھلی نشست پر تھیں۔

یہ سہ پہر ڈھائی تین بجے کا وقت تھا مگر بادلوں کی وجہ سے شام لگ رہی تھی۔ بوندا باندی بھی شروع ہو چکی تھی۔ جب تک ہم گوریکے سے پانچ چھ میل آگے نہیں نکل آئے، زبردست تناؤ میں رہے۔ آگے جو ایک دو گاؤں تھے، وہ ایک طرح سے جاگیر کے ہم خیال تھے۔ ہمارا اب تک کا سفر بالکل خاموشی میں کٹا تھا۔ بس میں اور شبیر آپس میں کبھی کوئی مدھم سرگوشی

کر لیتے تھے۔ بند گاڑی میں، میں بیگم بلقیس کے جسم کی خوشبو اور سانسوں کی مہک محسوس کر رہا تھا۔۔۔ کاش! کوئی ایسی صورت ہوتی کہ اس گاڑی میں ہم اکیلے ہوتے۔

اچانک تھرتھراہٹ کے ساتھ گاڑی ایک طرف کو جھکتی چلی گئی اور رک گئی۔ "ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔" صوفی اسلم نے کہا۔

ہم نے نیچے اتر کر دیکھا۔ ٹائر پنکچر تھا۔ ڈکی کھولی تو فالتو ٹائر بھی ہوا سے خالی تھا۔ "کوئی دکان ہے یہاں؟" میں نے پوچھا۔

"پرانی پُلی کے پاس ہے۔"

"تو پھر جلدی کرو۔ بس آنا اور جانا ہو۔"

صوفی اسلم ٹائر لے کر فوراً روانہ ہو گیا۔ پُرانی پُلی زیادہ دور نہیں تھی۔ دس پندرہ منٹ کا پیدل رستہ تھا۔ بیگم بلقیس اور تاجو گاڑی میں بیٹھی رہیں۔ میں اور شبیر درختوں میں چلے گئے۔ یہاں ایک طرف پختہ چھت سی نظر آ رہی تھی۔ شبیر نے بتایا کہ یہ 65ء کی جنگ کا پرانا مورچا ہے۔ ہم کنکریٹ سے بنے ہوئے زمین دوز مورچے میں جا کر بیٹھ گئے۔ مارک ٹو سامنے نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ گاڑی کا یوں راستے میں کھڑے رہنا اور

بیگم بلقیس کا اس میں بیٹھے رہنا مناسب نہیں۔ وہ کسی کی نظر میں آ سکتی تھیں۔ میں نے جا کر ان سے کہا۔ "بیگم جی! بہتر ہے کہ آپ درختوں میں آ جائیں۔"

انہوں نے میری بات مان لی اور تاجو کے ساتھ گاڑی چھوڑ کر مورچے میں آ گئیں۔ میں نے بیگم بلقیس کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر ایک چھوٹے سے تھڑے پر بچھا دی۔ "کچھ پتا چلا، یہ کون بندے تھے؟" بیگم بلقیس نے حملہ آوروں کے متعلق پوچھا۔

"ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا جی۔"

"کسی کی جان کا نقصان تو نہیں ہوا؟"

"نہیں جی۔ اللہ کا شکر ہے۔ حالانکہ کافی دیر گولی چلی ہے۔ بس دو چار بندے زخمی ہوئے ہیں۔" میں نے انہیں پوری تفصیل بتائی۔ میرے ہشاش لہجے اور بے پرواہ انداز نے بیگم بلقیس کی پریشانی بھی کم کر دی۔

اسی دوران میں صوفی اسلم ٹائر لے کر آ گیا۔ وہ ٹائر بدلنے میں مصروف ہوا تو شبیر بھی اس کی مدد کے لیے وہاں پہنچ گیا۔ بادل ایک بار پھر گھر کر آ گئے تھے۔ شام سے کافی پہلے ہی اندھیرا محسوس ہونے لگا۔ گاہے بہ گاہے درختوں سے اوپر ابر آلود سرمئی آسمان پر بجلی بھی تڑپتی

تھی۔اسی دوران میں بوندا باندی شروع ہو گئی۔ بڑا رومانی سا موسم ہو گیا۔ بیگم بلقیس نے شال اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔"یہ جمعرات کی جھڑی ہے، لگتا ہے کئی دن تک چلے گی۔"

تاجو نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔مجھے ہمیشہ محسوس ہوا تھا کہ تاجو صرف ایک ملازمہ نہیں ہے۔وہ ہر معاملے میں۔۔۔۔۔شاید ہر معاملے میں بیگم بلقیس کی رازدار بھی ہے۔۔۔۔ایک گہری سہیلی جیسی !اس موقعے پر بھی تاجو نے ایسا ہی کردار ادا کیا۔گاڑی سے نکلتے ہوئے وہ ایک کالی چھتری اندر سے نکال لائی تھی۔یہ کافی بڑی چھتری تھی۔بارش شروع ہوئی تو ٹائر بدلنے میں مصروف صوفی اسلم اور شبیر بھیگنے لگے۔تاجو بولی۔"میں ان پر چھتری کرتی ہوں۔"یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

اب اس ملگجی تنہائی میں، میں اور بلقیس تنہا تھے۔تنہائی کے وہ لمحے جن کے لیے میں ایک مدت سے ترس رہا تھا اور جو اچانک قیمتی موتیوں کی طرح میری جھولی میں آن گرے تھے۔انٹر کام پر ہوتی رہنے والی بے باک گفتگو نے میرے اندر حوصلہ بھر دیا تھا۔میں نے پیاسی نظروں سے بیگم بلقیس کی طرف دیکھا۔وہ بھی اس تنہائی کو اور میری پیاس کو محسوس کر

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

چکی تھیں۔وہ اپنے آپ میں سمٹ سی گئیں۔میں قریب پہنچا تو انہوں نے لاچاری سے کہا۔"نہیں خاور! یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

یہ مزاحمتی فقرہ بڑا کمزور تھا۔اس کمزوری نے مجھے مزید حوصلہ دیا۔میں نے ان کے ہاتھ تھامے اور اپنا چہرہ ان سے قریب تر کر دیا۔"خاور! دیکھو، تم مجھ کو توڑ رہے ہو۔"وہ منمنائیں۔

"میں تو خود ٹوٹ رہا ہوں۔"میں نے کہا اور اپنے ہونٹوں کو ان کے چہرے سے ہمکلام کر دیا۔بھولا بسرا لمس، بھولی بسری خوشبو اور حدت! میں نے انہیں بانہوں میں لے لیا۔انہوں نے ذرا سا ٹھٹک کر خود کو میری وارفتگی کے حوالے کر دیا۔یہ جادوئی لمحے تھے۔ہم دونوں مورچے کی نیم تیرگی میں کھڑے تھے۔وہ میرے تیز بہاؤ کا سامنا کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ گاڑی کی طرف بھی نگاہ رکھے ہوئے تھیں۔"میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا بلقیس!" میں کراہا۔۔۔۔۔میں نے انہیں جھنجھوڑ دیا۔اپنی تندی میں انہیں بے ترتیب کر دیا۔

کچھ دیر بعد تاجو مورچے کی طرف آتی دکھائی دی۔وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئیں اور اپنے لباس کی شکنیں درست کرنے لگیں۔ان کا چہرہ گلاب اور آنکھوں کے سرخ ڈورے اتنے

نمایاں تھے کہ تاریکی میں بھی نظر آ سکتے تھے اور یہی وقت تھا جب بلقیس بیگم کی نظریں میرے بازو پر پڑی۔

فرطِ محبت میں مجھے اپنے زخمی بازو کا کچھ خیال نہیں رہا تھا۔ زخم کا منہ کھل گیا اور خون تیزی سے رس رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا خاور؟" وہ گھبرا کر بولیں۔

"کچھ نہیں، ذرا سا کٹ لگ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

ان کی خوبصورت آنکھیں محبت بھری ناراضگی سے بھر گئیں۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا لیکن بہت کچھ کہہ بھی دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم پھر گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔

رات تک یہ بات ثابت ہو گئی کہ نکو وال میں حملہ کرنے والے ڈھاٹا پوشوں کا نشانہ بیگم بلقیس ہی تھیں۔ بیگم بلقیس پر حملہ یا ان کو اغوا کرنے کی کوشش کوئی معمولی کاروائی نہیں تھی۔ یہ سب کچھ باقاعدہ منصوبے کے تحت کیا گیا تھا۔ ہمیں غلط اطلاع دے کر گاؤں سے فارم کی طرف دوڑایا گیا اور انور علی کے گھر پر ہلا بول دیا گیا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ بیگم

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

بلقیس بال بال بچی تھیں۔ یہ واقعہ یوں کچھ اور بھی سنگین ہو گیا کہ فائرنگ میں زخمی ہونے والا ایک بندہ رات گئے ڈسکہ ہسپتال میں دم توڑ گیا۔ یہ انور علی کے ملازموں میں سے تھا۔

نکو وال والے واقعے کا شدید ترین ردِ عمل ہوا۔ اگلے روز صبح سویرے راجوال میں ایک بڑا "اکٹھ" ہوا۔ والی جی کے حمایتی بہت سے چودھری، زمیندار اور کرتا دھرتا اکٹھے ہوئے۔ پولیس کی نمائندگی رانا شبیر کر رہا تھا۔

مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ ناکام کاروائی موکھل پاشا کی طرف سے کی گئی ہے۔ تصویروں والے واقعے کے بعد وہ یقیناً اندر ہی اندر لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔۔۔۔۔ بالآخر اس نے ایک بڑا ہاتھ مارنے کا فیصلہ کیا تھا اور براہِ راست والی جی کی عزت پر حملے کی کوشش کی تھی۔ مگر موکھل جو بات کہہ رہے تھے، وہ مختلف تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ نکو وال میں فائرنگ کرنے والوں سے ان کا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا اپنے طور پر کیا۔ ان کا آگو "سرغنہ" بہرام موکھل نام کا بندہ ہے اور وہ ایک دوسرے گاؤں کا رہنے والا ہے۔

صاف پتا چلتا تھا کہ اس ناکام کاروائی کے بعد موکھل اپنے سر سے بلا ٹالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور بہرام نامی بندے کو قربانی کا بکرا بنا رہے ہیں۔ جو بندہ نکو وال میں میری گولی سے زخمی

ہو کر پکڑا گیا تھا، اسے راجوال لایا گیا تھا۔ اس نے اپنا نام قطب بتایا اور اپنی رہائش ڈسکے کے ایک قریبی پنڈ میں بتائی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ بہرام کے ساتھ آیا تھا۔ بہرام نے اسے معاوضے کے طور پر دو ہزار روپے اور پکی رائفل دینے کا وعدہ کیا تھا۔ قطب کا کہنا تھا کہ ان کا مقصد صرف والی جی کی بیوی کے زیور حاصل کرنا تھا کیونکہ انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ باہر نکلتے وقت بہت سا سونا پہنے ہوتی ہیں۔

قطب کو پولیس کے حوالے کیا گیا۔ اس سے مار پیٹ ہوئی اور اس نے اپنے تین چار مزید ساتھیوں کے نام بتائے۔ ان میں سے دو پکڑے گئے، باقی دو بہرام موکھل کی طرح روپوش تھے۔ ان میں سے کسی کا تعلق گوریکے سے نہیں تھا۔ غالباً موکھلوں نے یہ احتیاط کی تھی کہ نکووال پر ہلّہ بولنے والوں میں سے کسی کا ناتا چھوٹے اور وڈے موکھل سے ثابت نہ ہو۔
کوشش کے باوجود ابھی تک اس بندے کا سراغ بھی نہیں لگ سکا تھا جس نے ملتانی پر والی جی کو حملے کی غلط اطلاع دی تھی۔ بہر حال، اس سنگین واقعے کے بعد دونوں برادریوں میں رنجشیں عروج پر پہنچ گئیں۔ پولیس کو بجا طور پر نقصِ امن کا خطرہ تھا۔ پولیس حکام نے دفعہ 107 کے تحت دونوں طرف سے اسلحہ جمع کر لیا اور دونوں طرف کے چودہ پندرہ بندے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

بھی حراست میں لے لئے۔ موکھلوں کی طرف سے گرفتار ہونے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ نکووال میں دفعہ 144 کی خلاف ورزی اور فائرنگ کی رپورٹ بھی علیحدہ سے درج کر لی گئی تھی۔ اس میں میرا نام بھی شامل تھا۔ بہر حال، یہ سب کچھ وہاں کہ ماحول کا حصہ تھا اور لوگ زیادہ دیر تک اس سنسنی کا اثر نہیں لیتے تھے۔

ان چکروں میں دس پندرہ روز تک بیگم بلقیس سے بات نہیں ہو سکی۔ آخر ایک رات ہمارا رابطہ ہوا۔ بیگم بلقیس افسردہ اور خاموش تھیں۔ اس افسردگی کی ایک وجہ تو نکووال والا واقعہ تھی۔ بیگم بلقیس کو اب معلوم ہو چکا تھا کہ نکووال میں ان کو ہی نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔۔۔۔ دوسرے وہ والی جی کے لئے پریشان تھیں۔ ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ بیگم بلقیس کی خواہش تھی کہ میں انہیں مجبور کروں اور وہ لاہور یا گوجرانوالہ جا کر کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں۔

میں نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا۔"

وہ بولیں۔ "انہیں زیادہ سے زیادہ وقت دو خاور۔ تمہارے ساتھ مل کر ان کی طبیعت اچھی ہو جاتی ہے۔"

"کیسے وقت دوں؟میں حویلی کے اندر نہیں آسکتا۔وہ حویلی سے باہر بہت کم نکلتے ہیں۔"

"مردانے میں ان سے مل لیا کرو۔"

"مردانے میں بھی تو کم ہی آتے ہیں۔"

"اسی لئے تو کہتی ہوں ہمارے درمیان سب کچھ ختم ہو جانا چاہئیے۔ہم پہلے جیسے ہو جائیں۔دماغ پر کوئی بوجھ نہ ہو۔کوئی پابندی نہ ہو۔"انہوں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"آپ جانتی ہیں بلقیس!ایسا نہیں ہو سکتا،اب یہ ممکن نہیں۔"

"میں آہستہ آہستہ تمہیں ٹھیک کرلوں گی۔۔۔۔بالکل ٹھیک۔"

"بس یہی ایک کام ہے جو آپ نہیں کر سکتیں۔یقین کریں کہ۔۔۔۔"

"نہیں کرتی۔"انہوں نے تیزی سے میری بات کاٹی۔

ہم دونوں مسکرا دیئے۔گفتگو کی سنجیدگی کم ہو گئی۔میں نے ان سے اس"ہار"کے بارے میں پوچھا جو کبھی تحفے میں دیا تھا۔انہوں نے بتایا کہ وہ بہت دور سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔میں

نے ان سے درخواست کی کہ وہ بس ایک بار مجھے وہ ہار پہن کر دکھادیں۔انہوں نے اقرار کیا نہ انکار۔میں نے آخری ملاقات کا ذکر چھیڑ دیا جو چند روز پہلے ہوئی تھی۔

"تم بہت غلط ہو خاور!"انہوں نے تادیبی انداز میں کہا۔"آپ مجھے غلط کر دیتی ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے،اب میں پردہ کیا کروں گی۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔"بلقیس!کتنے برس ہو گئے ہیں۔کیا ہمیں پوری زندگی میں تھوڑا سا وقت بھی ایسا نہیں مل سکتا جو ہم اپنی مرضی سے گزار سکیں۔۔۔۔۔مکمل تنہائی میں،مکمل سکون میں۔اتنی بڑی زندگی میں سے صرف تھوڑا سا وقت،ایک آدھ گھنٹا!"

"میں پھر وہی بات کہوں گی خاور!محبت سب کچھ حاصل کر لینے ہی کا نام تو نہیں۔"

"لیکن پھر یہ امیدیں،یہ خواہشیں دل میں کیوں جاگتی ہیں؟یہ کس نے پیدا کی ہیں؟یہ قدرت نے ہی پیدا کی ہیں۔ہم نے کوئی سازش تو نہیں کی ہے بلقیس!یہ سب خود بخود ہوا ہے نا؟"

"ہوں۔"

"اور قدرت غلط تو نہیں ہو سکتی نا؟"

"لیکن قدرت نے دنیا میں زندگی گزارنے کے کچھ طریقے بھی تو بتائے ہیں۔ جو کچھ ہمارے درمیان ہے، دنیا اسے قبول نہیں کر سکتی۔ کوئی قبول نہیں کر سکتا۔"

وہ ان پڑھ تھیں لیکن کبھی کبھی پڑھے لکھوں سے زیادہ منطقی بات کرتی تھیں۔ "تو پھر کیا ہونا چاہئیے؟" میرے لہجے میں سنجیدگی گہری ہو گئی۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ مصنوعی ناراضگی سے بولیں۔ "دیکھو، تم بات کو کدھر سے کدھر لے گئے ہو۔ میں تم سے والی جی کی بات کر رہی تھی۔ تم انہیں کسی طرح لاہور لے جاؤ ۔۔۔۔پلیز!"

"واہ آپ تو انگریزی بولنے لگیں۔"

"بھئی! تمہارے شاگرد کی شاگرد ہوں اتنی انگریزی تو بول ہی سکتی ہوں۔"

"یعنی حامد کی شاگرد ہیں۔ بس آپ کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اگر استاد پکڑنا تھا تو کوئی اچھا سا پکڑتیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"اس قیمتی مشورے کا شکریہ۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں اور گفتگو کا رخ ایک بار پھر والی جی کی طرف موڑ دیا۔

اگلے روز ایک مقدمے کی پیروی پر میں لاہور گیا۔ دو دن لگ گئے۔ رات کو واپس آیا تو ایک پریشان کن خبر منتظر تھی۔ والی جی کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ درمیانی شدت کا اٹیک تھا۔ انہیں فوری طور پر گوجرانوالا ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے طبّی امداد دی تھی اور حالت سنبھلنے پر انہیں لاہور لے جانے کا کہا تھا لیکن والی جی نے لاہور جانے کے بجائے واپس راجوال آنا مناسب سمجھا۔ اب وہ پھر راجوال میں ہی تھے۔ میں فوراً ان کی خیریت دریافت کرنے پہنچا۔ وہ زرد چہرے کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ آنکھوں میں نمی آ گئی۔ وہ ایک دم زیادہ بوڑھے اور کمزور نظر آ رہے تھے۔۔۔۔۔ بیگم بلقیس سامنے نہیں آئیں۔ تاجو نے ان کی نمائندگی کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "بیگم جی پریشان ہیں۔ یہ دوا بالکل نہیں کھا رہے۔"

"او چل تو اپنا کام کر۔" والی جی نے تاجو کو جھڑکا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ "کچھ نہیں ہوا ہے مجھے بس معدے میں تھوڑی سی گیس ہو گئی تھی۔ یہ ڈاکٹر تو نِرے قصائی ہیں بس اسی

چکر میں رہتے ہیں کہ کوئی بندہ قسمت کا مارا اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھے اور یہ اس کی چیر پھاڑ شروع کر دیں۔۔۔۔۔ میں بالکل بھلا چنگا ہوں۔"

"لیکن پھر بھی۔۔۔۔۔ دو چار دن تو دوا کھالیں۔" میں نے التجا کی۔

"او نہیں یار! تُو بھی مجھے یہی پٹی پڑھانے لگ گیا ہے۔ میں نے اپنا اندر نہیں ساڑنا۔ دو چار روز سیب کا مرّبا، چاندنی کے ورق کے ساتھ کھالوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

میں دس پندرہ منٹ تک والی جی کے پاس بیٹھا رہا۔ ان کی ٹانگیں دباتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ چودھری عزیز نہایت ناگوار نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا برآمدے سے گزر گیا۔

والی جی کی حالت دیکھ کر میرے سینے میں جیسے دھواں سا بھر گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میری چھی حِس کہہ رہی تھی کہ اب والی جی کا سایہ زیادہ دن اس حویلی پر نہیں رہے گا۔

دو تین دن عجیب سی اداسی میں گزرے۔ پھر رات کو بیگم بلقیس کی کال آئی۔ ان کا لہجہ غم زدہ تھا۔ انہوں نے کہا۔ "خاور! میں نے تمہیں کئی بار بتایا ہے۔ کوئی پریشانی والی جی کو اندر ہی اندر کھاتی رہتی ہے۔ یہ جاگیر کے معاملوں والی پریشانی نہیں۔ کوئی اور بات ہے، کوئی اور

مسئلہ ہے۔ میں تو حویلی میں رہتی ہوں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔ کیا تمہیں بھی کچھ اندازہ نہیں؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جو کچھ میرے سامنے ہے، اس میں تو مجھے کوئی ڈھکی چھپی بات نظر نہیں آتی۔"

ہم اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ گفتگو کے دوران میں، میں نے پوچھا۔ "جس شام والی جی کو تکلیف ہوئی، کوئی خاص بات ہوئی تھی؟ یا کوئی ملنے آیا ہوا ان سے؟"

"ملنے تو نہیں آیا تھا، وہ خود کہیں گئے تھے۔ شام کے بعد نکلے تھے اور دس گیارہ بجے واپس آئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہیں سینے میں درد ہونے لگا۔"

میرا ذہن پھر مچھلی فارم کی طرف چلا گیا۔ کہیں، وہ اس طرف تو نہیں گئے تھے؟ میں نے سوچا۔

اگلی صبح میں نے نصر اللہ سے پوچھا۔ "دو دن پہلے رات کو والی جی کہاں گئے تھے اور ان کے ساتھ کون تھا؟"

"وہ ملتانی اور شبیر کے ساتھ نکلے تھے۔ پھر ان دونوں کو تو انہوں نے مکھن وال کے پاس چھوڑا تھا اور خود گھوڑے پر آگے چلے گئے تھے۔ شاید شام پور کی طرف!"

شام پور کے نام نے مجھے چونکایا۔ شام پور میں اماں دلشاد رہتی تھی اور ثمینہ رہتی تھی۔ کہیں وہ ان دونوں سے ملنے تو نہیں گئے تھے؟ پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اماں دلشاد اور والی جی کے درمیان کوئی ڈھکی چھپی بات ہے۔ کوئی ناتا۔۔۔۔ماضی کا کوئی تعلق! بہت سی باتیں کسی خاص سمت میں اشارہ کرتی تھیں۔ ثمینہ اور پاشا والے معاملے میں والی جی کی حد سے زیادہ دلچسپی اور فکر مندی۔۔۔۔ان کی خواہش کہ اماں دلشاد کی دونوں بڑی بیٹیوں کی شادیاں اچھے طریقے سے ہو جائیں۔۔۔۔اماں دلشاد کی والی جی سے شدید ناراضگی۔۔۔۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ ایک خاندانی ملازمہ اپنے مالک سے کسی چھوٹے واقعے کے سبب اتنی دور ہو گئی ہو گی۔ یہاں کچھ نہ کچھ تھا جو نظروں سے اوجھل تھا۔

اماں دلشاد مجھ سے خوش تھیں لیکن وہ بڑی گہری عورت تھی، مجھے توقع نہیں تھی کہ میں اس کی مرضی کے خلاف اس سے کچھ پوچھ سکتا ہوں لیکن اس کی بڑی بیٹی شاداں کے بارے میں امید کی جا سکتی تھی۔ وہ میری بے حد ممنون بھی تھی اور مجھے سچا خیر خواہ بھی سمجھتی تھی۔

دوسرے روز میں نے شاداں کے سسرالی گاؤں جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ آج کل سسرال میں ہی تھی۔ صبح منہ اندھیرے حویلی سے نکل کر میں بارہ بجے کے لگ بھگ سوپور گاؤں پہنچ گیا۔ سوپور گاؤں ہمارے عام دیہات جیسا ایک خوش نما گاؤں تھا۔ کھیتوں کے ہرے سمندر میں کچے گھروندوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ! جہاں الہڑ لڑکیاں کنوؤں پر کپڑے دھوتی تھیں۔ مویشی گھنٹیاں بجاتے ہوئے اپنے راستوں پر گامزن ملتے تھے۔ جہاں پیپل کے درختوں تلے محفلیں جمتی تھیں۔ دائروں کے الاؤ کے گرد کہانیاں کہی جاتی تھیں اور کھلے ہاتھوں پیروں والے جوان لڑکے کونوں کھدروں میں سمٹ کر شوخ سرگوشیاں کرتے تھے۔ مجھے اپنی دھرتی کے ان مناظر سے عشق تھا۔ میں انہی میں جینا اور انہی میں مرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اپنے پچیرے، ممیرے بھائیوں کی طرح شہر کا رخ کر لوں تو بہت پیسا کماؤں گا۔ بہت آگے جاؤں گا لیکن میں پُر تکلف زندگی کے لئے بانسری کی تان، کیکر کی چھاؤں اور کچے دودھ کی مہک کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چھوڑ ہی نہیں سکتا تھا۔

یہ بھی ایک ابر آلود دن تھا۔ نہایت سرد ہوا کے ساتھ کبھی ہلکی اور کبھی تیز بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میرا چہرہ مفلر میں لپٹا ہوا تھا۔ میں تانگے سے اتر کر پیدل ہی شاداں کے گھر کی طرف

چل دیا۔ میرے کپڑے بھیگ چکے تھے اور اس وقت مجھے ایک بڑا گلاس گرم دودھ اور ایک دہکی ہوئی انگیٹھی کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت شاداں مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔

ابھی میں شاداں کے خستہ حال گھر سے بیس پچیس قدم دور ہی تھا کہ ایک منظر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر نکلا۔ بارش سے بچنے کے لئے اس نے ایک کھیس کی بکل یوں مار رکھی تھی کہ سر اور چہرہ ڈھک گئے تھے۔ اس کی پیشانی وغیرہ ایک اونی ٹوپی میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ پاس ہی کھڑے ایک تانگے کی طرف بڑھا۔۔۔۔ اور جھکا جھکا سا اس میں بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی تانگہ روانہ ہو گیا۔ میں اپنی جگہ پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی میں نے جس شخص کو دیکھا تھا، وہ راجوال کی حویلی کے مالک اور اس جاگیر کے کرتا دھرتا، والی جی تھے۔۔۔۔

میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ وہی تھے میں سناٹے میں کھڑا سوچتا رہ گیا۔ والی جی شدید بیماری کی حالت میں کسی کو بتائے بغیر یہاں پہنچے تھے۔ تانگے میں سوار ہوتے وقت ان

کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ میں نے صاف محسوس کی تھی۔۔۔۔ تانگہ لمحہ بہ لمحہ مجھ سے دور ہوتا گیا اور پھر بھیگی ہوئی گلی کے موڑ پر اوجھل ہو گیا۔

میں یہاں شاداں سے ملنے آیا تھا مگر اب اس سے ملنا مجھے مناسب معلوم نہیں ہوا۔ میں وہیں سے واپس پلٹا اور ابر آلود موسم میں ڈیڑھ دو گھنٹے کا سفر کر کے پہلے مکھن وال اور پھر راجوال پہنچ گیا۔

میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ بار بار ذہن میں سوال ابھرتا تھا کہ اس صورتِ حال کے پیچھے کیا پوشیدہ ہے۔ راجوال واپس پہنچ کر میں نے بیگم بلقیس سمیت کسی کو کچھ نہیں بتایا۔

شام کو رونق علی کی طرف سے بلاوا آیا۔ گلزار نے آکر اطلاع دی۔ "رونق صیب بلا رہے ہیں۔ ان کی طبیعت کچھ کھراب ہے جی۔ کہتے تھے کہ آپ اپنی مشین لے کر آئیں۔"

جس کو وہ مشین بتا رہا تھا، وہ بلڈ پریشر چیک کرنے والا ایک پرانا آلہ تھا۔ اس کو "بی پی اپریٹس" کہتے ہیں۔ یہ سوئی والا سیکنڈ ہینڈ اپریٹس میں نے لاہور کے ایک دوکاندار سے والی جی

کے لئے خریدا تھا۔ رونق علی اپنے پلنگ پر پھیل کر لیٹا ہوا تھا۔ تین ٹانگوں والی گول میز پر بہت سی کھانے پینے کی اشیاء پڑی تھیں۔

"خیریت ہے رونق بھائی؟" میں نے پوچھا۔

"خیریت ہوتی تو تجھے بلاتا۔ یہ اپنی مشین لگا کر ذرا میرا "کولاسٹرول" چیک کرو۔"

"رونق بھائی! میں نے پہلے بھی گزارش کی تھی، یہ کولیسٹرول نہیں بلڈ پریشر بتاتی ہے۔"

"ہاں ہاں وہی۔ ذرا دیکھو کہاں تک پہنچا ہوا ہے؟"

میں نے چیک کیا نیچے کا 100 اور اوپر کا 170 تھا۔ یہ پہلے کی نسبت کچھ کم تھا۔ بلڈ پریشر معلوم کرنے کے بعد رونق علی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اس کا مطلب ہے، میں تھوڑا بہت جھگڑا تو کر ہی سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم نے ہی تو کہا تھا کہ بلڈ پریشر 200 کے قریب چلا جائے تو پھر کسی طرح کی ٹین شین وغیرہ نہیں لینی۔ اب تو پونے دو سو بھی نہیں ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تو کس سے جھگڑا کرنا ہے آپ نے؟"

"ہے ایک حرامی، تمہیں پتا ہی ہے، پرسوں مرید کے سے مہمان شمہان آئے ہوئے تھے۔ مجرے کے لئے ڈسکے سے دو ڈانسریں منگوائی تھیں۔ ٹھیک ٹھاک نانواں (معاوضہ) لے کر بھی اس حرامی نے پکی عمر کی تھکی ٹوٹی عورتیں بھیج دیں۔ اس سے پہلے بھی وہ ایک دفعہ ایسے ہی کر چکا ہے۔"

میں نے رونق کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لئے رونق بھائی! اپنے آپ پر رحم کرو۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس دلال کا شکر گزار ہونا چاہئیے۔ اگر طوائفیں نوجوان ہوتیں اور آپ کا دل ان پر آ جاتا تو پھر ناچ گانے کے علاوہ بھی "بہت کچھ" ہونا تھا۔ اب اس وقت پتا نہیں بلڈ پریشر کتنا تھا۔ زیادہ ہوتا تو آپ کو دل کا بڑا شاندار قسم کا دورہ بھی پڑ سکتا تھا۔"

"نہیں نہیں، پرسوں تو میری طبیعت شبعیت بالکل ٹھیک تھی اور ویسے بھی میں نے تم سے بلڈ پریشر چیک کروانے کے بعد ہی مجرے کا پروگرام بنایا تھا۔"

اچانک میری نظر رونق علی کے کانوں پر پڑی۔ وہاں سے چکنائی نکل رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "یہ کیا ہے رونق بھائی! اب تو آپ کے کانوں سے بھی مکھن نکلنے لگا ہے۔"

وہ سنجیدگی سے بولا۔ "مولوی بشارت بتا رہا تھا کہ یہ جو کانوں میں ٹھک ٹھک نبض چلتی ہے، یہ بلڈ پریشر کی نہیں خشکی کی وجہ سے ہے۔ اس نے کہا تھا کہ گھی گرم کر کے کانوں میں ڈالوں اور روزانہ سر پر بھی مالش کروں۔"

"اور گرم گھی پینے کے لئے نہیں کہا؟" میں نے ازراہِ مذاق پوچھا۔

رونق علی کے جواب نے حیران کر دیا۔ "ہاں پینے کے لئے بھی کہا ہے، مگر تازہ مکھن سے نکلا ہوا ہو۔"

"اور آپ نے پیا؟"

"کل ہی پیا ہے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے اور بی پی اپریٹس سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اچھا جی، میں چلتا ہوں۔ مجھے آپ کے قتل میں حصہ دار نہیں بننا۔"

رونق علی سمجھ گیا کہ میں ناراض ہو گیا ہوں۔ اس نے کھینچ تان کر اور منت سماجت کر کے مجھے پھر بٹھا لیا۔ میں نے ادھ گھنٹا اسے چکنائی، نمک اور گرم چیزوں کے نقصانات پر لیکچر دیا۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ بتدریج والی جی اور اماں دلشاد وغیرہ کی طرف مڑ گیا۔ میرے اندر اماں دلشاد کے حوالے سے کھد بد مچی ہوئی تھی۔ رونق علی عرصے سے یہاں مقیم تھا اور بہت کچھ جانتا تھا۔ میں نے اسے اماں کے حوالے سے کریدنا شروع کیا۔ عام لوگوں کی طرح رونق علی کا بھی یہی خیال تھا کہ اماں دلشاد کے حویلی چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ چودھری عزیز کے ساتھ ان کا جھگڑا ہوا تھا اور ان میں اَن بن شروع ہو گئی تھی۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ قریبی گاؤں بوریکی میں اماں دلشاد کا ایک بھائی بنا ہوا تھا۔ اس کا نام رمضان تھا۔ عمر پچاس پچپن کے قریب تھی۔ وہ تانگا چلاتا تھا۔ اماں اپنی درمیانی عمر میں بھی خوش شکل تھی لیکن خدانخواستہ رمضان کے ساتھ اس کا ایسا ویسا معاملہ نہیں تھا۔ دونوں بالکل بہن بھائیوں کی طرح ہی تھے۔۔۔۔

اگلے روز میں نے اس بارے میں مزید ٹوہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے صبح دس بجے کے قریب نکلنا تھا لیکن ایک مہمان کے آجانے سے وقت پر نہ نکل سکا۔ یہ مہمان اچانک ہی نمودار ہوا

اور دستک دے کر میرے کمرے میں آگیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی تھی۔ چہرے سے متانت اور شرافت جھلکتی تھی۔اس شخص نے اپنا نام رفاقت حسین بتایااور یہ بھی بتایا کہ میرے مرحوم والد عطااللہ سے اس کا گہرا واسطہ رہاہے۔اس نے کہا۔"تمہارے اباجی کی زمین میں سے کچھ زمین میں نے ٹھیکے پر لے رکھی تھی۔ کوئی ڈھائی تین ایکڑ تھی۔ میں وہ پہلا بندہ تھاجو علاقے میں ٹریکٹر لے کر آیا تھا۔ہمارا تعلق جتنی دیر رہا، بہت اچھا رہا۔"

وہ ماضی کی باتیں کرنے لگا۔ان اچھے دنوں کی باتیں جب ہمارا گھر کافی خوشحال تھااور ہم تینوں بہن بھائی ابھی بہت چھوٹے تھے۔اس کی باتیں کچھ دیر کے لئے مجھے بھی ماضی میں لے گئیں۔

والد صاحب مراد پور کے کھاتے پیتے زمیندار تھے۔ ہماری برادری ہمیشہ علاقے کی ایک طاقتور برادری سمجھی جاتی رہی ہے۔ والد صاحب نے بہت اچھا وقت گزارا مگر پھر وہ اور ان کے ایک چچازاد بھائی دو تین دیوانی مقدموں میں پھنس گئے۔ان مقدموں نے دو چار سالوں میں بہت کچھ ختم کر دیا۔اسی دوران میں والد صاحب بیمار ہوئے اور چند مہینوں میں چل

بسے۔ان کی وفات کے بعد ہماری معاشی حالت گرتی چلی گئی۔ بعدازاں فاقوں تک بھی نوبت آئی۔ بہرحال، بڑے بھائی باقر کے باہر جانے سے ہمیں کچھ سہارا ملا۔

خیر، یہ باتیں تو ویسے ہی درمیان میں آگئیں۔ میں اچانک وارد ہونے والے رفاقت حسین صاحب کاذکر کر رہا تھا۔ان کی باتوں سے پتا چلا کہ ان کے آنے کاایک خاص مقصد ہے اور اس مقصد کا تعلق موکھل پاشااور اس کے کرتوتوں سے ہے۔

در حقیقت رفاقت حسین صاحب میرے اور موکھل پاشا کے درمیان مفاہمت کرانے کا ارادہ رکھتے تھے۔۔۔۔۔انہوں نے کہا۔"دیکھو خاور! ہمارا دین بھی یہی کہتا ہے کہ جب دو مسلمانوں کے درمیان کوئی تنازعہ ہو تو ان میں صلح کرانے کی کوشش کرو۔اس معاملے میں میری کوئی غرض نہیں ہے بلکہ میں تو اس معاملے کو پوری طرح جانتا بھی نہیں ہوں۔ پاشے نے مجھے جو کچھ بتایا ہے اس سے یہی پتا چلا ہے کہ تمہارے پاس کچھ ایسی تصویریں ہیں جن سے پاشے کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔اسی طرح پاشے کے پاس بھی کچھ تصویریں ہیں جو تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟"

"جی صحیح ہے۔ آپ آگے فرمائیں۔"

رفاقت حسین صاحب نے کہا۔"میں جانتا ہوں یہاں راجوال اور گوریکے کے درمیان دشمنی کی ہوا چلی ہوئی ہے۔ بہت زیادہ نفرت اور غصہ ہے۔اس آگ کو ٹھنڈا کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن ہم کم از کم ان تصویروں والے معاملے کو تو حل کر سکتے ہیں۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"ایسے معاملے بڑے خطرناک ہوتے ہیں خاور! بہتر تو یہ ہے کہ تم دونوں اپنی اپنی تصویریں ایک دوسرے کے حوالے کر کے اس جھگڑے کو دفن کر دو۔"

"چاچا رفاقت! آپ کے بارے میں جاننے کے بعد میں دل سے آپ کی عزت کر رہا ہوں لیکن یہ معاملہ اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ پاشا ایک بہت بے اعتبارے اور جھوٹے شخص کا نام ہے۔ وہ یہ تصویریں واپس کرنے کا جھانسا دے کر پہلے بھی کچھ لوگوں پر بڑا ظلم کرتا رہا ہے۔اس نے اب بھی یہی کرنا ہے۔وہ کبھی اس معاملے کو جڑ سے ختم نہیں کرے گا۔ کہنے کو تو تصویریں دے دے گا لیکن اپنے پاس بھی رکھے گا۔ میں نے اس معاملے پر بہت سوچا ہے چاچا جی۔ میری سمجھ میں تو بس ایک ہی بات آئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اس کی تصویریں اس کے پاس اور میرے والی میرے پاس رہیں۔اور اس طرح ایک دوسرے کو اس بات کی پکی ضمانت رہے کہ یہ تصویریں کسی کی زندگی برباد کرنے کے لئے استعمال نہیں ہوں گی۔"

رفاقت حسین کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں پھیل گئیں۔انہوں نے کہا۔"خاور بیٹا! میں اسی لئے تو یہاں آیا ہوں۔ میں تم دونوں کے درمیان ضامن بننا چاہتا ہوں۔"

"یعنی آپ اپنی طرف سے اس بات کی ضمانت دیں گے کہ پاشے نے ساری تصویریں واپس کر دی ہیں اور اب اس کے پاس کچھ نہیں ہے؟"

"ہاں، میں یہی چاہتا ہوں۔"

میں نے رفاقت حسین صاحب کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔"میں نے ایک دو بار والدہ اور بڑے بھائی کی زبان سے آپ کا نام سنا ہوا ہے۔آج آپ سے مل کر مجھے یہی لگا ہے کہ میں نے اپنے پرانے وقتوں کو دیکھا ہے اور آپ کی باتوں سے مجھے ان وقتوں کی خوشبو آئی ہے۔ آپ جو بھی کہیں گے، میں کروں گا لیکن ایک بات میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے بتا دینا چاہتا ہوں چاچا جی!۔یہ پاشا سانپ ہے یہ ڈسنے سے باز نہیں آئے گا۔ کبھی نہیں آئے گا۔"

میرے لہجے کی تاثیر نے رفاقت حسین صاحب کے پر وقار گندمی چہرے پر سایہ سا لہرا دیا۔ وہ اپنی شکل وصورت سے بہت معاملہ فہم لگتے تھے۔ اس اہم معاملے پر ہمارے درمیان مزید پون گھنٹا بات ہوئی اور جب یہ بات اختتام کو پہنچی تو رفاقت حسین صاحب کا موقف بھی وہی تھا جو میرا تھا۔ یہ بات اچھی طرح ان کی سمجھ میں آگئی تھی کہ۔۔۔۔۔ اس عجیب مسئلے کا حل بھی بہت عجیب ہے۔ اور یہ وہی ہے جو میں نے انہیں بتایا ہے۔ ان کے خیالات میں اتنی زیادہ تبدیلی آئی کہ آخر میں انہوں نے خود مجھ سے کہا کہ میں وہی کروں جو میں نے سوچا ہوا ہے۔ بہر حال، انہوں نے دونوں طرف کی تصویروں کو بے حد احتیاط اور بے حد حفاظت سے رکھنے کی ضرورت پر زور دیا اور اس حوالے سے خدشات ان کے چہرے پر موجود رہے۔

میں نے آخر میں کہا۔ "چاچا جی! آپ پاشے کے دماغ میں یہ بات ڈال دیں۔ وہ یہ سمجھے کہ اس کی تصویریں اس کو واپس مل گئی ہیں اور میری مجھے واپس مل گئی ہیں اور ہم نے ان تصویروں کو بہت بہت حفاظت سے رکھنا ہے۔۔۔۔۔ بس اب یہی ایک حل ہے۔۔۔۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مہمان کے آجانے سے میں کافی لیٹ ہو گیا تھا۔ اس لئے ایک دن چھوڑ کر میں بوریکی کے لئے روانہ ہوا۔ راجوال سے چل کر میں نے نہر کے ساتھ ساتھ گھوڑی دوڑائی اور گیارہ بجے کے لگ بھگ بوریکی پہنچا۔ یہ وہی گاؤں تھا جہاں ایک باغ پر لمبٹر گروپ یعنی لیاقت کالا وغیرہ نے ناجائز قبضہ جما رکھا تھا۔ جب بعد ازاں میرے ہاتھوں لیاقت کالے کو مار پڑی تھی تو یہ قبضہ بھی چھوٹ گیا تھا۔ اس باغ کے مالک حاجی نور محمد اور اس کے بیٹے میرے بڑے مشکور تھے اور بڑی عزت کرتے تھے۔ میں بڑی خاموشی کے ساتھ حاجی نور محمد کے گھر پہنچا اور وہاں سے رمضان نامی کوچوان کے گھر کا پتا کیا۔

حاجی نور محمد کے بڑے بیٹے نے بتایا۔ "سالار صاحب! جس بندے کی آپ بات کر رہے ہیں وہ تو کوئی آٹھ نو سال پہلے یہاں سے چلا گیا تھا۔"

"اس کے ٹھکانے کا کچھ پتا ہے؟"

"وہ خود تو شاید تین چار سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ اس کا ایک بیٹا ہے اقبال۔ سنا ہے وہ ڈسکے کے پاس راہ والی گاؤں میں رہتا ہے۔ شاید ڈسکے میں ہی کہیں سلمے ستارے کا کام کرتا ہے۔ اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں۔ وہ بھی ڈسکے کے آس پاس ہی کہیں بیاہی ہوئی ہیں۔"

بوریکی گاؤں سے مجھے بس اتنی ہی معلومات حاصل ہو سکیں۔ میں وہاں سے سیدھا ڈسکے کے گاؤں راہ والی کی طرف روانہ ہو گیا۔۔۔۔ مچھی فارم والے "آدم خور رقبے" کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے ڈسکے کی طرف سفر جاری رکھا۔ جس وقت میں لمبا سفر کر کے راہ والی پہنچا، رات کے نو بج رہے تھے۔ آخری دو میل کا سفر کافی دشوار تھا کیونکہ راستہ کیچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ اس گاؤں میں مجھے کوئی جانتا پہچانتا نہیں تھا۔ ایک دائرے میں بیٹھے ہوئے لوگ حقہ پی رہے تھے اور سسّی پنوں سن رہے تھے۔ ایک خوش آواز نوجوان کی آواز گونج رہی تھی۔

"دیکھی قبر تے اڈ گئے ہوش اوہدے، رووے پیا تھل وچ زار وزار پنوں پائی تھلاں وچ
دردی گونج ڈاہڈی سسّی سسّی پکار پکار پنوں۔

میں نے ایک شخص سے اقبال سلمے ستارے والے کا پتا پوچھا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ وہ شخص میرے ساتھ چلا اور مجھے ایک چھوٹی سی گلی میں اقبال کے گھر کے سامنے کھڑا کر دیا۔

یہ چھوٹا سا کچا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دروازہ خستہ حال تھا۔ میری دستک پر ڈھیلی چولوں والا کواڑ کھلا تو چوں چاں کی کئی آوازیں آئیں۔ درمیانے قد کاٹھ کے ایک غصیلے نوجوان نے باہر جھانکا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ "ہاں جی، کیا بات ہے؟" اس نے مجھے سر تا پا گھورا۔

"میں نے اقبال سے ملنا ہے۔ میں کافی دور سے آیا ہوں۔"

"میں ہی اقبال ہوں، کیا بات ہے؟" وہ باہر آتے ہوئے بولا۔

"بات بہت خاص ہے۔ اس طرح گلی میں نہیں کی جا سکتی۔"

وہ کچھ دیر مجھے نظروں سے ٹٹولتا رہا پھر اپنے ساتھ اندر لے آیا۔ ایک چھپر تلے لالٹین جھول رہی تھی اور چار پانچ بکریاں بکرے بندھے تھے۔ ایک بکرا بکری اپنی "فطری ذمہ داری" پوری کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایک سات آٹھ سالہ بچی بڑی بے پرواہی سے ان کے سامنے چارا بکھیر رہی تھی۔ دیہات میں ایسے مناظر عام ملتے ہیں۔ وہ مجھے ایک نیچی چھت والے کمرے میں لے آیا۔ یہاں لالٹین کی مدھم روشنی تھی اور دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ ہم چارپائیوں پر بچھے کھدر کے گدیلوں پر بیٹھ گئے۔ رسمی کلمات کے بعد میں نے اقبال کو بتایا کہ میں اس سے ملنے کے لئے پہلے بوریکی گیا۔۔۔۔ اور وہاں سے سفر کر کے یہاں پہنچا ہوں۔

وہ مجھ سے اب کچھ مرعوب نظر آ رہا تھا اس لئے تمیز سے بول رہا تھا۔ "کہو جی، میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا۔ "تمہارے والد فوت ہو چکے ہیں؟"

"ہاں جی۔۔۔۔۔ کوئی چار سال ہو گئے اس بات کو۔ آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟"

"میں انہیں نہیں جانتا لیکن ایک ایسی عورت کو جانتا ہوں جو تمہارے والد رمضان کو جانتی ہے۔ میں تم سے تمہارے اباجی اور راجوال کی اماں دلشاد کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس بات کا پتا ہے کہ وہ بہن بھائی بنے ہوئے تھے اور اکثر آپس میں ملتے رہتے تھے۔"

اماں دلشاد کا نام سن کر اقبال کے چہرے پر فوری طور پر شناسائی کے آثار نہیں ابھرے تاہم چند سیکنڈ بعد اسے جیسے یاد آ گیا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں، اماں دلشاد!۔۔۔۔ ہم اسے چاچی شیدا کہتے تھے۔ پر اب تو بہت عرصے سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ قریباً پانچ چھ سال ہی ہو گئے ہیں لیکن آپ۔۔۔۔"

"میں راجوال کی حویلی میں ملازم ہوں۔ جاگیردار صاحب نے مجھے کچھ خاص ذمہ داریاں دی ہوئی ہیں۔ اسی سلسلے میں مجھے اماں دلشاد کے بارے میں باتیں معلوم کرنی ہیں۔۔۔۔ اماں دلشاد میرا مطلب ہے چاچی شیدا سے تمہاری آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

وہ ذہن پر زور دیتا رہا پھر بولا۔ "پانچ یا چھ سال تو اس بات کو بھی ہو گئے ہوں گے۔ وہ شاید گرمیوں کے دن تھے۔ رات آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ بڑی تیز آندھی آئی ہوئی تھی۔ اماں شیدا یہاں ابّے سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی جس نے ٹوپی والا برقعہ پہنا ہوا تھا۔ بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ اماں کی بڑی بیٹی ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اماں نے جاگیردار سے جھگڑا کر کے حویلی کی نوکری نئی نئی چھوڑی تھی۔"

"وہ کسی خاص کام سے آئی تھی؟"

"آہو جی۔ انہیں کوئی بہت ضروری کام تھا شاید۔ ابّے نے اسی وقت تانگے میں گھوڑا جویا تھا اور ہمیں بتایا تھا کہ وہ چاچی شیدا کو لے کر جا رہا ہے۔ کل تک واپس آئے گا اور ہو سکتا ہے تھوڑا زیادہ ٹائم لگ جائے۔ وہ انہیں وزیر آباد کے پاس کسی گاؤں میں لے کر گیا تھا۔"

"یہ تو کافی فاصلہ ہو گا؟"

"آہو جی۔ پر اندر اندر سے چار پانچ گھنٹے سے زیادہ کا نہیں ہے۔"

"اس پنڈ کا نام یاد ہے تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ ایک بار پھر ذہن پر زور دینے لگا لیکن فوری طور پر اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ وہ موضوع بدل کر بولا۔ "کچھ دن بعد پتا چلا تھا کہ چاچی شیدا کی بیٹی کے ساتھ کوئی واقعہ ہو گیا ہے اور وہ مر گئی ہے۔ مجھے یاد ہے ابّا اس فوتگی پر گیا تھا۔"

"اماں کی بیٹی کی موت وہیں وزیر آباد والے گاؤں میں ہوئی تھی؟"

"نہیں جی۔ مجھے اس کا ٹھیک پتا نہیں۔"

ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر اقبال کو اچانک وزیر آباد کے اس گاؤں کا نام یاد آ گیا جہاں اس کا باپ رات کے وقت اماں دلشاد اور اس کی بیٹی آسیہ کو لے کر گیا تھا۔ وہ بولا۔ "آہو جی۔ اس پنڈ کا نام مالن پور تھا شاید۔ یہ وزیر آباد کے پاس ہی کہیں ہے۔"

میں نے اقبال سے ایک ڈیڑھ گھنٹا مزید بات چیت کی۔ اس نے بھی مجھ سے دو چار سوال کئے۔ مثلاً چاچی شیدا آج کل کہاں ہیں؟ ان کی بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ میں پولیس والوں کی طرح اماں دلشاد اور اس کے ابّے کے بارے میں کرید کرید کر سوال پوچھ رہا ہوں۔ بہر حال ہمارے درمیان کافی کار آمد گفتگو ہوئی۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ میں اقبال کے گھر میں ہی سو رہا اور صبح راجوال روانہ ہو گیا۔

اب میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ والی جی، اماں دلشاد اور مالن پور نامی گاؤں میں کوئی گہرا تعلق موجود ہے اور ایسا ہی تعلق آسیہ کی موت اور مالن پور گاؤں میں بھی تھا۔ پہلے تو جی میں آئی کہ وزیر آباد جاؤں اور مالن پور نامی اس گاؤں کو تلاش کروں لیکن پھر بہتر محسوس ہوا کہ وزیر آباد میں نجل خراب ہونے سے پہلے ایک ملاقات اماں کی بیٹی شاداں سے کر ہی لوں۔

اگلے روز دوپہر کے وقت میں ایک بار پھر سوپور کی اسی گلی میں کھڑا تھا جہاں تین روز پہلے میں نے والی جی کو شاداں کے گھر سے نکلتے اور تانگے میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ موسم آج بھی سرد اور ابر آلود تھا مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے شاداں کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ خود ہی نکلی اور مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئی۔

اس کا شوہر کام پر گیا ہوا تھا۔گھر میں اس کے دس بارہ سالہ دیور اور ساس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ساس عمر رسیدہ عورت تھی۔کسی بیماری کے سبب اس کی سماعت بالکل ختم ہو چکی تھی۔بینائی بھی نہایت کمزور تھی۔میں نے شاداں سے کہا۔"ادھر کسی کام سے آیا تھا۔تمہارے دروازے سے گزر جانا اچھا نہیں لگا۔"

اس نے اپنے چمکیلے دوپٹے سے سر ڈھانپا اور گلوگیر آواز میں بولی۔"آپ نے میرے گھر میں قدم رکھا ہے۔مجھے اپنی انکھیوں پر یقین نہیں ہو رہا۔"

گھر کی حالت سے غربت جھلکتی تھی۔تاہم شاداں نے میری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔اس نے دیور کو دوڑایا۔وہ دکان سے جلیبی اور نمک پارے لے آیا۔شاداں نے گرما گرم دودھ سے بھرا ہوا گلاس میرے سامنے رکھ دیا۔

کچھ دیر تک شاداں سے رسمی باتیں ہوتی رہیں۔اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔۔۔۔اور اس کا سیدھا سادہ شوہر اس کی بات مانتا ہے۔میں نے کہا۔"شاداں! میں کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ایک خاص بات پوچھوں گا۔آج موقع ملا ہے تو پوچھ لیتا ہوں۔کیا میں امید کروں کہ تم مجھے صحیح جواب دو گی؟"

"آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں سالار جی۔آپ کے لیے جان بھی حاضر ہے۔آپ نے ہمارے لیے جو کچھ کیا ہے،ہم آپ کے پاؤں بھی دھو دھو کر پیئیں تو کم ہے۔

لیکن۔۔۔۔۔لیکن پہلے آپ مجھے یہ بتا دیں کہ وہ۔۔۔۔۔پاشے والا معاملہ تو ٹھیک ہے نا؟"آخری الفاظ کہتے کہتے اس کے لہجے میں ان جانے خدشے سمٹ آئے۔یقیناً اس کا دھیان پاشے کی بلیک میلنگ اور اپنی خوش گوار ازدواجی زندگی کی طرف چلا گیا تھا۔

میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ اس حوالے سے کوئی فکر مندی اپنے ذہن میں نہ لائے۔اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔وہ بولی۔"سالار جی! آپ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔۔۔۔"شاداں۔۔۔۔۔میں بڑے مان سے پوچھ رہا ہوں۔امید ہے تم میرا مان نہیں توڑو گی۔میں تم سے والی جی اور تمہاری والدہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔آخر وہ کیا بات ہے جس نے تمہاری والدہ کو حویلی اور والی جی سے اتنا دور کر دیا ہے؟ وہ والی جی کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتیں۔"

شاداں کے بھرے بھرے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔۔۔۔اور میرے دل نے گواہی دی کہ وہ کافی کچھ جانتی ہے۔

میں نے کہا۔ "شاداں ! مجھے تمہارے گھرانے کے بارے میں سارا کچھ پتا ہے۔ تم لوگ حویلی کے پرانے ملازم ہو۔ تم لوگوں کی وفاداری میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تمہاری والدہ اچانک والی جی سے دور ہو گئیں اور تم چاروں پانچوں بہنوں کو لے کر حویلی سے نکل آئیں ؟"

شاداں کے چہرے پر پھر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ سنبھل کر بولی۔ "بات تو وہی ہے جی۔۔۔۔ جو آپ کو بھی پتا چل گئی ہو گی۔ ماں جی اور چودھری عزیز کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ والی جی گاؤں میں نہیں تھے۔ ماں نے چودھری عزیز سے کچھ پیسے مانگے، انہوں نے نہیں دیے۔ اسی بات پر چودھری عزیز نے سخت باتیں کر دیں اور گرمی سردی ہو گئی۔"

میں نے کہا۔ "شاداں ! یہ تو وہ وجہ ہے جو عام لوگوں کو بھی پتا ہے اور مجھے بھی شاید رونق علی نے بتائی تھی مگر میں اصل وجہ جاننا چاہتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اصل وجہ یہ نہیں ہے۔ تم لوگوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے جس کی وجہ سے پانچ چھ سال پہلے تم نے اچانک راجوال چھوڑ دیا اور حویلی سے بھی ہر ناتا توڑ لیا۔"

شاداں کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہ واضح طور پر ڈری ہوئی نظر آئی۔ تاہم اس کی خاموشی برقرار تھی۔ میں نے کہا۔ "شاداں ! تمہیں پتا ہے، میں جاگیر کا سالار ہوں۔

مجھے ہر معاملے پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ تمہارا اور والی جی کا معاملہ بھی مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ میں بہت سی باتیں جانتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ تین دن پہلے والی جی یہاں تم سے ملنے آئے تھے۔"

شاداں نے ٹھٹک کر اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر چمکیلے دوپٹے کے نیچے اپنی انگلیاں مروڑتی رہی پھر منمنائی۔

"والی جی بھی اسی طرح گزرتے ہوئے آ گئے تھے۔۔۔۔ جج۔۔۔۔ جیسے آپ آئے ہیں۔"

"دیکھو شاداں ! مجھے بتا کر تم گھاٹے کا سودا نہیں کرو گی۔ اگر یہاں کوئی مسئلہ ہے تو میں حل کروں گا، جیسے پہلے میں نے حل کیا ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔ ڈرو مت۔۔۔۔ جس طرح تم نے پہلے حوصلہ کر کے پاشے والی بات بتائی تھی، اب بھی حوصلہ کر لو۔"

ایک دم اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اس نے نفی میں سر ہلایا۔"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔اور اگر۔۔۔۔۔ ہے بھی تو اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

اس کے آخری الفاظ کافی اہم تھے۔میں نے ان الفاظ کو پکڑتے ہوئے کہا۔"تم فائدے اور نقصان کی بات نہ سوچو۔بس یہ سمجھ کر مجھے بتاؤ کہ جو کچھ مجھے بتاؤ گی وہ صرف اور صرف مجھ تک رہے گا۔میں اس میں سے کوئی بہتری نکال سکوں تو نکال لوں گا مگر نقصان نہیں ہونے دوں گا۔اور دیکھو شاداں! میں بہت کچھ جان بھی چکا ہوں۔وہاں وزیر آباد کے مالن پور گاؤں میں جو کچھ ہوا،اس کے بارے میں بھی تھوڑا بہت جانتا ہوں۔"میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا لیکن اس کا اثر شاداں پر بہت گہرا ہوا۔وہ بری طرح چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔اس اندھیرے کے تیر اور میرے پُراعتماد لہجے نے شاداں کے تنے ہوئے چہرے کو قدرے نرم کر دیا۔۔۔۔مگر وہ بدستور نفی میں سر ہلاتی رہی۔

"نہیں،اب کچھ نہیں ہو سکتا سالار جی۔یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ان پر مٹی ہی پڑی رہے تو اچھا ہے۔آپ کو رب کا واسطہ،ان بے فائدہ باتوں کو اب نہ چھیڑیں۔"

"ہو سکتا ہے یہ تمہارے لیے اب بے فائدہ ہوں لیکن کسی دوسرے کے لیے اب بھی ان میں سے کوئی اچھائی نکل سکتی ہو۔"

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"مثلاً والی جی۔میں جانتا ہوں اور یقیناً تم بھی جانتی ہو گی کہ والی جی دل کے برے نہیں ہیں۔لیکن آج کل وہ شدید پریشان ہیں اور یہی پریشانی انہیں دن بہ دن زندگی سے دور کر رہی ہے۔ان کو دل کا ایک دورہ پڑ چکا ہے اور دوسرا بھی کسی وقت پڑ سکتا ہے۔میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں شاداں۔اور یہ مدد تب ہی ہو سکتی ہے جب ان کی شدید پریشانی کی اصل وجہ معلوم ہو۔"

وہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگی۔اپنی ساس سے اپنا رونا چھپانے کے لیے وہ جلدی سے اندر چلی گئی۔اس کا دیور صحن میں پالتو خرگوشوں کے پیچھے بھاگتا پھر رہا تھا۔میں وہیں برآمدے میں چارپائی پر بیٹھا رہا اور خود کو مصروف رکھنے کے لیے سگریٹ کے خالی پیکٹ کو پھاڑ کر اس پر بال پوائنٹ سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا۔قریباً پانچ منٹ بعد شاداں واپس آ گئی۔اس کا چہرہ دُھلا دُھلا یا نظر آتا تھا۔آنکھوں میں اب بھی نمی کے آثار تھے۔

وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ "سالار جی! وہ گھر آنے والے ہیں۔ میں نے روٹی پکائی ہے۔ آپ بھی روٹی کھا کر جائیں۔" اس کا اشارہ شوہر کی طرف تھا۔

"پر ہماری بات۔۔۔۔"

"اگر آپ۔۔۔۔ پرسوں آسکیں تو اچھا ہے۔ انہوں نے لوہا وغیرہ لینے کے لیے گوجرانوالہ جانا ہے۔۔۔۔"

"تو ٹھیک ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "پرسوں دس گیارہ بجے ملاقات ہو گی۔"

"پر آپ روٹی شوٹی تو۔۔۔۔"

"نہیں نہیں۔ تمہاری جلیبیوں اور نمک پاروں نے کوٹہ پورا کر دیا ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ٹھیک 48 گھنٹے بعد میں ایک بار پھر سوپور گاؤں میں تھا اور شاداں کے گھر اس کے سامنے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ شاداں کا شوہر کبیر جو لوہار کا کام کرتا تھا، گوجرانوالہ گیا ہوا تھا۔ ساس

سامنے دھوپ میں چھوٹے چھوٹے سوراخوں والی گرم چادر اوڑھ کر لیٹی ہوئی تھی۔ دیور ایک طرف کچی زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور کمان کی طرح دُہرا ہو کر تختی لکھ رہا تھا۔

شاداں نے اپنی سبز اوڑھنی سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "ماں نے مجھے مار چھوڑنا ہے سالار جی۔"

"میں نے تجھ سے کہا ہے ناشاداں! ماں کو کبھی یہ بات معلوم نہیں ہو گی کہ تم نے کچھ بتایا ہے۔ اگر تم کہتی ہو تو میں یہ وعدہ پکے کاغذ پر لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔"

وہ کچھ دیر سر جھکا کر بیٹھی رہی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور پلکوں پر موتی اٹکے ہوئے تھے۔ شادی کے بعد وہ کچھ نکھر گئی تھی پھر بھی عمر اس کے خدوخال میں سے جھانکتی نظر آتی تھی۔ اس نے لاچاری کے انداز میں برآمدے کے کچے فرش کی طرف دیکھنا جاری رکھا۔ وہ جیسے اظہار کے لیے الفاظ اکٹھے کر رہی تھی۔ میرے ذہن میں کئی سوال ابھر رہے تھے۔ وہ کیا بتانے جا رہی تھی؟ کیا اماں دلشاد اور والی جی کے درمیان ماضی میں کوئی غیر اخلاقی تعلق رہا تھا؟ کیا اس معاملے کا تعلق والی جی کے بجائے چودھری عزیز سے تھا؟ کیا حویلی میں اماں دلشاد کی بیٹیوں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا تھا؟

آخر شاداں نے ایک گہری سانس لی اور کانپتی آواز میں بولی۔ "سالار جی! والی صاحب بہت اچھے ہیں۔ پر کچھ سال پہلے ان سے ایک بڑی غلطی ہوئی ہے۔ ایسی غلطی جس کو ماں مر کر بھی ماف نہیں کر سکتی۔۔۔۔اور شاید ہم بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے سینوں کے اندر یہ پھٹ ہمیشہ تازہ رہے گا۔"

"کیا کیا انہوں نے؟"

"انہوں نے وہ کیا جو ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ان کی وجہ سے ہماری آپا ہم سے چھن گئی۔ وہ آپا جو ہمارے لیے جیتی تھی اور ہمارے لیے مرتی تھی۔

جو دن رات اپنی ہڈیاں اس لیے رولتی تھی کہ ہم بہنوں کی ڈولیاں عزت سے اٹھ سکیں۔ وہ اپنے اندر اپنی ساری حسرتیں ساتھ لے کر مر گئی۔"

وہ کچھ دیر تک دوپٹا منہ کے آگے رکھ کر اپنی سسکیاں روکتی رہی۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اصل میں تو یہ کہانی میری ماں سے ہی شروع ہوتی ہے۔ ماں کی شادی غیروں میں ہوئی تھی۔ میرا باپ بڑا سخت تھا۔ وہ ہر وقت غصے میں تپا ہوا رہتا تھا۔ وہ گھر میں آتا تو ہم سب سہم کر رہ جاتے تھے۔ مجھے اس کی بس تھوڑی شکل یاد ہے۔ وہ ماں کو مارتا بھی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

بہت تھا۔ کبھی کبھی سخت سردی میں اسے کمرے سے نکال دیتا اور وہ ساری رات ویہڑے میں کھڑی رہتی۔ ہم اندر روتے تھے اور وہ باہر روتی تھی۔ پر ہمارے اندر ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ایک دوسرے سے مل سکیں۔ وہ انجن ٹھیک کرنے کا کام کرتا تھا۔ اس کا ایک یار سجاول بھی یہی کام کرتا تھا۔ کسی وقت وہ دونوں مل کر پسرور شہر میں منڈوا (فلم) دیکھنے جاتے۔ جب بھی وہ منڈوا دیکھ کر گھر آتا تو اس نے نشہ بھی کر رکھا ہوتا تھا۔ ایسے میں ہم سب کی اور زیادہ شامت آتی۔ یقین کرو سالار جی! ایسے میں ہم دل میں دعائیں کیا کرتے تھے کہ ہمارا ابا گھر ہی نہ آئے۔ راستے میں ہی کہیں گھوڑے سے گر کر مر جائے۔ اس کے آنے سے پہلے ہی ہم جھوٹ موٹ سو جاتے۔ اس کا سارا غصہ ماں پر اترتا۔ وہ بڑے صبر والی ہے اور تب بھی ایسی ہی تھی۔ ساری سختیاں سہتی تھی پر شکایت زبان پر نہیں لاتی تھی۔"

چند لمحے خاموش رہ کر شاداں ذہن میں الفاظ جمع کرتی رہی پھر بولی۔ "ایک بار وہ ایسے ہی نشہ کر کے گھر آیا ہوا تھا۔ چھوٹی ثمینہ ماں کے پاس تھی جبکہ ہم چاروں دوجے کمرے میں تھیں۔ میرے پیٹ میں درد ہونے لگی۔ میں پورا ایک گھنٹا بلک بلک کر روتی رہی۔ میں مشکل سے چار سال کی تھی۔ آپا نے مجھے گلو جوین کھلائی۔ مولی کا نمک چٹایا۔ پر مجھے آرام

نہیں آیا۔۔۔۔ پھر ابے کے کمرے کا دروازہ زور سے کھلا۔ ابا لال آنکھوں کے ساتھ باہر آیا۔ اس نے مجھے منجی سے اٹھایا اور سر سے اونچا کر کے پھر منجی پر پھینک دیا۔ میں اچھل کر زمین پر گری اور ایک دم چپ ہو گئی۔ میری درد بھی رک گئی۔ میں صبح تک جیسے سکتے میں پڑی رہی۔ صبح ماں نے دیکھا تو میرا ایک بازو ہل نہیں رہا تھا، وہ کندھے سے اتر گیا تھا۔ سر سے بھی خون نکلا ہوا تھا۔ ماں نے ایک اور لمبی آہ کھینچی اور منہ ہی منہ میں کچھ کہا تھا۔ بڑے کہتے ہیں نا جی کہ صبر کرنے والی کی "ہا" میں بڑا اثر ہوتا ہے۔۔۔۔ چار دن بعد میرا ابا مر گیا۔"

شاداں کی آنکھوں میں تازہ آنسو امڈ پڑے اور وہ انہیں دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

"کیا ہوا تھا اسے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ماں کے جھمکے بیچنے کے لیے سائیکل پر گوجرانوالہ گیا تھا۔ وہاں ایک لاری کے نیچے آ گیا۔ ماں، جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی، اٹھائیس تیس سال کیا عمر ہوتی ہے۔ میری نانی اللہ بخشے حویلی میں ہی تھی۔ وہ میری ماں کو اور ہمیں اپنے پاس لے گئی۔ میری نانی بیمار تھیں۔ وہ تو تین چار مہینوں بعد اللہ کے پاس چلی گئیں، حویلی کا سارا کام کاج ماں نے سنبھال لیا۔"

"والی جی تو ان دنوں جوان ہی ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ بڑے گورے چٹے تھے۔ چہرہ ہر وقت لال رہتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں بھی تھیں۔ سفید کپڑے پہنتے تھے۔ میرے خیال میں اس وقت ان کی عمر پینتیس چالیس سال ہو گی۔ وہ ان دنوں اپنی پہلی بیوی وڈی بیگم جی کے ساتھ رہتے تھے۔ ان دنوں حویلی میں ناچ گانا آج کل سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔ والی جی کے یار دوست بھی بڑے تھے۔ وہ شکار کھیلتے تھے، کتوں کی دوڑیں کرواتے تھے، اور باز اڑاتے تھے۔ میری عمر اس وقت چار ساڑھے چار سال اور آپا کی عمر چھ سال ہو گی۔ ساڑھے پانچ چھ سال کا بچہ چھوٹا سا ہی ہوتا ہے۔ میں تو بیمار رہتی تھی۔ میرا ایک بازو بھی سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ پر آپا آسیہ ساری حویلی میں دوڑتی بھاگتی پھرتی تھی۔ آپا پیاری بھی بہت تھی۔ ہر ایک کی توجہ اپنی طرف کر لیتی تھی۔"

"میں نے سنا ہے کہ تمہاری آپا کو گھر میں گڈی کہتے تھے؟"

"ہاں جی۔ سب سے پہلے والی جی نے ہی گڈی کہنا شروع کیا تھا، پھر سب یہی کہنے لگے۔ مجھے ابھی بھی تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔ وہ اپنی دو گتیں (چوٹیاں) ہلاتی ہوئی، ننگے پاؤں حویلی کے پکے فرش پر اتنی تیزی سے چلتی تھی کہ لگتا تھا چابی والا کھلونا ہے۔ وہ ہر کام بھاگ کر کرتی اور کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔۔۔۔ کبھی وڈی بیگم کے سر کی مالش کر رہی

ہے۔ کبھی ہتھ میں ایک لمبی سی لاٹھی پکڑ کر والی جی کی کمر پر چڑھی ہوئی ہے اور انہیں لتاڑ رہی ہے۔ کبھی ان کے پاؤں کی انگلیوں کے پٹاکے نکال رہی ہے، کبھی ان کے مونڈھے دبا رہی ہے۔ والی جی کسی وقت اسے اٹھا کر ایک اونچی دیوار پر کھڑا کر دیتے اور کہتے۔ "چل گڈی! چھال مار۔" وہ والی جی کے کہنے پر بے دھڑک چھال مار دیتی۔ والی جی اسے پکڑ لیتے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اسے کمرے کی چھت پر کھڑا کرنے لگے۔ وہ وہاں سے بھی چھال مارنے لگی۔ مجھے یاد ہے، ایک دن والی جی نے اسے چھت پر کھڑا کر کے اس کا منہ چھت کی طرف کر دیا اور کہا کہ الٹی چھال مارو۔ وہ ڈرنے لگی۔ والی جی نے کہا۔ "گھبرانہ۔۔۔۔۔ میں تجھے پکڑ لوں گا۔" وہ کچھ دیر ڈرتی رہی پھر اس نے چھال ماردی۔ والی جی بڑے خوش ہوئے۔ انہوں نے آپا کو دو سو روپیا انعام دیا۔ دوسرے نوکروں کے دو چار بچے بھی وہاں تھے۔ والی جی نے کہا کہ جو کوئی گڈی کی طرح چھال مارے گا اسے دو سو روپیا انعام ملے گا۔ الٹی تو کیا، کسی کو سیدھی چھال مارنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ کچھ دن بعد والی جی نے آپا کا یہ کرتب اپنے یاروں دوستوں کو بھی دکھایا۔ سب بہت حیران ہوئے۔ میرے بتانے کا مطلب یہ ہے سالار جی۔۔۔۔۔ کہ وہ شروع سے ہی والی جی پر بڑا بھروسا کرتی تھی۔" آخری الفاظ کہتے کہتے

کرب کی ایک لہر سی شاداں کے سینے سے ابھری اور اس کے چہرے پر اندوہ کا گہرا سایہ پھیل گیا۔

چند گہری سانسیں لینے کے بعد اس نے کہا۔ "اسی طرح تین چار سال گزر گئے جی۔ میرا بازو بھی ایک اللہ والے کی دعا سے ٹھیک ہو گیا تھا۔ اب میں بھی گھر کے کام کاج میں ماں اور آپا کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹاتی تھی۔ ہم سب والی جی کا خیال رکھتے تھے۔ پر آپا تو بہت زیادہ رکھتی تھی۔ ان کے کسی بھی کام کے لیے وہ بجلی جیسی تیزی سے حرکت میں آجاتی تھی۔ اب سوچتی ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ ہم بہنوں کو گھر میں پیار کم اور ڈر زیادہ ملا تھا۔۔۔۔۔ شاید آپا آسیہ میں یہ پیار کی کمی ہم سے زیادہ تھی۔ انہوں نے ایک ترسے ہوئے بچے کی طرح اس کمی کا علاج، والی جی میں ڈھونڈا تھا۔ مجھے یاد ہے، انہی دنوں والی جی اور وڈی بیگم میں ناچاقی شروع ہو گئی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں یہ ناچاقی بہت زیادہ ہو گئی اور نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ وڈی بیگم جی اپنے بیٹوں کے ساتھ حویلی چھوڑ گئیں۔ والی جی بھی بہت دن تک پریشان رہے۔ ان کی پریشانی کا آپا نے بہت زیادہ اثر لیا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر روتی تھی۔ ماں اسے ڈانٹتی تھی کہ وہ کیوں خود کو رو رو کر ہلکان کر رہی ہے؟ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ ان دنوں آپا نے والی جی کا بہت

خیال رکھا اور زیادہ خیال رکھنے کی وجہ سے کئی بار والی جی سے ڈانٹ بھی کھائی۔ ان دنوں آپا کی عمر چودہ پندرہ سال اور میری بارہ تیرہ سال ہو گی۔ کچھ مہینے بعد والی جی کی شادی چھوٹی بیگم جی سے ہو گئی۔ چھوٹی بیگم بلقیس کے آنے سے حویلی میں نئی رونق آ گئی۔ چھوٹی بیگم بلقیس ان دنوں آج سے بھی زیادہ خوبصورت تھیں۔ وہ بھی زیادہ عمر کی نہیں تھیں۔ شاید پندرہ سولہ سال کی ہوں گی۔ وہ ہر ایک کا بڑا خیال بھی رکھتی تھیں۔ جب اپنے میکے جاتیں تو گھر والوں کے ساتھ ساتھ ملازموں کے لیے بھی تحفے لے کر آتیں۔ ان کے آنے سے ترنجن اور گدے والی راتوں میں جان پڑ گئی۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو، وہ گاتی بھی بڑا اچھا ہیں۔"

"ہاں تھوڑا تھوڑا پتا ہے۔" میں نے ہنکارا بھرا۔

شاداں اوڑھنی درست کرتے ہوئے بولی۔ "میں آج بھی بھولی نہیں ہوں۔ وہ ایک ایسی ہی رات تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں، بیگم جی کی سہیلیاں اور حویلی کی نوکرانیاں سب مل کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ چرخے کات رہی تھیں۔ کچھ ماہیے گا رہی تھیں یا ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ باغیچی میں جھولے پڑے ہوئے تھے، یہ برسات کا موسم تھا۔ اچانک حویلی میں بھگدڑ مچ گئی۔ پتا چلا کہ نہر کی پٹڑی ٹوٹ گئی ہے اور سیلاب کا پانی گاؤں کی طرف آ رہا

ہے۔ لوگ جان بچانے کے لیے گاؤں سے نکلنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے حویلی بھی خالی ہو گئی۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی سواریوں سے بھری ہوئی حویلی سے نکلی۔ والی جی بھی اپنے اور چودھری عزیز کے بال بچے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ سیلاب کا پانی حویلی میں داخل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ والی جی نے پیچھے رہ جانے والے ملازموں سے کہا کہ وہ حویلی کی چھت پر چلے جائیں۔ وہ ان کے لیے مدد لے کر آتے ہیں۔

"والی جی کے جانے کے بعد پانی تیزی سے اونچا ہونے لگا۔ ان دنوں حویلی ایک منزلہ تھی۔ ہم جان بچانے کے لیے چھت پر چلے گئے۔ ہمارے علاوہ بڑے مالی گلاب دین کا بال بچہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ چاچے عسکری کی رشتے دار عورتیں تھیں جو حویلی میں کام کرتی تھیں۔ جوں جوں رات گہری ہوتی گئی، پانی چڑھتا گیا۔ ہمیں بچانے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ آخر باقی لوگوں نے گھبرا کر پانی میں چھالیں مار دیں اور تیر کر پاس کے درختوں تک پہنچنا چاہا۔ ان میں سے کچھ کے پاس گھڑے اور کچھ کے پاس ہوا سے بھری ٹیوبیں تھیں۔ ماں نے ہم سے بھی کہا کہ ہم پانی میں کود پڑیں۔ پر آپا ڈر گئی۔ اس نے کہا، ہم یہیں رہیں گے۔ ہم

کہیں نہیں جائیں گے۔ والی جی نے کہا ہے، وہ ہم کو بچانے ضرور آئیں گے۔ اس نے کسی کی بات نہیں مانی۔ بس وہ ایسے ہی بھروسا کرتی تھی۔" شاداں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تو پھر والی جی بچانے آئے ؟"

"ہاں، وہ رات پچھلے پہر آئے۔ ان کے ساتھ ایک فوجی کشتی تھی۔ پر اس وقت تک پانی ویسے ہی تھوڑا تھوڑا اترنا شروع ہو گیا تھا۔ آپا کے بھروسے کا فائدہ ہمیں یہ ہوا کہ ہم پانی میں کودنے سے بچ گئے۔ جو پانی میں کودے، ان کا بڑا نقصان ہوا۔ دو بچے ٹیوب سے پھسل کر ڈوبے۔ گلاب دین کی سالی بھی جھاڑیوں میں پھنس کر جان گنوا بیٹھی۔ چاچے عسکری کا ایک بھائی لاپتا ہوا اور ایک کو پانی کے سانپ نے ڈنک مارا۔ بعد میں وہ بھی مر گیا تھا۔ اس سیلاب میں سات آٹھ پنڈوں کے دو ڈھائی سو لوگ مرے تھے۔"

شاداں کی ساس جو صحن میں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، بُری طرح کھانسنے لگی۔ لگتا تھا کہ اس کا دم الٹ گیا ہے۔ شاداں نے اٹھ کر اسے کھانسی کی دوا دی۔ دور دراز دیہات میں کھانسی کی دوا بڑی عجیب ہوتی ہے۔ توے کی کالک کے اندر چینی یا شکر ملائی جاتی ہے۔ شاداں کے پاس

بھی یہی کچھ تھا۔ اس کا دیور ہینڈ پمپ کے نیچے الف ننگا نہا رہا تھا اور اپنے حال میں مگن تھا۔ اس کو دُھلے ہوئے کپڑے دے کر وہ پھر میرے پاس آن بیٹھی۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ، والی جی کا برتاؤ بیگم بلقیس سے کیسا تھا؟"

"بس ٹھیک ہی تھا جی۔ بیگم بلقیس بھی زمیندار گھرانے سے ہیں مگر ان کی مالی حالت چنگی نہیں تھی۔ باپ بھی فوت ہو چکا تھا۔ جب والی جی نے بیگم بلقیس سے شادی کرنا چاہی تو ان لوگوں نے ہامی بھر لی۔ کہتے ہیں کہ بیگم بلقیس نے پکی عمر کے والی جی سے شادی کرنے سے پہلے یہ شرط رکھی تھی کہ اب حویلی میں ناچ گانا اور دوسرے شغل میلے نہیں ہوں گے۔ لیکن یہ چودھری زمیندار وغیرہ کہاں باز آتے ہیں جی۔ ہاں، یہ ہوا تھا کہ بیگم جی کے آنے کے بعد یہ کام کچھ کم ہو گئے تھے۔ عام طور پر ناچنے والیاں باغ والے ڈیرے پر آتی تھیں اور وہیں سے واپس چلی جاتی تھیں۔ آہستہ آہستہ بیگم جی نے بھی ان باتوں پر چپ رہنا سیکھ لیا۔"

"تم اپنے اور آپا کے بارے میں بتا رہی تھیں۔" میں اسے پھر اصل موضوع پر لایا۔

اس کے چہرے پر غم کے سائے لہرا گئے۔۔۔۔۔وہ ایک دھیمی لیکن طویل آہ بھر کر بولی۔"وقت گزرتا رہا جی۔والی جی کے گھر بیٹا ہوا تھا۔ہم سب اسے اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے۔آپا بھی ایسا ہی کرتی تھیں۔وہ اب بڑی ہو گئی تھیں۔ان کے ذمے کھانا پکانے کا کام لگ گیا تھا۔پھر بھی وہ والی جی کے کسی بھی کام کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔اور آپا ہی کیا ،ہم سب بہنوں کی سوچ ایسی ہی تھی۔والی جی ہمارے مالک تھے،پر ہم انہیں اپنے سرپرست کی طرح دیکھتی تھیں۔ہمیں لگتا تھا کہ ہمارے سر پر ان کا سایہ ہے اور کوئی مشکل ہمارے لیے مشکل نہیں ہے۔جب آپا کی عمر بیس سے اوپر ہوئی تو ماں کو اس کی شادی کی فکر پڑ گئی۔آپ کو پتا ہی ہے،ہمارے علاقوں میں شادیاں جلدی ہو جاتی ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔"میں نے ہنکارا بھرا۔

"ماں کے ساتھ ایک مسئلہ تھا،اس کے دل میں جیسے شادی کے بارے میں ڈر بیٹھا ہوا تھا۔اس کی وجہ یہی تھی کہ ماں نے شادی کے بعد بڑی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ہمارا باپ جتنا عرصہ زندہ رہا اس نے ماں کو سولی پر لٹکائے رکھا۔وہ سارا دن مشین کی طرح کام کرتی تھی۔ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کو پالتی تھی اور رات ہمارے باپ سے مار کھاتی تھی۔شادی

کے بعد دو چار مہینوں کے اندر ہی ہمارے باپ میں وہ ساری برائیاں ظاہر ہو گئی تھیں جو ظالم شوہروں کے اندر ہوتی ہیں۔اب ماں بہت پھونک پھونک کے قدم رکھنا چاہتی تھی۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب اس کی بیٹی کے ساتھ بھی وہی کہانی دُہرائی جائے۔"

"اپنے رشتے داروں میں کوئی لڑکا نہیں تھا؟"میں نے پوچھا۔

"نہیں جی۔۔۔۔۔اگر ہوتا تو یہ کام شاید اتنا مشکل نہ بنتا۔ماں نے دو تین جگہ رشتے دیکھے پر تسلی نہیں ہوئی۔آپ کو پتا ہی ہے کہ لڑکیوں کی عمر کتنی جلدی گزرتی چلی جاتی ہے۔لڑکی بائیس تئیس سے اوپر ہو جائے تو اچھا رشتہ ملنا اور مشکل ہو جاتا ہے۔آپا کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔وقت گزر رہا تھا اور کہیں کوئی بات نہیں بن رہی تھی۔۔۔۔۔ماں نے اس بارے میں والی جی سے بھی کہا کہ وہ دھیان رکھیں۔دوسرے ملنے جلنے والوں کے کانوں میں بھی بات پہنچائی۔۔۔۔۔مگر کہیں سے کوئی رستہ نہیں نکلا۔۔۔۔۔کچھ وقت اسی طرح گزرا پھر ایک موقعے پر یوں ہوا کہ ماں جب زیادہ پریشان ہوئی تو اس نے آپا کا رشتہ ایک جگہ کر دیا۔۔۔۔۔رشتہ کیا کیا، نکاح ہی کر دیا۔پر رخصتی نہیں ہوئی۔یہ غیر برادری کا ایک لڑکا تھا۔میلوں ٹھیلوں میں پنگوڑا لگاتا تھا۔ماں اس رشتے پر خوش تھی۔آپا بھی خوش تھی۔اس کی

بڑی چاہت تھی کہ ہم سب بہنوں کی شادیاں جلدی جلدی ہوں اور ہم اپنے اپنے گھروں میں جابسیں۔ یہ ایک طرح سے ماں کی چاہت تھی جو آپا میں بھی آگئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ میرا اور زرینہ کے جہیز کا سامان بھی تیار کر رہی تھی۔ لیکن پھر ایک دن سب کچھ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ پتا چلا کہ کسی میلے میں لڑائی جھگڑے کے بعد پلس نے آپا کے ہونے والے بندے آسو کو پکڑا ہے۔ اس کے بعد ایک ایک کرکے اور بھی باتیں کھل گئیں۔ آسو بھنگ اور شراب کا نشہ کرتا تھا۔ سرکس میں کام کرنے والی ایک ناچی کے ساتھ بھی اس کی میل ملاقات تھی۔ ماں کا دل بہت بُرا ہوا۔ وہ کئی دن تک روتی رہی۔ آپا کو رخصتی سے پہلے ہی طلاق ہوگئی۔ یہ بڑا صدمہ تھا لیکن ابھی ہم بدنصیبوں کی قسمت میں اس سے بھی بڑے صدمے لکھے تھے۔۔۔۔"

شاداں کی آواز پھر بھرا گئی اور اس کی پلکوں پر تارے چمکنے لگے۔ کچھ دیر بعد خود کو سنبھال کر اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ میرے سامنے جوڑے اور بولی۔ "سالار جی! میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر ان باتوں کا پتا کسی اور کو چل گیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ پتا نہیں کیوں میں آپ کو سب کچھ بتا دیتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں ہے ایسا؟"

"تم مجھ پر اعتماد کرتی ہو اور میں اس اعتماد کو کبھی بھی ٹھیس نہیں پہنچنے دوں گا شاداں۔" میں نے دل کی گہرائی سے کہا۔

وہ کچھ دیر گوٹے کنارے والے دوپٹے کے نیچے اپنی انگلیاں مروڑتی رہی پھر دل دوز آواز میں بولی۔ "یہ ان دنوں کی بات ہے جب چودھری عزیز کی بیوی فوت ہوئی تھی۔ چودھری عزیز ناچ گانے میں کچھ زیادہ ہی مست ہو گئے تھے۔ وہ راتیں باغ والے ڈیرے پر گزارتے تھے۔ گوجرانوالہ اور لاہور سے نئی نئی لڑکیاں لائی جاتی تھیں۔ پھر ایک روز وہ شراب پی کر گھر آگئے تھے اور خوب شور شرابہ کیا۔ بیگم جی نے ان کو منع کیا جس پر تلخی ہوگئی۔ آپ کو پتا ہی ہوگا کہ جاگیر کی بہت سی زمینیں چودھری عزیز کے نام پر ہیں۔ والی جی کو ان کے ساتھ بنا کر رکھنی پڑتی تھی اور اب بھی رکھنی پڑتی ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ چلنا دونوں کی مجبوری ہے۔ اس واقعے کے بعد بیگم جی بہت ناراض ہوئیں اور کچھ دنوں کے لیے میکے چلی گئیں۔ ماں بھی ان دنوں بیمار تھیں۔ زنان خانے میں صفائی ستھرائی کا کام بھی آپا کو کرنا پڑ رہا تھا۔ میں اور ثمینہ اوپر کی منزل کی جھاڑ پونچھ کرتی تھیں۔ زرینہ اور فیروزاں باورچی خانے کا کام سنبھالتی تھیں۔ ایک روز جب والی جی نشے میں تھے اور زنان خانے میں ان کے اور آپا

کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے آپا سے کہا کہ وہ ان کا سر دبائے، آپا سر دبانے لگی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے آپا سے کہا کہ وہ الماری سے بوتل اور گلاس نکالے۔ آپا تو حکم کی بندی تھی۔ بچپن سے والی جی کے ہر حکم کو آنکھیں بند کر کے ماننا اس کی عادت تھی۔ وہ آپا کو دوسری منزل سے زمین پر چھلانگ مارنے کا کہتے تو شاید آپا وہ بھی مار دیتی۔۔۔۔ اس بند کمرے میں والی جی جو جو کہتے رہے، وہ کرتی رہی۔ شاید وہ روئی بھی ہو، اس نے خود کو بچانے کی تھوڑی بہت کوشش بھی کی ہو لیکن وہ والی جی کے اتنے اثر میں تھی کہ خود کو بچا نہیں سکی۔ آپا کو گڈی گڈی کہنے اور اس کو اپنے ہاتھوں میں اچھالتے رہنے والے والی جی نے اس کو کہیں کا نہ چھوڑا۔۔۔۔" شاداں نے چہرہ دوپٹے میں چھپایا اور بے آواز رونے لگی۔

میں نے کہا۔ "شاداں! تمہاری ساس دیکھے گی تو کیا سوچے گی۔ خود کو سنبھالو۔"

کچھ دیر بعد شاداں نے دوپٹا چہرے سے ہٹایا اور گلوگیر آواز میں بولی۔ "آپا کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک بار نہیں ہوا سالار جی۔۔۔۔ پورے تین مہینے تک بیگم جی میکے سے نہیں آئیں اور تین مہینے والی جی حویلی میں آپا کے ساتھ یہ کھیل کھیلتے رہے۔ ان دنوں آپا بالکل گم صم تھیں، کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ میں سمجھتی تھی، ماں کی بیماری نے

اسے پریشان کیا ہوا ہے۔ ہم سب والی جی پر اتنا بھروسا کرتے تھے کہ ہمارے دماغوں میں کوئی ایسی بات آ ہی نہیں سکتی تھی۔ پھر بیگم جی اپنے میکے سے حویلی میں واپس آ گئیں اور یہ کھیل ختم ہو گیا۔"

"بیگم جی کو شک نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔۔۔۔ بلکہ سچی بات یہ ہے سالار جی۔۔۔۔ کہ بیگم جی کو آج تک معلوم نہیں۔ اور بیگم جی ہی کیا، کسی کو معلوم نہیں۔ صرف ہم چار بہنوں اور ماں کو پتا ہے۔۔۔۔ یا پھر آج اتنے سالوں بعد آپ کو پتا چلا ہے۔" شاداں کی آنکھوں میں پھر اندیشوں کے سائے لہرا گئے۔

"اچھا۔ تم لوگوں کو کب پتا چلا؟"

"بڑی جلدی چل گیا جی۔ آپا کچھ بیمار ہوئی۔ ماؤں کی نظر ایسے معاملوں میں بڑی تیز ہوتی ہے۔ بہت جلد ماں کو پتا چل گیا کہ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، ان کو پتا چل گیا کہ آپا کا پاؤں بھاری ہے۔ ایک قیامت آ گئی۔ ماں نے آپا کو بہت مارا یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔۔۔۔ اگلے دو چار ہفتے ہم پر بہت بھاری گزرے۔ ماں آپا سے پوچھتی تھی کہ یہ کیوں

ہوا اور کس نے کیا؟ آپا کچھ بتاتی نہیں تھی۔۔۔۔۔بس روتی رہتی تھی۔ چھوٹی ثمینہ بڑی سیانی ہے۔اس کو کچھ شک ہو چکا تھا۔اس نے ماں کو اس بارے میں بتا دیا۔جب یہ بات ثابت ہو گئی تو ماں کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔اس کے دماغ میں والی جی کا درجہ بڑا اونچا تھا۔اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی بچی کے ساتھ ایسا کریں گے۔ تین مہینے تک حویلی کی دیواروں کے اندر ہی یہ گندا کھیل کھیلا جاتا رہا تھا اور وہ بے خبر رہی تھیں۔دوسرے دن ماں والی جی سے ملیں۔پتا نہیں ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔۔۔۔۔جب ماں کمرے سے باہر نکلیں تو ان کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور پورا جسم پتے کی طرح لرز رہا تھا۔اگلے ہی روز ہم نے راجوال کی حویلی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی۔"

"کہاں گئے تم لوگ؟"

"شام پور میں میرا ایک چاچا رہتا ہے۔اس کا نام بھی خاور ہے جی۔وہ بڑا اچھا بندہ ہے۔شام پور میں اس کی تھوڑی زمین بھی ہے۔ہم کو چاچے کے پاس ہی پناہ ملی۔میری ماں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔چاچے کو بھی نہیں۔ان دنوں چاچا ویسے بھی کوئٹے میں تھا۔شام پور آنے کے کچھ ہی دن بعد میری ماں آپا کو لے کر چپکے سے وزیر آباد چلی گئی۔وہاں مالن پور گاؤں میں

ماں کی ایک بہت پرانی سہیلی بہشتو رہتی تھی۔بہشتو کی ایک بہن دائی کا کام بھی کرتی تھی اور بڑی سیانی سمجھی جاتی تھی۔۔۔۔۔ماں اپنے ایک منہ بولے بھائی کے ساتھ وہاں بہشتو کے پاس پہنچ گئی۔۔۔۔۔"

یہاں تک کہہ کر شاداں چپ ہو گئی۔اس سے آگے کی بات میں کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔۔۔۔۔مالن پور میں بدقسمت آسیہ کا حمل گرانے کی کوشش کی گئی تھی۔میں نے دیوار سے ٹیک لگائی اور سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا۔"تو۔۔۔۔۔تو تمہاری آپا کی موت وہیں پر ہوئی؟"

شاداں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں سے کئی موتی جھڑ کر اس کی چمکیلی قمیض میں جذب ہو گئے۔

"شام پور اور راجوال میں تم لوگوں نے کیا بتایا؟"

"کچھ بھی نہیں جی۔بس سب کو یہی پتا تھا کہ آپا ماں کے ساتھ وزیر آباد گئی ہوئی تھی۔وہیں سخت بیمار ہوئی اور دو چار دن میں ختم ہو گئی۔"

سینے میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ یہ وہی قدیم کہانی ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف ناموں اور حالات کے تحت دُہرائی جاتی رہی ہے۔ کبھی آقا اور کنیز، کبھی راجا اور حرم، کبھی مالک اور ملازمہ۔ طاقت اپنا خراج وصول کرتی ہے۔ کمزوری اور محکومی سسکیوں اور آہوں کے درمیان یہ خراج دیتی ہے۔ جاگیردار ارباب عرف والی جی نے بھی وہی کچھ کیا تھا جو اس قبیل کے لوگ کرتے ہیں۔ وہ خوبرو آسیہ کو گڈی گڈی کہتا تھا۔ گڈی ہی کی طرح اسے ہواؤں میں اچھالتا تھا اور اس کی معصوم شرارتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ لیکن وقت آنے پر وہ صرف ایک حاکم مرد بن گیا تھا اور وہ گڈی اس کے بستر ہوس پر روندی گئی تھی۔۔۔۔ بڑی خاموشی اور بڑی اطاعت مندی کے ساتھ۔ وہ بچپن میں آنکھیں بند کر کے والی جی کی بانہوں میں چھلانگ لگایا کرتی تھی۔ جب اسے جوانی میں یہ حکم دیا گیا تو بھی اس نے پورا کیا۔ اور پھر خاموشی سے شام پور میں میاں جی کے قبرستان میں جاسوئی۔

اس روداد نے دل پر اثر کیا۔ میں نے آسیہ کو دیکھا نہیں تھا۔ اس کا بچپن، نہ اس کی جوانی، نہ اس کے وہ کپڑے جو وہ جہیز کے لیے تیار کرتی تھی۔ نہ اس کی وہ آنکھیں جو اچھے دنوں کے

سپنے تھے۔ پھر بھی میرے دل پر ایک وزنی بوجھ پڑ گیا۔ میں سوچنے لگا، کیا اس شخص نے بھی ایسا بوجھ محسوس کیا ہوگا جس کے ہاتھوں نے یہ ظلم کمایا۔

شاداں کا دیور تختی لکھنے کے بعد اب ہل ہل کر قاعدہ پڑھ رہا تھا۔ ہلکی سی دھوپ نکل آئی تھی۔ مٹی کی گیلی دیواروں میں بھوسے کے تنکے چمکنے لگے تھے۔ میں نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "والی جی یہاں کیا کرنے آئے تھے؟"

"وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا آخری وقت قریب ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ماں انہیں ماف کر دے۔ ان کے دل میں یہ وہم بھی بیٹھا ہوا ہے کہ جب تک اماں انہیں ماف نہیں کرے گی، وہ مر بھی نہیں سکیں گے۔ اپنی بڑھتی ہوئی بیماری کو بھی وہ اپنے اس گناہ کا نتیجہ ہی سمجھتے ہیں۔"

مجھے بلقیس بیگم کی وہ ساری باتیں یاد آئیں جو وہ اس حوالے سے کرتی رہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ کوئی گہرا دکھ ان کے شوہر کو اندر ہی اندر کھاتا ہے اور وہ ہر وقت کسی ان دیکھی تکلیف میں رہتے ہیں۔ چند دن پہلے انہیں دل کا دورہ پڑا تھا اور ایسا تب ہوا تھا جب وہ چوری چھپے شام پور سے ہو کر واپس آئے تھے۔

میں نے شاداں سے پوچھا۔ "چندروز پہلے والی جی شام پور آکر تمہاری ماں جی سے ملے تھے؟"

شاداں نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

"وہ ملنے آئے تھے۔۔۔۔لیکن ماں نہیں ملی تھی۔اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا تھا۔بس دروازے کے دوسری طرف سے ہی دوچار باتیں کی تھیں۔"

"کیا اس سے پہلے بھی انہوں نے ایسی کوئی کوشش کی؟"

"ہاں جی۔ایک دوبار ایسا ہوا لیکن ماں نے ان سے بات نہیں کی۔وہ کبھی بات نہیں کرے گی۔اس کے دل پر بڑے گہرے زخم ہیں جی۔"

میں تقریباً آدھ گھنٹا مزید شاداں کے گھر رکا۔شاداں کی ساس بھی ہمارے قریب ہی بیٹھی رہی۔وہ کچھ سن نہیں سکتی تھی،بس ہونٹوں کی حرکت سے اندازے لگانے کی کمزور کوشش کرتی تھی۔دیہات کی عام بوڑھیوں کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی موتیا اتر چکا تھا۔اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ دودن پہلے جو شخص برستی بارش میں چادر میں لپٹا لپٹایا ان کے گھر آیا تھا،وہ علاقے کا بااثر ترین شخص جاگیردار والی جی تھا۔وہ میرے بارے میں بھی بس اتنا ہی جانتی تھی

کہ میں شاداں کے میکے گاؤں کا ہوں اور ایک بھائی کی طرح اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کر رہا ہوں۔خالص دیہاتی ماحول میں اس قسم کا میل ملاقات عجیب نہیں ہوتا۔شاداں نے اپنے شوہر کو بھی والی جی کی آمد کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔

میں شاداں کے گھر سے دل پر ایک بوجھ سا لے کر واپس آگیا۔رات کو انٹر کام پر بیگم بلقیس سے بات ہوئی۔"آج کہاں غائب رہے ہو سارا دن؟"انوں نے پوچھا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"تاجو بتا رہی تھی کہ تمہارا کمرا بند پڑا ہے۔"

"بس ذرا کام سے نکلا ہوا تھا۔"میں نے کہا۔مجھے بیگم بلقیس کی فکرمندی اچھی لگی۔

"کچھ چپ چپ ہو؟"انہوں نے کہا۔

"آپ بھی تو چپ چپ ہیں۔"

"ہاں۔"انہوں نے ایک طویل سانس لی۔"میں واقعی پریشان ہوں خاور! والی جی کی کچھ سمجھ نہیں آرہی۔"

"کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

"ہاں۔۔۔۔کل رات پچھلے پہر میری آنکھ کھلی۔والی جی پلنگ پر نہیں تھے۔میں نے اٹھ کر دیکھا۔وہ چھوٹے کمرے میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ایک بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھا ہوا تھا ۔۔۔۔وہ رو رہے تھے خاور۔میں نے انہیں زندگی میں پہلی بار روتے ہوئے دیکھا ہے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے بیگم بلقیس کی اپنی آواز بھی بھرا گئی اور وہ خاموش ہو گئیں۔

کتنی ہی دیر بعد ان کی اشک بار آواز دوبارہ ابھری۔"وہ بہت دکھی ہیں خاور۔۔۔۔۔مجھ سے ان کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ان کی حالت بھی دن بہ دن خراب ہو رہی ہے۔آج بھی تیز بخار ہے۔بازو میں ہلکا درد ہوتا ہے۔کل سے کچھ کھایا بھی نہیں انہوں نے۔"

والی جی کی بگڑتی ہوئی صحت اور ان کی پریشانی کے بارے میں ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔میں نے بیگم بلقیس کو اس نہایت اہم ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جو آج شاداں سے ہوئی تھی۔بہر حال، بیگم بلقیس کو تسلی تشفی دے کر میں نے انٹر کام بند کر دیا۔

میرے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔میں والی جی کا دکھ جان چکا تھا۔ایک نہایت سنگین غلطی کے بعد وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہے تھے۔میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جن بُرے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

لوگوں کی فطرت میں تھوڑی بہت اچھائی ہوتی ہے، وہ عمر کے آخری حصے میں اپنی غلطیوں پر نادم ہوتے ہیں اور پچھتاوے آسیبوں کی طرح انہیں گھیر لیتے ہیں۔شاید اس جاگیر کے کرتا دھرتا والی جی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔جواں مرگ گڈی کی موت ان کے دل کا روگ بنی ہوئی تھی۔وہ اماں دلشاد سے معافی کی صورت میں اس روگ سے چھٹکارا چاہتے تھے۔

والی جی جیسے بھی تھے، ان کے لیے میرے دل میں نرم گوشہ ہمیشہ رہا تھا اور اب بھی تھا۔میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس مشکل وقت میں ان کی مدد کروں گا۔درحقیقت بیگم بلقیس اور والی جی کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے میرے گرم جسم میں لامحدود توانائی ہر وقت موجود رہتی تھی۔اگلے روز بارش اور کڑاکے کی سردی تھی مگر میں تانگے، بس اور پھر تانگے کا طویل سفر کر کے وزیر آباد سے آگے مالن پور گاؤں میں پہنچا۔یہاں مجھے کون پہچان سکتا تھا؟ایک عام شخص کی حیثیت سے میں قریباً چھ گھنٹے مالن پور میں رہا۔میں وہاں ریاضی کے ایک ماسٹر جمیل صاحب سے ملا اور عمومی انداز میں ان سے بات چیت کرتے ہوئے کچھ معلومات حاصل کیں۔شاداں کی باتوں کی تصدیق ہوئی۔بھشتو نامی عورت کی دایہ بہن واقعی اس گاؤں میں

موجود تھی۔ یہ پتا چلا کہ وہ حمل ضائع کرنے کا کام بھی کرتی ہے اور پچھلے چند سالوں میں کچھ عورتیں یہ کام کرواتے ہوئے اس کے ہاتھوں جان سے بھی گئی ہیں۔ میں کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ایک اٹھارہ بیس سالہ لڑکے سے بھی ملا۔ یہ بہشتو کا چھوٹا بیٹا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھا کہ اس کی والدہ کی ایک سہیلی ڈسکے کے گاؤں شام پور میں بھی رہتی ہے؟ اس نے ہاں میں جواب دیا اور بتایا کہ کچھ دن پہلے ان کی بیٹی کی شادی تھی، ہمیں بلاوا آیا تھا پر ہم جا نہ سکے۔ وہ بس اتنا ہی بتا سکا۔ اسی روز رات کو آٹھ نو بجے کے قریب میں شام پور میں اماں دلشاد کے گھر میں تھا۔ اماں دلشاد اور ثمینہ مجھے دیکھ کر ڈر سی جاتی تھیں۔ ان کے ذہنوں میں شاید وہی تصویروں والا معاملہ آ جاتا تھا اور وہ سمجھتی تھیں کہ شاید میں اسی حوالے سے کوئی خبر لے کر آیا ہوں۔ اب بھی یہی ہوا۔ معصوم صورت ثمینہ کا رنگ سفید ہو گیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ماں بیٹی کو اس حوالے سے پوری تسلی دی اور کہا کہ وہ ہر اندیشہ ذہن سے نکال دیں۔

اماں دلشاد کی آنکھوں میں نمی آ گئی اور وہ مجھے دعائیں دینے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد میں اور اماں دلشاد علیحدہ کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

میں نے کہا۔ "اماں جی! آج میں آپ سے ایک بہت خاص بات کرنے آیا ہوں۔"

"پاشے کے بارے میں؟" ان کا ڈر پھر زندہ ہو گیا۔

"نہیں اماں! میں نے کہا ہے نا۔۔۔ اس کو بھول جائیں۔ اس کتے میں اب اتنی ہمت نہیں کہ آپ کی طرف منہ کرے۔ میں آج آپ سے والی جی کے بارے میں کچھ کہنے آیا ہوں۔"

والی جی کا نام سن کر اماں دلشاد کے چہرے پر نفرت اور سختی کی وہی لہر دوڑ گئی جو پہلے بھی نظر آیا کرتی تھی۔ "خاور پتر! میرے سامنے اس کا نام نہ لو۔ میں اس کے بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔"

"اماں جی! میں اکثر سوچتا ہوں، آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو والی جی اور حویلی سے آپ کا اتنا پرانا رشتہ ایک دم ختم ہو گیا ہے۔"

"پتر! میں نے کہا نا، مجھ سے اس بارے میں بات نہ کرو۔ بس جو ہو گیا وہ ہو گیا۔" اماں کے بوڑھے بدن میں ہلکی سی لرزش نمودار ہو گئی۔

میں نے بڑی محبت سے اماں کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔"اماں جی! بھول کس سے نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے نیک پاک لوگوں سے غلطیاں ہوتی ہیں۔پر جب ان کو سچی شرمندگی ہوئی ہے اور انہوں نے توبہ کی ہے تو انہیں معافی بھی ملی ہے۔اگر والی جی سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو۔۔۔۔"

وہ ایک دم بھڑک کر بولیں۔"خاور! میں نے تم سے کہا ہے نا، یہ بات مت چھیڑو۔اگر کوئی اور بات کرنی ہے تو کرو۔"

"لیکن اماں جی"!

میری بات سنے بغیر انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔میں نے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں پھر بٹھا دیا۔"اماں جی! آج آپ کو میری بات سننا پڑے گی۔ہم میں سے کوئی فرشتہ نہیں ہے۔ہم بندے بشر ہیں۔ہم غلطی کرتے ہیں۔میں بھی غلطی کرتا ہوں۔کبھی نہ کبھی آپ سے بھی ہوئی ہوگی۔اگر۔۔۔۔"

"کیا تم یہاں والی کی صفائیاں پیش کرنے کے لئے آئے ہو؟میں نے کسی کی صفائی نہیں سننی۔"وہ تڑخ کر بولیں۔

اس سے پہلے کہ وہ پھر اٹھ جاتیں، میں نے کہا۔"اگر آپ نے کسی کی صفائی نہیں سننی تو پھر اپنی صفائی بیان کر دیں۔"

میرے بدلے ہوئے لہجے نے انہیں چونکایا۔"کیا مطلب؟"وہ ہونٹ بھینچ کر بولیں۔

"آپ سے بھی تو ایک بڑی غلطی ہو چکی ہے۔"میں نے اطمینان سے کہا۔

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"وہ بدستور غصے سے کانپ رہی تھیں۔

"اماں دلشاد! میں یہ سب کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے کہنا پڑ رہا ہے۔آپ سے بھی تو ایک بڑی غلطی ہوئی ہے۔آپ نے ناجائز طور پر اپنی بیٹی کا حمل ضائع کرانا چاہا اور اس کوشش میں اس وچاری کی جان چلی گئی۔"

میرے آخری الفاظ نے اماں دلشاد پر جیسے آسمانی بجلی گرا دی۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی چلی گئیں۔ان کا جسم جو پہلے ہی لرز رہا تھا مزید لرزنے لگا۔وہ سکتے کی سی کیفیت میں تھیں۔میں نے کہا"ہاں اماں! میں سب کچھ جان چکا ہوں۔وہ کہتے ہیں نا کہ ڈھونڈنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے۔میں نے بھی کوشش کی ہے اور مالن پور تک پہنچا ہوں۔"

مالن پور کے نام نے اماں دلشاد کی حالت مزید پتلی کر دی۔اس کے سیاہی مائل ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔"تت۔۔۔۔۔تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ ہکلائیں۔

"اماں! میں اپنے طور پر سب کچھ معلوم کر چکا ہوں۔حویلی میں آسیہ کے ساتھ جو کچھ ہوا پھر آپ نے اپنی جلد بازی میں اس کے ساتھ جو کچھ کیا۔آپ کی سہیلی بشتو اور اس کی دایہ بہن اور دوسرے معاملے۔۔۔۔۔سب کچھ میرے علم میں آ چکا ہے۔"

اماں کی حالت غیر ہو رہی تھی۔میں نے اس کے پینے کے لئے پانی منگوایا۔ثمینہ کٹورے میں پانی لے کر تیزی سے اندر آئی۔اماں نے کانپتے ہاتھوں سے دو گھونٹ لیے۔مجھے ڈر محسوس ہوا کہ دونوں لڑکیاں واویلا کرنے لگیں گی اور اماں کی حالت مزید خراب ہو جائے گی۔میں نے دونوں بہنوں کو ہاتھ کے اشارے سے باہر بھیج دیا اور اماں کو سہارا دے کر چارپائی پر لٹا دیا۔ان کا رنگ لیموں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ایک پھٹا پرانا لحاف میں نے کمر تک ان کے اوپر کھینچ دیا۔وہ سکتہ زدہ سی پڑی رہیں۔پھر بتدریج ان کے چہرے کا رنگ واپس آنے لگا مگر آنکھوں میں شدید دکھ کی جو کیفیت تھی وہ برقرار رہی۔لالٹین کی مدھم روشنی میں، میں نے

دیکھا ان کی دھندلی آنکھوں کے باہری گوشوں سے آنسوؤں کا پانی بہہ کر رخساروں کی جھریوں میں گم ہونے لگا ہے۔وہ بڑی خاموشی سے روتی رہیں۔میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

کافی دیر بعد جب ان کے دل کا غبار قدرے کم ہوا تو انہوں نے کسی بچے کی طرح سسکیاں لیتے ہوئے اپنی دونوں ہتھلیاں میرے سامنے کر دیں اور بولیں۔"دیکھ پتر! میں نے وی 20 سال دن رات حویلی کی چاکری کی ہے۔میرے ہاتھوں پر محنت مشقت کی چنڈیاں پڑ گئی ہیں۔دیکھ ان چنڈیوں کے بدلے والی جی نے مجھے کیا دیا ہے۔میری چن ورگی دھی کو تڑفا تڑفا کر مار دیا۔۔۔۔میری گڈی، میری آسیہ۔۔۔۔میری سوہنی، پورے چار دن مچھی کی طرح تڑفتی رہی۔پھر تڑفتے تڑفتے مر گئی۔مجھے دس پتر! وہ کوئی عمر تھی مرنے کی؟ وہ کوئی عمر تھی اس طرح مرنے کی؟ اس نمانی کا قصور کیا تھا؟ اس کا قصور بس یہی تھا کہ وہ انکھیاں بند کر کے والی جی پر اعتبار کرتی تھی۔اس کی اتنی عزت کرتی تھی جتنی کوئی سوچ سکتا ہے۔بس یہی قصور تھا اس کا۔۔۔۔۔بس"

وہ نوحہ کرنے والے انداز میں روتی رہیں۔میں انہیں دلاسا دیتا رہا، ان کے کندھے دباتا رہا۔ان کی ہچکیاں کبھی آہستہ کبھی بلند ہوتی رہیں۔لگتا تھا کئی برسوں سے ان کے دل و دماغ میں

غم کا جو لاوا پک رہا تھا، وہ بہہ نکلا ہے۔ انہوں نے پاس ہی پڑے جستی ٹرنک میں سے دو تصویریں نکالیں۔ یہ آسیہ ہی کی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر اس کے بچپن کی تھی۔ وہ مشکل سے سات آٹھ سال کی ہو گی۔ وہ واقعی خوبصورت تھی، اور گڈی ہی لگتی تھی۔ یہ تصویر بلیک اینڈ وائٹ تھی۔ دوسری تصویر رنگین تھی اور کئی سال بعد کی تھی۔ اس میں آسیہ کے چہرے پر ذمہ داری اور متانت کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی پیاری تھیں۔ وہ اپنی چھوٹی بہن شاداں کو بڑی محبت سے اپنے ساتھ لگائے کھڑی تھی۔

اماں دلشاد بڑے حسرت ناک انداز میں ان تصویروں پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ ثمینہ اور اس کی بہن راشدہ نے دو تین بار دروازے کی درز سے اندر جھانکا۔ میں نے ہر بار انہیں ہاتھ کے اشارے سے باہر رہنے کے لئے کہا۔

اس رات اماں دلشاد کے ساتھ میری بڑی طویل گفتگو ہوئی۔ ان کی حالت ذرا سنبھلی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ کھڑکیوں سے باہر سرد رات سنسنا رہی تھی۔ آوارہ کتوں کی ٹولیاں کچی گلیوں میں دندناتی پھرتی تھیں۔ میرے سامنے پیالی میں چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے اماں کو یہ بتا کر حیران کیا کہ میں اب تک جو کچھ ان کے لئے کرتا رہا ہوں، وہ صرف اور

صرف والی جی کی ہدایت پر تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ والی جی ہی تھے جن کے حکم پر میں نے پاشے کی پرچول (چھان بین) کی اور ان تصویروں کا کھوج لگایا جنہوں نے شاداں اور ثمینہ کی زندگی میں زہر گھول رکھا تھا۔ میں نے اپنی ساری کوششوں کو والی جی کے کھاتے میں ڈالا اور اس طرح ان کے لئے اماں دلشاد کے دل میں ایک چھوٹا سا نرم گوشہ پیدا کرنے میں کامیاب رہا۔۔۔۔

میں نے کہا "اماں جی! ٹھیک ہے۔۔۔۔ کہ آپ کے لئے جو بھی کوششیں ہوئی ان میں میری بھاگ دوڑ شامل تھی لیکن ان۔۔۔۔ کوششوں کے پیچھے اصل ہاتھ والی جی ہی کا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان سے ایک بہت بڑا جرم ہوا ہے اس لئے ان کے اندر جو شرمندگی پیدا ہوئی ہے، وہ بھی چھوٹی نہیں ہے۔ کئی بار تو مجھے ایسا لگا کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لیں گے۔ وہ بہت روتے ہیں اماں جی، بہت تڑپتے ہیں۔ اگر وہ اسی حالت میں دنیا سے چلے گئے تو شاید ان کی روح بھی پچھتاوے کی آگ میں جلتی رہے۔ وہ بہت بیمار ہیں اور کمزور بھی ہو چکے ہیں۔ ان کے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

وہ کراہیں "میں اپنی آسیہ کو نہیں بھول سکتی خاور! اور جب تک میں اسے نہیں بھول سکتی والی جی کو بھی معاف نہیں کر سکتی۔"

"معاف کرنا بہت اونچی بات ہے اماں جی! دیکھیں۔ میں ایک مرتے ہوئے بندے کی طرف سے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ اسے معاف کر دیں۔"

میں نے باقاعدہ اماں دلشاد کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

انہوں نے جلدی سے میرے ہاتھ پکڑ لئے۔ "نہ میرے پتر! تو میرے سامنے ہتھ نہ جوڑ۔ تیرے تو بڑے احسان ہیں ہم غریبوں پر۔"

"یہ احسان بھی والی جی کی طرف سے ہوئے ہیں اماں جی! وہ کفارا ادا کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے، وہ آپ کے لئے بہت کچھ کرنے کی چاہ رکھتے ہیں۔ وہ آپ کی بیٹیوں کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی باقی دونوں بیٹیوں کو اچھے طریقے سے بیاہنا بھی چاہتے ہیں۔ وہ بہت کچھ سوچتے ہیں آپ کے بارے میں۔"

"لیکن خاور پُتر! یہ سب کچھ عزت اور جان کا بدلہ تو نہیں ہے۔ یہ حاکم لوگ کیوں کرتے ہیں ایسا؟ کیوں پھول جیسی بچیوں کی زندگیاں چھینتے ہیں۔ جب ان کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہوتے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہیں، یہ انہیں قبروں میں پہنچا دیتے ہیں۔ مجھے بتاؤ۔۔۔۔۔ یہ کوئی میری آسیہ کے مرنے کے دن تھے؟" وہ بار بار یہ فقرہ دُہرا رہی تھیں۔

"میں جانتا ہوں، آپ کا دُکھ بہت بڑا ہے۔ لیکن آپ ماں ہیں اور ماں کا دل بھی بہت بڑا ہوتا ہے۔ میں ایک بار پھر آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" میں نے دوبارہ ہاتھ جوڑ دیے۔ اماں دلشاد نے میرے ہاتھ پکڑے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

میں رات کے آخری پہر تک اماں دلشاد کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھا رہا اور آخر انہیں منا کر ہی اٹھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پروگرام یہ بنا تھا کہ دو تین روز میں، اماں دلشاد شام کے بعد میرے ساتھ حویلی جائیں گی اور والی جی سے ملیں گی۔

اماں دلشاد سے یہ وعدہ حاصل کر لینا میرے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔ میں راجوال واپس پہنچا تو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت حویلی کے اندر سے بیگم بلقیس کی کال آئی اور انہوں نے منشی منظور کے ذریعے مجھے بتایا کہ والی جی مجھے یاد کر رہے ہیں۔

میں والی جی کے پاس پہنچا۔ وہ سفید کپڑے پہنے حویلی کے ایک الگ تھلگ کمرے میں پلنگ پر لیٹے تھے۔ یہاں بالکل سکون تھا اور حویلی کی دیگر آوازیں نہیں پہنچتی تھیں۔ وہ تیزی سے کمزور ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ یہ اس شخص کا زوال تھا جو کسی وقت علاقے کا سب سے بااختیار اور طاقتور شخص سمجھا جاتا تھا۔

میں نے ان کی ابھری ہوئی رگوں والے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "والی جی! آپ اس کمرے میں کیوں آ گئے؟"

ان کے سیاہی مائل ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔ "خاورے! کہتے ہیں جب ہاتھی کا آخری وقت قریب آتا ہے، اسے پتا چل جاتا

ہے۔۔۔۔۔ وہ باقیوں سے علیحٰدہ ہو کر خود ہی کسی الگ تھلگ جگہ پر جا بیٹھتا ہے۔ آخر اسی جگہ پر اس کی موت بھی ہوتی ہے۔"

"آپ ایسی باتیں نا کریں والی جی۔ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولے۔ "اور شاید یہ بات صرف ہاتھی کے لیے ہی نہیں ہے۔ بہت سے جانوروں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ تمہیں ہیرا تو یاد ہے نا؟ اسے بھی تو پتا چل گیا تھا۔" وہ اپنے لاڈلے کتے کا ذکر کر رہے تھے۔

انہیں کھانسی ہونے لگی۔ تاجو جلدی سے آگے بڑھی۔ ہم دونوں نے انہیں سہارا دے کر گاؤ تکیے کے سہارے بٹھایا۔ انہوں نے ملٹھی کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لیا۔ کھانسی ذرا ٹھیک ہوئی تو بولے۔ "یار! اتنا عرصہ گزر گیا۔ تیرے سنیاسی سے کبھی ملاقات نہ ہوئی۔"

"میں خود بھی بڑا شرمندہ ہوں جی۔ چلیں، اس بار گاؤں گیا تو پوری کوشش کروں گا اسے یہاں لانے کی۔"

وہ ہولے سے بولے۔ "چلو چھوڑو اب۔ کہاں خجل خراب ہوتے پھرو گے اس آوارہ گرد کے پیچھے۔ یہاں تمہاری ضرورت زیادہ ہے۔"

تاجو باہر جاچکی تھی۔ میں نے ان کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"والی جی! میں آپ کے لیے ایک بڑی اچھی خبر لایا ہوں۔"

"اچھی خبر اور میرے لیے؟" انہوں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں والی جی۔ میں اماں دلشاد سے ملا ہوں۔ ہمارے درمیان بڑی دیر تک بہت ساری باتیں ہوئی ہیں۔ یہ بڑا مشکل کام تھا والی جی۔۔۔۔۔ لیکن میں کسی نہ کسی طرح آپ کے بارے میں اماں کا دل صاف کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔"

"کک۔۔۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو خاور؟" وہ نقاہت کے باوجود سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ "تم۔۔۔۔۔ دلشاد سے ملے ہو؟"

"ہاں جی والی جی! میں آپ کا دکھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر بہت کچھ کیا ہے۔ اس کے لیے میں پیشگی معافی چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ "والی جی! اماں دلشاد ایک پتھر بنی ہوئی تھی اور میں کسی طرح بھی اسے نرم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر آپ کے اور اس کے حالات کی ٹوہ لگائی ہے۔ اور مجھے اس واقعے کے بارے میں پتا چل گیا ہے والی جی۔۔۔۔۔ جو اماں دلشاد اور آپ میں دوری کی وجہ بنا۔۔۔۔۔ میں اماں کی بیٹی آسیہ کے بارے میں جان گیا ہوں۔"

والی جی نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بالکل خاموش ہو گئے۔ ان کے چہرے پر دو تین طرح کے رنگ آ کر گزر گئے۔ شدید حیرت۔۔۔۔۔ غصہ۔۔۔۔۔ سوچ اور پھر دکھ۔۔۔۔۔ میں نے شاداں کا ذکر کیے بغیر باقی ساری باتیں والی جی کو بتادیں۔ وہ بہت جذباتی کیفیت میں سنتے رہے۔ درمیان میں انہوں نے ایک دو سوال بھی کیے۔ میں روداد کے آخر میں پہنچا تو ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ میں نے کہا۔ "والی جی! کل رات دو بجے تک میں اماں کے پاس تھا اور اس سے بات کر رہا تھا۔ وہ مان گئی ہے والی جی۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ کل وہ میرے ساتھ حویلی آئے اور آپ کی بیمار پُرسی کرے۔۔۔۔۔"

میں نے دیکھا کہ بوڑھے والی جی کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو گرے اور ان کی گھنی کھچڑی موچھوں میں گم ہو گئے۔ انہوں نے جذباتی انداز میں میرا کندھا تھپتھپایا۔ کچھ کہنا بھی چاہتے

تھے مگر کہہ نا سکے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر انہوں نے خود کو سنبھالا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔ "خاور! ان باتوں کا بلقیس کو پتا نہیں۔۔۔۔ بلکہ دلشاد اور اس کی بیٹیوں کے سوا کسی کو بھی پتا نہیں۔"

"آپ کیوں فکر کرتے ہیں والی جی؟" میں نے محبت سے کہا اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "آپ کی بات اس سینے سے باہر نہیں نکل سکتی۔ کوئی میرے ٹوٹے بھی کر دے تو نہیں نکل سکتی۔"

ان کی بوڑھی آنکھوں سے پھر دو آنسو لڑھک گئے۔ انہوں نے پھول دار گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "تم نے جو کیا ٹھیک کیا۔ مجھے تمہاری کسی بات پر اعتراض نہیں لیکن ایک بات۔۔۔۔ مناسب نہیں۔"

"کون سی بات؟"

"دلشاد اس حویلی میں نہیں آئے گی۔ میں خود چل کر اس کے پاس جاؤں گا۔ غلطیاں مجھ سے ہوئی ہیں۔ گناہ گار میں ہوں۔ میرا جانا ہی بنتا ہے۔" ان کا لہجہ بے حد جذباتی تھا۔

"لیکن۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔ اس حالت میں؟ میرا مطلب ہے آپ بہت کمزوری محسوس کر رہے ہیں۔"

"کچھ بھی ہے خاور! میں خود جاؤں گا۔ اپنے پاؤں پر چل کر۔" انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ خاموش آنسو ان کے زرد رخساروں پر لڑھکنے لگے۔

اور اگلے روز رات دس بجے کے لگ بھگ میں اور والی جی ایک تانگے پر سوار شام پور گاؤں پہنچے۔ تانگا میں خود چلا رہا تھا۔ سردی اور دُھند نے ماحول کو جکڑا ہوا تھا۔ والی جی ایک گرم سے تہ بند کُرتے میں تھے۔ ایک ڈبی دار کھیس نے ان کے سارے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اپنی تکلیف اور کمزوری کے سبب وہ راستے بھر "ہائے ہائے" کرتے رہے تھے۔ پہلے میں خود تانگے سے اتر کر اماں دلشاد کے پاس پہنچا اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ پھر میں باہر آ کر والی جی کو سہارا دیتے ہوئے اندر لے گیا۔ اماں دلشاد کمرے میں تھی۔ میں نے والی جی کو اندر بھیج دیا اور دروازہ بھیڑ دیا۔

ثمینہ اور اس کی بہن ساتھ والے کمرے میں دیے کی روشنی میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھیں۔ میں ان کے پاس جا بیٹھا۔ اندر سے باتیں کرنے اور اماں دلشاد کے رونے کی مدھم آوازیں آتی رہیں۔ بہر حال الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ پھر رونے کی آواز بلند ہو

گئی۔۔۔۔۔دس پندرہ منٹ بعد دروازہ کھلا اور اماں دلشاد نے اشک بار آواز میں پکارا۔"ثمینہ۔۔۔۔۔راشدہ۔۔۔۔۔اندر آؤ۔"

میں نے ان دونوں کو اشارہ کیا۔وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔اندر سے رونے اور بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ کبھی کبھی ان میں والی جی کی بھرائی ہوئی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔آخر یہ طوفان گزر گیا۔بادل چھٹ گئے۔ مطلع نکھر گیا۔اماں دلشاد اس ڈھارے کی طرف چلی گئی جہاں چولہا تھا۔راشدہ نے آکر کہا۔"سالار جی! والی جی بلا رہے ہیں۔"میں کمرے میں پہنچا۔وہ چارپائی پر جھکے ہوئے بیٹھے تھے۔ ثمینہ ہولے ہولے ان کے کندھے دبا رہی تھی۔وہ نحیف آواز میں بولے۔"خاور! کل دوپہر کو تم نے پھر یہاں آنا ہے۔ چھوٹی ٹرالی بھی ساتھ لے آنا۔اس وقت دلشاد نے تیاری کرلی ہو گی۔ان لوگوں کو حویلی لے جانا۔"

"جو آپ کا حکم!"میں نے کہا۔

اتنے میں اماں دلشاد، شکر ملا ہوا دودھ لے کر آگئی۔والی جی نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھام لیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

۔۔۔۔۔رات کے ایک بجے کے قریب میں اور والی جی شام پور سے واپس روانہ ہوئے۔ہم خاموشی سے آئے تھے۔واپسی بھی خاموشی سے ہوئی۔جب ہم میاں جی کے قبرستان کے پاس سے گزر رہے تھے، والی جی نے کہا۔"ذرا تانگا روکو خاور!"

"کیوں والی جی؟"

"بس دو منٹ کے لیے۔میں ذرا قبرستان جانا چاہتا ہوں۔"

میں ان کی بات سمجھ گیا۔لیکن سردی زیادہ تھی اور گہرا اندھیرا ابھی تھا۔میں نے انہیں اس ارادے سے باز رکھنا چاہا۔وہ نہیں مانے۔آسیہ کی قبر کنارے کے پاس تھی۔میں انہیں سہارا دے کر وہاں تک لے گیا۔تاریکی اور دھند میں لپٹی ہوئی مٹی کی سخت ڈھیری جس میں وہ لڑکی سو رہی تھی جسے گڈی کہا جاتا تھا۔والی جی وہاں بیٹھ گئے اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے جانے کو کہا۔میں نے ٹارچ ان کے پاس رکھی اور واپس تانگے کی طرف چلا گیا۔ٹھنڈ ہڈیوں میں گھس رہی تھی۔مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ والی جی کی طبیعت مزید خراب ہو جائے گی۔وہ قریباً دس منٹ وہاں رکے۔میں ان کے مدھم ہیولے کو گھورتا رہا۔تب ٹارچ کے اشارے سے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔میں انہیں سہارا دے کر پھر تانگے میں لے آیا۔

اگلا دن حویلی کے لیے ایک پُر مسرت دن تھا۔ کئی برس حویلی سے دور رہنے والی اماں دلشاد حویلی میں واپس آگئی تھی۔ اس کی دونوں بیٹیاں بھی ساتھ تھیں۔ والی جی نے اماں دلشاد سے فرمائش کر کے میٹھے چاول پکوائے، خود کھائے اور دوسروں کو بھی کھلائے۔ وہ جیسے ایک دم پھر سے جی اٹھے تھے۔ ان کی بے جان آنکھوں میں اب ہلکی ہلکی روشنی نظر آتی تھی۔ اگلی رات انٹر کام پر بیگم بلقیس سے بات ہوئی۔ ان کا دکھ بھی آج ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ "یہ تم نے کیا جادو کیا خاور؟"

"تو میں جادوگر ہوں؟"

"چلو ہر فن مولا سہی۔ لیکن یہ سب ہوا کیسے؟ مجھے امید نہیں تھی کہ۔۔۔۔ اماں دلشاد اپنی ہٹ چھوڑے گی۔"

"وہ کہتے ہیں نا جی کہ سچے دل سے کوشش کی جائے تو پہاڑ بھی رستہ دیتے ہیں۔ مجھے یقین تھا بلقیس کہ والی جی کی پریشانیوں میں سے ایک بڑی پریشانی اماں دلشاد بھی ہے۔۔۔۔ آپ نے دیکھا ہی ہو گا، وہ کل سے خود کو کتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہے ہیں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ تکلیف اپنی جگہ ہے۔ پھر بھی وہ بولتے چالتے ہیں۔ تھوڑا بہت کھانا بھی کھا رہے ہیں۔ اگر کسی طرح یہ ایک دفعہ ہسپتال چلے جائیں تو بڑا اچھا ہو۔ سارے ٹیسٹ وغیرہ ہو جائیں۔۔۔۔ کیا تم انہیں لے جا نہیں سکتے ہو؟"

"آپ کو پتا ہی ہے، ڈاکٹروں اور ڈاکٹری دواؤں کا سن کر ان کا پارہ کتنا اوپر چلا جاتا ہے۔"

"پر وہ تمہارے ہاتھوں سے تو سب کچھ کھا رہے ہیں۔ ڈاکٹری دوائیاں بھی کھا لیتے ہیں۔"

"وہ تو بے خبری میں کھاتے ہیں۔"

بیگم بلقیس کچھ دیر خاموش رہیں پھر بولیں۔ "والی جی بہت گہرے ہیں خاور! مجھے نہیں لگتا کہ ڈاکٹری دواؤں کے بارے میں وہ بے خبر ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر کہا۔

"پانچ چھ دن پہلے پتا ہے مجھ سے کیا کہہ رہے تھے؟"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں نے تمہارے سنیاسی کی بات کی تو کہنے لگے۔۔۔۔۔سنیاسی وغیرہ کوئی نہیں ہے۔یہ خاور بڑا نخچرا ہے۔خود ہی سنیاسی ہے اور خود ہی ڈاکٹر۔بس میرا دل رکھنے کے لیے سنیاسی کی بات کرتا ہے۔"

"واقعی!"میں دنگ رہ گیا۔

"ہاں اور ایک دن تمہاری وہ کھٹی ڈکاروں والی دوا، حکیم بشارت نے دیکھ لی۔کہنے لگا یہ تو کوئی انگریزی دوا لگتی ہے۔وہ بولے۔انگریزی ہے یا دیسی پر آرام تو دے رہی ہے۔تیری پُڑیوں جیسی تو نہیں ہے۔"

"یہ تو بڑی عجیب بات بتائی ہے آپ نے۔لیکن اگر وہ واقعی جان چکے ہیں تو پھر چھپاتے کیوں ہیں؟"

"وہ ساری زندگی انگریزی دواؤں کے خلاف رہے ہیں،شاید اس لیے۔میں نے بتایا ہے نا کہ ان کے دل کی بات جاننا کافی مشکل ہوتا ہے۔اور میں سمجھتی ہوں،ان میں برداشت بھی بہت ہے۔کئی بار وہ جانتے بوجھتے بے خبر بن جاتے ہیں۔کسی کو احساس تک نہیں ہونے دیتے۔"

"ہم دونوں کے بارے میں بھی وہ جان بوجھ کر بے خبر بنے ہوئے ہیں؟"

"شاید۔"

"مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔۔۔۔۔ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔سب کچھ۔۔۔۔۔"

"شاید۔"بیگم بلقیس نے پھر کہا۔

عجیب الجھن تھی۔عجیب حالات تھے۔یہ تیسرے چوتھے دن کی بات ہے۔رات کے وقت اچانک والی جی کا آخری وقت آ گیا۔انٹر کام پر بیگم بلقیس کی آواز بہت کرب ناک تھی۔انہوں نے کہا کہ والی جی کی طبیعت بہت خراب ہے۔میں حتی الامکان تیزی سے حویلی پہنچا۔والی جی کے کمرے میں والی جی کی بہن، بیگم بلقیس،اماں دلشاد،تاجو،حامد سب موجود تھے۔چودھری عزیز شہر گئے ہوئے تھے۔والی جی کا رنگ زرد تھا اور کھینچ کھینچ کر سانس لے رہے تھے۔میں پہنچا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے باقیوں کو باہر نکل جانے کو کہا۔وہ سب چلے گئے۔میں ان کے قریب بیٹھ گیا اور ان کا ہاتھ تھام کر آہستہ آہستہ اپنا دوسرا ہاتھ ان کے سینے پر پھیرنے لگا۔انہوں نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور بہت مدھم آواز میں بولے۔"خاور!تُو نے کہیں جانا نہیں ہے۔بلقیس اور حامد کو تیری بہت ضرورت

ہے۔ان کا خیال رکھنا ہے۔اور خاص طور سے بلقیس کا۔۔۔۔وہ تجھ پر بڑا بھروسا کرتی ہے۔"

"آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔"میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ یک ٹک میری طرف دیکھتے رہے پھر انہوں نے ہونٹوں کو جنبش دی اور عجیب بات کہی۔"وہ بولے۔"میں تمہیں بلقیس کے بارے میں ایک اور مشورہ بھی دے سکتا تھا۔پر۔۔۔۔ مجھے پتا ہے، یہ لوگ تمہیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔بڑا فساد ہو گا۔بڑی خرابی پھیلے گی۔"انہیں کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور ان کا رنگ نیلگوں ہو گیا۔

بیگم بلقیس، فیروزاں اور اماں دلشاد بھاگی ہوئی اندر آئیں۔والی جی کو آبِ زم زم پلانے کی کوشش کی گئی مگر وہ ایک گھونٹ سے زیادہ نہ پی سکے۔کھانسی ذرا تھمی تو میں نے ان کا سر پھر تکیے پر رکھ دیا۔ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔بہت مشکل سے سانس لے رہے تھے۔اندازہ ہو رہا تھا کہ پھر دل کا دورہ پڑا ہے۔بیگم بلقیس نے کراہ کر کہا۔"خاور! گاڑی نکلواؤ۔ان کو ہسپتال لے جاتے ہیں۔"والی جی نے شہادت کی انگلی اٹھا کر نفی میں ہلائی اور بیگم بلقیس کا ہاتھ تھام لیا۔تین چار منٹ کے اندر اندر سب کچھ ختم ہو گیا۔آخری ہچکی والی جی

کے سینے سے جدا ہو گئی۔بیگم بلقیس ان کے اوپر گر گئیں اور دھاڑیں مارنے لگیں۔حویلی میں کہرام مچ گیا۔ہر طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"والی جی چلے گئے۔"یہ آواز راجوال کی حویلی سے نکلی اور علاقے میں پھیلتی چلی گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

والی جی کی آخری رسومات ادا ہوئیں۔دور و نزدیک سے ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔چوتھے دن حویلی کے مردانے میں ایک بڑا اکٹھ ہوا۔حویلی سے باہر گھوڑوں، تانگوں وغیرہ کی قطاریں لگ گئیں۔والی جی کے عزیز، رشتے دار اور حمایتی زمیندار جمع ہوئے۔مختلف معاملات پر تفصیلی بات ہوئی۔اس روز شام کے بعد رونق علی نے اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے مجھ سے کہا۔"لگتا ہے کہ اب حویلی میں کافی اٹھا پٹخ ہونی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"چودھری عزیز نے کوشش کرنی ہے کہ والی جی کے بعد جاگیر کے سارے معاملے شاملے اس کے ہاتھ میں آجائیں۔۔۔۔اور وہ اپنی مرضی کے لوگوں کو آگے لانا چاہے گا۔ جن سے اس کی نہیں بنتی، انہیں کھڈے لائن لگائے گا یا ان کی چھٹی کرے گا۔"

"کیا بیگم بلقیس کی اب کوئی حیثیت نہیں ہے؟"

"ہے۔۔۔۔ بالکل ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو زمینوں کی زیادہ ملکیت کے حساب سے جاگیر کے معاملے شاملے بلقیس کے ہاتھ میں ہی ہونے چاہئیں۔ پر اب بھائیا عزیز اپنی منوانے کی کوشش کرے گا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ بہت دیر سے اس ویلے کا انتظار کر رہا تھا۔ والی جی کا بڑا پتر تو الگ تھلگ رہتا ہے۔ حامد ابھی چھوٹا ہے۔ بھائیے عزیز کے لیے اپنا الو سیدھا کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ وہ سب سے یہی کہے گا کہ بزرگ وارث کے طور پر جاگیر کی کرسی پر اسے بیٹھنا چاہئیے۔"

مجھے رونق کی باتوں پر زیادہ یقین نہیں تھا لیکن اگلے روز صبح میں جب اٹھ کر حویلی کے بڑے گیٹ کی طرف گیا تو مجھے وہاں نئے پہریداروں کے چہرے نظر آئے۔ میں نے ایک بندے سے پوچھا۔ "ملتانی وغیرہ کہاں ہیں؟"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"پتا نہیں جی۔" مختصر جواب ملا۔

"تمہیں یہاں کس نے کھڑا کیا ہے؟"

"چودھری عزیز صیب کا حکم ہے۔"

اسی دوران چھوٹے اصطبل کی طرف سے شور سنائی دیا۔ اصطبل کے ساتھ ہی وہ بڑا کمرا تھا جس میں رائفلیں، برچھیاں اور لاٹھیاں وغیرہ پڑی رہتی تھیں۔ یہاں لکڑی کے دو بڑے بکسوں میں رائفلوں کا ایمونیشن بھی ہوتا تھا۔ شور اسی اسٹور کے سامنے سے بلند ہو رہا تھا۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھا۔ چودھری عزیز کا ایک ذاتی محافظ مولا میرے چچازاد بھائی باگو کو دھکے دے رہا تھا۔ جواب میں باگو بھی ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے قریب پہنچ کر غصے سے کہا۔

باگو دہاڑا۔ "یہ حرامی گالی دے رہا ہے۔ کہتا ہے اندر نہیں جانے دوں گا۔ اندر میری رائفل پڑی ہے۔"

"اوئے اوئے۔" محافظ گرجا اور اس نے باگو کا گریبان پکڑنا چاہا۔ میں نے راستے میں اس کا ہاتھ تھاما اور جھٹکے سے پیچھے ہٹا دیا۔

"مولے! یہ کیا طریقہ ہے۔ کیوں اندر جانے نہیں دے رہا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اندر نہیں جاسکتا۔ نہ کوئی اور جاسکتا ہے۔ یہ چودھری صاحب کا آرڈر ہے۔"

"پر یہ طویلہ اور اسلحہ خانہ ہے۔ یہاں میرا آرڈر چلتا ہے۔ میں سالار ہوں۔"

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور دھماکا خیز انداز میں بولا۔ "آپ سالار نہیں ہیں۔"

میں چند لمحے ششدر رہا پھر سنبھل کر کہا۔ "تو کون ہے سالار؟"

"سالار نصر اللہ صاحب ہیں۔"

میں نے دائیں طرف دیکھا۔ اصطبل کے دروازے پر نصر اللہ کھڑا تھا۔ سرخ پگڑی اس کے سر پر نظر آرہی تھی۔ دو مسلح محافظ اس کے عقب میں موجود تھے۔ یہ سنہری ڈورے والی پگڑی سالار کی نشانی تھی۔ نصر اللہ نے مجھے دیکھ کر نگاہیں جھکا لیں۔

نصر اللہ ایک اچھا ساتھی تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے اس کام کے لیے مجبور کر دیا گیا ہے۔ نصر اللہ سے کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ میں نے اپنے پریشان ساتھیوں کو وہیں چھوڑا اور لمبے ڈگ بھرتا مردانے کی طرف گیا۔ وسیع صحن میں سے گزر کر میں مردانے کے اندر پہنچا۔ یہاں چودھری عزیز نشست گاہ میں موجود تھا اور سر پر کپڑے کی گول ٹوپی رکھے گھٹلیاں پڑھ رہا تھا۔ میں نے اس کے سامنے پہنچتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب! آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے پتا ہے تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ "تم اپنی جگہ نصر اللہ کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہو۔ یہ فیصلہ کل ہوا تھا اور یہ اکیلے میرے کا فیصلہ نہیں۔ اس میں سب شریک تھے۔"

"یہ کیسا فیصلہ ہے جس کی خبر مجھے ایک چھوٹے ملازم سے ہو رہی ہے۔"

"ہم تمہیں رات کو ہی بتانا چاہتے تھے لیکن پھر کچھ لوگ آگئے۔ بہر حال، منشی منظور نے تمہارا حساب کتاب کر چھوڑا ہے۔ تمہاری تنخواہ کے جو پیسے نکلتے ہیں، وہ تم اس سے لے سکتے ہو۔"

میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ چودھری عزیز توہین کر رہا تھا۔ "تو آپ کا مطلب ہے میں خود کو فارغ سمجھوں؟"

"ہاں۔ اور تمہارے دس پندرہ ساتھیوں کو بھی فارغ کیا گیا ہے۔ ان کو بھی بتا دو۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔ کیونکہ میرے لیے والی جی کا یہ حکم ہے۔"

"اس طرح کا جھوٹ بول کر تم والی جی کی روح کو تکلیف پہنچاؤ گے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کیا چاہتے تھے اور کیا نہیں۔ جو بندہ دنیا میں نہیں، اس کے ساتھ کوئی شخص کوئی بھی بات جوڑ سکتا ہے۔"

"آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں چودھری صاحب۔"

"تم اپنے لیے ایسا موقع کیوں پیدا کر رہے ہو۔ جب تم سے کہہ دیا ہے کہ چلے جاؤ تو پھر چلے جاؤ۔ ہم تم سے کوئی بازپرس نہیں کر رہے۔ تم بھی ہم سے سوال جواب نہ کرو۔"

"مجھے کسی بازپرس کا ڈر نہیں۔ اور میں اس طرح یہاں سے جاؤں گا بھی نہیں۔ میں کسی ذمے دار سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھ سے زیادہ ذمے دار اس وقت تمہیں یہاں اور کوئی نہیں ملے گا۔" چودھری عزیز کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"میں بیگم جی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

چودھری نے شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھا۔ ایک لحظے کے لیے مجھے لگا کہ وہ مجھ پر جھپٹ پڑے گا۔ پھر اس نے گرج کر آواز دی۔ "صادق۔۔۔۔ شیدے۔۔۔۔ ارباز خان۔"

تین چار محافظ میری طرف بڑھے۔ چودھری میری جانب اشارہ کرتے ہوئے پھنکارا۔ "اس کو باہر لے جاؤ۔"

محافظوں نے سخت نظروں سے میری طرف دیکھا۔ انداز ایسے ہی تھا جیسے کہہ رہے ہوں۔۔۔۔ تمھارا پتا کٹ چکا۔۔۔۔ بہتر ہے کہ شرافت سے باہر چلے جاؤ۔"

اسی دوران میں پانچ چھ مزید بندے اندر داخل ہو گئے۔ان کے پاس بھی رائفلیں تھیں۔یہ حویلی کے وہ کارندے تھے جن کی بھرتی میں نے کرائی تھی۔مجھے مشکل میں دیکھ کر وہ سینہ تان کر آگے آ گئے تھے۔چند سیکنڈ میں ہی صورتِ حال خطرناک ہو گئی تھی۔اسی دوران میں چودھری عزیز کے عقب میں ایک دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔یہ دروازہ زنان خانے کی طرف کھلتا تھا۔چودھری نے دروازہ تھوڑا سا کھولا۔مجھے بیگم بلقیس کی ایک مختصر جھلک دکھائی دی۔بیگم بلقیس نے چودھری سے کچھ کہا۔چودھری نے تمام محافظوں کو باہر جانے کی ہدایت کی۔وہ سب چلے گئے تو چودھری مجھ سے مخاطب ہو کر پھنکارا۔"لو۔۔۔۔کر لو بات۔۔۔۔بیگم جی سے۔۔۔۔"

بیگم بلقیس نے دروازے کی اوٹ سے کہا۔"خاور! اکٹھ میں یہی فیصلہ ہوا ہے۔تمہاری جگہ نصراللہ کو سالار بنایا گیا ہے۔تم۔۔۔۔منشی منظور سے۔۔۔۔اپنا حساب کتاب لے سکتے ہو۔"

"یہ اکٹھ کا فیصلہ نہیں ہے بیگم جی۔میں اچھی طرح جانتا ہوں، یہ فیصلہ کیسے ہوا اور کس نے کرایا۔میں نے اس حویلی کے لیے خون پسینا بہایا ہے۔اپنا دن رات ایک کیا ہے۔مجھے کوئی ایک بندہ اپنے مطلب کی خاطر دھکے دے کر نہیں نکال سکتا۔"

"تمہیں بتایا ہے نا۔۔۔۔یہ اکٹھ۔۔۔۔کا فیصلہ ہے۔"بیگم بلقیس نے دروازے کی اوٹ سے کہا۔"تمہیں فارغ کر دیا گیا ہے۔اب تم ضد کرو گے تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"آپ اپنی زبان نہیں بول رہی ہیں بیگم جی۔میں کاکا نہیں ہوں۔"

"خاور! ہوش سے بات کرو۔تمہارے اور ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور دوبارہ ادھر کا رخ مت کرو۔"بیگم بلقیس کی بھرائی ہوئی آواز میں سختی کا عنصر بڑھ گیا تھا۔

میں نے ان کی شکل نہیں دیکھی، مگر ان کی آواز اور ان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس فیصلے تک پہنچنے سے پہلے وہ دکھ اور کرب کے گہرے پانیوں سے گزری ہیں۔شاید حویلی کے اندر بیگم بلقیس کو چودھری عزیز اور اس کے ہم نواؤں کی طرف سے سخت ترین دباؤ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔پھر میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔"ٹھیک ہے بیگم جی! اگر آپ بھی یہی کہتی ہیں تو چلا جاتا ہوں۔لیکن۔۔۔۔"

"لیکن کچھ نہیں۔ ہم نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔" بیگم بلقیس نے حتمی لہجے میں کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

میرے سینے میں جیسے ایک گھاؤ سا لگ گیا۔ بیگم بلقیس نے جو کچھ کہا تھا، بہ امر مجبوری ہی کہا تھا۔ مگر جس نے کبھی ایسا نہ کہا ہو، وہ پھول بھی مارے تو پتھر کی طرح لگتا ہے۔

میں چودھری عزیز پر ایک طائرانہ نظر ڈالتا ہوا واپس ہو لیا اور اپنے کوارٹر نما کمرے میں پہنچ گیا۔ کئی گھنٹے تک میں اس کمرے میں بند رہا۔ میرے ذہن میں ایک آندھی سی چل رہی تھی۔ والی جی کے ساتھ ہونے والی آخری گفتگو بار بار ذہن میں گھوم رہی تھی۔ اس گفتگو میں دو فقرے اہم ترین تھے۔ پہلا فقرہ یہ تھا۔ "میں تم کو بیگم بلقیس کے بارے میں ایک اور مشورہ دے سکتا تھا لیکن مجھے پتا ہے کہ یہ لوگ تمہیں ایسا کرنے نہیں دیں گے۔۔۔۔۔ یہاں بڑا فساد ہو گا۔"

دوسرا فقرہ یوں تھا۔ "خاور! تُو نے کہیں جانا نہیں ہے۔ بلقیس اور حامد کو تیری بہت ضرورت ہے۔ بہت زیادہ ضرورت ہے۔"

پہلا فقرہ واضح نہیں تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے یقین تھا کہ میں اس کا مطلب جانتا ہوں۔ والی جی مجھے بلقیس کے بارے میں جو مشورہ دینا چاہتے تھے، وہ انوکھا اور حیران کن تھا۔ والی جی جیسا بندہ ہی ایسا مشورہ دے سکتا تھا۔ یہ یقیناً، مجھے بیگم بلقیس کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا مشورہ تھا۔ لیکن یہ مشورہ انہوں نے نہیں دیا تھا۔ بس اس کا اظہار کیا تھا۔ دوسری بات یہاں سے نہ جانے کی تھی۔ اور اس وقت "جانے یا نہ جانے" کا سوال ہی میرے لیے اہم ترین بنا ہوا تھا۔ مجھے اپنے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں تھی لیکن میں یہ بات بھی بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے جانے سے جاگیر کا بہت نقصان ہو گا۔ جاگیر کے ارد گرد کے حالات کو میں بڑی اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ کسی اور کو یہ سب کچھ سمجھنے میں بڑی دیر لگنا تھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی، رونق علی تیز قدموں سے اندر آیا۔ اس کی توند ہچکولے کھا رہی تھی۔ "تمہیں پتا ہے ابھی کیا ہوا ہے نور دین کے کھوہ پر؟"

"کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ جاگیر کے سالار کی لال پگ تمہارے سر پر ہی رہنی چاہیئے۔ کئی لوگوں نے تمہارے حق میں نعرے شعرے بھی لگائے ہیں۔ سنا ہے کہ شام پور، نکووال اور آلے دوالے کے پنڈوں میں بھی یہی بات ہو رہی ہے۔"

اتنے میں تیمور اور ملتانی بھی اندر آ گئے۔ ان کے چہروں پر ہلکا سا جوش تھا۔ تیمور نے کہا۔ "لگتا ہے کہ عام لوگ چودھری عزیز صاحب کی سرداری قبول نہیں کر رہے۔ ان میں سے زیادہ تر یہ چاہتے ہیں کہ بیگم جی کو والی جی کی کرسی پر بیٹھنا چاہیئے تھا۔ کل اکٹھ میں بھی دونوں طرف کے حمایتی موجود تھے۔ بس چودھری عزیز نے اپنی چالاکی سے اپنا پلڑا تھوڑا سا بھاری کر لیا۔"

ملتانی نے کہا۔ "وہاں باغ والے ڈیرے پر ڈانگ سوٹا بھی ہوا ہے۔ کچھ کارندے چودھری عزیز اور کچھ بیگم جی کے حامی تھے۔"

رونق علی نے اپنی توند کھجاتے ہوئے موڑھے کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ "ویسے یہ ساری گیم پلٹا تو کھا سکتی ہے خاور! اگر اس موقعے پر تم اپنی حمایت بیگم بلقیس کے لیے ظاہر کر

دو تو بیگم بلقیس کا پلڑا بہت بھاری ہو جائے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ کچھ بھی ہو، لوگ تمہیں جاگیر کا سالار دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم نے ان کو حوصلہ شوصلہ دیا ہے۔ جوش جاش پیدا کیا ہے۔ وہ دل سے عزت کرتے ہیں تمہاری۔"

"پر کچھ ایسے بھی تو ہیں جو میری عزت نہیں کرتے۔ وہ مجھے بہت سے فسادوں کی جڑ سمجھتے ہیں۔ اگر میں کھڑا ہو جاؤں گا تو پھر خون خرابا شروع ہو جانا ہے۔ ہم آپس میں لڑیں گے اور ہماری یہ لڑائی موکھلوں اور لمبڑوں کے لیے موج میلے والی بات ہو گی۔ کوئی پتا نہیں وہ بھی اپنے بدلے چکانے کے لیے میدان میں نکل آئیں۔"

رونق کے چہرے پر ایک دم سوچ کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ وہ کچھ دیر بعد ایک لمبی آہ بھر کر بولا۔ "تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔ ہر ایک چیز مجھے صاف نظر آ رہی ہے۔ چودھری عزیز نے اب ہر طرح اپنی من مانی کرنی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد بلقیس اور حامد کو ویسے ہی حویلی سے نکلنا پڑ جائے۔"

"خیر، یہ سب کچھ اتنا آسان بھی نہیں ہے رونق بھائی۔ آخر بیگم بلقیس کے حمایتی بھی تو یہاں پر ہیں۔ بیگم کے تین چاچے ہیں۔ والی جی کے مامے کے پُتر ہیں۔ والی جی کی بہن ہیں اور آپ خود ہو۔"

"میں عزیز کی طبیعت بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کسی ایک جگہ ٹکتا نہیں ہے۔ اس میں جوڑ توڑ بھی بہت ہے۔ مجھے پتا ہے، اس نے پانچ چھ مہینے میں ہی بڑا زور پکڑ لینا ہے۔"

"چلیں اگر وہ غلطی کرے گا تو لوگ بھی تو دیکھیں گے۔۔۔۔۔"

ہمارے درمیان ڈیڑھ دو گھنٹے تک بات چیت ہوئی۔ مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ میں اپنی انا یا ذاتی فائدے کی خاطر یہاں کا ماحول خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ممکن تھا کہ کچھ لوگ میری خاموشی کو پسپائی یا بزدلی سمجھتے لیکن مجھے ان باتوں کی پروا نہیں تھی۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ میں یہاں ہونے والی تبدیلیوں پر پوری نظر رکھنا چاہتا تھا۔

ہماری طویل گفتگو میں یہ فیصلہ ہوا کہ فی الحال، تیل اور تیل کی دھار دیکھنی چاہیے۔ میں نے پروگرام بنایا کہ ابھی کچھ دن کے لیے منظر سے ہٹ جاؤں اور دیکھوں کہ یہاں حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ رونق علی نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے راجوال کی صورتِ حال سے وقتاً فوقتاً

آگاہ کرتا رہے گا۔ رونق علی بہت غم زدہ تھا۔ اس کا دل میرے ساتھ خوب لگا تھا۔ بار بار اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ "رونق بھائی! غم میں تو تمہاری بھوک زیادہ ہو جاتی ہے۔ آج گجریلا تمہارے سامنے پڑا ہے اور تم نے اس کو مسلسل معاف کر رکھا ہے۔"

"بس غم غم میں فرق ہوتا ہے۔" اس نے آہ بھر کر کہا۔

"چلیں جی۔ اب بلڈ پریشر کی طرح غم بھی دو طرح کا ہو گیا۔ بھوک لگانے والا غم اور بھوک اڑانے والا غم۔"

رونق کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں ابھری۔ وہ واقعی رنج زدہ تھا۔

مجھے پتا تھا کہ اگر میں دن کی روشنی میں یہاں سے روانہ ہوا تو ضرور تھوڑی بہت ہلچل ہو گی۔ ہو سکتا ہے لوگ اکٹھے ہو جائیں اور ان میں سے بہت سے مجھے روکنے کی کوشش کریں۔ میں فی الحال اس طرح کی کوئی بے چینی نہیں چاہتا تھا۔ آج صبح بیگم بلقیس کے لب و لہجے نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ یہاں راجوال میں پیدا ہونے والی کسی بھی طرح کی بے چینی ان کے لیے بہت تکلیف کا سبب ہو گی۔ میں نے اگلے روز صبح سویرے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے

میں ایک موہوم سی امید بھی شامل تھی۔ عین ممکن تھا کہ رات کو کسی وقت انٹر کام پر بیگم بلقیس سے تھوڑی سی بات ہو جاتی۔

میں نے رات راجوال میں ہی گزاری۔ شام کو حویلی میں پھر بہت بڑا اکٹھ ہوا۔ اس میں چودھری عزیز کے رشتے داروں اور حمایتی زمینداروں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ گیارہ کالے بکروں کی قربانی دی گئی۔ کھانا وغیرہ بھی پکایا گیا۔ اس اکٹھ میں چودھری عزیز کو باقاعدہ طور پر والی جی کی کرسی پر بٹھایا گیا۔ عام لوگوں کو دکھانے کے لیے چودھری عزیز نے گیارہ بارہ سالہ حامد کو بھی اپنے ساتھ کرسی پر بٹھایا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

میری امید پوری نہیں ہوئی۔ رات کو بیگم بلقیس کی طرف سے انٹر کام یعنی بمبوکاٹ پر کسی طرح کا رابطہ نہیں ہوا۔ میں نے چھت کی سرکیوں میں چھپا ہوا انٹر کام کا تار کھینچ کر نکال لیا۔ اب اس کا یہاں کیا کام تھا؟ صبح منہ اندھیرے میں اپنے ساتھی باگو اور تیمور کے ساتھ بہ خاموشی حویلی سے نکل گیا۔ میرے چودہ پندرہ قریبی ساتھی ایک دن پہلے ہی حویلی چھوڑ چکے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں اپنے گاؤں مراد پور پہنچا۔ ماں اور عارفہ گوجرانوالہ میں بڑے بھائی باقر کے پاس تھیں۔ گاؤں میں سب کو یہی معلوم تھا کہ اپنے ننھیالی رشتے داروں کے پاس کہیں آزاد کشمیر میں ہے۔ میرے قریبی ساتھیوں میں سے بھی کسی کو گوجرانوالہ والی بات کا پتا نہیں تھا۔ گوجرانوالہ میں ہم نے ایک مکان خرید لیا تھا لیکن یہ مراد پور والا آبائی گھر میں نے بیچا نہیں تھا۔ میں بیچ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہاں میری جڑیں تھیں۔۔۔۔۔جڑیں کھیت، کنواں کنواں اور گلی گلی پھیلی ہوئی تھیں۔ میں ان مست فضاؤں اور اس کچی کچور دھرتی سے بچھڑ کر زندہ ہی نہیں رہ سکتا تھا۔

ان دنوں میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اپنے پرانے یاروں دوستوں سے ملا۔ محفلوں میں بیٹھا، ماہیے سنے، کبڈی اور کشتی دیکھی اور سائفن پر جا کر پہروں مچھلی کا شکار کیا۔ ہاں، میں ہلکا پھلکا تھا مگر سینے کے اندر ایک بہت بڑا خلا بھی تھا۔۔۔۔۔کسی کی من موہنی صورت کا خلا! کوئی آواز بہت دور سے مجھے رات دن بلاتی تھی۔ کوئی چہرہ، کوئی مسکراہٹ اور ایک چمکتا ہوا کوکا، ایک جھکی ہوئی سی نظر۔ مجھے پتا تھا کہ وہ مجھے یاد کرتی تھیں کیونکہ میں بھی

ہر ہر گھڑی ان کو یاد کرتا تھا۔ ہر چیز میں ان کا عکس محسوس کرتا تھا۔ ہر آواز میں ان کی آواز کھوجتا تھا۔ میں پھر کہوں گا، میں ہر کیفیت آپ کے سامنے کھول کر بیان کر رہا ہوں۔ میں کوئی بھی اچھی چیز کھاتا تو میرے دل میں فوراً خیال آتا ہے کہ کاش اس وقت بلقیس میرے ساتھ ہوتیں۔ میں کوئی خوبصورت منظر دیکھتا تو دل میں یہ حسرت جاگتی کہ یہ منظر بلقیس نے بھی میرے ساتھ دیکھا ہوتا۔ کوئی دل گداز گیت سنتا تو دھیان فوراً بلقیس کی طرف جاتا۔ میں آنکھیں بند کر لیتا اور بلقیس کا چہرہ تصور میں ابھارنے کی کوشش کرتا۔ کبھی وہ ابھر آتا، کبھی مایوسی ہوتی۔ میرے پاس جو پیسے موجود تھے، وہ میں فراخدلی سے خیرات کرتا۔ خیرات کرتے وقت ذہن میں بے بے جی اور بلقیس کا تصور ہی ہوتا۔ کوئی بھی نیک کام کرتے ہوئے میں دل ہی دل میں اسے بیگم بلقیس سے منسوب کر دیتا اور اس طرح مجھے عجیب سی تسلی ہوتی۔

میں عام معیار کے مطابق مذہبی نہیں تھا لیکن مجھے خدا کی ذات پر ہمیشہ یقین رہا اور اس کی قدرت بھی میرے لیے ہر شک و شبے سے بالا رہی ہے۔ میں مصلے پر بیٹھ کر تو دعا نہیں مانگتا تھا مگر چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، یا کسی سنسان رات میں چپ چاپ لیٹے ہوئے میرے دل

سے دعا نکلتی تھی۔۔۔۔ اے اوپر والے! تو سب دیکھتا ہے۔ میں اپنی سوچوں پر شرمندہ ہوں، اپنے کردار پر بھی نادم ہوں لیکن تُو جانتا ہے میرے دل میں سچ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں اور میرا جو بھی قدم ہے بس اس کی راہ میں ہے۔

کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ مجھ پر بلقیس کے نام کی مہر لگ چکی ہے۔ میری کلائی پر ہتھیلی کی طرف جلنے کے زخم کا نشان تھا اور اس سے کہیں بڑا اور وسیع و عریض نشان میرے دل پر تھا جو بس مجھے نظر آتا تھا۔

۔۔۔۔ راجوال کی خبریں رونق علی کے ایک خاص بندے کے ذریعے اور دوسرے واسطوں سے مجھ تک پہنچتی رہتی تھیں۔ ڈیڑھ دو مہینوں میں ہی چودھری عزیز نے اپنے رنگ دکھانے شروع کر دیے تھے۔ ایسے تمام ملازموں کو چُن چُن کر نکال دیا گیا تھا جو کسی بھی طرح بیگم بلقیس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ تاجو اور اس ماں بھی اس میں شامل تھیں۔ مسلح محافظوں میں بھی لمبی چوڑی چھانٹی ہوئی تھی۔ کچھ کھڈے لائن لگا دیے گئے تھے۔ چودھری عزیز نے حویلی کا ایک بڑا حصہ اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ بیگم بلقیس، ان کی بہن اور حامد

وغیرہ اوپر والے کمروں میں چلے گئے تھے۔ چودھری عزیز نے پہلے کی طرح حویلی کے اندر شراب وغیرہ بھی پینی شروع کر دی تھی۔ پھر ایک روز اماں دلشاد کے بارے میں بھی اطلاع ملی کہ وہ حویلی کے ماحول سے پریشان ہے اور واپس شام پور جانے کا سوچ رہی ہے۔ اس اطلاع نے مجھے دکھ دیا۔ اماں اور اس کی بیٹیوں کو میں ہی شام پور سے بڑی چاہ اور عزت کے ساتھ لے کر آیا تھا۔ میں نے رونق علی کے کارندے فیاض سے کہا کہ وہ اس بارے میں مزید معلوم کرے اور مجھے بتائے۔

میں گوجرانوالہ جا کر بے بے جی، بھائی باقر علی اور عارفہ سے دو بار ملاقات کر چکا تھا۔ ایک دن پھر ان سے ملنے کو دل مچلا۔ ساتھ ساتھ ڈر بھی تھا کہ بے بے جی پھر شادی کی بات نہ چھیڑ دیں۔ بہر حال، اس ڈر کے سبب ان سے زیادہ دن دور بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ چچا زاد باگو نے اپنی اور بہن کی شادی کا کچھ سامان خریدنے لاہور جانا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ بہار کی آمد آمد تھی لیکن فضا میں ابھی خنکی موجود تھی۔ ہم صبح سویرے تانگے پر نکلے۔ ہمیں دو تانگے بدل کر پسرور روڈ پہنچنا تھا اور پھر وہاں سے بس پکڑنی تھی۔ جس تانگے پر ہم روانہ ہوئے، اس پر ہمارے ہی گاؤں کی ایک ماچھن رابعہ اپنے بچوں کے ساتھ جا رہی تھی۔ چار بچے تھے جن

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں بڑی لڑکی کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ ایک چھوٹا بچہ ہمارے ساتھ آگے بیٹھا ہوا تھا، باقی ماں کے ساتھ پیچھے تھے۔ یہ بہت سویرے کا وقت تھا۔ ابھی دھوپ نکلی نہیں تھی۔ گندم کی رنگ بدلتی فصل دور تک لہرا رہی تھی۔ ہم گاؤں سے دو ڈھائی میل آگے آئے تھے کہ ایک جگہ کوچوان کو تانگا روکنا پڑا۔ کچے راستے پر ایک گڑھا تھا جو بارشی پانی سے بھرا ہوا تھا۔ گڑھے کے ارد گرد کسی نے ڈھینگریاں "خشک ٹہنیاں" رکھ دی تھیں۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ راہ گیروں کی حفاظت کے لیے ایسا کیا گیا ہے مگر کنارے پر راستہ کم رہ گیا تھا۔ تانگے کو احتیاط سے گزارنے کی ضرورت تھی۔ کوچوان نیچے اتر آیا۔ یہی وقت تھا جب کنارے کی اونچی فصل میں سے تین چار بندے جھپٹا مار کر باہر نکل آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کالے رنگ کی ایل ایم جی چمک رہی تھی۔

"خبردار اوئے!" رائفل بردار نے میری طرف بیرل کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی چالاکی نہ دکھانا۔" ماچھن رابعہ اور اس کے بچے خوفزدہ ہو کر چلانے لگے۔

میری اور باگو کی قمیصوں کے نیچے بھرے ہوئے پستول موجود تھے۔ مگر جو کچھ ہوا، اتنا اچانک تھا کہ ہم ٹھٹک کر رہ گئے۔ ڈھاٹا پوش رائفل بردار پھر گرجا۔ "نیچے اتر آ۔ نئیں تو چھٹا (برسٹ) مار کر بال بچے سمیت فنا کر دوں گا۔"

مجھے ایل ایم جی کی مار کا پتا تھا۔ ایک لحظے میں ہم سب شکار ہو سکتے تھے۔ رابعہ اور اس کے بچے مسلسل چلا رہے تھے۔ دو بندوں نے ان کی طرف بھی رائفلیں سیدھی کر لی تھیں۔ ان چار بندوں میں سے دو نے سر ڈھاٹوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ باقی دو ہمارے لیے ان جان تھے۔ میں نے باگو کا گھٹنا دبا کر اسے کسی بھی حرکت سے منع کیا۔ مجھے اپنے سے زیادہ اپنے ساتھی بچوں کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ "پستول نکال کر نیچے پھینک دے۔" ڈھاٹا پوش نے ایل ایم جی کا سیاہ بیرل عین میرے سینے کی طرف رکھتے ہوئے کہا۔

اس کا لہجہ خوفناک تھا۔ وہ ایسے بندے کا لہجہ تھا جو کچھ بھی کر سکتا تھا۔

میں نے پستول پھینک دیا۔ باگو نے بھی ایسا ہی کیا۔ باگو کا پستول لڑھک کر پانی میں جا گرا۔

"چلو نیچے اترو دونوں۔" دوسرا حکم ہوا۔

ہم تانگے سے اتر آئے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ سواریوں والا ایک تانگا سامنے سے آ رہا تھا۔ مگر تانگے والوں نے دور ہی سے صورتحال کی سنگینی بھانپ لی اور تانگا موڑ کر ایک طرف اوجھل ہو گئے۔ اسی دوران پیچھے سے ایک کالی گاڑی دھول اڑاتی اور ہچکولے کھاتی موقعے پر پہنچی۔ اس میں دو بندے موجود تھے اور یہ بھی شکلوں سے خطرناک لگتے تھے۔

"چلو وڑو، گڈی کے اندر۔" ڈھاٹا پوش نے انگلی ٹرائیگر پر رکھے ہوئے کہا۔

مزاحمت کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ایسے موقعوں پر بہادری بے وقوفی بن جاتی ہے۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہی وقت تھا جب سیون ایم ایم رائفل کا ایک فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بندہ گرجا۔ "رک جاؤ۔"

میں نے مڑ کر دیکھا، رابعہ کے بچوں میں سے ایک خوفزدہ ہو کر کھیتوں کی طرف بھاگا۔ یہ وہی سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی تھی۔ رائفل بردار نے بے دریغ اس پر فائر کر دیا۔ لڑکی مجھے نظر نہیں آئی۔

تاہم رائفل بردار نظر آیا جو لڑکی کے پیچھے بھاگتا ہوا کھیت میں گھس گیا تھا۔

اسی دوران میں ہی گاڑی ایک تند جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ڈرائیور سمیت گاڑی میں چار مسلح بندے تھے۔ایل ایم جی کی نال میرے پیٹ میں گھسی ہوئی تھی۔ایک پستول بائیں کنپٹی کے ساتھ تھا۔دوسری رائفل کی نال باگو کی گردن میں اس طرح دھنسی ہوئی تھی کہ باگو کی گردن خطرناک زاویے سے پیچھے مڑ گئی۔یہ چاروں افراد ہمیں کوئی موقع دینا نہیں چاہتے تھے۔خاص طور سے مجھے تو بالکل نہیں۔ایسی شدید ٹینشن میں یہ ڈر بھی ہوتا ہے کہ کہیں اتفاقاً گولی نہ چل جائے۔میں نے خود کو اور حملہ آوروں کو ذرا پُر سکون رکھنے کے لیے ان سے بات چیت شروع کر دی۔

"کون لوگ ہو تم؟ میں تم میں سے کسی کو نہیں جانتا۔"

"لیکن تیرے خاندان کی عورتیں جانتی ہوں گی۔وہ ہمارے ہی بچے کھلاتی ہیں۔"نہایت ترش جواب ملا۔

"دیکھو، بدزبانی اچھی نہیں۔کہیں ایک طرف گاڑی روک دو۔جو کچھ چاہتے ہو مجھے بتاؤ۔ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری ڈیمانڈ پوری کر دیں۔"

"بڑی سخت ڈیمانڈ ہے۔تیرے گھر کی ساری جوان زنانیوں کو ٹھنڈے فرش پر ننگا نچانا ہے۔بھر لو گے یہ کڑوا گھونٹ؟"

میں سمجھ گیا کہ ان کتوں سے بات کرنا فضول ہے۔گہری سانس لے کر میں نے نشست کی بیک سے ٹیک لگا لی۔"چپ کیوں ہو گئے؟"ڈھاٹا پوش نے ایل ایم جی کی نال نہایت بے رحمی سے میرے پیٹ میں دھنساتے ہوئے کہا۔وہ واقعی از حد سر پھرا اور خطرناک تھا۔

"کہاں سے آئے ہو تم؟" باگو نے پوچھا۔

"جہاں سے سارے آتے ہیں۔جہاں سے تُو آیا ہے۔"وہ بازاری انداز میں بولا۔

باگو کے چہرے پر طیش کا رنگ لہرایا لیکن خیریت گزری کہ اس نے فوری طور پر کوئی بے وقوفی نہیں کی۔معاملہ بہت سنگین لگ رہا تھا۔اس کے پیچھے کون ہو سکتا ہے؟ میرا ذہن نہایت تیز رفتاری سے سوچنے لگا۔کئی امکانات تھے۔چودھری عزیز؟ لیاقت کالا؟ موکھل پاشا، چھوٹا موکھل یا پھر کوئی اور ویری؟ میں نے اب تک کسی کا چہرہ نہیں پہچانا تھا اور باگو کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔اونچی نیچی فصل کے درمیان مارک ون گاڑی کچے رستے پر ہچکولے کھاتی، تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔گاڑی کے اندر انتہا درجے کا تناؤ تھا۔ٹرائیگروں پر رکھی

ہوئی انگلیوں کا منظر بہت خطرناک تھا۔اس خوفناکی کو بیان نہیں کیا جا سکتا، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

قریباً پانچ چھ کلومیٹر چلنے کے بعد گاڑی درختوں سے گھرے ہوئے ایک کچے مکان کے سامنے جارکی۔ یہ ایک باغ تھا۔آم،امرود اور جامن کے درخت نظر آرہے تھے۔بہار کی آمد کے سبب ہر درخت پر رونق نظر آتی تھی۔چار پانچ کمروں پر مشتمل مکان بالکل سنسان تھا۔ایک طرف دو گھوڑے بندے ہوئے تھے اور پاس ہی کیچڑ آلود پہیوں والا ریڑھا کھڑا تھا۔دیواروں پر گوبر کے اُپلوں کی طویل قطاریں نظر آتی تھیں۔

"چل اوئے! نیچے اتر۔" ایک رائفل بردار نے باگو کو رائفل کی نال سے دھکیلتے ہوئے کہا۔ باگو نیچے اتر آیا۔

"چل بھائی! تُو بھی تشریف نیچے اتار۔" ڈھاٹا پوش نے ایل ایم جی میرے پیٹ میں دھنساتے ہوئے کہا۔

میں نے آخری کوشش کرتے ہوئے تحمل سے کہا۔

"دیکھو، اگر یہ معاملہ گل بات۔۔۔۔"

ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ ایک شخص کا بھرپور تھپڑ میرے چہرے پر پڑا۔اس کے ساتھ ہی گالی سنائی دی۔ باگو جو بڑی دیر سے برداشت کر رہا تھا، مزید برداشت نہ کر سکا۔وہ گاڑی سے باہر نکل چکا تھا۔اس کے عقب میں بس ایک رائفل بردار تھا۔ باگو بے حد تیزی سے پلٹا۔اس کا بایاں ہاتھ سیون ایم ایم رائفل کے بیرل پر آیا اور بیرل نیچے جھک گیا۔اس کے ساتھ ہی باگو نے رائفل بردار کے پیٹ میں زوردار لات رسید کر کے اس سے رائفل چھیننا چاہی مگر رائفل بردار نے رائفل نہیں چھوڑی۔دونوں گر گئے۔ گرتے ہوئے رائفل سے گولی چلی اور زمین میں پیوست ہو گئی۔ میں نے ایل ایم جی کی خوفناک نال اپنے پیٹ سے ہٹا دی مگر باقی دو ہتھیار میری طرف تھے اور میں گاڑی کے اندر تھا۔یہ پوزیشن ہرگز ایسی نہیں تھی کہ مزاحمت کی جا سکتی۔اسی دوران میں گاڑی کے پاس کھڑے ایک شخص نے 38 بور کے پسٹل کا ایک فائر کیا اور باگو جو رائفل بردار سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا، پہلو میں گولی کھا کر اپلوں کے اوپر گرا۔اس کی جلد بازی اسے جان لیوا طور پر زخمی کر گئی تھی۔ جس شخص کے پیٹ میں باگو کی لات لگی تھی، وہ بپھرا ہوا تھا۔اس نے رائفل کی نال باگو کے سر سے لگائی۔ایک لحظے کے لیے لگا کہ وہ باگو کو وہیں شوٹ کر دے گا مگر پھر میرے اور ڈھاٹا پوش کے چلانے سے وہ رک گیا۔

مجھے باہر نکال لیا گیا۔اس موقعے پر میری ذرا سی مزاحمت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ باگو زمین پر پڑا تھا اور اس کا پہلو تیزی سے خون اگل رہا تھا۔ تین افراد اسے اٹھا کر ایک قریبی کمرے میں لے گئے۔ غالباً وہ اسے طبّی امداد دینا چاہ رہے تھے۔

مجھے ایک ڈیوڑھی سے گزار کر ایک وسیع صحن میں لایا گیا۔ یہاں چارہ کاٹنے والا ٹوکا تھا، بھینسیں تھیں۔ دو عورتیں ایک چارپائی کے پاس کھڑی تھیں۔ شاید کچھ دیر پہلے تک وہ سبزی کاٹ رہی تھیں۔ اب اوپر تلے ہونے والے دو فائروں نے انہیں ٹھٹکا دیا تھا۔ انہوں نے قدرے ہراساں نظروں سے مجھے رائفلوں کی زد میں دیکھا اور آپس میں کھسر پھسر کرنے لگیں۔ مجھے ایک کمرے میں دھکیل کر دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ دروازہ لوہے کی چادر کا تھا۔ کمرے میں ایک کھڑکی بھی تھی جو برآمدے کی طرف کھلتی تھی۔ اس میں زنگ آلود سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ تاہم دو سلاخیں نئی نظر آتی تھیں۔ ان سلاخوں کو کھڑکی کی چوکھٹ میں شاید دو چار دن پہلے ہی ٹھونکا گیا تھا۔ اس بات سے یہ اشارہ بھی ملتا تھا کہ شاید ہمیں یہاں لانے کا پروگرام دو چار دن پہلے ہی بنا لیا گیا تھا۔ کمرے میں دو چارپائیاں، دو موڑھے، اور ایک جالی دار ڈولی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کمرے کے دو دروازے تھے۔

میں وہاں پورے آٹھ پہر بھوکا پیاسا بند رہا۔ مجھے کسی کی صورت بھی نظر نہیں آئی۔ بس یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ایک یا دو مسلح بندے کمرے کے ارد گرد موجود ہیں۔ رات کو میں نے کئی بار آوازیں بھی دیں مگر کسی آواز کا جواب نہیں آیا۔ میں باگو کے بارے میں بہت فکر مند تھا۔

اگلے روز صبح کے وقت دروازہ کھلا۔ ایک شخص رائفل ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ دوسرے نے کھانے کی چنگیر دروازے کے قریب ہی کچے فرش پر رکھ دی۔ دروازہ پھر سے بند کر دیا گیا۔۔۔۔۔ دونوں افراد سلاخ دار کھڑکی کے قریب آ گئے۔۔۔۔۔ میں نے پوچھا۔ "میرے ساتھی کا کیا حال ہے؟"

"بچ گیا ہے حرامزادہ۔۔۔۔ کافی ڈھیٹ ہڈی ہے۔" سانولے رنگ والے شخص نے جواب دیا۔

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں؟"

"سب کچھ دکھا بھی دیں گے اور سنا بھی دیں گے۔ پہلے روٹی کھا لے کیا چوسے ہوئے امب جیسا منہ ہو گیا ہے تیرا۔"

"وہ ہسپتال میں ہے یا یہاں؟"

"اوئے اسپتال لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم خود بھی چنگی بھلی ڈاکٹری کر لیتے ہیں۔ بلکہ آپریشن بھی کرتے ہیں۔ تجھے دکھائیں گے ایک دو دن میں۔"

میں ان سے مزید بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ کھڑکی سے ہٹ گئے۔ میں نے کل گھر سے نکلتے وقت ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ خیال تھا کہ بس میں بیٹھنے سے پہلے کچھ کھا پی لوں گا۔ اس حساب سے مجھے کچھ بھی کھائے ہوئے تقریباً 36 گھنٹے ہو چکے تھے۔ تلے ہوئے انڈے اور دہی وغیرہ کی خوشبو چنگیر میں سے اٹھ رہی تھی۔۔۔۔ مگر کھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

سانولے چہرے والا پھر کھڑکی پر نظر آیا۔ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "کیا سوچ رہا ہے۔ کھالے، کھا لے۔ زہر نہیں ملایا ہوا ہے اس میں۔"

"ملا بھی دیا ہو تو کون سی بڑی بات ہے۔ میں نے کہا۔

"گھبرا مت۔ اتنی آسان موت نہیں ماریں گے تجھے۔"

میں واقعی کھانے کے بارے میں مطمئن نہیں تھا۔۔۔۔ مگر جسمانی ضرورت بھی پوری کرنی تھی۔ چند لقمے لے لیے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ارد گرد پھر خاموشی تھی۔ درختوں کے درمیان گھری ہوئی یہ بالکل الگ تھلگ جگہ تھی۔ کل یہاں دو فائر ہوئے تھے لیکن شاید کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وسیع صحن کے دوسرے کنارے سے بس کسی وقت کسی بچے کے چلانے یا عورت کے بولنے کی مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچتی تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ باگو کے بارے میں اور اس نوعمر لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا جس پر کل گندم کے کھیت میں گولی چلائی گئی تھی۔ پتا نہیں وہ بچی تھی یا نہیں۔ ماچھن رابعہ کا روتا بلکتا چہرہ بھی بار بار تصور میں آرہا تھا۔ وہ بیچارے خوامخواہ اس چکر میں پھنس گئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد میں سو گیا۔ ٹھیک سے پتا نہیں میں کتنی دیر سویا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو سر بھاری تھا اور برآمدے میں نظر آنے والی روشنی بہت مدھم تھی۔

یکایک میں بے طرح ٹھٹک گیا۔ میں چارپائی سے اٹھنے کے لیے اپنے جسم کو حرکت نہیں دے سکا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو دیکھا اور سناٹے میں رہ گیا۔ ذہن پر چھائی ہوئی غنودگی ایک دم بکھرتی محسوس ہوئی۔ میں چارپائی کے ساتھ بڑی مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔۔۔۔ سن کی

موٹی رسی میرے جسم کے مختلف حصوں پر بُری طرح کُھب رہی تھی۔ میرا بالائی جسم بالکل عریاں تھا۔

میں اپنی حالت پر ششدر رہ گیا۔ میں نے اپنے چکرائے ہوئے سر پر غور کیا اور اس بھاری پن پر غور کیا جو پورے جسم میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ شک غلط نہیں تھا۔ کھانے میں کوئی نشہ آور چیز ملائی گئی تھی۔ میں اس کھانے کے اثر میں نہ جانے کتنی دیر اپنے ارد گرد سے یکسر بے خبر رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے پکارتا، دروازے پر آہٹ ہوئی اور وہ کھل گیا۔ اس دفعہ اندر آنے والے افراد کی تعداد تین تھی۔ ان میں سے ایک وہی ایل ایم جی رائفل والا تھا۔ اب وہ اپنے خاکی رنگ کے ڈھاٹے کے بغیر تھا۔ اس کی صورت میرے لیے اجنبی تھی اور اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ایک جرائم پیشہ، سفاک قاتل کا چہرہ ہے۔ اس کے جبڑے چوڑے اور تھوڑی پر پرانے زخم کا ایک گہرا نشان تھا۔

وہ میرے سامنے آکر بھاری آواز میں بولا۔ "ہاں وائی شاہ خاورے! سنا ہے بڑی گرمی ہے تیرے خون میں۔ بندے کو بندہ ہی نہیں سمجھتا ہے تُو؟"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اور کون ہے تُو؟"

"سمجھ لے کہ میں تیری شامت ہوں۔ تُو نے بڑی اَت مچائی ہوئی تھی۔ تیری اَت ختم کرنے اور تجھے ٹھنڈا ٹھار کرنے کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔"

"میرا ساتھی کہاں ہے؟"

"اس حرامی کو چھوڑ تُو اپنی خیر منا۔" چوڑے جبڑے والے نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک کارندے کو اشارہ کیا۔ وہ آگے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بانس کی ایک موٹی چھڑی تھی جسے غالباً تیل یا کسی اور چکنائی میں بھگویا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا مجھ پر سخت وقت آنے لگا ہے۔ ایک بندے نے آگے بڑھ کر سلاخ دار کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔ دروازہ پہلے ہی بند تھا۔ چھڑی بردار نے بڑی بے رحمی سے میرے جسم پر ضربیں لگانا شروع کیں۔ ننگے پنڈے پر بانس جیسی لکڑی کی ضرب بڑی دردناک ثابت ہوئی۔ اور یہاں تو مارا بھی بڑی بے رحمی سے جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے جسم پر جگہ جگہ دہکی ہوئی سلاخیں رکھی جا رہی ہیں۔ ہر ضرب پر میرا جسم تھوڑا سا اُچھلتا اور قوتِ برداشت تھوڑی سی کم ہو جاتی۔۔۔ آخر میرے ہونٹوں سے بے ساختہ کراہیں نکلنے لگیں، آہستہ آہستہ یہ کراہیں بلند ہوتی گئیں۔

چار پانچ میں ہی میں نیم جان ہو گیا۔ چوڑے جبڑے والے نے ہاتھ کے اشارے سے چھڑی بردار کو روک دیا۔ اس کی آنکھوں میں تمسخر تھا۔ وہ بولا۔ "اوئے اتنی تھوڑی سی خاطر پر ہی تو زنانیوں کی طرح ہائے ہائے کرنے لگا ہے۔ میں نے تو سنا تھا تُو بڑا دراچھا ہے۔ اکیلا ہی چھ سات بندوں کو بکری بنا دیتا ہے۔

"باندھ کر مارنا کوئی بہادری نہیں ہے۔"

"لیکن باندھ لینا تو بہادری ہے نا۔" اس نے منطقی جواب دیا۔ پھر سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر اس نے زہرناک نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔ "ہمشیرہ کہاں ہے تیری؟"

"اپنی زبان کو لگام دو۔" میں پھنکارا۔

اس نے بڑی سفاکی سے جلتا ہوا سگریٹ میری بائیں چھاتی پر بجھا دیا۔ چھاتی کے گول ابھار کی جگہ بڑی نازک ہوتی ہے۔ مجھے بالکل یہی لگا کہ ایک دہکتی ہوئی سلاخ کسی نے میرے سینے میں اُتار دی ہے۔ یہ اذیت بیان سے باہر تھی۔ میرا رُواں رُواں درد سے بھر گیا۔ وہ

سرسراتے لہجے میں بولا۔ "تیری ہر نرم نرم جگہ کو ایسے ہی جلاؤں گا۔ اپنی بہن کا ٹھکانہ تو تجھے بتانا ہی پڑے گا۔ ویسے بھی اور ویسے بھی۔"

"میرا قصور کیا ہے؟" میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

"اوہو ہو ہو۔۔۔۔۔ قصور؟ دیکھو وائی قصور پوچھ رہا ہے۔ واہ! کیا بات ہے۔" چوڑے جبڑے والے نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مزاحیہ انداز میں کہا۔ وہ بھی زہریلے انداز میں مسکرانے لگے۔ اس شخص نے میرے بال مٹھی میں جکڑ کر بے دردی سے کئی جھٹکے دیے اور پھنکارا۔ "تیرے قصوروں پر تو پورا اخبار کالا کیا جا سکتا ہے۔" فقرے کے آخر میں اس نے ایک غلیظ گالی بکی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تو وہ بدبخت ہے کہ جس تھالی میں کھاتا ہے اسی میں چھید کرتا ہے۔ تو کتے کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا۔ تجھے حویلی والوں نے روٹی ڈالی، تجھے رہنے کے لیے ٹھکانا دیا۔ لیکن تُو کتے سے بھی بدتر ہے۔ تُو نے مالکوں کو ہی کاٹنا شروع کر دیا۔ ان کی عزت پر اپنے دانت تیز کرنے لگا۔ تیری تو بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کو کھلا دی جائے تو بھی کم ہے۔ پر تیرے پنڈے میں سے تیری جان کو اتنی جلدی آزاد نہیں

ہونے دیں گے ہم۔ کیوں بھئی فیقے! غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"اس نے اپنے ایک فربہ اندام ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو بارا صاحب۔"

جس کو بارا صاحب کہا گیا تھا وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔"میں صاف صاف بات کرتا ہوں خاورے! یہ کام تو بڑا بے غیرتی والا ہے۔ پر یہ کام تجھے کرنا ہی پڑے گا۔۔۔۔ہاں اگر زندہ رہنا ہے اور اس کمرے سے جان چھڑانی ہے تو یہ کرنا پڑے گا۔ اپنی ہمشیرہ صاحبہ کا پتا ٹھکانہ بتانا پڑے گا اور انہیں یہاں بلانا پڑے گا۔"

میں خاموش رہا کیوں کہ اس بات کا نرم سے نرم جواب یہ تھا کہ میں اس بارا نامی بندے کی زبان کاٹ کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔۔۔۔اور فی الوقت میں سن کی رسی کے ساتھ مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔

"بڑی گرمی ہے وائی بڑی گرمی ہے۔" بارے نے میرے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ پھر نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔"اپنی کنواری بہن کو ہم جیسے گرم چھڑوں کے حوالے کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔۔۔۔پر تو عاشق ہے نا اور عاشقوں کو بہت وڈی وڈی مشکلوں سے

گزرنا پڑتا ہے۔ اگر وڈی مشکلوں سے گزرنے کا حوصلہ نہ ہو تو پھر عشق معشوقی میں ہتھ ہی نہیں ڈالنا چاہیئے۔ کیوں وائی فیقے؟"

"بالکل جی۔"

"چل شاباش بتا۔ کہاں چھپایا ہوا ہے اپنی ہمشیرہ اور امی جی کو؟"اس نے سگریٹ کو پھر میرے جسم سے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"اپنی زبان کو لگام دے کتے۔"میں ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر دہاڑا۔

اس مرتبہ اس نے مجھے پیٹ پر ناف کی گول گہرائی میں داغا۔ یہ بھی حساس جگہ ہوتی ہے۔ میں مچھلی طرح تڑپا اور سن کی رسی میرے بازوؤں اور پنڈلیوں میں آرے کی طرح گھسنے لگیں۔ مجھ پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں غالباً چلایا بھی تھا۔

"ابھی کچا بد معاش ہے۔"فیقے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"ہاں بھئی کچے بد معاش!"چند سیکنڈ بعد بارے کی طنزیہ آواز کانوں سے ٹکرائی۔"کیا ارادہ ہے ہمشیرہ صاحبہ کے بارے میں؟"

میں نے بارے کے منہ پر تھوکنے کا ارادہ کیا لیکن منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ میں نے زور لگا کر خود کو رسیوں سے آزاد کرانے کی اضطرابی کوشش کی۔ اس کوشش میں چارپائی کئی انچ تک دائیں بائیں کھسکی مگر میں سن کی موٹی رسی کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

بارے نے میرے بال مٹھی میں جکڑے۔ "اگر اپنی بہن کے نام پر غیرت اتنے اچھالے مار رہی ہے تو دوسرے کی ماں بہن کی عزت کا خیال کیوں نا کیا تُو نے؟"

"میں نے کسی کی عزت خراب نہیں کی۔" میں نیم غنودگی کی کیفیت میں کراہا۔

"تجھے موقع نہیں ملا ہو گا۔ ورنہ تیرے جیسے شہدے ہاتھ آئی شے کب چھوڑتے ہیں۔۔۔۔ بڑے دیکھے ہیں تیرے جیسے لفنگرو، رنگ باز۔ جہاں سوہنی زنانی نظر آئی، وہیں رال گرانے لگے۔ تیرے جیسے بھونڈ عاشقوں کی ساری محبت بس زنانی کی چمڑی تک ہی ہوتی ہے۔ اپنی چوپڑی چوپڑی باتوں سے زنانی کی مت ماری۔ دو چار دن اس کا رس شش چوسا۔ موج میلا کیا۔ پھر اُڑ گئے کسی اور جگہ عاشقی کا ڈنگ مارنے کے لیے۔"

"سارے ایک جیسے نہیں ہوتے۔" میں نے عجیب سی کیفیت میں کہا۔

"سارے یہی کہتے ہیں۔" وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سگریٹ دوبارہ سلگایا۔

"اچھا بتا۔۔۔۔ کہاں ملاقات ہو سکتی ہے تیری ہمشیرہ صاحبہ سے؟"

"اوئے بتا دے۔۔۔۔ بتا دے۔" فیقا لوفر انداز میں بولا۔

"اگر تم شادی شدہ سے پیار کی پینگیں ڈال سکتے ہو تو ہم غیر شادی شدہ سے کیوں نہیں ڈال سکتے؟ کوئی زیادتی نہیں کریں گے اس کے ساتھ۔ بس انکھ مٹکا لڑائیں گے یا پھر تھوڑی سی دل پشوری۔"

"خیر، یہ بات تو نہ کر فیقے۔" بارے نے کہا۔ "جب دل پشوری ہوتی ہے تو تھوڑی سی نہیں ہوتی۔ جب کام شروع ہو جائے تو آخر تک جاتا ہے۔ اس لفنگرو کو ہی دیکھ لے۔ اس نے کوئی بیگم کو معاف تھوڑی کیا ہو گا۔ اسے آخری پوڑھی (زینے) تک پہنچایا ہو گا۔"

"ہاں، یہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے بارا صاحب۔" فیقے نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"چل پھر شروع ہو جا۔ یہ لاتوں کا بھوت ہے، اس نے باتوں سے نہیں ماننا۔"

فیقے نے ایک بار پھر بید نُما چھڑی ہاتھوں میں تولی اور موت کے فرشتے کی طرح میرے سر پر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر بڑی نفرت اور بے رحمی سے مجھے مارنے لگا۔ اس مرتبہ اس نے پولیس والوں کے انداز میں میری رانوں اور پاؤں کے تلوؤں کو نشانہ بنایا۔ میرے درد کو سوا کرنے کے لیے بارے نے دو تین بار مزید میرے جسم کو سگریٹ سے داغا۔ وہ ساتھ ساتھ مجھ سے میری ماں اور بہن کا اتا پتا پوچھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ یہ جاننا چاہ رہے تھے کہ بیگم جی کے ساتھ میرا تعلق کس حد تک پہنچا ہوا ہے۔ اذیت اور برداشت کی انتہا کو چھونے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے ایک باریک چادر سی پھیلنے لگی۔ میں محسوس کرنے لگا تھا کہ میرا منہ لکڑی کی طرح خشک ہے اور میری آہ و بکا میرے سینے کے اندر ہی گونج رہی ہے۔ پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

۔۔۔۔۔ دوبارہ ہوش آیا تو رات کا وقت تھا۔ سلاخ دار کھڑکی کے پٹ کھلے تھے۔ برآمدے میں روشن لالٹین کی روشنی کمرے کو بھی نیم روشن کر رہی تھی۔ میں ابھی تک چارپائی کے ساتھ رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ کئی جگہ بندشیں اتنی سخت تھیں کہ جسم کے وہ حصے سُن ہو چکے تھے۔ پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ جہاں جہاں سگریٹ لگا وہاں اضافی درد تھا۔

اب مجھے اس بات میں بہت کم شبہ تھا کہ ان لوگوں کا تعلق چودھری عزیز اور اس کے ہم نواؤں سے ہے۔ چودھری عزیز ایک طویل عرصے سے سانپ کی طرح اپنے اندر لِس ☆ رہا تھا۔ اب جونہی اس کے ہاتھ میں اختیار آیا تھا اس نے اپنا آپ دکھا دیا تھا۔ یہ بڑی خطرناک صورتحال تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میں اور باگو یہاں سے زندہ نکل سکیں گے۔

اچانک میں لرز گیا۔ کسی قریبی کمرے میں کوئی بڑے کربناک انداز میں چلایا۔ اس کی آواز درودیوار میں گونجی۔ میرے کان دھوکا نہیں کھا رہے تھے۔ یہ میرے چچازاد باگو کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تو کیا اس پر بھی تشدد ہو رہا تھا؟ کیا اس سے بھی عارفہ اور بے بے جی کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا؟

باگو کی آہ و بکا مسلسل گونج رہی تھی۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں چلانے لگا۔ "بارے۔۔۔فیقے۔۔۔۔۔ میری بات سنو۔ میں کہتا ہوں میری بات سنو۔"

چند سیکنڈ بعد سلاخ دار کھڑکی کے پار فیقے کا فربہ چہرہ نظر آیا۔ میں نے ہیجانی انداز میں کہا۔ "دیکھ فیقے۔۔۔۔۔ اگر میرے ساتھی کو کچھ ہوا نا تو میں۔۔۔۔۔ تو میں تم لوگوں کا حشر خراب کر دوں گا۔ تمہارے بال بچے مار ڈالوں گا۔"

"اوئے چھری کے نیچے ساہ لو سلطانہ ڈاکو صاحب۔ اسے مار نہیں رہے۔ زندہ کر رہے
ہیں۔ اس کے پیٹ میں گھسی ہوئی گولی نکال رہے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، فیقے کا چہرہ کھڑکی سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے باگو کی آہ وبکا پر
غور کیا۔ یہ بات درست معلوم ہوئی کہ اسے مارا پیٹا نہیں جا رہا تھا۔ باگو قریباً ایک گھنٹے تک
روتا چلاتا رہا۔ کبھی اس کی آواز بلند اور کبھی دھیمی ہو جاتی تھی۔ "ہائے میرے
ربا۔۔۔۔اوئے میں مر گیا۔" یہ الفاظ بار بار اس کی زبان پر آتے اور میرے دل میں جیسے
خنجر پیوست کر دیتے تھے۔ وہ اپنی اور اپنی بہن کی شادی کا سامان لینے کے لیے میرے ساتھ
گاؤں سے نکلا تھا اور اس آفت میں پھنس گیا تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ باگو کے پیٹ سے گولی
کون نکال رہا ہے اور کس طرح نکال رہا ہے۔ اصولی طور پر اسے اسپتال کی ضرورت تھی مگر
یہ لوگ اسے اسپتال لے جانے کا خطرہ مول نہیں لے رہے تھے۔ انہیں کیا ضرورت تھیں
ان چکروں میں پڑنے کی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ایک آدھ گھنٹے کے بعد باگو کے کراہنے کی آواز پھر آنے لگی۔ آہستہ آہستہ یہ آواز بلند ہوتی
گئی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ساری رات درد سے تڑپتا رہا۔ اس کی تڑپ نے مجھے
سونے نہیں دیا۔ بس آخری پہر ذرا سی آنکھ لگی۔

صبح نو بجے کے قریب ایک بار پھر مجھ پر تشدد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دروازے پر آہٹ
ہوئی۔ میں سمجھا شاید میری مرہم پٹی کی جائے گی اور کھانے پینے کو کچھ دیا جائے گا مگر
صورتِ حال برعکس تھی۔ بارے نے اندر آتے ہی مجھے قہرناک نظروں سے دیکھا اور گندی
زبان استعمال کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں نشے کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔ وہ طنزیہ انداز میں
بولا۔ "ہاں جی خاور صاحب! ہم مسکینوں کی گزارش پر کچھ غور کیا آپ نے؟ میرا مطلب
ہے۔۔۔۔ ہمیں ان دونوں عورتوں کا پتا ٹھکانا چاہئیے جنہیں جناب نے بڑی ہوشیاری سے
چھپایا ہوا ہے۔"

میں نے پھر کل والی بات کہی۔ "باندھ کر مارنا کوئی بہادری نہیں بارے۔"

"پر تیرے جیسے ڈشکرے کو باندھ لینا تو بہادری ہے۔" اس نے بھی کل والی بات دُہرائی۔

ہمارے درمیان گالیوں کا تبادلہ ہوا جس کے بعد بارے کا غصہ عروج پر پہنچ گیا۔اس نے اپنے بندوں حکم دیا۔انہوں نے چارپائی کو کھڑا کر دیا۔لیکن الٹا کھڑا کیا۔میرا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہو گئیں۔بندشیں اتنی مضبوط تھیں کہ میں بس دو چار انچ ہی نیچے کھسک سکا۔اس کے بعد کل والا سلسلہ شروع ہو گیا۔بید نُما چھڑی سے مجھے نہایت بے دردی سے مارا گیا۔میرے سوجے ہوئے زخمی پیروں کو خاص طور سے نشانہ بنایا گیا۔بدن کے مختلف حصوں سے خون رسنے لگا۔دو تین بار سگریٹ بھی سلگایا گیا۔

یہ حقیقت تو غالباً ان کی سمجھ میں بھی آ گئی تھی کہ جو بات وہ جاننا چاہتے ہیں، وہ میری زبان پر آ ہی نہیں سکتی۔۔۔۔اس کے باوجود وہ بہیمانہ تشدد جاری رکھے ہوئے تھے۔غلیظ زبان کا سلسلہ بھی جاری تھا۔غالباً وہ مجھے زیادہ سے زیادہ ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچانا چاہتے تھے۔باقی باتوں کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔وہ بڑی بے رحمی اور بے پروائی سے میرے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلتے رہے۔بارے نے اپنے 38 بور ریوالور کے چیمبر میں دو گولیاں ڈالیں اور ریوالور کی خرچی گھما گھما کر میری ٹانگ پر تین بار فائر کیا۔ہر بار مجھے یہی لگا کہ گولی دھماکے سے میری ران میں گھس جائے گی۔لیکن خوش قسمتی سے تینوں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

مرتبہ گولی اور "ہیمر" آمنے سامنے نہیں آئے۔ریوالور سے ٹرچ کی آواز نکل کر رہ گئی۔میری اس ذہنی اذیت کو بارے اور فیقے نے بہت انجوائے کیا۔تب ایک بار پھر وحشیانہ مار پیٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔پندرہ بیس منٹ کی ناقابل بیان اذیت کے بعد میں ایک بار پھر نیم بے ہوشی محسوس کرنے لگا۔جب میرا ذہن بہ تدریج تاریکی میں ڈوب رہا تھا، مکروہ صورت فیقے کی طنزیہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔اس نے مجھے گالی دی اور بارے سے مخاطب ہو کر بولا۔"""کچا بدمعاش ہے جی۔۔۔۔کچا ہے۔"

بارے کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے میری سماعت سے ٹکرائی۔"ہاں جی کچے بدمعاش صاحب! والی جی کی بی بی کو بہن مانتے ہو یا نہیں۔۔۔۔"

اس نے شاید کچھ اور بھی کہا تھا پر میرا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔

اس دفعہ بے ہوشی طویل تھی۔میں دنیا و مافیا سے بے خبر تھا لیکن اس کیفیت میں بھی ذہن میں یہ احساس موجود تھا کہ میرا گلا خشک ہے، میں سخت ترین پیاس محسوس کر رہا ہوں اور میرے جسم پر دہکتے ہوئے انگارے رکھے ہیں۔شاید اسی حالت میں، میں کئی بار پانی کے لیے پکارا بھی تھا۔صحن کے کسی گوشے میں کھیلتے ہوئے بچوں کی آوازیں جیسے ہزاروں میل دور

سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔اس کرب ناک کیفیت میں، میں اپنے دل کے اندر یہ تھوڑا سا اطمینان بھی محسوس کر رہا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے عارفہ اور بے بے جی کے سلسلے میں احتیاط کر کے اچھا کام کیا تھا۔اگر آج وہ اپنے گھر میں ہوتیں یا ان کا اتا پتا گاؤں والوں کو معلوم ہوتا تو ان کے لیے خوفناک مسائل پیدا ہوتے۔

ایک طویل بے ہوشی کے بعد جب دھیرے دھیرے میرے حواس بحال ہوئے تو میرے ہونٹوں پر نمی تھی۔ گردن بھی گیلی ہو رہی تھی۔ شاید ابھی کچھ دیر پہلے مجھے کوئی پانی پلا کر گیا تھا۔چارپائی کو اب سیدھا کر دیا گیا تھا۔میں اس پر لیٹا ہوا تھا۔ برآمدے میں روشنی کے زاویوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ شام ہونے والی ہے۔اپنے ارد گرد کی آوازوں پر میں نے غور کیا۔خاموشی تھی۔ باگو کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ کہاں ہے۔

میں نے پکارنا شروع کر دیا۔"کوئی ہے۔۔۔۔اوئے کوئی ہے؟"

چند سیکنڈ کے بعد بارے کے ایک ساتھی اسلم کی شکل نظر آئی۔

"کیا موت پڑی ہے تجھے؟"اس نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"میرا ساتھی کہاں ہے؟"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اوئے! تُو اس کی فکر نہ کر۔وہ حرامی موج میں ہے۔نرسوں سے اپنے آپ کو ہتھ شتھ پھروا رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اسپتال میں ہے۔۔۔۔تُو اپنی فکر کر۔ تیرے ساتھ نہیں ہونے والی۔"

"مجھے پیشاب آ رہا ہے۔"میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"پیشاب کرنے کا بہترین وقت تو وہ تھا جب تُو آزاد تھا۔۔۔۔ہو ہو ہاہا۔"اس نے مذاق اڑایا۔

"دیکھو، میری بات سنو۔مجھے واقعی پیشاب آ رہا ہے۔"

"تو تجھے گودی میں بٹھا کر پیشاب کراؤں؟ کر لے خود ہی جا کر۔"

تب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں چارپائی پر لیٹا ہوں لیکن میرے جسم کے گرد رسی کی ظالم گرفت موجود نہیں ہے۔میں نے ایک خوش گوار حیرت کے ساتھ اپنے ہاتھ ہلائے اور پھر پاؤں کو حرکت دی۔دایاں پاؤں ہلاتے ہوئے مجھے کھڑ کھڑاہٹ سنائی دی اور ساتھ ہی

احساس ہوا کہ پاؤں مکمل طور پر آزاد نہیں۔ میں نے سر اونچا کر کے دیکھا میرے پاؤں میں ایک لمبی سی زنگ آلود زنجیر موجود تھی۔"

"یہ کیا ہے؟"

"تیرے پچھاڑی۔ جا پیشاب کر لے۔ وہ دروازہ کھول کر دوسری طرف چلا جا۔" اسلم نے اشارہ کیا۔

میرا مثانہ جیسے پھٹا جا رہا تھا۔ میں چارپائی سے اٹھا تو جسم کا ہر جوڑ چٹخنے لگا۔ زنجیر موٹی ہونے کے ساتھ ساتھ کافی لمبی تھی۔ میں بہ آسانی کمرے کے عقبی دروازے تک جا سکتا تھا یا شاید چار پانچ فٹ آگے بھی۔ میں نے جسم کا بوجھ اپنے سوجے ہوئے پیروں پر ڈالا تو ہونٹوں سے بے ساختہ کراہیں نکل گئیں۔

"اوئے! مرد بن۔۔۔۔ عاشقی معشوقی سوکھا کام نہیں ہے۔" اسلم نے زہریلے لہجے میں کہا۔

میں زنجیر کو گھسیٹتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ اسے دھکیلا تو ایک بدبودار تاریک بیت الخلا میں کھل گیا۔ یہ ایک کوٹھڑی سی تھی جس میں ایک گھڑے کا پیندا اور مٹی کا لوٹا رکھا ہوا تھا۔ میں اس

کراہت انگیز تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ اپنی زنجیر گھسیٹتا ہوا میں کمرے میں واپس آیا تو چارپائی پر کھانا رکھا ہوا تھا۔ بھوک کے باوجود میرا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہا۔ میں بس ایک دو نوالے ہی لے سکا۔

۔۔۔۔اگلے تین چار روز میں اسی کمرے میں بند رہا۔ مجھے تو پتا نہیں تھا کہ میرے بعد مراد پور میں کیا ہو رہا ہے۔ میرے اور باگو کے یوں "اٹھائے جانے" کو کس طرح لیا جا رہا ہے۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ میرے یار دوست میری تلاش میں غلط رخ اختیار کر کے خوامخواہ کسی سے جھگڑا مول نہ لے لیں۔ تین چار روز میں مجھے بس اسلم اور فیقے کی شکل ہی نظر آتی تھی۔ یا کسی وقت گہرے سانولے رنگ کی موٹی بھدی عورت دکھائی دیتی تھی۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ اس نے دو دفعہ کھانا مجھے اس طرح پہنچایا کہ روٹی کے اوپر سالن رکھ کر اسے سلاخ دار کھڑکی کے اندر گزار دیا اور کہہ دیا کہ میں پانی گھڑے سے لے لوں۔ اس کے دانت بدھے اور پیلے تھے۔ بولتے وقت بہت نمایاں ہو جاتے تھے۔ فیقا بالکل چپ رہتا تھا لیکن اسلم مجھ سے تھوڑی بہت بات کر لیتا تھا۔ ایک دن وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا

چرس والا سگریٹ بھر رہا تھا۔ رائفل اس کی گود میں تھی۔ اتنے میں ایک سات آٹھ سالہ بچہ آیا اور بولا۔

"چاچا! امی کہتی ہے کہ روٹی پک گئی ہے۔"

"اچھا، ابھی آتا ہوں۔" اسلم نے کہا۔

"چاچے رفیق کو بھی بتادو۔"

"وہ ڈھارے میں سویا پڑا ہے، اس کو جگادو۔"

لڑکا واپس چلا گیا۔ میں نے اسلم سے پوچھا۔ "بارا کہاں ہے؟"

"کام پر گیا ہے۔"

"تم تو کہتے ہو اس گھر میں مہمان ہو۔۔۔۔۔ پھر کام کیسا؟"

"اوئے! تو کیا مہمان کے پیروں میں مہندی لگی ہوتی ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کر سکتا؟۔۔۔۔ اور وہ کھیتوں میں ہل چلانے تھوڑی گیا ہے۔ ذرا ڈسکے تک گیا ہے۔ آجائے گا شام تک تیری خبر لینے۔"

اتنے میں لڑکے نے پھر آواز دی۔ اسلم اٹھ کر چلا گیا۔ ابھی تک جو کچھ مجھے پتا چلا تھا، اس کے مطابق یہ گھر باغ کے مالک فاضل عرف فجے نامی بندے کا تھا۔ یہاں وہ اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ فاضل کے دو بھائی اور کچھ یار بیلی کچھ دن رہنے کے لیے اس کے گھر آئے ہوئے تھے۔ یار بیلی بارا تھا اور دونوں بھائی فیقا اور اسلم تھے۔ وہ اپنا زیادہ وقت تاش کھیلتے، سگریٹ پیتے اور سوتے گزارتے تھے۔ ان کی سرگرمیاں مشکوک تھیں۔

لیکن چوتھے دن مجھ پر ایک بالکل نئی صورتِ حال کا انکشاف ہوا اور میں دنگ رہ گیا۔ یہ بالکل صبح سویرے کا وقت تھا۔ ابھی اندھیرا پوری طرح چھٹا نہیں تھا۔ باغ کی طرف سے پرندوں کا بے پناہ شور سنائی دے رہا تھا۔ میں اپنے ورم زدہ زخمی پاؤں کو لحاف میں دبائے بیٹھا تھا۔ ایک عورت کھڑکی کی طرف آتی دکھائی دی۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ یہ وہی موٹی سانولی لڑکی ہے لیکن وہ قریب آئی تو اندازہ ہوا کہ وہ ایک جواں سال عورت ہے۔ اس نے چہرہ آدھے گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے مجھے کھڑکی کے قریب چارپائی پر بیٹھے دیکھا اور اوڑھنی میں سے ہاتھ نکال کر بولی۔ "تیرا ناشتا۔"

باسی روٹی پر نرم تازہ مکھن اور شکر رکھی ہوئی تھی۔ یہ دیہات میں دل پسند ناشتا سمجھا جاتا تھا۔ اس نے تہ کی ہوئی روٹی کو سلاخ دار کھڑکی میں سے ہاتھ گزار کر چنگیر میں رکھ دیا۔

"اتنی جلدی ناشتا؟" میں نے پوچھا۔

"آہو بھراوا۔" اس نے عجیب لہجے میں کہا۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے مجھے سرتاپا دیکھا اور میری حالت جان کر اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔

"لگتا ہے تجھے بہت مارتے ہیں یہ۔ تیری آواجیں ہم تک پہنچتی رہتی ہیں۔"

"ایسا ہی ہے بھین۔"

"تیری کوئی دشمنی ہے ان سے؟"

"نہیں بھین (بہن)۔ بس بے گناہ ہی ان کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔"

عورت نے سہمی ہوئی نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور لرزاں آواز میں بولی۔ "مم۔۔۔۔ مجھے نہیں لگتا، یہ تجھے جندہ چھوڑیں گے۔ اگر کسی طرح یہاں سے نکل سکتا ہے تو نکل جا۔"

"کیسے نکلوں؟ انہوں نے سنگلی ڈالی ہوئی ہے۔" میں نے اسے اپنا دایاں پاؤں دکھاتے ہوئے کہا۔

"کوئی شے نہیں ہے یہاں سنگلی توڑنے والی؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بے حد تاسف سے بولی۔ "بب۔۔۔۔ بس میں نے تجھے بتا دیا ہے بھراوا! کچھ کر سکتا ہے تو کر لے۔ نہیں تو تیرے ساتھ بھی وہی ہو گا جو اس کے ساتھ ہوا۔"

"کس کے ساتھ؟"

"تیرے یار کے ساتھ۔"

"کیا ہوا؟" میں بری طرح چونک گیا۔

"تجھے نہیں پتا؟"

"نہیں۔"

"وہ مر گیا۔ انہوں نے گولی نکالنے کے لیے اس کی چیر پھاڑ کی تھی۔ وہ ختم ہو گیا۔۔۔۔ یہیں ساتھ والے کمرے میں۔"

مجھے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ دکھ کی ایک شدید لہر پہلے میرے پورے جسم میں پھیلی پھر وہ بتدریج غیض وغضب میں ڈھل گئی۔ "یہ کیا کہہ رہی ہے تُو؟" میں کراہا۔

"یہی ہوا ہے۔ انہوں نے مار دیا ہے اسے۔۔۔۔۔ اور ٹھکانے بھی لگا دیا۔ اس کی لاش کو بوری میں بھر کر لے گئے تھے کہیں۔ یہ بڑے کھتر ناک لوگ ہیں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

میں سناٹے میں تھا۔ ایک دم کہیں قریب سے آہٹ ہوئی۔ عورت بدک گئی۔ ہراساں نظروں سے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد بولی۔ "کوئی جاگ نہ گیا ہو۔ میں دیکھتی ہوں۔ اگر کھترا نہ ہوا تو تھوڑی دیر میں پھر آؤں گی۔"

مجھے سکتے کی سی کیفیت میں چھوڑ کر وہ اوجھل ہو گئی۔ میری آنکھوں میں گرم آنسو امڈ آئے تھے۔ باگو کا چہرہ مسلسل نظر میں گھوم رہا تھا۔ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ واقعی ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ گیا ہے۔ یہ کوئی بہت عرصہ پہلے کی بات نہیں تھی، صرف چار دن پہلے وہ میرے ساتھ تانگے پر بیٹھ کر خوشی خوشی لاہور جانے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ بات بات پر ہنستا تھا۔ آنکھوں میں شباب کی شوخی تھی۔ وہ دولہا بننے سے پہلے ہی دولہے جیسا نظر آتا تھا۔ اس کی ماں کا چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ اس تک یہ خبر پہنچے گی تو اس پر کیا بیتے گی؟ میں نے

سر ہاتھوں میں تھام لیا اور آنسو تواتر سے میری جھولی میں گرنے لگے۔ یہ آتشیں آنسو تھے۔ ان میں آگ تھی۔ تیزاب تھا۔ اگر باگو واقعی ان لوگوں کے ہاتھوں مر چکا تھا تو پھر انہیں بھی زندہ نہیں رہنا چاہئیے تھا۔ میرے دل سے آواز آئی۔ "خاور۔۔۔۔۔ ان کو مار دو یا خود بھی مر جاؤ۔"

نہ جانے میں کتنی دیر اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ تب اپنے بالکل پاس مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ پھر کھڑکی کے پاس تھی۔ نفرت سے بولی۔ "سوئے پڑے ہیں مرداروں کی طرح۔ اللہ کرے ان کو کسی کی آئی، آئے۔"

میں نے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔ "یہ تیرے دیور ہیں؟"

عورت نے ایک بار پھر ہراساں نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور بڑے دکھی انداز میں سر کو نفی میں ہلایا۔

"رشتے دار ہیں؟" میں نے پوچھا۔

عورت نے پھر نفی میں سر ہلایا اور دلدوز سرگوشی میں بولی۔

"ڈاکو ہیں۔۔۔۔۔موت جو گے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں، یہ پورے دو مہینے سے یہاں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ ہمیں جیتے جی مارا ہوا ہے انہوں نے۔ ہم کو ہمارے بچوں کو مارنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ بندہ دل کا مریج بن گیا ہے۔ نہ کسی کو بتا سکتا ہے، نہ کسی سے مدد مانگ سکتا ہے۔ آلے دوالے والوں کو یہی پتا ہے کہ ہمارے رشتے دار ہیں۔ کوئی رشتے دار آجائے تو کہنا پڑتا ہے کہ میرے بندے کے یار دوست ہیں۔" عورت کا لہجہ نم ناک ہو گیا۔ وہ ناک سے سُوں سُوں کی آواز نکالنے لگی۔

"کیا ان دو مہینوں میں تمہیں ایک موقع بھی نہیں ملا یہاں سے نکلنے کا؟"

"یہ بڑے خچر ہیں۔ ان کا ایک بندہ ہر وقت ہمارے سر پر رہتا ہے۔ اگر سر پر نہ بھی ہو تو۔۔۔۔ان کی دہشت اس طرح ہمارے اوپر بیٹھ گئی ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ویسے تو یہ بلائیں، خود ہی ٹل جائیں تو ٹل جائیں۔"

"تم بتا رہی ہو کہ اس وقت وہ مرداروں کی طرح سو رہے ہیں؟"

"پر اس وقت بھی ان کا ایک ساتھی گھر سے باہر والے کمرے میں ہے۔ وہ رات کو چوکیداری کرتا ہے۔"

عورت بتا رہی تھی اور ساتھ ساتھ بری طرح کانپ رہی تھی۔ اس نے باگو کے بارے میں ایک بار پھر وہی باتیں بتائیں جو پہلے بتائی تھیں۔ اس نے کچھ اور اہم انکشافات بھی کیے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ یہ کل پانچ بندے ہیں۔ ساہیوال کی جیل توڑ کر بھاگے ہوئے ہیں۔ تین بندے یہاں ہیں، دو نے اسی طرح کسی اور جگہ پناہ لے رکھی ہے۔ سرغنہ بارا ہے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے کئی قتل کیے ہوئے ہیں۔ ایک طوفانی رات میں یہ لوگ بلائے ناگہانی کی طرح ان کے گھر میں داخل ہوئے اور سب کو یرغمال بنا لیا۔ گھر چونکہ بالکل الگ تھلگ جگہ پر تھا اور گھر کے مالک کا ملنا جلنا بھی کم تھا، اس لیے ان ڈکیتوں کو یہاں ٹکے رہنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

عورت کا نام زینب تھا۔ اس نے اشک بار لہجے میں کہا۔ "انہوں نے مجھے اور میرے بندے کو یقین دلایا کہ وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے اور ہماری پوری عجت کریں گے۔ جیادہ دن یہاں رہیں گے بھی نہیں اور چلے جائیں گے۔ لیکن یہ ابھی تک نہیں گئے۔ ہر روج ہمیں یہ آس

ہوتی ہے کہ شاید آج یہ یہاں سے دفع ہو جائیں۔انہوں نے یہاں پر بڑا گند مچایا ہوا ہے۔تاش کھیلتے ہیں۔ایک دوجے کو گندی گالیاں نکالتے ہیں، نشہ کرتے ہیں اور۔۔۔۔اور۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"اور کیا؟"میں نے پوچھا۔

وہ ہمت کر کے بولی۔"وہ کُڑی تم نے دیکھی ہے نا جو دو تین بار تمہیں کھانا دے کر گئی ہے؟اس کا نام جمیلہ ہے۔اسے کالو کالو کہتے ہیں۔یتیم کڑی ہے۔گھر کے کام کاج میں میرا ہاتھ ونڈاتی (ہاتھ بٹاتی) ہے۔یہ۔۔۔۔سارے کتے۔۔۔۔اس کے ساتھ بُرا بھلا کرتے ہیں۔"آخری الفاظ عورت نے بہ مشکل ادا کیے اور آنسو گرانے لگی۔

میں حیران رہ گیا۔وہ لڑکی بیچاری بالکل معمولی شکل و صورت کی تھی۔ایک آنکھ میں تھوڑا سا نقص بھی تھا۔ جسم بھی بے ڈھنگا تھا۔عورت کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ ان لوگوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔کوئی نہ کوئی اسے کمرے میں لے کر گھسا رہتا ہے۔اب تک یہی غنیمت تھا کہ انہوں نے گھر کی مالکن زینب کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی تھی۔لیکن زینب کی باتوں میں

اندیشوں کی جھلک موجود تھی۔اسے بجا طور پر ڈر تھا کہ کسی وقت اس کی باری آسکتی ہے۔میاں بیوی خوف زدہ تھے۔خاص طور سے باگو والے واقعے کے بعد۔

"تم کسی طرح میری مدد کر سکتی ہو؟"میں نے سرگوشی کی۔

"میں کیا کر سکتی ہوں؟اگر انہیں کوئی شک ہو گیا تو وہ بُری طرح پیش آئیں گے۔ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"خطرے سے بچنے کے لیے تھوڑا بہت خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔"

اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے مجھے سرتاپا دیکھا اور بولی۔"میرا بندہ کہتا تھا تم جاگیر میں گھڑ سواروں کے سردار ہو۔اور۔۔۔۔لوگ تمہیں بڑا مانتے ہیں۔۔۔۔؟"

"سردار والی بات تو ٹھیک ہے لیکن اگر۔۔۔۔"

"اچھا میں چلتی ہوں۔"عورت ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔اسے داخلی دروازے کی طرف سے آہٹ سنائی دی تھی۔

اس کے اوجھل ہونے کے دو منٹ بعد فیقا اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ میں روٹی کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے دور ہی سے میرا جائزہ لیا اور کھانستا ہوا آگے نکل گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت طیش آتا تھا لیکن آج ضرورت سے زیادہ آیا۔ وہ میرے بھائی باگو کا قاتل تھا۔ اس کی گولی نے جان لی تھی باگو کی۔۔۔۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ باگو نہیں ہے۔

۔۔۔۔ یہ تین دن بعد کی بات ہے۔ میں کچی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور صحن میں امرودوں کے ایک بڑے ڈھیر کو دیکھ رہا تھا۔ یہ امرود کل باغ سے توڑے گئے تھے۔ میری شیو بڑھ چکی تھی۔ ٹخنے پر زنجیر کی مسلسل رگڑ سے زخم سا بن گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی جسم پر جلنے کے دو تین چھوٹے زخم ٹھیک نہیں ہو رہے تھے۔ یہاں مکھیاں بھی کافی تھیں۔ دروازہ کھلا اور بارا اندر داخل ہوا۔ اس خبیث کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں اس کے چہرے سے بالکل جدا تھیں۔ اس کے چہرے پر اچھا یا برا جو بھی تاثر ہوتا تھا، یہ آنکھیں اس سے بالکل علیحٰدہ رہتی تھیں۔ بارے کے ساتھ جلاد صفت فیقا بھی موجود تھا۔ بارے کے ہاتھ میں ایک سادہ کاغذ تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی میرے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر میرے سر کو دو تین بار کچی دیوار سے ٹکرایا اور دانت پیستے ہوئے بولا۔ "چل۔۔۔۔ اس کاغذ پر لکھ اپنے کرتوت۔ جو کچھ کیا ہے، سب کچھ لکھ اور نیچے انگوٹھا شنگوٹھا لگا اپنا۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟"

اس نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا۔ میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا۔ وہ پھنکارا۔ "جو تُو نے کیا ہے، وہ تجھے پتا ہے اور ہم کو بھی پتا ہے۔ لکھ۔۔۔۔ کہ تُو والی کی بی بی پر بُری نظر رکھتا تھا۔ تُو نے اس سے زبردستی کی کوشش بھی کی ہے۔ تو اپنی غلطی پر شرمندہ ہے اور معافی مانگتا ہے۔ اگر تجھے معاف کر دیا جائے اور جانے دیا جائے تو تُو کبھی اپنی منحوس شکل نہیں دکھائے گا اور یہ علاقہ ہی چھوڑ جائے گا۔ سب سے اوپر لکھ کہ تُو جو کچھ کہہ رہا ہے، خدا کو حاضر ناظر جان کر اپنی مرضی سے کہہ رہا ہے۔ چل لکھ۔۔۔۔"

بارے نے کاغذ قلم میرے سامنے پھینک دیا۔

"میں ایسا کچھ نہیں لکھوں گا۔" باگو کی موت نے میرے اندر عجیب سرکشی بھر دی تھی۔

"تیرے تو وڈے وڈیرے بھی لکھیں گے اور قبروں سے نکل نکل کر لکھیں گے۔" بارا پھنکارا۔اس کے ساتھ ہی اس نے فیقے کو اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ اسلم کو بھی اندر لے آئے۔

میں سمجھ گیا کہ وحشیانہ مارپیٹ کا سلسلہ پھر سے شروع ہونے لگا ہے۔ایک بار تو جی میں آئی کہ بارے پر جھپٹ پڑوں۔ لیکن پاؤں کی زنجیر نے مجھے بے بس کر رکھا تھا۔فیقا ابھی دروازے سے نکلا ہی تھا کہ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ عام طور پر فاضل ہی کھولتا تھا۔فاضل کی آواز سنائی دی۔اس کے بعد دو اور بھاری آوازیں سنائی دیں۔مجھے اندازہ ہوا کہ بارے کے باقی دو ساتھی آئے ہیں۔ بارا بھی مجھے خونی نظروں سے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔

میرا اندازہ درست تھا۔ بارے کے دونوں یار آئے تھے۔تاہم ان کے ساتھ ایک نسوانی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔یہ آواز کالو یا زینب کی ہرگز نہیں تھی۔یہ نئی آواز تھی۔ان دونوں افراد کے آنے سے مجھ پر سے فوری مصیبت ٹل گئی۔سفید کاغذ اور قلم وہیں ایک طرف کونے میں پڑے رہے۔

بارے کے ساتھیوں کے آنے کے بعد گھر میں بار بار قہقہوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔رات کا کھانا بھی اہتمام سے پکایا گیا۔ بُھنی ہوئی مرغیوں اور زردے کی خوشبو میرے قید خانے تک بھی پہنچ رہی تھی۔ میں کچھ دیر کے لیے سو گیا۔

کسی نے مجھے بلا کر جگایا۔یہ کالو تھی۔وہ سلاخ دار کھڑکی کے پار کھڑی تھی۔اس نے دو روٹیوں پر رکھا ہوا مرغی کا سالن، سلاخوں کے اندر سے مجھے پہنچایا اور اسی طرح زردے کی چھوٹی سی پوٹلی بھی پہنچا دی۔

"یہ عورت کون آئی ہے؟" میں نے کالو سے پوچھا۔

"پتا نہیں مجھے۔" وہ بے زاری سے بولی۔ بولتے ہوئے اس کے پیلے دانت ایک دم نمایاں ہو جاتے تھے۔

وہ چلی گئی تو میں اس کے لہجے کی بیزاری پر غور کرتا رہا۔اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ان شب و روز سے عاجز آئی ہوئی ہے۔اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ ایک عورت کا جسم رکھتی تھی۔رات کو دیر تک ہنسنے بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ شاید شراب کا دور بھی چل رہا تھا۔میری نگاہ بار بار کونے میں رکھے کاغذ قلم پر پڑتی تھی۔بہ ظاہر یہ لگتا تھا کہ بارا وغیرہ مجھ سے معافی نامہ لکھوا

کر مجھے یہاں سے بھگا دینا چاہتے ہیں لیکن معمولی سمجھ بوجھ والا شخص بھی جان سکتا تھا کہ عملی طور پر ایسا ممکن نہیں۔ خاص طور سے باگو کی موت کے بعد تو یہ ناممکن تھا۔اس چار دیواری میں میری زندگی کو شدید خطرہ لاحق تھا اور گھر کی مالکن زینب ٹھیک ہی کہتی تھی کہ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔

اگلے روز صبح سویرے زینب سے پھر میری ملاقات ہو گئی۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا۔وہ مجھے ناشتا دینے کے بہانے کھڑکی پر آئی۔ روٹی، مکھن اور شکر اس نے کھڑکی کے اندر پہنچائے اور محتاط نظروں سے ارد گرد دیکھنے لگی۔اس کا گھونگھٹ ہولے ہولے لرز رہا تھا اور یہ لرزش اس امر کی گواہ تھی کہ وہ خود بھی سر تا پا کانپ رہی ہے۔اس نے اپنی چادر کے اندر سے لوہے کی ایک پتری نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ یہ لوہا کاٹنے والا دندانے دار بلیڈ تھا۔ میں نے اسے بستر کے نیچے چھپا دیا۔ وہ ہیجانی انداز میں بولی۔ "کسی طرح یہاں سے نکل جاؤ۔اور ہو سکے تو ہم نصیب سڑوں کے لیے بھی کچھ کرو۔"

"رات کو یہاں کون آیا تھا؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"اسی بارے کے باقی دونوں یار تھے، موت جو گے۔ایک بیچاری کُڑی کو ساتھ لے کر آئے تھے۔"

"اب کہاں ہیں؟"

"دونوں یار تو سویرے سویرے دفع ہو گئے ہیں۔ وہ کُڑی یہیں پر ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ رات کو جو ہلا گلا ہو رہا تھا، اس کی نوعیت کیا تھی۔ جیل سے بھاگے ہوئے ڈکیتوں نے ایک لڑکی کو (یا شاید کالو سمیت دو کو) کھلونا بنا رکھا تھا۔یہی شرمناک ہلا گلا تھا جس کی وجہ سے آج زینب بھی زیادہ غصے اور دکھ میں نظر آ رہی تھی۔

ایکا ایکی میرا دھیان ماچھن رابعہ کی لڑکی کی طرف چلا گیا۔اس دن وہ بھاگی تھی اور ایک رائفل بردار نے اس پر فائر کیا تھا۔ بعد میں وہ لڑکی کے پیچھے فصل میں گھس گیا تھا۔ کہیں یہ وہی تو نہیں تھی؟

"تم نے اس کُڑی کو دیکھا ہے؟" میں نے زینب سے پوچھا۔

"ہاں، آس پاس کے کسی پنڈ کی ہے وچاری۔ زیادہ عمر بھی نہیں ہے غریبنی کی۔ ویسے بھی ماڑی (دبلی) سی ہے۔"

مجھے لڑکی کا سویٹر یاد تھا۔ میں نے کہا۔ "بھین! نیلے رنگ کا سویٹر تو نہیں پہنا ہوا اس نے؟"

زینب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "ہاں شاید۔۔۔۔۔ آسمانی رنگ کا سویٹر ہے۔ تت۔۔۔۔۔ تم اسے جانتے ہو؟"

میرے جسم میں درد کی لہر دوڑ گئی۔ "شاید جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

یکایک قدموں کی آواز آئی۔ جیسے کوئی ننگے پاؤں بھاگتا ہوا آ رہا ہے۔ ہم نے صحن کی طرف دیکھا، یہ چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی ڈیوڑھی کی طرف جا رہی تھی۔ پھر شاید وہ ڈیوڑھی میں پہنچ کر دروازے کو جھنجھوڑنے لگی۔ لیکن زینب نے بتایا تھا کہ لوہے کے دروازے کو تالا لگا ہوتا ہے۔ لڑکی باریک آواز میں چلانے لگی۔ "دروازہ کھولو۔۔۔۔۔ دروازہ کھولو۔ بچاؤ۔۔۔۔۔ مجھے بچاؤ۔"

وہ جانتی نہیں تھی، اس جگہ اس کی آواز کوئی نہیں سنے گا۔ زینب برآمدے کے شمالی کونے کی طرف کھسک گئی۔ چند ہی سیکنڈ بعد بارا کسی اندرونی کمرے سے نکلا اور بھاگتا ہوا صحن میں

پہنچا۔ غالباً وہ نیند سے اٹھا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک تہ بند تھا۔ اس کے سینے کے علاوہ اس کی توند بھی سیاہ بالوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ایک شرابی سانڈ کی طرح ڈگمگاتا ہوا وہ لڑکی کے پیچھے ڈیوڑھی میں پہنچا۔ لڑکی مزید زور سے چلانے لگی۔ چند سیکنڈ بعد بارا اس طرح کھڑکی کے سامنے سے گزرا کہ اس نے لڑکی کو پیچھے سے دبوچ کر اٹھایا ہوا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ پھر وہ اوجھل ہو گیا۔ میرے سینے میں ایک اور کچوکا لگا۔

میرے اندیشے کے عین مطابق یہ رابعہ کی بیٹی ہی تھی۔

میرے اندر نیلی آگ دہکنے لگی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا، لوگ بدمعاش اور قاتل کیسے بنتے ہیں؟ وحشی کیسے ہو جاتے ہیں؟ کیوں سب کچھ جانتے بوجھتے اپنے جیسے انسانوں کو جان سے مارتے ہیں اور پھانسی کے پھندے تک پہنچتے ہیں؟ آج مجھے ان سوالوں کے جواب مل رہے تھے۔ رات کو میں نے اپنے پاؤں کو اچھی طرح لحاف میں ڈھانپ لیا اور دیر تک لوہے کا بلیڈ زنجیر کے ایک حلقے پر چلاتا رہا۔۔۔۔۔ رات آخری پہر تک میں نے زنجیر کاٹ دی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دوپہر گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں چارپائی پر بیٹھا تھا۔ میرے سامنے بارا اور فیقا تھے۔ لمبوترے چہرے والا اسلم کھڑکی کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ سیون ایم ایم رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ رائفل پر کسی عریاں انگریز ایکٹرس کا اسٹیکر چسپاں تھا۔ جب بارا یا فیقا میرے کمرے میں آتے تھے۔۔۔۔ اسلم رائفل پکڑے کھڑکی کے سامنے موجود رہتا تھا۔ دوسری احتیاط یہ کی جاتی تھی کہ کمرے میں آنے والا مجھ سے ایک محفوظ دوری پر بیٹھتا تھا۔ بارے کے ہاتھ میں بید نما چھڑی تھی۔ اس نے چھڑی سے سادے کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آخری بار کہہ رہا ہوں انسانوں کی طرح لکھ دے۔"

"انسانوں کی طرح ہی کہہ رہا ہوں کہ نہیں لکھوں گا۔"

بارے کے چہرے پر غیض و غضب کی چنگاریاں چھوٹ گئیں۔ تاہم اس کی سرد آنکھیں، اس کیفیت سے لاتعلق رہیں۔ یہ گہری آنکھیں جیسے ہر وقت دعویٰ کرتی رہتی تھیں کہ وہ بہت دور تک دیکھتی ہیں۔ کچھ بھی ان سے اوجھل نہیں۔ لیکن آج شاید وہ غلط کہہ رہی

تھیں۔ میری زنجیر کا کٹا ہوا حلقہ ان آنکھوں سے اوجھل تھا۔ میرے پہلو میں زنجیر اپنی سالم حالت میں پڑی دکھائی دیتی تھی۔

بارے نے گالی بکتے ہوئے بید نما منحوس چھڑی فیقے کی طرف اچھالی جسے فیقے نے ہوا میں ہی دبوچ لیا۔ اور یہی وقت تھا۔۔۔۔ جب میں ایک عام شخص نہ رہا۔ ایک ہتھ چھٹ اور نڈر نوجوان سے آگے کا سفر ایک ہی جھٹکے میں طے کر کے میں حقیقی معنوں میں خطرناک اور خوں خوار ہو گیا۔ میں نے تیزی سے حرکت کی۔ دایاں بازو پورے کا پورا سلاخ دار کھڑکی میں سے نکالا اور اسلم کی رائفل کی نال پر گرفت کر لی۔ میرے جسم میں جتنی بھی طاقت اور تیزی تھی، وہ میں نے ساری کی ساری استعمال کی اور ایک طوفانی جھٹکے سے رائفل کو اپنی طرف کھینچا۔ اسلم شاید رائفل چھوڑ دیتا تو اس کے لیے اچھا ہوتا۔ لیکن اس نے نہیں چھوڑی۔ وہ جیسے اڑتا ہوا سا کھڑکی کی سلاخوں سے ٹکرایا۔ اس کے چہرے کا بھرتا بن گیا اور رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اندر کمرے میں موجود فیقا، توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح میری طرف آیا۔ میں نے رائفل کا دستہ گھما کر اس کے چہرے پر رسید کیا۔ وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ بارا کھڑا ہو چکا تھا اور کمرے کے آخری کونے میں تھا (اپنے تئیں وہ میری

زد سے باہر تھا)۔ میں نے دیکھا، اس کا ہاتھ پستول نکالنے کے لیے قمیص کے نیچے جا رہا ہے۔ میں نے جست لگائی اور اس کے اوپر گرا۔ ایک ہی لحظے میں وہ نیچے اور میں اوپر تھا۔ میں نے رائفل کو گھما کر سیدھا کیا اور اس کی نال بارے کی چربی دار گردن میں گھسا دی۔

"خبردار!" میں گرجا۔ "گولی مار دوں گا اسے۔"

میری آواز کمرے کے اندر چکرائی۔ فیقا جو اپنی لہولہان پیشانی کے ساتھ میری طرف بڑھنے کا سوچ رہا تھا، اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں تیز رفتار کاروائی کی وجہ سے پھٹی ہوئی تھیں۔ یہی وقت تھا جب میں نے اونچی لمبی زینب کو دیکھا۔ وہ جھپٹتی ہوئی اسلم کی طرف آئی۔ وہ کھڑکی سے باہر لہولہان پڑا تھا۔ زینب نے چلاتے ہوئے اس کے سر اور کندھوں پر کئی وار کیے۔ اس کے ہاتھ میں مرچیں کوٹنے والا ڈنڈا تھا۔ اسلم نیم جان ہو گیا۔ اتنے میں زینب کا خوف زدہ خاوند فاضل بھی لڑکھڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔۔۔۔۔ زینب کی ہلاشیری پر فاضل نے زینب کے ساتھ مل کر اسلم کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور ساتھ والے کمرے میں بند کر دیا۔ زینب کا سینہ دھونکنی طرح چل رہا تھا۔ اوڑھنی اس کے سر سے ڈھلک گئی تھی۔ وہ ایک مضبوط جسم والی قبول صورت دیہاتن تھی۔ میں نے بارے اور فیقے کے

پاؤں کے قریب زمین پر ایک ایک فائر کیا اور انہیں ایک کونے میں سمٹنے پر مجبور کر دیا۔ کشمکش کے دوران میں بارے کا 38 بور ریوالور اس کی قمیص کے نیچے سے نکل کر گر گیا تھا۔ میں نے ریوالور اٹھا لیا اور لوہا کاٹنے والا بلیڈ بھی بستر کے نیچے سے نکال کر الٹے پاؤں کمرے سے نکل آیا۔ اب بارا صاحب اور فیقا میری جگہ کمرے میں بند تھے اور میں ان کی جگہ باہر تھا۔ آہنی دروازے کو قفل لگ چکا تھا۔ یہ ساری کاروائی بہ مشکل دو تین منٹ میں مکمل ہو گئی تھی۔

صحن میں موجود بچوں نے گولیوں کی آواز سے چلانا شروع کر دیا تھا۔ کالو بھی ان کے ساتھ شریک تھی۔ زینب بچوں کو سنبھالنے کے لیے صحن کے شمالی کنارے کی طرف چلی گئی۔ فاضل تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اپنی بیوی کی نسبت وہ کافی کمزور دل تھا۔ اس کی حالت اس شخص کی سی تھی جس نے کُشتی میں پہلوان کو گرا تو لیا تھا مگر سخت ڈرا ہوا بھی تھا۔۔۔۔ کہ جلد ہی پہلوان اس کے نیچے سے نکل آئے گا اور بدلہ لے گا۔

میں نے ایک طرف لے جا کر فاضل کو تسلی دی اور اسے سمجھایا کہ وہ ہمت کرے، اب یہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔

"مگران کے ساتھی بھی تو ہیں۔" فاضل کراہا۔

"ان حرامیوں کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ میں جس طرح کہتا ہوں تم اس طرح کرتے جاؤ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں جی، بتائیں کیا کروں؟"

"تم فوراً مراد پور پہنچو۔ وہاں سے تیمور تومی کا گھر پوچھ لینا۔ تیمور کو بتاؤ کہ وہ دو تین بندوں کو لے کر فوراً یہاں پہنچے۔ لیکن تیمور کے علاوہ اس بات کا کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلنا چاہیئے۔ اگر تیمور کا پتا نہ چل سکے تو کرامت ترکھان یا فراست علی میں سے کسی کو یہاں لے آؤ۔ انہیں میرا نام شاہ خاور بتانا۔"

فاضل نے کہا۔ "میں آپ کے بارے میں تھوڑا تھوڑا پہلے بھی جانتا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے جلدی سے گھوڑا پکڑو اور نکل جاؤ۔ میرا خیال ہے، ایک گھنٹے کے اندر تمہاری واپسی ہو جائے گی۔ اور ایک بار پھر کہہ رہا ہوں۔۔۔۔ کسی پولیس والے کو یا کسی بھی دوسرے بندے کو بتانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ تیمور وغیرہ سے بھی بس اتنی ہی بات کرنی ہے جتنی میں بتا رہا ہوں۔"

فاضل نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیر کر اثبات میں سر ہلایا۔ کمرے کے اندر بارا گالیاں بک رہا تھا اور دروازے پر دھڑا دھڑ ٹھوکریں برسا رہا تھا۔ لیکن یہ لوہے کا مضبوط دروازہ تھا۔ اگر مضبوط نہ ہوتا تو بارا مجھے یہاں بند ہی نہ کرتا۔

"کہیں یہ نکل ہی نہ آئیں۔" فاضل کے چہرے پر خوف لہرایا۔

"ان کا باپ بھی نہیں نکل سکتا۔ تم ان کی فکر چھوڑو۔ بس تم پہنچو مراد پور۔"

"اپنی گھر والی اور بچوں کو بھی یہاں سے نکال نہ لوں؟"

فاضل نے پوچھا۔

ایک لحظے کے لیے میں نے سوچا کہ اسے یہ کرنے دوں لیکن پھر فوراً ہی دوسرا خیال آیا۔ فاضل بہت ڈرا ہوا تھا۔ اس بات کا روشن امکان تھا کہ وہ یہاں سے نکلے اور واپس پلٹ کر نہ دیکھے۔ "نہیں، فاضل ان کو یہیں رہنے دو۔ یہ بالکل حفاظت سے ہیں۔"

فاضل گھوڑے پر سوار ہو کر نکل گیا۔ میں نے داخلی دروازے کو اندر سے پھر تالا لگا دیا۔ دوسرے کمرے میں جا کر میں نے زخمی اسلم کو دیکھا۔ اس کے چہرے اور سر پر گہری

چوٹیں آئی تھیں۔ وہ نیم بے ہوشی میں تھا اور گہرے سانس لے رہا تھا۔ میرے دل میں باگو کے قاتلوں کے لیے رحم کی کوئی رمق نہیں تھی اور اسلم بھی ان میں شامل تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ نقدی سگریٹ اور چاقو کے علاوہ اس کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا بھی نکلا۔ اس گچھے میں ایک چابی میرے کام کی تھی۔ زنجیر کا ٹکڑا ابھی تک میرے پاؤں کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ میں نے مطلوبہ چابی سے وہ فولادی قفل کھول دیا جس نے زنجیر کو میری پنڈلی سے منسلک کر رکھا تھا۔

"خدا کے لیے بچاؤ۔۔۔۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو۔"

یہ آواز اس لڑکی کی تھی جو یہاں پرسوں رات سے بارے اور اس کے ساتھیوں کے رحم و کرم پر تھی۔ میں اس کمرے میں پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک کونے میں سمٹ گئی۔ لیکن پھر دھیان سے دیکھنے کے بعد اس نے مجھے پہچان لیا۔ اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر پھٹی پرانی اوڑھنی رکھی۔ کمرے کے کچے فرش پر شراب کی خالی بوتلیں، بوتلوں کے ڈھکن، سگریٹ کے ٹکڑے اور مرغی کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ قریب ہی وہ اکلوتی چارپائی تھی جو یقیناً اس نوعمر لڑکی کے لیے کانٹوں کی سیج بنی رہی تھی۔ یہاں ایک

پڑچھتی پر مجھے لپ اسٹک، کریم اور کاجل وغیرہ بھی نظر آئے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ چیزیں بارا وغیرہ کالو کو قدرے خوش نما بنانے کے لیے استعمال کراتے تھے۔

میں روتی سسکتی لڑکی کو لے کر باہر آیا اور اسے زینب کے حوالے کیا جو اپنے دیگر بچوں کو مرغی کی طرح اپنے پروں میں سمیٹے بیٹھی تھی۔ زینب کی بلند ہمتی نے مجھے متاثر کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آتشی آنسو تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ان کو مار دو۔ ان کتوں کے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے کر کے ان کو نہر میں چلا دو۔"

"حوصلہ رکھ بھین! ایسا ہی ہو گا ان کے ساتھ۔" میں نے بھی زہرناک لہجے میں کہا۔

میرے دل میں اب بھی ہلکی سی امید تھی کہ شاید باگو کے ساتھ وہ کچھ نہ ہوا ہو جو زینب نے بتایا ہے۔ شاید زینب کو کوئی دھوکا ہوا ہو۔۔۔۔ یا پھر کالو یا بچوں نے اسے کوئی غلط اطلاع دی ہو۔ لیکن جب میں نے زینب اور کالو کو بچوں سے علیحدہ کر کے اس بارے میں تفصیلاً پوچھا تو یہ موہوم امید بھی دم توڑ گئی۔

کالو نے سر تا پا کانپتے ہوئے بتایا۔ "میں نے اپنی انکھیوں سے دیکھا ہے جی۔ وہ مر گیا تھا۔ انہوں نے اس کے کپڑے اتار کر ایک بورے میں بند کیا۔ بورے میں ایک وزنی لوہا بھی ڈالا پھر اسے ریڑھے پر لد کر رات کے وقت لے گئے۔"

زینب نے اشک بار لہجے میں کہا۔ "اس وچارے کی گرگابی اور کپڑے میں نے بھی ایک دن دیکھے تھے۔ گچھا مچھا ہوئے ایک مجی کے نیچے پڑے تھے۔"

میں نے ماچھن رابعہ کی لڑکی سے بھی دو چار سوال پوچھے۔ اس نے کہا۔ "مجھے گولی نہیں لگی تھی، پر میں ایک کھال میں گر گئی تھی۔ مجھے اس بندوق والے نے پکڑ لیا۔"

"تمہاری ماں اور باقی بہن بھائی؟"

"مجھے ان کا کچھ پتا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کو ان لوگوں نے کچھ نہیں کہا۔ بس مجھے ایک ریڑھے پر ڈالا اور اوپر ایک ترپال ڈال کر وہاں لے گئے۔"

"کہاں؟"

"اس دوسرے مکان میں جہاں نم کے درخت تھے۔" لڑکی نے سسکی لے کر کہا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ یہاں آنے سے پہلے یہ لڑکی بارے کے ان دو ساتھیوں کے پاس رہی تھی جو کسی دوسری جگہ پناہ لیے ہوئے تھے۔ بعد میں وہ اسے بارے وغیرہ کے پاس لے آئے تھے۔

بارے کا نام دو تین دن سے مسلسل میرے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ میں نے یہ نام پہلے بھی کہیں سنا ہوا ہے۔ یہ یاد نہیں آرہا تھا کب اور کہاں؟ بس یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کسی اچھے حوالے سے نہیں، بُرے حوالے سے سنا ہوا ہے۔ شاید کوئی سنگین واردات تھی جس کا تذکرہ اخباروں میں آیا تھا۔

بارا بند کمرے کے اندر مسلسل گرج برس رہا تھا لیکن میں نے اس کی آوازوں پر مطلق دھیان نہیں دیا۔ میں صحن میں تھا تاہم سلاخ دار کھڑکی میں سے ان دونوں کی نقل و حرکت مجھے صاف نظر آرہی تھی۔ میری توقع کے مطابق قریباً ایک گھنٹے میں فاضل واپس آگیا۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت اطمینان ہوا کہ تیمور، کرامت اور رضوان نام کا ایک لڑکا فاضل کے ساتھ تھے۔

تیمور بھاگ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ "یارا! کہاں چلا گیا تھا تُو؟ تیرے لیے کہاں کہاں بھاگتے رہے ہیں۔ کس کس سے جھگڑے کیے ہیں۔ اور یہ کیا حالت بنالی ہے تُونے؟ کیا ہوا ہے تیرے ساتھ؟

میں نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"باگو تمہارے ساتھ ہی ہے نا؟"

"ہاں۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔اور رابعہ اور اس کے بچے؟"

"وہ گاؤں میں ہیں۔ رابعہ دن رات رو رہی ہے اپنی لڑکی کے لیے۔" فقرہ ختم کر کے تیمور نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"لڑکی یہیں پر ہے۔ فکر کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔

اگلے دو چار منٹ میں، میں نے بہت سی باتیں تیمور کے گوش گزار کر دیں۔ وہ بے حد حیرت کے عالم میں سنتا رہا۔ میرے ورم زدہ پاؤں اور جسم پر جلنے کے نشانات نے اسے بہت دکھی کیا۔ میں نے اسے فوری طور پر باگو کی موت کا نہیں بتایا۔ بس یہ کہا کہ وہ لاپتا ہے۔ بارے اور

فیقے وغیرہ پر تیمور بھی تھوڑا سا چونکا۔ اس نے سلاخ دار کھڑکی کے سامنے جا کر بارے اور فیقے کو دیکھا پھر ایک دم اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور سراسیمہ آواز میں بولا۔ "خاور! میرا خیال ہے میں نے ان دونوں کو پہچان لیا ہے۔ ان میں سے چوڑے بوتھے والے کی تو شاید تصویر بھی میں نے اخبار میں دیکھی ہوئی ہے۔ یار! یہ نامی گرامی ڈکیت ہیں۔ ان کے سر پر کوئی انعام شنام بھی رکھا ہوا ہے۔ بڑی وارداتیں ہیں ان کے کھاتے میں۔ سال ڈیڑھ سال پہلے انہوں نے لالہ موسیٰ کے ایک سیاسی بندے اور اس کے ساتھیوں کو دن دیہاڑے گولیوں سے چھانی کیا تھا۔۔۔۔یہ وہی ہیں۔

میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ تیمور کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے چودھری صاحب کے ذریعے پُلس کو اطلاع دینی چاہئیے۔۔۔۔" تیمور کہہ رہا تھا۔

وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا مگر میرے کان کچھ سن نہیں رہے تھے۔ میرے کانوں میں بس ہنستی مسکراتی آواز آ رہی تھی۔ وہ پورے 24 سال کی عمر میں شادی سے چند ہی دنوں پہلے قتل ہو گیا تھا۔ اسے قتل کرنے والے میرے سامنے تھے۔۔۔۔اور ان میں سے ایک

قاتل۔۔۔۔۔بلکہ بڑا قاتل وہاں راجوال میں بیٹھا تھا۔اس کا نام چودھری عزیز تھا۔۔۔۔۔میرے ذہن میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ وہی اس سارے منصوبے کا "شاہ دماغ" ہے۔۔۔۔۔اور مجھے آج پتا چل رہا تھا کہ میرے جیسے عام لوگ حالات کی زد میں آنے کے بعد بے رحم، سفاک اور خونی کیسے بنتے ہیں۔ میں آج خود کو ایک بدلا ہوا شخص محسوس کر رہا تھا۔ مجھ میں مرنے اور جان سے مار دینے کی بے پناہ ہمت پیدا ہو چکی تھی۔

ہاں، تیمور بول رہا تھا لیکن مجھے بس اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں پکارا۔ "میں آ رہا ہوں چودھری عزیز۔۔۔۔۔سب سے پہلے میں تیری گردن پکڑوں گا۔۔۔۔۔میں آ رہا ہوں۔۔۔۔۔"

تیمور اور رضوان کے پاس رائفلیں موجود تھیں۔ میں نے تیمور کو ایک طرف لے جا کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔"" تیمور! تم یہیں ان تین کتوں کی نگرانی کرو۔ میں کرامت کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"کہاں؟" تیمور نے پوچھا۔

"چودھری عزیز کی طرف۔" "میں آج اس سے ہر حساب چکا دینا چاہتا ہوں۔"

تیمور کے چہرے پر بھی جوش لہرایا۔اسے بھی پورا یقین تھا کہ میرے اور باگو کے ساتھ یہاں جو کچھ ہوا ہے اس کا اصل ذمے دار چودھری عزیز ہی ہے۔ لیکن میری اس بات سے تیمور نے اتفاق نہیں کیا کہ میں چودھری عزیز کو یہاں لانے کے لیے اس کی طرف جاؤں۔ اس کی نگاہ بار بار میرے سوجے ہوئے زخمی پیروں کی طرف اٹھ رہی تھی۔

وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "خاور! میں اس حالت میں تم کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ اگر چودھری کی گردن پکڑ کر اسے یہاں لانے کا ارادہ ہے تو پھر یہ کام میں کروں گا۔ اور میرا خیال ہے میں یہ کام آسانی سے کر بھی سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

وہ دبے دبے جوش سے بولا۔ "مجھے اندازہ ہے کہ چودھری عزیز اس وقت کہاں ہو گا۔ وہ خبیث راجوال میں نہیں ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ نہر پار کے موضع خراس پور میں آیا ہوا ہے۔ یہاں کے پٹواری سے اسے کوئی کام ہے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ رات بھی خراس پور میں ہی رہا ہے۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"وہی جو ہمیں کرنا چاہیئے۔آج کسی وقت اس نے واپس راجوال روانہ ہونا ہے۔میں اور کرامت اس کو راستے میں چھاپ لیں گے اور گردن سے گھسیٹتے ہوئے یہاں لے آئیں گے۔" تیمور کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"لیکن۔۔۔۔۔"

"لیکن کچھ نہیں۔اس معاملے میں ایک لفظ نہ بولنا۔تمہاری حالت ایسی نہیں کہ یہاں سے نکل سکو۔تم اور رضوان یہیں رہو اور بارے وغیرہ کی نگرانی کرو۔ہم اس حرامی کو زندہ یا مردہ یہاں لے کر آتے ہیں۔"

میں جانتا تھا کہ یہ ایک خطرناک کام ہے۔میں اس کے لیے تیمور کو بھیجنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

ابھی ہم کسی فیصلے پر نہیں پہنچے تھے کہ حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔۔۔۔۔اور یہ پلٹا بالکل غیر متوقع تھا۔ہمارے گمان میں ہرگز نہیں تھا کہ ایسا کچھ ہو جائے گا۔گھر کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔میں نے فاضل کو دیکھنے کے لیے بھیجا۔فاضل کی واپسی دو تین منٹ

بعد ہوئی۔اس کے چہرے پر ہلچل نظر آرہی تھی۔وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا۔"ان کا ساتھی آیا ہے۔"اس کا اشارہ بارے وغیرہ کی طرف تھا۔

"جو پرسوں آئے تھے،ان میں سے ہے؟"میں نے پوچھا۔

"نہیں جی۔"فاضل نے نفی میں سر ہلایا۔"یہ کوئی اور ہے۔ایک بار پہلے بھی بارے کو بلانے آیا تھا۔"

"اب کیا کہہ رہا ہے؟"

"یہی کہ بارا جی سے ملنا ہے۔۔۔۔۔میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو کہیں پیچھے کھڑا ہے۔یہ بارے کو اس کے پاس لے جانا چاہتا ہے۔"

"تم نے کیا کہا ہے بارے کے بارے میں؟"

"کچھ نہیں۔میں نے کہا میں ابھی سو کر اٹھا ہوں۔دیکھ کر بتاتا ہوں کہ بارا صاحب ہیں یا نہیں۔"

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے فاضل کا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ "تم ایک کام کرو۔ جا کر اسے بتاؤ کہ بارا کہیں باہر نکلا ہوا ہے۔ باقی دونوں کے بارے میں بتاؤ کہ شراب پی کر بے سدھ پڑے ہوئے ہیں۔ بس ان کا ایک چوتھا ساتھی ہے، وہ آسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے جی۔"

میں نے فاضل کو پوری تفصیل سمجھا کر باہر بھیج دیا۔ دو منٹ بعد فاضل نے آکر بتایا کہ وہ مان گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو بھی ہے، اسے بھیج دو۔ میں نے اس بارے میں تیمور سے مشورہ کیا اور رضوان کو باہر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے رضوان کو سمجھا دیا کہ وہ بارے کے ساتھی کے طور پر باہر جا رہا ہے۔

رضوان اپنی رائفل کو چادر کے نیچے چھپا کر باہر نکل گیا تو میں نے بھی اپنا منہ سر چادر میں لپیٹا اور رضوان کے پیچھے ہی پیچھے باہر آگیا۔ تیمور نے بھی میری تقلید کی۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ باغ کے درختوں کے نیچے دھوپ کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں تھیں۔ سورج مغربی افق کی طرف جھکتا جا رہا تھا اور ہوا میں خنکی تھی۔ رضوان ایک شخص کے ساتھ باغ کے جنوبی کنارے کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ یہ شخص دراز قد تھا اور اُس نے دھوتی کُرتہ پہن رکھا

تھا۔ حالانکہ میں نے ابھی تک اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اسے دیکھا ہوا ہے۔ اس شخص نے بھی چادر لپیٹ رکھی تھی اور چادر کے نیچے چھوٹی نالی والی رائفل کی موجودگی کا اندازہ ہوتا تھا۔

باغ سے نکل کر رضوان اور دراز قد شخص خودرو جھاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ جھاڑیوں میں تقریباً دو سو قدم طے کرنے کے بعد وہ ایک نشیبی راستے پر رک گئے۔ یہاں ایک گاڑی موجود تھی۔ گاڑی کو دیکھ کر میرا خون رگوں میں اچھل گیا۔ یہ گاڑی میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ وہی لینڈ روور تھی جو والی جی کے استعمال میں رہی تھی اور اب ان کے بعد چودھری عزیز کے پاس آگئی تھی۔

چادر کے نیچے 38 بور کے ریوالور پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ تیمور بھی میرے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔ ہم خودرو جھاڑیوں میں دبکے لینڈ روور کی طرف دیکھتے رہے۔

"کیا خیال ہے۔۔۔۔۔اس میں چودھری عزیز ہو گا؟" تیمور نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

"لگتا تو یہی ہے۔" میں نے جوابی سرگوشی کی۔

"میرا خیال ہے ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئیے۔" تیمور نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی۔ ہم جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے تیزی سے جیپ کی طرف بڑھے۔ یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس میں صرف ایک فرد موجود ہے۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور غالب امکان تھا کہ وہ چودھری عزیز خود ہے۔ جیپ سے فاصلہ جب پندرہ بیس قدم رہ گیا تو میں جھاڑیوں سے نکل کر تیزی سے جھپٹا اور دراز قد شخص کے سر پر پہنچ گیا۔ "خبردار! گولی مار دوں گا۔" میں نے ریوالور دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ پلک جھپکتے میں رضوان نے بھی چادر کے نیچے سے چھوٹی نال والی رائفل نکال لی اور اس کا رُخ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کے سینے کی طرف کر دیا۔

یہ چودھری عزیز ہی تھا۔ میں نے اس کے چربی دار چہرے پر گہرا زرد رنگ پھیلتے دیکھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پہلے رضوان کو اور پھر مجھے دیکھا۔ چادر کے منڈاسے میں سے بس میری آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔

"کون ہو۔۔۔۔۔ تم؟" چودھری عزیز ہکلایا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تمہاری موت۔" میں نے اسے گردن سے پکڑ کر بُری طرح جھنجھوڑا اور دروازہ کھول کر جیپ کے اندر بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں رضوان نے دراز قد شخص کی پیٹھ پر زوردار لات رسید کی اور رائفل کے زور پر اسے بھی جیپ کے اندر پہنچا دیا۔ تیمور پچھلا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ "چلو گاڑی چلاؤ۔" میں نے ریوالور کی نال چودھری عزیز کی گردن میں گھسیڑتے ہوئے خطرناک لہجے میں کہا۔

چودھری عزیز نے میری آواز پہچان لی۔ اس کے ساتھ اسے لہجے کی بے حد خطرناکی کا اندازہ بھی ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اسی جگہ، اسی ڈرائیونگ سیٹ پر اسی وقت سچ مچ اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

چند منٹ بعد لینڈ روور جیپ باغبان فاضل کے کشادہ گھر کے اندر پہنچ چکی تھی اور رضوان وغیرہ پھاٹک نما آہنی دروازہ اندر سے بند کر چکے تھے۔ چودھری عزیز اور اس کے دراز قد ساتھی کو جیپ سے نکالا گیا۔ دراز قد شخص کو میں اب اچھی طرح پہچان چکا تھا۔ یہ حویلی میں چودھری عزیز کا قریبی ساتھی انورا تھا۔ انورے کی رائفل پہلے ہی لے لی گئی تھی۔ میں نے چودھری عزیز کی اچھی طرح تلاشی لی۔ اس نے اپنے کڑھائی دار کُرتے کے نیچے باقاعدہ

ہولسٹر لگایا ہوا تھا اور اس میں پستول موجود تھا۔ ہولسٹر اس کی کمر سے کھول لیا گیا۔ جیپ میں ایک چمڑے کا تھیلا بھی تھا جس میں کاغذات وغیرہ تھے۔ انورے نے حقِ نمک ادا کرتے ہوئے ذرا بڑبڑانے کی کوشش کی تو کرامت اور تیمور نے اسے خوب ٹھاپیں لگائیں اور گوبر آلود زمین پر گرادیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں مزید لڑائی سے منع کیا۔ وہ انورے کو شلوار کے نیفے سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اسی کمرے میں لے گئے جہاں زخمی اسلم کو بند کیا گیا تھا۔ اسلم کو وہاں سے نکال کر انورے کو وہاں تاڑ دیا گیا۔

زخمی اسلم کو دیکھ کر چودھری عزیز کے چہرے پر برستی ہوئی حیرت کچھ اور گہری ہوگئی۔ میں نے اب چادر کا منڈاسا اتار دیا تھا۔ چودھری خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

"مجھے کیوں لائے ہو یہاں؟"

میں نے اطمینان سے کہا۔ "تجھے ہم نہیں لائے چودھری! تیری تقدیر تجھے گھیر کر لے آئی ہے۔"

"مم۔۔۔۔میں سمجھا نہیں۔"

"لیکن ہم سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ تو نے فاضل کے گھر کا رُخ کر لیا۔ تُو جاننا چاہتا تھا کہ ابھی بارے نے ہماری لاشوں کے ٹوٹے کر کے نہر میں چلائے ہیں یا نہیں۔ یہی جاننا چاہتا تھا نا؟" میں نے کھڑے کھڑے زوردار لات چودھری کے سینے پر رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر جیپ کی سائیڈ سے جا ٹکرایا۔ اس کی اونچے شملے والی پگڑی گوبر میں جا گری۔

چودھری عزیز نے سنبھل کر کہا۔ "تم اس معاملے کو بہت خراب کر رہے ہو، تمہیں بُری طرح پچھتانا پڑے گا۔"

"اب پچھتانے کی باری تیری ہے چودھری۔ ہم نے جو بھی جھیلنا تھا جھیل لیا ہے۔۔۔۔اور تُو نے ان ڈکیتوں کے ذریعے جو کچھ کرانا تھا کرا لیا ہے۔"

"مجھے تمہاری باتوں کی کچھ سمجھ نہیں آرہی۔ میں یہاں صرف اسلم اور رفیقے سے ملنے آیا تھا۔ مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ تم بھی یہاں ہو۔"

"ابھی تیری سمجھ میں سب کچھ آ جائے گا۔ایک ایک چیز کھل جائے گی تیرے سامنے۔"میں نے دانت پیسے اور ریوالور کی نال ایک بار پھر چودھری کی چربی دار گردن میں گھسیڑی۔

تیمور نے زخمی اسلم کو بارے اور فیقے کے ساتھ ہی کمرے میں بند کر دیا تھا۔۔۔۔اور اب میری طرف آ رہا تھا۔اس کے ہاتھ میں وہ گرگابی اور خون آلود کپڑے تھے جو چند روز پہلے بارے وغیرہ نے باگو کے جسم سے اتارے تھے۔ تیمور کے چہرے پر اندیشوں کے گہرے سائے لہرانے لگے تھے۔اس نے کانپتی آواز میں کہا۔"خاور! یہ چیزیں ادھر پڑی ہوئی تھیں، چھوٹے کمرے میں۔۔۔۔یار! مجھے لگتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔باگو ٹھیک تو ہے نا؟"

میں تیمور کو ایک طرف لے گیا۔میری آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے تھے۔ تیمور کے گلے سے لگ کر میں نے اسے باگو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔یہ تیمور کے لیے بھی ایک جانکاہ صدمہ تھا۔اس کی آنکھیں گہری سرخ ہو گئیں اور پورا جسم طیش کی شدت سے لرزنے لگا۔رائفل پر اس کی گرفت نہایت سخت ہو گئی تھی۔اس نے میری طرف دیکھا۔آنکھوں

آنکھوں میں جیسے اس نے کہا۔۔۔۔باگو کے قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑنا۔میں نے بھی خاموشی کی زبان میں جواب دیا۔۔۔۔ہاں، نہیں چھوڑیں گے زندہ۔ تیمور کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم دونوں چھوٹے کمرے میں چودھری عزیز کے گن مین انورے کے سامنے موجود تھے۔انورا کچے فرش پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تیمور رائفل بہ دست اس کے سر پر کھڑا تھا۔پہلے تو انورے نے بھی چودھری عزیز کی طرح کوئی بھی بات ماننے سے انکار کیا مگر پھر ہمارے تاثرات دیکھنے کے بعد اور تیمور کے ہاتھوں تھوڑی سی مار کھانے کے بعد وہ سمجھ گیا کہ صورتِ حال اس کی توقع سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

میں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑا اور اس کے خون آلود چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔"""دیکھ انورے! اگر اس چار دیواری سے زندہ نکلنا چاہتا ہے اور پھر اپنے بال بچے کی شکل دیکھنا چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ تعاون کر۔ جیسے عدالت کے اندر چلنے والے کیسوں کے اندر ایک سلطانی گواہ ہوتا ہے، تُو بھی سلطانی گواہ بن جا۔جو کچھ بھی عزیز نے کیا ہے وہ صاف صاف بتا دے۔"

"میرا کوئی قصور نہیں شاہ خاور صاحب! آپ کو تو پتا ہے میں حکم کا بندہ ہوں۔۔۔۔۔ پہلے والی جی کا حکم مانتا تھا، اب چودھری کا مانتا ہوں۔"

"اسی لیے تو تیری جان بخشی کی بات کر رہے ہیں۔" تیمور نے خوفناک لہجے میں کہا۔ "چل، شروع ہو جا فٹافٹ۔" اس کے ساتھ ہی تیمور نے اسے رائفل سے بے رحم ٹھوکا دیا۔

تھوڑے سے توقف کے بعد انورے نے اعترافی لہجے میں بتایا۔ "یہ بات ٹھیک ہے کہ بارے اور فیقے کو چودھری عزیز نے ہی آپ پر ہاتھ ڈالنے کے لیے کہا
تھا۔۔۔۔ لل۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "جہاں تک مجھے پتا ہے جی۔۔۔۔ چودھری نے کسی کو جان سے مارنے کا نہیں کہا تھا۔ چچ۔۔۔۔ چودھری چاہتا تھا کہ آپ کو مارا جائے۔۔۔۔ بے شک ایک آدھ ہڈی توڑ دی جائے۔ اس کے بعد آپ سے معافی نامہ لکھوایا جائے اور سادے کاغذ پر دستخط وغیرہ کرائے جائیں۔ پھر آپ کو مجبور کیا جائے کہ آپ علاقہ چھوڑ جائیں اور کبھی اپنی صورت نہ دکھائیں۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔۔۔۔۔" تیمور نے رائفل کے بیرل سے انورے کے سر پر زوردار ضرب لگائی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا۔

انورے نے کراہتے ہوئے کہا۔ "مم۔۔۔۔ میں وہی بتا رہا ہوں جو کچھ مجھے پتا ہے۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ باگو کے مرنے کے بعد۔۔۔۔ بارے وغیرہ نے ارادہ بدل دیا ہو۔ پر پہلے ان کا پروگرام یہی تھا۔"

اگلے دس منٹ میں انورے نے "سلطانی گواہ" کے طور پر جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔۔۔۔ چودھری عزیز کو پتا چلا تھا کہ بارا ساہیوال کی جیل توڑ کر بھاگا ہوا ہے اور اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ خراس پور کے آس پاس چھپا ہوا ہے۔ بارے کے ساتھ چودھری کی پرانی جان پہچان تھی۔ اس نے انورے کے ذریعے بارے سے رابطہ کیا اور اس کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ مجھے مراد پور سے اٹھائے اور اپنے ٹھکانے پر لے آئے۔ وہ میری ہڈی پسلی تڑوا کر مجھے یہاں سے ہمیشہ کے لیے بھگا دینا چاہتا تھا۔۔۔۔ یقیناً اس میں مجھے قتل کر دیئے جانے کا امکان بھی موجود تھا۔ حالات ایسے ہوئے کہ بارے کو میرے ساتھ ساتھ باگو کو بھی اٹھانا پڑا۔ بعد ازاں باگو پر فائر کیا گیا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگ گئی۔ وہ درد سے تڑپتا رہا۔ بارے

اور فیقے کی منتیں کرتا رہا کہ وہ اسے اسپتال لے جائیں لیکن ان بے رحموں نے اسی کمرے میں اسے افیم کھلا کر چاقو وغیرہ سے اس کی چیر پھاڑ کی۔ بعد میں چوبیس گھنٹوں کے لیے اسے تڑپنے اور سسکنے کے لیے چھوڑ دیا۔اسی کمرے کے کچے فرش پر وہ جواں سال ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔اس کی لاش بوری میں ڈال کر اور وزن باندھ کر نہر میں پھینک دی گئی۔۔۔۔انورے نے اپنی گفتگو میں اس جگہ کی نشاندہی بھی کی جہاں لاش نہر برد کی گئی تھی۔ باگو کی موت کے بعد بارے اور فیقے نے مجھے قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔۔۔۔گن مین انورے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بارے کے اس ارادے میں چودھری عزیز شریک تھا یا نہیں۔

"آج تم یہاں کیسے آئے تھے؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے انورے سے پوچھا۔

"دراصل جی، ہم نہر پار کے گاؤں خراس پور میں آئے ہوئے تھے۔چودھری نے پٹواری شفیع سے اپنی زمینوں کی کچھ فردیں نکلوانی تھیں۔یہ کام کرانے کے بعد چودھری نے بارے اور فیقے سے ملنے کا سوچا۔میرے خیال میں وہ یہاں کے حالات جاننا چاہتا تھا کیونکہ چار پانچ

دن سے اسے یہاں کی کچھ خبر نہیں تھی۔اس نے جیپ پیچھے کھڑی کر دی اور مجھے بارے کو بلانے کے لیے یہاں بھیج دیا۔۔۔۔"

انورے سے پوچھ تاچھ کرنے کے بعد ہم دونوں بدنصیب لڑکی مہناز اور فاضل کی نوکرانی کالو کے پاس پہنچے۔میں نے دونوں لڑکیوں سے علٰیحدہ علٰیحدہ بات کی۔دونوں نے رو رو کر اپنے اوپر ہونے والے ستم کی کہانی سنائی۔اس کہانی کی تفصیل میں جائے بغیر ہی سب کچھ سمجھا جا سکتا ہے۔کالو کے جسم پر کئی نیل تھے۔وہ لوگ اسے زبردستی شراب بھی پلاتے رہے تھے۔اسی طرح ماچھن کی نوعمر لڑکی مہناز کے دبلے پتلے جسم پر بھی درندگی کے نشانات تھے۔جیل سے بھاگے ہوئے ان ڈکیتوں نے اسے پلاسٹک کی گڑیا کی طرح توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔میں نے ڈری سہمی مہناز کا سر چوما اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔مجھے یوں لگا جیسے اس کی بربادی کی ذمے داری مجھ پر بھی آتی ہے۔میری ہی وجہ سے تو وہ ان کتوں کے ہتھے چڑھی تھی۔ہاں، آج میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ میرے جیسے عام لوگ قاتل کیسے بنتے ہیں۔میرے اندر مہناز اور کالو اور باگو کے مجرموں کے خون کی پیاس بڑھتی جا رہی تھی۔

تیمور کے بعد اب مجھے بھی بارے کے متعلق کافی کچھ یاد آرہا تھا۔ یہ بندہ نامی گرامی مجرم تھا اوراس کے سر وغیرہ کی قیمت بھی مقرر ہوئی تھی۔ غالباً علاقہ غیر سے بھی اس کا تعلق رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی اچھی طرح پتا تھا کہ اگر ان لوگوں کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا تو پھر ان کے زندہ بچ جانے کے امکان بھی پیدا ہو جائیں گے۔۔۔۔ اور مجھے یہ کسی صورت قبول نہیں تھا۔ میرا تو دل چاہتا تھا کہ ان کو مہناز اور کالو کے سامنے کھڑا کر دوں اور وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے گولیاں ماریں۔ مگر ان بے چاریوں میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ وہ تو ان کی شکلیں دیکھ کر ہی پیلی ہو جاتی تھیں۔

شام کے سائے اب تیزی سے پھیل رہے تھے۔ سورج مغربی جھاڑیوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ باغ میں پرندوں کی پُر شور چہکار شروع ہو گئی تھی۔ اس باغ سے آگے اور خودرو جھاڑیوں سے پرے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ محمد فاضل کے اس الگ تھلگ مکان میں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

شام ہوتے ہی زینب، اس کے بچے، فاضل، مہناز اور کالو وغیرہ صحن کے شمالی کنارے پر اپنے کمرے میں بند ہو گئے۔ میں، تیمور اور کرامت اس کمرے میں آ گئے جہاں بارے، فیقے اور

اسلم کے ہاتھ بڑی مضبوطی سے پشت پر باندھے جا چکے تھے۔ فیقا کچھ زیادہ ہی تن فن دکھا رہا تھا اس لیے کرامت نے اس کے پاؤں بھی سن کی رسی میں جکڑ دیے تھے۔ اب وہ تینوں قیدیوں کی طرح کمرے کی کچی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ چودھری عزیز کو میں نے تماشے کے لیے سلاخ دار کھڑکی کے پاس بٹھا دیا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کسی بھی طرح کی مزاحمت کر سکتا۔ بارے اور اس کے ساتھیوں نے ہمارے چہروں پر اپنی موت کی پرچھائیاں دیکھ لی تھیں، اس لیے وہ بے حد مضطرب نظر آرہے تھے۔ بارا کبھی دھمکیاں دینے لگتا، کبھی مفاہمت کی باتیں کرنے لگتا۔ ہاتھ بندھوانے سے پہلے اس نے سخت مزاحمت کی تھی اور اس کے جسم پر کئی چوٹیں آئی تھیں۔

فیقے نے منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے کہا۔ "اگر ہمیں کچھ ہوا نا۔۔۔۔ تو ہمارے ساتھی تمہاری پوری نسل ختم کر دیں گے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی مار ڈالیں گے۔"

بارے نے اسے خاموش رہنے کو کہا اور دھیمے مگر کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دیکھو، جو کچھ بھی ہوا ہے ہم اس کے لیے ہرجانہ دینے کو تیار ہیں۔ تم جتنی رقم مانگو گے، ہم دے دیں گے۔"

تیمور نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "پچاس پچاس لاکھ دو گے دونوں لڑکیوں کو اور ایک کروڑ باگو کے وارثوں کو؟"

"اگر تم مہلت دو گے تو شاید اتنے بھی دے دیں گے۔"

"مگر مسئلہ تو یہی ہے کہ تم چاروں کے پاس مہلت نہیں ہے۔ تمہارا دانہ پانی پورا ہو چکا ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

میں نے تین کی بجائے چار کی بات کی تھی۔ چودھری عزیز کا ہلدی رنگ کچھ اور بھی ہلدی ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر آواز اس کے گلے میں ہی کھڑکھڑا کر رہ گئی۔

مفاہمت کے چند جملے بولنے کے بعد بارا ایک بار پھر طیش میں آ گیا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ اس نے گندی گالیاں دیں اور اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ کرامت نے اس کے سر پر رائفل کے بٹ مار کر اسے پھر کچے فرش پر بٹھا دیا۔

میرے اندر عجیب سی سفاکی پروان چڑھ رہی تھی۔ میں نے بارے کا 38 بور ریوالور نکال لیا۔ اس میں چھ گولیاں تھیں۔ میں نے چار نکال لیں۔۔۔۔ اور ریوالور تیمور کی طرف بڑھا دیا۔

"لو بھئی تیمور! تم نے چرخی گھما کر چھ فائر کرنے ہیں اس پر۔ اگر بچ گیا تو ٹھیک ہے۔۔۔۔ چھوڑ دیں گے حرامی کو۔"

بارے کا رنگ زرد ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ یہ تمہارا ہی بتایا ہوا کھیل ہے۔"

تیمور، فیقے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میرا تو خیال ہے، اس کی طرف سے شروع کریں۔ اس کو کچھ زیادہ ہی جلدی ہے دوسری طرف جانے کی۔"

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ اگلے تین چار منٹ بے حد سنسنی خیز اور خوفناک تھے۔ ان کی خوفناکی بس وہی شخص محسوس کر سکتا تھا جو ریوالور کے سامنے تھا۔ جتنی بار تیمور نے ٹرائیگر دبایا، فیقا اتنی ہی بار مرا اور زندہ ہوا۔ اور وہ یقیناً اس سے بھی بُرے سلوک کا مستحق تھا۔ بے پناہ دہشت کے سبب اس کے جسم کا سارا خون نچڑ چکا تھا اور سر تا پا شدید لرزے کی زد میں تھا۔ چیمبر دو گولیوں کے ساتھ چھ فائر کا تناسب بے حد سنگین تھا۔ فیقے کے بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے۔ وہ چار فائر تک تو بچا رہا لیکن جب تیمور نے چرخی گھما کر پانچویں بار ٹرائیگر دبایا تو ایک دھماکے سے گولی فیقے کی بائیں کنپٹی میں گھس گئی۔ اس کے سر

نے زوردار جھٹکا کھایا اور وہ بیٹھا بیٹھا۔۔۔۔ریت کی بوری کی طرح دائیں طرف لڑھک گیا۔اس کی کنپٹی سے نکلنے والا خون تیزی سے کچے فرش پر پھیلنے اور جذب ہونے لگا۔

بارے نے ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔کرامت نے پھر اس کے سر پر رائفل کے بٹ مارے اور زمین بوس کر دیا۔اس کے سر سے خون رسنے لگا تھا۔

فیقے کے بعد اسلم کی باری آئی۔فیقے کے خون اُگلے جسم نے اسے موت سے پہلے ہی آدھا مار دیا تھا۔اس کے زخمی ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔اس بار ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔اب پھر اس میں دو گولیاں تھیں اور مجھے چرخی گھما کر فائر کرنا تھا۔قدرت کی طرف سے اسلم پر مہربانی ہوئی۔اسے زیادہ دیر موت اور زندگی کے درمیان نہیں ٹکنا پڑا۔میں نے دوسری بار ٹرائیگر دبایا تھا کہ ریوالور بول اٹھا۔دھماکے کے ساتھ شعلہ نکلا اور 38 بور کی وزنی گولی اسلم کے سر میں اتر گئی۔

اسلم کے خونچکاں جسم کو فرش پر لڑھکتے دیکھ کر بارے نے دیوانوں کی طرح چلانا شروع کر دیا۔وہ سمجھ گیا تھا کہ اب اس کی باری ہے اور یہ بڑی سنگین "باریاں" تھیں۔چیمبر میں دو گولیوں کے ساتھ چھ فائر صاف صاف موت کا سندیسہ تھے۔کرامت نے بارے کے سر پر

رائفل کا دستہ مارنا چاہا۔اس نے سر جھکا کر کرامت کے سینے پر ٹکر رسید کی اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔اس کے ساتھ ہی وہ چلایا۔

"بچاؤ۔۔۔۔۔بچاؤ۔۔۔۔۔"

میں نے عقب سے اس کی گردن دبوچ لی اور پھنکارتے ہوئے کہا۔"اگر یہاں باگو اور دونوں کڑیوں کی آواز کسی نے نہیں سنی تھی تو تیری بھی کوئی نہیں سنے گا۔"

بارے کے بدبودار جسم میں کسی جنگلی سانڈ کی سی طاقت تھی۔اس نے تیمور کے پیٹ میں لات رسید کی اور مچھلی کی طرح تڑپ کر خود کو خود کو مجھ سے چھڑانا چاہا۔ہم اوپر نیچے چارپائی پر گرے اور چارپائی کا بازو ایک کڑاکے سے ٹوٹ گیا۔اس دوران میں چودھری عزیز نے بھی دروازے کی طرف بڑھنا چاہا تھا مگر کرامت نے رائفل کی نال اس کے عین دل کے مقام پر رکھ کر اسے ایک دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

یکایک مجھے احساس ہوا کہ بارے کے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھلنے والے ہیں۔رسی کی بندش ڈھیلی ہو چکی تھی۔اب مزید خطرہ مول لینا مناسب نہیں تھا۔میں نے خود سے برسر پیکار بارے کے جبڑے کے نیچے ریوالور رکھا اور اوپر تلے تین دفعہ ٹرائیگر دبا دیا۔گولی بارے

کاتالو چیرتی ہوئی اس کے دماغ میں گھس گئی۔ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی شدید مزاحمت ختم ہوگئی اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔اس کی گردن کے سوراخ سے بہنے والا گرم خون میرے ہاتھ کی پشت پر گر رہا تھا۔

چودھری عزیز نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور دیوانگی کے عالم میں چلا رہا تھا۔"میں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔ مجھے جانے دو۔"اس کی آواز میں خوف آمیز طیش کی بلند لہریں تھیں۔

مجھ پر درندگی سوار ہو رہی تھی۔میرے اشارے پر کرامت اور تیمور نے رضوان کے ساتھ مل کر چودھری عزیز کے ہاتھ پشت پر باندھے اور اسے ایک پَر کٹی مرغی کی طرح کمرے کے کونے میں پھینک دیا۔چودھری کے چہرے پر موت کی گہری زردی کھنڈ گئی تھی۔وہ سمجھ گیا تھا کہ اب اس کی باری ہے۔اس نے ایک بار پھر دہشت سے بگڑی ہوئی آواز میں دہائی دی کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔

میں نے کہا۔"بے شک تم نے خود کچھ نہیں کیا۔لیکن سب کچھ کرانے والے تم ہی ہو۔تیرے حکم پر میں چپ چاپ حویلی سے نکل آیا لیکن تیری دشمنی نے پھر بھی میرا پیچھا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

نہیں چھوڑا۔ باگو کی جان گئی۔دو لڑکیوں کی عزت برباد ہوئی اور ابھی تیرے ان ہرکاروں نے مجھے بھی قبر میں پہنچانا تھا۔دیکھ میرے پنڈے کو۔۔۔۔اس میں جتنے پھٹ لگے ہیں وہ تیرے ہی لگائے ہوئے ہیں اور دل پر جو پھٹ تیری کمینگی نے لگائے ہیں،ان کا کوئی حساب ہی نہیں۔"

میں نے موڑھے پر بیٹھ کر بڑے اطمینان سے پھر دو گولیاں ریوالور کے چیمبر میں ڈال لیں۔۔۔۔فرش پر پڑی تین لاشوں نے ماحول کو سنگین تر کر رکھا تھا۔چودھری عزیز ایک دبنگ شخص تھا مگر یقینی موت کو روبرو دیکھ کر اس کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی تھی۔وہ گھگیایا۔"شاہ خاور! میں نے کچھ نہیں کیا۔میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ہاں۔۔۔۔مم۔۔۔۔میں اپنا اتنا قصور مانتا ہوں۔میں نے بارے سے کہا تھا کہ ۔۔۔۔وہ تمہیں ڈرا دھمکا کر یہاں سے نکال دے۔۔۔۔"

"ڈرا دھمکا کر نکال نہیں دے،مجھے ہر طرح ذلیل و خوار کرے۔میری ماں بہن کو بھی اس چار دیواری میں لائے اور پھر ہم سب کو عبرت ناک موت کا مزہ چکھائے۔"میں نے کہا اور ایک زوردار ٹھوکر چودھری عزیز کی پسلیوں میں رسید کی۔

وہ بھنبھیے کی طرح ڈکرایا اور بار بار نفی میں سر ہلانے لگا۔

"مم۔۔۔۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا اور۔۔۔۔۔ بارے نے اپنی مرضی چلائی ہے۔ پھر بھی۔۔۔۔۔ میں تم سے۔۔۔۔۔ معافی مانگتا ہوں۔ تم جو کہو، میں کرنے کو تیار ہوں۔ اگر تم کہتے ہو تو میں سب کچھ چھوڑ کر چلا جاتا ہوں۔ میں کہیں کنارہ کر لیتا ہوں۔"

"باگو نے بھی جان بچانے کے لیے ایسے ہی منت ترلے کیے تھے لیکن تم لوگوں نے اسے معاف نہیں کیا۔ مجھے بھی کسی نے معاف نہیں کرنا تھا۔ اسی کمرے میں تڑپا تڑپا کر مار دینا تھا۔" میں نے چرخی گھما کر ریوالور چودھری کی طرف سیدھا کر دیا۔

چودھری کی آواز اس کے گلے میں پھنسنے لگی۔ پتا نہیں وہ کیا بول رہا تھا۔ میں نے ٹرائیگر پر انگلی رکھی۔ "دیکھ چودھری عزیز! میں تجھے قتل نہیں کر رہا۔ میں تو تیرا فیصلہ تقدیر پر چھوڑ رہا ہوں۔ ریوالور کے چار خانے تو خالی ہیں اور یہی کھیل اس سے پہلے میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔"

لگتا تھا، چودھری عزیز بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ وہ شراب کی لاتعداد بوتلوں اور عورتوں کو اپنے منہ سے لگا چکا تھا۔ ان عیاشیوں نے اسے اندر سے کھوکھلا کر رکھا

تھا۔۔۔۔ ان لمحوں میں وہ جان بچانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ جیب سے نکلنے والا چودھری عزیز کا بریف کیس سامنے ٹوٹی ہوئی چارپائی پر رکھا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"اس بریف کیس میں کیا ہے؟"

"فف۔۔۔۔۔ فردیں ہیں۔" وہ بہ مشکل بول پایا۔

میں نے کرامت سے کہا۔ "یار! ادھر لاؤ ذرا۔۔۔۔۔ دیکھیں چودھری کی فردیں۔"

کرامت نے رائفل نیچے رکھی اور بریف کیس میرے سامنے لا کر کھول دیا۔ پٹوار خانے میں لکھی ہوئی سات آٹھ فردیں دیگر کاغذات کے اوپر ہی نظر آ رہی تھیں۔

"یہ کون کون سی زمین ہے چودھری صاحب؟" میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

اس نے تھوک نگل کر خود کو بہ مشکل بولنے کے قابل کیا اور دو تین موضعات کے نام گنوائے۔ اس کی آواز خوف کے سبب اتنی بگڑ چکی تھی کہ بہ مشکل سمجھ میں آتی تھی۔ پھر اس نے کراہتے ہوئے کچھ کہا۔

سارے الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن اتنا پتا چل گیا کہ وہ "لیٹرین" میں جانا چاہ رہا ہے۔

میں نے کرامت اور رضوان کو اشارہ کیا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ کھولے اور اسے سہارا دے کر اس لیٹرین میں لے گئے جو پچھلے کئی دن سے میرے استعمال میں تھی۔

چودھری کی واپسی آٹھ دس منٹ بعد ہوئی۔ اس کا رنگ بدستور ہلدی تھا۔ ان لمحوں میں وہ کچھ بھی ماننے کو تیار تھا۔ چودھری کی غیر موجودگی میں، میں نے سرسری انداز میں فردیں دیکھ لی تھیں۔ یہ راجوال کے گردونواح میں تقریباً چودہ مربعے زمین تھی۔ ان میں سے کچھ زمین شام پور اور کچھ نکووال کے ساتھ لگتی تھی۔ یہ ساری فردیں چودھری عزیز کے اپنے نام سے تھیں۔

ریوالور بدستور میرے ہاتھ میں تھا اور تین عدد خون آلود لاشیں کمرے کے فرش پر خوفناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "چودھری! اگر جان بچانی ہے تو پھر ایک سودا کرنا پڑے گا۔۔۔۔"

"مجھے منظور ہے۔" اس نے میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

زینب تینوں ڈاکوؤں کی لاشیں دیکھ کر بالکل نہیں ڈری بلکہ اس کی آنکھوں میں عجیب سی طمانیت ابھر آئی۔ برآمدے میں جا کر اس نے اپنے چھوٹے سے گھونگٹ کی اوٹ سے مجھے مخاطب کیا اور کہا۔ "بھراوا! تُو نے ہمارے کلیجے ٹھنڈے کر دیے ہیں۔ اگر پلس کے سامنے بیان دینے کی لوڑ ہے تو میں دوں گی۔ تم یہ پستول مجھے دے دو۔ میں پلس کو بتاؤں گی کہ میں نے ان کتوں کو مارا ہے۔ انہوں نے میری بچیوں کو برباد کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میری بھین! اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ان تینوں کو مار کر ہم نے قانون توڑا نہیں ہے، قانون کی مدد کی ہے۔"

"ان کے باقی دو ساتھیوں کا کیا بنا ہے؟" فاضل نے پوچھا۔

"ہم نے ان کے ٹھکانے کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پولیس ان کے ٹھکانے تک پہنچنے والی ہو گی۔"

اس کے بعد میں نے زینب، فاضل، کالو اور مہناز کو ایک جگہ بٹھایا اور انہیں بتایا کہ انہیں پولیس کے سامنے کیا بیان دینا ہے اور کس طرح دینا ہے۔ اس سارے واقعے میں، میں نے صرف دو تبدیلیاں کی تھیں۔ پہلی یہ کہ زینب اور فاضل وغیرہ کو بتایا تھا کہ بارا اور اس کے دونوں ساتھی دوطرفہ فائرنگ کے دوران میں ہلاک ہوئے ہیں۔ دوسرے اس سارے واقعے میں سے چودھری عزیز اور اس کے گن مین کا ذکر حذف کر دیا تھا۔ ویسے بھی زینب اور فاضل وغیرہ چودھری عزیز کے نام سے واقف نہیں تھے۔

"چودھری کا کیا کرنا ہے؟" تیمور نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"اسے جیپ میں بٹھاؤ اور اس کے گن مین کو بھی۔ ہم ان دونوں کو دو چار دن کے لیے مہمان بنائیں گے۔"

"کہاں؟"

"ڈسکے میں۔ میرے خیال میں تیرے جگری یار کے ٹو کا گھر ٹھیک رہے گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

"لیکن یہاں احاطے میں سے جیپ کے ٹائروں وغیرہ کے نشان ختم کرنے ہوں گے۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔" تیمور نے کہا۔

میں نے چودھری عزیز اور گن مین انورے کو جیپ میں ہی ڈسکے روانہ کر دیا۔ میں خود فاضل کے گھر میں ہی رک گیا۔ پولیس پہنچنے والی تھی اور مجھے بہت سارے سوالوں کے جواب دینے تھے۔ میں یہ جواب اپنے ذہن میں ترتیب دینے لگا۔ پولیس کی آمد سے پہلے میں نے کمرے اور برآمدے کی دیواروں پر اسلم کی اسٹکر والی بندوق سے کئی فائر کیے۔ اس کے علاوہ بھی موقعے پر کئی ایک تبدیلیاں کیں۔ ان تبدیلیوں سے اس بیان کو تقویت ملتی تھی کہ تینوں ڈاکو دوطرفہ فائرنگ میں مرے ہیں۔

پولیس کی آمد کے بعد اور تفتیش سے فارغ ہونے کے بعد ہم نہر پر جا سکتے تھے اور بارے کی بتائی ہوئی جگہ پر باگو کی لاش تلاش کر سکتے تھے۔۔۔۔ باگو کو لاش کہتے ہوئے سینے پر تیر سا لگتا تھا اور دل خون کے آنسو بہانے لگتا تھا۔ جب وہ میرے ساتھ تانگے پر سوار ہونے کے لیے

نکلا تھا تو وہاں ڈھولک بج رہی تھی۔اب بہت جلد اس گھر میں ماتم کی صدائیں گونجنے والی تھیں۔

اس سے آگے کے واقعات تفصیل سے بیان کروں گا تو یہ روداد بہت طویل ہو جائے گی۔میرے بچپن کے ساتھ باگو کی مسخ شدہ لاش نہر میں سے نکال لی گئی۔۔۔۔۔اور پوسٹ مارٹم کے بعد اگلے روز شام کو دفن کر دی گئی۔ تین مفرور ڈاکوؤں کی موت کو علاقے میں بہت سراہا گیا اور مقامی انتظامیہ کی طرف سے بھی اطمینان کا اظہار کیا گیا۔بارے کے باقی دونوں ساتھی بھی گرفتار ہوئے۔ان کا تعلق خوشاب کے دیہی علاقے سے تھا۔ان میں سے ایک کو پہلے ہی پھانسی کی سزا ہو چکی تھی۔دو ایس ایس پی صاحبان نے اسپیشل طور پر مراد پور آ کر مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے ملاقات کی اور وقوعے کی تفصیلات حاصل
کیں۔میرے خیال میں پولیس افسران کو کہیں کہیں شک بھی تھا کہ کہانی تبدیل کی گئی ہے۔لیکن تین خطرناک مجرموں کی موت اتنی اہم کامیابی تھی کہ ان چھوٹے موٹے شکوک کو نظر انداز کر دیا گیا۔پورے علاقے میں ان واقعات نے تہلکہ سا مچا دیا تھا۔میرا اور تیمور کا نام ایک بار پھر ابھر کر سامنے آیا تھا۔

ایک طرف تو یہ صورتِ حال تھی،دوسری طرف چودھری عزیز اور گن مین انوار اہمارے پاس ڈسکے میں موجود تھے۔ہم نے انہیں کے ٹو کے گھر میں رکھا ہوا تھا۔چودھری عزیز بے دام کا غلام بنا ہوا تھا۔ہر بات بنا چون وچرا مان رہا تھا۔ڈسکے پہنچتے ہی اس نے پسرور میں اپنے چھوٹے بھائی احسان کو فون کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ وہ بالکل خیر خیریت سے ہے۔اسے ایک ضروری کام سے فوری طور پر لاہور جانا پڑ گیا ہے۔چار پانچ روز لگ سکتے ہیں۔وہ راجوال جا کر اس بات کی اطلاع دے دے۔

اب اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ راجوال میں بے چینی پھیلے گی اور بیگم بلقیس یا دوسرے لوگ چودھری کی تلاش شروع کروا دیں گے۔ساجا کے ٹو پراپرٹی ڈیلنگ بھی کرتا رہا تھا اور کاغذ وغیرہ بنوانے کے کام میں تجربہ رکھتا تھا۔میں نے اسے ساری فردیں وغیرہ دکھادیں اور اس سے کہا۔"اس زمین کے کاغذات لکھواؤ۔"

"تین چار لاکھ کے تو صرف اسٹامپ پیپر لگیں گے۔" کے ٹو نے اطلاع دی۔

"کوئی بات نہیں،انتظام ہو جائے گا۔"

"بیع نامہ کس کے نام لکھوانا ہے؟"

"بیگم بلقیس کے نام۔"

کے ٹو نے ہونٹ سکوڑ کر میری طرف دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولا۔"ان کا شناختی کارڈ یا فوٹو اسٹیٹ وغیرہ ہے؟"

"ہاں، مل جائے گا۔"

کے ٹو کو ساری بات سمجھانے کے بعد اب مجھے پیسے کا انتظام کرنا تھا۔ چودھری عزیز کے چرمی بیگ میں سے تیس پینتیس ہزار روپے نکلے تھے لیکن مجھے زیادہ کی ضرورت تھی۔ تیمور نے پوچھا۔

"باقی پیسے کہاں سے آئیں گے؟"

"چودھری عزیز سے آئیں گے اور کہاں سے آئیں گے۔ اس کے بیگ میں پسرور کے بینک کی چیک بک موجود ہے۔۔۔۔اور اللہ کے فضل سے بینک میں پیسے بھی ہیں۔"

"یہ چیک پر دستخط کر دے گا؟"

"اس نے دستخط کر دیے ہیں۔۔۔۔اور ایک چیک پر نہیں، پوری چیک بک پر کر دیئے ہیں۔"

"یار! تم نے تو اسے مرید بنا لیا ہے۔" تیمور نے کہا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو، وہ میرا نہیں اس کا مرید ہے۔" میں نے ہولسٹر میں لگے 38 بور کے وزنی ریوالور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پیر جی کو سلام۔" تیمور نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر ریوالور کو سلام کیا۔

کے ٹو کے گھر میں اگلے سات آٹھ روز کے اندر سارے کام ہماری پلاننگ کے مطابق ہوئے۔ اسٹامپ پیپر مل گئے اور کے ٹو نے ایک وثیقہ نویس سے چھ عدد رجسٹریاں لکھوا لیں۔ میں نے ان رجسٹریوں پر چودھری عزیز کے سائن، انگوٹھے کروائے اور کاغذات کو محفوظ کر لیا۔ ان رجسٹریوں کی وجہ سے چودھری عزیز کی زمینوں کا قریباً چالیس فیصد حصہ اس کی دسترس سے نکل گیا۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا مگر یہ اس طریقے سے ہوا کہ کئی موقعوں پر خود مجھے بھی حیرت ہوئی۔ سچ کہتے ہیں کہ موت کو بہت قریب سے دیکھنا بڑے دل

گردے کا کام ہوتا ہے۔ اور ایسے نظارے بہت سے لوگوں کو جڑوں کی گہرائی سے ہلا دیتے ہیں۔

میرے جسم پر جلنے کے زخم بہ تدریج مندمل ہو رہے تھے۔ پاؤں کا ورم بھی اب ٹھیک تھا۔ بارے اور اس کے ساتھیوں کی موت کی خبر اخباروں میں چھپی تھی۔ پولیس نے وقوعہ اس طرح بنایا تھا کہ اس میں ان کی اپنی کارکردگی بھی شامل ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود میری کارکردگی بھی واضح طور پر نظر آتی تھی۔ جاگیر اور ارد گرد کے علاقے کے لوگ پہلے ہی مجھ سے متاثر تھے، اس واقعے کے بعد اور بھی متاثر ہوئے تھے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے کسی سے غرض نہیں تھی۔ میری سوچ کا ہر رستہ تو صرف اور صرف بیگم بلقیس کی طرف جاتا تھا۔ اگر وہ متاثر نہیں تھیں تو پھر میں اپنی اس کارکردگی پر جتنا بھی خوش ہوتا، کم تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ ان تک یہ ساری خبریں کس انداز میں پہنچی ہیں۔۔۔۔۔ اور پہنچی بھی ہیں یا نہیں؟

"کس سوچ میں کھوئے ہو؟" تیمور نے مجھے ٹہوکا دیا۔

ہم دونوں کے ٹو کے گھر کی بیٹھک میں موجود تھے۔ چودھری عزیز اور گن مین انور ساتھ والے کمرے میں مقفل تھے۔ یہ رات کا وقت تھا۔

"سوچ رہا ہوں۔۔۔۔۔ کہ اب کیا سوچنا چاہیئے۔" میں نے دیوار سے ٹیک لگا کر نیا سگریٹ سلگایا۔

"میرے خیال میں تو حویلی کو اور بیگم بلقیس کو اس وقت تمہاری سخت ضرورت ہے۔ اگر تم اس ذمے داری سے پیچھے ہٹو گے تو یہ سخت ناانصافی ہو گی۔ اور تم جانتے ہو، تمہارے لیے والی جی کا آخری حکم بھی یہی تھا۔"

"لیکن میرے وہاں جانے میں بھی تو کوئی مسئلے ہوں گے۔ بہت سے لوگ بہت سی باتیں بنائیں گے۔"

"باتیں بنانے والوں کو گولا مارو۔ باتیں بنانے والے اب بھی کون سا چپ ہیں۔ وہ باتیں بنا ہی رہے ہیں لیکن ایک بات میری سمجھ میں بڑی اچھی طرح آ رہی ہے۔ چودھری عزیز کو ہم جتنا بھی نیچے لگا لیں، حویلی واپس پہنچ کر اس میں تھوڑا بہت ڈِنگ (ٹیڑھا پن) آ ہی جانا ہے۔ اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ حویلی سے دور رہ کر حویلی کے معاملوں کو کنٹرول کر لو گے تو یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔"

"چودھری عزیز کی طرف سے تو اب مجھے بہت زیادہ ڈر نہیں ہے۔ اس کا کافی سارا زہر ہم نے نکال لیا ہے۔"

"یار! بات صرف چودھری ہی کی نہیں، اس کے دو درجن رشتے دار تو حویلی کے اندر ہی موجود ہیں۔ نکووال میں بھی اس کے رشتے دار زمینداروں کا زور ہے۔ یہ لوگ بیگم بلقیس کو کسی صورت ان کا حق نہیں دیں گے۔ اور تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ انہوں نے زبردست جوڑ توڑ شروع کیا ہوا ہے۔"

جو باتیں تیمور کہہ رہا تھا، وہ میرے اپنے دل میں بھی تھیں۔ حقیقت یہی تھی کہ بیگم بلقیس اور حامد کو کسی افسوس ناک حادثے سے بچانے کے لیے میرا راجوال واپس جانا ضروری ہو گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میں خود بھی بیگم بلقیس کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ حالات مجھے پوری طاقت سے واپس راجوال کی طرف دھکیل رہے تھے۔ راجوال جہاں میں نے پہلی بار محبت کا چہرہ دیکھا تھا۔ جہاں میرے لہو میں ترنگ پیدا ہوئی تھی۔ جہاں بال و پر میں پرواز کی خواہش جاگی تھی۔ وہاں کی اوس میں بھیگی ہوئی صبحیں، سنہری دوپہریں اور

سرد چاندنی راتیں، میری حسین ترین یادوں سے سجی ہوئی تھیں۔ میں خود تو وہاں سے آ گیا تھا لیکن میرا دل وہیں تھا اور اس نے ہمیشہ وہیں رہنا تھا۔ دل کے بغیر انسان کس کام کا؟

اس رات میں نے چودھری عزیز کے ساتھ سب کچھ طے کر لیا۔ میں نے کہا۔ "چودھری! اب تک میرے اور تیرے درمیان جو کچھ ہوا ہے، وہ ہماری لڑائی کا حصہ تھا۔۔۔۔۔ لیکن میں آج سے یہ لڑائی ختم کر رہا ہوں اور تیرے قصور معاف کر رہا ہوں۔ میں نے جو کچھ تجھ سے حاصل کیا ہے، اس میں سے صرف باگو کا خون بہا لوں گا۔ بس چھ سات ایکڑ زمین۔۔۔۔۔ جو اس کے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بھائی کی کفالت کرے گی۔ باقی سب کچھ تمہارے ہی پاس رہے گا۔"

چودھری عزیز نے پوری آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ "لیکن تم تو رجسٹری کرا رہے ہو؟"

"رجسٹری کرا رہا ہوں، زمین اٹھا کر تو نہیں لے جا رہا۔ یہ رجسٹریاں بس اس بات کی ضمانت کے طور پر میرے پاس رہیں گی کہ تم ہمارے ساتھ ٹھیک چلتے رہو گے۔ تم نے دو

سادے اسٹامپ پیپروں پر بھی دستخط کیے ہیں۔ان پیپروں سے بھی تمہیں کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔بس شرط یہی ہے کہ تمہیں شرافت سے چلنا ہوگا۔"

"بار بار یہ مت دہراؤ۔میں نے کہہ دیا ہے، تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"چودھری عزیز نے مرے مرے بے جان لہجے میں کہا۔

"تو پھر تمہیں بھی ہم سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔نہ تمہاری عزت میں فرق آئے گا،نہ تمہاری آمدن میں کوئی کمی ہو گی۔فرق صرف اتنا ہو گا کہ حویلی میں بیگم بلقیس کا حکم چلے گا۔بہر حال،اس کام میں بھی تمہارے اچھے مشورے قبول کیے جائیں گے۔"

"میں حویلی میں رہوں گا یا حویلی سے باہر؟"

"اس کی کوئی پابندی نہیں۔تم جہاں چاہو رہ سکتے ہو۔پر شرط وہی ہے، کسی بھی طرح بیگم بلقیس اور ان کے بچے کی حق تلفی نہیں ہونی چاہیئے۔یہ بات ذہن میں رکھو چودھری عزیز! میں دشمنوں کا بدترین دشمن ہوں اور دوستوں کا بہترین دوست۔"

"تم نے کہا ہے کہ میری عزت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔۔۔۔لیکن اس کے لیے تمہیں میرا پردہ رکھنا پڑے گا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں چودھری۔بے فکر رہو، حویلی میں بیگم بلقیس کو یا کسی دوسرے کو یہاں ہونے والے واقعے کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلے گا۔کم از کم میں اپنی اور اپنے چاروں ساتھیوں کی طرف سے تو پوری گارنٹی دیتا ہوں۔اگر حویلی میں کسی اور طرح سے یہ بات نکل جائے تو میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔"

آدھ پون گھنٹے کی بات چیت میں میرے اور چودھری کے درمیان تقریباً سارے معاملات طے ہو گئے۔حویلی پہنچ کر چودھری کو رضاکارانہ طور پر پیچھے ہٹ جانا تھا اور جاگیر کا کرتا دھرتا بیگم بلقیس کو بنانا تھا۔بدلے میں مجھے یہ کرنا تھا کہ بارے اور فیقے وغیرہ کے معاملے میں کسی بھی طرح چودھری عزیز کا نام نہ آئے۔چودھری نے وعدہ کیا کہ وہ جاگیر کا انتظام چلانے میں ہر طرح بیگم بلقیس کی مدد کرے گا۔۔۔۔اس روز چودھری عزیز اپنے ذاتی محافظ انورے کے ساتھ راجوال واپس چلا گیا۔وہ اپنی جیپ خود ڈرائیو کر کے گیا تھا۔

میں مراد پور واپس آ گیا۔دل ابھی تک باگو کی ناگہانی موت کے غم سے نہیں نکل سکا تھا۔ماچھن رابعہ کی لڑکی مہناز کے ساتھ ہونے والا معاملہ بھی از حد افسوس ناک تھا۔وہ لوگ گاؤں چھوڑ گئے تھے۔میں نے کرامت کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ ان لوگوں کا پتا کرے کہ

کہاں ہیں۔ مہناز کی عزت تو واپس نہیں آسکتی تھی مگر اس ستم زدہ گھرانے کی مالی مدد تو کی جا سکتی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ جمعے کا دن تھا۔ مارچ کی پہلی تاریخیں تھیں۔ میں، تیمور اور رضوان اپنے آٹھ عدد دیگر ساتھیوں کے ہمراہ واپس راجوال روانہ ہوئے۔ میرے آٹھوں ساتھی وہی تھے جنہیں چند ماہ پہلے چودھری عزیز نے ذلیل ورسوا کر کے جاگیر سے نکالا تھا۔ ہم گھوڑوں پر سوار تھے۔ ابھی ایک گھنٹے کا سفر باقی تھا کہ تیز بارش شروع ہو گئی۔ ہمیں ایک کسان بھائی کے گھر پناہ لینا پڑی۔ خدا بخش نامی اس کسان کے گھر میں اس کا بہنوئی بھی آیا ہوا تھا۔ اس کا نام شوکت تھا۔ شوکت راجوال کا رہنے والا تھا۔ وہ مجھے اور تیمور وغیرہ کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ ایک دم جذباتی ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ وہ بولا۔ "سالار جی! آپ ہم کو کیوں چھوڑ کر چلے گئے؟ جاگیر میں سب آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ جوں جوں وقت گزر رہا ہے، آپ کی کمی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "دنیا کے کام کسی ایک بندے کے آنے جانے سے نہیں رکتے۔"

"آپ کی بات ٹھیک ہے جی۔۔۔۔۔ پر لوگ آپ کو دل سے پیار کرتے تھے۔ انہیں ایسے ہی لگتا ہے کہ ان کا کوئی اپنا وچھڑ گیا ہے۔" شوکت یہی سمجھ رہا تھا کہ ہم لوگ راجوال نہیں کہیں اور جا رہے ہیں اور بارش کی وجہ سے یہاں رک گئے ہیں۔

تیمور نے پوچھا۔ "چودھری عزیز سے خوش نہیں ہیں لوگ؟"

"کیوں ہمارے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہیں جی۔"

شوکت نے آزردگی سے کہا۔ "کہاں والی جی؟ کہاں یہ چودھری عزیز۔ اسے تو اپنے عیاشیوں سے ہی فرصت نہیں ہے۔ ایک سے ایک مہنگی طوائف گوجرانوالہ اور لاہور سے منگواتا ہے اور اسے ڈیرے پر نچاتا ہے۔ پندرہ وی چمچے بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ شراب پی کر مرداروں کی طرح صبح دس گیارہ بجے تک ڈیرے پر پڑے رہتے ہیں۔ اور آپ کو پتا ہی ہے، ہر طرح کی عیاشیاں بندے کو اندر سے بزدل بنا دیتی ہیں۔ پچھلے سے پچھلے منگل والی بات کا پتا ہے آپ کو؟"

"نہیں، کیا ہوا تھا؟"

چودھری عزیز نے گوجرانوالہ سے ایک کسبی طوائف "نتھ کھلوائی" کے لیے منگوائی ہوئی تھی۔ اٹھارہ وی سال کی کڑی ہو گی۔ نائیکہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ نائیکہ موکھلوں سے بڑا خوف کھاتی تھی اور بڑی مشکل سے یہاں آنے پر راضی ہوئی تھی۔ اگلے روز صبح سویرے وہ نائیکہ ڈر گئی۔ اس نے شور مچادیا کہ اس نے ابھی موکھلوں کا شیر دیکھا ہے۔ وہ کھڑکی کے سامنے سے گزر گیا ہے۔ ڈیرے پر بھگدڑ مچ گئی۔ چودھری کے چمچوں نے اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ خود چودھری عزیز اس حالت میں کمرے سے نکل کر دوڑا کہ اس کے پنڈے پر ایک جانگیے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جس طوائف کے ساتھ وہ سو رہا تھا، اس طوائف نے کھڑکی میں سے چھال ماری اور اپنا گٹا تڑوا بیٹھی۔ یہ تو حال ہے جی ان لوگوں کا۔"

شوکت کے ساتھ ہماری بات چیت جاری رہی۔ جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ ہم کہیں اور نہیں، راجوال ہی جا رہے ہیں اور اب چودھری عزیز کی من مانیوں کو بھی بریک لگنے والے ہیں۔

اس اطلاع کو شوکت اور اس کے سسر نے خوش خبری کے طور پر لیا اور وہ نہال ہو گئے۔ بارش ابھی پوری طرح بند نہیں ہوئی تھی کہ شوکت جوش کے عالم میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر نکل گیا۔ وہ یقیناً راجوال میں یہ اطلاع دینے نکلا تھا کہ سالار خاور واپس آ رہا ہے۔

راجوال میں میرا باقاعدہ استقبال کیا گیا۔ بہت سے لوگ راجوال میں داخل ہونے والے راستے پر جمع ہو گئے۔ ان میں مرد، عورتیں اور ننگ دھڑنگ بچے سبھی شامل تھے۔ بچوں نے اچھل کود کر اور بڑوں نے اپنے پٹکے وغیرہ اٹھا کر مجھے خوش آمدید کہا۔ راجوال کی گلیوں، چھتوں اور کھڑکیوں میں بہت سے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ در حقیقت بارے والے سنگین واقعے کے بعد علاقے میں میری شہرت اور حیثیت میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ تاہم لوگ اس واقعے کو میری واپسی سے بالکل الگ تھلگ سمجھ رہے تھے۔

پروگرام کے مطابق چودھری عزیز نے حویلی کے دروازے پر آ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے مردانے میں لے گیا۔ مردانے میں سب سے پہلے مجھ سے بغلگیر ہونے والا موجودہ سالار نصر اللہ تھا۔ اس کے بعد رونق علی نے مجھے جِن جپھے میں جکڑا۔

رات تک یہ خبر پورے علاقے میں پھیل چکی تھی کہ میرے اور چودھری عزیز کے درمیان صلح صفائی ہو گئی ہے اور میں سالار کے طور پر حویلی میں واپس آگیا ہوں۔ میرے واپس آ جانے کے بعد لوگ اور بھی تبدیلیوں کی توقع کر رہے تھے۔ میں یہ کہوں تو بالکل غلط نہ ہو گا کہ میرے واپس آ جانے سے حویلی اور پورے راجوال میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

بیگم بلقیس سے میری باقاعدہ ملاقات اگلے روز دوپہر میں ہوئی۔ یہ ملاقات مردانے کی بیٹھک میں ہوئی۔ میں آج بیگم بلقیس کو کئی ماہ بعد دیکھ رہا تھا۔ ان کے من موہنے چہرے پر ابھی تک ہلکی سی سوگواری باقی تھی۔ بارہ تیرہ سالہ حامد بھی بیگم بلقیس کے پہلو میں موجود تھا۔ اب وہ سلجھی ہوئی باتیں کر رہا تھا اور باپ کی موت کے بعد اس کے چہرے پر ذمے داری کا سا سایہ دکھائی دینے لگا تھا۔ جواں سال بیگم بلقیس کو جاگیر دارنی کے طور پر قیمتی لباس پہننا پڑتا تھا اور زیورات بھی جسم پر سجانے ہوتے تھے۔ مگر والی جی کی موت کے بعد وہ بالکل سادہ لباس میں نظر آتی تھیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

بیگم بلقیس نے مجھے قدرے حیرت سے دیکھا۔ میرے چہرے پر چوٹوں کے داغ تھے۔ گردن پر سگریٹ سے داغے جانے کا ایک نشان تو کافی پختہ تھا۔ "یہ کیا ہوا؟" انہوں نے پوچھا۔

"بس ان لوگوں سے کچھ مار اماری ہوئی تھی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"ما رونق بتا رہا تھا، ان لوگوں نے تمہیں کچھ دن بند بھی رکھا ہے؟"

"ہاں جی۔۔۔۔۔ چار پانچ دن تک۔۔۔۔۔ پاؤں میں سنگلی بھی رکھی۔"

"تمہارے دوست کی موت کا بڑا افسوس ہوا خاور۔ پر تم بھی ان لوگوں کے ہاتھ کیسے آ گئے؟" بیگم بلقیس نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے اسے بس ایک اتفاق قرار دیا اور اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ بالآخر اس واقعے کا نتیجہ اچھا نکلا اور وہ لوگ اپنے انجام کو پہنچے ہیں۔ بیگم بلقیس میرے چہرے پر چوٹوں کو تاسف سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ اس سے زیادہ چوٹیں میرے لباس میں چھپی ہوئی ہیں۔

"ایسے خطرناک کام کیوں کرتے ہو خاور؟" انہوں نے کراہتے ہوئے کہا۔

پھر گفتگو کا رُخ میری راجوال میں واپسی کی طرف مڑ گیا۔ بیگم بلقیس نے کہا۔ "یہ سب کیسے ہوا ہے خاور! بھائیا جی (چودھری عزیز) تو تمہارا نام بھی سننا نہیں چاہتے تھے؟"

"دیکھ لیں۔ اب وہ نام بھی سن رہے ہیں اور مجھے یہاں حویلی میں دیکھنا بھی چاہ رہے ہیں۔"

حامد ہولے سے ہنسا۔ "امی کہتی ہیں، آپ ہر فن مولا ہیں۔ یعنی ہر کام کر سکتے ہیں۔"

"ہر کام تو نہیں کر سکتا حامد۔ کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی اور کے بس میں ہوتے ہیں۔ انہیں بھلا، میں کیسے کر سکتا ہوں۔"

"بھائیا جی بالکل بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔" بیگم بلقیس نے کہا۔ "انہوں نے تاجو کو حویلی سے نکال دیا تھا۔ آج اسے بھی واپس بلا لیا ہے۔ اماں دلشاد سے بھی گل بات کی ہے اور اس کی ناراضگی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"اماں دلشاد کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"وہ کچھ دن کے لیے شام پور گئی ہے۔ وہاں اس کے ہمسائے میں ویاہ ہے۔ کہتی تھی، دو چار دن میں آ جائے گی۔ پر میرا خیال ہے وہ ناراض بھی ہے۔ بھائیا جی کا سلوک اس کو دکھی کر رہا تھا۔"

"راشدہ اور ثمینہ ٹھیک ہیں؟"

"ہاں، میں نے ایک جگہ راشدہ کی بات پکی کر دی ہے۔ اس کا جہیز وغیرہ بھی تیار ہو رہا ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ گرمیاں آنے سے پہلے پہلے اس کا نکاح پڑھوا دوں۔۔۔۔ پر اماں دلشاد کوئی جواب ہی نہیں دیتی تھی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ وہ پھر حویلی نہ چھوڑ جائے۔ اگر اس بار ایسا ہو گیا تو وہ پھر کبھی واپس نہیں آئے گی۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں آ گیا ہوں نا۔ اب سارے معاملوں کو دیکھ لوں گا۔ راشدہ کا ویاہ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گا اور سج دھج سے ہو گا۔"

ہم جاگیر کے معاملوں پر بات کرتے رہے۔ اس دوران میں حامد اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ "امی! میں جاؤں؟" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، تھوڑی دیر ٹھہرو۔" بلقیس اس کا بازو تھامتے ہوئے بولیں۔

میں جانتا تھا بلقیس اسے کیوں روک رہی ہیں۔ ان کے دماغ پر ابھی تک چودھری عزیز سوار تھا۔ وہ ہر وقت اس کے خوف کے سائے میں رہتی تھیں۔ اب بھی وہ ڈر رہی تھیں کہ چودھری کو اس بات پر اعتراض نا ہو کہ وہ میرے ساتھ بیٹھک میں اکیلی کیوں تھیں۔

میں نے کہا۔ "آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں بلقیس؟ حامد کو جانے دیں۔"

"لیکن۔۔۔۔"

"جاؤ حامد۔" میں نے حامد کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔

وہ ماں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ بیگم بلقیس نے گہری سانس لے کر اپنی خالی کلائیوں پر ہاتھ پھیرا اور پُر سوچ لہجے میں بولیں۔ "خاور! تمہارے واپس آنے سے جتنی خوشی ہوئی ہے۔۔۔۔ وہ میں ہی جانتی ہوں۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"لیکن ڈر بھی ہے کہ پھر وہی ساری باتیں شروع ہو جائیں گی۔ وہی طعنے، وہی بہتان۔ اور اب۔۔۔۔ اب میں بہت تھک گئی ہوں خاور۔ میں یہ سب کچھ نہیں جھیل سکتی۔"

"آپ کیا چاہتی ہیں۔۔۔۔ میں واپس چلا جاؤں؟"

"میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ پھر سب کچھ ویسے ہی ہو جائے۔"

"یعنی آپ چاہتی ہیں کہ میں یہاں تو رہوں پر آپ سے بہت دور رہوں۔۔۔۔"

"دور ہی نہیں خاور۔۔۔۔ تم۔۔۔۔ تم مجھے دل سے بھی نکال دو۔ ہمارا میل کسی صورت نہیں ہو سکتا۔ اور جس رستے نے کہیں پہنچنا ہی نہ ہو اس پر چلنے کا کیا فائدہ۔ اپنے پاؤں پر چھالے ڈالنے سے کیا ملے گا؟"

"میرا آپ سے کوئی مطالبہ نہیں ہے بلقیس۔۔۔۔ اور نہ ہی کبھی ہو گا۔ اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے سامنے نہ آیا کروں تو مجھے یہ بھی منظور ہے۔ آپ کے کانوں تک میری آواز نہ پہنچے، مجھے یہ بھی منظور ہے لیکن آپ کو دل سے نکالنے والی بات میرے بس میں نہیں ہے۔ آپ مجھے دنیا کے ہر کام پر مجبور کر سکتی ہیں، پر اس پر نہیں۔"

"تم مجھے اس بوجھ سے آزاد کیوں نہیں کر دیتے خاور؟"

وہ روہانسی ہو گئیں۔ "تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ ہم اس کے بعد بھی ملتے رہیں گے۔ ایک دوسرے کے لیے بہت اچھا سوچتے رہیں گے، بہت اچھا کرتے رہیں گے۔"

میں نے ایک آہ بھری۔ "بلقیس! میں اپنی ماں سے بے حد محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔ اب میں مہینوں تک اپنے آپ کو ان کی شکل کے لیے ترساتا ہوں اور اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ اپنی ممتا سے مجبور ہو کر مجھے شادی پر مجبور کرتی ہیں۔ بلقیس۔۔۔۔ شادی ایک ایسا زہریلا گھونٹ ہے جو میں کم از کم جیتے جی تو نہیں بھر سکتا۔"

"بس یہی باتیں ہیں خاور۔۔۔۔ جو مجھ پر بوجھ بنتی ہیں۔ میں خود کو بہت بڑا مجرم سمجھنے لگتی ہوں۔ اب تم اگر اپنی ماں سے اور اپنے گھر والوں سے دور ہو تو یہ بھی مجھ پر ایک بھاری بوجھ ہی ہے نا۔ اس بوجھ سے اور اس جیسے سارے بوجھوں سے مجھے آزاد کر دو خاور! مجھ سے یہ سب کچھ اب اور نہیں جھیلا جاتا۔"

میرا دل غم سے بھر گیا۔ روئیں روئیں میں گہری یاسیت اتر گئی۔ سینے میں امید کی جو کرنیں جگمگائی تھیں، وہ یک لخت گہری تاریکیوں میں ڈوبنے لگیں۔ میں چند سیکنڈ گم صم بیٹھا رہا، تب

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تو اس کا مطلب ہے بلقیس۔۔۔۔ آپ مجھے واپس بھیجنا چاہتی ہیں؟"

"میں نہیں چاہتی لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی۔" وہ اشک بار انداز میں بولیں۔

"یعنی مجھے جانا ہوگا؟" وہ خاموش رہیں۔ دوپٹے کی اوٹ میں ان کا آدھا چہرہ نظر آرہا تھا، آدھا چھپا ہوا تھا۔ میں ان کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ وہ بڑے ظالم لمحے تھے۔ بڑے بڑے مہیب پتھروں کی طرح میرے دل و دماغ کو کچلتے جا رہے تھے۔

میں اٹھنا چاہتا تھا لیکن اٹھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ میں جانتا تھا ایک بار اٹھ گیا تو پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور یہاں سے جانے کے لیے پتھر کا کلیجہ درکار تھا۔ میں منتظر رہا۔ وہ خاموش رہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ کسی کی خاموشی بھی توہین کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ آخر میں اٹھ گیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میرا ہر قدم جیسے اپنے دل پر پڑ رہا تھا اور مجھے ہلکان کر رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں دروازے سے باہر چلا جاتا بیگم بلقیس نے مجھے کمزور آواز میں پکارا۔ "خاور!"

میں رکا اور پلٹ کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ میرے پاس آئیں اور اشک گراتے ہوئے بولیں۔ "کیوں مجھے مار رہے ہو۔۔۔۔ کیوں ایسا کر رہے ہو؟"

"میں نے کیا کیا ہے؟ آپ کے حکم پر عمل ہی کر رہا ہوں۔"

وہ خاموش رہیں۔ جھیل آنکھوں پر بھاری پلکوں کا پردہ تھا اور رخساروں پر نمی تھی۔ میں ان کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ نہیں بولیں۔ میں بھی خاموش کھڑا رہا۔ خاموشی ایک بار پھر توہین محسوس ہونے لگی۔ میں دوبارہ دروازے کی طرف مڑا۔ اس مرتبہ انہوں نے خاموشی سے میری کلائی تھام لی اور نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کچھ کہا، نہ میری طرف دیکھا۔ بس کلائی تھامے رکھی۔ یہ بڑا دل گداز اور روح فزا اشارہ تھا۔ وہ چاہتی تھیں، میں یہاں سے نہ جاؤں۔ زبان سے نہیں کہہ رہی تھیں مگر ان کا پورا جسم بہ زبانِ حال یہی کہہ رہا تھا۔

اسی دوران میں حامد کی آوازوں سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ اسی طرف آ رہا ہے۔ انہوں نے میری کلائی چھوڑ دی اور ہولے سے کہا۔ "اچھا جاؤ۔ حامد آ رہا ہے۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گی۔"

"کب؟"

"اچھا بابا! میں بتا دوں گی۔ اب جاؤ۔" انہوں نے محبت بھری ناراضگی سے کہا۔ کوکے نے ہلکا سا لشکارا مارا پھر دروازے کی طرف مڑ گئیں۔

اگلے دو ہفتے سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا کہ میں اور میرے ساتھی چاہتے تھے۔ حویلی کے مردانے میں ایک بڑا اکٹھ ہوا۔ حویلی کے مین دروازے پر سجے سجائے تانگوں اور گھوڑوں کی قطاریں لگ گئیں۔ اس اکٹھ میں چودھری عزیز نے رضاکارانہ طور پر حویلی کے معاملات کو بیگم بلقیس کے سپرد کرنے کا اعلان کیا۔ چودھری نے عذر پیش کیا کہ وہ لاہور میں اپنا معائنہ کرا کے آیا ہے۔ اسے دل کا مسئلہ ہے اور ہو سکتا ہے اسے کچھ مہینوں میں آپریشن کرانا پڑے۔ وہ اب جاگیر کے کاموں کا بوجھ اٹھائے گا تو اس کی بیماری بڑھے گی۔ اس اکٹھ میں آخری نتیجہ وہی نکلا جو ہم چاہتے تھے۔ بیگم بلقیس کو جاگیر کا مختار مان لیا گیا۔ میں نے جن

لوگوں کو بھرتی کیا تھا، وہ سارے واپس آ گئے۔ یقیناً کچھ لوگ ان فیصلوں کے خلاف بھی تھے لیکن انہیں بھی خاموش ہونا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ موکھل اور لمبڑ برادری دن بہ دن زور پکڑ رہی تھی۔ خاص طور سے موکھلوں نے توراج والیوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ جہاں جہاں کھیت ملتے تھے، وہاں آئے دن پانی اور حد بندی کے جھگڑے ہو رہے تھے اور یہ سب کچھ پچھلے تین چار مہینوں میں ہوا تھا۔

میں شام پور جا کر اماں دلشاد اور ثمینہ وغیرہ سے بھی ملا۔ اماں واقعی کچھ ناراض لگتی تھیں۔ تاہم میرے واپس آنے کی اسے خوشی تھی۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "تم آ گئے ہو تو اب میں بھی شادی سے فارغ ہو کر آ جاؤں گی۔"

مجھے لگتا تھا کہ اماں دلشاد کی دل جوئی مجھ پر فرض ہے۔ وہ اپنی معصوم گُڈی کی موت کا گہرا غم سینے سے لگائے ہوئے تھی اور والی جی، جیسے اس غم کا کفارہ مجھے سونپ گئے تھے۔

مجھے حویلی کے پاس ہی ایک گھر میں ٹھہرایا گیا۔ یہ گھر حویلی کے مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ تین چار ہوادار کمرے تھے اور صحن میں نیم اور دھریک کے درخت لگے ہوئے تھے۔ تیسری رات نصر اللہ سے بات چیت ہوئی۔ وہ بولا۔ "خاور صاحب! آپ جانتے

ہیں کہ جو کچھ ہوا اس میں مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ میں آخر تک انکار کرتا رہا مگر سالار کی پگ زبردستی میرے سر پر رکھی گئی۔"

"تمہیں اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں نصر اللہ۔۔۔۔۔ میں سب جانتا ہوں۔ تم کوئی اور بات کرو۔"

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "اور بات یہ ہے جی کہ مچھلی فارم کا کام بہت بگڑ گیا ہے۔ پچھلے آٹھ دس دن میں وہاں کافی گڑبڑ ہوئی ہے۔"

"یار! پہیلیاں نہ بجھواؤ۔"

"موکھلوں کے حوصلے بڑھتے جا رہے ہیں جی۔ پچھلے بدھ کو نہوں نے فارم کی طرف کھلنے والا دروازہ کھول دیا تھا اور وہاں سے آنا جانا شروع کر دیا تھا۔۔۔۔۔ چودھری عزیز نے پنچایت بلائی تھی۔ اس میں بھی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ اب موکھلوں نے دروازے کے سامنے اپنے گھوڑے باندھنے شروع کر دیے ہیں بلکہ وہاں سائے کے لیے ایک بڑا چھپر بھی ڈال دیا ہے۔ اب دو چار دن میں وہ وہاں چارپائیاں ڈال کر بیٹھنا شروع کر دیں گے۔"

میرا خون کھولنے لگا تھا۔ میں نے اس بارے میں نصر اللہ سے کچھ مزید تفصیل پوچھی۔ مجھے اپنے تن بدن میں آگ سی لگتی محسوس ہوئی۔ چودھری عزیز نااہلی کا ثبوت دیتا رہا تھا۔ یہاں بات چیت کی نہیں، کاروائی کی ضرورت تھی۔ نصر اللہ کے جانے کے فوراً بعد میں نے تیمور اور کرامت کو بلایا۔ تیمور نے صاف صاف بات کرتے ہوئے کہا۔ "خاور! اس وقت راجوال میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ہماری واپسی پر غصہ کھا رہے ہیں۔ ان کو ٹھنڈا کرنے کا بڑا اچھا موقع ہے۔ یہ ایک تیر سے دو شکار ہوں گے۔ موکھلوں کو تو سبق ملے گا ہی، چودھری عزیز کے ساتھیوں کا مچ بھی مرے گا۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہئیے؟"

"وہی پرانا کلیہ۔ موکھلوں کی اینٹ کا جواب پتھر سے۔۔۔۔۔ مار مار کر تھوبڑے توڑ دیے جائیں سور کے پُتروں کے۔" تیمور کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔

کچھ ہی دیر بعد رونق علی، نصر اللہ، گلزار اور شبیر وغیرہ بھی اس میٹنگ میں شریک ہو گئے۔ سب میں ایک نیا جوش وجذبہ پیدا ہو گیا۔ دو تین گھنٹے کی اس ملاقات کے آخر میں

فیصلہ ہوا کہ بات چیت یا تھانے کچہری سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ موکھلوں نے بازوؤں کا زور دکھایا ہے، ہمیں بھی زور دکھانا پڑے گا۔

میں نے کہا۔ "میں کل سویرے ہی چودھری عزیز اور بیگم جی سے بات کرتا ہوں۔"

رونق نے کہا۔ "میں اپنے طور پر بھی بلقیس اور بھائیا سے بات شات کرتا ہوں۔ یہ چیز وہ بھی چنگی طرح جانتے ہیں کہ اگر اب چپ رہیں گے تو بہت زیادہ نقصان ہو گا۔"

رات کو رونق علی کی موجودگی میں بیگم بلقیس اور چودھری عزیز سے بات ہوئی۔ حامد بھی ماں کے پاس موجود تھا۔ ریشمی لاچے کُرتے اور پگڑی میں وہ چھوٹا چودھری ہی نظر آتا تھا۔ چودھری عزیز نے دبے لفظوں میں کہا کہ پولیس اور پنچایت کے ذریعے مسئلہ حل کرنے کی ایک اور کوشش کی جائے۔ بہر حال، اپنی اس رائے کی کمزوری خود چودھری عزیز کو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ والی جی کے بعد پنچایت اور پولیس میں حویلی کا زور باقی نہیں رہا۔

اگلی شام ہم کاروائی کے لیے بالکل تیار تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، یہ مارچ کی اٹھائیس تاریخ تھی اور جمعے کا دن تھا۔ قریباً سو گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈال لی گئیں۔ اسلحہ وغیرہ بھی

صاف کر لیا گیا۔ نصراللہ نے اینٹوں کی تین ٹریکٹر ٹرالیاں منگوالی تھیں اور پندرہ بیس مزدوروں کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ پروگرام کے مطابق میں نے نصراللہ، تیمور اور رضوان کے ساتھ پندرہ بیس گھڑ سوار لے کر موقعے پر پہنچنا تھا۔ موکھلوں کا بنایا ہوا چھپر گرانا تھا اور گھوڑوں کو قبضے میں لینا تھا۔ اس کے بعد ہم نے اپنے احاطے کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کرنا تھا اور دروازے کے سامنے دیوار کی چنائی شروع کرنا تھی۔ ہمارے باقی ساتھیوں نے دو گروپوں میں دائیں اور بائیں درختوں میں موجود رہنا تھا۔ انہیں تب تک سامنے نہیں آنا تھا جب تک میری طرف سے ہدایت نہ ملتی۔

میں نے ساتھیوں کو آخری ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اس وقت تک حملہ نہیں کرنا جب تک دوسری طرف سے حملہ نہ ہو۔ اگر فائرنگ شروع ہو جائے تو بھی یہی کوشش کرنی ہے کہ ٹانگوں وغیرہ پر گولی لگے۔"

رضوان نے جوش سے کہا۔ "گولی تو چلنی ہی چلنی ہے جی۔۔۔۔۔ تو پھر کیوں ہم اپنے بندے مرنے کا انتظار کریں۔"

"بس جو کہہ رہا ہوں، وہی کرنا ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ رات کا ویلا ہو گا۔ اندھیرے میں اپنے پرائے کی اچھی طرح پہچان رکھنی ہے۔ تمہیں پتا ہو گا، پچھلی دفعہ موکھلوں کے دو بندے اپنے ہی فائروں سے پھسٹل ہوئے تھے۔"

اس سے پہلے میں کبھی کبھی رونق کے ساتھ مل کر یاکے ٹو وغیرہ کے ساتھ ناچ گانا دیکھ لیتا تھا مگر اس روز میں نے اپنے سے یہ وعدہ کیا کہ اگر آج میں اپنے کام میں سرخرو رہا تو زندگی بھر ناچ گانے کی طرف نہیں جاؤں گا۔ یہ ایک طرح سے اپنی اصلاح کا ہی ایک عمل تھا جس کی جڑیں کسی نہ کسی طرح بلقیس کے پیار سے پیوست تھیں۔

رات نو بجے کے قریب ہم راجوال سے روانہ ہوئے۔ دو گروپوں میں قریباً 80 بندے مچھلی فارم سے ایک فرلانگ کی دوری پر چھپا دیے گئے۔ میں بیس پچیس سواروں کے ساتھ رقبے پر پہنچا۔ یہاں ایک چھپر موجود تھا۔ اس کے نیچے دو لالٹینیں جل رہی تھیں۔ تین چار گھوڑے بندھے تھے اور گوبر ڈھونے والا ایک ریڑھا کھڑا تھا۔ ہم نے جاتے ساتھ ہی کلہاڑیوں کے وار کیے اور چھپر گرا دیا۔ یہاں ایک رکھوالا بھی سو رہا تھا۔ وہ شور مچاتا ہوا کھیتوں کی طرف بھاگ گیا۔ دھما چوکڑی کی آوازیں سن کر گودام کے اندر بھی ہلچل ہوئی تھوڑی ہی

دیر میں ایک دیو ہیکل کتے سمیت آٹھ دس افراد ہمارے سامنے تھے۔ ان میں سے دو کے پاس رائفلیں تھیں، باقی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ ایک دو منٹ کے اندر ہی یہ تعداد بڑھ گئی۔ گودام نما کارخانے میں موجود سارے لوگ باہر نکل آئے۔ ان کی تعداد تیس کے قریب ہو گئی۔ موکھل پاشا کو میں نے صاف پہچان لیا۔ وہ لاچ کرتے میں تھا اس نے آستینیں اڑسی ہوئی تھیں اس کے گلے میں گولیوں والا بیگ تھا اور ہاتھ میں ٹرپل ٹو رائفل نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے رائفل اوپر اٹھائی اور کئی ہوائی فائر کیے۔ پھر لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے سامنے آگیا اور پھنکارا۔ "مجھے پتا تھا کہ تو راجوال آگیا ہے اور اب تیری موت تجھے یہاں بھی ضرور لائے گی۔ مجھے پتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اگر تجھے غائب کا علم آگیا ہے تو پھر یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ آج تجھے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑے گا یا پھر یہیں اس رقبے میں تیرے پانچ چھ ٹوٹے ہو جائیں گے۔"

طیش کے عالم میں اس نے مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور رائفل میری طرف سیدھی کرنی چاہی۔ میرے ایک ساتھی نے پھرتی سے اس کے ہاتھ پر لاٹھی کا زوردار وار کیا۔ رائفل پاشے کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نے اپنی رائفل کا دستہ گھما کر اس کے منہ پر مارا۔ وہ ڈکراتا

ہوا اپنے ہی کارخانے کے گندے پانی میں جا گرا۔ پلک جھپکتے میں صورتِ حال تہلکہ خیز ہو گئی۔ دونوں اطراف کے افراد بھڑکیں اور للکارے مارتے ہوئے ایک دوجے پر پل پڑے۔ کلہاڑیوں اور لاٹھیوں کا آزادانہ استعمال ہوا۔ دونوں طرف سے رکھوالی کے دونوں جسیم کتے بھی ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے اور لڑتے لڑتے کھیتوں میں گم ہو گئے۔ گرد و غبار کے سبب پاشا میری نظروں سے اوجھل تھا۔ اس نے چھوٹے دستے کی ایک گری ہوئی کلہاڑی زمین سے اٹھائی اور پہلو سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کا مہلک وار میرے یار تیمور نے اپنے ننگے ہاتھ پر روکا۔ تیمور کی کراہ سن کر میں پلٹا۔ موکھل دوسرے وار کے لیے کلہاڑی سر سے بلند کر چکا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر ٹانگ رسید کی، وہ پھر پانی میں جا گرا۔ ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ وہ پھنکار رہا تھا۔ "ماردوں گا۔۔۔۔۔ آج تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس کے انداز میں وحشت تھی اور سڈول جسم میں اضافی طاقت پیدا ہو گئی تھی۔ ہاں، یہی کرخت جسم تھا جس نے اماں دلشاد کی بڑی بیٹی شاداں کو اپنے بوجھ تلے روندا تھا اور چھوٹی ثمینہ کو طاقت کے نشے میں اپنے اشاروں پر نچاتا تھا۔ مجھے اس جسم سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی۔ میں نے اس گندے پانی میں، اس گھمسان کی لڑائی میں، موکھل پاشا کو نہایت سخت

ضربیں لگائیں اور ادھ موا کر دیا۔ میرے سر کی ایک نہایت طوفانی ٹکر نے پاشے کے چہرے کی کوئی ہڈی توڑ دی اور وہ بھینسے کی طرح ڈکرانے لگا۔ اسی دوران میں گولی چلنے لگی۔ میرا ایک ساتھی سینے پر گولی کھا کر پشت کے بل میرے اوپر گرا۔ پاشے پر سے میری گرفت کمزور ہوئی اور وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے لیٹے لیٹے جست لگا کر اپنی رائفل پھر اپنے ہاتھ میں کی اور خود پر کلہاڑی بلند کرنے والے ایک موکھل کی ناف پر گولی ماری۔ وہ گر گیا۔ میری نظر پاشے کی تلاش میں تھی۔ وہ نظر آ جاتا تو اس کی زندگی کو فل اسٹاپ لگ جاتا مگر وہ نظر نہیں آیا۔ میں نے ملتانی کو دیکھا۔ وہ جوش سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے بھاگتے ہوئے ایک موکھل کی ٹانگوں میں گولی ماری۔ وہ گرا، اٹھا اور لنگڑاتا ہوا پھر کارخانے کی طرف بھاگا۔

ایک دو منٹ کے اندر ہی موکھل بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے کچھ واپس کارخانے میں گھس گئے۔ کچھ عمارت کے پچھواڑے کی طرف نکل گئے تھے۔ میرے ساتھیوں نے جوش کے عالم میں ان کا پیچھا کیا اور ہوا میں بھی گولیاں چلائیں۔

ایک طرف سے آواز آئی۔ "آگ لگا دو چھپر کو۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میرے منع کرتے کرتے کچھ افراد نے لالٹینیں پھینک کر چھپر کو آگ لگا دی۔ ریڑھا اور تین گھوڑے قبضے میں لے لیے گئے۔ آگ کی روشنی ہوئی تو احاطے میں لاش نظر آئی۔ یہ موکھلوں کے کارندے کی لاش تھی۔ اس کے سینے پر گولی لگی تھی۔ اس کی کمر میں گولیوں والی پیٹی تھی۔ یقیناً اس کے پاس آٹھ ایم ایم رائفل تھی جو کوئی موکھل بھاگتے ہوئے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ لاش کے علاوہ بھی دو تین جگہ خون نظر آ رہا تھا۔ آدم خور رقبے نے پھر خوں خواری شروع کر دی۔ میں نے لاش پر کپڑا ڈلوایا تاہم اسے جہاں کا تہاں پڑا رہنے دیا۔

تیمور نے معماروں سے کہا کہ وہ کارخانے کے دروازے کو اینٹیں لگا کر بند کر دیں۔

میں نے مزدور کے بڑے کو حکم دیا۔ "تم دیوار کے ساتھ بنیاد کی کھدائی شروع کر دو۔"

دیکھتے ہی دیکھتے کوئی ڈیڑھ درجن افراد تیزی سے کام میں مصروف ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق چار ٹریکٹر ٹرالیاں بھی شور مچاتی پہنچ گئیں۔ ایک ٹرالی پر ریت اور سیمنٹ کی بوریاں تھیں۔ ایک اور ٹرالی پر اینٹوں کے علاوہ خاردار تار بھی لدی ہوئی تھی۔

دوسری طرف ہم نے ٹریکٹر ٹرالیوں کے پیچھے اور مچھلی فارم کے کمرے کی اوٹ میں رائفل بردار کھڑے کر دیے۔ انہیں پوری طرح چوکس رہنے کی ہدایت تھی۔ موکھل وقتی طور پر

بھاگ گئے تھے مگر یقینی بات تھی کہ وہ پلٹ کر آئیں گے اور زیادہ تعداد میں آئیں گے۔ اگر میں یہی کہوں تو بے جا نہ ہو گا۔ کہ ہمارے علاقے میں ایسی لڑائیوں کے اندر اکثر لوگ پولیس کی مدد لینا بزدلی سمجھتے ہیں۔

تیمور، رضوان اور نصر اللہ وغیرہ کی آنکھوں میں بجلیاں کوندر ہی تھیں۔ تیمور نے اپنے دونوں زخمی ہاتھوں پر پٹیاں باندھ لی تھیں اور اس حالت میں بھی مقابلے کے لیے پوری طرح تیار نظر آتا تھا۔

"کیا خیال ہے خاور؟" تیمور نے کہا۔ "کرامت والی ٹولی کو بھی بلا لیا جائے؟"

میں نے سوالیہ نظروں سے نصر اللہ کی طرف دیکھا۔ نصر اللہ نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں جی، اب ایک لاش گر گئی ہے۔ میرے خیال میں اب لڑائی تو ہونی ہی ہونی ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "کرامت والے بندوں میں سے بیس کو بلوا لو۔ باقی بیس کو شبیر والی ٹولی میں شامل کر دو۔ ان لوگوں سے کہہ دو کہ وہ ذرا اور قریب آ جائیں۔"

نصر اللہ گھوڑا دوڑاتا ہوا کرامت کی طرف چلا گیا۔ راج مزدور کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ "تم اپنا کام جاری رکھو۔ تم اس لڑائی میں حصے دار نہیں ہو اور نہ ہی تمہیں کوئی خطرہ ہے۔"

"ایک دم تو گولی نہیں چل جائے گی چودھری صیب؟" مزدوروں نے بڑے دبے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ ابھی تو یہ پتا نہیں کہ وہ لوگ آئیں گے بھی یا نہیں۔ اگر آئیں گے تو میں تمہیں اشارہ کر دوں گا۔ تم کام چھوڑ کر پیچھے ہٹ جانا اور کچھ دیر کے لیے کھیتوں کی طرف نکل جانا۔"

ہم نے میگزینوں کو پھر سے لوڈ کیا۔ کلہاڑیوں وغیرہ کے وار سے بچنے کے لیے سر پر پگڑیاں باندھ لی گئیں۔ کچھ سواروں نے اپنی پگڑیوں کے نیچے چمڑے کی جوتیاں اور دھات کی تھالیاں وغیرہ رکھیں۔ ڈھیلی کلہاڑیوں کو پھر سے ٹھونک کر کس لیا گیا۔ ہر چہرے پر موکھلوں کے لیے آگ اور جوش تھا۔ یہی جوش مجھے پسند تھا۔ یہی تناؤ، یہی سنسنی۔ جب رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی ہے اور تن بدن میں ایک لہر جاگتی ہے۔

کارخانے کے اندر ہلچل محسوس ہو رہی تھی۔ کھڑکیوں میں لالٹینیں گردش کرتی نظر آتی تھیں۔

دو بجے کا عمل ہو گا، قریباً سو فٹ لمبی، دیوار ڈھائی تین فٹ اونچی ہو چکی تھی۔۔۔۔ تیمور بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور تمتمائے چہرے کے ساتھ بولا۔ "لگتا ہے موکھل آ گئے ہیں۔"

"آ گئے ہیں تو سو بسم اللہ۔" میں نے اپنی رائفل کو تھپکی دی۔

ٹریکٹر ٹرالیوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ ساتھ میں یقیناً گھوڑے بھی تھے۔ ہوائی فائرنگ سنائی دی۔ للکارے اور پھر موکھلوں کا ایک جم غفیر نظر آیا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں کوکوں والی لاٹھیاں اور کلہاڑیاں چمک رہی تھیں، چہرے چمک رہے تھے۔ مدھم چاندنی میں ان کی آمد ایک خوفناک منظر ظاہر کرتی تھی۔ میں نے اس ہجوم میں موکھل پاشا کے علاوہ چھوٹے موکھل کو بھی پہچانا۔ "مار دو حرامیوں کو۔ ان کی لاشیں بچھا دو۔" بڑے موکھل کی آواز نقارے کی طرح گونجی۔

"ہاں مار دو۔" بہت سی آوازوں نے جواب دیے۔ میرے اشارہ کرتے ہی مزدور پیچھے کی طرف بھاگ گئے۔

موکھل ایک سیلابی ریلے کی طرح ہماری طرف بڑھے انہوں نے ابھی تک گولی نہیں چلائی تھی۔ ہم نے بھی نہیں چلائی۔ انہیں اپنی تعداد کا گھمنڈ تھا۔ میں نے ملتانی سے کہا۔

"سیٹی بجاؤ۔"

اس نے چوکیداروں والی دھاتی سیٹی منہ سے لگائی اسے ایک دو بار زور سے بجایا۔۔۔۔ اس سیٹی میں بیر کی گٹھلی ڈالی جاتی تھی جس سے تھرتھراتی آواز پیدا ہوتی ہے۔ تاریکی میں سیٹی کی تیز باریک آواز پھیلتی چلی گئی۔ یہ باقی ساتھیوں کے لیے اشارہ تھی۔ یکایک دائیں اور بائیں طرف سے حرکت نظر آئی۔ ٹارچیں روشن ہوئیں اور ہمارے ساتھی تیزی سے موقعے کی طرف بڑھے۔ ان کا یوں ظاہر ہونا اور برق رفتاری سے موقعے کی طرف بڑھنا سنسنی خیز تھا۔ موکھلوں کے لیے حیرت کے یہی لمحے تھے جب ہم نے آگے بڑھ کر ان پر ہلہ بول دیا۔ میرے ہاتھ میں درمیانے دستے کی کلہاڑی تھی۔ 38 بور ریوالور میری کمر سے بندھا ہوا تھا۔ سر پر بھاری کپڑے کا منڈاسا تھا۔ میں اور تیمور سب سے آگے تھے۔ تیمور نے حیدری نعرہ لگاتے ہوئے حملہ کیا۔ کلہاڑیوں سے کلہاڑیاں اور لاٹھیاں ٹکرائیں۔ گھمسان کا رن پڑ گیا۔ اگلے تین چار منٹ میں خونی رقبے پر زوردار لڑائی ہوئی۔ للکاروں، کراہوں اور بھڑکوں

سے قرب وجوار گونج گئے۔اس شور کے درمیان لاٹھیوں کی ٹھکا ٹھک تھی اور گاہے بہ گاہے فائر سنائی دے رہے تھے۔ یہ ایک کلاسیکل دیہاتی لڑائی تھی۔اس میں قدیم مبارزت کا رنگ ڈھنگ تھا۔میرے ساتھیوں میں جو والہانہ جوش تھا، وہی میرا سب سے بڑا ہتھیار، میرا حوصلہ تھا۔مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا جسم ایک عام جسم نہیں رہا۔میں درجنوں ہاتھوں، آنکھوں اور سروں کے ساتھ ہوں۔ بہ مشکل چھ سات منٹ گزرے ہوں گے کہ پولیس کی بھاری نفری موقعے پر پہنچ گئی۔ یہ لوگ دو گاڑیوں اور کوئی درجن گھوڑوں کے ساتھ نمودار ہوئے تھے۔ان کی مخصوص لاٹھیوں اور ہوائی فائرنگ کی آوازوں نے سب کو چونکا یا۔فون پر کسی پولیس آفسر کی للکارتی ہوئی آواز گونجی۔"پولیس پہنچ گئی ہے۔سب لوگ پیچھے ہٹ جائیں۔ورنہ ہم گولی چلائیں گے۔۔۔۔گولی چلائیں گے۔"

یوں لگا جیسے موکھل پہلے ہی راہِ فرار ڈھونڈ رہے ہیں۔وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئے اور ہٹتے چلے گئے۔میرے ساتھیوں نے جوش کے عالم میں تھوڑی سی پیش قدمی کی لیکن پھر پولیس کی گاڑیوں کو دیکھ کر انہیں بھی رکنا پڑا۔پولیس نے رقبے کے سامنے گاڑیاں اور دو ٹرالیاں کھڑی کر کے ایک دیوار سی بنا دی۔میرے ساتھی فاتحانہ نعرے لگا رہے تھے۔

میدان میں کم از کم سات لاشیں موجود تھیں۔ان میں دو ہمارے ساتھیوں کی تھیں۔ملتانی ہم میں نہیں رہا تھا۔خود کار کا پورا برسٹ اس نے سینے پر کھایا تھا۔مرنے کے بعد بھی خون آلود کلہاڑی پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ہمارے قریباً دس ساتھی زخمی تھے۔ان میں سے چار شدید زخمی تھے۔"زخمیوں کو ٹرالی پر چڑھاؤ۔"میں نے نصراللہ سے کہا۔

نصراللہ اور اس کے ساتھی فوراً اس کام میں لگ گئے۔میں نے کرامت کو ہدایت کی۔"تم سات آٹھ بندوں کو لے کر نصراللہ کے ساتھ جاؤ اور انہیں اسپتال پہنچاؤ۔اگر کوئی کو پولیس والا جاتا تو اسے بھی لے جاؤ۔"

اسی دوران میں علاقے کا نیا ایس ایچ او میاں وارث میرے قریب پہنچا۔اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔اس نے مجھ سے کہا۔"تم فوری طور پر دو کام کرو۔اپنے ساتھیوں کو پیچھے ہٹا کر رقبے میں لے جاؤ۔۔۔۔اور ان کا اسلحہ جمع کرا دو۔"

میں نے کہا۔"میں انہیں پیچھے لے جاتا ہوں لیکن ہم اسلحہ اس وقت تک نہیں دیں گے جب تک موکھل نہیں دیں گے۔ہم نہتے مرنا نہیں چاہتے۔"

انسپکٹر وارث نے تھوڑا سا اصرار کیا لیکن پھر مان گیا۔ میں نے اپنے مشتعل ساتھیوں کو ذرا ٹھنڈا کر کے پیچھے ہٹا لیا۔ پولیس والوں نے لاشوں کو ان کی جگہوں پر ہی رہنے دیا۔ ہاں، ان کے اوپر کپڑے ڈال دیے اور خون کے ارد گرد اینٹیں رکھ دیں۔ کچھ دیر بعد میں نے راجوں اور مزدوروں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے دیوار کی چنائی پھر شروع کر دی۔ ایس ایچ او وارث تیزی سے آگے آیا۔ اس نے کہا۔ "شاہ خاور! میرے خیال میں تمہیں کام روک دینا چاہیے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا تھانیدار صاحب۔" میں نے خم ٹھونک کر کہا۔ "آج یہ دیوار ضرور مکمل ہو گی اور سامنے کی طرف تار وغیرہ لگے گی۔"

"لیکن تمہیں پتا ہے، یہ کیس چل رہا ہے۔"

"کیس اس وقت بھی چل رہا تھا جب انہوں نے دروازہ کھولا تھا اور یہاں چھپڑ ڈالے تھے دنیا جانتی ہے کہ یہ ہمارا رقبہ ہے۔ ہم نے یہاں قبضہ مکمل کر کے چھوڑنا ہے۔"

میرے تاثرات دیکھ کر ایس ایچ او کو خاموش ہونا پڑا۔

تھوڑی ہی دیر بعد راجوال سے چودھری عزیز، چودھری نشاط، رونق علی اور دیگر زمیندار بھی موقعے پر پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ ان کے کارندے اور ہرکارے وغیرہ بھی تھے۔ وہ ٹرالیوں، ٹانگوں اور گھوڑوں پر کوئی ایک سو افراد تھے۔

ان لوگوں نے بھی موقعے پر سات عدد لاشوں کو دیکھ کر سخت سنسنی محسوس کی۔ لاشوں کے قریب ہی دیوار کا کام بھی تیزی سے جاری تھا۔ چودھری عزیز وغیرہ کے پہنچنے کے بعد دیوار کے کام میں مزید تیزی آ گئی۔ کچھ رقبے کے سامنے والے حصے کی طرف خاردار تار لگانے کے لیے کیکر کی لکڑیاں گاڑنے لگے۔ چودھری عزیز اور چودھری نشاط وغیرہ کی نظروں میں میرے لیے تعریف پوشیدہ تھی۔ چودھری نشاط والی جی کا چچازاد تھا۔

کچھ دیر بعد چودھری عزیز میرے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا۔ "پتا چلا ہے کہ ڈسکے سے پولیس کی اور نفری یہاں پہنچ رہی ہے۔ ان لوگوں نے اب ضرور گرفتاریاں وغیرہ کرنی ہیں۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" میں نے تائید کی۔

"میرا خیال ہے کہ تم، تیمور اور نصر اللہ یہاں سے نکل جاؤ۔ کرامت، رضوان اور شبیر وغیرہ کی گرفتاری دے دیتے ہیں۔"

"آپ مشورہ کرلیں۔ مجھے جس طرح بھی کہیں گے، میں تیار ہوں۔"

"بس مشورہ ہی مشورہ ہے۔ ڈسکے کی پولیس پہنچنے سے پہلے تم لوگ نکل جاؤ۔ یہاں کا کام ہم سنبھال لیتے ہیں۔"

میں، تیمور اور نصر اللہ خاموشی کے ساتھ درختوں کی طرف کھسک گئے اور پھر گھوڑے سنبھال کر راجوال کی طرف نکل گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اپنی پرانی پناہ گاہ میں موجود تھے۔ یہ حویلی کے اصطبل کا وہی کچا تہ خانہ تھا جہاں میں باگو کے ساتھ پہلے بھی دس پندرہ دن چھپا رہا تھا۔ تب بھی یہ روپوشی موکھلوں کے ساتھ لڑائی کے بعد ہوئی تھی۔ اصطبل کے ملازموں شیدے اور عبید اللہ نے پرالی کے گٹھے وغیرہ ہٹا کر نیچے جاتی ہوئی سیڑھیوں کے لیے راستہ صاف کیا تھا اور ہم تہ خانے میں پہنچ گئے تھے۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جو میں نے پچھلی دفعہ دیکھا تھا۔ تہ خانے کا ایک کمرا خالی تھا۔ دو میں چار پانچ چارپائیاں بچھی ہوئی تھی۔ مٹی کے گھڑے، لالٹینیں، برتن وغیرہ رکھے تھے اور وہی ٹرانزسٹر ریڈیو بھی جو ہم سنتے رہے تھے۔ اگر کچھ

نہیں تھا تو وہ باگو تھا۔ وہ بارے کے ہاتھوں جان ہار کر مراد پور کے نواح میں منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔۔۔۔۔ زندگی اسی بے ثباتی کا نام ہے۔

تہ خانے کے خالی کمرے میں آہنی سلاخوں کے پیچھے ایک گرے ہاؤنڈ کتا سو رہا تھا۔ شاید وہ بیمار تھا یا پھر کسی جرم کے نتیجے میں اسے قید تنہائی کی سزا دی گئی تھی۔

تیمور کے زخمی ہاتھوں سے پھر خون ٹپک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "یار! لگتا ہے تجھے کچھ زیادہ ہی چوٹ آگئی ہے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ کلہاڑی مجھے ہی لگ جاتی۔"

"کیسی بات کرتے ہو خاور۔ یہ تو کلہاڑی تھی۔ گولی بھی ہوتی تو میں اپنے اوپر لینے کی کوشش کرتا۔"

ملتانی کی موت نے ہم تینوں کو افسردہ کر رکھا تھا۔ کچھ دیر تک ہم اس کی باتیں کرتے رہے اور ان حالات کے بارے میں سوچتے رہے جو اب پیش آنے تھے۔ میں ساتھ ساتھ تیمور کے زخمی ہاتھوں کی پٹی بھی کرتا رہا۔ ایک ہاتھ کا زخم زیادہ گہرا تھا۔ تیمور نے اس زخم کو چومتے ہوئے کہا۔

"آج جو کچھ ہم نے موکھلوں کے ساتھ کیا ہے،اس کے لیے تو ایسے آٹھ دس زخم بھی کھائے جا سکتے ہیں۔سچ کہتا ہوں یار! نشہ سا ہو گیا ہے۔"

نصر اللہ نے سارے موکھلوں کو ایک مشترکہ گالی سے نوازتے ہوئے کہا۔"آج کھلے میدان میں بھیڑوں، بکریوں کی طرح آگے لگایا ہے ان کو۔ مجھے پکا یقین ہے۔والی جی کی روح خوش ہو گئی ہو گی۔"

"دیکھو،اب ان کی جوابی کاروائی کیا ہو گی؟" تیمور بولا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ اب وہ لمبڑ گروپ کو ساتھ ملا کر کچھ کرنے کی کوشش کریں گے۔" نصر اللہ نے خیال ظاہر کیا۔

"لمبڑ گروپ نے بھی تو اپنا اچھا برا سوچنا ہے۔اور ابھی تو ان کا چمپئن لیا قا بھی جیل سے باہر نہیں آیا۔"

پلاسٹک کے ایک کین میں کچھ شراب موجود تھی۔ نصر اللہ اور تیمور نے تھوڑی تھوڑی پی۔ میں نے سگریٹ پینے پر اکتفا کیا اور ہم سو گئے۔

اگلے روز ڈھائی تین بجے کے لگ بھگ شیدے نے باہر کی کچھ خبریں ہم تک پہنچائیں۔اس نے بتایا۔"اسپتال میں دو اور زخمی بندے مر گئے ہیں۔ایک ڈسکے میں مرا ہے اور دوسرا لاہور میں۔لاہور میں مرنے والا چاچے عسکری کے پنڈ کا خورشید شاہ ہے۔"

"دوسرا کون ہے؟"

"وہ موکھلوں کا ہے۔اس کی گردن پر کلہاڑی لگی تھی۔رونق صاحب بتا رہے تھے ٹوٹل نو موتیں ہوئی ہیں۔ تین ہمارے گئے ہیں چھ ان کے۔"

"دیوار مکمل ہو گئی ہے؟"میں نے پوچھا۔

"بالکل جی! دیوار بھی ہو گئی ہے۔سامنے تار بھی لگ گئی ہے۔زمین کھود کر موکھلوں کے کارخانے کا گندا پائپ بھی نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔سب کچھ ایک دم ٹھیک ہے۔"

"گرفتار کون کون ہوا ہے؟"

"گرفتاریاں تو زیادہ ہماری ہی ہوئی ہیں جی۔ نیا ایس ایچ او موکھلوں کی پوری سائیڈ لے رہا ہے۔آپ کو پکڑنے کے لیے بھی تھاں تھاں چھاپے مارے جا رہے ہیں۔سنا ہے کہ پولیس

آپ کے مراد پور والے گھر تک بھی گئی ہے۔ چودھری عزیز تھانے میں ہی تھے۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے واپس آئے ہیں۔"

"بیگم جی تو ٹھیک ہیں؟"

"ہاں جی! ایس ایچ او انہیں بھی تھانے میں بلا رہا تھا مگر چودھری عزیز اور چودھری نشاط نے انہیں نہیں جانے دیا۔ بیگم جی آپ کے بارے میں بھی پریشان ہیں جی۔ ابھی کچھ دیر پہلے عبید اللہ سے آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ مجبوری تھی عبید اللہ نے کچھ نہیں بتایا۔"

شیدے کے آخری الفاظ نے میرے سینے میں خوشگوار دھڑکنیں جگا دیں۔ اپنے لیے بیگم بلقیس کی فکر مندی مجھے ہمیشہ ہی دل کی گہرائیوں سے متاثر کرتی تھی۔

جاتے جاتے شیدے نے ایک بار پھر ہم سے کہا کہ ہم بہت ضرورت کے تحت ہی تہ خانے سے نکلیں۔ باہر حالات ہمارے لیے اچھے نہیں ہیں۔

یہ اسی رات دس گیارہ بجے کی بات ہے۔ ہم تاش سے دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تہ خانے میں گرمی محسوس ہو رہی تھی اس لیے ہم نے قمیصیں اتاری ہوئی تھیں۔ تہ خانے کے دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ میں سمجھا شاید شیدا ٹھنڈی اسکنجبی وغیرہ لے کر آیا ہے۔

لیکن تہ خانے میں آنے والا شیدا نہیں تھا اور نہ ہی اس کے پاس کوئی ٹھنڈی چیز تھی۔ وہ سخت گرم بلکہ آتشیں خبر لایا تھا۔ یہ گورکیے میں ہمارا وفادار مخبر رملی تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔

اندر آتے ہی اس نے پہلے ماحول کا جائزہ لیا پھر سنسنی خیز انداز میں بولا۔ "سالار صیب! بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ پاشے نے اپنا آپ دکھا دیا ہے۔ وہ شام پور میں اماں دلشاد کی طرف گیا ہے۔ یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"میں آپ کو بالکل اندر کی بات بتا رہا ہوں۔۔۔۔۔ بالکل اندر کی۔" رملی کی آواز کانپ رہی تھی۔ "پاشا اماں کی چھوٹی بیٹی ثمینہ کو اٹھانے گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ اب تک کاروائی ڈال بھی چکا ہو گا۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ موکھل پاشا بدترین ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔ ثمینہ ایک عرصے سے اس کے نشانے پر تھی۔ آج وہ اس پر جھپٹ پڑا تھا۔

رملی کہہ رہا تھا۔ "یہ پاشا بڑا خبیث ہے جی۔ اس کو پتا ہے کہ آپ اس وقت چھپے ہوئے ہیں۔ پولیس آپ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ اس نے اماں کی بیٹی پر ہتھ ڈالنے کے لیے یہ موقع بہت اچھا سمجھا ہے۔"

"خبر پکی ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"سولہ آنے پکی جی۔" رملی نے مخصوص انداز میں اپنے مدقوق ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر کہا۔

"اماں سے بھی تھوڑی سی غلطی ہوئی ہے۔ اسے لڑائی سے پہلے حویلی واپس آجانا چاہیے تھا۔"

میں نے قمیص پہنتے ہوئے کہا۔ "تیمور! مجھے جانا ہے۔"

تیمور نے میرے فیصلہ کن لہجے کو محسوس کیا اور چونک کر میری طرف دیکھا۔ پھر وہ عزم سے بولا۔ "تم جاؤ گے تو میں بھی جاؤں گا۔"

"یہ بے وقوفی ہے تیمور۔۔۔۔۔ اگر ہم سارے ہی جیل پہنچ گئے تو اس کی سب سے زیادہ خوشی موکھلوں کو ہی ہو گی۔"

تیمور نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں نے کسی نہ کسی طور اسے سنبھال لیا۔ میں نے چھوٹی نال کی رائفل اپنی چادر کے نیچے چھپائی۔ کمر سے گولیوں والی بیلٹ لگائی اور ایک فالتو میگزین شلوار کی جیب میں رکھ لیا۔ اپنا چہرہ منڈاسے میں چھپا کر میں اس کچے تہ خانے سے باہر نکل آیا۔ میری جانی پہچانی گھوڑی اصطبل میں ہی موجود تھی۔ زین کس کے میں اس پر سوار ہوا اور رملی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ رملی بھی گھوڑی پر سوار تھا۔ اب رملی کو واپس موکھلوں کے پنڈ گورکے میں پہنچ جانا تھا۔ رملی نے یہ بات پورے یقین سے بتائی تھی کہ ثمینہ کو شام پور سے اٹھانے کے بعد پاشے نے اسے مچھلی فارم کے ساتھ والے کارخانے میں لانا ہے۔ اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں نے شام پور کی طرف جانا ہے یا کارخانے کی طرف۔ یہی سوال میں نے رملی سے پوچھا تو وہ بولا۔ "اس ویلے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سالار جی! ہو سکتا ہے کہ آپ شام پور کی طرف جائیں تو وہ لوگ لڑکی کو لے کر کارخانے میں پہنچ جائیں۔"

میں نے کہا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر میں سیدھا شام پور کی طرف جاؤں تو پاشے کے پہنچنے سے پہلے ہی اماں دلشاد کے گھر پہنچ جاؤں۔"

رملی نے اثبات میں سر ہلا کر میری تائید کی۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا اور سوچنے کے لئے زیادہ وقت بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے بس چند سیکنڈ سوچا اور پھر رملی کو خدا حافظ کہہ کر اپنی بے تاب گھوڑی کا رخ کارخانے کی طرف موڑ دیا۔ اس گھوڑی سے میرا پرانا دوستانہ تھا۔ یہ جیسے میرے اندر کے حالات کو سمجھتی تھی۔ میرے سینے میں جو طوفان برپا تھا، اس کی شدت گھوڑی کے پاؤں میں بھی منتقل ہو گئی تھی اور وہ جیسے ہوا میں اڑی چلی جا رہی تھی۔ پاشے کا بھوری آنکھوں والا منحوس چہرہ بار بار میری نگاہوں میں آ رہا تھا اور میرے اندر کے نیلے شعلوں کو ہوا دے رہا تھا۔

اب یہ ایک اتفاق ہے کہ میں جس وقت کارخانے سے قریباً ڈھائی تین فرلانگ کے فاصلے پر پہنچا، میں نے موکھلوں کی جیپ کو دیکھا۔ یہ بند جیپ تیزی سے ہچکولے کھاتی کارخانے کی طرف جا رہی تھی۔ میرا اور جیپ کا فاصلہ 100 میٹر کے قریب تھا یا شاید تھوڑا سا کم ہی ہو گا۔ میں نے چلانے کی مدھم نسوانی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی کسی مرد کی کرخت دھمکاتی

ہوئی آواز ابھری۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میرے ذہن میں چنگھاڑتے ہوئے اندیشے کہہ رہے تھے۔ چڑیا، عقاب کے پنجوں میں تھی۔ وہ اس کی چیر پھاڑ کے لیے اسے اپنے گھونسلے میں لے جا رہا تھا۔

میں نے اپنی برق رفتار گھوڑی کو کچے راستے سے اتار کر کھیتوں میں ڈال دیا۔ میں شارٹ کٹ لگا کر پاشے کے سر پر پہنچنا چاہتا تھا۔ گھوڑی نے بھی میرا پورا ساتھ دیا۔ وہ گندم اور سبزی کے کھیتوں میں دندناتی ہوئی کارخانے کے سامنے والے حصے کی طرف بڑھی لیکن یہاں وہ ایک جگہ چوک گئی۔ اس کا اگلا پاؤں کسی درخت کے کٹے ہوئے تنے سے ٹکرایا اور وہ گر گئی۔ میں اس کے اوپر سے ہوتا ہوا آلوؤں کے کھیت میں گرا۔ کھاد اور گیلی مٹی کی بو میرے نتھنوں میں گھسی۔ میں نے گھوڑی کو پھر کھڑا کیا۔ جست لگا کر سوار ہوا مگر عین اس وقت اندازہ ہوا کہ گھوڑی میرا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ اس کا اگلا سم زمین کو نہیں چھو رہا تھا۔ میں نے نیچے اتر کر اس کی ٹانگ کو تھپتھپایا۔ اس کی آواز میں کرب تھا اور ایک بے چین بے بس آواز تھی۔ میں نے اسے ایک شاخ سے باندھا اور پیدل کارخانے کی طرف بڑھا۔

میں نے دیکھا، دور اندھیرے میں جیپ کی عقبی سرخ بتیاں کارخانے کے گیٹ کے پیچھے اوجھل ہو رہی تھی۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ میں ایک چکر کاٹ کر کارخانے کے پچھواڑے پہنچا۔ یہاں ایک جگہ باہر کی زمین اونچی تھی اور دیوار کی بلندی کم محسوس ہوتی تھی۔ مجھے قریب ہی ایک خستہ حال ریڑھا نظر آیا۔ اس کا ایک پہیا ندارد تھا۔ میں ریڑھے کو گھسیٹ کر دیوار کے پاس لے آیا۔ ریڑھے کے اوپر چڑھا تو دیوار کے بلائی سرے تک ہاتھ پہنچ گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں دھند سی بھری ہوئی تھی۔ صرف ایک ہی خیال تھا کہ مجھے کسی بھی طرح معصوم صورت ثمینہ کو پاشے کے خونی پنجوں سے بچانا ہے۔ اس کے لیے مجھے چار چھ بندوں کی جان لینی پڑے یا میری اپنی جان چلی جائے، کوئی پروا نہیں۔ والی جی کے آخری دنوں میں ان کے ساتھ میری جو باتیں ہوئی تھیں وہ میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے اماں دلشاد اور اس کی بیٹیوں کا محافظ ٹھہرایا تھا اور بڑے مان سے ٹھہرایا تھا۔ اب وہ خود نہیں تھے مگر ان کے الفاظ تو تھے۔ یہ الفاظ جیسے مجسم شکل اختیار کر گئے تھے اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

جب بندے کے ذہن میں تند آندھی چلتی ہے تو پھر وہ بہت سے اندیشوں، بہت سے حقیقتوں اور احتیاطوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس وقت میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں موکھلوں کے ڈیرے میں گھس رہا تھا اور یکسر تنہا تھا۔ میں نے دیوار پر پہنچ کر اپنے پاؤں نیچے لٹکائے اور اندازے سے گہری تاریکی میں چھلانگ لگا دی۔ میرے پاؤں کچی نرم زمین سے ٹکرائے اور دھپ کی مدھم آواز پیدا ہوئی۔ اور یہی وقت تھا جب مجھے اندازہ ہوا کہ میں ایک فاش غلطی کر چکا ہوں۔ شاید اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی۔ احاطے کی نہایت گہری تاریکی میں درختوں اور جھاڑیوں نما پودوں کے درمیان مجھے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ ایک غصیلی گونج جو آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے لیے یہ خون خوار آواز اجنبی نہیں تھی۔۔۔۔وہ گہری تاریکی میں میرے بالکل قریب موجود تھا۔ شاید پانچ چھ میٹر کے فاصلے پر۔ اور یہ وہ تھا، جانوروں میں جس کی درندگی کی مثال دی جاتی ہے۔

میری گرفت رائفل پر مضبوط ہوئی اور پھر مجھے جھاڑی پودوں کی گہری تیرگی میں دو انگارے سے روشن نظر آئے۔ ہاں، یہ وہی بنگالی شیر تھا جس کی دہشت علاقے کے لوگوں کے دلوں

میں عرصے سے جا گزیں تھی۔۔۔۔اور اس رات کی گھمبیر تاریکی میں اس بلند چار دیواری کے اس وسیع احاطے میں وہ بالکل غیر متوقع طور پر میرے سامنے آ گیا تھا۔

خوف کی لہر کے بعد جو پہلا احساس مجھے ہوا، وہ حیرت کا تھا اور حیرت اس بات کی تھی کہ یہ درندہ تو گورکیے میں موکھلوں کی رہائش گاہ پر پایا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں جو بھی سنا اور کہا گیا تھا، اس کا تعلق موکھلوں کی رہائش گاہ سے ہی تھا۔ اسے رات کے وقت رہائش گاہ کے احاطے میں کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ مگر آج یہ رہائش گاہ کی بجائے کارخانے کے احاطے میں نظر آ رہا تھا۔ شاید آج جو کچھ یہاں ہونے والا تھا۔ یہ اس کی رکھوالی کے لیے موجود تھا۔ اس حیرت کے ساتھ جو دوسرا احساس مجھے ہوا، وہ یہ تھا کہ درندہ اسی طرح میری طرف متوجہ تھا اور کسی بھی لمحے مجھ پر جھپٹ سکتا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اسے بجلی کی تڑپ اور گولی کی سپیڈ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ درندے کی لرزہ خیز آواز بلند ہوئی۔ روشن انگارے بلا خیز تیزی سے میری طرف آئے۔ لیکن اس امر میں بہت دیر تھی کہ میری آٹو میٹک رائفل اس کی طرف سیدھی ہو سکتی، وہ مجھ پر آن پڑا۔ مجھے بہ عین یہی محسوس ہوا کہ کسی بہت طاقتور شخص نے بہت وزنی ہتھوڑے کو نہایت تیزی

سے گھما کر میرے کندھے پر ضرب لگائی۔ میں ہوا میں اڑتا ہوا سا پھول دار جھاڑیوں میں گرا۔ پہلے میرا سر زمین سے ٹکرایا پھر میں الٹ کر پشت کے بل چت ہو گیا۔

میرے دھندلائے ہوئے ذہن میں یہ خیال پوری قوت سے آیا کہ رائفل میرے ہاتھ سے نکل چکی ہے اور موکھل پاشا کا خون خوار پہرے دار مجھ پر دوسرا حملہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ کیا وہ کسی سوچ سمجھ کا نتیجہ نہیں تھا۔ یہ جان بچانے کا وہ اضطراری عمل تھا جو قدرت نے ہر جان دار کے اعصابی نظام میں فیڈ کر رکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم میں کب اپنی جگہ سے اٹھا اور کب تڑپ کر چند فٹ دور کھڑی ایک پرانی شیورلیٹ کار کے نیچے گھس گیا۔ اگلا منظر میری زندگی کے بھیانک ترین مناظر میں سے تھا۔ درندے نے لرزہ خیز انداز میں ہنکارتے ہوئے شیورلیٹ کے نیچے گھسنا چاہا۔ اس کے فولادی جسم اور شیورلیٹ کی باڈی کا تصادم ہوا۔ پوری گاڑی تھرا اٹھی اور چوں چراں کی کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ بنگالی شیر کا سر قریباً ایک فٹ تک اندر گھس آیا۔ اس کے وسیع منہ سے خارج ہونے والی حیوانی باس میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور اس کی گونج دار آواز سماعت کو دہلا گئی۔

شیورلیٹ گاڑی کافی نیچی ہوتی ہے۔اس پرانی شیورلیٹ کے پہیوں کی ہوا نکلی ہوئی تھی اور یہ نہ جانے کب سے یہاں کھڑی کھڑی زمین میں دھنس چکی تھی۔درندے نے چند بار زور لگا کر نیچے گھسنا چاہا مگر گاڑی کو لرزہ براندام کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔اس کی سانسوں کی بو، اس کی قاتل چمکیلی آنکھیں،اس کی وحشی آواز۔۔۔۔۔یہ سب کچھ میرے ذہن پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو چکا تھا۔میں اب تاریکی میں اس کا ہیولا بہ خوبی دیکھ سکتا تھا۔اس کا جسم دو میٹر سے کم لمبا نہیں تھا،قریباً ایک میٹر کی دم اس کے علاوہ ہو گی۔اس کی چھاتی سفید تھی اور یہ سفیدی تاریکی میں بھی جھلک دکھا رہی تھی۔اس کی مالٹے رنگ کی دھاریاں دم کی طرف جا کر سیاہی مائل چھلوں کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔

احاطے کے پار سے ایک آواز ابھری۔"جگے۔۔۔۔۔جگے۔۔۔۔۔کیا ہوا جگے۔"میں نے ایک لحظے میں پہچان لیا۔یہ منحوس آواز موکھل پاشا کی تھی۔وہ اپنے پالتو کی بے چینی محسوس کر کے یہاں آیا تھا۔۔۔۔۔جگا در اصل اس بنگالی شیر کو کہا جاتا تھا۔

پاشا کی آواز دوبارہ ابھری۔وہ کسی غیاث نامی ملازم کو مخاطب کر کے بولا۔"جا دیکھ اسے کیا ہوا ہے"

چند سیکنڈ بعد مجھے ٹارچ کا ایک روشن دائرہ نظر آیا۔ٹارچ کی روشنی برآمدے کی طرف سے پھینکی جا رہی تھی۔میں نے خود کو گاڑی کے نیچے کچھ اور سمیٹ لیا۔شدید خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں زمین پر گری ہوئی میری رائفل ٹارچ کی روشنی میں نہ آ جائے۔روشن دائرے نے شیر کی دھاری دار جسم پر حرکت کی۔۔۔۔۔اور رائفل کے پاس سے گزرتا ہوا گاڑی کی طرف آیا۔تب غالباً غیاث نامی ملازم نے ہونٹوں سے "پچ پچ" کی آواز نکالی اور جانور کو پرسکون کرنے کے لیے بولا۔"شانت جگے۔۔۔۔۔شانت!"

ٹارچ بجھ گئی۔اندازہ ہوا کہ غیاث جو شاید اس بنگالی شیر کا رکھوالا بھی تھا۔برآمدے کی طرف واپس چلا گیا ہے۔یقیناً اس نے یہی سمجھا تھا کہ جانور جھاڑیوں میں کسی چوہے گلہری وغیرہ کو دیکھ کر مشتعل ہو رہا ہے۔

اب میں اوندھے منہ شیورلیٹ کے نیچے تھا اور خون خوار جانور شیورلیٹ کے ارد گرد چکرا رہا تھا۔شاید وہ گزرنے والے ماہ و سال میں آدم خور ہو چکا تھا اور اب یہاں میری خراشوں وغیرہ سے رسنے والی خون کی مہک اسے ہیجان میں مبتلا کر رہی تھی۔حقیقت یہی ہے کہ مجھے اس قسم کے جانوروں کی عادات اور خصائل کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔۔۔۔۔بنگالی

شیر کو اس سے پہلے میں نے صرف لاہور کے چڑیا گھر میں دیکھا تھا۔ صرف اتنا پتا تھا کہ اسے رائل بنگلہ ٹائیگر کہا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر انڈیا اور بنگلہ دیش میں پایا جاتا ہے اور درندگی میں اپنی مثال آپ ہے۔ یا پھر لاہور میں ایک پرانی انگریزی فلم دیکھی تھی جس میں ایک قریباً چار من وزنی مادہ ٹائیگر کا ذکر تھا جو اپنی بھوک سے مجبور ہو کر پہلے سانپوں اور بندروں وغیرہ پر حملہ کرتی رہی پھر آدم خور ہو گئی۔ اس فلم میں بنگلہ ٹائیگر کی تمام تر خون آشامیوں کو نمایاں کیا گیا تھا۔

اور اب رائل بنگلہ ٹائیگر موت کا ہرکارہ بن کر میرے ارد گرد چکر لگا رہا تھا۔ دو تین منٹ بعد اچانک اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ میرے عین سامنے قریباً دس فٹ کے فاصلے پر کچی زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کی قاتل آنکھیں بہ دستور مجھ پر لگی تھیں۔

میرے اندر اس درندے کو دیکھنے کے بعد خوف کی جو فوری لہر ابھری تھی، وہ اب معدوم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس خوف کی جگہ اب ایک طرح کا طیش اور مقابلے کا عزم پیدا ہو رہا تھا۔ ان سنگین ترین لمحات میں کہاں سے آیا تھا یہ عزم؟ اس سوال کا ایک ہی جواب تھا۔ ہاں وہی ایک چہرہ، وہی ایک ہستی جو میرے دل میں سمانے کے بعد میری روح میں اتر چکی تھی۔

موت کو اپنے روبرو دیکھ کر مجھے وہی یاد آ رہی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی۔ ہمت کرو، تم جیتو گے۔ تم کو جیتنا ہے۔ زندہ رہنا ہے۔ اپنے لئے اور میرے لئے!۔

پھر حامد کا چہرہ میری نگاہوں میں آیا۔ ایک بار اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا تھا۔ "ماسٹر چاچا! اگر شیر یہاں آگیا تو آپ کیا کرو گے اس کے ساتھ؟" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ "ہم اس کی آنکھوں کے درمیان گولی ماریں گے اور پھر اس کی کھال اتار کر، اس میں بھوسا بھر کر حویلی کے سامنے لٹکا دیں گے۔"

اور آج وہ خونی جانور واقعی میرے سامنے تھا۔ مجھ سے صرف دس فٹ کے فاصلے پر مورچا جمائے بیٹھا تھا۔ میں تاریکی میں اس کی بے چین متحرک دم کو دیکھ سکتا تھا۔ یہ بات تو اکثر میرے ذہن میں آیا کرتی تھی کہ کبھی موکھل پاشا کے شیر سے ملاقات ہو سکتی ہے لیکن یہ ملاقات ایسے سنگین ترین حالات میں ہو گی، یہ سوچا بھی نہ تھا۔ میری رائفل مجھ سے قریبا بیس فٹ کے فاصلے پر تھی اور گاڑی سے نکل کر اس تک پہنچنا دردناک موت کو دعوت دینا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی پورے یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس گاڑی کے نیچے محفوظ رہ

سکوں گا یا نہیں۔ عین ممکن تھا کہ قریباً ساڑھے چار سو پونڈ وزنی یہ مشتعل جانور زیادہ زور لگائے تو آگے تک آنے میں کامیاب ہو جاتا۔

وقت آگے سرک رہا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اور قاتل کب تک اس طرح ایک دوسرے کے سامنے موجود رہیں گے۔ مجھے کب رائفل تک پہنچنے کا موقع ملے گا اور موقع مل گیا تو پھر کیا ہو گا؟ میں نے اس درندے کو شوٹ کر دیا تو اس کے بعد اس چار دیواری میں صورتِ حال میرے لیے کیا رخ اختیار کرے گی؟ کئی دہکے ہوئے سوالات اور ان میں سے سب سے اہم یہی تھا کہ میں کتنی دیر تک رائفل تک پہنچنے کا انتظار کروں گا؟

اپنے اس آخری سوال کا جواب مجھے جلد ہی مل گیا۔ زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ یہ جواب ایک چلاتی ہوئی آواز کی صورت میں ملا۔ یہ مدھم نسوانی آواز کارخانے کے کسی اندرونی کمرے سے بلند ہوئی تھی۔ یہ کس کی آواز تھی اس کا جواب میں بہ خوبی جانتا تھا۔ میرے سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ دھڑکن بڑھ گئی۔ مجھے جلد سے جلد کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

گاڑی کے نیچے لیٹے لیٹے میں نے نگاہیں پھر اس جگہ جما دیں جہاں رائفل گری تھی۔ رائفل پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ تاہم گھاس میں سے اس کی ابھری ہوئی نال کا حصہ میں دیکھ

سکتا تھا۔ میں نظروں نظروں میں بھانپنے لگا کہ میں کتنی دیر میں رائفل تک پہنچ پاؤں گا اور جانور کے اٹھنے اور حرکت میں آنے کی رفتار کیا ہو گی؟ ٹائمنگ کا ٹھیک اندازہ لگانا دشوار تھا مگر جتنا اندازہ لگایا جا سکتا تھا وہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ میں ایک سنگین ترین دوراہے پر تھا اور دوسری طرف وہ چڑیا تھی جو بھوکے عقاب کے گھونسلے میں پہنچ گئی تھی۔۔۔۔۔ دوسری طرف 450 پونڈ وزنی بنگلہ ٹائیگر کے روپ میں مجسم موت میرے سامنے تھی۔ میں نے سوچا۔ "کیا یہ آخری لمحے ہیں؟ کیا کل صبح میری موت کی خبر بیگم بلقیس پھر بے بی جی تک پہنچنے والی ہے؟"

اسی دوران میں کسی اندرونی کمرے سے اماں دلشاد کی معصوم صورت بیٹی کی روتی بلکتی آواز پھر ابھری۔ اس کے جو الفاظ بھی سمجھ میں آئے۔ وہ پکار رہی تھی۔ "امی۔۔۔۔۔ امی جی۔" میں سرکتا ہوا گاڑی کے بالکل کنارے پر پہنچ گیا۔ حرکت سے جانور کے جسم میں بھی حرکت پیدا ہوئی۔ وہ الرٹ ہو گیا تاہم وہ ابھی تک اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سب کچھ فراموش کر کے نگاہیں رائفل پر مرکوز کیں۔ اپنے جسم کی تمام توانائی اور تیزی کو بروئے کار لا کر گاڑی کے نیچے سے نکلا اور اندھا دھند رائفل کی طرف بھاگا۔

جانور، درندہ، بنگالی شیر یا رائل ٹائیگر۔۔۔۔اسے کسی بھی نام سے پکارا جاتا، مطلب ایک ہی تھا۔موت۔۔۔۔ مجسم موت !اور موت بے انتہا تیزی کے ساتھ حرکت میں آئی اور میرے پیچھے لپکی۔میں نے اپنی پشت پر نکیلے پنجوں کی تصوراتی چبھن محسوس کی۔پھر میں نے بھاگتے بھاگتے کسی پیراک کی طرح جست لگائی اور رائفل کے اوپر گرا۔میرے ہاتھوں نے رائفل کا سخت لمس محسوس کیا۔رائفل تھامتے ہوئے میں نے گھاس پر دو تین پلٹے کھائے۔وہ میرے اوپر آیا۔اس کی بو،اس کی قاتل پھنکار،اس کی "فر" کا مہلک لمس۔یہ سب کچھ ناقابل فراموش اور بھیانک تھا۔میں نے سنا تھا کہ یہ گردن پر حملہ کرتا ہے۔میں نے اپنی گردن کو بے ساختہ اپنے بازو کی آڑ فراہم کی۔مجھے لگا، میری دائیں کلائی کسی شکنجے کی زد میں ہے۔یہ بنگلہ ٹائیگر کا جبڑا تھا۔میں نے رائفل تھام تو لی تھی مگر اس سے فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔میں نے بیرل کی طرف سے بنگلہ ٹائیگر کے چہرے پر اندھا دھند ضرب لگائی۔ مجھے نہیں معلوم یہ ضرب کہاں لگی اور اس نے کتنا نقصان پہنچایا۔صرف یہ احساس ہوا کہ یہ شدید ضرب تھی اور ٹائیگر کی آنکھ کے آس پاس تھی۔وہ تڑپ کر دھاڑا۔ایک لحظے کے لیے مجھ پر اس کی گرفت ختم ہوئی۔میں اٹھ کر بھاگا۔بھاگتے بھاگتے میں نے رائفل کی پوزیشن درست کر کے انگلی ٹائیگر تک پہنچادی۔میں نے بہ مشکل پانچ چھ قدم طے کیے ہوں گے کہ

قریباً 450 پونڈ وزنی مشتعل جانور ایک بار پھر میرے اوپر آیا۔میں ایک نکیلے دھکے سے لڑکھڑانے کے بعد دور جا گرا۔گرتے ہوئے میں نے اپنا رخ بنگالی ٹائیگر کی طرف کر دیا۔ کہتے ہیں جسامت، طاقت اور پھرتی کا ملاپ کم ہوتا ہے۔اور اگر یہ تینوں چیزیں کسی جاندار میں آجائیں تو پھر خوفناک قسم کا شکاری وجود میں آتا ہے۔BIG CATS یعنی شیر، چیتے وغیرہ اس کی بہترین مثال ہیں۔اور یہ مثال قریباً آٹھ فٹ کے فاصلے پر میرے سامنے تھی۔میں جانتا تھا، یہ دو سو کلو گرام وزنی اور قریباً دو میٹر طویل درندہ اب جو جست لگائے گا وہ میری موت کا اعلان ہو گی۔یہ بس ایک ثانیے کا کھیل تھا۔میرا نشانہ چوک جاتا یا کسی وجہ سے رائفل چل نہ پاتی تو میری عدم آباد کی طرف روانگی یقینی تھی۔۔۔۔مجھے نہیں پتا میں نے کب ٹرائیگر دبایا، کب گولی چلائی۔رائفل سنگل شاٹ پر سیٹ تھی۔چمک کے ساتھ زوردار دھماکا ہوا۔جانور کے جسم کو جھٹکا لگا۔۔۔۔تاہم وہ جست لگا چکا تھا۔وہ میرے پاؤں کے قریب گرا۔میں نے پشت کے بل پیچھے کو کھسکتے ہوئے دوسرا فائر کیا۔اس بار بھی گولی لگی۔کہاں؟اس کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔

میرے کانوں میں برآمدے کی طرف سے چلاتی ہوئی آواز پڑی۔ "کون ہے۔۔۔۔اوئے کون ہے؟" پتا نہیں یہ کس کی آواز تھی۔

پھر شاید غیاثا دہاڑا تھا۔ "جگے جگے!"

جگا دو گولیاں کھا چکا تھا مگر ابھی تک میری طرف بڑھ رہا تھا۔اس کی آواز ہولناک تھی۔میں پشت کے بل کچھ اور پیچھے کو کھسکا۔وہ مزید آگے بڑھا۔اس تاریکی میں وہ مجھے کسی بہت بڑے گھڑیال کی طرح رینگتا ہوا نظر آیا۔اس کی حیوانی بو والی پھنکاریں میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ان میں الکحل کی باس تھی یا شاید یہ صرف میرا وہم تھا۔میں نے پیچھے کو کھسکتے ہوئے تیسرا فائر کیا اور یہ لازماً حامد سے کیے گئے وعدے کے عین مطابق اس درندے کی پیشانی پر تھا۔اس کا اٹھا ہوا سر نیچے جا گرا۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میری کلائی تیزی سے خون اگل رہی تھی لیکن یہ کلائی کی طرف دیکھنے کا موقع نہیں تھا۔ برآمدے کی طرف سے مجھ پر دو فائر ہوئے۔دونوں گولیاں میرے قریب سے گزریں۔میں اٹھا اور جھک کر بھاگتا ہوا شیورلیٹ کی اوٹ میں ہو گیا۔

موکھل پاشا کی للکار گونجی۔وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر چلایا۔ "ادھر ہے گاڑی کے پیچھے۔"

ایک اور آواز آئی۔ "فائر کرو۔"

اس کے ساتھ ہی ٹن ٹن کی آواز سے کئی گولیاں عمر رسیدہ گاڑی کی باڈی میں پیوست ہو گئیں۔مجھے اندازہ ہوا کہ یہ آڑ میرے لئے مناسب نہیں ہے۔میں باؤنڈری وال کے ساتھ جھک کر بھاگتا ہوا مین گیٹ کی طرف بڑھا مگر پہرے دار ادھر بھی چوکس ہو چکے تھے۔مجھے ٹارچوں کی روشنی دکھائی دی۔اس کے ساتھ ہی پاٹ دار آواز والا کوئی شخص دہاڑا۔ "بھاگنے نہ پائیں۔گھیر لو کتوں کو۔"

ان کا خیال تھا کہ اندر گھسنے والے ایک سے زیادہ افراد ہیں۔میں واپس مڑا اور درختوں کی اوٹ لیتا ہوا ایک دروازے میں گھس گیا۔یہ ایک چھوٹی سی راہداری تھی۔ہر طرف کچے چمڑے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔پکے فرش پر بدبودار پانی والے چھوٹے چھوٹے کئی حوض بنے ہوئے تھے۔ایک طرف گیس لیمپس کی روشنی ہو رہی تھی۔فرش پر نمک لگی ہوئی تازہ کھالوں کا ڈھیر تھا۔

"اوئے۔۔۔۔اوئے۔" ایک غصیلی آواز سنائی دی اور ایک ہٹا کٹا شخص تیزی سے میرے سامنے آیا۔اس کے ہاتھ میں فقط لاٹھی تھی۔مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔یقیناً میرا حلیہ حیران کن تھا۔گیلے کھیت میں گھوڑی سے گرنے کے بعد میں بری طرح لتھڑ گیا تھا۔بازو خون آلود تھا اور پورے جسم پر خونی خراشیں تھیں۔اس نے حقِ نمک ادا کرتے ہوئے مجھ پر لاٹھی سے حملہ کرنا چاہا۔میں نے اس کی ران پر گولی ماری اور اسے تڑپتا چھوڑ کر آگے بڑھا۔ایک اور کمرے میں بھی کچھ کھالیں نظر آئیں مجھے لگا کہ یہ صرف بھیڑ بکریوں کی ہی کھالیں نہیں ہیں۔ان میں ایک سیاہ ریچھ کی کھال اور ایک لومڑی کی کٹی پھٹی کھال میں نے صاف پہچانی۔

"وہ جا رہا ہے۔" پہلو سے پکارتی ہوئی غصیلی آواز ابھری۔یہ آواز موکھل پاشا کی تھی۔ٹرپل ٹو کے تین گونج دار فائر ہوئے۔گولیاں پختہ دیواروں سے ٹکرائیں۔میں نے رائفل کو برسٹ پر ایڈجسٹ کر لیا اور جھک کر بھاگتا ہوا ایک بڑے ڈیزل انجن کے عقب میں ہو گیا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے،بس ایک ہی دھن تھی،میں نے ثمینہ کو بچانا ہے۔مرنا ہے یا مار دینا ہے۔

"باہر آ جاؤ خاورے!نہیں تو کتے کی موت مار دیں گے۔" پاشا کی آواز عمارت میں گونجی ظاہر ہے کہ وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ابھی اس کی آواز کی بازگشت ختم نہیں ہوئی تھی کہ مجھ پر اوپر تلے پھر کئی فائر ہوئے۔میں نے جواب میں دو چھوٹے برسٹ چلائے۔

اچانک نہایت تیز سیٹی کی آواز سنائی دی جیسے کسی بڑے بوائلر سے بھاپ بے پناہ دباؤ کے ساتھ نکل رہی ہو۔

چند ہی سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ میرے نتھنوں سے ایک ناگوار بو ٹکرائی اور سانس سینے میں گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔اس کے ساتھ ہی میرے ارد گرد موجود لوگوں کی گھبرائی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔مجھے لگا کہ لوگ بدحواسی میں بھاگ رہے ہیں۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے خود سے پوچھا۔

ایک ہی جواب سمجھ میں آیا۔یہاں کوئی بڑا گیس سلینڈر وغیرہ موجود تھا جسے فائرنگ کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے اور اب اس کی زہریلی گیس تیزی سے عمارت میں پھیل رہی ہے۔گیس کے سبب مجھے لگا کہ کسی نے میرا گلا مضبوطی کے ساتھ دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا ہے۔اس

کے ساتھ ہی ایک بار پھر مجھے وہی پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "بچا۔۔۔۔۔خدا کے لئے بچاؤ۔"

اس مرتبہ آواز بالکل واضح تھی اور دائیں جانب سے سنائی دی تھی۔

میں نے سانس روک لی اور ڈگمگاتا ہوا آواز کی طرف دوڑا۔ گیس خارج ہونے کی تیز آواز پورے کارخانے میں گونج رہی تھی۔ مجھے لگا، میں نے سانس لی تو یہیں بے ہوش ہو کر گر جاؤں گا۔

ایک دروازہ دھڑ دھڑ بجایا جارہا تھا۔ میں دروازے کے سامنے پہنچا۔ اندر سے گھٹی گھٹی کھانسی سنائی دے رہی تھی میں نے دروازہ کا کھٹکا ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔ یہ ثمینہ ہی تھی۔ گیس لیمپ کی روشنی، اس کی دگرگوں حالت کو بتا رہی تھی۔ وہ سر اور پاؤں سے ننگی تھی۔ خوف سے سہمی ہوئی چڑیا کی طرح نظر آرہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی گیس نے پوری شدت سے اسے متاثر کیا۔ وہ کھینچ کر سانس لینے لگی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جارہی تھیں۔ میرے ابتر حلیے کے باوجود اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"سالار جی!" اس نے اتنا ہی کہا اور میرے اوپر ڈھے گئی۔ قریب ہی تپائی پر پانی سے بھرا ہوا جگ رکھا تھا۔ میں نے اپنا منڈاسا اور ثمینہ کا دوپٹا ایک ساتھ پانی میں بھگویا۔ ثمینہ نے دوپٹہ اور میں نے منڈاسا منہ کے گرد لپیٹ لیا۔ سانس روکے ہم باہر کی طرف بھاگے۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ بائیں طرف تازہ کھالوں کے ڈھیر لگے تھے ایک موٹا شخص اوندھے منہ پڑا تھا۔ اپنی پھٹی دھوتی کے سبب وہ نیم عریاں ہو چکا تھا۔ یقیناً اس پر گیس اثر کر چکی تھی۔

مجھے نہیں معلوم، ہم دونوں بری طرح کھانستے، گرتے پڑتے کس طرح کارخانے کے بغلی دروازہ تک پہنچے تھے۔ درازہ چوڑ چوپٹ کھلا تھا۔ ہم باہر نکل آئے مگر سانس ابھی تک رک رہی تھی۔ لگتا تھا گیس کارخانے کے ارد گرد بھی پھیل گئی ہے۔ ایک دو بار تو مجھے لگا کہ ثمینہ گر جائے گی۔ مگر کسی نہ کسی طرح وہ میرا ساتھ دینے میں کامیاب رہی۔

اور یہی وقت تھا۔ جب مجھے مچھلی فارم کی طرف سے لالٹینوں اور ٹارچوں کی روشنی نظر آئی۔ یہ کم و بیش بیس افراد تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور رائفلیں تھیں یقینی بات تھی کہ یہ ہمارے اپنے ہی بندے ہیں۔ مجھے بتایا تھا کہ لڑائی کے بعد مچھلی فارم والے رقبے پر عزیز نے بندے مقرر کر دیے ہیں۔ شروع میں، میں نے یہی سمجھا کہ یہ لوگ کارخانے میں

ہونے والی اندھا دھند فائرنگ اور گیس کی بو کی وجہ سے باہر نکلے ہیں۔ مگر بعد ازاں پتا چلا کہ ان تک یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ اماں دلشاد کی لڑکی کو اٹھا کر یہاں لایا گیا ہے اور میں اسے چھڑانے کے لیے یہاں پہنچ چکا ہوں، یہ اطلاع رملی نے رونق علی کو اور رونق علی نے یہاں تک پہنچائی تھی۔ رونق علی خود بھی یہاں مچھلی فارم میں پہنچ چکا تھا۔

سب سے پہلے رونق نے ہی آگے بڑھ کر مجھے تھاما۔

"اوئے خاور! تو ٹھیک تو ہے نا؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ اس کی فکر کرو۔" میں نے نیم جان ثمینہ کی طرف اشارہ کیا۔

دو بڑی عمر کے بندے آگے بڑھے اور ثمینہ کو سہارا دیتے ہوئے فارم کے اندر لے گئے۔

رونق علی، کرامت اور رضوان وغیرہ بہت مشتعل ہو رہے تھے۔ انہوں نے کارخانے کے کھلے ہوئے پھاٹک کے سامنے جا کر زبردست ہوائی فائرنگ کی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ نہ ہی کہیں کوئی متنفس دکھائی دیا۔ لگتا تھا کہ زہریلی بو نے کارخانے کے سارے شرابیوں کا نشہ ہرن کر دیا ہے اور وہ بھاگ گئے ہیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تین چار بندے منہ پر گیلے کپڑے لپیٹ کر کارخانے کے احاطے میں گھس گئے اور اس بند جیپ کو آگ لگا دی جس پر ثمینہ کو اٹھا کر یہاں لایا گیا تھا۔ احاطے میں شعلوں نے روشنی بکھیری تو لوگوں کو ایک اور حیران کن منظر نظر آیا۔۔۔۔ یہ مردہ بنگالی شیر تھا۔ یہ موکھلوں کے کالے ٹریکٹر کے پاس بے سدھ پڑا تھا۔ مچھلی فارم کے چند جوشیلے پہرے داروں نے مردہ شیر کی ایک پچھلی ٹانگ سے رسی باندھی اور اسے جھٹکوں سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے۔۔۔۔ ہاں، یہی وہ موذی جانور تھا جس نے ایک عرصے سے علاقے کے مکینوں کی نیندیں برباد کر رکھی تھیں۔ وہ سفاک مالک کا خون آشام پالتو تھا۔ اس کی دہشت کھیت اور گلی گلی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ڈراوے سے لوگوں کے حق مارے گئے تھے۔ فصلیں اٹھائی گئی تھیں اور عزتیں لوٹی گئی تھیں۔ آج وہ خاک و خون میں لتھڑا پڑا تھا۔۔۔۔

"شاہ خاور! تم نے مارا ہے اسے؟" رونق علی نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔

"میں نے صرف گولی چلائی ہے۔ اسے اس کی خون خواری نے مارا ہے اور اس کے مالک کو بھی اس کی خوں خواری اور بے رحمی مارے گی۔"

رونق علی نے مجھے گلے سے لگالیا۔ لوگوں کے چہرے دیدنی تھے۔ ٹارچوں کے روشن دائرے بنگالی شیر کے دھاری دار جسم پر گردش کر رہے تھے۔ اس کا تھوبڑا خون سے لتھڑا ہوا تھا اور آنکھوں سے اب تک درندگی ٹپک رہی تھی۔ مختارے نے کہا۔ "تین گولیاں لگی ہیں جی۔ ایک سینے میں، ایک گردن میں۔ لیکن اصل کام ماتھے والی گولی نے کیا ہے۔"

رونق علی نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "پاشے کے اس پالتو کی لاش گلیوں میں گھمانی چاہیے۔ یہی ایک طریقہ ہے پاشے کی دہشت کم کرنے کا۔"

کچھ ایسی ہی بات میرے ذہن میں بھی آرہی تھی۔ جانور تو اب مر ہی چکا تھا۔ اس کی لاش کی تشہیر سے لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا خوف کم ہو سکتا تھا۔

میں نے کئی افراد کے ساتھ مل کر مردہ جانور کو اٹھایا۔ اور ایک کھلی جیپ میں لاد دیا۔ مچھلی فارم کے رقبے پر ہمارا قبضہ مضبوط ہو چکا تھا۔ خاردار تاروں اور دیوار کے علاوہ باقاعدہ لکڑی کا پھاٹک بھی لگا دیا گیا تھا۔ کرامت اور رضوان سمیت قریباً پچیس بندے ہر وقت یہاں چوکس تھے۔ میں اس چوکسی کے بارے میں ساتھیوں کو مزید ہدایت دے کر اور ان کا حوصلہ بڑھا

کر جیپ میں آبیٹھا۔ درختوں میں بندھی ہوئی اپنی زخمی گھوڑی کی طرف میں نے کرامت کو بھیج دیا اور خود تین ساتھیوں کے ہمراہ راجوال روانہ ہو گیا۔

جس وقت ہم راجوال پہنچے، صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

جلد ہی یہ خبر آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی کہ موکھلوں نے دلشاد اماں کی بیٹی کو اغوا کر کے بے آبرو کرنے کی کوشش کی ہے اور اس واقعے میں موکھل پاشا کا بنگالی شیر کارخانے میں مارا گیا ہے۔ کارخانے میں زہریلی گیس پھیلنے کی خبر بھی ہر طرف چکرانے لگی۔ اماں دلشاد کے بارے میں پتا چلا کہ اس کی بیٹی راشدہ شادی والے گھر میں تھی اس لئے بچ گئی۔ ثمینہ کو بچانے کی کوشش میں اماں کے سر پر چوٹیں آئی تھیں اور وہ کافی دیر تک بے ہوش رہی تھی۔

پو پھٹتے ہی راجوال کی گلیوں میں مردہ شیر کو دیکھنے کے لیے ہجوم ہو گیا۔ اسی دوران میں پولیس بھی موقعے پر پہنچ گئی۔ میں چاہتا تو پولیس کے آنے سے پہلے پھر روپوش ہو سکتا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، میں پولیس سے مزید بھاگنا نہیں چاہتا تھا۔ میں مجرم نہیں تھا اور جو مجرم تھے وہ دندناتے پھر رہے تھے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یوں روپوش رہ کر میں اور تیمور وغیرہ اپنا کیس خراب کر لیں گے۔

ایس ایچ او میاں وارث نے کہا۔ "خاورے ! میں تجھے گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کیا یہ زیادہ اچھا نہیں تھا کہ پہلے تم اس کو گرفتار کرتے جس نے ہماری لڑکی کو اغوا کیا ہے اور اسے بے آبرو کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"اس کو بھی پکڑا جائے گا اور تم مجھے میرا کام نہ سمجھاؤ۔ مجھے پتا ہے کہ مجھے کس وقت کیا کرنا ہے۔" انسپکٹر وارث کا لہجہ درشت تھا۔

میری گرفتاری کا سن کر بہت سے لوگ میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے اور آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ ایک دو نہیں تھے۔۔۔۔۔ ڈھائی تین سو لوگ تھے اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان میں مسلح افراد بھی موجود تھے۔ اور وہ سب جانتے تھے کہ ایس ایچ او وارث موکھلوں کی سائیڈ لے رہا ہے۔

یہ سب میرے اور پولیس پارٹی کے درمیان آ گئے۔ ایک آواز نے پکار کر کہا۔ "ہم سالار جی کو گرفتار نہیں ہونے دیں گے۔ دیکھیں گے، کون مائی کا لال ان پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ ہم لاشیں بچھا دیں گے۔"

ایک اور شخص پکارا۔ "پہلے چھوٹے موکھل اور موکھل پاشا کو گرفتار ہونا چاہیے۔"

بہت سے لوگ اس آواز میں آواز ملانے لگے۔ انسپکٹر وارث نے کہا۔ "میں نے گرفتاری تو کرنی ہی کرنی ہے۔ جو لوگ اس کام میں روڑے اٹکائیں گے، ان کے خلاف بھی پرچے درج ہوں گے لیکن پہلے میں تمہاری جاگیر دارنی سے بات کر لوں۔"

میں نے کہا۔ "کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے انسپکٹر۔ میں خود گرفتاری دوں گا لیکن پہلے میں گاؤں کا ایک چکر لگاؤں گا۔۔۔۔۔ اور یہ جیپ میرے ساتھ ہو گی۔"

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد پولیس پارٹی اس شرط پر مان گئی کہ پولیس اہلکار میرے ساتھ ساتھ رہیں گے۔

اب دھوپ نکل آئی تھی۔ گاؤں کے نیچی چھتوں والے گھر اور کھیت کھلیان خوب روشن ہو چکے تھے۔ گلیوں میں اور چھتوں پر ہجوم تھا۔ مردہ شیر جیپ پر تھا۔ میں نے جیپ خود چلاتے ہوئے پورے راجوال کا چکر لگایا۔ پولیس اہلکار گھوڑوں پر سوار میرے ساتھ ساتھ تھے۔ لوگوں کے چہرے پر جھلکنے والا اطمینان اور خوشی کے تاثرات نے میرے سینے میں بھی ٹھنڈک ڈال دی۔ وہ میرے لئے مارچ کے مہینے کی ایک یادگار صبح تھی۔

مجھے گرفتار کر کے حوالات پہنچا دیا گیا۔ مجھ سے عناد رکھنے کے باوجود ایس ایچ او میاں وارث میرے ساتھ کسی طرح کی بدسلوکی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ میرے پیچھے جاگیر اور جاگیر والوں کا ہاتھ ہے۔ بہرحال، اس بات کا شدید دکھ رہا کہ نہایت واضح ثبوت ہونے کے باوجود چھوٹے موکھل کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ موکھل پاشا کو بھی لاپتا قرار دے دیا گیا۔ موکھل پاشا کے بس تین چار ساتھیوں کو گرفتار کر کے خانہ پُری کر دی گئی۔ ایس ایچ او وارث کو میرے ساتھ جو نرم رویہ اختیار کرنا پڑا، اس کی ایک بڑی وجہ بارے اور فیقے والا واقعہ بھی تھی۔ ان ڈکیتوں کو مار کر ہم نے پولیس کا کام نمٹایا تھا، اور پولیس کے حصے میں مفت کی نیک نامی بھی آئی تھی۔ انتظامیہ کے افسران نے کہا تھا کہ ڈاکوؤں کے سر کی جو قیمت مقرر کی گئی تھی، اس میں سے ہمیں معقول رقم ملے گی۔ یہ انعامی رقم اب تک ہمیں نہیں ملی تھی تاہم وارث کی شکل میں ایک کرخت افسر ضرور مل گیا تھا۔

کارخانے سے خارج ہونے والی گیس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ دو بڑے سلینڈروں سے نکلی تھی۔ درحقیقت موکھلوں کے اس کارخانوں میں کھالوں کو ابتدائی "ٹریٹ منٹ" دی جاتی تھی۔ اسے چمڑا سکھانے کی PREPARATORY STAGE کہا جاتا ہے۔ اس

میں عام طور پر کرومیم وغیرہ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ لوگ تجرباتی طور پر ایک گیس استعمال کر رہے تھے جو خاصی زہریلی بھی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں سے کچھ ایسے جانوروں کی کھالیں بھی ملیں جنہیں غیر قانونی طور پر شکار کیا گیا تھا۔ میری کلائی بنگالی شیر کے جبڑوں نے بری طرح زخمی کی تھی۔ تاہم کلائی کی دو ہڈیاں بچ گئی تھیں۔ رونق علی خود لاہور گیا اور میرے لئے کاٹے کا انجکشن اور ڈاکٹر لے کر آیا۔ ڈاکٹر ہی کی ہدایت کے مطابق اگلے چند روز تک میری مرہم پٹی کی گئی۔ یہ رام چند نامی ہندو ڈاکٹر تھے، تاہم نفیس آدمی تھے۔

کارخانے والے واقعے کے بعد میری شہرت میں اضافہ ہوا۔ بارے اور فیقے وغیرہ کی موت کے بعد جو تاثر میرے بارے میں قائم ہوا تھا، وہ گہرا ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ اگست کا مہینا تھا۔ اب مجھے جیل میں بند ہوئے قریباً پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ میرے بعد نصراللہ نے بھی گرفتاری دے دی تھی۔ ان پانچ مہینوں میں جاگیر کے اندر کافی تبدیلیاں آئی تھیں۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید چودھری عزیز میری گرفتاری سے فائدہ اٹھانے کی

کوشش کرے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ غالباً چودھری بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ موکھلوں اور لمبڑوں کے سامنے ڈٹے رہنے کے لیے میرا وجود ضروری ہے۔ اس کے علاوہ میں نے محسوس کیا تھا کہ بلقیس بھی اب کافی ہوش مندی اور ذمے داری کا ثبوت دینے لگی تھیں۔ وہ جاگیر کے وکیل اقبال راٹھور کے ذریعے پوری طرح میری پیروی کرا رہی تھیں اور چودھری عزیز کے علاوہ خود بھی میری خبر رکھتی تھیں۔ چودھری عزیز سے میں نے جن رجسٹریوں پر دستخط لیے تھے، ان کا انتقال ہو چکا تھا اور اب چودھری کو پوری طرح راہِ راست پر رکھنے کے لیے یہ مضبوط وسیلہ بھی میرے پاس موجود تھا۔۔۔۔ بنگالی شیر کی موت والے واقعے کا علاقے میں خوب چرچا ہوا تھا۔ درحقیقت یہ واقعہ علاقے کے مکینوں کے دلوں پر نقش ہو گیا تھا۔

وہ برسات کی ایک ابر آلود سہ پہر تھی جب ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں میری ملاقات آئی۔ یہ تیمور تھا۔ وہ بھی ڈھائی تین ماہ گرفتار رہا تھا مگر اب عدم ثبوت کی بنیاد پر اس کی ضمانت ہو چکی تھی۔ اسے چھوٹے اصطبل کا رارکھا (انچارج) بنا دیا گیا تھا اور تنخواہ میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو گیا تھا۔

تیمور سے میری ملاقات چھوٹی کوٹھڑی میں ہوئی۔ مجھے جیل میں بی کلاس مل گئی تھی اور کچھ دیگر سہولتیں بھی میسر ہو گئی تھیں۔ تیمور نے مجھے سگریٹ، مٹھائی اور پھل وغیرہ دیے۔ وہ آج کافی خوش بھی نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تیرے لیے دو خاص الخاص خبریں ہیں یارا۔"

"میرے لیے خاص الخاص خبر تو رہائی کی ہی ہو سکتی ہے۔"

"رہائی میں تو ابھی چار چھ مہینے لگنے ہیں۔ تو ناشکرا نہ بن۔ کیا اور کوئی اچھی خبر تیرے لیے نہیں ہو سکتی؟"

"اچھا بتا۔" میں نے سگریٹ کا پیکٹ کھولتے ہوئے کہا۔

"پرسوں حویلی میں اکٹھ ہوا ہے۔ بیگم بلقیس بھی وہاں تھیں۔ اکٹھ میں تجھے زمین دینے کا فیصلہ ہوا ہے۔ چھوٹی نہر کے پاس والی۔ قریباً ڈیڑھ دو مربعے ہے۔"

"مذاق کر رہا ہے یار۔۔۔۔"

"میں نے آج تک کسی مسکین قیدی سے مذاق نہیں کیا یار۔ تو واقعی مربعوں والا بن رہا ہے بلکہ بن ہی گیا ہے۔ میرے خیال میں ایک دو ہفتے میں کاغذات تیار ہو جائیں گے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ دل میں خوشگوار دھڑکنیں جاگیں۔ ان دھڑکنوں کا سبب شاید زمین نہیں تھی، یہ احساس تھا کہ زمین دینے والے اس فیصلے میں یقیناً بیگم بلقیس کا بھی کردار رہا ہوگا۔

"اور دوسری خبر؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"پچھلی دفعہ میں بیگم بلقیس کے لیے تجھ سے تیری بے بے جی کا پتا لے کر گیا تھا نا؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ تیمور بولا۔ "دو ہفتے پہلے بیگم بلقیس رونق علی کے ساتھ خود گوجرانوالہ آئی ہیں اور بے بے جی سے ملی ہیں۔"

میں نے تاسف میں سر ہلایا۔ "یار! تجھ سے کہا بھی تھا یہ خطرناک کام ہے۔ بہتر تو یہ تھا کہ میں تجھے پتا ہی نہ دیتا۔"

"یار! اب خطرے والی کوئی بات نہیں رہی ہے۔ تو میری پوری بات تو سن لے۔ اس کے بعد بھی غصہ آئے تو تیری جوتی اور تیرا سر۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، میرا سر۔"

"ہاں کر بکواس۔"

وہ دبے دبے جوش سے بولا۔ "بیگم بلقیس، بے بے جی اور بہن عارفہ کو اپنے پاس جاگیر میں لے آئی ہیں۔ بھائی جان باقر اپنے بچوں کے ساتھ دبئی واپس جا رہے ہیں۔ بیگم جی نے کہا کہ تم جاگیر کے لیے جیل گئے ہو۔ تمہارے گھر والوں کی حفاظت اب جاگیر کی ذمے داری بلکہ فرض ہے۔ انہوں نے بے بے جی اور بہن عارفہ کو حویلی کے ایک حصے میں پوری حفاظت سے رکھا ہے۔"

اگر واقعی ایسا ہو چکا تھا تو یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی۔ بھائی جان واپس دبئی جانا چاہتے تھے۔ عارفہ کا شوہر بھی بہ سلسلہ روزگار کویت میں مقیم تھا۔ میں بے بے جی اور عارفہ کے لیے ہر وقت پریشانی میں رہتا تھا۔ جوں جوں موکھلوں سے دشمنی بڑھ رہی تھی، میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے اس بارے میں تیمور سے چند مزید سوال پوچھے اور آخر میں کہا۔ "آج تو تُو نے دونوں اچھی خبریں سنائی ہیں۔"

وہ مسکرایا۔ "ایک تیسری اچھی خبر بھی ہے۔ مگر ابھی یہ صرف خبر ہی ہے اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس خبر کو زیادہ اچھا نہیں سمجھتے۔"

"یار! کیا پہیلیاں بوجھوا رہے ہو۔ ٹائم تھوڑا ہے۔ ابھی وہ تیرا پیو مقدم کھڑکی کے پاس آ کر سیٹی بجانے لگے گا۔"

تیمور نے سگریٹ کا طویل کش لیا اور بولا۔ "دیکھ خاورے! سچ کو سچ مان لینا چاہیے۔ اب یہ بات تو ہر کسی کو پتا ہے کہ تیرے اور بیگم جی کے درمیان کچھ ہے اور بڑے عرصے سے ہے۔ اب بھی جو شے تجھے راجوال میں رکھے ہوئے ہے، وہ بیگم جی سے تیرا ناتا ہی ہے۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ لوگ اب ایک اور بات بھی کہہ رہے ہیں۔"

"کیا؟"

"مجھے چھ سات دن پہلے رونق بھائی نے بتایا ہے کہ راجوال کے کچھ خاص خاص لوگ بیگم بلقیس کے ساتھ تیری شادی کی بات کر رہے ہیں۔"

میں سر تا پا ہل گیا۔ یوں لگا جیسے پورے جسم میں برقی رو چل گئی ہے۔ "کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے تیمور سے پوچھا۔

"وہی کہہ رہا ہوں جو میرے کانوں تک پہنچا ہے۔ ایک بات اچھی طرح جاگیر والوں کی سمجھ میں آنا شروع ہو گئی ہے کہ جاگیر کے لیے تم سے اچھا محافظ انہیں کوئی اور نہیں مل سکتا۔ اور

تم صرف اور صرف اس لیے راجوال میں ہو کہ بیگم جی سے تمہارا "ناتا" ہے۔ اب کچھ سمجھ دار لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس معاملے کا بہترین حل یہی ہے کہ تمہاری شادی ہو جائے مگر۔۔۔۔۔"

"مگر کیا؟"

تیمور کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ "مگر یہ کہ رائے صرف چند لوگوں کی ہے۔ والی جی کے قریبی رشتے دار اور بیگم جی کے ماموں وغیرہ یہ بات سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ پرسوں پنڈ کے "دائرے" میں محفل جمی ہوئی تھی۔ زمیندار حاجی چراغ دین اور پٹواری نذیر کے درمیان زوردار بحث چھڑ گئی۔ حاجی چراغ نے کہا، شرح میں شرم نہیں ہونی چاہیے۔ ہم ہندو نہیں ہیں کہ بیوہ کی شادی کو گناہ سمجھیں۔ بے شک بیگم جی کا بچہ بڑا ہو رہا ہے پر ان کی شادی کم عمری میں ہوئی تھی۔ ان کے سامنے پہاڑ جیسی زندگی ہے۔ ہمارا مذہب ایسی شادی کو غلط نہیں سمجھتا بلکہ اس کے حق میں ہے۔ جواب میں پٹواری نذیر نے کہا۔۔۔۔ پر شادی برابر کے خاندانوں میں ہوتی ہے۔ وہ ملازم ہے۔ حاجی چراغ نے کہا۔۔۔۔ ذات پات تم جیسے لوگوں نے بنائی ہوئی ہے۔ اور اگر یہی بات ہے تو بھی شاہ خاور کی ذات کچھ کم نہیں ہے۔ وہ

زمیندار گھرانے سے ہے اور ہماری برادری اور اس کی برادری میں پہلے بھی شادیاں ہوئی ہیں۔۔۔۔ لمبی چوڑی بحث ہوئی۔ اتنے میں بیگم جی کا ایک رشتے دار بھی آگیا اور یہ بحث ختم کرنی پڑی۔"

تیمور مجھے راجوال کی صورتحال سے آگاہ کر رہا تھا اور میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ میں بے حد حیرت کے عالم میں سوچ رہا تھا، کیا واقعی میری قسمت اتنا زور مار سکتی ہے؟ کیا واقعی ایسا کچھ ہو سکتا ہے کہ بیگم بلقیس میری زندگی میں شامل ہو جائیں؟ یہ ایسی انہونی بات تو نہیں تھی۔ اگر یہ بات بہت سے دوسرے لوگوں کے علاوہ خود والی جی کے ذہن میں بھی آسکتی تھی تو پھر اس میں وزن تو یقیناً موجود تھا۔ تاہم فوراً ہی والی جی کے الفاظ میرے ذہن میں گونجنے لگے۔ انہوں نے اپنے فقرے کے آخر میں کہا تھا۔ "مگر میں یہ بات جانتا ہوں خاور۔۔۔۔ یہ لوگ تمہیں ایسا کرنے نہیں دیں گے۔ بہت فساد پھیلے گا، بدامنی ہو گی۔"

تیمور کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ میں دل کی گہرائیوں سے خدا کو حاضر ناظر جان کر کہہ سکتا تھا کہ مجھے زمین، دولت اور حیثیت کا ذرہ برابر بھی لالچ نہیں تھا۔ جو کچھ میرے پاس تھا اور جو کچھ میرے پاس آسکتا تھا وہ سب میں بیگم بلقیس کی قربت کے ایک

لمحے کے بدلے قربان کر سکتا تھا۔ میرا راستہ اور میری منزل صرف بیگم بلقیس تھیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اگر فرض محال یہ لوگ کہتے کہ مجھے شادی کی صورت میں جاگیری کی وراثت میں سے ایک تنکا بھی نہیں ملے گا تو مجھے یہ بھی بہ خوشی قبول تھا۔ مگر اب تو یہ سب خواب و خیال کی باتیں تھیں۔ میں اس حوالے سے اپنے دل میں کسی طرح کی امید پالنا نہیں چاہتا تھا۔

رات کو برسات کی پہلی دھواں دھار بارش ہوئی، جیل کی بیرکوں میں بجلی لشکارے مارتی رہی اور بارش کی بوچھاڑیں دلوں میں ترنگ جگاتی رہیں۔ ترنگ تو ہر دل میں جگہ بنا لیتی ہے۔ موسم کی خوب صورت کروٹ پرندوں کو پنجروں کے اندر پر پھڑ پھڑانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ برسات کی اس رات میں جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے میں نے بھی بلقیس کو ٹوٹ کر یاد کیا۔ ان کی آواز، ان کی روپہلی شفاف کرنوں جیسی ہنسی اور ان کی ناک کا کوکا کیا کیا یاد نہیں کیا۔

ایک دفعہ بے بے جی نے بڑے غصے سے کہا تھا۔ "یہ جو تیرے اندر جو جوانی کی آگ لگی ہوئی ہے، بڑی جلدی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ مجھے سبق نہ پڑھا۔ تو نے مجھے پیدا نہیں کیا، میں نے تجھے

کیا ہے۔ وہ دس سال کے بچے کی ماں ہے اور تجھ سے پیار کی پینگیں ڈال رہی ہے۔ بڑی دیکھی ہیں اس طرح کی ففے کٹنیاں۔ رات کو اپنے خصموں کو سلا کر یارانے پالنے نکل کھڑی ہوتی ہیں۔"

اور پھر ایک دن مفرور ڈکیت بارے نے اپنی بڑی بڑی خونی آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے کہا تھا۔" تیرے قصوروں پر تو پورا اخبار لکھا جا سکتا ہے خاورے۔ تو وہ بد بخت عاشق ہے، جس تھالی میں کھاتا ہے، اسی میں چھید کرتا ہے۔ تو کتے کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا۔ تجھے حویلی والوں نے روٹی ڈالی لیکن تو کتے سے بھی بدتر ہے۔ تو نے مالکوں کو ہی کاٹنا شروع کر دیا۔ ان کی عزت پر اپنے دانت تیز کرنے لگا۔"

یہ باتیں اور اس طرح کی کئی اور باتیں تھیں۔ یہ باتیں مختلف وقتوں میں مختلف لوگوں نے کہی تھیں۔ ان باتوں کا اصل مطلب ایک ہی تھا۔ میری عاشقی ہوس ہے اور میں بہت جلد اپنا مطلب نکال کر اور بیگم کی عزت خاک میں ملا کر اپنی راہ لوں گا۔ سکہ بند ہرجائیوں کی طرح کسی اور شکار کی تلاش میں نکل جاؤں گا یا پھر راجوال میں ہی ذلیل موت مارا جاؤں گا۔

میں نے اپنے رویے اور اپنے طرز زندگی سے ان باتوں کو بالکل غلط ثابت کیا تھا اور مجھے اس بات پر فخر تھا۔ اب قریباً آٹھ برس ہونے والے تھے۔ اپنی جان پر ہزار ستم جھیل کر بھی میں نے اپنی آن پر حرف نہیں آنے دیا تھا۔ میں نے ثابت کیا تھا کہ میں عام نہیں ہوں اور نہ میری محبت عام ہے۔

انہی دنوں مجھے شوق چرایا اور میں نے جیل کے اندر ڈائری لکھنی شروع کی۔ فرصت کے وقت میں بیٹھ جاتا۔۔۔۔ جو کچھ دل میں ہوتا اسے لفظوں کا لباس پہنا کر کاغذ پر بکھیرنے لگتا۔ میں نے بلقیس کو سامنے رکھ کر شاعری بھی کی۔ درج ذیل شعر ان دنوں کی نشانی ہیں۔

جس دن سے وہ ساجن روٹھا، روٹھا مجھ سے دن کا عالم

شامیں روٹھیں، صبحیں روٹھیں، روٹھی مجھ سے رات سہانی

گزرے ماہ و سال آنکھوں کے در پر اس صورت آتے ہیں

لاغر اندھے گونگے بہرے پر کشکول سبھی کے خالی

ہر دور رہا ہے منکر پر ہر دور میں اس کا چرچا تھا

ہر دور نے اپنے ہاتھوں سے عاشق کو بنایا لافانی

ایک طرف مار دھاڑ اور ایک طرف شاعری۔ یہ میرے کردار کی دو بالکل الگ الگ صفتیں تھیں جو دیکھنے والوں کو حیران کرتی تھیں۔ جیل میں قید سکھر کے ایک صحافی صاحب نے مجھے شاور خاور کے بجائے شاہ بابر کہنا شروع کر دیا۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ بابر بادشاہ بھی شاعری اور جنگ ساتھ ساتھ کرتا تھا۔۔۔۔ جیل میں قیام کے دوران میں بھی مختلف خبریں ملتی رہیں تاہم ان میں سے تین اہم تھیں۔ میں ایک بچے کا ماموں بنا۔ اماں دلشاد کی بیٹی راشدہ کی شادی بلقیس نے بڑے اہتمام سے کی۔ تیسری خبر غم ناک تھی۔ اماں دلشاد کچھ عرصہ بیمار رہ کر چل بسی۔ درحقیقت موکھل پاشا کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد وہ کبھی بھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی۔

قریباً سات ماہ مزید گزر گئے۔ پھر جب تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 320 اور 326 کے کیسوں میں میری ضمانت ہوئی اور میں راجوال واپس آیا تو میرا باقاعدہ استقبال کیا گیا۔ ارد گرد کے دیہات سے بہت سے افراد جمع ہو گئے۔ مجھے ہاروں سے لادا گیا اور کچھ نے مجھے زبردستی

کندھوں پر اٹھا لیا۔ ڈھول پیٹے گئے۔ حویلی میں درجنوں دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ہر خاص و عام کو کھانا کھلایا گیا اور خوشی منائی گئی۔

یہ ساری پزیرائی مجھ پر بہت بھاری ذمے داری ڈال رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ لوگوں نے مجھ سے بے تحاشا توقعات وابستہ کر لی ہیں۔ وہ مجھے اپنے ہر درد کی دوا سمجھ رہے تھے۔ موکھلوں اور لمبڑوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے باوجود ان کا خیال تھا کہ میں جاگیر کے ہر بدخواہ کو زیر کر کے یہاں کے ہر مسئلے کو ختم کر سکتا ہوں۔ میں اپنے اندر جھانکتا تھا اور گہرائی سے سوچتا تھا تو خود ہی شرمندہ ہونے لگتا تھا۔ میں اتنے بلند مقام پر نہیں تھا، جتنے بلند مقام پر مجھے سمجھا جا رہا تھا۔ میں تو عام سا شخص تھا۔ اگر مجھ میں کوئی خاص چیز تھی تو وہ صرف بلقیس کی محبت تھی۔ میری ہر توانائی کا سرچشمہ فقط یہی جذبہ تھا اور اس جذبے کا انجام کیا تھا؟ یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔

راجوال پہنچنے کے فوراً بعد میں حویلی کے اندر بے بے جی اور عارفہ سے ملنے گیا۔ دونوں نے مجھ سے لپٹ کر خوشی کے آنسو بہائے۔ بے بے جی کو جو عزت اور محبت مل رہی تھی اس کا اظہار ان کے چہرے اور باتوں سے ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔"بے بے جی! یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی آپ کو؟"

وہ میری بلائیں لیتے ہوئے بولیں۔"تکلیف بس یہی تھی کہ تو نظروں کے سامنے نہیں تھا۔ باقی تو ہمیں یہاں پھولوں کی طرح رکھا ہوا تھا اس کڑی نے۔"

کڑی سے بے بے جی کی مراد بلقیس تھی۔وہ بلقیس کی تعریفیں کرنے لگیں۔"کچھ بھی ہے، طبیعت کی بڑی اچھی ہے۔ہر وقت ہمارے آلے دوالے رہتی ہے۔لگتا ہی نہیں کہ اتنی وڈی جاگیر دارنی ہے۔"

میں بے بے جی کے رویے کی اس تبدیلی پر حیران ہو رہا تھا۔بلقیس سے ملنے سے پہلے بے بے جی اس سے بے حد بدگمان تھیں۔سچ ہے کہ اچھا سلوک براہِ راست دل پر اثر کرتا ہے۔
عارفہ نے بھی بلقیس، رونق علی اور چودھری عزیز کے رویے کی تعریف کی۔بے بے جی اور عارفہ سے باتوں کے دوران میں میری نظر بلقیس کے لیے بھٹکتی رہی مگر وہ سامنے نہیں آئیں۔

رات کو بہت عرصے بعد رونق علی کے ساتھ محفل جمی۔رونق اور اس کے کچھ دوستوں کا ارادہ تھا کہ میری رہائی کی خوشی میں ناچ گانے کا ایک زبردست پروگرام ہو۔لیکن میں چونکہ

ایک سال پہلے ناچ گانے سے مکمل پرہیز کا عہد کر چکا تھا اس لیے یہ پروگرام ختم کر دیا گیا۔
پچھلے ایک سال میں رونق پہلے سے مزید موٹا اور سست ہو گیا تھا۔۔۔۔ مگر اس کے رہن سہن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔وہ میرے سامنے بلڈ پریشر کا رونا بھی روتا رہا اور دودھ پتی کے ساتھ ایک آدھ کلو سوہن حلوہ بھی کھا گیا۔دیسی گھی کے سوہن حلوے کے بارے میں اس کی حتمی رائے تھی کہ یہ گرم تو ہوتا ہے مگر تر گرم ہوتا ہے۔غمی اور خوشی کے علیحدہ علیحدہ بلڈ پریشر کی طرح اس نے یہ نیا لفظ "تر گرم" ڈھونڈ لیا تھا اور ہر پسندیدہ شے پر اس کو چپکا دیتا تھا۔حقہ بھی اس کے نزدیک تر گرم تھا کیونکہ اس میں پانی ہوتا ہے۔حقے کا ایک طویل کش لے کر وہ بولا۔"یار خاور! تیرے بعد ایک کام اچھا نہیں ہوا ہے۔اور میرے خیال میں تجھے بھی اس کا تھوڑا بہت اندازہ شندازہ ہو ہی گیا ہو گا۔موکھل اور لمبڑ ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں۔اب پتا ہے، کیا نئی بات ہو رہی ہے؟"

"کیا؟"

"پچھلے ہفتے پتا چلا ہے کہ قلعہ والا کے بڑے لمبڑ آصف جا کی چھوٹی بیٹی شہوار کی شادی چھوٹے موکھل کے سالے رمضان سے ہو رہی ہے۔اس شادی کے بعد تو دونوں برادریوں نے ایک جان ہو جانا ہے۔"

"تو ہونے دیں۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پڑتا ہے شیر شاہ صاحب" وہ کبھی کبھی اب مجھے مذاق سے شیر شاہ کہتا تھا۔اس کا تعلق ایک سال پہلے کے بنگالی ٹائیگر والے واقعے سے تھا۔

"آپ کا مطلب ہے رونق بھائی کہ اس شادی کے بعد دونوں پارٹیاں ایکا کر کے ہم پر چڑھ دوڑیں گی؟"

"دیکھو، یہ بات ایسی نہ ہونے والی بھی نہیں ہے۔"

رونق نے لمبا کش لیا۔"اور مجھے تو پکا یقین ہے کہ موکھلوں نے یہ رشتہ ہی اس لیے مانگا ہے کہ وہ ہمارے خلاف اپنا زور شور بڑھانا چاہتے ہیں۔اندر خانے بڑی ڈونگی سازشیں ہو رہی ہیں۔علاقے پر اپنا اثر وغیرہ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔سیاست شیاست میں بھی پاؤں

رکھا جا رہا ہے۔تم یہاں سے دور رہے ہو اس لیے تمہیں اندازہ نہیں۔ مچھلی فارم والے رقبے نے موکھلوں کے اندر بڑا زہر گھولا ہوا ہے۔"

اگلے ایک دو دن میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ رونق علی کی بات واقعی قابل غور بلکہ پریشان کن ہے۔راجوال میں اور حویلی میں ہر طرف اسی بات کا چرچا تھا۔ہر ایک کی سمجھ میں یہ بات بڑی اچھی طرح آ رہی تھی کہ موکھلوں نے لمبڑوں سے یہ رشتہ مانگ کر دراصل ایک بڑی گہری چال چلی ہے اور آنے والے دنوں میں اس چال کا جاگیر کو زبردست نقصان ہونے والا ہے۔اب تک تو لمبڑ برادری تقریباً غیر جانبدار تھی مگر پکی بات تھی کہ اس رشتے داری کے بعد انہوں نے غیر جانبدار نہیں رہنا ہے۔

رات کو چودھری عزیز سے بھی اس بارے میں بات ہوئی۔چودھری عزیز نے اب چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ لی تھی اور پہلے سے کچھ بدلا ہوا نظر آتا تھا۔مگر اس کے اندر کیا ہے، اس کے بارے میں کوئی پیشن گوئی کرنا بہت مشکل تھا۔

چودھری عزیز کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ اور اس کے ساتھی موکھلوں کی چال توڑ کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔

چودھری عزیز نے کہا۔ "ہم نے تو یہ کوشش بھی کی ہے کہ کسی طرح بڑے لمبڑ آصف جاہ کی بیٹی کا رشتہ ہماری برادری میں ہو جائے۔ اس لڑکی کا نام شہوار ہے۔ کافی سوہنی کڑی ہے۔ چار پنج مربعے زمین بھی ساتھ لائے گی۔ میں نے بلقیس سے مشورہ کر کے اپنے چھوٹے مامے کے پتر سلطان کے رشتے کی بات آصف جاہ کی طرف کی تھی۔ سلطان کے حصے میں بھی سات آٹھ مربعے زمین آئی ہے۔ اونچا لمبا سوہنا جوان ہے۔ پر لمبڑوں نے یہ رشتہ نہیں مانا۔"

"موکھلوں کی طرف بات پکی ہو گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، پکی تو نہیں ہوئی، بس چل رہی ہے۔"

"تو پھر اور کوشش کر کے دیکھ لیں۔"

"دوسری کوشش بھی کی ہے۔ والی جی کے پہلے بہنوئی چودھری سلیم کا بڑا پتر ہے۔ زمین بھی ہے، چاول کا کاروبار بھی ہے۔ علاقے میں کافی رسوخ ہے اس کا۔ مجھے امید تھی کہ شاید بات بن جائے مگر ابھی تک آصف جاہ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ انہوں نے بس ایک بار لڑکا دیکھا ہے۔ اس کے بعد خود آئے نہ ہمیں بلایا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چودھری نشاط اور رونق علی وغیرہ بھی اس گفتگو میں شریک ہو گئے۔ ایک خوبرو ملازمہ الائچیوں والے دو خوشبودار حقے تیار کر کے لے آئی۔ حقے گڑگڑاتے رہے اور بات چیت جاری رہی۔ چودھری نشاط کی گرم نگاہیں آتی جاتی ملازمہ کے جسم کے گرد چکراتی رہیں۔ بہر حال، یہ سلسلہ تا دیر جاری نہیں رہ سکا۔ کیونکہ حامد اندر داخل ہو گیا تھا۔ حامد کی عمر اب تیرہ چودہ سال سے اوپر ہو گئی تھی۔ وہ چھوٹی سی پگڑی باندھتا تھا اور بڑے رکھ رکھاؤ سے اٹھتا بیٹھتا تھا۔ تاہم چہرے پر معصومیت موجود تھی۔ اسے مجھ سے خاص لگاؤ تھا۔۔۔۔ اپنی واپسی کی خوشی میں نے اس کے چہرے سے پھوٹتی محسوس کی تھی۔ اب بھی وہ آیا تو میرے پاس بیٹھا۔

میری رہائش گاہ وہی تھی جو جیل جانے سے پہلے تھی۔ یہ حویلی سے ملحقہ ایک ہوادار مکان تھا۔ جس میں نیم اور دھریک کے پیڑ تھے۔ ایک پیڑ کے نیچے میری پسندیدہ گھوڑی بندھی ہوئی نظر آئی۔ رونق کی کوششوں سے وہ پوری طرح صحت مند ہو گئی تھی۔ دوسرے روز اتفاقاً ملازمہ تاجو سے ملاقات ہو گئی۔ وہ گھر کی صفائی ستھرائی کے لیے آئی تھی۔ میں نے بلقیس کا حال احوال پوچھا۔ وہ مسکرا کر میرے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔ مجھے لگا کہ وہ خود

بھی اس موضوع پر بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ صبح کا وقت تھا۔ گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے تاجو سے کہا وہ جھاڑو وغیرہ رکھ کر میرے پاس بیٹھ جائے۔ وہ بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ "جن دنوں آپ جیل میں تھے، یہاں بیگم جی کے ساتھ آپ کے ویاہ کی باتیں بھی ہوتی رہی ہیں۔ آپ کو پتا چلا ہی ہوگا؟"

"ہاں، کچھ کچھ چلا ہے۔" میں نے کہا۔

"بلکہ یہ باتیں اب بھی ہو رہی ہیں۔ اب تو آپ کو ایک اور سفارشی مل گیا ہے۔" وہ شوخ انداز میں دیکھ کر بولی۔

"کس کی بات کر رہی ہو۔"

"آپ کو سن کر بڑی حیرانی ہونی ہے۔ میں حامد کی بات کر رہی ہوں۔"

"حامد کی؟" میں واقعی حیران ہوا۔

"ہاں جی۔ حامد، رونق صیب کے پاس بہت اٹھتا بیٹھتا ہے۔ رونق صیب نے ہی اس کے دماغ میں یہ بات ڈالی ہے کہ اگر آپ کا اور بیگم جی کا ویاہ ہو جائے تو آپ ہمیشہ راجوال میں ہی رہیں

گے۔۔۔۔۔ اور آپ کے یہاں ہونے سے حویلی کے سارے مسئلے اپنے آپ حل ہوتے رہیں گے۔ ویسے بھی وہ آپ کو بہت پسند کرتا ہے جی۔ جب موکھلوں کا شیر مارنے کے بعد آپ جیل چلے گئے تھے تو کئی دن تک اس کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں اور بیگم جی اس کے ترلے کر کر کے ہار گئی تھیں۔"

"تم نے حامد کو سفارشی کیوں کہا ہے۔۔۔۔۔ کیا اس نے بیگم بلقیس سے اس بارے میں کوئی بات کی ہے؟"

"آہو جی۔" تاجو مسکرائی۔ "بیگم جی نے مجھے خود بتایا ہے۔ ایک دن اسے بہت بخار چڑھا ہوا تھا۔ بے ہوشی میں بول رہا تھا۔ بیگم جی سے پوچھنے لگا۔ کیا آپ کا اور ماسٹر چاچا کا ویاہ نہیں ہو سکتا؟ کیا ماسٹر چاچا ہمارے ساتھ اس حویلی میں نہیں رہ سکتے؟"

"بیگم جی اس بارے میں کس طرح سوچتی ہیں؟" میں نے تاجو سے پوچھا۔

"آپ ان سے ہی پوچھ لیں جی۔ مجھے تو کچھ پتا نہیں۔" وہ جھکی جھکی نظر سے بولی۔

"لیکن پوچھوں کس طرح؟ وہ تو سامنے ہی نہیں آتیں۔"

"اچھا، میں ان سے کہوں گی کہ وہ آپ سے بمبوکاٹ پر بات کریں۔" اس نے انٹرکام کو بڑی روانی سے بمبوکاٹ کہا۔ سب ایسا ہی کرتے تھے۔

"اچھا، میں آج رات منشی منظور کو کسی کام سے بھیج دوں گا۔ وہ رات کو نو اور دس کے درمیان گھنٹی دیں۔"

"پھر کل رات کا رکھیں۔ آج بیگم جی کے بڑے ماموں انہیں شب برات دینے کے لیے آرہے ہیں۔"

میرے اور تاجو کے درمیان طے ہو گیا اور وہ چلی گئی۔

پورے گھر کی صفائی ستھرائی ہو چکی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ بے بے جی اور عارفہ حویلی کے بجائے میرے ساتھ اس گھر میں رہیں۔ شام تک وہ دونوں آگئیں۔ ثمینہ بھی دل جوئی کے لیے ساتھ آئی۔ وہ ہر وقت عارفہ کے پانچ چھ ماہ کے بچے کو چمٹائے رکھتی تھی۔ پورے گھر میں چہل پہل ہو گئی۔ رات کو لالٹین کی روشنی میں، میں نے چارپائی پر بیٹھ کر دیر تک بے بے جی کی ٹانگیں دبائیں۔ اکیلے کمرے میں ہم ماں بیٹا دکھ سکھ کرتے رہے۔ وہ مجھ سے جیل میں بیتے ہوئے وقت کا احوال پوچھتی رہی۔ میں ان سے باہر کے حالات پوچھتا رہا۔ ماں پھر

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ماں ہوتی ہے۔ وہ تین چار سال مجھ سے ناراض رہی تھیں لیکن اب ہر شکوہ بھول چکی تھیں۔۔۔۔۔ انہوں نے بار بار مجھے گلے سے لگا کر میرا ماتھا چوما۔ آخر گلوگیر آواز میں کہنے لگیں۔ "خاور پتر! تجھے پتا ہے، یہاں کچھ لوگ تیرے اور بلقیس کے ویاہ کی باتیں بھی کرتے ہیں؟"

"ہاں بے بے جی! کچھ کچھ پتا ہے۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔

وہ ایک لمبی سانس لے کر بولیں۔ "پتر! بندہ سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ میں نے بھی کبھی تیرے لیے اس طرح نہیں سوچا تھا مگر۔۔۔۔۔ اب کیا کہوں۔ یہ دکھ بھی برداشت نہیں ہو سکتا کہ تو ساری عمر کنوارا ہی رہے۔ تو بلقیس سے ویاہ کرنا چاہتا ہے۔ مجھے نہیں پتا یہ ویاہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ پر میری طرف سے تجھے اجازت ہے۔ میں تجھے بس خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔"

اگلے روز رات کو انٹرکام پر بلقیس سے بات ہوئی۔ وہی بھولی بسری آواز پھر سے کانوں میں پڑی جو ہمیشہ سے میری رگوں میں ایک میٹھا میٹھا درد جگاتی رہی تھی۔

"ہیلو بلقیس! کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس ٹھیک ہوں۔اور تم؟"

"میں بھی بس ٹھیک ہوں۔" میں نے بس پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اتنے میں کہیں پاس سے حامد کی آواز آئی۔ وہ لاڈلے انداز میں ماں کو پکار رہا تھا۔ "میں ابھی آئی۔" بلقیس نے کہا اور ریسیور رکھ کر چلی گئی۔ دو منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔

"کیا بات تھی؟" میں نے پوچھا

"کچھ نہیں۔ کہہ رہا تھا، مجھے پگڑی باندھنا سکھاؤ۔"

"لیکن پگڑی باندھنی تو اسے آتی ہے۔"

"کہہ رہا تھا، اس طرح باندھنی ہے جس طرح لاٹھی کی لڑائی میں باندھتے ہیں۔ اب ہر بات میں بڑوں کی نقل کرتا ہے اور خاص طور پر تمہاری۔"

"کیا مطلب؟"

"میں اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور بات کرنے میں تمہارا رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ اس نے تمہارا بڑا اثر لیا ہے۔ جب تم جیل گئے تھے، یہ بہت رویا تھا۔ بہت یاد کرتا ہے تمہیں۔"

"اور کون کون یاد کرتا رہا ہے؟" میں نے اداس لہجے میں پوچھا۔

"سب ہی کرتے رہے ہیں۔" بلقیس نے ہولے سے کہا۔

"مجھے تو یقین نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"اگر کسی نے یاد کیا ہوتا تو پھر یوں دور دور تو نہ رہتا۔ کم از کم اپنی شکل تو دکھاتا۔"

"مجبوریوں کی ایک اونچی دیوار ہے۔"

"جو لوگ کوشش کرتے ہیں ان کے لیے دیواریں ٹوٹ جاتی ہیں بلکہ پہاڑ بھی اپنی جگہ سے سرک جاتے ہیں۔"

"یہ تو کتابوں اور کہانیوں کی باتیں ہیں۔"

"کہانیاں بھی تو اسی زندگی میں سے نکلتی ہیں۔ ہم بھی کوشش کریں تو اپنی زندگی کے دکھوں میں سے ایک مسکراتی ہوئی کہانی نکال سکتے ہیں۔"

بلقیس میری بات سمجھ کر چند لمحے کے لیے چپ ہو گئی۔ پھر گھمبیر لہجے میں کہا۔ "شاید تم ٹھیک کہتے ہو خاور۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور پتا نہیں کیوں۔ میں خود میں کسی طرح کی ہمت نہیں پاتی۔"

"اس کا مطلب ہے، محبت میں وہ طاقت نہیں۔"

"مجھے پتا تھا تم نے یہی بات کہنی ہے۔"

"تو غلط کہی ہے؟"

"بالکل غلط۔ تمہیں کچھ پتا نہیں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ پھر چند سیکنڈ کے توقف سے کہا۔ "تم ایک بار کہہ کر دیکھو۔ میں سب کچھ چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں گی۔ ہمیشہ کے لیے کہیں گم ہو جاؤں گی۔"

"تم نے پہلے بھی یہ کہا تھا لیکن سب کچھ چھوڑ دینا آسان ہے۔ اس "سب کچھ" کا سامنا کرنا مشکل ہے اور یہی اصل محبت ہے۔"

"تم مرد ہو خاور۔ میں عورت ہوں۔ مجھے بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔"

میں اب بلقیس کو بے تکلفی سے "تم" کہہ کر بلاتا تھا۔ میں نے کہا۔ "بلقیس! تم جتنا سوچو گی، مجبوریوں کی دیوار اتنی ہی اونچی ہوتی جائے گی۔ اگر آگے بڑھو گی تو ساری دیواریں رستہ دیں گی۔"

"میں۔۔۔۔ میں کیا کروں خاور! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" وہ ناک میں گنگنا کر بولی۔ جب وہ اس طرح بولتی تھی تو میرے دل کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ یہ اس کی خوب صورت اور بے ساختہ اداؤں میں سے ایک تھی۔

میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "تم نے سیمسن کا نام سنا ہوا ہے بلقیس؟"

"نہیں۔ کون تھی؟"

"تھی نہیں۔۔۔۔۔ تھا۔ پرانے زمانے کا ایک مشہور اسرائیلی پہلوان۔ اس کی ساری طاقت اس کے بالوں میں تھی۔ مجھے لگتا ہے، میری ساری طاقت تمہارے پیار میں ہے۔ اگر یہ پیار میرے پاس نہ رہا تو پھر کچھ بھی نہ رہے گا۔ میں سچ کہتا ہوں بلقیس۔۔۔۔۔ مجھے اس جاگیر میں سے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ ایک تنکا بھی نہیں۔ میرا پہلا اور آخری طمع تم ہو۔۔۔۔۔ صرف تم۔"

"خاور۔۔۔ خاور! آخر کیا ہے مجھ میں؟ تمہیں کیا نظر آتا ہے مجھ میں؟"

"اپنی تعریفیں کرانا چاہتی ہو؟ میں اس پر مہینوں اور سالوں تک بول سکتا ہوں۔"

"خاور! تم یہ سب کچھ دل سے نکال کیوں نہیں دیتے۔۔۔۔۔ پھر پہلے کی طرح کیوں نہیں ہو جاتے؟"

"تم نے ہی تو کہا ہوا ہے بلقیس۔ اب واپسی ممکن نہیں۔"

وہ چپ ہو گئی یا شاید لاجواب۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "تم سے باتوں میں جیتنا بہت مشکل ہے خاور!"

"تم جیتتی نہیں ہو اور ہار بھی نہیں مانتیں۔"

"ہار تو مانی ہوئی ہے لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا خاور۔ مجھے لگتا ہے کہ میں سب کی گناہ گار ہوں۔ تمہاری۔۔۔۔۔ تمہارے گھر والوں کی۔۔۔۔۔ اپنے گھر والوں کی۔۔۔۔۔ سب کی۔ ہر کوئی دل ہی دل میں مجھے برا کہتا ہے۔"

"ہم یہ ساری زبانیں بند کر سکتے ہیں۔ کس طرح کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ تمہیں بھی پتا ہے۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ یہ زبانیں پھر بھی بند ہو سکیں گی۔"

"اور مجھے لگتا ہے کہ تم کچھ چاہتی ہی نہیں ہو۔"

میرے لہجے کی شدید اداسی کو محسوس کر کے وہ ایک دم بولی۔ "اور مجھے لگتا ہے کہ تم پھر ناراض ہونے کی طرف جا رہے ہو۔ ایک دم فون بند کر دو گے اور میں یہاں بیٹھ کر روتی رہوں گی۔"

"تم روتی بھی ہو؟" میں نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

"اچھا،اب کسی دن تمہیں رو کر دکھاؤں گی۔" وہ پھر ادا سے ناک میں گنگنائی۔

میں نے ایک آہ بھری اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میرے پاس آجاؤ بلقیس۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تمہارے بغیر کچھ نہیں ہوں۔"

کافی دیر لائن پر خاموشی رہی، تب اس نے کہا۔ "اچھا اس بارے میں بات کریں گے۔ اب تو حامد پھر آوازیں دینے لگا ہے۔"

حامد کی دور افتادہ آواز سنائی دے رہی تھی۔ "امی۔۔۔۔امی!"

اگلے تین چار دن تک عجیب صورتِ حال رہی۔ حویلی کے اندر مشورے وغیرہ چل رہے تھے۔ شام پور اور نکووال کے زمینداروں کا حویلی میں پھیرا رہا۔ ان میں والی جی کے قریبی رشتہ دار بھی شامل تھے۔ ایک دو بار مکھن پور کا ایک زمیندار بھی دکھائی دیا۔ وہ اپنا سجا سجایا تانگا خود ہی چلا کر آتا تھا۔

اتفاقاً رونق علی کسی ضروری کام سے پسرور روڈ کے قصبے "ستراں" میں گیا ہوا تھا۔ اگر وہ یہاں موجود ہوتا تو مجھے اندر کی خبر ملتی رہتی۔ ایک روز اپنے نئے ٹریکٹر کی خوشی میں مٹھائی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کھلانے کے بعد چودھری نشاط نے مجھ سے یہ بات بھی کہی کہ اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ اس کی بات سے مجھے شک گزرا کہ شاید حویلی میں میری شادی کی بات پھر گردش میں ہے۔

یہ چوتھے پانچویں دن کی بات ہے جب تاجو کے ذریعے بلقیس نے مجھے حویلی میں بلوایا۔۔۔۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ دیہی علاقے کی چلچلاتی ہوئی ایک سنسان اور طویل دوپہر نے ہر شے کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ کھیت کھلیان، کنویں، گھروندے اور راستے سب اپنی اپنی جگہوں پر خاموش پڑے تھے۔ بس کہیں کہیں درختوں کے نیچے لوگ چارپائیاں ڈالے اور دستی پنکھے جھلتے ہوئے اس نہ ختم ہونے والی دوپہر کو کاٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں حویلی میں پہنچا تو بلقیس نے بیٹھک میں مجھے خوش آمدید کہا۔ آج میں نے بلقیس کو ایک طویل عرصے بعد دیکھا تھا۔ اس نے گرمیوں کا ہلکا پھلکا لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے کی شادابی جوں کی توں تھی۔ کوکے کا لشکارا بھی ویسا ہی تھا۔ گزرتا ہوا وقت اس پر بہت کم اثر چھوڑ رہا تھا۔ تاجو چائی کی لسی لے کر آئی۔ اس پر ہلکا ہلکا مکھن تیر رہا تھا اور اس کو ڈھیلے والے نمک سے نمکین کیا گیا تھا۔

حامد کو میری آمد نے نہال کر دیا۔ وہ مسلسل میرے ارد گرد گھوم رہا تھا۔ بلقیس نے میرا حال احوال پوچھا۔ پھر حامد سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اپنے ماسٹر چاچا سے پوچھو، کھانا کھاؤ گے ؟"

میں نے بھی مسکراتے لہجے میں کہا۔ "کیا کھلاؤ گے ؟"

وہ سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔ بلقیس نے کہا۔ "ماسٹر چاچا کی پسندیدہ چیز ہے۔ بھنڈی کا سالن اور تندور کی گرم روٹی۔ ساتھ میں آم کا اچار۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" میں نے کہا۔

تھوڑی دیر میں کھانا آگیا۔ میں اور حامد آمنے سامنے بیٹھ گئے اور کھانا کھایا۔ دیسی گھی میں بھنی ہوئی بھنڈی اور پیاز کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ بلقیس کے ہاتھ کا پکا ہوا سالن ہے۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اس کا لطف اٹھا چکا تھا۔ کھانے کے بعد کھیت سے تازہ بہ تازہ توڑے ہوئے خربوزے آگئے۔ بلقیس نے اپنے ہاتھ سے قاشیں کاٹ کر سامنے رکھیں۔۔۔۔۔ پتا نہیں کیوں میرے دل میں کھٹکا سا پیدا ہو رہا تھا۔ میں جلد از جلد وہ اصل بات جاننا چاہتا تھا جس کے لیے مجھے یہاں بلایا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد بلقیس نے حامد کو باہر بھیج دیا۔ تاجو بھی دائیں بائیں ہو گئی۔۔۔۔۔ اب ہم دونوں بیٹھک میں اکیلے تھے۔ میں نے بلقیس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب سنجیدگی تھی اور یہ گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے لگا کہ کوکے کا لشکارا ماند پڑتا جا رہا ہے۔ وہ شاید کوئی بہت بوجھل اور بہت گھمبیر بات کہنے جا رہی تھی۔ آخر یہ بات اس کی زبان پر آگئی۔ اس نے کہا۔

"خاور! پچھلے چند روز میں نے ایک عذاب میں گزارے ہیں۔ اتنی تکلیف سہی ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ حویلی میں وہ بات ہوتی رہی ہے جو نہ ہی ہوتی تو اچھا تھا۔"

"کونسی بات۔"

"وہی جس کا ذکر تاجو نے بھی تم سے کیا تھا۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو چاہتے تھے کہ کسی طرح اس حویلی سے تمہارا رشتہ جڑ جائے۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بلقیس شادی کی بات کر رہی تھی۔ میری اور اپنی شادی کی بات۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"وہی جو ہونا تھا۔ جس کے بارے میں، میں نے تمہیں پہلے ہی بتادیا تھا۔" بلقیس کے لہجے میں دنیا جہان کا کرب سمٹ آیا۔ "خاور! یہ نہ ہونے والی بات تھی۔ میں بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ دو چار لوگوں کی آواز پوری برادری کی آواز تو نہیں بن سکتی نا۔ بہت جھگڑے ہوئے ہیں۔ والی جی کے بھائیوں، میرے ماموؤں اور دوسرے رشتے داروں میں سے کوئی اس کے حق میں نہیں تھا۔ مجھے تو یہاں تک سننا پڑا ہے کہ۔۔۔۔"

وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ آواز گلے میں اٹک گئی۔ چند سیکنڈ بعد ہمت کر کے بولی۔ "کچھ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر میری شادی ہی ہونی ہے تو پھر اس بندے سے کیوں نہ کی جائے جو والی جی کے بعد اس جاگیر پر سب سے زیادہ حق رکھتا ہے۔۔۔۔"

"مطلب۔۔۔۔ چودھری عزیز؟" میں نے پوچھا۔

بلقیس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی جھکی ہوئی پلکوں سے دو ستارے ٹوٹ کر اس کی گود میں گر گئے۔

"چودھری عزیز کا کیا رویہ تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں خاور۔۔۔۔۔ ہمارا۔۔۔۔۔ کچھ۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ہو سکتا۔ یہ بات اب ختم ہو چکی ہے۔ بالکل ختم ہو چکی ہے۔ ہم اس کو جتنی بار دہرائیں گے، اتنی ہی زیادہ تکلیف اٹھائیں گے۔ آج میں نے تمہیں یہاں ایک اور وجہ سے بلایا ہے۔"

بلقیس کے جاں گسل لہجے نے مجھے اندر سے کرچی کرچی کر دیا۔ مجھے لگا جیسے میرا جسم روح سے خالی ہو گیا ہے اور میں مٹی کا بت رہ گیا ہوں۔ کچھ دیر پہلے بڑی رغبت سے کھایا ہوا کھانا سینے میں ایک وزنی بوجھ کی طرح محسوس ہوا۔ وہ لمحے صدیوں پر بھاری تھے۔ اپنے اندر کی کرچیوں کو میں نے بے حد مشکل سے جوڑا اور پوچھا۔ "کیا کہنا چاہتی ہو بلقیس؟" اپنی آواز مجھے کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

"تم سے ایک وعدہ لینا ہے آج۔" وہ اشک بار لہجے میں بولی۔

"تم نے ہمیشہ مجھ سے دور کرنے والے وعدے ہی لیے ہیں۔ کبھی کوئی قریب لانے والا وعدہ بھی لیا ہوتا۔ کبھی تو مجھے اس طرح بھی آزمایا ہوتا۔" میری آواز نادیدہ بوجھ سے ٹوٹ رہی تھی۔

ان لمحوں میں وہ بہت بے رحم دکھائی دے رہی تھی۔ سن ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ "خاور! زندگی میں پہلی اور آخری بار تم سے کچھ مانگ رہی ہوں۔ اور اس مان کے ساتھ کہ تم انکار نہیں کرو گے۔" آنسو اس کی آنکھوں سے مسلسل بہہ رہے تھے۔

یہ کیسی چلچلاتی دوپہر تھی جس میں برسات بھی ہو رہی تھی؟ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دور درختوں کی جھلسی ہوئی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ کیکر، برگد، دھریک اور سفیدہ۔۔۔۔ پتا نہیں کون کون سے درخت تھے۔ گرما کی اس پر تپش دوپہر میں وہ بھی سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ ان میں چھپے ہوئے پرندے نظر نہیں آتے تھے مگر میں تصور کی نگاہ سے ان کے ہانپتے ہوئے سینے اور پیاس سے کھلے ہوئے منہ دیکھ سکتا تھا۔

۔۔۔۔ اور اس لشکتی جھلتی دوپہر میں وہ مجھ سے کچھ مانگ رہی تھی۔ اس نے عجیب التجا بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ "خاور! والی جی نے تمہیں جاگیر کا محافظ بنایا تھا۔ آج اس جاگیر کو تمہاری جتنی ضرورت ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ تم ایک قربانی دے کر اس جاگیر کو بچا سکتے ہو۔۔۔۔"

"کہتی رہو بلقیس۔۔۔۔ میں سن رہا ہوں۔" میں نے بے حد کمزور آواز میں کہا۔

"میرا مان نہ توڑنا خاور! میری بات مان لینا۔ تم شادی کر لو۔"

میرا پورا جسم بے طرح جھنجھنا اٹھا۔ میں نے خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ "کس سے کر لوں شادی؟"

"جس سے میں کہتی ہوں۔ ایسا کر کے تم بہت کچھ بچا لو گے خاور۔ میرا مان، میری عزت اور اس جاگیر کی سلامتی کو بھی۔۔۔۔ حالات نے ہمیں ایک عجیب دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے خاور۔"

"کیسا دوراہا؟"

"بھائیا عزیز اور بھائی نشاط نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ علاقے میں بہت جوڑ توڑ ہو رہا ہے خاور۔ موکھل گہری چال چل رہے ہیں۔ وہ لمبڑ برادری سے ایکا کرنے کے لیے بڑے لمبڑ آصف جاہ کی بیٹی کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ یہ لوگ ایک ہو گئے تو جاگیر میں رہنے والوں کی زندگی حرام کر دیں گے۔ اس کا ایک ہی حل ہے۔ آصف جاہ کی بیٹی کا رشتہ موکھلوں میں نہ ہو۔ بھائیا عزیز اور بھائی نشاط نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہ رشتہ ہماری برادری میں ہو

جائے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ پر چار پانچ دن پہلے ایک راستہ نکلا ہے۔ تم مکھن پور کے نمبر دار ملک فیاض کو تو جانتے ہو نا؟"

"وہی جس نے چاندی کی انگوٹھیاں پہنی ہوتی ہیں اور اپنا تانگا خود چلا کر آتا ہے؟"

"ہاں وہی۔ وہ لمبڑوں میں بھی اٹھتا بیٹھتا ہے۔۔۔۔ اس کو قلعہ والا کی اندر خانے کی باتوں کا پتا رہتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ راجوال میں صرف ایک ہی بندہ ہے جس کے لئے آصف جاہ کی بیٹی کا رشتہ مانگا جائے تو وہ انکار نہیں کریں گے۔۔۔۔" بلقیس نے تھوڑا سا توقف کیا اور ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "اور وہ تم ہو خاور۔"

میں سکتے کی سی کیفیت میں بلقیس کو دیکھتا رہا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں التجا بھرے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے بڑی عاجزی سے میری سامنے سر جھکایا اور بولی۔

"زندگی میں پہلی اور آخری بار تم سے کچھ مانگ رہی ہوں خاور۔ انکار نہ کرنا۔ آصف کی بیٹی شہوار سے شادی کر لو۔"

بلقیس کی اس التجا کے بعد اگلے تین چار دن میں میرے ساتھ جو کچھ ہوا، میں اسے ایک ناقابل بیان کشمکش کا نام دے سکتا ہوں۔ ایک جان توڑ اذیت تھی جو میرے لہو میں شامل

ہو کر پورے جسم میں ٹھوکریں مار رہی تھی اور مجھے بے حال کر رہی تھی۔ میں اس تفصیل میں جا کر اس روداد کو مزید طویل کرنا نہیں چاہتا۔۔۔۔ اگلے تین چار دن میں، میں نے ہر پہلو سے غور کیا۔ آخر قدرت کی مرضی اور بلقیس کی رضا کے سامنے میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ میرے دل نے گواہی دے دی کہ محبت جو قربانی مجھ سے مانگ رہی ہے، وہ مجھے دینا ہی پڑے گی۔ بے شک میں اس میں برباد ہوتا تھا لیکن محبت آباد ہوتی تھی۔ بلقیس کی سرخروئی، جاگیر کے ہزاروں مکینوں کی بھلائی، والی جی کے ورثے کی حفاظت۔۔۔۔ میری قربانی سے بہت کچھ وابستہ ہو گیا تھا۔

وہ گرما کی ایک چاندنی رات تھی۔ تیز آندھی اور ہلکی بارش کے بعد مطلع صاف ہو گیا تھا اور ہوا چل رہی تھی۔ میں نے منشی منظور کے کمرے سے انٹر کام پر بلقیس سے رابطہ کیا۔ مجھے آٹھ پہر سے شدید بخار تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ میں نے بلقیس کو بتا دیا کہ وہی ہو گا جو وہ چاہ رہی ہے۔۔۔۔

بلقیس کی آواز بھی بھرا گئی۔ وہ بولی۔ "مجھے پتا تھا خاور۔۔۔۔ میرا مان نہیں ٹوٹے گا۔"

میرے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ مجھے نہیں پتا، میں نے صحیح کیا یا نہیں۔۔۔۔۔ میں نے جو کچھ کیا، اس کی حیثیت اخلاقی طور پر کیا تھی؟ مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ بس جو میرے دل نے کہا، وہ میں نے بلقیس سے کہہ دیا۔ میں نے کہا۔ "بلقیس! یہ سوچ مجھے زندہ مار رہی ہے کہ ہمارے راستے جدا ہو رہے ہیں۔"

"تم ایسی باتیں کرو گے تو میں بھی موت کے نزدیک پہنچ جاؤں گی۔ مجھے تمہاری طرف سے حوصلے کی ضرورت ہے۔"

"بلقیس! پھانسی پانے والے بندے سے اس کی آخری خواہش تو پوچھی جاتی ہے نا؟ مجھ سے نہیں پوچھو گی؟"

"خاور! وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ "اب وہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اب خود کو کانٹوں میں نہ گھسیٹو۔۔۔۔۔ اور نہ مجھے۔"

"تمہارا مطلب ہے۔۔۔۔۔ جو کچھ ہمارے دلوں میں پیدا ہوا وہ سب کچھ غلط تھا؟"

"میں غلط یا صحیح کی بات نہیں کرتی۔ مگر وہ جو کچھ بھی تھا۔ اسے دنیا قبول نہیں کرتی۔ کوئی بھی قبول نہیں کر سکتا۔"

"یعنی وہ غلط ہے؟"

"میں یہ نہیں کہتی۔ لیکن وہ جو کچھ بھی ہے، ہمارے دلوں میں رہے گا۔ ہم ایک دوسرے کے لیے اچھا سوچیں گے۔ ایک دوسروں کو دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔"

"چلو جو تم کہتی ہو ویسا ہی ہو گا۔ لیکن۔۔۔۔۔ بلقیس۔۔۔۔۔ جانور کو بھی ذبح کرنے سے پہلے پانی پلا دیتے ہیں۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو خاور؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میری ایک دو چھوٹی چھوٹی خواہشیں ہیں بلقیس۔ وہ دل میں ہمیشہ پھانس بن کر چبھتی رہیں گی۔" وہ خاموش رہی۔ میں نے کہا۔ "بلقیس! بس پہلی اور آخری بار مجھے وہ ہار پہن کر دکھا دو اور اس کے ساتھ اپنا وہ کالا اور نسواری سوٹ۔ میں نے اپنے خیالوں میں ہزاروں بار تمہیں اس روپ میں دیکھا ہے۔ ایک بار ان خیالوں کو سچ کر کے دکھا دو۔"

"تم۔۔۔۔۔ ایسے کیوں ہو خاور؟" اس کی حیرت کی تہ میں ہلکی سی محبت بھی چھپی ہوئی تھی۔

"بس جیسا بھی ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے سامنے ہوں۔۔۔۔۔ اور شرمندہ ہوں۔"

وہ چپ رہی۔ انٹر کام کی لائن پر خاموش کرنٹ سنسناتا رہا۔ آخر وہ روہانسی آواز میں اور عہد لینے والے لہجے میں بولی۔

"تم۔۔۔۔اور کچھ نہیں کہو گے خاور!"

"ٹھیک ہے بلقیس! کچھ نہیں کہوں گا۔ بس مجھے جی بھر کر دیکھ لینے دینا۔"

"اچھا۔۔۔۔کب آؤ گے؟"

"کل رات۔"

وہ کچھ دیر سوچ کر بولی۔ "نہیں۔۔۔۔پھر آج ہی آجاؤ۔"

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ بلقیس کے اس فقرے کا کیا مطلب ہے۔ وہ کل تک پریشانی کی سولی پر لٹکنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ تناؤ جلد ختم ہو جائے۔ وہ اپنے اطراف سے ہر وقت سہمی رہتی تھی۔

"کب تک آؤں؟" میرا لہجہ بدستور بوجھل تھا۔

"آدھے گھنٹے تک۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا۔ فون ٹھیک کرنا ہے۔ یہ واقعی کل سے گڑبڑ کر رہا ہے شاید بیٹری خراب ہو گئی ہے۔۔۔۔اور تم زیادہ دیر ٹھہرو گے نہیں خاور۔۔۔۔بس دو چار منٹ۔" اس کی آواز بار بار بھرا رہی تھی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں بلقیس کے سامنے اس کے کمرے میں تھا۔ وہ سیاہ اور نسواری سوٹ میں تھی۔ کمرے کے وسط میں سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں ایک سوگوار تصویر نظر آتی تھی۔ میں اس کو پوری توجہ سے دیکھتا رہا۔

"اور میرا ہار؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اپنے گلے پر سے نسواری دوپٹے کو تھوڑا سا نیچے کھسکا دیا۔ طلائی ہار اس کے مرمریں گلے میں دمک رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے کس کر باندھی ہوئی چوٹی پسند نہیں۔ اس کے ریشمی بال ڈھیلے تھے۔ بخار کی شدت سے میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ دل میں غم کا ایک سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

"بس؟" کچھ دیر بعد اس نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

میں اس کے قریب چلا گیا۔ میری آواز دکھ کے بوجھ تلے کانپتی رہ گئی۔ "بلقیس! کہتی ہو تو چلا جاتا ہوں۔ لیکن یہ آخری بار ہے۔ پھر پتا نہیں کبھی اس طرح آمنے سامنے ہوں گے یا نہیں۔ ایک بار مجھے۔۔۔۔۔" میں فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"خاور! تم نے کیا کہا تھا؟" وہ ذرا خفگی کے ساتھ کراہی۔

"بس ایک بار۔" میرے لہجے میں کچھ ایسا کرب اور ایسی التجا تھی کہ شاید گوشت پوست کی بلقیس کے بجائے سنگلاخ پہاڑ بھی ہوتا تو ایک بار تھرا جاتا۔

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بے تاب ہو کر اسے گلے لگا لیا۔ اس کے ہونٹوں پر میرا الوداعی بوسہ بڑا طویل اور رقت آمیز تھا۔ میں نے صرف "ایک" کی اجازت مانگی تھی لیکن جب حد ٹوٹی تو پھر "ایک" کی اجازت "کئی ایک" کی اجازت میں بدل گئی۔ ہمارے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔ ہم کمرے کے وسط میں کھڑے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ ارد گرد کے کمروں میں یکسر خاموشی تھی اور نیم تاریکی میں نیند کے سائے تھے۔

"مجھے بھول جانا خاور۔ اپنی ساری محبت اپنی بیوی کو دینا۔" اس نے سسکتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"جو تم کہتی ہو، وہی ہو گا۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ خاور۔۔۔۔۔ دیکھو غلط نہ کہنا۔" وہ نیم تاریکی میں میرے گلے سے لگے لگے بولی۔

"پوچھو۔"

"خاور۔۔۔۔۔ اماں دلشاد کی بڑی بیٹی گڈی کے ساتھ جو کچھ ہوا۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ والی جی کی وجہ سے ہوا تھا نا؟"

میرا سارا جسم سنسنا اٹھا۔ میں خاموش رہا۔ وہ مجھے ہولے سے ہلاتے ہوئے بولی۔ "مجھے بتاؤ نا خاور۔۔۔۔۔ تم نے وعدہ کیا ہے۔۔۔۔۔ مجھے بتاؤ۔" میں پھر بھی چپ رہا۔ اس حوالے سے میری زبان کھل ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے والی جی سے وعدہ کیا ہوا تھا۔

اس نے دو بار مزید پوچھا مگر میں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ کبھی کبھی خاموشی اور لاعلمی کا اظہار بھی جواب ہوتا ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ میں کسی وعدے کی زنجیر میں ہوں۔ تاہم اس کی ذہانت نے اسے جواب بتا دیا۔ اس نے میری بانہوں میں ایک گہری سانس لی۔ اس کی سرگوشی جیسے کسی کنوئیں سے ابھری۔ "خاور! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ مرد کی ہزاروں غلطیاں معاف کر دی جاتی ہیں، عورت کی ایک چھوٹی سی بھول کو معاف نہیں کیا جاتا۔ کیا وفاداری نبھانا صرف اور صرف عورت کی ذمہ داری ہوتی ہے؟"

وہ ایک ایسا سوال پوچھ رہی تھی جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ کسی بھی مرد کے پاس نہیں تھا۔ میں تو صرف اپنے بارے میں جواب دے سکتا تھا۔ اور میرا جواب یہ تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک کروں گا۔

میں نے جیسے اس کے سوال سے بچنے کے لئے اپنا چہرہ اس کے بالوں میں چھپا لیا۔ اسے الوداعی احساس کی پوری شدت کے ساتھ خود میں پیوست کر لیا۔ میں نے اس کے گلے کو اور گلے کے ہار کو چوما۔ اس کے ہونٹوں کو ایک حسرت بھرا طویل پیار دیا اور جدا ہو گیا۔۔۔۔ ہاں، میں اس سے جدا ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ٹھیک ایک ماہ بعد قلعہ والا کے بڑے لمبڑ آصف جاہ کی بیٹی شہوار میری دلہن بن گئی۔ میں نے اپنی جان پر ہزار ستم سہہ کر بلقیس کو دیا ہوا قول پورا کر دیا۔

یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس کے انتظامات میں بلقیس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ ہر جگہ اور ہر وقت بے بے جی، عارفہ اور بھابھی کا ہاتھ بٹاتی نظر آئی تھی۔ بے بے جی بھی بلقیس سے بہت خوش تھیں۔ ان کے شکوے دور ہو گئے تھے۔ میں اپنے نئے کشادہ گھر میں آ گیا تھا۔ یہ حویلی نما گھر اس سے پہلے والی جی کی پہلی بیوی کے استعمال میں رہ چکا تھا۔ شادی کی تیاریوں میں بلقیس کا عمل دخل ہر جگہ موجود رہا تھا۔ گھر کے رنگ و روغن سے لے کر کپڑوں اور زیورات کی خریداری تک۔۔۔۔ چھوٹی چھوٹی رسموں سے لے کر مہمانوں کی خاطر تواضع تک، ہر موقعے پر وہ مستعد اور مصروف تھی۔ برات سے ایک رات پہلے اس نے ڈھولک بجائی اور اس کی آواز کا جادو میرے گھر کی دیواروں میں سرایت کرتا محسوس ہوا۔ وہ کیا آواز تھی۔ وہ کانوں سے پہلے دل سے ٹکراتی تھی۔ اس میں ایک تڑپ تھی، ایک پکار تھی۔

وہ کہتی تھی، میرے سینے میں دل ہے۔ ہزار صدیوں سے اس دل کی حسرت ہے، میں کسی کو ٹوٹ کر پیار کروں اور کوئی مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرے۔۔۔۔ صرف اور صرف مجھ سے۔۔۔۔

شادی کی مصروفیات میں گھر کے اندر آتے جاتے کبھی میری نظر بلقیس کی نظر سے ملی بھی تو وہ بالکل اجنبی اور بے گانہ نظر آئی۔۔۔۔ اور پھر شہوار میرے گھر آ گئی۔ شہوار تئیس چوبیس سال کی ایک خوبرو لڑکی تھی۔ اس نے ایف اے کر رکھا تھا۔ میری نسبت اس کا قد تھوڑا چھوٹا تھا مگر اسے کوتاہ قامت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ پانچ مربعے زرعی اراضی اور بھاری بھرکم جہیز لائی تھی۔ بے بے جی کو جو وزنی کڑے پہنائے گئے، ان میں زمرد لگے ہوئے تھے۔ مجھے نئے ماڈل کی ٹویوٹا جیپ اور تازی نسل کے دس شاندار گھوڑے تحفے میں دیے گئے۔ اسی طرح عارفہ، اس کے خاوند جمیل اور دیگر رشتہ داروں کے لیے بھی نہایت قیمتی تحفے اور کپڑے وغیرہ تھے۔ یہ علاقے کی ایک یادگار شادی تھی۔ چھوٹے اور بڑے موکھل نے بھی بادل ناخواستہ اس میں شرکت کی۔ میرا پرانا مخالف لیاقت کالا ایک دوست کی طرح اس میں شریک ہوا۔ شادی کی رات میں نے شہوار کا گھونگھٹ اٹھایا اور

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کہا۔ "شہوار! ہر شخص کا ایک ماضی ہوتا ہے۔ میرا ہے۔۔۔۔ اور تمہارا بھی۔ لیکن آج سے ہم اس ماضی کو بھول کر ایک نئی زندگی شروع کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے بارے میں کچھ باتیں تمہارے کانوں تک بھی پہنچی ہوں گی۔ میں اس بارے میں کسی طرح کی صفائی پیش کرنا نہیں چاہتا لیکن ایک بات پورے یقین سے کہہ رہا ہوں۔ تمہیں مجھ سے کسی طرح کی شکایت نہیں ہو گی۔"

وہ ہولے سے منمنائی۔ "میں کوئی جواب تو طلب نہیں کر رہی ہوں۔"

شہوار کے ساتھ میری زندگی کا آغاز بہ ظاہر نارمل تھا مگر یہ صرف مجھے پتا تھا کہ یہ نارمل نہیں ہے۔ ایک نوجوان خوبرو دلہن کا شوہر ہونا یقیناً ہزارہا لوگوں کے لیے ایک پُر لطف تجربہ ہوتا ہو گا مگر میں پوری سچائی سے بتاتا ہوں کہ میرے لیے ایسا نہیں تھا۔ میں اس تجربے کو شاید ایک مثال سے واضح کر سکوں۔ جس طرح ہمیں اکثر کھانے کی رغبت نہیں ہوتی لیکن جب ہم کسی کے مجبور کرنے پر کھانا شروع کر دیتے ہیں تو پھر شروع والی بے رغبتی کم ہو جاتی ہے۔ بس میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ ہاں یہ بات ہے کہ میں نے شہوار کو اپنے اندر کے خلا کا ذرا سا احساس بھی نہیں ہونے دیا۔

شہوار کے ساتھ شادی سے پہلے مجھے جاگیر میں ایک بلند مقام حاصل ہو گیا تھا۔اس شادی کے بعد میرے مرتبے میں مزید اضافہ ہوا۔اب میں جاگیر کا سالار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زمیندار اور ایک طاقتور برادری کا جنوائی بھی تھا۔جاگیر کے کاموں میں میرا عمل دخل خود بہ خود بڑھ گیا۔ہر کام میں مجھ سے مشورہ لیا جانے لگا۔بلقیس براہ راست تو مجھ سے بات نہیں کرتی تھی تاہم چودھری نشاط اور رونق علی وغیرہ کے ذریعے ہر کام میں مجھ سے صلاح لیتی تھی۔راجوال میں میرا جو سفر دودھ دھونے والے ادنٰی ملازم سے شروع ہوا تھا وہ اب ایک بااثر زمیندار کی منزل تک پہنچ گیا تھا۔اور میری اس پرواز کے پیچھے جو توانائی تھی،اس کا سرچشمہ صرف مجھے معلوم تھا۔بس ایک آواز،ایک لشکارے مارتا کوکا اور ایک جھکی جھکی نظر!

یہ شہوار سے میری شادی کے قریباً چھ ہفتے بعد کی بات ہے جب میری ازدواجی زندگی کو پہلا شدید جھٹکا لگا۔میں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا حامد کو ریاضی کا ایک سوال سمجھا رہا تھا،ساتھ ساتھ ہم دونوں اپنے باغ کے آم چوس رہے تھے۔اچانک ملازمہ اللہ رکھی اوپر آئی اور پریشان لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔"چودھری جی! شہوار بی بی آپ کو بتا کر کہیں گئی ہیں؟"

"نہیں تو۔۔۔۔۔وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے؟"

"نہیں جی۔۔۔۔۔میں نے دیکھ لیا ہے۔"

میں کھڑا ہو گیا۔یکایک نیچے سے دوسری ملازمہ چھیدو کے چلانے کی آواز آئی۔"چودھری جی۔۔۔۔۔چودھری جی! دیکھیں بی بی جی کو کیا ہو گیا ہے۔"میں سیڑھیوں کی طرف لپکا ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں طے کرتا ہوا میں نیچے پہنچا۔شہوار ایک پچھلے کمرے میں دری پر بے سدھ پڑی تھی۔اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔نوکرانیاں اس کے ارد گرد جمع تھیں اور واویلا کر رہی تھیں۔

"دیکھو مالک! کیا ہو گیا وہٹی کو۔"شہوار کی خاص نوکرانی رشیداں نے کہا۔وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

میں نے شہوار کو دیکھا۔اس کی نبض ٹٹولی۔سانسوں کی آمدورفت محسوس کی۔وہ غالباً بے ہوش تھی۔میں نے ملازماؤں کو ڈانٹ کر اس کے ارد گرد سے ہٹایا۔پھر اسے بازوؤں میں بھر کر اٹھایا اور کشادہ کمرے میں لے آیا۔میرا دل کہہ رہا تھا کہ خطرے والی کوئی بات نہیں۔

"اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرو۔"میں نے دو ملازماؤں سے کہا۔

خود میں نے شہوار کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے اور دستی پنکھے سے ہوا دی۔ اس کی پلکوں میں جنبش پیدا ہوئی اور وہ کسمسانے لگی۔

میں واپس اس کمرے میں پہنچا جہاں شہوار بے ہوش ملی تھی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ کمرے میں ایک طرف چھوٹی سی پڑیا نظر آئی جس میں کوئی سیاہی مائل شے تھی۔ دراصل یہ افیم کے ٹکڑے تھے۔ ملازمہ اللہ رکھی کے دو چھوٹے جڑواں بچے تھے۔ رات کو ریں ریں کرتے رہتے تھے۔ دیہاتی علاقوں میں اکثر عورتیں بچوں کو پر سکون رکھنے کے لیے انہیں تھوڑی سی افیم دے دیتی ہیں۔ اللہ رکھی بھی ایسا ہی کرتی تھی۔ آج یہ افیم کہیں شہوار کے ہاتھ لگی اس نے مقدار کا اندازہ لگائے بغیر کھالی۔

لیکن سوچنے کی اصل بات یہ تھی کہ اس نے ایسا کیا کیوں؟ اسے ایسی کیا شدید پریشانی لاحق ہو گئی تھی؟ ویسے تو میں دو چار دن سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ چپ ہے اور رات کو بھی دیر تک جاگتی رہتی ہے مگر اس کی پریشانی اس نوعیت کی ہو گی، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

میں واپس آیا تو شہوار کی آنکھیں پھر بند تھیں اور وہ بوجھل سانس لے رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی بے ہوشی اب نیند میں بدل رہی ہے۔ نبض بھی ٹھیک ہی تھی۔ تاہم ظاہری طور

پر وہ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ رشیداں واویلا کرنے والے انداز میں بولی۔ "مالک جاؤ! کسی ڈاکٹر حکیم کو بلاؤ۔ اسے کچھ ہو نہ جائے۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔ اب یہ ٹھیک ہے۔ تم لوگ جاؤ اپنا کام کرو۔" میں نے کہا۔

دوسری ملازمائیں پیچھے ہٹ گئیں مگر رشیداں کھڑی رہی۔ رشیداں "قلعہ والا" کی رہنے والی تھی اور شہوار کے جہیز کے ساتھ ہی یہاں آئی تھی۔

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "رشیداں! تم نے سنا نہیں۔ اب یہ ٹھیک ہے۔ تم جاؤ یہاں سے۔"

رشیداں نے قدرے مجھے تلخ نظروں سے دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ "پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اسے؟ اچھی بھلی تھی وہاں۔ جب سے یہاں آئی ہے، کوئی نہ کوئی مصیبت چمڑی ہوئی ہے۔"

مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے زور سے کہا۔ "کیا بڑبڑ کر رہی ہے؟ کیوں بولتی رہتی ہے ہر وقت۔۔۔۔۔کوئی خاص تکلیف ہے تجھے تو مجھے بتا دے"

میری ڈانٹ پر رشیداں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ "نہیں نہیں مالک جی! میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ میں تو بس کہہ رہی تھی۔۔۔۔"

"تو کچھ مت کہا کر۔ بس اپنے کام سے کام رکھا کر اور اگر تجھے کوئی چیز زیادہ پریشان کرتی ہے تو جا کچھ دن اپنے گھر سے ہو آ۔"

"م۔۔۔۔ مم میں نے کہاں جانا ہے مالک۔ میرا تو اب یہی گھر ہے۔ آپ کے قدموں میں ہی جینا مرنا ہے۔"

"اچھا جا پھر۔" میں نے کہا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی باہر چلی گئی۔

دس پندرہ منٹ بعد شہوار نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اسے تھوڑا سا قہوہ پلایا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں اب بھی غنودگی تھی تاہم وہ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔

میں نے اسے افیم دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہی کھائی ہے نا تم نے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں بس تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی تھی۔ شاید مجھے پتا نہیں چلا، میں نے زیادہ کھا لی۔ خالی پیٹ تھا اس لیے اثر بھی جلدی ہوا۔"

صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اصل بات چھپا رہی ہے۔ میں اس کی سرخ آنکھوں میں ناراضی کے آثار بھی دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے شہوار! مجھے لگتا ہے کہ تم خوش نہیں ہو۔ کوئی چیز ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔"

"نہیں۔ مجھے یہاں کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ سب کچھ ہی تو ہے۔ ہر طرح کا آرام ہے۔ نوکر چاکر ہیں۔ سیر تفریح ہے۔ تم ہو۔" میں اس کے لہجے کی تہ میں ہلکی سی تلخی محسوس کر سکتا تھا۔

میں اس کے سرہانے کی طرف بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس سے باتیں کرنے لگا۔ دو ملازماؤں نے ہمیں تنہائی دینے کے لئے کمرے کے پردے گرا دیے تھے۔

میں شہوار کی پریشانی کی اصل وجہ جاننا چاہتا تھا۔ میں ایک طویل کوشش کے بعد ہی کامیاب ہو سکا۔ بالآخر شہوار کے دل کی بات اس کی زبان پر آ گئی۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بولی۔

"خاور! تم حامد کو پڑھانا بند کر دو۔ مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔ آخر راجوال میں اور لوگ بھی

ہیں جو اسے پڑھا سکتے ہیں اور پھر یہاں پیسے کی کوئی کمی ہے ؟اسے پڑھانے کے لیے شہر سے اچھے سے اچھا ٹیچر بلوایا جا سکتا ہے۔"

میں نے گہری سانس لے کر شہوار کی طرف دیکھا۔اس کے چہرے پر شکوک کے گہرے سائے تھے۔میں سمجھ گیا کہ وہ بات تو حامد کی کر رہی ہے مگر اس کا اصل اشارہ بلقیس کی طرف ہے۔۔۔۔وہ حامد کے پیچھے بلقیس کو دیکھ رہی تھی اور اس کا ذہن اسے باور کروا رہا تھا کہ حامد کے ساتھ میرا ناتا دراصل بلقیس کے ساتھ ناتا ہے اور اگر حامد کے ساتھ میرا ملنا جلنا جاری رہا تو پھر کئی ایسے مواقع پیدا ہوں گے جب میں بلقیس سے بھی ملوں گا۔

میں جانتا تھا کہ اس کے اندیشے غلط ہیں مگر وہ جو بات کہہ رہی تھی وہ ٹھیک تھی۔

میں نے کہا۔"شہوار! وہ صرف اس وجہ سے آرہا تھا کہ چند روز میں اس کا امتحان شروع ہونے والا ہے۔اس کے بعد اس نے کہاں آنا ہے"

"کیا وہ تمہارے بغیر امتحان نہیں دے سکتا؟"شہوار نے عجیب پر تپش لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔چھوڑو اس بات کو۔اگر تم نہیں چاہتی ہو تو وہ نہیں آئے گا۔کل سے نہیں آئے گا۔"

وہ گھمبیر انداز میں بولی۔"میں چاہتی ہوں کہ جب تم گھر آجاؤ تو میرے سامنے رہو۔کوئی تیسرا ہمارے درمیان نہ ہو۔"

اگلے روز حامد کے آنے سے پہلے میں نے رونق علی کے ذریعے بلقیس تک یہ بات پہنچا دی کہ حامد پڑھنے نہ آیا کرے۔میں نے رونق سے یہ بھی کہا کہ وہ ڈسکے سے حامد کے لیے کسی اچھے ٹیچر کا انتظام کر دے۔خاص طور سے ایسا ٹیچر جو ریاضی میں اس کی کمزوری دور کر سکے۔

تین چار دن بہ خیریت گزر گئے۔میں اپنی زمینوں کی حد بندی کرا دی تھی۔میں سارا دن خود کو مصروف رکھتا تھا اور یہ مصروفیت میرے حق میں بہتر تھی۔کچھ ایسی سوچوں سے میرا پیچھا چھوٹا رہتا تھا۔جنہیں میں ہر گز دماغ میں جگہ دینا نہیں چاہتا تھا۔شام کے وقت حویلی کے مردانے میں روزانہ چودھری عزیز،چودھری نشاط اور دیگر لوگوں کے ساتھ بیٹھک ہوتی۔اس میں سارے دن کے معاملوں پر بات کی جاتی اور ارد گرد ہمارے جو تین چار مخبر موجود تھے،ان کی اطلاعات پر غور ہوتا۔درحقیقت لمبڑوں میں میری شادی نہلے پر دہلا تھا۔ اس شادی سے موکھلوں کی چال کا ایسا زبردست توڑ ہوا تھا کہ وہ ابھی تک ہکا بکا تھے۔ان کی مخالفانہ سرگرمیاں بھی ایک دم بالکل کمزور پڑ گئی تھیں۔

یہ پانچویں چھٹے دن کی بات ہے، میں تھکا ہارا گھر پہنچا تو بے بے جی پریشان نظر آئیں۔ وہ شہوار کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کی پریشانی کا تعلق شہوار سے ہے۔

"کیا بات ہے بے بے جی! شہوار تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہے۔ رو رہی ہے۔ جا پوچھ لے اس سے۔"

"کیا ہوا ہے؟" میں چونک گیا۔

"ہونا کیا ہے، وہی رونا ہے پہلے والا۔ تو نے بلقیس کے بیٹے سے کہا نہیں تھا کہ وہ نہ آیا کرے؟"

"کہا تو تھا بے جی۔ کیا وہ پھر آیا تھا؟"

"وہ اتنی آسانی سے رکنے والا کہاں ہے؟ کل بھی آیا تھا۔ کہتا ہے میں نے چاچا سے بات کرنی ہے۔ ووہٹی (شہوار) سے بخشا بخشی کر رہا تھا۔ میں نے کہہ سن کر واپس بھیج دیا۔ آج پھر آ گیا۔ ووہٹی سے لڑنے جھگڑنے لگا۔ کہہ رہا تھا کہ تمہاری وجہ سے چاچا مجھ سے نہیں ملتا۔ اور

یہ بھی کہہ رہا تھا کہ یہ ہمارا گھر ہے، تم اس کی مالکن بنی ہوئی ہو۔ اس نے زبردستی اندر آنا چاہا۔ ووہٹی نے اسے روکا تو اس نے ووہٹی کو دھکا دے دیا۔ ووہٹی بھی وڈے باپ کی بیٹی ہے۔ اس میں بھی غصہ ہے۔ اس نے حامد کو تھپڑ مار دیا۔"

"کب کی بات ہے یہ؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ابھی تمہارے آنے سے کوئی ایک گھنٹا پہلے کی۔ مجھے تو ڈر ہے یہ معاملہ زیادہ نہ بگڑ جائے۔ اگر تو کہتا ہے تو میں جا کر بلقیس سے بات کروں؟"

"نہیں، آپ رہنے دیں۔ میں رونق علی سے بات کرتا ہوں۔ وہ سنبھال لے گا۔"

"اچھا تو ووہٹی کے پاس جا۔ اسے ذرا تسلی دے۔ وہ تب سے رو رہی ہے۔"

میں شہوار کے پاس پہنچا۔ وہ منہ پر دوپٹا لیے پڑی تھی۔ ملازمہ رشیداں اس کے پاس بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی رشیداں اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔ شہوار بھی سوجی سوجی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہو گیا ہے شہوار؟" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"تم مجھے امی کے پاس چھوڑ آؤ۔ میں یہاں رہ کر ہر روز اپنی بے عزتی نہیں کرا سکتی۔"

"حوصلہ کرو شہوار! وہ بچہ ہے۔ اگر۔۔۔۔"

"وہ بچہ ہے، پر میں بچی نہیں ہوں۔" اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ "میں سب جانتی ہوں جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اور جو ہوتا رہا ہے۔"

"شہوار! یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"میں یہاں رہوں گی تو میرے منہ سے ایسی ہی باتیں نکلیں گی۔ تم مہربانی کر کے مجھے کچھ دن کے لیے چھوڑ آؤ۔"

"میں چودھری عزیز سے بات کرتا ہوں شہوار۔ عزیز سمجھا لے گا حامد کو اور بلقیس کے کانوں سے بھی ساری بات گزار دے گا۔"

"یہاں میرے ساتھ جو ہونا ہے، وہ مجھے ابھی سے نظر آرہا ہے۔ تین دن پہلے تم نے ان کی خاطر رشیداں کو برا بھلا کہا ہے۔ کچھ دن بعد مجھ سے بھی یہی کچھ کرو گے۔" وہ رونے لگی۔

"شہوار۔۔۔۔۔ شہوار! خود کو سنبھالو۔ ابھی تو ہماری زندگی کا سفر شروع ہوا ہے۔ ابھی سے ہم اس طرح کی باتیں کریں گے تو آگے کیا بنے گا؟"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ بڑے نرم لہجے میں اس سے بات کی اور اسے کسی حد تک سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔

رات کو نو بجے کے قریب ایک ملازم رونق علی کا پیغام لے کر آگیا۔ اس نے بتایا کہ رونق صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں بلڈ پریشر والی مشین لے کر پہنچوں۔

میں نے بی پی آپریٹس لیا اور رونق علی کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ کمرے میں نیم دراز تھا۔ حقے کی نال حسب معمول اس کے سینے پر دھری تھی۔ ہلکی بارش کے بعد موسم قدرے خوشگوار تھا۔ رونق نے کمرے کی کھڑکیاں کھولی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی شوگر وغیرہ بھی بڑھی ہوئی ہے۔

"کیا ہو گیا ہے رونق بھائی؟"

"وہی بلڈ پریشر۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ جس میں "بلڈ" تو ہے ہی نہیں۔ پھر یہ پریشر کہاں سے آجاتا ہے؟"

"بلڈ کیوں نہیں ہے۔ چہرہ تو آپ کا ہر وقت لال رہتا ہے۔"

"وہ تو پریشر کی وجہ سے رہتا ہے۔۔۔۔۔اور یہ پریشر کیوں ہوتا ہے، تمہیں کچھ پتا ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ "یہ صرف تمہاری وجہ سے ہوتا ہے۔ تمہاری پریشانیوں کی وجہ سے میرا ستیاناس ہو رہا ہے۔ آخر تم یہ سب کچھ کیوں کرتے ہو شیر شاہ؟"

"اب کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا

"یہ تمہیں بھی اچھی طرح پتا ہے۔ حامد اور تمہاری ووہٹی میں تو تکرار ہوئی ہے۔ ووہٹی نے اسے چپیڑ مار دی ہے۔ وہ تین گھنٹے سے لگاتار رو رہا ہے۔ بلقیس علیحدہ سے پریشان ہے۔"

"شہوار بھی رو رہی تھی۔ اسے تو میں نے سمجھا بجھایا ہے۔ آپ حامد اور بلقیس کو سمجھائیں۔ گھروں میں ایسی باتیں تو ہو ہی جاتی ہیں۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے، میں نے انہیں سمجھایا نہیں۔۔۔۔۔میرا بلڈ پریشر یوں ہی اتنا ہو گیا ہے؟ پورا ایک گھنٹا سر کھپایا ہے میں نے۔ دراصل میں نے اندازہ لگایا ہے کہ حامد نے تمہاری شادی کا کچھ زیادہ ہی اثر لیا ہوا ہے۔ بلقیس نے بتایا ہے کہ وہ ہر وقت اکھڑی اکھڑی باتیں کرتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ شادی کے بعد تم اس سے اور حویلی سے دور ہو گئے ہو۔ اور وہ

اس کا قصوروار شہوار کو سمجھنے لگا ہے۔ بلقیس بھی اسے سمجھاتی ہے لیکن وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا ہے۔ جب سے تم نے اسے پڑھانا شڑھانا بند کیا ہے، اس کے دل میں اور گرہ پڑ گئی ہے۔"

"اب مجھے بتائیں۔۔۔۔۔اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"تمہارا قصور بس اتنا ہے کہ تم نے اسے بہت زیادہ اپنے ساتھ چموڑ رکھا تھا۔ خاص طور سے جب سے تم جیل سے واپس آئے ہو، وہ ہر وقت تمہارے ساتھ رہتا تھا۔ اب اس کو ایک دم دوری محسوس ہو رہی ہے۔ اچھا، تم میرا بلڈ پریشر دیکھو۔ باتوں سے اور بڑھتا جا رہا ہے۔"

میں نے بلڈ پریشر دیکھا۔ وہ واقعی بڑھا ہوا تھا۔ دو سو سے اوپر جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "رونق بھائی! مجھے تو آپ کا چل چلاؤ نظر آ رہا ہے۔ وہ سفید والی گولی کہاں ہے جو میں نے آپ کو دی تھی؟ وہ فوراً کھائیں۔ جلدی کریں۔"

گولی ساتھ والے کمرے میں پڑی تھی۔ رونق علی توند مٹکاتا ہوا گولی لینے چلا گیا۔ تیمور مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ "یار! تمہیں پتا ہے اپنے بلڈ پریشر صاحب کا بلڈ پریشر کیوں بڑھ رہا ہے؟"

"کیوں؟"

"شاید ان کو تھوڑی بہت پریشانی حامد والے معاملے کی بھی ہو گی لیکن اصل بات اور ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے، آج کل برسات کا موسم ہے۔ خون پانی ایک ہوا ہوتا ہے اور جناب بلڈ پریشر (رونق علی) صاحب روزانہ چھ دیسی چوچوں کی یخنی پی رہے ہیں۔ تین کی دوپہر کو، تین کی رات کو۔ ایک حکیم صاحب نے یہ نسخہ بتایا ہے اور ساتھ ہی دعویٰ کیا ہے کہ وہ دو مہینے میں خود کو بالکل تازہ دم محسوس کرنے لگیں گے۔"

"تازہ دم تو جناب تب ہوں گے جب ان میں دم رہے گا۔ اگر یہ واقعی اس طرح یخنی پی رہے ہیں تو ایک مہینہ بھی مشکل سے نکالیں گے۔ وہ حکیم کوئی پرانی دشمنی لے رہا ہو گا۔"

"لیکن یہ خود بھی اپنے دشمن بنے ہوئے ہیں۔" تیمور نے سرگوشی کی۔ "ڈسکے میں جس طوائف کے پاس جایا کرتے تھے اس سے باقاعدہ شادی کا پروگرام بن رہا تھا۔ مشکل سے انیس بیس سال عمر ہے کڑی کی۔"

اسی دوران میں رونق علی گولی لے کر واپس آ گیا۔ میرے سامنے اس نے لسی کے ساتھ گولی کھائی اور ایک تین چار گز لمبی ڈکار لی۔ میں نے کہا۔ "رونق بھائی! اپنی تھوڑی سی سمجھ بوجھ کے مطابق میں نے آپ کو گرم چیزوں سے پرہیز بتایا تھا۔"

"پرہیز شرہیز تو میں ایک دم کر رہا ہوں۔ اگر کوئی گرم شے کھا لوں تو فوراً کافی ساری گنڈیریاں چوس لیتا ہوں۔"

"ہاں، گنڈیریاں تو آپ کی شوگر کے لیے بھی بہت اچھی ہیں۔ جس طرح چوچوں کی یخنی بلڈ پریشر کے لیے مفید ہے۔"

"ہاں ہاں۔" رونق نے ذرا چونک کر کہا۔ "ویسے یخنی سے مجھے واقعی فائدہ ہو رہا ہے۔ یہ تر گرم ہوتی ہے نا۔"

"فائدہ تو ظاہر ہے۔ بلڈ پریشر ماشاءاللہ ڈھائی سو تک ہونے والا ہے۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے، وہ بھی پوری ہو جائے گی۔"

"وہ کس طرح؟" رونق نے روانی سے پوچھا۔

"یخنی کی طرح انیس بیس سال کی لڑکی بھی تر گرم ہوتی ہے۔ تر گرم بھی کیا ٹھنڈی ہوتی ہے۔ بڑا فائدہ ہو گا آپ کو۔ دو چار ہفتے میں آپ کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔"

میرے لہجے کی زہرناکی کو محسوس کر کے رونق علی چونکا۔ میں بڑبڑاتا ہوا واپس آ گیا۔

حامد والے واقعے کا مجھے بہت افسوس تھا۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ بلقیس کے دل پر کیا گزری ہو گی۔ اس کا ملول غمزدہ چہرہ میرے تصور میں تھا۔ روئی روئی آنکھیں، کھویا کھویا لہجہ!

جیسا کہ میں نے بتایا ہے میں خود کو بہت مصروف رکھتا تھا۔ کئی ہفتے سے میں نے بلقیس کو دیکھا نہیں تھا لیکن جب کہیں تھوڑی دیر کی فرصت ملتی تھی وہ پوری آب وتاب کے ساتھ میرے خیالوں میں آدھمکتی تھی۔ شہوار بھی کم خوبصورت نہیں تھی۔ وہ جوان بھی تھی۔ ایک نئی دلہن کی ساری کشش اس میں موجود تھی۔ اگر حالات سے مجبور ہو کر میں کبھی شہوار کے پاس ہوتا بھی تھا تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں کوئی جرم کر رہا ہوں۔ ایسے میں ایک احساس ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا اور وہ یہ کہ میں شہوار سے جتنا قریب ہوں گا، بلقیس سے اتنا ہی دور ہوتا جاؤں گا۔۔۔۔ اور پھر ایک دن بلقیس ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جائے گی۔

ایسا سوچتے ہوئے میں ایک دم چونک بھی جاتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی تک میرے دل میں بلقیس سے پھر ملنے کی آس موجود تھی۔ یہ آس ختم کیوں نہیں ہوتی تھی۔۔۔۔ کیوں مر نہیں جاتی تھی؟ پڑھنے والوں کو میرا رویہ عجیب لگے گا مگر میں اسے کھول کر بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ ایک خوبرو اور پرجوش بیوی کی حیثیت سے شہوار ہر وقت میرے پاس تھی۔

شام ہوتے ہی اس کی آنکھوں میں رنگ لہرانے لگتے تھے۔ اس کی پائل کھنکنے لگتی تھی۔ میں اس سے گریز کی کوشش کرتا تھا کیونکہ میرے سینے میں دھواں سا بھرا ہوتا تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں کسی گناہ کی طرف مائل ہو رہا ہوں۔ میں وقت کو ٹالنے کی کوشش کرتا تھا اور جس رات وقت نہیں ٹلتا تھا اور شہوار کامیاب ہو جاتی تھی، بعد ازاں میں دیر تک افسردہ پڑا رہتا تھا۔ ایک عجیب سی کوفت اور ندامت میرے سراپا کو گھیر لیتی تھی۔ پھر یوں ہوتا کہ میں کئی دن کے لیے شہوار سے دور ہو جاتا، کھانا پینا چھوڑ دیتا یا بہت ہی کم کھاتا۔ سخت تھکن کے باوجود خود کو مصروف رکھتا اور اپنے جسم کو توڑتا رہتا۔ شاید یہ سارے کام خود کو اذیت دینے کے لئے ہوتے تھے۔ ہر ہفتے میں نہایت خاموشی سے ایک معقول رقم خیرات کرتا تھا۔ یہ کام کرتے ہوئے میرے ذہن کی گہرائی میں کہیں بلقیس کا تصور ہوتا تھا۔ میں اس سے دور ہو گیا تھا لیکن دل اس سے دور نہیں ہوا تھا۔

اور پھر انہی دنوں ایک اور واقعہ ہوا۔ میں اپنے پانچ چھ ساتھیوں کے ہمراہ شام کے بعد مچھلی فارم کی طرف گشت لگانے گیا تھا۔ واپسی پر باغ والے ڈیرے جانے کا ارادہ تھا لیکن جب میری گھوڑی ڈیرے کے پاس پہنچی تو باہر دو چار تانگے کھڑے نظر آئے اور اندر سے ناچ

گانے کی صدائیں سنائی دیں۔یقیناً چودھری نشاط اور رونق علی وغیرہ نے محفل جمائی ہوئی تھی۔میں اب چونکہ ایسی محفلوں میں بالکل شریک نہیں ہوتا تھا اس لیے میں گاؤں کی طرف چل دیا۔اور میرا ایسا کرنا اچھا ہی ہوا۔

ابھی میں اپنی حویلی سے تھوڑی دور ہی تھا کہ بڑے مالی کا بیٹا گلزار بھاگا ہوا آیا اور بولا۔

"چودھری جی!اچھا ہوا آپ آ گئے۔اندر آپ کی بڑی جرورت ہے جی۔چھوٹے مالک حامد کی طبیعت بڑی کھراب ہے۔ان کو سانس نہیں آ رہا۔"

"اوہو۔"میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔میں تیزی سے بڑی حویلی کی طرف بڑھا لیکن دو قدم چل کر رک گیا۔میں نے خود سے اور شہوار سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ حویلی میں نہیں جاؤں گا۔میں نے گلزار سے کہا۔"تم تیمور صاحب کو دیکھو وہ تھان کی طرف ہوں گے۔ان کو اندر لے جاؤ۔۔۔۔اور منشی منظور کہاں ہے؟"

اتنے میں منشی منظور بھی تیزی سے آتا دکھائی دیا۔اس نے دور ہی سے مجھے اشارہ کیا۔"خاور پتر!جلدی آ۔"وہ پکار کر بولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں چند لمحے تذبذب میں کھڑا رہا پھر گلزار اور منشی منظور کے ساتھ حویلی میں چلا گیا۔۔۔۔۔
حامد کی طبیعت واقعی خراب تھی۔وہ بہت کھینچ کر سانس لے رہا تھا اور ہر سانس کے ساتھ آواز سنائی دے رہی تھی۔وہ بے حد بے قرار بھی تھا۔ایسا عموماً نمونیہ یا خناق وغیرہ میں ہوتا ہے۔"کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟"میں نے بلقیس سے پوچھا۔

"ہاں، کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔لیکن اس دفعہ زیادہ ہوا ہے۔حکیم جی نے بتایا تھا، خناق کی شکایت ہے۔"

ان تکلیفوں کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ مجھے بھی تھی۔یہ خناق ہی کی شکایت تھی۔اس میں گلا بند ہو جاتا ہے اور سانس کے ساتھ ایک طرح کی آواز بھی پیدا ہوتی ہے۔میرے پاس وکس کا تھوڑا سا مرہم موجود تھا۔میں نے یہ مرہم منگوایا اور حامد کے سینے اور گلے وغیرہ پر ملا۔اس کی سانس قدرے بہتر ہوئی تو ہم نے اسے فوراً گاڑی میں ڈالا اور آدھ پون گھنٹے کے اندر ڈسکے لے آئے۔یہاں ڈاکٹر نے انجکشن لگایا، دوا وغیرہ دی اور اس کی طبیعت بحال ہو گئی۔وہ ایک دم پر سکون ہو کر سو گیا۔

بچے عام طور پر بدپرہیزی کر لیتے ہیں۔ حامد نے بھی کھٹیاں توڑ کر کھائی تھیں اور بیمار ہو گیا تھا۔ بیماری کا شدید حملہ تو پسپا ہو گیا تھا مگر اسے تیز بخار نے جکڑ لیا اور سینے میں درد ہونے لگا۔۔۔۔اسے ڈسکے لے جانے اور لانے کی ذمہ داری نصر اللہ نے اٹھالی۔ میں پہلے دن کے بعد دوبارہ حویلی میں نہیں گیا اور نہ ہی حامد سے ملا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شہوار میرے حویلی میں داخل ہونے اور بلقیس کے ساتھ ڈسکے جانے پر اعتراض کرے گی مگر اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور یہ بات نہیں چھیڑی۔ بلکہ وہ ایک دو دفعہ اپنے طور پر حامد کی بیمار پرسی کے لیے بھی گئی۔ یہاں نوٹ کرنے والی بات یہ تھی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر نہیں گئی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ مجھے اور بلقیس کو ایک ساتھ دیکھ کر اس کے دل پر بوجھ پڑتا ہے۔۔۔۔ بلکہ کسی وقت تو محسوس ہوتا تھا کہ میرے منہ سے اسے بلقیس کا نام سننا بھی اچھا نہیں لگتا۔

ایک شام میں اصطبل میں ایک بیمار گھوڑے کو دیکھ رہا تھا کہ مجھے تاجو نظر آئی۔ اس نے مجھے ہلکا سا اشارہ کیا اور کھیتوں کی طرف چلی گئی۔ وہ شاید مجھ سے کوئی بات کہنا چاہتی تھی۔ میں اس کے پیچھے گیا تو وہ چری کے اونچے کھیتوں میں ایک کیکر کے ساتھ کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے تاجو؟" میں نے پوچھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "حامد آپ کو بہت یاد کرتا ہے جی۔ وہ بیمار بھی ہے۔ کل بھی آپ سے ملنے کی بڑی ضد کر رہا تھا۔ بیگم جی نے اسے جھڑکیاں دیں۔ وہ رونے لگا۔ بیگم جی بھی روتی رہیں۔"

"اب وہ کیسا ہے؟"

"بس ٹھیک ہی ہے۔ بیگم جی نے آپ کے لیے پیغام دیا ہے کہ کسی طرح آپ تھوڑی دیر کے لیے آکر اس سے مل جائیں۔ اگر آپ کی ووہٹی جی بھی ساتھ آجائیں تو اچھا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گا۔ میری طرف سے حامد کو پیار دینا۔ میں نے کہا۔

رات کو دیر تک میں سوچتا رہا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں حویلی میں جاتا اور شہوار رونا دھونا شروع نہ کر دیتی۔ یہ بھی مشکل تھا کہ وہ میرے ساتھ حویلی چلی جاتی۔ وہ اس معاملے میں دن بہ دن نازک مزاج ہوتی جارہی تھی۔ اگلے روز بارش ہو رہی تھی۔ قلعہ والا سے شہوار کی کچھ سہیلیاں رات رہنے کے لئے آئی ہوئی تھیں۔ وہ ان کی خاطر تواضع اور باتوں میں مگن تھی۔ دیہات میں برسات کی ایسی شاموں میں میٹھے پوڑے بنائے جاتے ہیں، پکوڑے تلے جاتے ہیں اور حلوہ وغیرہ تیار کیا جاتا ہے۔ میرے گھر میں بھی ان پکوانوں کی خوشبو پھیلی ہوئی

تھی۔ بار بار شہوار کی سہیلیوں کے قہقہے گونجتے تھے۔ میں خاموشی سے نکل آیا۔ بارش سے بچنے کے لئے میں نے ایک موٹی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اندر کمرے میں حامد خاموش لیٹا ہوا تھا۔ بلقیس اس کے ساتھ بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر حامد کھل اٹھا۔ میں نے پلنگ پر بیٹھ کر اسے گلے سے لگایا۔ وہ بولا۔ "مجھے آپ پر بڑا غصہ ہے چاچو۔ آپ نے اس دن کے بعد میرا پتا ہی نہیں لیا۔"

"تمہارا پتا تو میں ہر وقت رکھتا تھا۔ بس یہاں نہیں آسکا۔"

"مجھے پتا ہے آپ کیوں نہیں آتے۔ آپ اس سے ڈرتے ہیں۔ اس نے آپ کو۔۔۔۔ تالے میں رکھا ہوا ہے۔"

"ایسی باتیں نہیں کرتے حامد۔" بلقیس نے اسے ڈانٹا۔ "وہ تمہاری بڑی ہیں۔ ان کا نام تمیز سے لو۔ نہیں تو میں بات نہیں کروں گی تم سے۔"

"تو پھر وہ کیوں نہیں آنے دیتی؟ نہ چاچو میرے ساتھ شکار پر جاتے ہیں، نہ مجھے پڑھاتے ہیں۔۔۔۔ نہ آپ سے بات کرتے ہیں۔"

"دیکھو، یہ سب کچھ وقتی ہے۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم پریشان نہ ہو۔" میں نے حامد کو پچکارا۔

حامد نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "تو پھر آپ مجھ سے وعدہ کرو چاچو! آپ مجھ سے ملنے آیا کرو گے۔" اس کا ہاتھ بخار میں تپ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں آؤں گا۔"

"نہیں، مجھ سے وعدہ کرو۔" اس کا گرم ہاتھ بہ دستور میرے ہاتھ میں تھا۔

"اچھا وعدہ کرتا ہوں۔ لیکن تم بھی وعدہ کرو کہ چاچی سے لڑو گے نہیں بلکہ اس سے دوستی کرو گے۔" حامد نے اثبات میں سر ہلایا۔ مگر اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ بہ امر مجبوری ایسا کر رہا ہے۔ اگلے دس پندرہ روز میں مجھے مزید دو دفعہ اسی طرح خاموشی سے حامد کے پاس جانا پڑا۔ میں وہاں زیادہ دیر بیٹھتا بھی نہیں تھا، بس دس بیس منٹ میں واپس آجاتا تھا۔ بلقیس سے بھی بس واجبی سی بات ہوتی تھی۔ جیسے دو اجنبی راہ چلتے چلتے چند لمحے کے لیے ایک دوجے سے رسمی بات کرلیں۔ دونوں مرتبہ حویلی میں جاتے ہوئے میں نے احتیاط رکھی تھی کہ ملازمہ فیروزاں حویلی میں موجود نہ ہو۔ وہ چودھری عزیز کی چہیتی ملازمہ تھی اور ایسی

باتوں کی ٹوہ رکھتی تھی جن سے مجھے نقصان پہنچ سکتا ہو۔ بے شک زمینوں کی رجسٹریاں میرے ہاتھ آجانے کے بعد چودھری عزیز کی سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں اور میرے ساتھ اس کا رویہ بہتر تھا تاہم میں اس کی طرف سے بالکل بے پروا نہیں ہو سکتا تھا۔

میں جب تیسری بار حامد کی بیمار پرسی کے لیے گیا تو شام کا وقت تھا۔ شہوار سہ پہر کو سوئی تھی اور ابھی تک جاگی نہیں تھی۔ میں حامد کے کمرے میں پہنچا۔ یہ برسات کا ایک گرم دن تھا۔ ساری کھڑکیاں کھلی تھیں، حامد رنگین پلنگ پر سو رہا تھا۔ بلقیس اس کے سرہانے بیٹھی کروشیا کر رہی تھی۔ ملازمہ تاجو ایک بڑے دستی پنکھے سے ماں بیٹے کو ہوا دے رہی تھی۔

میں آیا تو تاجو سلام کر کے باہر چلی گئی۔ اس کی جگہ بلقیس ایک چھوٹے پنکھے سے حامد کو ہوا دینے لگی۔ میں نے موڑھے پر بیٹھ کر حامد کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بخار نہیں تھا۔ وہ تیزی سے تندرست ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "اچھا، میں پھر آؤں گا۔ ابھی تو یہ سو رہا ہے۔"

میں اٹھنے لگا تو بلقیس بولی۔ "بیٹھ جاؤ۔"

میں اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔ وہ ہولے سے بولی۔ "میرا خیال ہے، اب یہ ٹھیک ہے۔ تم اب نہ آنا۔ مجھے ہر وقت شہوار کی طرف سے فکر رہتی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا تو خواہ مخواہ پریشان ہو گی۔"

میں نے کہا۔ "جس نے پریشان ہونا ہو، وہ پریشانی کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ہر طرف سے آنکھیں بند کر لوں۔"

"کچھ بھی ہے خاور! تمہیں اس کا بہت دھیان رکھنا چاہیے۔ وہ دل کی بری نہیں ہے بلکہ اچھی ہے۔ ہر بیوی کی طرح وہ بھی چاہتی ہے کہ تمہاری ساری توجہ اس کی طرف ہو۔ خاص طور سے ایسے وقت میں جب شادی کو ابھی چند ہی مہینے ہوئے ہیں۔"

"جو کچھ میرے بس میں ہے، وہ تو کر رہا ہوں۔ جو بس میں نہیں ہے وہ کیسے کروں؟ تم جانتی ہو میں تمہیں۔۔۔۔۔اور حامد کو بھلا نہیں سکتا۔"

"میرا نام اب مت لو خاور! وہ سب کچھ اب ختم ہو چکا ہے۔۔۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔" اس نے آہنی لہجے میں کہا

"میرے لیے ختم نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر میں زیادہ تنگ ہوا تو چپ چاپ کسی طرف نکل جاؤں گا، کبھی کسی کو شکل نہیں دکھاؤں گا۔" میرے لہجے کی تہ میں آتشیں آنسو تھے۔

وہ میرے لب و لہجے کو محسوس کر کے ایک دم دھیمی پڑ گئی۔ "دیکھو خاور! جو کچھ بھی ہے ہمارے دلوں میں ہے اور اس کو دلوں میں ہی رہنا چاہیے۔ محبت ایسے بھی تو ہوتی ہے۔"

"میں تم سے کچھ مانگ تو نہیں رہا۔"

"لیکن میں مانگ رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اپنا سارا پیار شہوار کو دو۔ اس کو اتنا خوش رکھو کہ اس کے دل میں جو گلے ہیں وہ سب دور ہو جائیں۔ وہ ساری پرانی باتیں بھول جائے۔"

اچانک شام کی نیم تاریکی میں ایک سایہ سا کھڑکی کے سامنے لہرا گیا۔ اس طرف بلقیس کی پشت تھی، وہ نہیں دیکھ سکی تھی لیکن میں نے دیکھ لیا۔ میں تیزی سے اٹھ کر راہداری کی طرف گیا۔ میں نے کسی کو راہداری کے موڑ پر اوجھل ہوتے دیکھا۔ مجھے نیلے لباس کی جھلک بھی نظر آئی۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ شہوار نے بھی آج نیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔

"کیا ہوا خاور؟" بلقیس نے کمرے کے دروازے میں آ کر پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے، کوئی پیچھے والی کھڑکی سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔"

"اچھا، اب تم جاؤ۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔ بے بے جی اور عارفہ کو میرا اسلام کہنا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور حویلی کے ایک بغلی دروازے سے باہر نکل آیا۔

میں اپنی حویلی میں پہنچا تو سب سے پہلے عارفہ کا دھواں دھواں چہرہ نظر آیا۔ وہ اپنے بچے کے ساتھ برآمدے میں ہی کھڑی تھی۔ "خاور بھاجی! آپ نے کیا کہہ دیا ہے بھابھی کو۔ وہ تو اُچی اُچی رو رہی ہے۔"

میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ کھڑکی میں نظر آنے والا ہیولا شہوار کا ہی تھا۔ میں تیزی سے کمرے میں پہنچا۔ شہوار بڑے طیش کے عالم میں اپنے کپڑے ایک اٹیچی کیس میں رکھ رہی تھی۔۔۔۔ تمتمائے ہوئے چہرے والی شیداں بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر شیداں ساتھ والے کمرے میں اوجھل ہو گئی۔

"کیا بات ہے شہوار۔۔۔۔ کیا کر رہی ہو؟" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

اس نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ پیچھے ہٹایا۔ "خبردار! دور ہو جاؤ مجھ سے۔" وہ دہاڑی۔ "جاؤ اپنی اسی سہیلی کے ساتھ گھس کر بیٹھو۔ تمہاری اصل وہٹی تو وہی ہے۔ میں تو یہاں بس اپنا خون ساڑنے کے لیے آئی ہوں۔ جاؤ اسی ففے کٹنی کے پاس۔ اس کے کلیجے کی آگ ٹھنڈی کرو۔"

"شہوار!" میں زور سے بولا۔ "منہ سنبھال کر بات کرو۔ یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"اب میں منہ سنبھال کر بات نہیں کروں گی۔ وہی کہوں گی جو دیکھ رہی ہوں، سن رہی ہوں۔ ساری دنیا کہتی تھی، تم اس زنانی کے جال میں ہو۔ وہ تمہیں اپنے جال سے نکلنے نہیں دے گی۔ پر میں اپنے آپ کو تسلیاں دیتی تھی۔ میں سمجھتی تھی، میں تم کو بدل لوں گی۔ اپنی محبت اور خدمت سے تمہیں ٹھیک کر لوں گی۔ یہ میری بھول تھی میری خوش فہمی تھی۔"

"شہوار! تم غلط سمجھ رہی ہو۔ اب ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ سب پرانی باتیں ہیں۔ میں وہاں صرف حامد کا پتا لینے گیا تھا۔ تم جانتی ہو۔۔۔۔"

"میں سب جانتی ہوں۔" اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ "تم بالکل بے قصور ہو۔ اور تم سے بڑی بے قصور وہ ہے۔ والی جی کی زندگی میں ہی اس نے تم سے یارانہ پالا ہوا تھا۔ اب ان کی

موت کے بعد بھی اسے شرم نہیں آ رہی۔ دنیا کو دکھانے کے لیے اس نے مجھے، تمہاری نام کی بیوی بنایا ہے۔ اصل بیوی وہ خود ہے۔۔۔۔۔ وہ خود ہے۔ وہ گندی بدذات ہمیں کبھی آباد نہیں ہونے دے گی۔"

"خاموش!" میں دہاڑا۔ میرا زوردار طمانچہ شہوار کے گال پر لگا۔ وہ لڑکھڑا گئی۔۔۔۔۔ پھر سنبھلی اور شدید طیش کے عالم میں مزید زور زور سے چلانے لگی۔ وہ بلقیس کے لیے جو الفاظ بول رہی تھی انہیں سننا اور سہنا میرے بس میں نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ بلقیس کے لیے اس کے اندر جو لاوا کئی ماہ سے پک رہا تھا، وہ پھٹ پڑا ہے۔ جب وہ چپ نہیں ہوئی تو میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور ہتھیلی سے اس کا منہ ڈھانپ دیا۔ "چپ کر جا۔ نہیں تو میں تجھے جان سے مار دوں گا۔"

اسی دوران میں بے بے جی، عارفہ اور شیداں وغیرہ اندر آ گئیں۔ انہوں نے شہوار کو سنبھالا۔

مجھے ڈر محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں وہاں رہا تو طیش کے عالم میں شہوار کو پھر تھپڑ وغیرہ مار دوں گا۔ میں وہاں سے نکل آیا اور باغ والے ڈیرے پر چلا گیا۔

رات کو نو بجے کے قریب تیمور نے ڈیرے پر آ کر مجھے اطلاع دی کہ شہوار ابھی اور اسی وقت قلعہ والا جانا چاہتی ہے۔اس نے اپنا سامان تیار کر لیا ہے اور ڈرائیور اسلم سے گاڑی بھی منگوالی ہے۔

"تو میں کیا کروں؟"

"بے بے جی نے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے۔وہ کہتی ہیں تم آ کر اسے روکنے کی ایک کوشش کرو۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے روکنے کی۔وہ جانا چاہتی ہے تو جائے۔"

"لیکن خاور! یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ تمہیں پتا ہے کہ لمبڑ آصف جاہ بڑے غصے والے ہیں۔ انہوں نے کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تو معاملہ اور بگڑ جائے گا۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔انہوں نے دنیا دیکھی ہوئی ہے اور اپنی بیٹی کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ وہ اس وقت چلی ہی جائے تو اچھا ہے۔کچھ دن تک ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ لے گی۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تیمور کے اصرار کے باوجود میں گھر نہیں گیا۔ صبح گیا تو پتا چلا کہ رات کو شہوار چلی گئی تھی۔۔۔۔اس کی خاص نوکرانی بھی ساتھ گئی تھی۔صوفی اسلم نے جیپ ڈرائیو کی تھی۔ نصر اللہ اپنے طور پر بیس گھڑ سواروں کے ساتھ جیپ کے پیچھے پیچھے رہا تھا۔

یہ جو کچھ ہوا بالکل آناً فاناً ہوا۔بے بے جی اور عارفہ کو اس کا بہت دکھ تھا۔یقیناً بلقیس تک بھی یہ اطلاع پہنچ چکی تھی اور وہ بہت دکھی تھی۔اگلے روز دوپہر سے پہلے رونق علی میرے گھر آ گیا۔بہت سے لوگوں کی طرح اسے بھی اصل بات معلوم نہیں تھی۔اسے یہی پتا تھا کہ میرے اور شہوار کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے اور وہ روٹھ کر میکے چلی گئی ہے۔

وہ منہ لٹکا کر بولا۔"یہ اچھا نہیں ہوا خاورے۔چند مہینوں میں ہی ایسی باتیں ہونے لگی ہیں تو آگے کیا ہو گا؟"

"میں تو اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ گاڑی دو پہیوں سے ہی چلتی ہے۔"

رونق بولا۔"کچھ لوگ اسی انتظار میں ہیں کہ ہمارے اور لمبڑوں کے درمیان ان بن ہو۔وہ اس واقعے سے بڑے خوش ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے فائدہ شائد اٹھانے کی

کوشش بھی کریں۔ تمہیں پتا ہی ہے، وڈا موکھل تمہاری شادی میں بھی شریک ہوا تھا۔ وہ اب بھی آصف جاہ سے ملتا جلتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ساری باتیں ہمارے ہی سوچنے کی نہیں ہیں۔ کچھ باتیں شہوار کے ماں باپ کو بھی سوچنی ہوں گی۔"

شہوار کے واپس جانے کا کوئی فوری رد عمل تو ظاہر نہیں ہوا۔ شاید شہوار کے گھر والے بھی یہی سوچ رہے تھے کہ چند دن خاموش رہنا چاہیے تاکہ دونوں طرف سے غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ یہ اس واقعے کے بعد آٹھویں دسویں روز کی بات ہے۔ لاہور سے ایک خوش خبری ہمارے حصے میں آئی۔ حویلی کے وکیل اقبال راٹھور نے ہائی کورٹ میں مچھلی فارم والے رقبے کا مقدمہ جیت لیا تھا۔ طویل قانونی کاروائی ہوئی تھی لیکن بالآخر حق دار کو حق مل گیا تھا۔ پوری جاگیر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں سہ پہر کے وقت اپنے کمرے میں تھا جب مجھے ڈھول ڈھمکے کی آواز سنائی دی۔ میں نے شبیر سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

اس نے بتایا۔ "ایڈووکیٹ اقبال راٹھور صاحب کو جیپ میں سوار کر کے اس پر پھولوں کے ہار ڈالے گئے ہیں اور تین چار تانگوں پر سوار ڈھولچی ان کے ساتھ ساتھ آرہے ہیں۔ ٹھیک ٹھاک استقبال ہو رہا ہے راٹھور صاحب کا۔"

میں باہر نکلا تو لگا جیسے کوئی برات آرہی ہے یہ والی صاحب کی لینڈ روور میں راٹھور صاحب اور ان کے ساتھ دو تین نوجوان وکیل بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے گلوں میں پھولوں کے ہار تھے۔ سجے سجائے تانگوں پر بینڈ باجا تھا۔ بہت سے لوگ ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے۔ مجھے ان میں رونق علی بھی اپنی توند مٹکاتا نظر آیا۔ چودھری عزیز بھی اقبال راٹھور کا استقبال کرنے والوں میں موجود تھا۔

اسی دوران میں چودھری نشاط میرے پاس آیا اور مجھے بھی ہجوم میں لے گیا۔ کافی دیر تک ہلا گلا رہا۔ پھر کھانے کا انتظام ہوا۔ اقبال راٹھور صاحب نے فیصلے کی کاپیاں دکھائیں۔ ہمارے نقطہ نظر سے یہ بہترین فیصلہ تھا۔ ایسے دیوانی مقدمے بڑا طول کھینچتے ہیں، یہ ہماری خوش قسمتی اور راٹھور صاحب کی مہارت تھی کہ چار پانچ سال کے اندر ڈگری ہو گئی تھی۔

صبح سویرے تیمور نے بتایا کہ بلڈ پریشر صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ میں رونق علی کے پاس پہنچا۔ وہ رنگین پلنگ پر لمبا لیٹا تھا۔ رنگ بھی کچھ پھیکا نظر آرہا تھا۔ "کیا ہوا رونق بھائی؟"

"یار! لگتا ہے ہیضہ سا ہو گیا ہے۔ پیٹ میں بھی ساری رات درد رہا ہے۔" وہ کمزور آواز میں بولا۔

"کیا کھالیا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں یار! تم لوگوں نے مجھے ویسے ہی بدنام شدنام کیا ہوا ہے۔ وہی روز والا کھانا تھا۔ بس پانچ چھ رس گلے کھائے ہوں گے۔ آخر خوشی کا موقع تھا۔"

تیمور، رونق علی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا اور یخنی والا پیالہ دکھایا۔

میں نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "رونق بھائی! پانچ چھ رس گلے آپ کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ میں نے تو آپ کو پانچ چھ کلو تک کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ جو آپ نے زبردست "یخنی کورس" شروع کیا ہوا تھا، اسی نے آپ کو پنکچر کیا ہے۔"

کوئی اور موقع ہوتا تو رونق علی سخت مزاحمت کرتا اور ممکن تھا کہ یخنی کی توہین پر لال پیلا ہو جاتا مگر اس وقت وہ بس کمزور سی آواز ہی نکال سکا۔ "میرا تو نہیں خیال کہ یخنی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔"

"اور میرا خیال ہے کہ ہاتھی کو بھی اتنی یخنی روزانہ پلائی جائے تو وہ اسپتال میں داخل ہو جائے۔ خدا کے لیے۔۔۔۔ خدا کے لئے اپنے آپ پر ترس کھاؤ رونق بھائی۔" میں نے اس کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔ "آپ دن رات نئی شادی کے چکر میں پڑے ہوئے ہو۔ اور یہ نہیں سوچ رہے ہو کہ شادی کرنے کے لیے زندہ ہونا ضروری ہوتا ہے اور اگر آپ کو برا نہ لگے تو ایک سچی بات کہوں؟"

وہ بس کمزور سی "ہوں" کر کے رہ گیا۔

"وہ لڑکی کتنی بھی اچھی ہے لیکن ہے تو طوائف زادی۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ کو اس سے شادی کرنی چاہیے۔ ایسی شادیاں ہدایت کار حسن طارق کی فلموں میں تو شاید کامیاب ہو جاتی ہوں، عام زندگی میں نہیں ہوتیں۔"

"لیکن یار شیر شاہ! وہ بالکل اور طرح کی لڑکی ہے۔ وہ گناہ کی زندگی سے نکلنا چاہتی ہے۔"

"ایسی ساری کڑیاں اور طرح کی ہی ہوتی ہیں اور وہ گناہ سے نکلنا چاہتی ہیں۔"

"لیکن کسی کو گناہ سے نکالنا اور نیک کاموں کی طرف لانا بڑی بات ہے۔"

"رونق بھائی! تم نیکی پھیلانے کا کوئی اور طریقہ بھی تو اختیار کر سکتے ہو۔ تمہیں پتا ہی ہے، کچھ سال پہلے چودھری نشاط نے بھی اسی طرح نیکی پھیلانے اور گناہ مٹانے کا ایک طریقہ اختیار کیا تھا۔اس طریقے نے نشاط صاحب کو قریباً دس ایکڑ زمین کا ٹیکا لگایا اور اب وہ طریقہ پھر سے لاہور کے بازارِ حسن میں ناچتا ہے۔ میرا خیال ہے شاید گلشن آرا نام تھا اس طریقے کا۔"

"یار شیر شاہ! تم نے اس کڑی کو دیکھا شیکھا ہو تو پھر اس طرح کی بات نہ کرو۔۔۔۔۔ اچھا، چلو ایسا کرتے ہیں کہ میں تمہیں اس کی بہن دکھا دیتا ہوں۔ دونوں ایک دوجے کی کاربن کاپی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ میرے والی ایک سال چھوٹی ہے۔"

"تو کہاں دکھاؤ گے اس کی بہن؟"

"یہاں ہی، باغ والے ڈیرے پر۔ پرسوں ڈیرے پر تھوڑا سا شغل میلہ ہے نا۔ وہاں آنا ہے اس نے۔ نبیلہ نام ہے اس کا۔ میرے والی کا شکیلہ ہے۔"

"شغل میلہ کس خوشی میں؟"

"لو، یہ بھی پتا نہیں تمہیں؟ یار مقدمہ جیتا ہے، کوئی مذاق نہیں ہے۔ عزیز بھائی تو کل کا پروگرام ہی بنا رہے تھے۔ پر اتنی جلدی انتظام شنتظام نہیں ہونا تھا نا۔"

"بیگم بلقیس سے اجازت لے لی ہے چودھری عزیز نے؟"

"ہاں ہاں پوچھ لیا ہے۔ خوشی کا موقع ہے۔ اس نے کیا کہنا ہے۔"

"خوشی کا موقع تو ہے لیکن رونق بھائی! تم لوگوں کو نیکی کرنے کی طرح خوشی منانے کا بھی بس ایک ہی طریقہ آتا ہے۔"

"اور ویسے بھی زیادہ خوشی اچھی نہیں ہوتی جی۔" تیمور نے ہولے سے کہا۔

تیسرے روز رات کو باغ والے ڈیرے پر گیس لیمپوں کے ذریعے ٹھیک ٹھاک روشنی کی گئی تھی۔ تین چار دیگیں کھڑک رہی تھیں۔ دیسی گھی میں دیسی مرغا اور بکرے کا پلاؤ۔ اس کے ساتھ زردہ۔۔۔۔۔ میں اب ایسی محفلوں سے دور رہتا تھا مگر رونق اور چودھری نشاط مجھے کھینچ کر وہاں لے گئے۔ میں نے یہ شرط رکھی تھی کہ ناچ گانا شروع ہونے سے پہلے وہاں سے

نکل آؤں گا۔ ڈسکے سے تین طوائفیں بھی منگوائی گئی تھیں۔ چودھری نشاط کا کہنا تھا کہ یہ بالکل پاکیزہ طوائفیں ہیں۔ یعنی صرف ڈانس اور گانا کرتی ہیں۔ لفظ پاکیزہ کا یہ استعمال توجہ طلب تھا۔

رونق علی نے مجھے اپنی رکھیل شکیلہ کی بڑی بہن نبیلہ دکھائی۔ وہ اکیس بائیس سال کی لڑکی تھی۔ یہ بات تو ٹھیک تھی کہ وہ شکل صورت اور طور اطوار سے سکہ بند طوائف نہیں لگتی تھی مگر اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ نائیکہ تھی اور سازندے بھی تھے۔

رونق نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ "خاورے! اس سے ذرا اگل شل کر کے دیکھو۔"

میں نے دو تین فقرے بولے۔ وہ کچھ خاموش طبع سی تھی۔ اس کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا۔۔۔۔

کھانے سے پہلے پینے پلانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلی دھار کی دیسی شراب اور سیل بند شراب کے گلاس محفل میں چکرانے لگے۔ ساتھ میں سگریٹ اور حقے بھی پھونکے جا رہے تھے۔ میرے اور تیمور کے علاوہ ایک دو بندے ہی ہوں گے جو اس شغل سے دور رہے۔

یہاں تک کہ چودھری عزیز بھی جس نے اب چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھی ہوئی تھی، چسکیاں لے رہا تھا۔ شراب نے رنگ جمانا شروع کیا تو شرابی بہکنے لگے۔ بات بے بات قہقہے بلند ہونے لگے۔ شراب کے مٹکے بالکل پاس بیٹھے ہوئے ایک گجراتی نے مٹکا بجا بجا کر پنجابی کے چو مصرعے بولنے شروع کر دیے۔ اس ٹھیٹ پنجابی کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

تو سفید مکھن ہے اور میں تجھے سفید لسی میں سے ڈھونڈ نہیں سکتا۔ تو گلاب کا پھول ہے پر میں تجھے رات کو اپنے پاس تکیے پر نہیں رکھ سکتا

تو دودھ سے بھری کچی گری ہے پر میں تجھے کچر کچر کھا نہیں سکتا۔ تو رس بھرا پونا گنا ہے اور میں تجھے چوسنے کو ترستا ہوں۔ تو شراب کی بند بوتل ہے پر میں تجھے ایک ڈیک میں پی نہیں سکتا۔

سننے والے آوازیں کس رہے تھے۔ "ہائے اوئے۔۔۔۔ ہائے اوئے۔۔۔۔"

پر تو ہر وقت میرے آس پاس رہتی ہے۔ سفید مکھن کی طرح، گلاب کے پول کی طرح، کچی گری، پونے گنے اور شراب کی بوتل کی طرح۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاندنی رات میں، گلی کی نکڑ پر، گاؤں کے سارے چھڑوں میں کھڑا ہو کر تیری باتیں کرتا ہوں۔

ایک بار پھر آوازیں بلند ہوئیں۔ "او جان کڈ لئی او۔ اوئے مار دتا ای۔"

پینے پلانے کے ساتھ ہی کھانے کا دور بھی شروع ہو گیا تھا۔ دو لڑکے برف توڑ توڑ کر گلاسوں میں ڈال رہے تھے اور ان میں سوڈا اور شراب انڈیل رہے تھے۔ سیخ کبابوں کی گرما گرم پلیٹیں ایڈووکیٹ راٹھور اور ان کے ساتھیوں کے سامنے رکھی جا رہی تھیں۔ ایڈووکیٹ راٹھور نے بھی کھانے پینے میں سے صرف کھانے پر اکتفا کیا تھا۔ اچانک میری نظر رونق علی پر پڑی۔ وہ کچھ چپ چپ تھا۔ گلاس بھی اس نے ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ مجھے لگا، اسے متلی ہو رہی ہے۔ پھر ایک دم اسے زور کی ابکائی آئی۔ دو دن پہلے بھی اس کی طبیعت خراب رہی تھی۔ اب بلانوشی کی وجہ سے اس کی طبیعت پھر بگڑ گئی تھی۔

میں اس کی طرف بڑھا۔۔۔۔ لیکن یہی وقت تھا جب میں نے ایک گورے چٹے سازندے کو بھی قے کرتے اور نیچے جھکتے دیکھا۔ وہ جیسے اپنے ہارمونیم کے اوپر گر ہی گیا تھا۔ "کیا ہوا؟" میں نے سازندے کو پکڑ کر جھنجھوڑا۔ وہ تکلیف سے کراہنا شروع ہو گیا تھا۔

"وہ دیکھو خاور! چودھری صاحب کو کیا ہوا ہے؟" تیمور نے تقریباً چلا کر کہا۔

میں نے مڑ کر دیکھا اور چکرا کر رہ گیا۔ چودھری نشاط بیرونی دروازے کی طرف جاتے جاتے دہلیز کے پاس گر گیا تھا۔ اسے زوردار طریقے سے قے ہو رہی تھی۔ اگلے تین چار منٹ کے اندر ہی ڈیرے میں قیامت سی برپا ہو گئی۔ ڈیرے پر موجود پچیس تیس افراد میں سے زیادہ کی حالت خراب ہو گئی۔ جس نے جتنی زیادہ پی لی تھی، وہ اتنی زیادہ مصیبت میں تھا۔ کچھ گھبرا کر باہر کی طرف بھاگ گئے تھے، کچھ وہیں پڑے اینٹھ رہے تھے۔ جن پر کم اثر ہوا تھا، وہ دوسروں کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ فوری طور پر یہی بات ذہن میں آ رہی تھی کہ شراب زہریلی تھی۔ کیوں زہریلی تھی؟ اس کا فی الحال کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے رونق کو دیکھا تو میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ اسے خون کی الٹی ہوئی تھی۔ میں نے تیمور کے ساتھ مل کر اس کے وزنی جسم کو اٹھایا اور باہر کھڑی جیپ کی طرف دوڑا۔

ابھی یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے، ابھی یہ سوچنا تھا کہ جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک دم موت کے کنارے پر پہنچ گئے ہیں ان کے لیے کیا کرنا ہے۔

"دوسری گاڑی نکالو اور ٹریکٹر ٹرالی بھی۔" میں نے بلند آواز سے نصر اللہ کو ہدایت کی۔

نصر اللہ دوڑتا ہوا گاڑیوں کی طرف گیا۔ اندر سے چلانے اور آہ وبکا کی آوازیں آرہی تھیں۔ چند افراد خود ہی لڑکھڑاتے ہوئے گاڑی کی طرف آرہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے تین چار دن میں جو کچھ ہوا، وہ خاصا پریشان کن اور تکلیف دہ تھا۔ زہریلی شراب کے سبب تقریباً بائیس افراد اسپتال پہنچے تھے۔ ان میں سے کچھ ڈسکہ اور کچھ گوجرانوالہ کے اسپتال میں گئے۔ شدید متاثر ہونے والوں میں چودھری نشاط، چودھری عزیز کے دو چچیرے بھائی، رونق علی اور ایک نوجوان وکیل بھی شامل تھا۔ اگلے روز صبح سویرے چودھری نشاط گوجرانوالہ اسپتال میں چل بسا۔ نوجوان وکیل مدثر احمد رات کو ہی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ ڈسکے میں بھی ایک بندے کی موت واقع ہوگئی۔ رونق علی کی حالت بھی خراب تھی۔ وہ مسلسل بے ہوش تھا۔

اگلے روز شام کو رونق علی کو ہوش آگیا۔ باقی افراد کی حالت بھی بہتر ہونا شروع ہوگئی۔ راجوال والوں کے لیے یہ بڑا غم ناک اور شرمسار کرنے والا واقعہ تھا۔ اخباروں میں بھی اس

کی خبر آئی۔ ویسے بھی یہ میڈیکو لیگل کیس تھے۔ کئی افراد کے خلاف ایف آئی آر درج ہوئی جن میں خود چودھری عزیز بھی شامل تھے۔

مرنے والوں کی تجہیز و تکفین کے بعد جاگیر کے تینوں دیہات میں سوگ کی کیفیت تھی۔

نصر اللہ نے مجھ سے کہا۔

"چودھری صاحب! لوگوں میں بہت غصہ ہے۔ زیادہ تر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ اس سارے معاملے میں موکھلوں کا ہتھ ہے۔"

"وہ بات تو سب کے دماغ میں آرہی ہے، پر اس کا کوئی ثبوت بھی تو ہونا چاہیے۔"

تیمور نے کہا۔ "یہ بات صحیح ہے کہ اس موقعے پر یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں تک زہریلی شراب کی بات ہے، اس طرح کے ایک دو واقعے یہاں پہلے بھی ہوئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ بھی ویسا ہی واقعہ ہے یا اس میں کسی کا ہتھ ہے۔"

"ثبوت اور پکے ثبوت کے بغیر اگر ہم کسی پر چڑھائی کریں گے تو خود کو دہری مصیبت میں ڈال لیں گے۔" شبیر نے رائے دی۔

میں نے کہا۔ "لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اگر ثبوت مل جاتا ہے تو پھر قصور واروں کو کسی صورت معاف نہیں کرنا چاہیے۔ تین بندوں کی قیمتی جان جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے اور ان میں چودھری نشاط بھی شامل ہے۔"

"ابھی چاچا منظور گوجرانوالہ سے آیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ شام پور کے نمبردار سلطان صیب کو ہوش تو آگیا ہے پر ان کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ زہریلی شراب سے شاید ان کی نظر چلی گئی ہے۔" نصراللہ نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

"جو کچھ ہوا ہے دیسی (شراب) سے ہوا ہے۔" تیمور نے کہا۔ "میں نے کل ایک چھوٹے بلڈاگ کے راتب میں یہ شراب ملائی تھی۔ دو ہی گھنٹے میں اس کا پیٹ پھول گیا۔ وہ کل سارا دن بے ہوش پڑا رہا ہے، ابھی تک اس کی حالت ٹھیک نہیں ہوئی۔"

سارا دن اس بات کی تحقیق ہوتی رہی کہ جشن پر لائی جانے والی دیسی شراب کس کی تحویل میں تھی اور اسے کہاں سے لایا گیا تھا۔

یہ سارا کام شیدے اور عبیداللہ کے ذمے تھا۔ یہ وہی دو ملازم تھے جن سے میری ملاقات طویلے والے تہ خانے میں ہوتی رہی تھی۔ یہ دونوں بڑے پرانے ملازم تھے اور پوری طرح

قابل اعتماد تھی۔ شیدے کا ایک سالا امانت بھی اس کام میں شریک رہتا تھا۔ وہ دیسی شراب تیار کرنے کا ماسٹر تھا۔ کچے مٹکوں میں کیکر کی چھال، پرانا گڑ اور بہت سے الم غلم ڈال کر طویلے کے پچھواڑے زمین میں دبایا جاتا تھا۔ کچھ مہینے بعد اس سڑے ہوئے ملغوبے کو نکال کر بھٹی پر چڑھایا جاتا تھا اور سفید رنگ کی شراب کشید ہوتی تھی۔

نصراللہ نے بتایا۔ "شراب امانت کے پاس ہی تھی۔ اسے ریڑھے پر رکھ کر ڈیرے پر پہنچانے والا بھی امانت ہی تھا۔ چودھری عزیز کو اس پر تھوڑا بہت شک ہے۔ وہ ابھی ابھی اسپتال سے آئے ہیں اور امانت سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔"

"ڈیرے پر ہی گئے ہیں۔" نصراللہ نے بتایا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم ڈیرے پر تھے۔ اندر سے آہ و بکا کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم اندر پہنچے۔ امانت کے سیاہی مائل جسم پر صرف ایک لنگوٹ تھا۔ وہ چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ چودھری عزیز کا ملازم خاص انورا اسے کوچوانوں والے چھینٹے سے مار رہا تھا۔ امانت کے جسم پر لاسیں تھیں اور وہ منت ترلے میں مصروف تھا۔ اس کی ناک سے بہنے والا رقیق مادہ ٹپاٹپ زمین پر گر رہا تھا۔

"کچھ بکا ہے اس نے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں لیکن ضرور بکے گا۔" چودھری کی آنکھوں میں رنج اور طیش یک جا تھے۔

میں نے چودھری سے کہہ کر امانت کو نیچے اتروایا۔ وہ شکل سے خرانٹ اور کرخت نظر آتا تھا مگر فی الوقت اس کی حالت پتلی تھی۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور جان بخشی کی التجائیں کرنے لگا۔

میں نے اسے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ لرزتا کانپتا بیٹھ گیا۔ ہم بھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ اگر وہ قصوروار نہیں تھا، تب بھی کم از کم اس سے شدید قسم کی غفلت تو ضرور ہوئی تھی۔

میں نے اس سے ساری تفصیل پوچھی کہ شراب کہاں تھی اور وہ کس طرح یہاں لے کر آیا تھا۔

وہ بولا۔ "یہ پہلی دھار کے دو گھڑے تھے جی۔ یہ صرف چھ سات دن پہلے نکالے تھے۔ تین دن یہ میرے کمرے میں ہی پڑے رہے۔ ان کو میں نے اوپر سے چنگی طرح ڈھکا ہوا تھا۔ پھر مجرے والے دن دوپہر کے ٹائم میں یہ گھڑے ڈیرے پر لے گیا۔ وہاں بھی یہ میری نظروں کے سامنے ہی رہے ہیں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"شراب تیار ہونے کے بعد تم نے چیک کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"دو واری جی۔ ایک وار شیدے نے بھی میرے ساتھ چکھی تھی۔ پھر مجرے والے دن شام سے پہلے بھی میں نے ٹیسٹ کرنے کے لیے دو چار گھونٹ لگائے تھے۔ ذائقہ اور نشہ بالکل ٹھیک تھا۔"

"تم ڈیرے سے کہیں باہر تو نہیں گئے مجرے والے دن؟"

"بالکل نہیں جی۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔"

"جب مہمان آنے شروع ہوئے، تب بھی تم شراب والے کمرے میں ہی تھے؟"

"بالکل جی۔ میرا کام ہی یہی تھا۔ میں نے برف کو بوریاں میں لپیٹ کر رکھا ہوا تھا۔ سوڈے کی بوتلوں کو ٹھنڈا کرنا اور اس طرح کے سارے دوسرے کام میرے ذمے تھے۔ سب سے پہلے چودھری نشاط صاحب اور ان کے دو یار بیلی یہاں آئے تھے۔ پھر وڈے وکیل صاحب اور ان کے ساتھی۔ پھر ناچیاں اور ان کے سازندے۔ اس کے بعد دوسرے پروہنے آئے۔"

"ان پروہنوں میں سے کوئی شراب والے کمرے میں نہیں آیا؟"

"نہیں جی۔ اگر ایک دو آئے بھی ہوں گے تو میں اس وقت کمرے میں ہی تھا۔"

"اگر میں کہوں کہ تم کسی پر شک کرو تو کس پر کرو گے؟"

"مم۔۔۔۔۔ میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا جی۔۔۔۔۔ دیکھیں جی! اگر شراب پہلے ہی زہریلی ہوتی تو میرے ساتھ بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا۔ اور میں تو جی اللہ کے فضل سے سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ شراب زہریلی ہے یا نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ ہوا ہے، شام کے بعد ہوا ہے۔۔۔۔۔"

میں نے امانت سے چند سوال مزید پوچھے۔ میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ پھر بھی اس کی حالت دیکھتے ہوئے اس سے مزید مار پیٹ مناسب نہیں سمجھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کپڑے پہن لے۔

جب وہ لرزتا کانپتا کپڑے پہن رہا تھا، ایک چیز دیکھ کر میں ذرا چونکا۔ اس کی سفید بنیان کے اوپر سرخ داغ سا تھا جیسے لپ اسٹک کا نقش ہو۔

"یہ بنیان دکھاؤ مجھے؟" میں نے کہا۔

وہ پہلے ٹھٹکا پھر پسینے کی بو والی بنیان میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں نے روشنی کی طرف کر کے دھیان سے نشان کو دیکھا۔۔۔۔۔ سونگھا۔۔۔۔۔ بلاشبہ یہ لپ اسٹک کا نشان تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جان بوجھ کر اس میلی سی بنیان پر ہونٹوں کا نشان ثبت کیا گیا ہے۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے امانت سے پوچھا۔ اس کے سانولے چہرے پر زردی سی لہرا گئی۔

"یہ وہ۔۔۔۔۔ دراصل میں۔۔۔۔۔" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

چودھری عزیز کا زوردار تھپڑ امانت کے گال پر پڑا۔ "یہ کیا بکری کی طرح میں میں کر رہا ہے۔ سیدھی طرح بتا۔ یہ کس سرخی پوڈر والی سے ملتا ہے۔ زنانی تو تیری ہے نہیں۔"

"اور کوئی سہیلی شہیلی بھی نہیں ہے شاید۔" انورا پھنکارا۔

امانت کی شدید گھبراہٹ اور بدحواسی نے ہمیں مزید شک میں مبتلا کر دیا۔ چودھری عزیز نے گرج کر اسے دوبارہ چھت سے لٹکانے کا حکم دیا۔ امانت بہت ہوشیار نہیں تھا اور کسی حد تک بزدل بھی تھا۔ پہلے تو اس نے اِدھر اُدھر کی مار کر جان بچانے کی کوشش کی مگر چند تھپڑ مزید کھا کر ہاتھ جوڑ دیے اور سچ بتانے پر آمادہ ہو گیا۔

میرے اندازے کے عین مطابق لپ اسٹک کا یہ داغ صرف تین چار دن پرانا تھا۔یعنی اسی منحوس رات کا جب یہاں ڈیرے پر جشن منایا گیا تھا۔اور اس داغ کا تعلق ایک ڈانسر سے ہی تھا۔۔۔۔

"کیانام تھا اس کا؟" میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

"وہ جو لمبے قد کی تھی جی۔ نبیلہ نام بتایا تھا اس نے۔ در۔۔۔۔ دراصل، شراب چکھنے کے بعد میں تھوڑا نشے میں ہو گیا تھا۔اس نے مجھے انکھ کے اشارے کے ساتھ والے کمرے میں بلایا۔وہاں اور کوئی نہیں تھا۔جو پروہنے آئے ہوئے تھے وہ بڑے کمرے میں تھے اور باتیں کر رہے تھے۔وہ مجھے۔۔۔۔ اپنی طرف کھینچنے لگی۔"

"اور تو کھنچتا چلا گیا۔" چودھری عزیز نے اس کے سر پر جھانپڑ مار کر کہا۔

"بب۔۔۔۔ بس جی۔۔۔۔ تھوڑی دیر کے لیے میری مت ماری گئی تھی۔"

چودھری عزیز نے اس کے سر پر ایک اور دوہتڑ مارا۔اس کی ناک سے خون رسنے لگا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اگلے پانچ دس منٹ میں امانت نے روتے کانپتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

نبیلہ نامی ڈانسر نے امانت کو ورغلا کر ساتھ والے کمرے میں بلا لیا۔وہ تھوڑی دیر تک اسے اپنی بازاری اداؤں سے بہلاتی رہی۔امانت نے اسے بانہوں میں بھر لیا اور اپنی بے وقوفی کے چھوٹے موٹے ثبوت فراہم کیے۔جب وہ جانے لگی تو امانت نے جاہل عاشقوں کی طرح کہا۔

"سوہنیو! اپنی کوئی نشانی تو دے جاؤ۔"

اس نے ادا کے ساتھ امانت کی قمیص اٹھائی اور اس کی چھاتی پر بائیں طرف اپنے سرخی سے لتھڑے ہونٹوں کا نقش بنا دیا۔یہ نقش اس کی بنیان پر بنا تھا۔

امانت کے اس بیان کے بعد ہمارے شک کا رخ خود بہ خود نائیکہ اختری بائی اور اس کی پارٹی کی طرف مڑ گیا۔دماغ میں خود بہ خود یہ خیال آ رہا تھا کہ امانت کو جشن سے کچھ دیر پہلے دوسرے کمرے میں بلانے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔اور شاید یہ وہی وجہ ہے جس نے شراب کو زہریلا کیا ہے۔

اس سے پہلے بھی ایک دو دفعہ میرا دھیان طوائفوں اور سازندوں کی طرف گیا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر میں نے اپنا

خیال رد کر دیا تھا کہ شراب نوشی کی وجہ سے دو سازندے بھی تو بے ہوش ہوئے تھے۔ اب اس نئی صورتِ حال میں شک پھر پختہ ہونے لگا۔

میں، نصر اللہ اور انوار اسی وقت گاڑی پر سوار ڈسکہ روانہ ہو گئے۔ مقصد یہی تھا کہ نائیکہ اختری بائی اور اس کی دونوں ڈانسروں کو چھاپا جا سکے۔ لیکن پتا نہیں کس طرح ہماری آمد کی اطلاع ہماری آمد سے پہلے ہی کوٹھے تک پہنچ گئی۔ جب ہم اس دو منزلہ کوٹھے پر پہنچے تو ایک بڑھے کھوسٹ طبلچی اور ایک افیمی ہیجڑے کے سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ طبلچی کو اصل صورتِ حال معلوم نہیں تھی۔ اس نے اپنے پوپلے منہ میں زبان گھماتے ہوئے کہا۔ "میرا کھیال ہے کہ بائی جی ستار نواز گھشی محمد اور کھورشید کھاں کی کھیر کھیریت پوچھنے کے لیے اسپتال تک گئی ہیں۔"

طبلچی کا یہ "کھیال" بالکل غلط ثابت ہوا۔ ہماری آمد سے صرف دس پندرہ منٹ پہلے اختری بائی اپنی تینوں لڑکیوں کے ساتھ ایک پرانی کار میں بیٹھ کر یہاں سے نکل گئی تھی۔ ہم نے ارد گرد کافی تلاش کیا۔ مقامی ایس ایچ او سے بھی مدد لی مگر کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ ایس ایچ او نے اختری بائی کے دو سازندوں کے علاوہ تین چار بندوں کو تفتیش میں بٹھا لیا۔ مگر مجھے

اندازہ ہو رہا تھا کہ ان بندوں سے کوئی کام کی بات معلوم ہونے والی نہیں ہے۔ اختری بائی کے جو دو سازندے بے ہوش ہوئے تھے وہ اس کے مستقل ساتھی نہیں تھے، کرائے پر پکڑے گئے تھے۔

اب اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ زہر خورانی کی اس سنگین واردات میں نائیکہ اور اس کی لڑکیوں کا ہاتھ ہے۔ یہ لڑکیاں گلابو، نبیلہ اور شکیلہ تھیں۔ گلابو کے بارے میں تو یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا مگر نبیلہ کا ملوث ہونا ثابت ہو گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ نبیلہ کی بہن شکیلہ بھی پوری طرح ملوث ہو۔ یہ شکیلہ وہی تھی جس پر رونق علی آج کل ہزار جان سے فدا ہو رہا تھا۔ اب یہ لڑکیاں نائیکہ سمیت موقعے سے غائب تھیں۔

رات گئے ہم راجوال واپس پہنچے۔ اگلے روز صبح سویرے تیمور نے بتایا۔ "یار! سنا ہے رات کو چودھری عزیز نے نائیکہ اور ایک ڈانسر کو پکڑ لیا ہے۔ اب وہ دونوں ڈیرے پر ہیں۔"

"اگر ایسا ہو گیا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔"

ہم پُر امید ہو کر ڈیرے پہنچے، پر وہاں صورتِ حال مختلف نکلی۔ ڈیرے پر موجود عورتیں کوئی اور تھیں۔ ان کا بس اختری بائی اور نبیلہ وغیرہ سے ملنا جلنا تھا۔ چودھری عزیزان دونوں

عورتوں سے بھی اسی طرح کا سلوک کر رہا تھا جو ایک دن پہلے اس نے امانت سے کرایا تھا۔ عورتوں کے رونے چلانے اور منت سماجت کرنے کی آوازیں ڈیرے سے باہر پہنچ رہی تھیں۔ میں نے اندر جا کر چودھری عزیز اور انورے سے ان کی جان چھڑائی۔

چودھری عزیز بے حد طیش میں تھا۔ وہ پھنکارا۔ "میں ان کی پوری برادری کو گھسیٹ کر یہاں لاؤں گا۔ ایک ایک کی چمڑی اتروا دوں گا۔"

"چلو، اب ان دونوں کی چمڑی اتر گئی ہے۔ ان کو تو چھوڑو۔" میں نے کہا۔

چودھری عزیز غصہ ضبط کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

میں نے تیمور اور نصر اللہ کو ہدایت کی کہ دونوں عورتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ عورتوں کے ساتھ آنے والے مرد بیچارگی کی تصویر بنے ڈیرے سے باہر کچی زمین پر بیٹھے تھے۔ وہ اپنی عورتوں کی آہ و بکا سنتے رہے تھے مگر ان کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اندر جا کر ان کے لیے کچھ کر سکیں۔ ایک طوائف کے بڈھے کھوسٹ مامے نے میرے پاؤں پر سر رکھ دیا اور دعائیں دینے لگا۔

چودھری عزیز انگارے کی طرح سرخ، ڈیرے کے ہی ایک کمرے میں بیٹھا تھا۔ اگر مرنے والوں میں چودھری نشاط شامل نہ ہوتا تو شاید چودھری عزیز اور دوسرے چودھریوں کا پارہ اتنی اونچائی تک نہ پہنچتا۔

کچھ دیر بعد لیاقت کالا۔۔۔۔ اس کا چاچا ایم پی اے امین اور تین چار دوسرے چودھری بھی ڈیرے پر آ گئے۔ مرنے والوں کے لیے فاتحہ پڑھی گئی پھر اس سنگین واقعے پر غور شروع ہوا۔ بلقیس کے بڑے ماموں چودھری یعقوب نے کہا۔ "ہمارے پاس ثبوت نہیں ہے۔ پر شک سیدھا موکھلوں کی طرف جا رہا ہے۔ ان کو ہماری جیت ہضم نہیں ہوئی۔ انہوں نے اختری کو خریدا ہے اور وار کر دیا ہے۔"

"سو فیصد ایسا ہی ہے۔" چودھری عزیز نے تائید کی۔

"یہ موکھل پاشا کتے دا پتر۔۔۔۔ بات بھی بھولنے والا شخص نہیں ہے۔ بنگالی شیر والا زخم اس کے سینے میں ہر وقت تازہ رہتا ہے۔ میں نے خود سنا ہے کئی بندوں سے۔"

ایم پی اے امین نے پُر سوچ لہجے میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ اختری بائی اور اس کی بیٹیوں سے موکھلوں کی پرانی یاد اللہ ہو۔ میرا مطلب ہے، وہ موکھلوں کے لیے مخبری وغیرہ کرتی رہتی ہوں۔"

میرا دھیان سید ھا رونق علی کی طرف گیا۔ وہ ہر وقت اختری کی بیٹی شکیلہ کے پاس گھسا رہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ شکیلہ نے مخبری کے لیے ہی رونق علی پر ڈورے ڈال رکھے ہوں۔ راجوال کے کئی راز حیران کن طور پر فاش ہوئے تھے۔

ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ دو گھڑ سوار تیزی سے ڈیرے پر آئے۔ ان میں سے ایک میرا ساتھی فتح محمد تھا۔ اس نے بتایا کہ نہر کے پار ہمارے بندوں اور موکھلوں میں لڑائی ہوئی ہے۔ چودھری نشاط کے چھوٹے بھائی شاہنواز نے موکھلوں کے دو بندوں کو گولیاں مار کر سخت زخمی کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک تو اسپتال بھی نہیں پہنچ سکے گا۔ دوسرے کا پتا نہیں۔

نشاط کا چھوٹا بھائی شاہنواز پہلے بھی ایک دو مقدموں میں اشتہاری تھا۔ وہ کبھی کبھار چوری چھپے ہی گاؤں کا چکر لگاتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس تازہ واقعے کے بعد بھی وہ موقعے سے نکل گیا ہو گا۔

چودھری یعقوب نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ "لو جی! شاہنواز نے کچھ تو بوجھ ہلکا کیا۔ پر اب ہمیں بہت ہوشیار ہو جانا ہو گا۔ جوابی کارروائی ہو سکتی ہے۔"

میں نے نصر اللہ کو بلایا اور اسے ضروری ہدایات دے دیں۔ اس قسم کا ریڈ الرٹ ہمیں اکثر کرنا پڑتا تھا۔ اب ہم ان باتوں کے عادی ہو چکے تھے۔ میں شاید بتانا بھول گیا ہوں کہ کچھ دن پہلے میں نصر اللہ کو نائب سالار کی بجائے مکمل سالار بنا چکا تھا۔

چائے کا دور چلا۔ اس کے بعد لیاقت کالے کا چاچا ایم پی اے امین مجھے ایک طرف لے گیا۔ وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔ "شاہ خاور! تم اب ہمارے پنڈ کے داماد بھی ہو۔ تمہارے اچھے برے کی فکر ہم کو رہتی ہے۔ ویسے تو تم خود بھی سمجھدار ہو لیکن۔۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"آپ نے جو کہنا ہے کھلے دل سے کہیں۔۔۔۔"

"میں نے سنا ہے اپنی بیوی سے تمہاری کوئی ناراضگی ہوئی ہے اور وہ آج کل میکے میں ہے؟"

"ہاں جی۔ گھروں میں چھوٹی موٹی باتیں ہو ہی جاتی ہیں۔"

امین چودھری نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہا۔ "خیر، یہ تمہارا گھریلو معاملہ ہے۔ مگر بڑا ہونے کی حیثیت سے میں تم سے ایک بات ضرور کہوں گا۔ اس موقعے پر اپنے سسر آصف جاہ سے تمہاری کسی طرح کی اب بن بھی ٹھیک نہیں ہے۔ خاص طور سے موکھلوں کے ساتھ اس نئی ٹینشن کے بعد تو تمہیں اور احتیاط کرنی چاہئیے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ موکھلوں کو ابھی تک یہ رشتہ ہضم نہیں ہوا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔"

"وڈے موکھل کی ابھی تک یہ کوشش ہے کہ وہ کسی طرح ہماری لمبڑ برداری کو اپنے ساتھ ملا لے۔ اور میں تمہیں بالکل اپنے دل کی بات بتاتا ہوں، یہ تمہارا اور آصف کی بیٹی کا رشتہ ہی ہے جس نے جاگیر کو بہت بڑی مصیبت سے بچایا ہے۔ ورنہ اب تک جاگیر کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہوتی۔"

"آپ کے مشورے میرے لیے بڑے قیمتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے پتا ہے تم نے والی کے لیے اور اس جاگیر کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں، بڑی جدوجہد کی ہے۔ اب بھی تمہارے سر پر بڑی ذمے داری آتی ہے۔ تم اپنے اندر کے معاملے درست

کر لو تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔ یہ آصف جاہ بالکل وکھری ٹائپ کا بندہ ہے۔ اس کے بارے میں تمہیں پھر کبھی تفصیل سے بتاؤں گا۔"

۔۔۔۔رات کو اپنے کمرے میں بڑی دیر تک میں اس بارے میں سوچتا رہا۔ حالات میں پھر لہر پیدا ہو رہی تھی۔ دوپہر کو شاہنواز کے ہاتھوں زخمی ہونے والا بندہ دم توڑ گیا تھا۔ دونوں طرف سے چھ سات گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ صورتِ حال کسی بھی وقت مزید سنگین ہو سکتی تھی۔

امین چودھری نے تو مجھ سے آج شہوار کے بارے میں بات کی تھی لیکن میں کئی دن سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے اس ناراضی کو زیادہ طول نہیں دینا چاہئیے۔ میں اس بارے میں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ رہا تھا۔ نو بیاہتا شہوار کی جو خواہش تھی، وہ ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر صرف اس کا ہو کر رہے۔ وہ اس کو اپنے جسم و جان کا مالک بناتی ہے اور خود بھی اس کی مالک بننا چاہتی ہے۔ بلقیس کی بھی تو یہی خواہش تھی۔ وہ نوخیز کنواری تھی۔ اس نے اپنے بڑی عمر کے شوہر سے صرف

ایک چیز مانگی تھی۔اس کی مکمل محبت اور توجہ! ماضی میں جو ہو چکا تھا، وہ ماضی کا حصہ تھا مگر والی جی سے شادی کے بعد بلقیس کی اکلوتی شرط یہی تھی کہ وہ اب اس کے ہو کر رہیں گے۔

تو جس بات کی خواہش کرنا بلقیس کے لیے جائز تھا، وہ شہوار کے لیے ناجائز کیسے ہو سکتا تھا؟ ٹھیک ہے، میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا لیکن ظاہری طور پر تو مجھے شہوار کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہیئے تھا۔ میں اس معاملے پر جتنا غور کرتا رہا، میرے دل میں نرمی پیدا ہوتی رہی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جھوٹی انا کو دیوار نہیں بننے دوں گا۔ قلعہ والا جاؤں گا اور شہوار کو واپس لاؤں گا۔

اگلے روز بے جی اور عارفہ سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے گاؤں کے نائی کے ہاتھ قلعہ والا پیغام بھیجا۔ دیہات میں ایسی پیغام رسانی کے کام عموماً نائی ہی کرتے ہیں۔ شام کو نائی واپس آیا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا پیغام دیا ہے؟"

"جناب! یہی کہ آپ پرسوں شام کو قلعہ والا آئیں گے۔ آپ کی والدہ جی بھی ساتھ ہوں گی۔ وہ خوش ہوئے ہیں جی۔۔۔۔اور جی آیا نوں کہا ہے۔"

"کس سے بات ہوئی تھی؟"

"بڑے نمبردار آصف جاہ صاحب کی بیگم سے۔ بعد میں آصف جاہ سے بھی ہوئی۔"

"آصف جاہ صاحب کا رویہ کیسا تھا؟"

"وہ ذرا چپ چپ تھے پر بیگم صاحبہ تو بڑا خوش ہو کر ملیں۔"

تیسرے روز صبح میں اور والدہ جیپ پر سوار قلعہ والا کے لیے روانہ ہوئے۔ گن مین کے طور پر تیمور بھی ہمراہ تھا۔ رواج کے مطابق پھل اور مٹھائیوں کے چار پانچ ٹوکرے ہمارے ساتھ تھے۔ راستے برسات کی وجہ سے خراب تھے۔ ہم سہ پہر کے وقت ہی پہنچ سکے۔ قلعہ والا کی حویلی میں ہمارا بہت اچھی طرح سے استقبال کیا گیا۔ دروازے پر خود آصف جاہ صاحب نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ دودھ اور مٹھائی سے تواضع کی گئی۔ ملازموں نے جیپ کی دھلائی شروع کر دی۔ ایک دو چھوٹی موٹی رسمیں بھی ادا کی گئیں۔

آصف جاہ دبنگ طبیعت کے مالک تھے۔ سفیدی مائل مونچھوں کے اوپر ان کی آنکھوں میں بھی سفیدی کچھ زیادہ تھی اور ان آنکھوں کے اوپر بھویں بے حد گھنی تھیں۔ یہ بھویں ان کی شخصیت کو پُراسرار سا ٹچ دیتی تھیں۔ وہ کم گو تھے لیکن اس موقعے پر مجھے کچھ زیادہ ہی خاموش نظر آئے۔ بیڑی پینا ان کا خاص الخاص شوق تھا۔

شام میں ہمیں ریچھ اور کتوں کی لڑائی دکھائی گئی۔ پھر سانپ اور نیولے کا مقابلہ ہوا۔ پھر دو نامی پہلوانوں نے ایک دوسرے کو مار مار کر لہولہان کیا۔ یہ سب کچھ تفریحات کا حصہ تھا۔ سسر آصف جاہ صاحب کو اعلیٰ نصب کے کتوں کا بے حد شوق تھا۔ ان کتوں کی تفصیل میں آگے بیان کروں گا۔ رات میں میرے اور والدہ کے اعزاز میں زبردست دعوت کا انتظام تھا۔ علاقے کے ایک معروف بانسری نواز نے شاندار دھنیں بکھیریں۔ نوکر چاکر ہمارے آگے پیچھے بچھے جا رہے تھے۔ تاہم ایک بات تھی۔ اس ساری آؤ بھگت میں محبت سے زیادہ شان شوکت کا اظہار نظر آتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ابھی تک شہوار صرف ایک بار میرے سامنے آئی تھی اور سلام کر کے اوجھل ہو گئی تھی۔

رات کو ہمارے بستر ایک ہی کمرے میں بچھائے گئے تھے۔ چاروں طرف خاموشی چھا گئی تو شمع دان کی روشنی میں ہماری بات چیت ہوئی۔ میں نے کہا۔ "شہوار! اس رات کو جو کچھ بھی ہوا مجھے اس کا بے حد افسوس ہے۔ زیادہ غلطی میری ہی تھی لیکن تم نے بھی بڑے سخت لفظ استعمال کیے جس کی وجہ سے۔۔۔۔۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ "چلو، جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ میں بھی بھولنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن۔۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"میں نے ابا جی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی امی نے یا شیداں نے بتایا ہے۔ تم نے بھی اس بارے میں ان سے کوئی ذکر نہیں کرنا۔ انہیں یہی پتا ہے کہ گھر میں کوئی چھوٹا موٹا جھگڑا ہوا ہے۔" شہوار کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"میں جانتا ہوں شہوار! تم ان کی اکلوتی اولاد ہو۔ بڑی محبت کرتے ہیں وہ تم سے۔ تمہاری تھوڑی سی تکلیف کا بھی بہت اثر لیتے ہیں۔ اور میری دلی خواہش ہے شہوار کہ ہمارے درمیان آئندہ اس طرح کا کوئی واقعہ نہ ہو۔"

"اگر تم واقعی ایسا چاہتے ہو خاور تو پھر میری ایک بات مان لو۔ حویلی میں جانا۔۔۔۔۔ اور آپا بلقیس سے بات کرنا بند کر دو۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں لیکن یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔ کبھی بھی نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے شہوار! تمہیں اب اس بارے میں شکایت نہیں ہو گی۔"

"حامد نے بھی مجھ سے بہت بدتمیزی کی تھی۔ پر کچھ بھی ہے، وہ بچہ ہے۔ سمجھ داری تو ہمیں دکھانی چاہئیے۔ اور سمجھ داری تو یہی ہے کہ اس سے ہمارا میل جول کم سے کم ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ بلقیس اب خود ہی اسے ہماری طرف آنے نہیں دے گی۔ اس کے لیے پسرور کے ایک اچھے ماسٹر کا انتظام بھی ہو گیا ہے۔"

"ماسی شیداں کے بارے میں بھی میرا دل بڑا دُکھا ہے۔ خاور تم نے اس سے بڑی سخت باتیں کی تھیں۔ وہ یہاں آکر بھی کئی دن گم صم رہی۔"

"اس کو بھی تھوڑا سا سمجھانا پڑے گا تمہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمارے آپس کے معاملوں میں دخل دے گی تو اس سے خوامخواہ رنجش بڑھے گی۔"

صبح شہوار واپس جانے کے لیے تیار تھی۔ ناشتے سے پہلے میں حویلی کے پچھواڑے کینوؤں کے باغ میں آیا تو یہاں آصف جاہ صاحب کو دیکھا۔ آٹھ عدد نہایت خون خوار شکاری کتے ان کے ساتھ تھے۔ ان کتوں کا نام انہوں نے سلوکی ہاؤنڈز بتایا۔ گرے ہاؤنڈز اور اس قسم کے دوسرے ہاؤنڈز کتوں کی طرح ان کی کمریں چیتے کی طرح پتلی، جسم لمبے اور تھوتھنیاں چھوٹی تھیں۔ ان خوفناک کتوں کو دیکھ کر جھرجھری آتی تھی۔ میری معلومات کے مطابق یہ

کتے انہوں نے بیرون ملک سے منگوائے تھے۔ ان کی تعداد ہمیشہ آٹھ ہی رہتی تھی۔ پورے علاقے میں ان کتوں کی شہرت تھی۔ جس وقت میں نے دیکھا، آصف جاہ کے دو کارندے چار کتوں کو ورزش کرانے میں مصروف تھے۔ ایک پہلوان نما کارندے نے بانس کے سر سے ایک چھوٹے سائز کا زندہ خرگوش باندھ رکھا تھا۔ وہ ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو کر تیزی سے بانس کو دائیں بائیں حرکت دیتا تھا اور کتے اس حرکت کے ساتھ ہی تیزی سے خرگوش پر پلٹ اور جھپٹ رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ایک تیز رفتار کتے نے جھپٹا مار کر خرگوش کی انتڑیاں باہر نکال دیں۔ خرگوش کو مارنے کے بعد کتوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ مردہ خرگوش کو بانس سے اتار لیا گیا اور ایک دوسرے خرگوش کو باندھا جانے لگا۔

آصف جاہ صاحب مجھے ان خاص الخاص کتوں کے بارے میں بتانے لگے۔ میں نے ان سے کہا۔ "میں نے سنا ہے یہ کتے ہمیشہ آٹھ ہی رہتے ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"نہیں، کوئی خاص وجہ تو نہیں۔ بس شروع سے ہی یہ آٹھ کی ٹولی چلی آ رہی ہے۔"

"لیکن کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہو گا کہ کوئی کتا زخمی ہو جاتا ہو گا یا مر جاتا ہو گا؟"

"ہاں، دو چار بار ہوا ہے۔ اس کی جگہ فوراً دوسرا کتا بھرتی کر لیا جاتا ہے۔ دو تین کتے فالتو رکھے جاتے ہیں۔ ان کی علیحدہ ٹریننگ ہوتی رہتی ہے۔ جب کسی کتے کی عمر کچھ زیادہ ہو جاتی ہے تو اسے بھی بدلنا پڑتا ہے۔ بس ایک دفعہ ایسا ہوا تھا کہ یہ ٹولی آٹھ کی بجائے چار کی رہ گئی تھی۔"

"وہ کیسے؟"

"چار کتے ایک ساتھ مر گئے۔۔۔۔ بلکہ میں نے اپنے ہاتھوں سے مار دیے تھے۔"

"وہ کیوں؟"

"بس، غلطی ہوئی تھی ان سے۔" آصف جاہ نے عجیب سرسراتے لہجے میں کہا، پھر بیڑی کا ایک طویل کش لے کر بولے۔ "یہ پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے۔ وہ کتے کہیں اوپر کی منزل پر چلے گئے۔ انہیں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر شہوار ڈر گئی اور سیڑھیوں سے گر گئی۔ اس کی کہنیاں چھل گئیں۔ شہوار سے بڑا پیار ہے مجھے۔ اس کی ذرا سی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ وہ ساری رات روتی رہی۔ بس آخری پہر اس کی آنکھ لگی۔ صبح میں نے کتوں کو شوٹ کر دیا۔"

میں چونک کر آصف جاہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ان کی نہایت گھنی مونچھوں کے نیچے ان کی سفید آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ کچھ دیر بعد ہم ناشتے کے لیے کمرے کی طرف بڑھے تو آٹھوں کتے بھی ناشتا کر رہے تھے۔ کتوں کے رکھوالوں نے اسٹیل کی بڑی بڑی رکابیوں میں گجریلا ڈال کر ان کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ گجریلے میں ثابت بادام تھے اور سیب کے مربے کے ٹکڑے تھے۔ ایک قریبی کمرے میں تازہ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹے جا رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میں اور بے بے جی، شہوار کو لے کر واپس آ گئے۔ ڈھیروں ڈھیر مٹھائی کے علاوہ بہت سے کپڑے اور دیگر ساز و سامان شہوار کے ساتھ آیا۔ یہ سب کچھ ایک دوسری گاڑی میں لاد کر راجوال پہنچایا گیا تھا۔ اعلیٰ نسل کی دو نہایت شاندار بھینسیں بھی ساز و سامان کے ساتھ تھیں۔ یہ بھینسیں زیادہ دودھ دینے کے دو علیحدہ علیحدہ مقابلوں میں اول آئی تھیں۔ اس وقت بھی ان کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپے سے اوپر تھی۔ ایک بھینس بڑی حویلی کے لیے اور

دوسری میرے گھر کے لیے تھی۔ان بھینسوں کے ساتھ بھی، ہماری اندرونی چپقلش کا ایک واقعہ منسلک ہے لیکن اسے بیان کرنے سے یہ روداد جو اب اختتام کے قریب ہے مزید طویل ہو جائے گی۔

ڈیڑھ دو مہینے مناسب طریقے سے گزر گئے۔میں نے اپنے آپ کو جیسے ایک خول میں بند کر لیا تھا۔اس خول کے اندر کی کوئی کیفیت اور اذیت میں شہوار پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

زہریلی شراب والے واقعے کے بعد رونق علی بچ گیا تھا مگر کتے کی ٹیڑھی دم کی طرح اس کے مشاغل میں کچھ زیادہ تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔اپنی ڈانسر محبوبہ، شکیلہ کے بارے میں بھی ابھی تک اس کے دل میں نرم گوشہ موجود تھا۔وہ اپنے طور پر اسے تلاش کرتا رہا تھا لیکن وہ ماں بیٹیاں، گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو چکی تھیں۔اب وہ ان کی طرف سے مایوس تھا۔رونق علی پر کئی لوگوں نے انگلیاں بھی اٹھائی تھیں۔کہا تھا کہ رونق کے تعلقات ایک ایسی طوائف سے رہے ہیں جو موکھلوں کی آلہ ء کار بنی رہی ہے۔بہر حال، رونق کے لیے شکر کا مقام تھا کہ اس بات نے زیادہ زور نہیں پکڑا۔میں نے بھی دوستی نبھاتے ہوئے اس موقعے پر رونق کا دفاع کیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ایک دن میں مچھلی فارم والے رقبے پر گشت لگانے گیا تھا تو رونق سے بھی وہیں ملاقات ہو گئی۔وہ وہاں جال سے مچھلیاں پکڑوا رہا تھا۔میں نے کہا۔"یہ کیا کر رہے ہو؟"

وہ بولا۔"میں نے بھائی عزیز کو صلاح دی تھی۔آج کل مچھلی کا ریٹ اچھا ہے۔ان کو بیچ دیں، کچھ رقم شقم ہاتھ آ جائے گی۔یہاں بھی تو ان کارندوں شارندوں نے ہی نکال نکال کر کھا جانی ہیں۔"

"رقم کی یہاں کون سی کمی ہے؟ رہنے دو۔۔۔۔۔اگر اپنے لوگ کھاتے ہیں تو کھالیں۔کبھی کبھار ہم بھی کھالیتے ہیں۔"

"یار! یہ موسم مچھلی کھانے کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

"تو اچھا موسم بھی آ جائے گا۔"

"سچی بات بتاؤں؟" وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں بتاؤ۔"

"میں بہت کمینہ ہو گیا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"میں تمہاری بات کو رد تو نہیں کر سکتا۔۔۔۔ لیکن ذرا تفصیل بتاؤ۔"

"اب دیکھ نا، میں بلڈ پریشر کی وجہ سے مچھلی نہیں کھا سکتا۔ جب یہ سارے کھاتے ہیں تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہوں۔"

"سبحان اللہ۔ بڑے اچھے خیالات ہیں۔ اسی وجہ سے تمہارا کوئی کام سیدھا نہیں ہو رہا رونق بھائی۔ چالیس کے ہو گئے ہو پر ابھی تک گھر بھی آباد نہیں کر سکے۔"

"اب تو سو بیماریاں چمڑی ہوئی ہیں۔ اب گھر شر آباد کیا کرنا ہے۔"

"سو نہیں، دو ہی بڑی بیماریاں چمڑی ہوئی ہیں تمہیں۔ طوائف اور شراب۔"

"یار! وہ پہلے والی بیماری تو سمجھو ختم ہو گئی۔ دفع ہو گئی وہ خانہ خراب۔۔۔۔ یہ دوسری بھی آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔"

"آہستہ آہستہ کچھ ختم نہیں ہوتا۔ اللہ بخشے چودھری نشاط بھی تو آہستہ آہستہ چھوڑنے کو کہتا تھا نا۔۔۔۔"

رونق علی ایک دم چونک گیا۔ "ہاں، بھائی نشاط سے یاد آیا۔ اس کی بیٹی پروین کے دن رکھے جا رہے ہیں۔ تمہیں پتا ہے نا؟"

"نہیں؟"

"واقعی نہیں پتا؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یار! کیسے بندے ہو تم۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے حویلی کی طرف سے اپنی آنکھیں اور کان شان بالکل بند کر لیے ہیں۔ بالکل الگ تھلگ ہو گئے ہو۔"

"ہر معاملے میں تو الگ تھلگ نہیں ہوا۔ جو میرے کرنے کے کام ہیں، ان پر تو پوری توجہ دے رہا ہوں۔ لیکن جو حویلی کے اندر کے کام ہیں ان کی ذمے داری بیگم بلقیس اور چودھری عزیز وغیرہ کی ہے۔"

"مگر ان دونوں معاملوں کو الگ تھلگ بھی تو نہیں کیا جا سکتا نا۔ دس پندرہ دن کے اندر شادی ہے۔ اس کے انتظام شنتظام کے بارے میں تمہیں مشورہ کرنا چاہیئے۔"

"مشورہ آپ لوگ خود کریں۔ مجھے اس بارے میں بتا دیں۔ اگر میری کوئی رائے ہو گی تو میں بھی بتا دوں گا۔"

"یعنی اب تم نے بلقیس سے بات نہ کرنے کی قسم کھالی ہے؟"

"بس ایسا ہی سمجھ لیں۔ آپ لوگوں نے ان سے جو مشورہ کرنا ہو، خود کرلیا کریں۔ اور مجھے بتانا ضروری ہو تو بتادیا کریں۔"

چار پانچ دن کے اندر حویلی کے اندر باہر شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ شہوار خود تو بڑی حویلی میں جاتی تھی لیکن میرا جانا اسے کسی طور قبول نہیں تھا۔ بلکہ میں نے تو کئی بار محسوس کیا تھا کہ میرے منہ سے بلقیس یا حامد کا نام سننا بھی اسے تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اب میں کوشش کرتا تھا کہ میری گفتگو میں بلقیس کا نام ہی نہ آئے۔

شادی کی گہما گہمی میں بھی شہوار کی نگاہ ہر وقت مجھ پر رہی۔ میں نے صرف ایک بار حامد سے تھوڑی سی بات کی۔ اس وقت بھی مہمانوں کے درمیان سے شہوار کی نگاہیں مجھ پر ہی تھیں۔ دلہن کی رخصتی سے پہلے مختلف رسموں کے وقت دو تین بار بلقیس پر میری نگاہ پڑی۔ وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ والی جی کی موت کے بعد سے وہ بالکل سادہ لباس میں ہوتی تھی۔ چونکہ، شادی کا موقع تھا، اس لیے اس نے ہلکے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ چہرہ پھر بھی آرائش سے عاری تھا مگر یہ سادگی اس کی دل کشی کو کم کرنے میں ناکام تھی۔

دلہن کی رخصتی کے فوراً بعد شہوار مجھ سے بولی۔ "میرے سر میں بہت سخت درد ہو رہا ہے۔ چلو، گھر چلیں۔"

"لیکن شہوار یہ مناسب نہیں۔ ہمیں دس پندرہ منٹ تو اور رکنا چاہئیے۔"

"ٹھیک ہے، تم رکے رہو۔ میں چلتی ہوں۔" اس نے کہا اور تیزی سے قدم اٹھاتی گھر کی طرف چلی گئی۔

کچھ دیر بعد میں گھر پہنچا تو وہ منہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ "کیا بات ہے شہوار؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میرا سر پھٹ رہا ہے۔ مجھے سونے دو۔" وہ سخت بے زار لہجے میں بولی۔

میرا خیال تھا کہ صبح تک اس کا موڈ بہتر ہو جائے گا۔ لیکن اس کے اندر کی بے چینی میرے اندازے سے کہیں زیادہ تھی اور یہ بے چینی کسی نہ کسی طور اپنا اظہار چاہتی تھی۔ ناشتے کے بعد میں ڈیرے پر جانے لگا تو پلنگ پر کچھ چیزیں پڑی نظر آئیں۔

میں چونک گیا۔ یہ میری ذاتی چیزیں تھیں اور میں نے ایک جستی پیٹی کی تہ میں رکھ چھوڑی تھی۔ ان میں ایک تو وہی انٹر کام تھا جو چند سال پہلے میرے استعمال میں رہا تھا اور جس کے

ساتھ میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ پھر ایک سویٹر تھا جو بلقیس نے مجھے تحفے میں دیا تھا اور بعد ازاں بتایا تھا کہ یہ اس نے اپنے ہاتھوں سے بُنا ہے۔ ایک رومال تھا۔ کئی برس پہلے تختی لکھنے کے بعد بلقیس نے اپنی انگلیاں پونچھی تھیں۔ بیتے دنوں کی یاد روشنائی کی صورت رومال پر موجود تھی۔ ایک خالی عید کارڈ تھا جس پر کچھ بھی لکھا نہیں گیا تھا۔

شہوار سنگھار میز کے سامنے بیٹھی تھی۔ میں نے پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا شہوار؟"

"تمہاری کچھ "بہت قیمتی" چیزیں ہیں۔ پیٹی کے نیچے سے ملی ہیں۔ ایک لفافے میں رکھی ہوئی تھیں۔" اس نے قیمتی پر زور دیا۔

"کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"وہی جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں نے پیٹی نئے لحافوں کے لیے خالی کروائی ہے۔ اپنا یہ اثاثہ تم کہیں اور رکھ لو۔" اس کا لہجہ تاؤ دلانے والا تھا۔

"شہوار! ذرا ذرا سی بات پر تمہاری زبان میں اتنا زہر کیوں بھر جاتا ہے۔ ان چیزوں میں تمہیں کیا بات غلط نظر آئی ہے؟"

"سب غلط ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ سویٹر غلط ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ اس کے ہاتھ کا بُنا ہوا ہے۔ میں نے اس کے بُنے ہوئے سویٹر دیکھے ہیں۔"

میں سٹپٹا گیا۔ "تم ذرا ذرا سی بات پر شک کرتی ہو۔ ہر وقت ٹوہ میں رہتی ہو۔ میرے کپڑوں کی تلاشی لیتی رہتی ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ میں گھر میں نہیں، کسی تھانے میں ہوں۔"

"کیا تم انکار کرتے ہو کہ یہ تمہارے پاس اس کی نشانیاں ہیں اور تم نے انہیں سنبھال کر رکھا ہوا ہے؟"

"میں نے نہیں سنبھال کر رکھا ہوا۔ بس یہ وہاں پڑی تھیں اور پڑی رہ گئی ہیں۔ میری طرف سے انہیں کنوئیں میں پھینک دو یا آگ لگا دو۔"

میں پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ میں شہوار کے سامنے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا تھا لیکن کسی وقت ضبط کا ساتھ چھوٹ جاتا تھا۔

میں سارا دن بے حد مصروف رہا۔ منڈی مویشیاں جانا تھا۔ وہاں سے حویلی کے لیے کچھ نئے گھوڑے خریدنے تھے۔ شام کو میں واپس آیا۔ کھانے کے بعد ذرا ٹہلنے کے لیے چھت پر گیا تو ایک طرف راکھ کی ڈھیری سی نظر آئی۔ غور سے دیکھا تو اس میں جلے ہوئے انٹر کام کے ایک

دو ٹکڑے ملے۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شہوار نے واقعی ساری چیزیں جلا ڈالی تھیں۔ سینے میں درد کی ایک لہر سی اٹھی اور گلے میں دھواں سا بھر گیا۔ انٹر کام کا سرخی مائل ٹکڑا میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ بمبو کاٹ جو ماضی کی ایک خوبصورت یاد تھا، میری طرح اسے بھی راکھ ہونے کی سزا ملی تھی۔ میں نے وہ ٹکڑے گھما کر گہری تاریکیوں میں پھینک دیے۔

کچھ بھولی بسری آوازوں کی بازگشت تصور میں ابھری۔ یہ ماضی کی حنوط شدہ آوازیں تھیں۔

"آپ کہاں ہیں؟"

"پلنگ پر لیٹی ہوں۔ کروٹ لے کر۔"

"میں بھی لیٹا ہوں۔ آپ کا رخ کس طرف ہے؟"

"احاطے کی طرف۔"

"اور میرا حویلی کی طرف۔ یعنی ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں۔"

"ہوں۔" ناک میں گنگناتی ہوئی سی آواز۔

"ایسا نہیں لگتا کہ ہم ایک دوسرے کے پاس لیٹے ہیں۔۔۔۔ بالکل پاس۔"

"ہوں۔" پھر گنگناتی ہوئی آواز۔

"آپ کی سانسیں میری سانسوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ یقین کریں ایسا لگتا ہے کہ۔۔۔۔"

"نہیں کرتی یقین۔"

کھلکھلاتی ہوئی ہنسی ہم دونوں کی۔

پھر ایک دم سب کچھ سسکیوں میں بدل گیا۔ آہوں اور کراہوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ میں نے راکھ کی ڈھیر کو ٹھوکر مار کر اڑایا اور ماضی کی ساری آوازوں سے کان بند کرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

دو تین دن میری اور شہوار کی بات چیت بند رہی لیکن پھر حالات معمول پر آ گئے۔ میں ماضی کو بھول جانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ کسی وقت دل چاہتا تھا کہ شہوار کے ساتھ دو چار مہینوں کے لیے راجوال سے باہر جاؤں مگر یہاں اتنے بکھیڑے پال لیے تھے کہ باہر نکلنا دشوار تھا۔

وہ پت جھڑ کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کسی وقت بارش کا چھینٹا بھی پڑ جاتا تھا۔ چاچا عسکری راجوال میں ہی تھا اور بہت بیمار تھا۔ کسی وقت اس کے تن و توش کو دیکھ کر بہت ہیبت آتی تھی۔ اب وہ سکڑ سمٹ کر مختصر ہو گیا تھا۔ در حقیقت موکھل کے ساتھ لڑائی میں کندھے پر زخم کھانے کے بعد وہ کبھی بھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا۔ بلکہ کچھ عرصہ پہلے تو اس کی موت کی جھوٹی خبر بھی پھیل گئی تھی۔ وہ پچھلے پانچ برس سے کام کاج بالکل چھوڑ چکا تھا۔ بلقیس نے اس کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ وہ اب پانچ وقت کا نمازی بن چکا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ کر دیر تک اس کی ٹانگیں دباتا رہا۔ لالٹین کی زرد روشنی عسکری کے چہرے کی جھریوں میں رینگ رہی تھی اور گئے وقتوں کی کہانیاں سنا رہی تھی۔

دیگر لوگوں کی طرح چاچا عسکری بھی میرے اور بلقیس کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا۔ لالٹین کی ساکت لو کو کھوئے کھوئے انداز میں گھورتے ہوئے چاچے عسکری نے اچانک کہا۔ "بیگم جی کا تجھ سے ملنا جلنا شروع میں بڑا عجیب لگا تھا۔ میں بڑا حیران ہوا تھا کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ پر جب غور کیا تو آہستہ آہستہ بات سمجھ میں آنے لگی۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا چاچا۔"

عسکری نے پھولدار تکیے سے ٹیک لگا کر کہا۔ "خاور پُتر! یہ جو زنانی ہے نا، یہ بڑی عجیب شے ہے۔ یہ جلیبی کی طرح ٹیڑھی بھی ہے اور کورے کاغذ کی طرح سادی بھی ہے۔ شادی کے بعد بندہ اس کو جس رنگ میں ڈھالتا ہے نا، یہ ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ بس اس کی ایک ہی تمنا ہوتی ہے۔ اسے اپنے بندے کی پوری چاہ ملے۔" عسکری نے ذرا توقف کر کے حقہ گڑگڑایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جب بیگم بلقیس حویلی میں آئی تھی تو ہر طرف چانن سا ہو گیا تھا۔ وہ اب بھی اپنی عمر کی عورتوں سے جوان اور سوہنی نظر آتی ہے مگر تب تو اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ جو دیکھتا تھا، دیکھتا رہ جاتا تھا۔ والی جی اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے۔ ان کی عمر بھی کافی زیادہ تھی۔ بس وہ ایک میلے میں بیگم بلقیس کو دیکھ کر فدا ہو گئے تھے۔"

"سنا ہے چاچا! بیگم بلقیس نے والی جی سے شادی کے لیے کوئی شرط بھی رکھی تھی۔۔۔۔"

"ہاں، وہ شرط والی بات بھی بالکل صحیح ہے۔ والی جی بڑے کھلے ڈلے مزاج کے تھے۔ کئی زنانیوں سے ان کا دوستانہ تھا۔ ایک دو رکھیلیں بھی تھیں۔ بیگم بلقیس نے والی جی سے وعدہ لیا

تھا کہ وہ یہ سب کچھ چھوڑ دیں گے اور والی جی نے وعدہ کر لیا تھا۔۔۔۔۔پر ہم نے دیکھا۔۔۔۔کہ یہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔ شروع کے ایک ڈیڑھ سال میں والی جی نے کچھ احتیاط کی۔ حویلی کے اندر ناچ گانا بھی نہیں ہوا مگر پھر آہستہ آہستہ سب کچھ ویسا ہی ہو گیا۔ والی جی کے یار دوست بھی حویلی میں نشے کے لیے آنے لگے۔"

"بیگم بلقیس نے کیا کیا؟"

عسکری نے لالٹین کی دھواں دھواں ٹپنی کو گھورتے ہوئے لحاف کو کچھ اور بھی اپنے گرد لپیٹا اور کہا۔ "میں نے یہ سب کچھ بڑے پاس سے دیکھا ہے خاور پُتر! بیگم بلقیس بڑی شوخ چنچل ہوا کرتی تھی۔۔۔۔۔ایسے جیسے کوئی رنگ دار چڑیا حویلی میں چہکتی پھرتی ہے۔ ہر وقت کا ہاسا، ترنجن، ڈھولکی، گانے۔ مگر پھر جب والی جی اپنی پرانی ڈگر پر آنے لگے تو بیگم بلقیس بجھ سی گئی۔ میاں بیوی میں کئی بار جھگڑا ہوا۔ بیگم بلقیس کئی کئی ہفتے میکے چلی جاتی تھی مگر مجبور ہو کر پھر واپس چلی آتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے صبر کرنا سیکھ لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہاں کچھ بھی نہیں بدلے گا اور اگر اس نے بدلنے کی زیادہ کوشش کی تو سب کچھ بگڑ جائے گا۔۔۔۔۔ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ناچ گانے کی محفلیں حویلی کے بجائے باغ والے ڈیرے پر ہونے لگیں۔"

چاچے عسکری کو حسبِ معمول کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور اس کا دم الٹنے لگا۔ ماضی کا یہ سالار خشک پتے کی طرح کانپنے لگا۔ میں نے اسے پانی پلایا اور حقہ پکڑ کر ایک طرف رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد طبیعت ذرا بحال ہوئی تو عسکری نے کہا۔ "میں نے بتایا ہے نا کہ ان دنوں والی جی بڑے ہی کھلے ڈلے تھے۔ ان کے یار دوست حویلی کے اندر ہی پیتے پلاتے بھی تھے۔ ان کے ایک زمیندار دوست نے انہیں لاہور سے، فلم چلانے والی مشین لا کر دی تھی۔ اس مشین پر وہ حویلی میں ہی فلمیں بھی دیکھ لیتے تھے۔۔۔۔۔والی جی کا ایک یار خوشاب کا عظمت خان کچھ زیادہ ہی وگھڑا ہوا تھا۔ ایک بار میں نے اسے خود بلقیس بیگم سے مذاق کرتے دیکھا۔ اس نے نشے میں بیگم بلقیس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ بیگم بلقیس کا منہ لال بوٹی ہو گیا۔ پر والی جی نے بات ہنس کر ٹال دی۔ بس اتنا کیا کہ عظمت خان کے ہاتھ سے بوتل پکڑ کر ایک طرف رکھ دی۔

"اب کبھی کبھی سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ والی جی نے ایک بڑی ہی سیدھی اور سچی کھری لڑکی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ والی جی کئی کئی دن ڈیرے پر گزار دیتے، وہ اتنی بڑی حویلی میں اداس پڑی رہتی۔ سردیوں میں وہ اکثر خیمے وغیرہ لے کر شکار پر نکل جاتے تھے۔ ایسے دوروں سے ان کی واپسی دو دو ہفتوں بعد ہوتی تھی۔ بس کچھ نہ پوچھو، ان دنوں کیا کیا ہوتا رہا ہے۔"

میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔"لیکن کچھ سال پہلے جب میں نے والی جی کو دیکھا تو وہ کافی بدلے ہوئے تھے۔"

"وہ تو جب ان میں ہمت ہی نہ رہی اور بیماریوں نے گھیر لیا تو سارے کام آہستہ آہستہ چھوٹ گئے۔اس عمر میں بدلنا جوانی میں بدلنے کے برابر تو نہیں ہوتا نہ۔"

میں نے موضوع بدلا۔چاچا عسکری! تمہارا بہت تجربہ ہے۔تم بتاؤ بیگم بلقیس کیسی عورت ہیں؟"

"یہ سوال تو میں تم سے پوچھنے والا تھا۔تم بتاو کہ تمہارے دماغ میں بیگم بلقیس کے بارے میں کیا خیال آتا ہے؟میرا مطلب ہے کہ اب یہ بات بالکل لکی چھپی نہیں ہے کہ والی جی کی زندگی میں ہی تمہارے اور بیگم بلقیس کے درمیان بات چل پڑی تھی۔تمہارا کیا خیال ہے، بیگم بلقیس نے ایسا کیوں کیا؟"

میں نے کہا۔"سچی بات پوچھو چاچا عسکری تو تب جو کچھ ہوا اس میں زیادہ قصور میرا ہی تھا۔"

"لیکن تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی نا۔کیا تمہارے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ بیگم بلقیس وفادار زنانی نہیں ہے؟جس طرح اس نے والی جی کے ہوتے ہوئے تمہارا حوصلہ بڑھایا،اس طرح اس نے کہیں اور بھی ایسا کام کیا ہوگا؟"

میں نے ایک لمحہ سوچے بغیر کہا۔"نہیں چاچا عسکری! میرے دماغ میں کبھی یہ خیال نہیں آیا اور نہ آسکتا ہے۔میرے پاس اس کی کوئی پائیدار وجہ نہیں ہے پر چاچا! میں آنکھیں بند کر کے بیگم بلقیس پر یقین کر سکتا ہوں۔"

"میرا بھی خیال تھا کہ تم یہی کہو گے۔۔۔۔اور سچ پوچھتے ہو پُتر خاور تو میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔۔۔۔زنانی کے اندر محبت کی بھوک ہوتی ہے۔بس اسی بھوک نے بیگم بلقیس کو مجبور کیا اور اس سے زندگی کی پہلی بھول ہوئی۔اور میرا خیال ہے کہ یہ آخری بھول بھی ہے مگر اس میں ایک بات اور غور کرنے والی بھی ہے۔اس بھول میں تھوڑی بہت ڈھیل والی جی کی طرف سے بھی شامل رہی ہے۔والی جی بالکل وکھری ٹائپ کے بندے تھے۔انہوں نے کھلی ڈلی زندگی گزاری اور کبھی کسی کی باتوں کی پروا نہیں کی۔تمہارے اور بیگم بلقیس کی وجہ سے شروع میں ضرور ان کو سخت جھٹکے لگے۔وہ کئی ماہ پریشان رہے اور انہوں نے تمہارا حویلی میں

آنا جانا بند کر دیا تھا۔ لیکن پھر جیسے آہستہ آہستہ انہوں نے یہ معاملہ برداشت کرنا شروع کر دیا۔ ویسے بھی وہ تم کو پسند کرنے لگے تھے۔ ان کو پتا تھا کہ اس وقت تم ہی ہو جو جاگیر کے معاملوں کو سنبھال سکتے ہو۔ دوسری طرف بیگم بلقیس بھی یہ دیکھ رہی تھی کہ والی جی کو تمہاری سخت ضرورت ہے۔ ان سارے معاملوں نے مل جل کر وکھرا ماحول ہی بنا دیا تھا۔ لیکن کچھ بھی ہے خاور پُتر! بھول تو بھول ہی ہوتی ہے۔ اس بات کو مانتے ہو نا تم؟"

"بالکل مانتا ہوں چاچا"

"اب یہ بہت بڑا کام ہو گا کہ تم دونوں اس "بھول" کو بھول جاؤ۔ جو کچھ ہوا وہ ہو گیا۔ بڑے بڑے لوگوں سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ اب تم اپنی اپنی زندگیوں کو اپنے اپنے راستے پر ڈال دو۔ اسی میں نیکی اور اسی میں سلامتی ہے۔ میں تو اب شاید چند دنوں کا مہمان ہوں۔ اب جو کچھ کرنا ہے، تم لوگوں نے کرنا ہے۔ مجھے پتا ہے تم نے اس جاگیر کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اب یہ آخری قربانی بھی تم ضرور دو گے۔"

میں نے چاچے عسکری کے جفاکش ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اسی دوران میں دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ہمارا مخبر رملی تھا۔ بارش سے بچنے کے لئے اس نے سن کی بوری کو برساتی کی طرح اوڑھ رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ میں اسے اندر لے آیا۔ چاچے عسکری کو سلام کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "چودھری جی! وہاں گورکیے میں بڑی گڑبڑ ہے۔ موکھل پاشا کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ موکھل حویلی میں کافی لوگ جمع ہیں اور صلاح مشورے ہو رہے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے، وہ کوئی شرارت کریں گے؟"

"لگ تو ایسے ہی رہا ہے جی۔ کوئی لمبا چوڑا پروگرام ہے۔ وڈے موکھل صاحب کے سالے وڈیرا خان نے کوئی سٹھ گھڑ سوار بھیجے ہیں جی اسلحے سمیت، ایک زمیندار نے تین بڑے صندوقوں میں کافی سارا اسلحہ موکھل حویلی میں پہنچایا تھا اور بہرام کا تو پتا ہے نہ آپ کو؟"

"جس نے نکووال میں بیگم بلقیس پر ہتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی؟"

"جی ہاں، وہی خبیث۔۔۔۔وہ بھی اپنے تین درجن ساتھیوں کے ساتھ موکھل حویلی میں ہے۔ شاہنواز صاحب کے ہاتھوں ایک موکھل کے مرنے کے بعد یہ لوگ بڑے سخت تپے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں اگلے آٹھ پہروں میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

اس زبردست اطلاع پر میں نے رملی کو شاباش دی اور سو سو کے تین نوٹ بھی۔ اسے ضروری ہدایتیں دے کر میں نے واپس بھیج دیا۔

چاچے عسکری نے کہا۔ "والی جی کی زندگی میں علاقے کی پلس ہمیشہ ہمارے ہتھ میں رہی ہے۔ پر اب الٹ ہو گیا ہے۔ اس لئے خطرہ بھی بڑھ گیا ہے۔ تمہیں تیزی کے ساتھ کچھ کرنا ہو گا۔"

چاچے کی بوڑھی آنکھوں میں خوف کے سائے تھے۔ کبھی یہی آنکھیں تھیں جو ایسی خبر سن کر جوش سے لال ہو جاتی ہوں گی۔ سب وقت کا کھیل ہے۔

میں نے چاچے عسکری کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔ "تم یہ گرم دودھ پی کر آرام سے سو جاؤ چاچا! میرے ہوتے ہوئے ان موکھلوں کی ہمت نہیں کہ راجوال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھیں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

چاچے کی آنکھوں میں دعاؤں کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ میں جانتا تھا کہ لحاف کے اندر ایک چھوٹی سی تسبیح پر اس کی انگلیوں کی گردش تیز ہو گئی ہے۔

میں حویلی کے مردانے میں آیا۔ بلقیس کا ماموں چودھری یعقوب سو چکا تھا۔ چودھری عزیز بھی کہیں لحاف میں دبکا ہوا تھا۔ نشاط کا منجھلا بھائی ارباز بیٹھک میں ہی تھا۔ میں نے فوری طور پر سارے ذمے دار افراد کی ہنگامی میٹنگ بلائی۔ شام پور کے نمبردار سلطان کو بھی فوری طور بلا لیا گیا۔ نمبردار کی تقریباً اسی فیصد بینائی ضائع ہو چکی تھی وہ اپنی پسندیدہ سواری یعنی گھوڑے پر سفر نہیں کر سکتا تھا۔ سب میں غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ زہریلی شراب والے واقعے میں ہمارا جانی نقصان زیادہ ہوا تھا۔ چودھری نشاط جیسا اہم بندہ قبرستان میں جا سویا تھا۔ اس کے باوجود موکھل تن فن دکھا رہے تھے۔

نمبردار سلطان کی رائے اکثر مختلف ہوتی تھی۔ اس نے کہا۔ "موکھل حویلی میں اکٹھ کی اطلاع تو مجھے بھی ملی ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ یہ اکٹھ کسی کارروائی کے لئے ہی ہوا ہے۔"

"تم یہ کیسے کہہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا

"مجھے پتا چلا ہے کہ کل وڈا موکھل شکار کے لئے بھکر جارہا ہے۔ بھکر سے میرے ایک رشتے دار نے بھی تصدیق کی ہے وہاں ایک بڑی رکھ میں سور مارنے کا لمبا چوڑا پروگرام بنا ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔"تمہاری اس اطلاع سے میرا شبہ اور پکا ہو گیا ہے کہ موکھل کسی کاروائی کا سوچ رہے ہیں۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو، اس سے پہلے بھی ایک دو دفعہ ایسا ہو چکا ہے۔ موکھلوں نے ہلا بولا ہے اور ہلے کے موقعے پر وڈا موکھل حویلی میں موجود نہیں تھا۔ یہ لوگ ایسا کام موقعے سے اپنی غیر حاضری ثابت کرنے کے لئے کرتے ہیں۔"

دو تین اور افراد نے بھی میری بات کی تائید کی۔

مجھے ایسے موقعوں پر اکثر اماں دلشاد کی چاروں بیٹیوں کی طرف سے خطرہ رہتا تھا۔ موکھل پاشا کو ان یتیم لڑکیوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ راشدہ کی شادی تو گاؤں کے اندر ہی ہوئی تھی۔ ثمینہ ویسے ہی حویلی میں رہتی تھی۔ چند ماہ پہلے میں نے ایک احتیاط یہ کی تھی کہ شاداں اور زرینہ کو بھی ان کے شوہروں سمیت راجوال میں ہی گھر لے دیے تھے۔ اب یہ چاروں

راجوال میں تھیں اور میں ان کی طرف سے کافی حد تک بے فکر تھا۔ یہاں سوچنے کی بات یہ تھی کہ موکھل کس طرح کی کاروائی اور کس جگہ کرنا چاہتے ہیں۔

چودھری عزیز نے مجھے مشورہ دیا۔"میری رائے ہے کہ تمہیں فوراً اپنے سسر صاحب کو خبر پہنچانی چاہئیے۔ انہیں بتانا چاہئیے کہ موکھل حویلی میں کیا تیاری ہو رہی ہے۔"

"لیکن کیا خیال ہے خاور؟"چودھری عزیز نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر آپ سب کا مشورہ ہے تو کسی کے ہاتھ آصف جاہ صاحب کو اطلاع پہنچادیتے ہیں۔"

"لیکن یہ کام فوراً ہو تو اچھا ہے تاکہ وہ بھی اس بارے میں وقت پر سوچ لیں۔"چودھری یعقوب نے کہا۔

"اس اطلاع سے بھی زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ ہم خود پوری طرح تیار ہو جائیں۔ سب جانتے ہیں کہ لڑائی کو روکنے والی اصل چیز لڑائی کی تیاری ہی ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔

اس کے علاوہ ہمیں پولیس کو بھی آگاہ کرنا چاہئے۔اس میں شرمندگی کی بات نہیں۔ایسا کرنے سے ہماری قانونی پوزیشن مضبوط ہو جائے گی۔"

چودھری عزیز نے تائید کی۔ڈکیت بارے کی موت والے واقعے کو عرصہ گزر چکا تھا۔تاہم اس کے بعد سے عزیز کا رویہ میرے ساتھ میری مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔

دوڈھائی گھنٹے تک مشورہ ہوا۔چودھری عزیز اور یعقوب بلقیس کے پاس بھی پہنچے اور اس معاملے میں اس کی رائے لے کر آئے۔اس رائے کے مطابق اگلے دن صبح سویرے ایک بڑا اکٹھ بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔میں، تیمور، نصر اللہ اور شبیر وغیرہ اپنے تمام ساتھیوں کو چوکس کرنے کے لئے اصطبل کی طرف چلے گئے۔رات آخری پہر تک ہم مختلف کاموں میں مصروف رہے۔

صبح میں گھر پہنچا تو والد، عارفہ اور شہوار سب پریشان تھیں۔والدہ نے بتایا کہ شہوار رات گئے تک میرے انتظار میں جاگتی رہی ہے۔

میں کمرے میں گیا تو وہ آنکھوں میں ناراضی لئے کھڑی تھی۔"کہاں رہے ہو ساری رات۔ کم از کم بتا تو دیتے کہ کیا معاملہ ہے؟"

سارے گاؤں کو معلوم ہو گیا ہے، کیا تمہیں ابھی تک معلوم نہیں ہوا؟"

وہ تو ٹھیک لیکن میں تمہاری بیوی ہوں۔مجھے بھی دوسروں سے معلوم ہو تو یہ تو کوئی بات نہیں۔"

میں نے اسے تفصیل بتائی۔وہ بولی۔اباجی کو پیغام بھیج دینا چاہئے۔۔۔۔بلکہ اگر تم اجازت دیتے ہو تو میں خود حویلی چلی جاتی ہوں۔اگر ہماری برادری راجوال کے ساتھ کھڑی ہو گئی تو موکھلوں کی جرات نہیں ہو گی ہلا بولنے کی۔"

میں نے کہا۔"تمہارا جانا مناسب نہیں۔"

"تو پھر میں اپنی طرف سے چٹھی لکھ دیتی ہوں، اباجی کے لئے۔"

وہ بھرپور کردار ادا کرنا چاہتی تھی۔اس رویے کے پیچھے غالباً رقابت کا جذبہ بھی موجود تھا۔وہ مجھے یہ جتانا چاہتی تھی کہ اگر بلقیس، جاگیر کی مختار بن کر فیصلے کر سکتی ہے تو وہ بھی ایسے سنجیدہ کاموں میں ہاتھ ڈال سکتی ہے۔

میں نے کہا۔"فی الحال چٹھی وغیرہ کی ضرورت نہیں۔اگر کوئی مسئلہ ہوا تو میں تمہیں بتاوں گا۔"

اگلا روز بہت ٹینشن والا تھا۔وہی تناؤ آمیز سنسنی جو ایسے موقعوں پر خون میں شامل ہو کر دھڑکنوں کو گونج دار بنا دیتی ہے۔مجھے یہ گونجتی دھڑکنیں ہمیشہ سے پسند تھیں اور میرے خیال میں میرے اندر کا یہی خداداد جوش تھا جو میرے ساتھیوں کو بھی توانا کر دیتا تھا۔پچھلے برسوں میں اس توانائی سے ہم نے خودسر موکھلوں کے منہ پھیرے تھے۔آثار سے صاف نظر آرہا تھا کہ لڑائی ہو گی اور کافی بڑی ہو گی۔دوپہر کو ہمارا اڈسکے کا دوست ساجا کے ٹو بھی راجوال پہنچ گیا۔اس کو ارد گرد کی بڑی خبر رہتی تھی۔اس نے مجھ سے کہا۔"یار خاور! یہ کیا ہو رہا ہے؟ پکی بات کہ یہاں بڑا خون خرابا ہونے والا ہے۔پولیس کہاں ہے؟

"پولیس یہی پر ہے اور وہ تماشا دیکھنا چاہتی ہے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ انہیں موکھلوں کا پلہ بھاری نظر آرہا ہے۔انہوں نے شراب والے معاملے کو بھی دبانے کی کوشش کی تھی اور ہر ثبوت ضائع کر دیا تھا۔آج تک نائیکہ اختری کا کھوج نہیں ملا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ پولیس موکھلوں کی سائیڈ لے رہی ہے؟"

"ابھی تک تو ایسا ہی ہے۔"میں نے کہا"پولیس افسر گھنے بنے ہوئے ہیں اور اس طرح گھنے بن کر وہ سات آٹھ گھنٹے اور گزار دینا چاہتے ہیں۔"

شام چھ بجے تک حالات سخت خراب رہے۔پھر ہمیں قلعہ والا کی طرف سے ایک اچھی خبر ملی۔ایک طرح سے یہ ہمارے لئے سخت حبس میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تھا۔معلوم ہوا کہ لمبڑ آصف جاہ صاحب نے اپنے قریباً دو سو مسلح کارندوں اور گھڑسواروں کو بالکل تیار کر دیا ہے۔اس کے بعد وہ ایم پی اے امین چودھری، ایک بڑے پولیس افسر اور کچھ دیگر معزز لوگوں کے ساتھ گورکیے میں موکھل حویلی پہنچے ہیں۔پتا چلا کہ وہاں بڑی زبردست میٹنگ ہو رہی ہے۔

۔۔۔۔اس میٹنگ کا نتیجہ ہمیں رات گیارہ بجے کے قریب ملا۔تب تک ہم ہر قسم کے حالات کے لئے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔شام سے پہلے ہی گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈالی جا چکی تھیں۔میٹنگ کا نتیجہ لے کر خود لیاقت کالا اور دو معزز لمبڑ راجوال پہنچے۔یہ نتیجہ حوصلہ افزا تھا۔لیاقت کالے نے بتایا۔

"لڑائی ٹل گئی ہے شاہ خاور! موکھلوں اور ان کے ساتھیوں نے گھوڑوں کی زینیں کھول دی ہیں اور ہتھیار اتار رہے ہیں۔"

"اگر انہوں نے اتار دیئے ہیں تو ہم بھی اتار دیں گے۔" میں نے کہا۔

"بڑی لمبی چوڑی بحث ہوئی جی وہاں۔ موکھلوں کی ضد تھی کہ یہ لڑائی ضرور ہو گی۔ وہ آصف جاہ سے کہتے تھے کہ وہ ایک طرف رہیں۔ نہ ہماری حمایت کریں نہ جاگیر والوں کی۔ لیکن آصف جاہ صاحب نے بتایا کہ وہ اس لڑائی سے علیحدہ نہیں رہ سکتے۔"

جب اس بات کی پوری تصدیق ہو گئی کہ لڑائی ٹل گئی ہے اور موکھلوں کے جو حمایتی جتھے موکھل حویلی میں جمع ہوئے تھے وہ واپس جانا شروع ہو گئے ہیں۔ تو میں نے بھی نصر اللہ سے کہا کہ وہ ساتھیوں سے ہتھیار اتروا دے مگر اندر خانے چوکس رہے۔

ایک خونی لڑائی بالکل کنارے پر آکر تھم گئی تھی اور یہ سب کے لئے خوشی کی بات تھی۔۔۔۔ اگلے روز ہمیں اس بحث کی تفصیل معلوم ہوئی تھی۔ پتا چلا کہ ایک موقعے پر آصف جاہ صاحب سخت غصے میں آ گئے تھے۔ انہوں نے وڈے موکھل کو صاف بتا دیا تھا کہ راجوال میں ان کی بیٹی ہے وہ اس کا سسرال ہے۔ اگر راجوال کو کوئی نقصان پہنچا تو ہم سمجھیں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

گے کہ یہ ہمارا نقصان ہے۔ ہم راجوالیوں کے کندھے سے کندھا ملا کر میدان میں آ جائیں گے۔

اور یہی موقع تھا جب موکھلوں نے اپنا ارادہ بدلا۔

اگلے چار پانچ ہفتے تک حالات پر سکون ہی رہے۔ ویسے اندر خانے لڑائی کا ماحول بنا رہا۔ پتا چل رہا تھا کہ موکھل پاشا مسلسل جوڑ توڑ میں مصروف ہے۔ میرے گھر کا ماحول بھی بس ٹھیک تھا۔۔۔۔ اور ٹھیک اس وجہ سے تھا کہ یہاں شہوار کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ حامد کی صورت دیکھے مجھے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ اسے ایک بار پھر خناق کی شکایت ہوئی تھی لیکن میں پتا لینے نہیں گیا تھا۔ بلقیس سے ملنے یا بات کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ان دنوں ایک اور واقعہ ہوا جس سے شہوار کی نازک طبیعت کا اندازہ ہوا۔ ہمارے دیہات میں اکثر سردیوں کے موسم میں دودھی بنائی جاتی ہے۔ دودھی ایک مقوی غذا ہوتی ہے۔ دودھ میں چار مغز، ناریل اور بادام وغیرہ ڈال کر اسے خوب جوش دیا جاتا ہے اور پھر چمچ سے گرم گرم پیا جاتا ہے۔ رات کو شہوار بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری ایک ملازمہ رانو نے گرم

گرم دودھ کا پیالہ شہوار کے سامنے رکھنا چاہا تو وہ الٹ گیا اور اس نے شہوار کا پاؤں جلا دیا۔

شہوار چلا کر اٹھی اور اس کے جہیز کا ایک نہایت قیمتی گلدان بھی ٹوٹ کر گر گیا۔

دودھ بہت گرم تھی، شہوار کے پاوں پر آبلے پڑ گئے۔ کئی دن اس کی مرہم پٹی ہوتی رہی۔

اسی ملازمہ رانو سے چند دن پہلے شہوار کا ایک مہنگا دوپٹا بھی استری کرتے ہوئے جل گیا تھا۔

شہوار نے رانو کو نکال دیا اور وہ اپنے گاوں نکووال چلی گئی۔

بات یہیں تک رہتی تو کوئی خاص نہیں تھی۔ مگر چند دن بعد پتا چلا کہ دو تین راہ زنوں نے رانو کو کھیتوں میں پکڑ کر خوب مارا ہے۔ اس کے کپڑے پھاڑ دیئے ہیں، کانوں سے چاندی کی بالیاں نوچ لی ہیں اور اسے نیم بے ہوش کر کے چھوڑ گئے ہیں۔ اس واقعے کے بعد بھی میرا دھیان کسی خاص سمت میں نہیں گیا۔ لیکن اس رات رونق علی کے کمرے میں اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے ایک عجیب بات کہی۔ وہ بولا۔ "یار! میں سوچ رہا ہوں، اس کڑی رانو کو کہیں پاؤں اور دوپٹا جلانے کی سزا تو نہیں ملی؟"

میں چونک کر رونق کی طرف دیکھنے لگا۔ "کیا کہنا چاہ رہے ہو رونق بھائی؟"

اس نے اپنی چربی دار ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ "یقین سے نہیں کہہ رہا ہوں، بس میرا خیال شیال ہی ہے، دراصل میں تو بڑے عرصے سے آصف جاہ کو جانتا ہوں نا، یہ بندہ اپنی بیٹی کے بارے میں بڑا جنونی ہے۔ اکلوتی اولاد ہے اور بڑے لاڈ پیار سے پلی ہوئی ہے، تمہیں شاید اس کتوں والی بات کا پتا ہی ہو گا۔ اپنے چار بہت مہنگے کتے آصف جاہ نے صرف اس بات پر شوٹ کر دیئے تھے کہ۔۔۔۔۔"

"ہاں، مجھے پتا ہے لیکن یہ جو رانو والی بات تم کہہ رہے ہو، یہ تو سمجھ میں نہیں آتی۔"

"لیکن مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو گا۔ ایسے لوگ موٹی اسامیوں کو شکار کرتے ہیں۔ غریب نوکرانی سے انہیں کیا مل جانا تھا۔ بس اسے نیلو نیل کر کے چھوڑ گئے ہیں۔ یہ وہی چکر ہے۔ تمہیں آصف جاہ کے غصے اور کینے کا پتا نہیں ہے۔ وہ ماسٹر والی بات سنی ہوئی ہے تم نے؟"

"نہیں۔"

"آصف جاہ کی حویلی کے گیٹ پر ایک چوکیدار بیٹھا ہوتا ہے۔ اس کا ایک بازو نہیں ہے۔"

"شاید یہ دیکھا ہے میں نے۔"

یہ ماسٹر خورشید ہے۔جب شہوار پانچویں چھٹی میں پڑھتی تھی۔یہ اسے حویلی میں پڑھانے آتا تھا۔پتا چلا تھا کہ ماسٹر کبھی کبھار شہوار کو چھڑی سے مارتا ہے۔آصف جاہ نے سختی سے منع کر دیا۔کچھ عرصے بعد ماسٹر کو کسی بات پر غصہ آیا اس نے پھر شہوار کے ہاتھوں پر سوٹیاں ماریں۔شہوار تو شاید نہ بتاتی پر اس کے چاچے کی بہن نے دیکھ لیا اور تایے آصف جاہ کو بتا دیا۔آصف جاہ نشے میں تھا۔نشے میں بندے کا غصہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔آصف جاہ نے ماسٹر خورشید کو کچھ اور تو نہیں کہا،بس کلہاڑی سے اس کا ہاتھ کٹوا دیا۔"

"یقین نہیں آرہا۔"

"قلعہ والا کے کسی بندے سے پوچھ لینا،یقین آجائے گا۔ہاتھ کاٹ کر بھی آصف جاہ نے اسے معاف نہیں کیا۔اس پر پابندی لگا دی کہ وہ قلعہ والا میں بلکہ پورے علاقے میں کسی بچے کو پڑھا شڑھا نہیں سکے گا اور نہ اسکول میں نوکری شوکری کر سکے گا۔"

کچھ دیر اس موضوع پر بات ہوتی رہی پھر اچانک رونق علی کو یاد آیا۔"شہوار کے پاؤں کا اب کیا حال ہے؟"اس نے پوچھا

"پٹی کھل گئی ہے پر دوا وغیرہ لگا رہی ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"بلقیس اس کا پتا لینا چاہ رہی تھی۔لیکن وہ ڈرتی بھی ہے کہ کہیں شہوار کا موڈ خراب نہ ہو جائے۔کہہ رہی تھی،میں ایسے وقت جاؤں گی جب شہوار گھر میں اکیلی ہو۔"

"ٹھیک ہے جیسے ان کی مرضی۔"

"تم کل کتنے بجے گھر سے نکلو گے؟"

"یہی کوئی نو بجے کے قریب۔"

"ٹھیک ہے۔میں اسے کہوں گا دس بجے کے بعد چلی جائے۔"رونق علی نے کہا پھر توند پر ہاتھ پھیر کر بولا۔"یار! یہ ذرا میرا بلڈ پریشر تو چیک کرو۔اب ذرا ذرا سی بات پہ بڑھنے لگا ہے۔اب دیکھو،کوئی ایسی گرم شے بھی نہیں کھائی۔بکرے کے تھوڑے سے کھراوڑے (پائے) کھائے ہیں۔"

"ہاں ہاں،بکرے کے کھراوڑے تو بالکل ٹھنڈے ہوتے ہیں۔۔۔۔بلکہ جس بندے کو یرقان ہو اس کو بکرے کے کھراوڑے کھلانے چاہئیں۔"

وہ دھیان سے میری طرف دیکھنے لگا۔ یار! ایک تو تمہاری سمجھ نہیں آتی۔ پتا نہیں چلتا کس وقت مذاق کر رہے ہو اور کس وقت صحیح بات کہہ رہے ہو۔"

"رونق بھائی! تم سب جانتے ہو۔ بس جان بوجھ کر گھنے بن جاتے ہو۔ اب تم اتنے چوچے نہیں کہ تمہیں کھراؤڑوں کے سخت گرم ہونے کا پتا نہ ہو۔ بس زبان کا چسکا تمہارا ستیاناس کر رہا ہے۔"

اس کا چہرہ متغیر ہوا پھر وہ کھسیانے انداز میں ہنسنے لگا۔ اس کی توند بھی ساتھ ہنسنے لگی۔ وہ میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "یار! اصل میں مجھے صبح سے لگ رہا تھا کہ بلڈ پریشر بہت کم ہو گیا ہے۔ ایک دم کمزوری ہو گئی تھی۔ اس لئے میں نے سوچا تھوڑا سا تیز کر لوں۔ زیادہ کھایا بھی نہیں۔ بس دو چار بوٹیاں ہی تھیں۔"

"مجھے پتا ہے رونق بھائی، تم پورے پائے کو ایک بوٹی کہتے ہو لیکن۔۔۔۔۔ خیر سے یہ بلڈ پریشر تمہارا لو کیسے ہو گیا؟"

"سچی بات بتاؤں؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دراصل وہ خانہ خراب شکیلہ بائی رات کو بہت یاد آتی رہی۔ اس دغا باز کے بارے میں سوچ سوچ کر بلڈ پریشر نیچے چلا گیا۔"

"وہ دوسری باتوں کی طرح تمہاری یہ بات بھی الٹی ہے۔ اس خبیث کے بارے میں سوچ کر تو تمہارا بلڈ پریشر اور اوپر جانا چاہیے تھا۔ وہ مخبر تھی۔ تمہیں نقصان پہنچاتی رہی اور تمہارے ساتھ ساتھ پورے راجوال کو بھی۔ یہ تو شکر ہے کہ جلدی اس کا پول کھل گیا۔ اس کے بارے میں سوچ کر تو تمہارے بلڈ پریشر میں آگ لگ جانی چاہیئے۔"

رونق نے ایک گہری سانس لی۔ ساتھ ہی اس کی توند بھی پھول کر پچکی۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ "یار! ان پڑھ بندوں کا بلڈ پریشر ایسے ہی ہوتا ہے۔ جب اوپر جانا ہوتا ہے نیچے چلا جاتا ہے۔ نیچے ہونا ہو تو اوپر چلا جاتا ہے۔ ہم بھی چار جماعتیں پڑھ لیتے تو "پریشر" کو اوپر نیچے ہونے کا طریقہ آجاتا"

"میں پھر کہہ رہا ہوں، اس ان پڑھ بلڈ پریشر کی طرف سے ہوشیار ہو جاؤ۔ اوپر نیچے کے چکر میں یہ کہیں تمہیں اوپر ہی نہ پہنچا دے۔"

بی پی اپریٹس میں نے رونق علی کے کمرے میں ہی رکھ چھوڑا تھا۔اس کا بی پی چیک کیا۔ کھراؤڑوں کی مہربانی سے وہ دوڈھائی سو سے اوپر تھا۔میں نے اسے بتایا تو اسے یقین نہیں آیا۔ وہ آنکھیں میچ میچ کر میٹر پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔زہریلی شراب والے سنگین واقعے کے بعد نمبر دار کی بینائی تو تقریباً ختم ہوگئی تھی۔دو تین بندوں کی بہت کم بھی ہوگئی تھی۔

ان میں رونق علی بھی شامل تھا۔اسے اس طرح میٹر پڑھتے دیکھ کر مجھے اس پر ترس بھی آیا۔ رونق علی جو کچھ بھی تھا لیکن مجھ سے اس کی ہمدردی ہمیشہ بہت گہری اور پرخلوص رہی تھی۔

انٹرکام اور دوسری چیزیں شہوار نے چھت پر لے جا کر جلادیں تھیں۔اس واقعے کے بعد جو تلخی پیدا ہوئی تھی۔وہ آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔کچھ روز پہلے چاچے عسکری سے جو باتیں ہوئی تھیں۔وہ اکثر میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھیں۔

چاچے عسکری نے کہا تھا،زنانی اپنا سب کچھ اپنے شوہر کو سونپ دیتی ہے اور اس کے بدلے اس سے وفا مانگتی ہے۔اور جب یہ نہیں ملتی تو پھر ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔چاچے عسکری نے اپنی گفتگو میں مجھے ایک واقعہ بھی سنایا تھا۔یہ قطر کا واقعہ تھا۔جوانی میں چاچا عسکری کچھ عرصہ قطر میں بھی محنت مزدوری کرتا رہا تھا۔چاچے نے قطر کے ایک مقامی بندے کا ذکر

کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کی پانچ بیویاں تھیں۔پانچویں یعنی سب سے چھوٹی سے اسے بہت پیار تھا لیکن جب اس نے چھٹی شادی کر کے پانچویں کو بھی نظر انداز کر دیا تو اس نے انتقام کے طور ایک ایسے آوارہ غندے سے شادی کی جس نے کبھی اس کے شوہر کو بھرے بازار میں پیٹا تھا۔اس واقعے میں اس خفیہ بغاوت کے اشارے تھے جو بے وفائی کا شکار ہونے والی عورت کے اندر گہرائی میں موجود رہتی ہے۔

کسی میں کم ہوتی ہے،کسی میں زیادہ لیکن یہ ہوتی ضرور ہے۔

میں شہوار کا ذکر کر رہا تھا اور اس تلخی کا ذکر جو ہمارے درمیان دھیرے دھیرے کم ہو رہی تھی لیکن انہی دنوں ایک ایسا واقعہ ہو گیا جو حالات کو پھر دوسرے رخ پر لے گیا۔کڑاکے کی سردی شروع ہو چکی تھی۔مجھے اماں دلشاد کی سب سے چھوٹی ثمینہ کا بہت خیال رہتا تھا۔وہ یتیم تھی اور دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے والی جی نے اماں کی چاروں بیٹیوں کی حفاظت کی ذمے داری لے لی تھی۔بڑی تینوں تو شادی شدہ ہو چکی تھی۔اب ثمینہ رہ گئی تھی۔میں نے اس کے لئے کچھ گرم کپڑے حویلی میں بھجوائے اور پھر گپ شپ کے لئے گاؤں کے دائرے میں آ گیا۔دائرے میں شام کے فوراً بعد محفل جم جاتی تھی،آج بھی جمی ہوئی تھی۔میرا رتبہ

اب چودھری کا ہو چکا تھا لیکن دائرے میں بیٹھنے والے لوگ اب مجھ سے بے تکلفی سے بات کرتے تھے۔ میری موجودگی میں لطیفے بازی زور پکڑ جاتی تھی اور مجھے خاص طور سے لطیفے سنانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

پکی لکڑی کی آگ کے گرد بیٹھ کر باتیں کرتے ابھی مجھے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ مالی گلاب دین کے بیٹے گلزار کی شکل نظر آئی۔ اس نے مجھے اشارے سے باہر بلا دیا۔ وہ خاصا بے چین نظر آرہا تھا۔ میں باہر گیا تو وہ بولا۔ کچھ پتا چلا ہے آپ کو؟ بیگم جی ابھی تک واپس نہیں آئی ہیں؟"

"کہاں گئی ہوئی تھیں وہ؟" میں نے پوچھا

"روہی پور میں۔۔۔۔ایک لڑکی کی شادی تھی۔ بیگم جی نے ہی کروائی ہے۔"

بے آسرا لڑکیوں کی شادیاں کرانے اور ان کا جہیز بنانے کا سلسلہ بلقیس نے والی جی کی زندگی میں ہی شروع کر دیا تھا اور یہ اب تک جاری تھا۔ وہ کسی بھی طرح کے صلے کی خواہش کے بغیر یہ کام کرتی تھی۔ شاید بلقیس کو اس کام کی طرف لانے میں اس کی اپنی ناتمام آرزوؤں کا بھی عمل دخل تھا۔

میں نے گلزار سے پوچھا۔ "وہ بتا کر نہیں گئی تھی کہ کب واپس آنا ہے؟"

"انہوں نے کہا تھا کہ جیادہ سے جیادہ ڈیگر (عصر) کی اجان تک آجائیں گی۔ اب تو شام بھی کافی دیر کی ہو گئی ہوئی ہے۔"

"کوئی ڈھونڈنے گیا ہے؟"

"نصر اللہ صاحب گئے ہیں جی، پانچ چھ بندوں کو لے کر۔ اللہ کھیر کرے، ابھی تک وہ بھی واپس نہیں آئے۔"

"بیگم جی کے ساتھ کون ہے؟"

"ملاجمہ تاجو ہے جی۔ صوفی اسلم گاڑی چلا رہا ہے۔ چار بندے حفاجت کے لئے ساتھ ہیں۔ ان میں شبیر صاحب بھی ہیں۔"

میں گلزار کے ساتھ حویلی کی طرف گیا۔ چودھری عزیز باہر ہی نظر آگیا۔ وہ بھی کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"کچھ پتا چلا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی تک تو نہیں۔ میں نے سات آٹھ بندوں کو گھوڑے دے کر اور بھیجا ہے۔"

رات بے حد تاریک اور سرد تھی۔ یخ بستہ ہوا ہڈیوں میں گھس رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ مزید گزر گئے۔ جو چھ گھڑ سوار سب سے پہلے سالار نصراللہ کے ساتھ گئے تھے ان میں سے دو واپس آ گئے اور انہوں نے بتایا کہ روہی پور تک انہوں نے سارا راستہ دیکھ لیا ہے۔ بیگم جی کی گاڑی کہیں نہیں۔۔۔۔ روہی پور سے وہ تین بجے کے قریب نکل گئی تھیں۔

یہ اطلاع زیادہ پریشان کر دینے والی تھی۔ میں نے اسی وقت جیپ پکڑی اور خود بھی تلاش میں نکل گیا۔ ذہن میں ان گنت اندیشے سر اٹھا رہے تھے اور بڑا اندیشہ موکھل پاشا کی طرف سے ہی تھا۔ اپنے ایک خفیہ گماشتے بہرام کی مدد سے وہ ایک بار پہلے بھی بلقیس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر چکا تھا۔ میرا دماغ کھولنے لگا۔ اگر موکھلوں کی طرف سے کوئی ایسی حرکت ہوئی تھی تو پھر اس کا نتیجہ بڑا سنگین نکلنا تھا۔ لیکن ابھی پہلے سے ہی کوئی حتمی رائے قائم کر لینا بھی مناسب نہیں تھا۔ موکھلوں کے لئے یہ کام ہر گز آسان نہیں تھا کہ براہِ راست بلقیس پر ہاتھ ڈال کر پورے علاقے کو اپنے خلاف کر لیتے۔

احتیاط کے طور پر میں نے بھی راجوال سے روہی پور تک کا سارا راستہ دوبارہ دیکھا۔ پھر میرے ذہن میں آیا کہیں وہ روہی پور سے نکووال کی طرف نہ چلی گئی ہو۔ وہاں اس کے پھوپھا پھوپھی اور دو بھائی بھی رہتے تھے۔ اسی خیال کے تحت میں نے اپنی لینڈ کروزر روہی پور سے نکووال کی طرف موڑ دی۔ یہ سخت خراب اور قدرے ویران رستہ تھا۔ دونوں طرف کیکر کے درخت تھے اور ان سے آگے مکئی اور کماد کے کھیتوں پر دھند کی چادر تھی۔ بس کہیں کہیں کسی ٹھٹھرے ہوئے آلاؤ کی روشنی نظر آتی تھی۔ میں ڈھائی تین میل گیا ہوں گا کہ اچانک مجھے حویلی کی جیپ نظر آ گئی۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک بندہ جیپ کے نیچے گھسا ہوا تھا۔ محافظ گھڑ سوار دائیں بائیں کھڑے تھے۔ میری جیپ کی روشنی سیدھی دوسری جیپ کے اندر پڑی۔ وہاں بلقیس اور تاجو کی موجودگی کو محسوس کر کے میں نے اطمینان کی سانس لی۔ گلزار نے حامد کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن وہ بھی جیپ میں موجود تھا۔

"یہ کیا تماشا ہے شبیر؟" میں نے جیپ سے اترتے ہوئے کہا۔ "وہاں ہم تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو رہے ہیں۔ تم لوگوں کو کم از کم گاؤں میں اطلاع تو پہنچانی چاہئیے تھی۔"

شبیر نے کہا۔"ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے میں نے فتح محمد کو بھیج دیا تھا۔میرا خیال ہے کہ وہ پہنچ گیا ہوگا۔"

"لیکن وہاں تو عصر کے وقت سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔"

"دراصل ہم شادی سے جلدی فارغ ہو گئے تھے۔ بیگم جی نے سوچا کہ وہ نکووال کا ایک چکر لگالیں۔ نکووال سے واپسی پر یہاں پہنچے تو گاڑی کی بیلٹ ٹوٹ گئی۔ابھی دس منٹ پہلے اسلم بیلٹ لے کر آیا ہے لیکن۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"یہ بیلٹ بھی کام نہیں کر رہی۔ شاید بدل کر آنی پڑے یا پھر بیرنگ کا تعلق ہے۔"

مجھے سخت جھلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے حامد سے کہا۔"حامد! چلو آؤ۔اس دوسری گاڑی میں آجاؤ۔"

بلقیس تذبذب میں نظر آئی۔اس نے ابھی تک مجھ سے بات نہیں کی تھی۔حامد نے بلقیس کی طرف دیکھا۔بلقیس نے تاجو سے مخاطب ہو کر ہولے سے کچھ کہا۔تاجو بولی۔"بیگم جی کا خیال ہے کہ ابھی گاڑی ٹھیک ہو جائے گی۔اسی میں آجائیں گے۔"

"اس کا ابھی کچھ پتا نہیں کہ کب ٹھیک ہو گی۔ یہاں رُکنا خطرناک ہے۔ تم لوگ دوسری گاڑی میں آجاؤ۔"میں نے ذرا تحکم سے کہا۔شبیر نے بھی میری تائید کی۔

کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بلقیس دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ایک پھولدار گرم شال نے بلقیس کو سر سے گھٹنوں تک لپیٹا ہوا تھا۔وہ،حامد اور تاجو میری جیپ میں بیٹھ گئے۔حامد میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا،تاجو اور بلقیس پچھلی سیٹوں پر۔میں نے ایک مسلح محافظ کو صوفی اسلم کے پاس چھوڑ دیا۔باقی دونوں محافظ گھوڑوں پر سوار میری جیپ کے عقب میں چل دیئے۔سفر خاموشی سے ہوتا رہا۔آخر حامد نے پوچھا۔"کیا بات ہے چاچو! آپ ناراض ہیں؟آپ بول کیوں نہیں رہے؟"

"اب تک میں ہی تو بولتا رہا ہوں۔تم کون سا بولے ہو؟"

اس نے کہا۔ "شاید آپ امی کی بات کر رہے ہیں۔" پھر وہ بلقیس کی طرف مڑ کر بولا۔ "امی! آپ بات کیوں نہیں کر رہیں؟ کیا آپ دونوں کی آپس میں کوئی لڑائی ہے؟"

"نہیں۔" بلقیس نے مختصراً جواب دیا۔

"تو پھر چپ کیوں ہیں؟ یہاں چاچی شہوار تو نہیں ہے جو آپ دونوں کے بولنے پر رولا ڈالا شروع کر دے گی۔" حامد نے کہا۔

"کتنی بار کہا ہے، ایسی باتیں نہیں کرتے۔" بلقیس نے اسے ڈانٹا۔ میں نے عقب نُما آئینے میں دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سُرخ تھا۔ پھر وہ خود کو پُر سکون کرتے ہوئے بولی۔ "بس غلطی ہو گئی۔ میں نے سمجھا تھا، ہم شام گہری ہونے سے پہلے واپس پہنچ جائیں گے۔ خوامخواہ سب کو پریشانی ہوئی۔" اس نے جملہ تو ادا کیا تھا لیکن اس طرح جیسے کسی کو بھی مخاطب نہ کیا ہو۔

"حالات ٹھیک نہیں۔ سفر کرتے ہوئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

تھوڑی تھوڑی بات چیت شروع ہوئی تو پھر باتیں ہونے لگیں۔ تاہم بلقیس کے لہجے میں بہ دستور بے گانگی اور گہری سنجیدگی رہی۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ شادی میں شرکت

کے فوراً بعد ڈھائی بجے کے قریب وہ روانہ ہو گئی تھی۔ راستے میں اس نے تھوڑی دیر کے لیے نکووال جانے کا سوچا۔ اس کے دونوں بھائی آپس میں لڑ پڑے تھے۔ بیویوں نے لگائی بجھائی کی تھی۔ وہ ان میں صلح کرانے گئی تھی۔

میری نگاہیں عقب نُما آئینے میں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اس کی اتنی بڑی عمر نہیں تھی جتنی بڑی ذمہ داریاں اس پر عائد ہو گئی تھیں۔ وہ اب بھی جواں سال نظر آتی تھی۔ جیپ کی ایک چھوٹی اندرونی روشنی آن تھی۔ اس روشنی میں اس کا چہرہ آدھے چاند کی طرح نظر آتا تھا۔ آدھا چہرہ چمکیلے کنارے والی اوڑھنی کے پیچھے اوجھل تھا۔ جیپ ذرا ہچکولا کھاتی تھی تو ناک کا کوکا لشکارا مارتا تھا۔ میں نے خاموشی کی زبان میں خود سے کہا۔ "خاور! کسی وقت یہ چہرہ اور یہ کوکا تجھ سے کتنا قریب تھا۔ آج تیرے اور اس کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔"

مجھے اپنے ہونٹوں پر کوکے کی میٹھی چبھن محسوس ہوئی اور وہ خوشبو تصور میں آئی جو ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا کرتی تھی۔

پھر جیسے ایک دم میں نے خود کو سنبھالا۔ یہ میں کیا کر رہا تھا۔ کیوں اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ رہا تھا۔ اب جس رُخ پر جانا ہی نہیں تھا، اس رُخ کے بارے میں سوچنے کا کیا فائدہ؟ میں نے اپنی تمام توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی اور حامد سے باتیں کرنے لگا۔ کبھی کبھی بلقیس نے بھی کوئی فقرہ بولا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ اماں دلشاد کی بیٹی ثمینہ کے لیے بھی کوئی بر دیکھ رہی ہے۔ اور امید ہے کہ جلد ہی اس کے ہاتھ پیلے ہو سکیں گے۔

حویلی کے بڑے دروازے پر پہنچ کر جیپ رکی۔ ہانپتے ہوئے گھوڑے بھی عقب میں رک گئے۔ چودھری عزیز اور یعقوب وغیرہ تک یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ بلقیس کے لیٹ ہو جانے کی وجہ جیپ کی خرابی ہے۔ میں نے بلقیس، حامد اور تاجو کو جیپ سے اتارا۔ یہی وقت تھا جب میری نظر کچھ فاصلے پر واقع اپنے حویلی نُما گھر پر پڑی۔ حویلی کی چھت پر میں نے ایک سائے کو منڈلاتے دیکھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ شہوار کی ملازمہ خاص رشیداں عرف شیداں ہے۔

میں گھر پہنچا تو شہوار کا چہرہ دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کا موڈ سخت خراب ہو چکا ہے۔ یقیناً اسے اس بات کی خبر ہو گئی تھی کہ بلقیس میرے ساتھ جیپ پر آئی ہے۔

"ہاں، کیا پکا ہے آج؟" میں نے نارمل انداز میں پوچھا۔

"تم نے گھر کی روٹی کو کیا کرنا ہے۔ تمہیں تو باہر سے ہر شے مل جاتی ہے۔" وہ عجیب لہجے میں بولی۔

"میں سمجھا نہیں تمہاری بات؟"

"جس کے ساتھ آئے ہو، اس کے ساتھ بیٹھ کر روٹی شوٹی بھی کھا لینی تھی۔۔۔۔ بلکہ سو بھی اس کے پاس رہنا تھا۔" شہوار کے لہجے میں زہر ابلا پڑ رہا تھا۔

"شہوار! تم سے ہزار دفعہ کہا ہے کہ منہ سنبھال کر بات کیا کرو۔ مجبوری تھی جس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ واپس آئی ہے اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ حامد اور تاجو بھی ساتھ تھے۔" میں نے سخت غصے میں کہا۔

"حامد ساتھ نہیں تھا۔ مجھے خود گلزار نے بتایا ہے۔۔۔۔ اور تاجو کے ساتھ ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں جو گند مچاتے رہے ہیں، تاجو بھی ان میں شامل رہی ہے۔ مجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔"

"کون کہتا ہے کہ حامد ساتھ نہیں تھا۔ تم پوچھ لو جا کر حویلی میں۔ اور میں پھر کہتا ہوں، ہوش سے بات کیا کرو۔ جو منہ میں آئے بک نہ دیا کرو۔"

"میں ہوش سے بات کرتی ہوں۔" وہ پھنکاری۔ "اور باقی دنیا کو بھی ہوش ہے۔ اگر ہوش نہیں ہے تو تمہیں نہیں ہے یا پھر اس کو نہیں ہے۔ میں سمجھ گئی ہوں، اس کتی نے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑنا۔ اس نے تم سے ملنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈتے رہنا ہے۔"

"شہوار!" میں گرجا۔ "خبردار جو اسے گالی دی تو۔۔۔۔" میں اب بھی ضبط کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیوں گالی نہ دوں اس حرام زادی کو۔ وہ میرا گھر برباد کر رہی ہے۔ وہ بدمعاش زنانی ہے، وہ گھر کھانے والی ڈائن ہے۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔"

میرا تھپڑ شہوار کے گال پر پڑا اور وہ اچھل کر بیش قیمتی مسہری پر جا گری۔ تھپڑ کھانے کے بعد اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلائی۔ "ہاں ہاں، مارو مجھے۔۔۔۔ اس کتی کے لیے مجھے جان سے مار دو۔ ٹوٹے ٹوٹے کر دو میرے۔"

"چپ ہو جا۔ میں کہتا ہوں چپ ہو جا۔" میں نے اس کا منہ دبایا۔

اس نے ایک جنونی جھٹکے سے خود کو چھڑایا اور زیادہ زور سے چلائی۔ "میں چپ نہیں رہوں گی۔ آج میں سب کو بتاؤں گی۔ ایک ایک کو بتاؤں گی۔ وہ حرام زادی تمہارے ساتھ مل کر یہاں کیا گندا کھیل کھیل رہی ہے۔"

وہ واقعی دروازے کی طرف بڑھی، جیسے سب کے سامنے باہر جا کر واویلا کرنا چاہتی ہو۔ بے بے جی نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اس کے جواں جسم میں کہیں زیادہ طاقت تھی۔ بے بے جی کا بوڑھا ناتواں جسم لڑکھڑا کر دور جا گرا۔ میں نے اسے دوبارہ پکڑ لیا۔ گھر کے تمام مکین جمع ہو چکے تھے۔ بلند آوازیں سن کر باہر کھڑے گارڈ بھی اندر جھانک رہے تھے۔

شہوار پوری طاقت سے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ہی بلقیس اور بے بے جی کے لیے بدترین الفاظ استعمال کر رہی تھی۔

میں نے پھر اس کا منہ اپنے ہاتھ سے ڈھانپ دیا اور دہاڑ کر کہا۔ "چپ ہو جا۔۔۔۔ نہیں تو میں تجھے جان سے مار دوں گا۔"

اسی دوران میں چودھری عزیز اور رونق علی بھی گھبرائے ہوئے اندر آ گئے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے شہوار کو سنبھالا اور کھینچ تان کر اندرونی کمرے میں لے گئے۔ وہ مسلسل بول رہی تھی۔

کچھ دیر بعد رونق علی نے آ کر مجھے بتایا۔ وہ ابھی اور اسی وقت واپس قلعہ والا جانا چاہتی ہے۔ اسے کسی بھی طرح روکنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ نہیں تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔

ہو جائے جو گڑبڑ ہونی ہے۔ اسے کہو دفع ہو جائے یہاں سے۔" میں نے بھی تپ کر کہا۔

"زیادہ گرمی ٹھیک نہیں خاور! تمہیں پتا ہی ہے جس طرح کے حالات شالات ہیں۔ تم خود کو ٹھنڈا کرو۔ ہم اسے بھی ٹھنڈا شنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"بس میں تمہیں ایک بات بتا دوں رونق بھائی۔ اگر وہ بے بے جی یا بلقیس کے بارے میں کوئی غلط لفظ بولے گی تو میں برداشت نہیں کروں گا۔"

"میں نے اسے یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ تم حوصلہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں اوپر چھت پر چلا گیا۔ نیچے چودھری عزیز، چودھری یعقوب اور رونق علی وغیرہ اسے سمجھانے میں لگے رہے۔ دس بجے کے قریب رونق اوپر چھت پر آیا اور اس نے بتایا کہ وہ کسی حد تک سنبھل گئی ہے۔ کم از کم اتنا تو ہوا کہ فوری طور پر قلعہ والا واپس جانے سے رک گئی ہے۔ صبح اس سے مزید بات کریں گے۔

"میں نے کہا۔ "رونق بھائی! اس کے زیادہ پیچھے لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اسے اس گھر میں رہنا ہے تو پھر اسے خود کو بدلنا پڑے گا۔ یہ بات تم چودھری عزیز کو بھی بتا دو۔ اگر اس نے ذرا ذرا سی بات پر شک کرنا ہے اور طوفان اٹھانا ہے تو پھر ابھی یہاں سے چلی جائے۔"

میں اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ بے بے جی کو گرنے سے تھوڑی بہت چوٹیں آئی تھیں۔ میں نے ان کو دوا کھلائی۔ تھوڑا سا ٹرنکولائزر پلایا۔ اماں دلشاد کی بیٹی ثمینہ بھی ہمارے گھر آئی ہوئی تھی۔ وہ ان کی ٹانگیں دباتی رہی۔ وہ کچھ دیر بعد سو گئیں۔ تو میں بھی ان کے ساتھ والے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ شہوار اپنے کمرے میں تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے اونگھ سی آئی۔ اچانک آہٹ سی ہوئی اور میں پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آہٹ میرے کمرے کی طرف ہوئی تھی۔

میں نے دبے پاؤں جا کر ادھ کھلی کھڑکی سے دیکھا۔ کمرے میں گیس لیمپس کی روشنی تھی۔ شہوار نے گرم شال لی ہوئی تھی اور کہیں جانے کے لئے تیار نظر آتی تھی۔ پہلا خیال تو ذہن میں یہی آیا کہ شاید اس نے ارادہ بدل دیا ہے اور ابھی اپنے باپ کے گھر قلعہ والا روانہ ہو رہی ہے لیکن اس کے آس پاس کہیں سامان نظر نہیں آیا۔ ویسے بھی ہر طرف خاموشی تھی۔ ملازمہ خاص شیداں بھی سوئی ہوئی تھی۔ دفعتاً ایک خیال تیر کی طرح ذہن میں پیوست ہو گیا۔ کہیں یہ بلقیس سے بدکلامی کرنے کے لئے حویلی تو نہیں جا رہی تھی؟ حویلی زیادہ دور بھی نہیں تھی بس چند قدم کا فاصلہ تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں جلدی سے کمرے میں چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں میری مرضی ہے۔ میں جاؤں گی۔ تم بھی جہاں تمہاری مرضی ہوتی ہے، جاتے ہو۔ وہ پھنکاری۔

"میرے سوال کا جواب دو۔ اس وقت کہاں جا رہی ہو اکیلی؟"

وہ چند لمحے مجھے آتشیں نظروں سے دیکھتی رہی پھر سینہ تان کر بولی۔ "میں اس کی طرف جا رہی ہوں جس نے میری زندگی برباد کی۔ میں آج اس سے صاف بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس کے اندر جیسے جوالا مکھی دہک رہا تھا۔

میری رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ میں نے اس کے سامنے آتے ہوئے کہا۔ "تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

"میں تمہاری غلام نہیں ہوں۔ میرا حق ہے اس "گھٹیا" سے پوچھنے کا کہ وہ میرے گھر کو دوزخ کیوں بنا رہی ہے۔ اگر اس کے اندر اتنی ہی آگ لگی ہوئی ہے تو خصم کیوں نہیں کر لیتی۔ مربعوں کی مالک ہے۔ درجنوں مل جائیں گے اس کے بھانبھڑ کو ٹھنڈا کرنے والے۔ اس نے میرا ہی گھر کیوں چنا ہوا ہے۔"

ایک بار پھر مجھ سے شہوار کے یہ نہایت زہریلے الفاظ برداشت نہیں ہوئے۔ میں نے ہاتھ گھمایا اور چٹاخ سے ایک اور شہوار کے گال پر پڑا۔ اس کے بال کھل گئے اور ایک جھمکا اتر کر دور جا گرا۔ وہ کراہ کر دیوار کے قریب جا گری تھی۔ اس مرتبہ اس نے واویلا نہیں کیا۔ اس کی آنکھوں میں شدید ہیجانی کیفیت نمودار ہوئی اور وہ دیوار کی طرف جھپٹی۔

یہاں دیوار پر ایک دونالی رائفل اور دو خنجر آویزاں تھے۔ شہوار نے ایک خنجر اتار لیا۔

"میں اپنی جان لے لوں گی۔ میں تمہارا اور اس کا کلیجا ٹھنڈا کر دوں گی۔" وہ دھیمی مگر نہایت سنگین آواز میں پھنکاری۔

میں نے لپک کر اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ لیا۔ "چھوڑ دو مجھے۔" وہ زور لگاتے ہوئے بولی۔

اس کے تاثرات خطرناک تھے۔ یہ کند خنجر تھا، یعنی دھار بہت تیز نہیں تھی تاہم وہ اس سے خود کو زخمی تو کر ہی سکتی تھی۔

میں نے زور لگا کر خنجر لینا چاہا تو وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی گرا۔ گرتے ہوئے شہوار کا سر پلنگ کے وزنی پائے سے ٹکرایا۔ یہ کافی شدید تصادم تھا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ ایک گھمبیر کراہ نکلی۔ ایک دم میں نے محسوس کیا کہ شہورا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں الٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

میں نے اسے جھنجھوڑا۔ یوں لگا کہ وہ نیم بے ہوش ہو گئی ہے۔ میں نے اس کا سر ٹٹولا۔ چوٹ عقبی حصے میں لگی تھی۔ مجھے اپنی انگلیوں کی پوروں پر خون کی ہلکی سی نمی محسوس ہوئی۔ میں

نے اسے اٹھا کر بٹھایا اور پھر بازوؤں میں لے کر بستر پر پہنچا دیا۔ وہ جیسے نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہ رہی تھی۔ گیس لیمپ کی روشنی میں، میں نے اس کا سر دیکھا۔ عقبی حصے میں کنپٹی سے ذرا پیچھے گومڑ سا بن گیا تھا۔ اس گومڑ میں سے خون بھی رِس رہا تھا۔ تاہم یہ بہنے والا خون نہیں تھا۔

میں نے خنجر کو فرش سے اٹھا کر دوبارہ دیوار پر لگایا اور کمرے کی کھڑکی بند کر دی۔ اس سے پہلے جب شہوار فرش پر گری تھی، میں نے محسوس کیا تھا کہ کوئی کھڑکی کے آس پاس موجود ہے یا شاید یہ صرف میرا وہم تھا۔

کھڑکی بند کر کے اور دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر میں پھر شہوار کے پاس آگیا۔ میں نے مخمل کا لحاف اچھی طرح اس کے جسم پر ڈالا۔ اس کے سر کا گومڑ بھی کچھ بڑا ہو گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی میں کراہنے لگی۔ "میں مر جاؤں گی۔۔۔۔۔ یا میں اسے مار دوں گی۔۔۔۔۔ ہم دونوں میں سے۔۔۔۔۔ ایک رہے گی۔۔۔۔ ایک رہے گی۔"

میں نے اسے پانی پلانا چاہا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ "میں تمہاری کچھ نہیں ہوں۔۔۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔ مجھے مر جانے دو۔"

اس کے جسم کی لرزش سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سخت تکلیف میں ہے۔ جہاں سے خون رس رہا تھا، وہاں میں نے پاؤڈر کا چھڑکاؤ کیا۔ کونے میں رکھی انگیٹھی ابھی بجھی نہیں تھی۔ میں اسے پلنگ کے قریب لے آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ شہوار کو چوٹ لگنے کے بعد میری ساری کیفیت بدل گئی تھی۔ غصے کے بجائے مجھے اس پر ترس آرہا تھا۔ اپنے جوش اور کچے پن کی وجہ سے وہ بہت غلط اندازے لگا رہی تھی اور بالکل غلط رُخ پر جا رہی تھی۔

اب رات کے تقریباً بارہ بج چکے تھے۔ ارد گرد مکمل خاموشی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ تھوڑی دیر پہلے میرے اور شہوار کے درمیان جو کشمکش ہوئی ہے، اس کی خبر کمرے سے باہر نہیں ہوئی۔

میں نے دونوں گیس لیمپس کی روشنی بالکل مدھم کر دی۔ میں پلنگ پر شہوار کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ایک کپڑے کی میں نے گدی سی بنائی۔۔۔ اور اس گدی کو انگیٹھی پر سینک سینک کر شہوار کے سر کے ابھار کی ٹکور کرنے لگا۔

وہ پہلے تو میری اس ہمدردی کو قبول کرنے سے انکار کرتی رہی مگر جب میں نے زبردستی اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تو وہ ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کا شدید غصہ آنسوؤں میں ڈھل گیا اور اس کے رخسار پر بہنے لگا۔

کمرے سے باہر راجوال کی گلیوں میں تاریک سناٹے کا راج تھا۔ کھیت کھیت، کھلیان کھلیان سردی نے پنجے گاڑے ہوئے تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "شہوار! جو تم کہو گی، وہی ہو گا۔ اگر تم کہتی ہو تو ہم یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ نکووال یا مکھن وال میں گھر بنا لیتے ہیں۔۔۔۔ یا کوئی اور تجویز تمہارے دماغ میں ہو؟ جو بھی ہے مجھے بتا دو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس آتشیں آنسو گراتی رہی۔ میں اس کے سر کے ابھار کو سینکتا رہا۔۔۔ اور تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے اندر کا ابال کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ اس کا سر بدستور میرے زانو پر تھا۔ دھیرے دھیرے وہ سو گئی۔

میں نے آہستہ سے اس کا سر تکیے پر رکھ دیا۔ خون کے داغوں والا تکیہ میں نے بدل دیا تھا۔۔۔ اسے مکمل آرام کی ضرورت تھی۔۔۔۔ میں ساتھ والے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

میں ہر گز نہیں چاہتا تھا کہ اس نئے واقعے کی خبر قلعہ والا تک پہنچے اور نئی چپقلش پیدا ہو۔ اور اب بات کی امید پیدا ہو گئی تھی کہ یہ خبر یہیں تک محدود رہے گی۔ زیادہ خطرہ شہوار کی ملازمہ شیداں سے ہی ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ وفادار بھی بہت تھی۔ شہوار اسے ایک بار منع کر دیتی تو پھر اس کی زبان پر تالا لگ جاتا تھا۔

مجھے صبح جلدی جانا تھا۔ گوجرانوالہ میں میری ایک تاریخ تھی۔ یہ وہی رائل بنگلہ ٹائیگر کو شوٹ کرنے والا کیس تھا۔ اس میں مجھ پر تین چار دفعات لگی تھیں۔ دیوار پھاند کر کارخانے میں داخل ہونے، آتشیں اسلحے سے ہراس پھیلانے اور زخمی کرنے، ملکیتی جانور کو بے رحمی سے ہلاک کرنے کی مختلف دفعات لگائی گئی تھیں۔ یہاں تک کہ سرقہ بالجبر کی دفعہ 390 اور بے رحمیء جانوراں کے ایک سو سال پرانے ایکٹ کی دو مضحکہ خیز دفعات بھی ٹھونک دی گئی تھیں۔

میں منہ اندھیرے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ راستے میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے مجھے موضع فاضل پور کے قریب بھی رکنا تھا اور وہاں اپنی زمین پر فصل کی بوائی کا جائزہ لینا تھا۔ میں نے دوسرے کمرے میں جھانکا۔ لحاف کے نیچے شہوار نیند کی حالت میں تھی۔ میں نے اس کے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

آرام میں مخل ہونا بہتر نہیں سمجھا۔ بے بے جی نماز کے لیے جاگ چکی تھیں۔ میں نے انہیں شہوار کی چوٹ کے بارے میں مختصراً بتایا اور اس حوالے سے انہیں ضروری ہدایات دے کر روانہ ہو گیا۔

تیمور میرے ساتھ تھا۔ ہم جیپ پر روانہ ہوئے۔ ابھی اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا کہ ہم موضع فاضل پور پہنچ گئے۔ یہاں ہل چلائے جانے کے بعد زمین ہموار کرنے کے لئے سہاگا پھیرا جا رہا تھا۔ دو ٹریکٹر اس کام میں مصروف تھے۔ قریباً تیس ایکڑ زمین کے لیے دوائی لگے بیجوں کی بوریاں وہاں پہنچ چکی تھیں۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے پڑھے لکھے ہونے کا کوئی فائدہ ہو۔ میں کھیتی باڑی میں تھوڑا سا نیا پن لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چودھری عزیز کو بھی یہ کوششیں پسند آئی تھیں۔

مجھے اور تیمور کو پراٹھے، انڈے اور لسی، مکھن کا ناشتا کرایا گیا۔ کاشت کاروں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد میں آگے روانہ ہو گیا۔ ہماری جیپ میں کچھ گنے اور مکئی کے بھٹے وغیرہ رکھ دیئے گئے تھے۔ ابھی ہمیں چلتے ہوئے بیس پچیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ عقب میں گرد

نظر آئی۔ یوں لگا جیسے کچھ لوگ ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔ یہ چند گھوڑے تھے اور ایک کھٹارا سی جیپ تھی۔

"میرا خیال ہے، پولیس والے ہیں۔" تیمور نے کہا۔

میں نے دھیان سے عقب میں دیکھا۔ کھلی جیپ کے اندر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ "ایس ایچ او میاں وارث بھی ساتھ ہے۔" میں نے بتایا۔

"یہ صبح صبح کہاں سے اٹھ پڑے ہیں؟" تیمور کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ وہ گنا چوس رہا تھا۔

چند ہی لمحوں میں یہ لوگ ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ ہم نے جیپ آہستہ کر دی۔ "رک جاؤ خاور!" میاں وارث کی گرجدار آواز سنائی دی۔

میں نے جیپ روک دی۔ دائیں طرف کیکر کے کچھ درخت تھے اور ایک کنواں تھا۔ پولیس کی کھٹارا کالی جیپ بھی رک گئی تھی۔ اس کے پیچھے چار پانچ ہانپتے ہوئے گھوڑے بھی ٹھہر گئے۔ جیپ میں سے ایس ایچ او میاں وارث کے اترنے کے انداز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ توند ہلاتا ہوا سیدھا میرے پاس آیا۔ اس نے ہولسٹر میں سے پستول نکال کر میری طرف سیدھا کر

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

لیا تھا۔ گھوڑوں سے بھی اہلکار چھلانگیں لگا کر اترے۔ ایک سیون ایم ایم کی رائفل بھی میں نے اپنے سینے کی طرف اٹھتی ہوئی دیکھی۔

"خیریت ہے وارث صاحب؟" میں نے کہا۔

"تمہیں بھی پتا ہو گا کہ خیریت ہے یا نہیں ہے؟" میاں وارث کا لہجہ ہیجانی تھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

ایک لمبا تڑنگا ہیڈ کانسٹیبل آگے آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی کھڑکھڑا رہی تھی۔ "یار محمد! ہتھکڑی لگاؤ اسے۔" ایس ایچ او میاں وارث نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے تم مجھے بتاتے کیوں نہیں ہو؟" میں نے طیش میں پوچھا۔

"میں تمہیں اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔" میاں وارث کا چہرہ بے رحم تھا۔ میری سانس جیسے سینے میں اٹک گئی۔ پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میں نے سکتہ زدہ لہجے میں کہا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو وارث؟ کیا ہوا ہے۔۔۔۔ شہوار کو؟"

"وہی جو تم نے اس کے ساتھ کیا ہے۔۔۔۔اور بھاگ رہے ہو۔۔۔۔اس کی لاش پچھلے کمرے میں چارپائیوں کے پیچھے سے مل گئی ہے۔"

"کیا بک رہے ہو۔ کس کی لاش؟ میں اسے زندہ سلامت چھوڑ کر آیا ہوں۔" میں سینے کی پوری قوت سے دھاڑا۔

"جس کے پنڈے پر چاقو کے چھ پھٹ لگے ہوں، وہ زندہ کیسے رہ سکتا ہے؟" وارث کا چہرہ زہرناک تھا، پھر وہ اپنے عملے سے مخاطب ہو کر پھنکارا۔ "اوئے! دیکھتے کیا ہو، ہتھکڑی لگاؤ اس سورمے کو۔"

ہیڈ کانسٹیبل میری طرف بڑھا۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "خبردار! جو کوئی میرے پاس آیا تو۔ میں کیوں لگواؤں ہتھکڑی؟ میں نے کیا جرم کیا ہے؟ ایک طرف تم مجھے میری بیوی کی موت کی خبر سنا رہے ہو اور دوسری طرف ہتھکڑی بھی مجھے لگا رہے ہو۔ مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں ہو رہا۔ تم کوئی چال چل رہے ہو۔ میں اسے دو گھنٹے پہلے زندہ چھوڑ کر آرہا ہوں۔" میری آواز شدتِ جذبات سے لرز رہی تھی۔ ارد گرد کی ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"تمہاری بیوی مر چکی ہے شاہ خاور! اس کی لاش تمہارے گھر میں پڑی ہے۔ اب اس کا فیصلہ عدالت کرے گی کہ قاتل تم ہو یا کوئی اور۔" سب انسپکٹر رمضان نے کہا۔

"کیا تم نے خود اس کی لاش دیکھی ہے؟" میں نے سخت ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

"دیکھی ہی نہیں ہے، اسے اپنے ہاتھوں سے نکالا بھی ہے۔ ہم تمہیں گرفتار کرنے پر مجبور ہیں۔" سب انسپکٹر رمضان نے کہا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ ایس ایچ او وارث بار بار عقب میں دیکھ رہا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے پیچھے مزید کمک آرہی ہے۔ غالباً وہ وقت ضائع کیے بغیر تھوڑی نفری کے ساتھ پہلے نکل آیا تھا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور اپنا اندیشہ درست محسوس ہوا۔ قدرے نشیب میں تقریباً ایک کلومیٹر کی دوری پر گھوڑوں کی اڑاتی ہوئی گرد دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً مزید مسلح افراد یہاں پہنچ رہے تھے۔

میرے دل نے پکار کر کہا۔ "شاہ خاور! تم کسی نہایت سنگین چکر میں پھنس چکے ہو۔ شہوار واقعی مر چکی ہے اور اس کے قتل کا الزام تم پر آچکا ہے۔ تم اس وقت پکڑے گئے تو پھر شاید

طویل مدت تک اپنے سر پر کھلا آسمان نہ دیکھ سکو۔۔۔۔اور یہ بھی ممکن ہے آزادی کا سورج ہمیشہ کے لیے تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جائے۔"

"یہ بڑے قیمتی لمحے ہیں خاور۔ان میں کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔" دل نے پھر کہا۔

"فی الوقت تمہارے سامنے صرف ایک پستول اور ایک رائفل ہے۔ابھی چند منٹ میں ہو سکتا ہے کہ کئی رائفلیں تمہاری اور تیمور کی طرف اٹھی ہوئی ہوں۔"

"بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ خاور۔" میرے اندر پکارتی ہوئی آواز نے کہا۔

وہ بڑے فیصلہ کن لمحے تھے۔میری نگاہ ایک ساعت کے لیے تیمور کی نگاہ سے ٹکرائی۔وہ میرا لنگوٹیا یار تھا۔میری ہر رمز جانتا تھا۔اس ایک ساعت میں ہی وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔شاید اصل ٹیلی پیتھی یہی ہوتی ہے۔جب ایک دوسرے کے مزاج آشنا بغیر کسی وسیلے کے، کسی مبہم کنایے کے ذریعے ایک دوسرے کی بات سمجھ جاتے ہیں۔

تیمور کے ہاتھ میں ابھی تک ہری چھال کا مضبوط گنا موجود تھا۔اس نے ایک بھڑک سی ماری اور گنا پوری طاقت سے گھما کر ایس ایچ او میاں وارث کے ہاتھ پر رسید کیا۔میں نے سیاہ رنگ کا پستول میاں وارث کے ہاتھ سے نکلتے اور زمین پر گرتے دیکھا۔

اسی ساعت میں، میں اس تنومند ہیڈ کانسٹیبل پر حملہ آور ہوا جس نے سیون ایم ایم رائفل میری طرف اٹھا رکھی تھی۔میں نے اس کی رائفل کی نال اوپر کر دی اور اسے پوری قوت سے دھکیلتا چلا گیا۔ہیڈ کانسٹیبل کی رائفل سے فائر ہونے والی گولی ایک دھماکے کے ساتھ ہوا میں پرواز کر گئی۔وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔اس کے عقب میں کیکر کا درخت تھا اور کنواں تھا۔وہ ڈکراتا ہوا کنوئیں کے اندر گر گیا۔اس کے پانی میں گرنے کی آواز کافی زوردار تھی۔اس کی رائفل بھی اس کے ساتھ ہی گئی تھی۔

تیمور ایس ایچ او کا زمین پر گرا ہوا پستول اٹھا چکا تھا۔"آجا خاور۔" اس نے جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے پکارا۔

ہمارے ارد گرد جو پانچ اہلکار تھے،ان کے ہاتھوں میں بس لاٹھیاں ہی تھیں۔ایک اہلکار نے ہمت کر کے مجھ پر لاٹھی سے وار کیا۔میں نے جھکائی دے کر یہ وار بچایا اور ٹانگ رسید کر کے اسے کئی فٹ دور پھینک دیا۔"آجا خاور۔" تیمور کی آواز پھر سنائی دی۔

میں جست لگا کر جیپ پر سوار ہوا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ انجن ابھی تک سٹارٹ تھا۔ میاں وارث اضطراری طور پر دو قدم جیپ کی طرف بڑھا۔

"خبردار اوئے۔۔۔۔ گولی مار دوں گا۔" تیمور خطرناک لہجے میں گرجا۔

میاں وارث کی توند تھر تھرا کر رہ گئی۔ وہ اپنی جگہ رک گیا۔ کنوئیں کے اندر سے ہیڈ کانسٹیبل کی آوازیں آرہی تھیں۔ "اوئے میں مر گیا۔۔۔۔ اوئے مجھے بچاؤ۔"

میں نے گئیر لگا کر ایکسلریٹر دیا اور جیپ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح کچے راستے پر بڑھی۔ یہ میرے جانے پہچانے راستے تھے اور خون میں جیسے آگ بھڑکی ہوئی تھی، میں جیپ کو اڑاتا چلا گیا۔

"میرا خیال ہے وہ اپنی جیپ پر پیچھے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"جیپ چلے گی تو پیچھے آئیں گے۔" تیمور نے کہا اور پولیس جیپ کی چابی میرے سامنے لہرائی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

یہ کام اس نے زبردست کیا تھا، اپنی جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے پولیس جیپ کی اگنیشن میں سے چابی نکال لی تھی۔

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ چڑھتے سورج کی روشنی میں گرد کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اگر کوئی پیچھے آ بھی رہا تھا تو اس گرد کی دوسری طرف تھا اور ہم سے کافی دور تھا۔

"یار تومی! یہ کیا ہو گیا ہے؟" میں نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔

"ابھی تک کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" تیمور کی آواز بھی دکھ کے بوجھ سے چیخ رہی تھی۔

"اگر وہ واقعی۔۔۔۔ مر گئی ہے تو کس نے مارا ہے اسے؟"

اس سوال کا جواب تیمور کے پاس نہیں تھا، نہ ہی میرے پاس تھا۔ آگے ایک دوراہا نظر آرہا تھا۔ ایک چوڑا راستہ تھا، دوسرا تنگ۔ میں نے چند لمحے کے لیے سوچا پھر جیپ کا رخ تنگ راستے کی طرف موڑ دیا۔ نئے طاقت ور انجن نے ایک بار پھر جیپ کو ہواؤں میں اڑانا شروع کر دیا۔ میری ڈائری میں درج ہے، یہ دسمبر کی 18 تاریخ تھی۔۔۔۔ میری زندگی کا ایک اور تلخ ترین دن۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میں اور تیمور، راجوال سے قریباً 24 کلو میٹر دور ایک "کاچھو والی" گاؤں میں تھے۔۔۔۔اس گاؤں میں پکی اینٹوں کا بنا ہوا ایک کشادہ گھر ہمارا ٹھکانا تھا۔فی الحال یہی ایک عارضی ٹھکانا تھا جو میری سمجھ میں آیا تھا۔اس گاؤں میں بجلی اور کچی پکی سڑک بھی تھی۔

پڑھنے والوں کو شاید رفاقت حسین صاحب کا نام یاد ہو۔یہ والد مرحوم کے وہی دوست تھے جو کچھ عرصہ پہلے بڑی خاموشی سے راجوال آئے تھے اور مجھ سے ملے تھے۔وہ دراصل تصویروں والے اس معاملے کے سلسلے میں آئے تھے جو میرے اور موکھل پاشا کے درمیان شروع ہوا تھا۔پاشا کے پاس شاداں کی اور میرے پاس پاشا کی سوتیلی بہن کی تصویریں تھیں۔اور رفاقت حسین صاحب اس جھگڑے میں ضامن بننا چاہتے تھے لیکن پھر میری بات ان کی سمجھ میں آگئی اور انہوں نے ضامن بننے کا فیصلہ واپس لے لیا۔

اس ملاقات سے ہمیں ایک دوسرے سے کافی قربت محسوس ہوئی تھی۔رفاقت حسین صاحب نے ایک سرپرست کی طرح مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کبھی مجھے ان کی

ضرورت محسوس ہو تو میں انہیں ضرور یاد کروں۔اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔کئی بار میرے دل میں آیا تھا کہ چاچا رفاقت سے ملوں لیکن ایسا ہو نہیں سکا تھا۔

آج میں چاچا رفاقت کے گھر میں موجود تھا مگر افسوس اس بات کا تھا کہ میں کسی اچھے وقت میں نہیں آیا تھا۔میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی تھی اور مجھ پر اپنی بیوی کے قتل کا الزام آچکا تھا۔میں نے چاچا رفاقت سے کچھ بھی چھپایا نہیں تھا۔اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں صرف ایک رات کے لیے ان کے پاس پناہ گزیں ہوا ہوں۔کل اندھیرا ہوتے ہی میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔میرا ارادہ لاہور کی طرف جانے کا تھا۔

اگلے روز دس بجے کے قریب چاچا رفاقت حسین کمرے میں داخل ہوئے جہاں میں اور تیمور لیٹے ہوئے تھے۔یاد رہے کہ میں اپنی جیپ چاچا کے گاؤں میں لے کر نہیں آیا تھا۔یہ جیپ ہم نے گاؤں سے کافی فاصلے پر ایک "رکھ" کے گھنے درختوں میں چھوڑ دی تھی۔چاچا رفاقت کا سنجیدہ چہرہ معمول سے زیادہ سنجیدہ نظر آیا۔ان کے سر کے سفید بال الجھے الجھے سے تھے۔میں نے اندازہ لگایا کہ ان کے پاس راجوال کی کچھ اہم خبریں ہیں۔

"معاملہ بہت بگڑا ہوا ہے۔" انہوں نے افسردہ انداز میں کہا۔

"کوئی نئی خبر؟"میں نے پوچھا۔

"شہوار کے میکے والے شہوار کا پوسٹ مارٹم نہیں کروانا چاہتے تھے مگر میاں وارث اور پولیس افسروں نے زور دیا۔اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی گئی ہے۔خیال ہے کہ آج رات سے پہلے اسے دفنایا نہیں جاسکے گا۔"

شہوار کے پوسٹ مارٹم اور اس کے دفنانے کا ذکر سینے میں دہکتے ہوئے تیروں کی طرح لگا۔یہ سارے الفاظ کانوں کو بالکل اجنبی اور ناقابل قبول محسوس ہوتے تھے۔

"اس کے قتل کے بارے میں عام لوگوں کا کیا خیال ہے؟"میں نے پوچھا

چاچا رفاقت نے غمزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"حالات تمہارے لیے بالکل ٹھیک نہیں ہیں خاور! شروع میں راجوال والوں کو بالکل یقین نہیں آیا کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔لیکن اب ان کی سوچیں کچھ بدلی ہوئی لگ رہی ہیں۔جو لوگ تمہاری حمایت میں بہت زیادہ بول رہے تھے،وہ بھی اب چپ ہو گئے ہیں۔اس کے ایک دو سبب ہیں۔"

"مثلاً کیا؟"

"موقعے پر لوگوں نے پولیس کو جو شہادتیں قلمبند کروائی ہیں،وہ ساری تمہارے خلاف جا رہی ہیں۔کہا جارہا ہے کہ پرسوں رات شہوار سے تمہارا شدید جھگڑا ہوا تھا اور تم نے اسے جان سے مارنے کی دھمکیاں دی تھیں۔تمہارے گھر کے دو پہرے داروں کے علاوہ ملازمہ رشیداں اور دوسری عورتوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔"

"بالکل ایسا ہوا تھا۔۔۔۔اور گھریلو جھگڑوں میں ایسی باتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ماں اپنے بچوں تک کو کہہ دیتی ہے کہ میں تمہارے ٹوٹے کردوں گی لیکن اس کا مطلب ٹوٹے کرنا تو نہیں ہوتا۔"

لیکن جو گواہیاں لکھی گئی ہیں،ان سے پتا چلتا ہے کہ یہ بڑی طیش والی لڑائی تھی۔شہوار نے بیگم بلقیس اور بھابی(بے بے جی)کو گالیاں دی تھیں اور تم نے اس کا منہ دبا کر اس کا سانس روک دیا تھا۔"

"یہ سب کچھ ہوا ہے چاچا جی۔۔۔۔بلکہ اس کے تھوڑی دیر بعد پھر ہماری لڑائی ہوئی ہے لیکن میں نے آپ کو بتایا ہے نا۔۔۔۔اس کے بعد صلح ہو گئی تھی۔۔۔۔میں اپنے ہاتھوں

سے شہوار کی چوٹوں پر ٹکور کرتا رہا ہوں اور اس سے باتیں کرتا رہا ہوں۔اس کا غصہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔۔۔۔"

"مسئلہ تو یہی ہے نا،اس لڑائی کے گواہ تو موجود ہیں،پر صلح کا گواہ کوئی نہیں۔۔۔۔۔جو رہی سہی کسر تھی وہ اس طرح پوری ہو گئی کہ تم پولیس کی حراست سے نکل گئے۔لگتا ہے کہ ایس ایچ او نے بھی تمہیں پھنسانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنی۔تم بتا رہے ہو کہ تم تاریخ پر جانے کے لیے پکی سڑک کی طرف جا رہے تھے۔اور مجھے بھی پتا ہے ایسا ہی ہے لیکن ایس ایچ او کا کہنا ہے کہ تم واردات کے بعد بدحواسی میں بھاگ رہے تھے۔تمہیں پکڑا گیا،تم نے پولیس مقابلہ کیا۔سرکاری اسلحہ چھینا اور ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے نکل گئے۔اہلکار کو کنوئیں میں پھینکنے کے جرم میں تم پر دفعہ تین تینتیس اور اقدام قتل کی دفعہ تین چھبیس بھی لگائی گئی ہے۔"

"شہوار کے میکے والوں کا کیا رویہ ہے؟"میں نے پوچھا۔

"ابھی تو وہ گم صم ہیں۔لیکن پکی بات ہے کہ ان کا رویہ بہت سخت ہونا ہے۔سنا ہے کہ بیٹی کی موت کی خبر سن کر اس کے والد سکتے میں چلے گئے تھے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میری نگاہوں کے سامنے آصف جاہ صاحب کا چہرہ گھوم گیا۔یہ وہ شخص تھا جو لاڈلی بیٹی کی چھوٹی سی تکلیف پر سراپا قہر بن جاتا تھا۔اور یہ چھوٹی تکلیف نہیں تھی۔چھوٹی تکلیف تو تب ہوتی جب اس کی کہنیاں چھلی ہوتیں،یا اس کے ہاتھ پر کسی نے چھڑیاں ماری ہوتیں،یا کسی نے کوئی تلخ بات کہہ کر اس کی آنکھوں کو آنسو دیے ہوتے۔اس کی تو زندگی ہی چھین لی گئی تھی۔بڑی وحشت سے اس کے جسم پر تیز دھار آلے کے وار کیے گئے اور اسے اس کے اپنے ہی لہو میں ڈبو دیا گیا۔اس کے بعد آصف جاہ کا رویہ کیسا ہونا تھا؟یہ کوئی سمجھ میں نا آنے والی بات نہیں تھی۔

انسان سوچتا کچھ اور ہوتا کچھ ہے۔آج سے چند ماہ پہلے شہوار سے میری شادی ہوئی تھی اور اس شادی کے پیچھے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لمبڑ برادری سے جاگیر کے تعلقات مضبوط ہو جائیں۔اور کچھ وقت کے لیے یہ محسوس بھی ہوا تھا کہ شاید مقصد پورا ہو رہا ہے لیکن آج جو حتمی نتیجہ نکل رہا تھا،وہ بہت مختلف تھا۔نہ صرف مختلف بلکہ نہایت سنگین بھی۔قلعہ والا کی بیٹی راجوال میں کچھ عرصہ گھریلو جھگڑوں میں گزارنے کے بعد بہیمانہ طریقے سے قتل ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ہاں،انسان سوچتا کچھ اور ہوتا کچھ ہے۔

چاچا فاقت کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکایا۔ وہ لرزتے ہاتھوں سے حقہ گڑگڑاتے ہوئے بولے۔ "تم بتاتے ہو کہ کل سویرے جب تم گھر سے نکلے تو شہوار لحاف میں سو رہی تھی۔ لیکن گھر والوں کو اس کی لاش پچھلے کمرے میں کھڑی چارپائیوں کے پیچھے سے ملی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ لحاف کے نیچے وہ نہیں تھی۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ دراصل میں کمرے کے اندر نہیں گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی نیند خراب نہ ہو۔ ویسے بھی کمرے میں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں زمین پر خون کے دھبے بھی ہوں لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ جہاں تک لحاف کی بات ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ ویسے ہی پلنگ پر رکھ دیا گیا ہو یا اس کے نیچے کوئی تکیے وغیرہ رکھے ہوں۔ دور سے مجھے یہی لگا کہ وہ پلنگ پر ہے۔"

"تم کمرے سے اندازاً کتنے بجے نکلے تھے؟" چاچا فاقت نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ دو بجے کا وقت ہو گا۔"

"کہا جا رہا ہے کہ شہوار کے کمرے سے غائب ہونے کا پتا صبح چھ بجے کے قریب لگا۔ اس کا مطلب ہے کہ قتل کرنے والا یا کرنے والے دو اور پانچ بجے کے درمیان کسی وقت کمرے

میں گھسے ہیں اور اپنا کام کر کے چلے گئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے شام کے بعد تمہارا اور شہوار کا جھگڑا بھی دیکھا ہو۔ اس جھگڑے کی آڑ میں انہوں نے شہوار کی جان لی اور تمہیں پوری طرح پھنسا دیا۔" چاچا فاقت نے خیال ظاہر کیا۔

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ تیمور بولا۔ "میرا دھیان تو بار بار موکھلوں کی طرف ہی جا رہا ہے۔ اسے بڑا زہری دشمن ہمارا اور کون ہو گا۔ اور ایسا خطرناک وار زہری دشمن ہی کر سکتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ان کا کوئی بندہ کسی بھیس میں تمہارے گھر کے اندر یا پھر بڑی حویلی میں موجود ہے۔" چاچا فاقت نے کہا۔

"مگر ضروری تو نہیں یہ کام موکھلوں کا ہی ہو۔ راجوال اور جاگیر میں بھی تو میرے کئی ویری موجود ہیں۔" میرے لہجے میں گہرا اندوہ تھا۔

"بہر حال، کچھ بھی ہے۔۔۔۔۔ وار کرنے والا اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہا ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے چاچا، مجھے گرفتاری دے دینی چاہئیے؟"

چاچے رفاقت کے مدبر چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہرائیں۔ انہوں نے کہا۔ "کل تک میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم نے جاگیر چھوڑ کر جلد بازی کی ہے لیکن اب جو کچھ سامنے آرہا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ تمہیں بڑے پکے طریقے سے پھنسانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اگر تم موجودہ حالات میں پیش ہو گئے تو بس دو تین ہفتوں میں تمہارے خلاف بڑا سخت قسم کا چالان بن جائے گا۔ اب اس بات کا مشورہ تو کوئی اچھا وکیل ہی دے سکتا ہے کہ تمہیں اس موقعے پر پیش ہونا چاہئیے یا چند دن تک حالات کا رخ دیکھ لینا چاہئیے۔"

"کیا کسی وکیل سے میری ملاقات کرا سکتے ہیں آپ؟" میں نے پوچھا۔

"میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔" چاچا رفاقت نے کہا۔

"لیکن آپ کی کوشش زیادہ لمبی نہیں ہونی چاہئیے۔ بس آج رات تک۔۔۔۔۔ کیونکہ کل صبح سے پہلے مجھے ہر صورت یہ جگہ چھوڑ دینی ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"بس، میں آپ کو کسی بڑی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ یہ بھی آپ کی بہت زیادہ مہربانی ہے کہ آپ نے اپنے لیے اور گھر والوں کے لیے خطرہ مول لے کر مجھے یہاں رکھا ہے۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔"

"اور میرے پاس بھی الفاظ نہیں ہیں کہ میں اپنا افسوس تمہیں بتا سکوں۔ تم نے یہ بات کہہ کے مجھے بہت دکھ دیا ہے۔" چاچا رفاقت کی آواز بھرا گئی۔

"لیکن چاچا جی۔۔۔۔۔"

"دیکھو، اب ایک لفظ نہ بولنا۔ ورنہ میں سمجھوں گا کہ تمہیں اپنے بڑوں کے لحاظ اور عزت کا کوئی پتا ہی نہیں ہے۔ تمہیں کیا پتا خاور! تیرے ابے کے ساتھ میرا کیا رشتہ تھا۔ ہم دوست تھے لیکن بھائیوں سے بڑھ کر تھے۔ ہم نے ہمیشہ ایک دوسرے کے پسینے پر خون بہایا ہے۔ کاش! آج عطا میرے سامنے ہوتا اور میں اس کے سامنے تمہارا شکوہ کر سکتا۔"

"میں آپ کے جذبات کی بڑی قدر کرتا ہوں لیکن۔۔۔۔۔"

"پھر بول رہے ہو۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں کہا ہے نا کچھ نہ بولو۔ بول کر تم میرے غصے کو اور بڑھاؤ گے۔" انہوں نے اپنے آنسو بمشکل ضبط کیے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے

کہا۔ "آج عطا کا پُتر پناہ کے لیے میری دہلیز پر آیا ہے۔ میں اسے کسی اور کی دہلیز پر بھیج دوں؟ میرے جیتے جی تو یہ ہو نہیں سکے گا۔"

"مگر میری وجہ سے آپ پر کوئی مصیبت آئی تو؟"

"کیوں آئے گی مصیبت؟ تو نے کوئی جرم کیا ہے؟ تجھ پر صرف جھوٹا الزام لگ رہا ہے اور اگر تُو نے جرم کیا بھی ہوتا نا۔۔۔۔ تو میں اپنے مرے ہوئے یار کی قسم کھا کر کہتا ہوں، میں پھر بھی اپنی پوری ہمت طاقت کے ساتھ تیرا ساتھ دیتا۔"

انہوں نے سامنے میز پر پڑی ہوئی میری کار کی چابی اپنے قبضے میں لے لی اور نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اس گھر میں چاچا رفاقت حسین صاحب اپنی بیمار بیوی اور ایک ملازمہ کے ساتھ رہتے تھے۔ پچھلی ملاقات میں انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کی بیوی پچھلے تقریباً اٹھارہ سال سے بستر پر ہیں۔۔۔۔ ان کے دو بیٹے سعودی عرب میں تھے۔ بس، سال میں ایک آدھ بار آکر خبر گیری کر جاتے تھے۔ یہاں چاچا رفاقت کی کافی زمین تھی جس سے بہ آسانی گزر بسر ہوتی

تھی۔ گھر کے کام کاج کے لیے انہوں نے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دیکھا، وہ کافی مستعد اور ہمدرد عورت تھی۔

اگلے دن چاچا رفاقت نے کافی بھاگ دوڑ کی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے رشتے داروں میں ہائی کورٹ کا ایک قابل وکیل ہے۔ وہ جاگیر ہی کے گاؤں نکووال کا رہائشی تھا۔ اس سعود خان نامی شخص سے مل کر جب رفاقت صاحب شام کو واپس آئے تو ان کے چہرے سے مایوسی جھلک رہی تھی۔

میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا۔ "سعود نے اس کیس کے لیے ہامی نہیں بھری۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ بہت مصروف ہے۔ اس کیس میں بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے اس لیے انصاف نہیں ہو سکے گا۔ اس نے ایک دو اور اچھے وکیلوں کا پتا بتایا ہے لیکن یہ وکیل لاہور میں بیٹھے ہیں۔"

"کہیں وہ ٹال تو نہیں رہا؟"

"مجھے بھی ایسے ہی لگتا ہے۔ بڑی عزت کرتا ہے میری۔ کبھی کسی کام کے لیے انکار نہیں کیا۔ لیکن یہاں لگتا ہے کہ وہ ڈر رہا ہے۔ وہ آصف جاہ کے غصے سے ڈر رہا ہے۔ اسے پتا ہے کہ یہ کوئی معمولی کیس نہیں۔ اس میں آصف جاہ کی بیٹی قتل ہوئی ہے۔"

میں نے اپنی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "چاچا رفاقت! آپ کو تکلیف دیتے ہوئے دل پر بوجھ بڑھتا ہے، لیکن مجبوری ہے۔ آپ کو دو کام کرنے ہوں گے۔ ایک تو جیپ کے لیے کوئی محفوظ ٹھکانا دینا ہو گا۔ دوسرے میرے ایک ڈسکے کے دوست سے رابطہ کرانا ہو گا۔ وہاں اس کے پاس ٹیلی فون ہے۔ میں نے سنا ہے کہ یہاں آپ کے گاؤں کے قریب بھی فون پہنچ چکا ہے؟"

"تم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ یہیں پاس ہی ایک ڈسپنسری ہے، وہاں تک فون کا تار پہنچ گیا ہے۔ تم اپنے دوست کا نمبر بتاؤ میں اس سے رابطے کی کوشش کرتا ہوں۔ نہ ہوا تو میں خود ڈسکے چلا جاؤں گا۔ رہی دوسری بات تو تمہاری جیپ خیر سے محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکی ہے۔ رات کو میں نے خود پہنچایا ہے اسے۔ وہاں اپنے ٹیوب ویل کے پیچھے میں نے ایک چھوٹا سا باغیچہ بنایا ہوا ہے۔ تمہاری چاچی کو گلاب کے پھول بڑے پسند ہیں۔ وہاں میں نے کوئی

تیس چالیس قسم کے گلاب کے پھول لگائے ہوئے ہیں۔ وہاں کوئی آتا جاتا نہیں ہے۔ میں نے جیپ ایک چھپڑ کے نیچے کھڑی کر کے اس پر بہت ساری پرالی ڈلوا دی ہے۔ بالکل بے فکر رہو۔"

رات کو سونے سے پہلے چاچے رفاقت نے میرا دوسرا کام بھی کر دیا۔ اس نے ڈسکے میں ساجے کے ٹو سے رابطہ کیا اور اسے میری طرف سے پیغام پہنچایا کہ وہ کا چھو والی پہنچ جائے۔ اس کے ساتھ ہی احتیاط کی تاکید کی کہ وہ اپنی نگرانی یا تعاقب وغیرہ سے خبردار رہے۔ دیہات میں بھی یہ رواج موجود ہے کہ پولیس، سادہ کپڑوں میں اپنے ٹاؤٹ مشکوک لوگوں کے پیچھے چھوڑتی ہے۔

ساجا اگلے روز تو نہیں آیا مگر اس سے اگلے روز وہ صبح سویرے آ دھمکا۔ اسے چاچے رفاقت کا گھر ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی۔ بیرونی دروازے پر اس کی دستک نے ہمیں بری طرح ٹھٹکا دیا۔ سچی بات یہی ہے کہ پچھلے تین دن سے ہر آہٹ پر یہی لگتا تھا کہ پولیس ہم تک آن پہنچی ہے۔ ہم اس وقت اندرونی کمرے میں بیٹھ کر ہلکا پھلکا ناشتہ کر رہے تھے۔ تین دن سے میری بھوک بالکل اڑی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ رات دن بے بے جی اور

عارفہ کا خیال رہتا تھا۔ میری غیر موجودگی میں پولیس انہیں زچ کر سکتی تھی۔ آصف جاہ کی طرف سے بھی کئی طرح کے اندیشے تھے۔ بہرحال، جب میں اس انداز میں سوچتا تھا تو بلقیس کا چہرہ خود بخود میری نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اندھیرے میں کوئی شمع روشن ہو گئی ہے۔ جو کچھ بھی تھا، بلقیس جاگیر کی کرتا دھرتا اور مختار تھی۔ پچھلے دو تین سالوں میں اس نے کافی کچھ سیکھا تھا اور اس میں اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری وجہ سے عارفہ اور بے بے جی پر کوئی سخت مصیبت نہیں آنے دے گی۔

میں نے ساجے سے سب سے پہلے بے بے جی اور عارفہ کے بارے میں ہی پوچھا۔ وہ چہرے پر گہری افسردگی لے کر بولا۔ "وہ ابھی تک تو ٹھیک ہیں مگر آنے والے دنوں کا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سچی بات تو یہ ہے خاور! تمہارے اور تیمور کے لیے حالات دن بہ دن بگڑ رہے ہیں۔"

"کوئی نئی بات ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"روز نئی باتیں ہو رہی ہیں۔" ساجے کے ٹو نے کہا اور اس کے ساتھ مجھے آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ ابھی بتانا نہیں چاہتا۔

تھوڑی دیر بعد چاچا رفاقت ملازمہ سے ساجے کے لیے ناشتہ تیار کرانے چلے گئے تو ساجے نے قدرے سراسیمہ نظروں سے مجھے اور تیمور کو دیکھا۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر دھیمی آواز میں بولا۔ "خاور! ہمارے درمیان کبھی کوئی پردہ نہیں رہا ہے۔ اب بھی نہیں رہنا چاہیئے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ دکھ بھری نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ "کیا واقعی یہ قتل تمہارے ہاتھوں سے نہیں ہوا؟"

"تمہارا کیا خیال ہے، میں تم سے جھوٹ بول رہا ہوں؟ اس سے تو بہتر تھا کہ تم میرے منہ پر دو چار تھپڑ مار دیتے۔"

میرے غم زدہ لہجے نے ساجے کو جھنجھوڑ دیا۔ "نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بس ایک بار تمہارے منہ سے سننا چاہ رہا تھا، اکیلے میں۔" وہ خاموش ہو گیا۔ پھر کانپتے ہاتھوں سے اپنا پسندیدہ سگریٹ سلگا کر بولا۔ "کل شام وہاں راجوال میں جو کچھ ہوا ہے اس نے تمہیں اور پھنسا دیا ہے۔"

"کھل کر بتاؤ۔"

اس نے طویل کش لیا۔"ثمینہ تمہارے خیال میں کیسی لڑکی ہے؟"

"تم اماں دلشاد کی چھوٹی بیٹی کی بات کر رہے ہو نا؟"ساجے کے ٹو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے کہا۔"اچھی لڑکی ہے۔دل کی بھی صاف ہے۔"

"وہ بھی تمہیں بہت اچھا سمجھتی ہے۔جس طرح تم نے اس کی اور اس کی بہنوں کی مدد کی،وہ سب تمہاری بہت احسان مند ہیں۔۔۔۔اور خاص طور سے ثمینہ۔اگر تم پچھلی بار موکھلوں کے کارخانے میں گھس کر اسے پاشا کے چنگل سے نہ بچاتے تو اس کی زندگی تباہ ہو جاتی۔میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ثمینہ ان لوگوں میں سے ہے جو راجوال میں اٹھتے بیٹھتے تمہاری مالا جپتے ہیں۔"

"لیکن ہوا کیا ہے؟"

"ثمینہ نے بھی گواہی دی کہ اپنی بیوی شہوار کا قتل تم نے کیا ہے اور وہ چشم دید گواہ ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔"کیا بک رہے ہو ساجے؟یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ہوا ہے خاور!اور سمجھو میرے سامنے ہوا ہے۔میں بھی کل شام تک زیرِ تفتیش تھا۔۔۔۔تمہارے دیگر دوستوں کی طرح مجھے بھی دو کانسٹیبل بھیج کر تھانے بلوایا گیا تھا۔تقریباً دو گھنٹے کے سوال و جواب کے بعد میری جان چھوٹی۔لیکن ابھی بھی پوری طرح کہاں چھوٹی ہے۔۔۔۔کسی بھی وقت پھر بلایا جا سکتا ہوں۔"

"تم ثمینہ کی بات کر رہے تھے؟"تیمور نے کہا۔

"ہاں،تمہیں پتا ہی ہو گا خاور!۔۔۔۔واردات سے پہلے تین چار روز سے ثمینہ تمہارے ہی گھر میں تھی۔لیکن واردات کے بعد وہ ایک دم سے اوجھل ہو گئی۔"

"کیا مطلب۔۔۔۔کہاں گئی؟"

"شام پور میں۔اپنے چاچے کے پاس۔اس کا نام بھی خاور ہے۔"

"پتا کیسے چلا؟"

"جب تھانے دار میاں وارث موقعے کے بیان لکھ رہا تھا تو پتا چلا کہ اماں دلشاد کی بیٹی ثمینہ بھی اسی گھر میں تھی۔اسے بیان لکھوانے کے لیے طلب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح

سویرے ہی کہیں چلی گئی ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے، ایسی باتیں پولیس والوں کو خوامخواہ شک میں ڈال دیتی ہیں۔ ثمینہ کا پتا کرایا گیا اور معلوم ہوا کہ وہ شام پور میں اپنے چاچے کے گھر ہے۔"

"کیا بیان دیا ہے اس نے؟" میں نے سخت حیرانی کے عالم میں پوچھا۔

"پہلے تو وہ کچھ بولنے کو ہی تیار نہیں تھی، بس روتی جا رہی تھی۔ پولیس والوں نے پوچھا کہ وہ موقعے سے غائب کیوں ہو گئی تھی؟ اس نے جواب دیا کہ وہ ڈر گئی تھی۔ اس لیے اپنے چاچے کے پاس چلی گئی۔ پولیس والے بھی ایسے کہاں جان چھوڑنے والے تھے۔ انہوں نے زنانہ پولیس کے حوالے کرنے کی بات کی تو ثمینہ نے بیان لکھوا دیا۔ اس نے کہا ہے کہ وہ بہت ڈر گئی تھی کیونکہ اس نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے شہوار کو چھریاں مارتے ہوئے دیکھا ہے۔ شہوار تمہارے نیچے تڑپ رہی تھی اور تم اس کے اوپر چڑھے ہوئے اسے مار رہے تھے۔"

"یہ ثمینہ نے کہا ہے؟"

"بالکل، اسی نے کہا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھوایا ہے کہ دو تین دن تک وہ بڑے شش و پنج میں رہی ہے۔ شاہ خاور کے اس پر اور اس کے گھر والوں پر کئی احسان ہیں۔ وہ انہیں ایسا ہرگز

نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ جو کچھ دیکھ چکی ہے، اسے چھپا کر رکھے گی تو اللہ کے ہاں گناہ گار ہو گی۔"

"اس نے۔۔۔۔۔ اس نے ایسا کیوں کہا ہے؟" میں نے ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے کے ٹو کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ میں کسی طرح کا کوئی چکر چلا رہا ہوں؟"

کے ٹو نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم تینوں یار نہیں ہیں بھائی ہیں۔ اگر ساری دنیا بھی ایک طرف ہو جائے اور تمہیں ثبوتوں کے ساتھ قاتل کہے تو ہم اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک تم اپنی زبان سے نہ کہہ دو۔ لیکن یہاں سوچنے والی بات صرف یہ ہے کہ ثمینہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ کہیں یہ پھر وہی بلیک میلنگ والا چکر تو شروع نہیں ہو گیا۔"

"میرے دماغ میں بھی یہی بات آ رہی ہے۔" تیمور نے کہا۔ "اس سے پہلے بھی جب ہم پولیس کی وجہ سے آگے پیچھے ہوئے تھے اس حرامی پاشے نے اپنے لیے میدان کھلا سمجھ لیا

تھا اور ثمینہ کو پکڑ کر اپنے گودام میں جا گھسا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اب پھر شیر ہو گیا ہو۔ ثمینہ کی
بڑی بہن کی غلط تصویریں تو اس کے پاس ہی ہیں۔"

"مجھے نہیں لگتا تومی! وہ تصویروں والا خطرہ مول لے گا۔ اسے بڑی اچھی طرح پتا چل چکا ہے
کہ جس دن اس نے شاداں والی تصویروں کو حرکت دی، اس کی اپنی بہن کی تصویریں بھی
حرکت میں آجائیں گی۔"

"تو پھر ہو سکتا ہے اس خبیث نے کوئی اور طریقہ اختیار کیا ہو۔ یہ بات تو طے ہے کہ ثمینہ پر
اس کا بڑا رعب ہے بلکہ دہشت بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ اکیلے میں بُلا کر اس سے "ہاتھ چالاکی"
کرتا رہا ہے بلکہ مارتا بھی رہا ہے۔" تیمور نے کہا۔

اسی دوران میں چاچا رفاقت بھی واپس آگئے اور گفتگو کا رخ بدل گیا۔ کے ٹو نے اپنے کرتے
کی جیب سے ایک مڑا تڑا اخبار نکالا۔ یہ تین چار دن پہلے کا تھا۔ اس میں شہوار کے قتل کی خبر
موجود تھی۔ شہوار کی لاش کی تصویر بھی چھپی تھی۔ وہ چارپائی پر پڑی تھی۔ اس کے سیاہ بال
بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر خون کے چھینٹے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے وہ پھولدار

قمیض پہچان لی جو اس نے آخری رات پہنی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں شدتِ غم سے جل
اٹھیں۔

نیچے سرخی تھی۔ "علاقے کے با اثر زمیندار آصف جاہ کی بیٹی شادی کے چند ماہ بعد شوہر کے
ہاتھوں قتل!" ذیلی سرخیاں اس طرح تھیں۔ "پولیس پارٹی نے ملزم کا پیچھا کیا لیکن وہ فرار
ہونے میں کامیاب۔ میاں بیوی میں کئی ماہ سے چپقلش تھی۔ مقتولہ کے جسم پر چاقو کے چھ
گہرے زخم!"

خبر کے متن میں تفصیل درج تھی۔ متن میں نہ صرف موکھلوں اور جاگیر والوں کی پرانی
عداوت کا ذکر تھا بلکہ ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے ملزم کے ساتھ
جاگیر کی مختار بیگم جی کی شادی کی خبر بھی گردش کرتی رہی ہے۔ خبر کا یہ حصہ میرے لیے اور
زیادہ تشویش ناک تھا۔

ساجے کے ٹو نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک میرا تجربہ ہے، تمہیں اس وقت
پولیس سے بھی زیادہ اپنے سسرالیوں سے خطرہ ہے۔ لمبڑ آصف جاہ کے غصے کا اندازہ کچھ
وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اسے قریب سے جانتے ہیں۔ اور تمہارا یہ ڈر بھی غلط نہیں ہے کہ اس

کے غصے کا رخ بے بے جی اور عارفہ کی طرف مڑ سکتا ہے۔۔۔۔۔بلکہ اس معاملے میں بیگم بلقیس کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا غصہ ان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہا ہو۔"

"کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے کہ میری بات آصف جاہ صاحب سے ہو سکے؟"

"جہاں تک مجھے پتا ہے، قلعہ والا میں تو فون شون ہے ہی نہیں۔ کوئی خط وغیرہ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن مجھے نہیں امید کہ ان باتوں سے کوئی فائدہ ہو گا۔" کے ٹو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "اچھا، ایک بتاؤ یار! تم توراجوال سے ہو کر آئے ہو۔ چودھری عزیز اور بیگم بلقیس اس بارے میں کس انداز میں سوچ رہے ہیں؟"

"بیگم بلقیس کا تو مجھے زیادہ پتا نہیں۔ ہاں، پرسوں چودھری عزیز تھانے آیا ہوا تھا اور میاں وارث سے گل بات کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ وہ اس واقعے پر بہت حیران ہے۔ اس کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ تم گھریلو جھگڑے میں اس حد تک جا سکتے ہو۔۔۔۔۔لیکن یہ پرسوں کی بات ہے۔" کے ٹو نے آخری فقرہ معنی خیز انداز میں کہا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کیا مطلب؟" تیمور نے پوچھا۔

"پرسوں تک اس خبیث ثمینہ کا بیان نہیں آیا تھا۔ میں نے کہا ہے نا کہ اس بیان کے بعد تمہارے ساتھ بہت زیادہ ہمدردی رکھنے والے بھی چکر میں پڑ گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ چودھری عزیز اور بیگم بلقیس کی سوچ میں بھی فرق آیا ہو۔ ثمینہ تو ہر وقت بیگم بلقیس کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک طرح کا دوستانہ تھا ان دونوں میں۔ اب پتا نہیں اس نے بیگم بلقیس کے کانوں میں کیا کچھ ڈالا ہے۔"

مجھے لگا کہ کے ٹو درست کہہ رہا ہے۔ حالات کا شکنجہ میرے گرد سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا اور یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا تھا۔ پانچ روز پہلے تک میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس طرح گردن تک ایک دلدل میں دھنس جاؤں گا۔

پتا نہیں کیوں بلقیس کا چہرہ میری آنکھوں میں گھومنے لگا۔ میری زندگی میں اس چہرے کی جتنی اہمیت تھی، اس کو شاید لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ میری زندگی کا جواز ہی یہ چہرہ ہے۔ میں سوچنے لگا کہ بلقیس اس وقت کس انداز میں سوچ رہی ہو گی۔ کیا اس کا یقین بھی مجھ پر ڈانواں ڈول ہو گیا ہو گا؟ جب گئے وقتوں کی یخ بستہ چاندنی

راتوں میں ہمارے درمیان شوخ سرگوشیاں ہوا کرتی تھیں۔ وہ بات بے بات مجھ سے کہا کرتی تھی۔۔۔۔۔ میں نہیں کرتی یقین۔۔۔۔۔

لیکن یہ انکار صرف مذاق میں ہوتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھ پر بہت یقین کرتی ہے۔ شاید اپنی ذات سے بھی زیادہ۔ بس اس کا کھلا اظہار نہیں کرتی تھی۔ تو کیا وہ آج بھی مجھ پر یقین کر رہی تھی؟ یا پھر وہ بھی لوگوں کے بہاؤ کے ساتھ بہنا شروع ہو گئی تھی؟

میں نے کے ٹو سے کہا۔ "تم میرا ایک کام کرو۔ بس کسی طرح بیگم بلقیس اور چودھری عزیز تک میرا یہ پیغام پہنچا دو۔ ان کو بتا دو کہ میں نے کسی جگہ سے تم سے فون پر رابطہ کیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ میں نے شہوار کی جان نہیں لی۔ میں بہت جلد پیش ہو جاؤں گا اور پوری صفائی دوں گا۔ بس دو چار دن کی بات ہے۔ اس دوران میں وہ میرے گھر والوں کا خیال رکھیں اور کسی کو ان کے ساتھ زیادتی نہ کرنے دیں۔"

"ٹھیک ہے، میں آج ہی یہ کام کر دیتا ہوں۔ لیکن اس میں تمہارے لیے کوئی مسئلہ تو نہیں ہو جائے گا؟"

"یا پھر ایسا کرو، چودھری عزیز کو بھی نا بتاؤ۔ فی الحال صرف بیگم بلقیس تک یہ بات پہنچا دو۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کے ٹو نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

میں نے دوسرا کام کے ٹو کے ذمے یہ لگایا کہ وہ ایک دو دن کے اندر میرے اور تیمور کے لیے کسی بہت اچھے وکیل کا انتظام کرے۔ میں نے اسے لاہور کے دو وکیلوں کے نام بھی بتائے۔

وہ بڑی سرد رات تھی۔ ہوا چل رہی تھی اور بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ تیمور سو چکا تھا۔ بلب کی مدھم روشنی میں اس کا حلیہ خستہ نظر آ رہا تھا۔ میں بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ میرے سینے میں آگ سی بھڑک رہی تھی۔ آخر ثمینہ نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا کہا ہوا فقرہ کے ٹو نے مجھے بتایا تھا اور یہ بار بار میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے چودھری خاور جی کو اپنی ووہٹی پر چھریاں چلاتے دیکھا، وہ ان کے نیچے تڑپ رہی تھی اور لہولہان تھی۔

ثمینہ اتنا بڑا جھوٹ کیوں بول رہی تھی؟ وہ کسی لالچ میں آ گئی تھی۔۔۔۔۔ ڈر گئی تھی یا پھر اس میں اس کا اپنا کوئی مفاد آ گیا تھا؟ جو کچھ بھی تھا، اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ میرا دل چاہا کہ وہ میرے سامنے ہو اور میں اسے پوری طاقت سے جھنجھوڑوں اور پوچھوں۔۔۔۔۔ میری ساری بھلائیوں کا صلہ کیا یہی تھا؟۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات بھی میری سمجھ

میں آ رہی تھی۔اور یہ بات صرف میری سمجھ میں ہی آسکتی تھی۔۔کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں قاتل نہیں ہوں اور وہ یہ کہ ثمینہ اس اندھے قتل کا کوئی نا کوئی سرا میرے ہاتھوں میں دے سکتی ہے۔وہ جھوٹ بول رہی تھی اور ہر جھوٹ کے پیچھے کوئی وجہ ہوتی ہے۔

اس سرد طوفانی رات میں میرے دل کی کیفیت کچھ عجیب ہو گئی اور میں نے ہر اندیشے اور خطرے کو بالائے طاق رکھ کر ثمینہ تک پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔اس فیصلے تک پہنچنے میں میری کچھ مدد موسم نے بھی کی۔بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ایسے موسم میں ہر خاص و عام گھروں میں دبک جاتا ہے۔پولیس ناکے ختم ہو جاتے ہیں۔چوکیداروں اور سنتریوں وغیرہ کے گشت بھی ترک کر دیے جاتے ہیں۔

میں نے تیمور کو جگایا اور اسے ساری صورتِ حال سے مطلع کیا۔یہ بات تو اس نے بھی مانی کہ ثمینہ سے ہمیں کوئی اہم بات معلوم ہو سکتی ہے مگر میرا اس طرح محفوظ چار دیواری سے نکلنا اسے بالکل ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

"یار! بہتر ہے کہ ہم اس کام کے لیے کسی اور کو استعمال کریں۔اچھا بھلا کے ٹو یہاں آیا ہوا تھا ،اسی کے ذمے لگا دیتے۔"

"بس،اس وقت ذہن میں نہیں آیا نا۔اور ویسے بھی میرا خیال ہے تومی،اس کام کو جتنے اچھے طریقے سے میں کر سکتا ہوں اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

"لیکن اگر دو چار دن انتظار کر لیں۔میرا مطلب ہے ہماری تلاش کا کام ذرا ٹھنڈا پڑ جائے؟"

"نہیں یار! اگر دیر کریں گے تو غلطی کریں گے۔اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک بڑی غلطی ہم سے پہلے ہی ہو چکی ہے۔شاید ہمیں اس طرح بھاگنا نہیں چاہئیے تھا۔ہمارے بھاگنے نے ہمیں نقصان پہنچایا ہے۔اب رہی سہی کسر ثمینہ کا بیان پوری کر رہا ہے۔"

"بھاگنے سے نقصان ہوا ہے تو نہ بھاگنے سے بھی ہو سکتا تھا۔اس میاں وارث کا کیا بھروسہ تھا کہ ہمیں گولی ٹکا دیتا اور بعد میں پولیس مقابلہ بنا دیتا۔" تیمور نے کہا۔

"خیر،جو بھی ہے تومی! غلطیاں بھی تو انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔اگر یہ غلطی ہے بھی تو اب ہمیں اس غلطی کو مزید لمبا نہیں کرنا چاہئیے۔میں ہر صورت آج ثمینہ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔"میرے حتمی لہجے نے تیمور کے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا دی۔

میں نے چاچے رفاقت کو بھی نہیں بتایا اور خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔چاچے کے مویشی خانے سے میں نے ایک سدھا ہوا چتکبرا گھوڑا لے لیا۔دیہات کے کچے راستوں پر

جب تابڑتوڑ بارش برستی ہے تو سفر اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے کئی دفعہ سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں کو کیچڑ سے یکسر جام ہوتے دیکھا ہے۔ گھوڑے وغیرہ کی سواری بھی ازحد دشوار ہو جاتی ہے۔ رفتار پکڑنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہوتا، بس ہر وقت اوندھے منہ گرنے کا خدشہ رہتا ہے۔

میرے سر اور چہرے کو ایک گرم چادر کے منڈاسے نے چھپایا ہوا تھا۔ پولیتھین کی ایک شیٹ میں نے برساتی کے طور پر اوڑھ رکھی تھی۔ بھرا ہوا بریٹا پستول بھی واٹر پروف کور میں لپیٹ کر قمیض کے نیچے لگایا ہوا تھا۔ پولیتھین کی شیٹ نے بارش کی بوچھاڑوں کا مقابلہ زیادہ دیر تک نہیں کیا۔ جلد ہی میں سر سے پاؤں تک یخ بستہ پانی سے شرابور ہو گیا اور دسمبر کی برفیلی ہوا ہڈیوں سے آر پار ہونے لگی۔ کھیت کھلیان، درخت اور گھروندے سب کچھ پانی کی تاریک چادر میں چھپا ہوا تھا۔ بس جب بجلی چمکتی تھی، چند ساعتوں کے لیے اس تاریک چادر میں سے یہ سارے مناظر اپنی جھلک دکھا دیتے تھے۔

کاچھووالی سے شام پور کا فاصلہ کافی تھا لیکن میں نے اندرونی راستے استعمال کیے۔ کہیں کہیں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سے بھی گزرا اور قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں شام پور کے نواح میں پہنچ

گیا۔ میاں جی کا قبرستان اپنے بے شمار درختوں سمیت مسلسل برستی بارش میں خاموشی سے بھیگ رہا تھا۔ وہی قبرستان جس میں گُڈی دفن تھی اور گُڈی کی کہانی دفن تھی۔ میں اس قبرستان کے پاس سے ہو کر نکلا۔ مجھے لگا جیسے والی جی آج بھی گُڈی کی قبر کے سرہانے چادر اوڑھے بیٹھے ہیں اور ندامت کے آنسو بہا رہے ہیں۔

راستے میں آنے والے تمام دیہات کی طرح شام پور بھی برفیلی بارش اور گہرے سناٹے کے نرغے میں تھا۔ کہیں کسی کتے یا پالتو جانور کی آواز بھی سنائی نہیں پڑتی تھی۔ یہ میری جانی پہچانی گلیاں تھیں۔ میں ثمینہ کے چاچے خاور کے گھر کے عین سامنے پہنچا۔ گلی میں تقریباً ایک ایک فٹ پانی کھڑا تھا۔ گھر کی دیوار خاصی اونچی تھی اور اوپر کانچ کے ٹکڑے بھی لگائے گئے تھے جن میں سے بیشتر اب گر چکے تھے۔ میں نے چاچا رفاقت کے چتکبرے گھوڑے کو دروازے کے ساتھ ہی ایک کلے سے باندھا پھر گھوڑے کو دیوار کے بالکل پاس کھڑا کر دیا اور اس کی پشت پر دو چار تھپکیاں دیں۔ ارد گرد کہیں کسی متنفس کے آثار نہیں تھے۔ میں گھوڑے کی پشت پر کھڑا ہوا اور دیوار پھلانگ کر اندر چلا گیا۔

اندر کچھ ہلچل کے آثار نظر آئے۔ یوں محسوس ہوا کہ اہلِ خانہ میں سے کوئی جاگ رہا ہے۔ ثمینہ کے چاچے کے بارے میں میری معلومات بالکل محدود تھیں۔ مجھے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ اس گھر میں اپنی بیوی اور دو بیٹوں کے ساتھ رہتا ہے۔ ایک بیٹا شادی شدہ تھا۔

مجھے ایک کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی بھی دکھائی دی۔ میں اس روشنی کی طرف گیا۔ کمرے کی کھڑکی شیشم کی پرانی لکڑی کی تھی۔۔۔۔۔ اور "رف" سی بنی ہوئی تھی۔ میں نے کھڑکی کی ایک درز سے آنکھ لگائی۔ کمرے کی چھت ٹپک رہی تھی اور پانی ایک بڑی پرات میں بوندوں کی صورت گر رہا تھا۔ لیکن یہ مسئلہ شاید صرف ایک گوشے میں تھا۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ وہ بے شک ثمینہ تھی اور اس حالت میں ایک مرد اس کے سامنے چارپائی پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ تین چار فٹ کے فاصلے پر کھڑی اپنے کپڑے اتار رہی تھی۔ اس نے قمیض کا زیریں لباس اتار لیا اور اس کا بالائی جسم عریاں ہو گیا۔

میں نے کھڑکی سے نگاہ ہٹالی۔ میرے دل کی دھڑکن بہت بڑھ گئی تھی۔

یہ میں کیا دیکھ رہا تھا؟ تو کیا ثمینہ کے بارے میں میرے اندیشے درست تھے؟

میں چارپائی پر بیٹھے شخص کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ میری طرف اس کی پشت تھی۔ بہر حال، میں اتنا کہہ سکتا تھا کہ وہ موکھل پاشا نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے دوبارہ کھڑکی سے آنکھ لگائی۔ ثمینہ نے دوسری قمیض پہن لی تھی۔ اس کی پنڈلیاں اور گھٹنے اب بھی عریاں تھے۔ وہ اپنی بھیگی قمیض کو نچوڑ کر کھونٹیوں پر پھیلا رہی تھی۔ مرد بڑی عمر کا تھا۔ ثمینہ نے اس سے کوئی بات بھی کی۔ وہ بالکل نارمل نظر آ رہی تھی۔۔۔۔۔ میری آنکھیں جل اٹھیں۔ وہ غیر شادی شدہ تھی۔ راجوال میں بلقیس اس کے لیے کوئی اچھا لڑکا ڈھونڈ رہی تھی اور یہاں وہ ایک پکی عمر کے شخص کے سامنے بے لباس ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ اور وہ یہ سب کچھ کر رہی تھی تو پھر اور بھی بہت کچھ کر سکتی تھی۔

میرے اعصاب تن گئے، رگوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں گھوم کر کمرے کے دروازے پر آیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ "اچھا آئی۔" اندر سے ثمینہ کی کپکپاتی آواز ابھری۔ شاید وہ اپنی بقایا عریانی ڈھانپ رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ میں تیزی سے اندر داخل ہو گیا اور دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

ثمینہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ "کون؟" وہ ہکلائی۔

میں نے گرم چادر کا بھیگا ہوا منڈا سا اتار پھینکا۔ شاید اس نے چلانے کے لیے اپنا منہ کھولا لیکن پھر خود ہی دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ "آ۔۔۔۔۔آپ۔۔۔۔۔یہاں؟" وہ سکتہ زدہ انداز میں بولی۔

"ہاں۔۔۔۔۔بڑی تکلیف ہوئی ہے مجھے یہاں دیکھ کر؟" میں پھنکارا۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ تب میری نگاہ سامنے چارپائی پر حیران بیٹھے شخص پر پڑی۔ ایکا ایکی مجھے لگا صورتِ حال بالکل ویسی نہیں ہے جیسی نظر آرہی ہے۔ چارپائی پر بیٹھا ہوا شخص نابینا تھا۔ وہ کوئی سائیں ٹائپ کا شخص تھا جس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔

میں نے سائیں نما شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ثمینہ سے پوچھا۔ "کون ہے یہ؟"

"یہ میری چاچی کا چھوٹا بھائی ہے۔" ثمینہ ہکلائی۔

"خورشید۔۔۔۔۔نام ہے۔۔۔۔۔اس کا۔"

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

www.pakistanipoint.com

"وہ۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔اصل میں، میں ساتھ والے کمرے میں سو رہی تھی۔ بارش کی وجہ سے اس کی ساری چھت چونے (ٹپکنے) لگی ہے۔ میرے کپڑے بھی بھیگ گئے ہیں۔ اب میں نے چاچے اور چاچی کے کمرے میں جا کر لیٹنا تھا۔ میں یہاں۔۔۔۔۔کپڑے بدلنے۔۔۔۔۔کے لیے آئی ہوں۔ خورشید کو نظر نہیں آتا نا۔"

خورشید ہکا بکا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ "یہ۔۔۔۔۔یہ کون ہے چھیمو؟" اس نے بے ڈھنگی سی آواز میں ثمینہ سے پوچھا۔

"یہ چودھری صاحب ہیں۔ شاہ خاور۔ مم۔۔۔۔۔مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ تم آرام سے لیٹو۔"

سائیں نما خورشید نے اپنی رال پونچھی اور ثمینہ سے مخاطب ہو کر ہونق انداز میں بولا۔ "یہ باداموں والی برفی بھی لے کر آئے ہیں؟"

"نہیں، یہ برفی نہیں لائے۔ تم آرام سے سو جاؤ۔"

خورشید وہیں پر کھسک کر لیٹ گیا۔ اس کی بے نور آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں اور چھت پر تواتر سے بارش کا پانی گر رہا تھا۔

گھر کے باقی کمروں میں خاموشی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ مکین سو رہے ہیں۔ ثمینہ سخت سہمی ہوئی سی ایک گوشے میں کھڑی تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تو تم نے مجھے شہوار کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے؟"

اس کا سر بہ دستور جھکا رہا۔ بھیگے بالوں کی لٹیں اس کی شفاف گردن سے چپکی ہوئی تھیں۔ میں پھنکارا۔ "میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟ تم نے مجھے اس حالت میں دیکھا تھا کہ میں شہوار پر چڑھا ہوا اسے چھریاں مار رہا تھا اور وہ لہولہان میرے نیچے تڑپ رہی تھی؟"

ثمینہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ لیا۔

"میرے ساتھ یہ ظلم کیوں کیا تم نے؟ کس کے کہنے پر کیا؟ میں نے کیا برائی کی تھی تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔ کیا نقصان پہنچایا تھا تمہیں؟" وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔ بس جھکی نظروں کے ساتھ آنسو گراتی رہی۔ اس کا بھیگا بھیگا خشک جسم پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ خورشید بالکل لاتعلق سا لیٹا تھا اور اپنی انگلیاں چاٹ رہا تھا۔ شاید ان پر کوئی میٹھی چیز لگی تھی۔

میں نے ایک بار ثمینہ کو جھنجھوڑا۔ "تم بولتی کیوں نہیں ہو؟"

وہ بے دم سی ہو کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی۔ "میں کیا کرتی؟ میں نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ بتانے پر مجبور ہو گئی۔"

میرے اعصاب چٹخ گئے۔ میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ "کیا بک رہی ہو؟ کیا دیکھا تھا تم نے؟" اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ میں نے اس کے سر بالوں کو اپنے ہاتھ کے گرد بل دیا اور ایک بار پھر زور سے جھنجھوڑا۔ "کیا دیکھا تھا تم نے؟ یہی کہ میں شہوار کو چھریاں مار مار کر لہولہان کر رہا ہوں؟"

"میں نے یہ کب کہا ہے؟ میں نے تو بس وہی کہا تھا۔۔۔۔۔" وہ منمنائی۔

"کیا کہا تھا؟"

"یہی کہ۔۔۔۔۔ آپ کے ہاتھ میں چاقو تھا۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ نے۔۔۔۔۔ وو ہٹی جی کو۔۔۔۔۔"

"ہاں، کیا کیا تھا وو ہٹی جی کو؟"

"آپ۔۔۔۔۔بہت غصے میں تھے۔آپ نے۔۔۔۔۔وو ہٹی جی کو۔۔۔۔۔پلنگ کے پیچھے گرادیا تھا۔۔۔۔۔"

ایک دم میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ایک ہی لحظے میں،میں سمجھ گیا کہ ثمینہ یہ کیا بات کہہ رہی ہے۔اس کے بالوں پر سے میری گرفت کمزور پڑ گئی۔جب رات گئے میرے اور شہوار کے درمیان دوسری جھڑپ ہوئی تھی اور شہوار نے دیوار پر سے خنجر اتار لیا تھا۔۔۔۔اس نے خود کو زخمی کرنے کی خوب کوشش کی تھی۔میں نے اس کی کوشش کو ناکام بنایا تھا۔اسی کھینچا تانی میں ہم دونوں گر گئے اور شہوار کا سر پلنگ کے پائے سے ٹکرایا تھا۔۔۔۔ثمینہ اسی واقعے کا ذکر کر رہی تھی۔یہ ایک ادھورا منظر تھا جسے شاید وہ پورا سمجھ بیٹھی تھی اور پولیس کے روبرو ایک نہایت سنگین بیان دے دیا تھا۔

میں نے اس کے سامنے ایک نواڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔"لیکن تم نے تو کہا ہے کہ تم نے مجھے شہوار پر چھریاں چلاتے اور اسے خون میں لت پت ہوتے دیکھا؟"

"نہیں جی۔۔۔۔میں نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی۔تھانے دار صیب نے بڑھا چڑھا کر لکھ دیا ہوگا۔"

اللہ لوک خورشید نے بستر پر لیٹے لیٹے ہانک لگائی۔

"اور جب آنا تو کلاس والے کی مٹھی برفی ضرور لے کر آنا۔"وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

"ہاں ہاں،لے کر آئیں گے۔"ثمینہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔"تم اب سو جاؤ۔"

خورشید نے کروٹ بدل کر سچ مچ آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے ثمینہ سے پوچھا۔"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں شہوار کو چھریاں مار کر قتل کر سکتا ہوں؟"

اس نے پہلی آبدیدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔پھر دوبارہ پلکیں جھکا لیں۔یوں لگتا تھا کہ وہ کوئی بھی جواب دینے سے قاصر ہے۔

میں نے کہا۔"جب تم نے میرے ہاتھ میں خنجر دیکھا اور پھر مجھے اور شہوار کو پلنگ کے پیچھے گرتے دیکھا تو اس کے بعد تم نے کیا کیا؟"

وہ ایک بار سسکیوں سے رونے لگی۔"میں ڈر گئی تھی۔۔۔۔۔بہت ہی زیادہ ڈر گئی تھی۔مم۔۔۔۔۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں۔۔۔۔۔بے ہوش ہو جاؤں گی۔۔۔۔۔میں کمرے میں چلی گئی۔اندر سے کنڈی چڑھا لی اور لحاف میں گھس کر اور کانوں میں انگلیاں دے کر

لیٹ گئی۔ مجھے نہیں پتا میں کب تک اسی طرح پڑی رہی۔ پھر دروازہ دھڑ دھڑ بجا اور ماسی اللہ رکھی نے بتایا کہ ۔۔۔۔۔ وہ بٹی جی کا خون ہو گیا ہے۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"میرا سر چکرا رہا تھا۔ بار بار الٹی آ رہی تھی۔ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ اگر میں وہاں رہی تو بے ہوش ہو جاؤں گی یا میرے دل کو کچھ ہو جائے گا۔ میں نے بس اللہ رکھی کو بتایا اور چپ کر کے یہاں آ گئی۔"

ثمینہ کی بات اب میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ بڑا عجیب و غریب معاملہ ہو گیا تھا۔ ثمینہ نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ پولیس کو بتا دیا تھا۔ لیکن اس نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ سچ نہیں تھا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ثمینہ! بندے کی نظر اکثر اسے دھوکا دیتی ہے۔ کئی دفعہ ہم دیکھ کچھ رہے ہوتے ہیں، حقیقت میں کچھ ہوتا ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں لیکن ہم دور کیوں جائیں۔ ایک بالکل تازہ مثال ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میرے سامنے آئی ہے۔" وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے بات جاری رکھی۔ "ابھی کچھ دیر پہلے جب میں نے کھڑکی کی درز سے اس کمرے میں جھانکا تو مجھے کچھ اور ہی منظر نظر آیا۔ تم اس اکیلے کمرے میں خورشید کے سامنے اپنے کپڑے اتار رہی تھیں۔ اگر میں بس یہی منظر دیکھ کر واپس چلا جاتا تو میرے ذہن میں تمہارے اور خورشید کے بارے میں ہر برا خیال آ جانا تھا۔ جبکہ اصل میں ایسا نہیں ہے۔ یہی کچھ وہاں راجوال والے گھر میں ہوا۔ تم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ "پورا" نہیں تھا۔ اور جو "پورا" تھا وہ تم نے دیکھا نہ کسی اور نے۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں جی۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "جس وقت تم نے مجھے اور شہوار کو لڑتے دیکھا، خنجر میرے ہاتھ میں نہیں شہوار کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خود کو زخمی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں خنجر اس سے چھڑوا رہا تھا۔ اسی دوران میں وہ گر گئی اور سر پر چوٹ لگنے سے بے سدھ ہو گئی۔ میں اسے اٹھا کر پلنگ پر لے آیا تھا۔"

"پھر ۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا ان کے ساتھ؟"

"ثمینہ ! تمہاری طرح مجھے بھی کچھ پتا نہیں۔ میری بات پر یقین کرنا کیوں کہ یہی سچ ہے۔ میں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ اس واقعے کے قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد ہوا ہے۔"

ثمینہ پریشان، الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔

میں نے اسے وہ سب کچھ بتایا جو اس منحوس رات میں ہوا تھا۔ شہوار کو چوٹ لگنے کے بعد میرا رویہ تبدیل ہونا۔۔۔۔ ہم دونوں میں کسی حد تک صلح ہو جانا۔۔۔۔ پھر صبح منہ اندھیرے میرا تیمور کے ساتھ نکل جانا۔۔۔۔ میں نے سب کچھ ثمینہ کے گوش گزار کر دیا۔ وہ حیرت کے عالم میں سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکتے رہے۔

اچانک کمرے کا بند دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ اس کی بند کنڈی اکھڑ کر دور جا گری۔ میری نگاہ سب سے پہلے ایک رائفل پر پڑی۔ یہ رائفل ایک ڈھاٹا پوش شخص کے ہاتھ میں تھی۔ اس سے پہلے کہ ڈھاٹا پوش کا منہ کھلتا اور وہ مجھے خطرناک نتائج کی دھمکی دے کر ہاتھ اٹھانے کا حکم دیتا۔۔۔۔ یا اس قسم کی کوئی اور حرکت کرتا، میں برق رفتاری سے اس کے اوپر جا پڑا۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور گولی کمرے کے کچے فرش میں دھنس

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

گئی۔۔۔۔ میں نے سر کی بھرپور ضرب ڈھاٹا پوش کے چہرے پر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا اس چارپائی پر جا گرا جہاں مست حال میں خورشید نیم غنودگی میں تھا۔

طوفانی ضرب کے سبب رائفل حملہ آور کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اسی اثنا میں ایک دوسرا شخص نظر آیا۔ اس کا ہاتھ ہولسٹر۔۔۔۔ سے باہر آ رہا تھا اور ہاتھ میں سیاہ پسٹل تھا۔ میں نے رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے، دستے کی طرف سے اس کے ہاتھ پر چوٹ لگائی۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکلتا اور ہوا میں اڑتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی ثمینہ اور خورشید کے چلانے کی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔ ثمینہ سہم کر ایک گوشے میں سمٹ گئی تھی۔

یہی وقت تھا جب میری نظر دروازے سے گزر کر گھر کے صحن کی طرف گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ دو تین مزید افراد تیزی سے کمرے کی طرف آ رہے ہیں۔ یہ کون تھے؟ پولیس کے سادہ پوش؟ میرے سسر آصف جاہ کے ہرکارے؟ یا پھر موکھل پارٹی کے لوگ؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے وقت درکار تھا اور میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ ایک سیکنڈ بھی نہیں تھا۔ یہ بس فیصلے کا لمحہ تھا اور یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مجھے رکنا ہے یا بھاگ جانا

ہے۔ رکنے میں نقصان کے علاوہ اور کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ دوسرے ڈھاٹا پوش نے پھرتی سے اپنے گرے ہوئے پسٹل تک پہنچنے کی کوشش کی۔ میں نے لات چلا کر اسے برآمدے میں پھینک دیا۔ پہلے ڈھاٹا پوش کے قدموں کے قریب دو فائر کرنے کے بعد میں نے کھڑکی۔۔۔۔ سے جست لگائی اور باہر آگیا۔ ایک دیوانہ وار کوشش کے ساتھ میں دیوار پہ آیا اور باہر کیچڑ میں کود گیا۔ دھماکوں سے کئی چنگاریاں دیوار کے بالائی کنارے پر بکھریں۔ بارش کی بوچھاڑیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں اندھا دھند ایک گلی میں بھاگتا چلا گیا۔ اس سے آگے کھیت اور درخت تھے۔ درخت سے آگے خودرو جنتروں کا ایک وسیع سلسلہ تھا۔ میں ان جنتروں میں گھستا چلا گیا۔ ذہن میں بار بار یہ خیال لپک رہا تھا کہ مجھے تلاش کرنے والے اچانک یہاں کیسے پہنچ گئے؟ کیا وہ پہلے سے یہاں موجود تھے؟ یہ امکان کافی روشن تھا۔ ہو سکتا تھا کہ پولیس والے سادہ لباس میں اس گھر کی نگرانی کر رہے ہوں۔ انہیں توقع ہو کہ موجودہ حالات میں، میں ثمینہ تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔

مسلسل بارش کے سبب زمین بھاگنے کے لیے بالکل غیر موزوں تھی۔ خودرو جھاڑیاں میرے چہرے اور ہاتھوں پر گہرے خراش ڈال رہی تھیں لیکن میں دیہاتی ماحول کا پالا پوسا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہوا تھا۔ انہی نشیب و فراز میں بھاگ بھاگ کر جوان ہوا تھا۔ لڑکپن کی اندھیری راتوں میں میں نے ایسے ہی کھیتوں کھلیانوں میں دوڑیں لگائی تھیں اور یاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ شاید میں آج آنکھ مچولی کھیل رہا تھا مگر یہ بے حد سنگین تھا۔ مجھ پر قتل کا الزام آگیا تھا اور میں ایک بااختیار چودھری ہونے کے باوجود چھپتا پھر رہا تھا۔

مجھے اپنے عقب میں ہوائی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ یقیناً کچھ لوگ میرے تعاقب میں بھی آئے تھے مگر میں جلد ہی ان کی پہنچ سے دور نکل گیا۔ میرا گھوڑا وہیں گاؤں کی گلی میں بندھا رہ گیا تھا۔ میرے پاس اپنا پستول موجود تھا۔ اس لیے میں نے حملہ آور سے چھینی ہوئی رائفل وہیں ایک جوہڑ میں پھینک دی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے ایک ٹریکٹر ٹرالی نظر آگئی۔ بجلی کی چمک نے ٹرالی کو نمایاں کیا تو اس پر دو کسان، چارے کے بہت سے گٹھوں سمیت بیٹھے نظر آئے۔ میں نے ان سے درخواست کی اور انہوں نے دیہی علاقوں کی مخصوص سادہ لوحی کے ساتھ مجھے سوار کر لیا۔ تاریکی کے سبب میرے چہرے کی خونی خراشیں وغیرہ ان کی نظروں سے اوجھل رہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات کے آخری پہر میں ایک بار پھر کا چھو والی میں تیمور کے پاس پہنچ چکا تھا۔ چاچار فاقت میری غیر موجودگی سے بے خبر نہیں رہے تھے۔ انہوں نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئیے تھا۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ لمبڑ برادری کے لوگ اور پولیس والے ہر جگہ تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔"

پھر انہوں نے غور سے میرے چہرے کی خراشوں کو دیکھ کر کہا۔ "لگتا ہے کہ تمہارا کسی سے ٹاکرا ہوا ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، تیمور نے پوچھا۔ "گھوڑا کہاں ہے؟"

"گھوڑا وہیں رہ گیا ہے شام پور میں۔"

پھر میں نے تفصیل سے سب کچھ تیمور اور چاچار فاقت کے گوش گزار کر دیا۔ ساتھ ساتھ میں انگیٹھی پر خود کو اور اپنے گیلے کپڑوں کو سینکتا رہا۔ ثمینہ سے اپنی ملاقات اور مکالمے کا سارا احوال میں نے انہیں سنایا اور بتایا کہ ثمینہ نے میرے خلاف بیان کیوں اور کس وجہ سے

دیا ہے۔ آخر میں، میں نے اچانک اندر گھس آنے والے بندوں کا ذکر کیا اور ان کے چنگل سے نکلنے کی تفصیل بتائی۔

اس ساری روداد میں تیمور اور چاچار فاقت کے لیے پریشانی کی ایک ہی بات تھی اور وہ یہ کہ جس گھوڑے پر میں گیا تھا وہ وہیں رہ گیا تھا۔

چاچار فاقت نے کہا۔ "پولیس والے اب گھوڑے کے ذریعے اپنی تفتیش آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ ہمارے پنڈ میں چتکبرے گھوڑے چار پانچ ہی ہیں۔ ان میں سے دو میرے پاس ہیں۔ داغ کی وجہ سے بھی مصیبت پڑ سکتی ہے۔"

داغ اس نشانی کو کہتے ہیں جو جانوروں کی شناخت کے لیے ان کے جسم پر بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر ایک طویلے یا مویشی خانے کے جانوروں کا داغ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔

کچھ دیر تک اس موضوع پر بات ہوتی رہی پھر چاچار فاقت نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ "بہرحال، ایک بات تو امید دلانے والی ہوئی ہے۔ ثمینہ کے سامنے اصل صورتِ حال آ گئی ہے۔ اگر وہ تھوڑی سی دلیری دکھائے اور اپنا نیا بیان لکھوا دے تو کیس کافی کمزور پڑ سکتا ہے۔ حقیقت میں یہ ثمینہ کا بیان ہی ہے جس نے تمہیں اتنی بری طرح پھنسایا ہے۔"

"لیکن یہاں یہ مسئلہ بھی ہے کہ مخالف پارٹی ثمینہ پر اثر ڈالے گی۔" تیمور نے کہا۔ "اور مخالف پارٹی تو رہی ایک طرف، خود پولیس بھی پارٹی بنی ہوئی ہے۔ اب دیکھیں نا۔۔۔۔ ثمینہ کا بیان کچھ اور طرح کا تھا مگر اسے توڑ مروڑ کر لکھا کچھ اور طرح گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال تو یہ ہے کہ ہم جتنی جلدی کسی اچھے وکیل کا انتظام کر لیں، اتنا ہی بہتر ہے۔ وکیل ہی ہمیں مشورہ دے گا کہ ہم ثمینہ کو آلے دوالے کے پریشر سے کس طرح بچا کر رکھیں۔"

"دیکھیں جی، اگر تو ثمینہ عقل مند ہوئی، وہ اپنے بدلے ہوئے بیان کے بارے میں ابھی کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ مگر مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ سیدھی سادی کڑی ہے۔ اسے ان قانونی چکروں کا کیا پتا؟" چاچا فاقت نے اپنی رائے کو خود ہی رد کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

میرا دل اس وقت کافی اچاٹ تھا۔ کچھ کھانے پینے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ زندگی میں کبھی سوچا نہیں تھا کہ مجھ پر اس طرح قتلِ عمد کا الزام لگے گا اور میں اپنی جان بچاتا پھروں گا۔ کہتے ہیں کہ دفعہ 302 ایسی بلا ہے کہ اسے ہرے بھرے درخت پر بھی لکھ دیا جائے تو وہ تھوڑے عرصے میں سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے۔ اس کہاوت کی حقیقت مجھے اب معلوم ہو رہی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تھی۔ صبح چاچا فاقت نے زبردستی دہی اور پراٹھے کا ناشتا کرایا۔ وہ خود بھی پریشان تھے لیکن مجھے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

شام تک ہمیں کچھ تسلی ہو گئی۔ لگ رہا تھا کہ شاید چتکبرے گھوڑے والا معاملہ زیادہ خطرناک ثابت نہ ہو۔ میرے اور تیمور کے کپڑے پچھلے چند دنوں میں برباد ہو گئے تھے۔ چاچا فاقت کہیں سے ہم دونوں کے لیے ہمارے ناپ کے دو جوڑے لے آئے۔ ساتھ میں شیو کے لیے ریزر اور بلیڈ وغیرہ بھی تھے۔ ہم نے کئی دنوں کے بعد نہا کر کپڑے پہنے۔ چاچا فاقت نے ملازمہ سے مٹروں والے چاول اور دیسی مرغی کا قورمہ بنوایا تھا۔ ابھی ہم نے دو لقمے ہی لیے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ایسی ہر "دستک" ہماری رگوں میں خون کی گردش تیز کر دیتی تھی۔ چاچا فاقت نے ہمارے کمرے کی بتی بجھا کر دروازہ بند کر دیا اور بیرونی دروازے پر پہنچ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"دروازہ کھولو جی۔" باہر سے ساجے کے ٹو کی آواز سنائی دی۔

ہمیں کچھ اطمینان ہوا۔۔۔۔ لیکن یہ اطمینان زیادہ دیر قائم نہیں رہا۔ کے ٹو اندر آیا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ پاؤں اور جوتے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔

بلب کی روشنی میں اس نے بڑے غور سے میرا چہرہ دیکھا اور بولا۔ "یہ کیا ہوا ہے خاور! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب بھی پوچھ رہے ہو خیریت ہے؟" اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔

"یار! کچھ منہ سے بھی تو بولو۔"

"واقعی تمہیں کچھ پتا نہیں۔" وہ لرزاں آواز میں بولا۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز بھی تھا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں۔ تم بکواس کرو کیا ہوا ہے۔" میں نے اس کا کندھا جھنجھوڑا۔

"ثمینہ قتل ہو گئی ہے۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ شام پور میں سب کہہ رہے ہیں کہ اسے بھی تم نے مارا ہے۔"

میرے سر پر جیسے کسی نے کئی ہزار پاؤنڈ وزنی بم گرا دیا تھا۔ تیمور کا چہرہ بھی سکتہ زدہ رہ گیا۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ میں بے دم سا ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں کراہا۔

"وہی جو ساری دنیا کہہ رہی ہے۔ ثمینہ کے سینے میں دو گولیاں لگی ہیں۔ وہ گھر میں ہی مر گئی تھی۔ آج صبح سویرے پولیس تمہاری والدہ اور بہن عارفہ کو بچے سمیت پکڑ کر تھانے لے گئی تھی۔۔۔۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے بیگم بلقیس انہیں بڑی مشکل سے گھر لے کر آئی ہیں۔ پر لگتا ہے کہ پولیس والے انہیں صبح پھر لے جائیں گے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے یار! ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ابھی ایک بھنور سے نکل نہیں پائے تھے کہ دوسرے نے جکڑ لیا تھا۔۔۔۔ یااللہ! یہ کن گناہوں کی اتنی سخت سزا مل رہی ہے۔۔۔۔ میں نے دل ہی دل میں فریاد کی۔

کے ٹو کی آب دیدہ نظریں بہ دستور میرے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ جیسے میرے تاثرات سے اندر کے حالات جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ "کیا۔۔۔۔ تم نے۔۔۔۔ خود لاش دیکھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیسی بات کر رہے ہو۔ میری مت ماری گئی تھی جو میں لاش دیکھنے شام پور جاتا۔ پولیس ہر جگہ تمہیں کھوجتی پھر رہی ہے۔ جس کسی سے تمہارا تھوڑا بہت بھی میل جول رہا ہے، اسے

پکڑا جا رہا ہے اور الٹا لٹکایا جا رہا ہے۔ میں کل صبح سویرے سے نکلا ہوا ہوں، ابھی تک گھر نہیں گیا۔"

"میری بھی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ کیا ہو رہا ہے۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میں کل رات شام پور ضرور گیا تھا اور ثمینہ سے بھی ملا ہوں لیکن اس ملاقات کی سزا ثمینہ کو موت کی صورت میں ملے گی، یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔" مجھے محسوس ہوا کہ میری آنکھوں میں آتشیں آنسو جمع ہو گئے ہیں۔ سینے میں شعلے سے بھڑکنے لگے۔

ثمینہ کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ اس کی معصوم آنکھیں۔۔۔۔ اس کی آواز۔۔۔۔ اس کے آخری الفاظ! کیا واقعی وہ اس دنیا میں نہیں رہی تھی؟ مر کر مٹی ہو چکی تھی؟ اس کے سینے میں دو گولیاں لگی تھیں۔۔۔۔ کس نے چلائی تھیں یہ دو گولیاں؟ جو دو یا تین فائر میں نے کیے تھے وہ تو زمین میں لگے تھے۔ اس وقت ثمینہ سہمی سمٹی کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت آمیز خوف لہریں لے رہا تھا اور یہ اس کی آخری جھلک تھی جو میں نے دیکھی تھی۔

وہ یتیم مسکین لڑکی جس کی حفاظت کا وعدہ والی جی نے کیا تھا۔۔۔۔ اور مرتے وقت جس کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی، کل رات ماری گئی تھی۔۔۔۔ عین جوانی میں، اپنی ناتمام آرزوؤں سمیت اور اس کی موت کا ذمے دار بھی مجھے ٹھہرایا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس پناہ گاہ سے نکلوں اور شہوار و ثمینہ کے قاتلوں کو ڈھونڈ کر عبرتِ نشاں بنا دوں۔

"تم ہی کچھ بتاؤ خاور۔۔۔۔ آخر کیا ہوا ہے ثمینہ کے ساتھ؟" کے ٹو نے پوچھا۔ اس کی تیز کھوجتی ہوئی نظریں میری آنکھوں میں گڑی تھیں۔

مجھے اس کے انداز نے تاؤ دلا دیا۔ میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف۔۔۔۔ اگر مجھ پر شبہ تو پھر پکڑ لو مجھے۔ قانون کی مدد کرو۔ مجھے باندھ کر ڈال دو یہاں اور پولیس کو بلا لو۔ تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے اور میری بھی جان چھوٹے اس بھاگ دوڑ کے عذاب سے۔ لگوا دو مجھے ہتھکڑیاں!" میں نے دونوں ہاتھ کے ٹو اور تیمور کے سامنے کر دیے۔

میرے انداز نے کے ٹو کا چہرہ متغیر کر دیا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "یار! کیسی باتیں کرتے ہو تم؟ ہم تم پر شبہ کر سکتے ہیں؟ کیا ہم جانتے نہیں ہیں تمہیں؟ ہم تو صرف یہ بات کہہ رہے ہیں کہ۔۔۔۔۔"

"تم کوئی بات نہ کرو۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "میں بس پیش ہو جانا چاہتا ہوں۔ میں اپنے گھر والوں کے لیے اور تم سب کے لیے اور مصیبتیں کھڑی کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے جب کوئی جرم نہیں کیا تو پھر کیوں بھاگوں؟ میں گرفتاری دوں گا اور پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"جن دو وکیلوں کے نام تم نے بتائے تھے، ان میں سے بس ایک ہی مل سکا ہے۔" کے ٹو نے کہا۔ "لیکن وہ بھی ڈانواں ڈول نظر آ رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لمبڑ برادری کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اسے پتا ہے کہ یہ خطرناک لوگ ہیں اور معاملہ ان کی بیٹی کے قتل کا ہے۔۔۔۔۔ لیکن تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی پھر لاہور کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو کل تک کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

چاچا رفاقت اندر گئے اور کچھ دیر بعد بڑے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی کے ساتھ واپس آئے۔ انہوں نے یہ گڈی زبردستی ساجے کے ٹو کی جیب میں ڈال دی۔

کے ٹو چلا گیا تو ہم ایک بار پھر امید و مایوسی کی کیفیت میں ڈوب گئے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر بے بے جی اور عارفہ کی طرف سے تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اطمینان بھی تھا اور وہ یہ کہ بلقیس موجود ہے اور وہ ان کی ہمدردی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔

کل رات کے مناظر رہ رہ کر میری نگاہوں میں گھومتے تھے۔ سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ ثمینہ سے میری باتوں کے دوران میں وہ لوگ آناً فاناً اندر گھسے تھے۔ اگر مجھے ہلکا سا شبہ بھی ہوتا تو میں بھاگنے کی بجائے ان سے لڑ کر وہیں مر جانے کو ترجیح دیتا۔ یہاں سوال یہ بھی تھا کہ وہ تھے کون؟

"تمہارا کیا خیال ہے تیمور۔۔۔۔۔ وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"لگتا تو یہی ہے میاں وارث نے گھر کے آس پاس اپنے اہل کار چھپائے ہوئے تھے۔ اسے پتا تھا کہ ثمینہ کے بیان نے تم کو ضرور تنگ کرنا ہے اور ہو سکتا ہے کہ تم ثمینہ کو جھنجوڑنے کے لیے اس کے پاس آؤ۔"

"لیکن ایک بات شک میں ڈالتی ہے۔اگر وہ پولیس والے تھے تو انہیں چہروں پر ڈھاٹے باندھنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔۔اور پھر ثمینہ کا قتل؟"

"جب پولیس کسی کی دشمنی میں اتر آئے تو پھر کیا نہیں کر سکتی۔اگر ان لوگوں نے تمہیں پھنسانے کا پکا ارادہ کیا ہوا ہے تو پھر وہ ہر کام کر سکتے ہیں۔ثمینہ کے مرنے سے ہمارے مخالفوں کو دو فائدے ہوئے ہیں۔ایک تو اس کا پہلا بیان ہی آخری بیان بن گیا ہے۔یعنی تم ہی شہوار کو مارنے والے ہو۔دوسرے ثمینہ کی موت کا الزام بھی سیدھا سیدھا حاتم پر آرہا ہے۔"

"یار! میرا دھیان آصف جاہ کی طرف بھی جا رہا ہے۔کہیں ایسا تو نہیں کہ شام پور میں جو کچھ ہوا، انہوں نے کیا ہو۔"

"یہ بھی ایسی ناممکن بات تو نہیں ہے۔" تیمور نے کہا۔

کھانا ہمارے سامنے ویسے کا ویسا پڑا تھا۔چاچا رفاقت سمیت کسی نے اس میں سے ایک لقمہ بھی نہیں لیا تھا۔بلب کی زرد روشنی یرقان زدہ نظر آرہی تھی۔کسی قریبی کمرے میں چاچے رفاقت کی بیمار بیوی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔

۔۔۔۔اگلے روز کے ٹو واپس نہیں لوٹا۔اس سے اگلے روز بھی ہم اس کا انتظار کرتے رہے۔اس کی وجہ سے ہماری پریشانیوں میں گوناگوں اضافہ ہو گیا۔کئی طرح کے اندیشے ذہن میں کلبلانے لگے۔کہیں اسے بھی تو کسی نے نقصان نہیں پہنچا دیا تھا۔۔۔۔یا کہیں وہ بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہو؟اگر کوئی ایسی بات تھی تو یہ ہمارے لیے بہت خطرناک تھی۔ایسی صورت میں یہ ٹھکانا بھی ہمارے لیے محفوظ نہیں تھا۔کسی بھی وقت گھر کے دروازے پر پولیس کی دستک ہو سکتی تھی۔

دوپہر کے وقت میں نے ایک بار پھر تیمور اور چاچا رفاقت سے مشورہ کیا۔مجھے لگ رہا تھا کہ ہم جتنی دیر کر رہے ہیں، اپنے کیس کو اتنا ہی خراب کرتے چلے جا رہے ہیں۔میری رائے تھی کہ میں علاقے کے کسی معتبر شخص کے ذریعے اپنی گرفتاری دے دوں۔۔۔۔

چاچا رفاقت ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد گئے تو واپسی پر انہوں نے ایک اہم اطلاع دی۔انہیں پتا چلا تھا کہ دوپہر ایک بجے کے قریب جاگیر کی دو گاڑیاں "کاچھو والی" کے پاس سے گزر کر ڈیک نالے کی طرف گئی ہیں۔ایک گاڑی میں مسلح محافظ موجود تھے اور خیال ہے کہ دوسری گاڑی میں جاگیر کی بیگم بلقیس خود تھیں۔

بلقیس کے ذکر نے میرے سینے میں ہلچل سی مچائی۔اس کے ساتھ ہی کئی سوال ابھرے۔وہ جاگیر سے اتنی دور کیا کرنے آئی تھی؟اور کہاں گئی تھی؟

چاچے رفاقت نے کہا۔"اندازہ ہے کہ بیگم جی،ڈیک نالے کے کنارے پر کسی گاؤں میں گئی ہیں۔یقینی بات ہے کہ ان کی واپسی بھی اسی راستے سے ہو گی۔"

یہ بات خود بھی میرے ذہن میں آرہی تھی۔اگر بلقیس نے واپس یہاں سے گزرنا تھا تو پھر اس سے ایک مختصر سی ملاقات بھی ہوسکتی تھی۔میں اس کے سامنے اپنی زبان سے بے گناہی بیان کر سکتا تھا۔اس کے علاوہ اپنے گھر والوں کے بارے میں بھی بات کر سکتا تھا لیکن اس میں خطرہ بھی موجود تھا۔اگر مخالف پارٹی کے کچھ لوگ یا کوئی مخبر وغیرہ بلقیس کے ارد گرد موجود تھے تو میں پھنس سکتا تھا۔

سوچ بچار کے بعد میں نے تیمور کے ساتھ باہر نکلنے کا فیصلہ کیا۔سورج ڈھلتے ہی دھوپ غائب ہو گئی تھی اور سرد ہوا چل رہی تھی۔چاچارفاقت کے پاس ایک تانگا موجود تھا۔میں نے اپنا چہرہ اونی مفلر میں چھپالیا۔گرم چادر بھی اوڑھ لی۔گھر کے احاطے سے ہی ہم تانگے میں بیٹھ گئے۔چاچے رفاقت کا خاص ملازم اچھوتا تانگا ہانکنے لگا۔قریباًدس منٹ بعد ہم گاؤں سے

نکل کر ایک چھوٹی راج بہا کے کنارے گھنے درختوں میں پہنچ چکے تھے۔راج بہا کے ساتھ ساتھ ایک کچا راستہ ڈیک نالے کی طرف جاتا تھا۔ہم نے تانگا وہاں کھڑا کر دیا۔پروگرام کے مطابق اچھونے اپنے اوزاروں کی مدد سے تانگے کا ایک پہیا علیحدہ کر دیا اور اس کے جوڑ توڑ میں مصروف ہو گیا۔اب ہمیں کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ راستے میں تانگے کا پہیا نکل گیا ہے اور ہم مرمت میں مصروف ہیں۔

ہم کافی دن بعد باہر نکلے تھے۔خاص طور سے تیمور تو کئی روز سے مسلسل چاچے رفاقت کے گھر میں بند تھا۔اس نے ایک لمبی سانس لی اور تازہ ہوا کو اپنے کشادہ سینے میں بھر کر بولا۔"یار !یہ کھیت،یہ پگڈنڈیاں،یہ درخت اور درختوں پر اڑتے ہوئے پنچھی،سب کچھ ویسا ہی ہے،پر ہم کتنے بدل گئے ہیں ان دو چار دنوں میں۔۔۔۔لگتا ہے کہ یہ کوئی اور دنیا ہے۔۔۔۔ہم کسی اور دنیا میں ہیں۔"

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔یہ جو کچھ ہے وقتی ہے۔"میں نے اسے تسلی دی۔

ہم باتیں کرتے رہے۔ہمیں قریباًایک گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔پھر کچے راستے پر گاڑی کی اڑائی ہوئی گرد نظر آنی شروع ہوئی۔ڈوبتے سورج کی روشنی میں،میں نے پہچان لیا۔یہ حویلی کی

جیپ ہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوئی اور میں چادر لپیٹے جھاڑیوں سے نکل آیا۔ میری قمیض کے نیچے بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ جیپ دھول اڑاتی بالکل نزدیک پہنچ چکی تھی۔ مجھے اگلی نشستوں پر ڈرائیور صوفی اسلم اور دو تین مسلح محافظ نظر آئے۔ پچھلی نشستوں پر بلقیس اور تاجو موجود تھیں۔ میں جیپ کے سامنے آگیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ محافظ چوکس ہو گئے۔ ان میں شبیر بھی موجود تھا۔

"کیا بات ہے؟" شبیر نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔ اس کی گرفت آٹو میٹک رائفل پر مضبوط تھی۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اپنے چہرے سے مفلر ہٹا دیا۔ گاڑی میں موجود تقریباً سبھی لوگ چونک گئے۔ میں نے بلقیس کی حیران آنکھیں دیکھیں۔ بس ایک جھلک دکھا کر یہ آنکھیں اوڑھنی کے پیچھے اوجھل ہو گئیں۔ "شبیر! دروازہ کھولو۔ میں دو منٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

شبیر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ متذبذب بھی تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے بلقیس کی طرف دیکھا، پھر کوئی واضح اشارہ نہ پا کر اس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ میں اگلی

نشستوں میں شبیر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہ سب میرے ساتھی تھے یا ملازم تھے لیکن ان سب کے چہروں پر بے گانگی کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ پریشان اور گنگ بیٹھے تھے۔ ان سب کی موجودگی میں، میں بلقیس کو بے تکلفی سے مخاطب نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ بے تکلفی اب گزرے زمانوں کی بات ہو چکی تھی۔ میں نے بلقیس کی طرف دیکھے بغیر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں چند لفظوں میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں گناہ گار نہیں ہوں۔ میں نے شہوار کو نہیں مارا اور نہ ثمینہ کی موت میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر بلقیس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے کہا۔ "تم جو کچھ کہنا چاہ رہے ہو، وہ سب ہمیں پتا ہے لیکن۔۔۔۔ حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ بھائی جی عزیز نے بڑے وکیل راٹھور صاحب کو بلایا ہوا تھا، وہ بھی کوئی امید دلا کر نہیں گئے۔ ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ تم نے بھاگ کر اپنا کیس اور خراب کر لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے جی کہ مجھ سے یہ غلطی ہوئی۔اور ہو سکتا ہے کہ میری جگہ اگر چودھری عزیز بھی ہوتے تو ان سے ایسی غلطی ہو جاتی۔لیکن غلطیوں کو ٹھیک بھی تو کیا جاتا ہے۔اب میں پیش ہونا چاہتا ہوں۔"

اس بات کا بلقیس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔وہ جیسے خود کو اس مسئلے پر رائے دینے کا اہل نہیں سمجھ رہی تھی۔گھونگھٹ کی اوٹ میں اس کا چہرہ تقریباً او جھل تھا۔بس ناک کا مختصر حصہ دکھائی دیتا تھا۔وہی چمک جو آنکھوں کے راستے دل میں اترا کرتی تھی۔

میں نے پوچھا۔"بے بے جی اور عارفہ کا کیا حال ہے؟"

بلقیس نے دھیمی مگر ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔"وہ ابھی تک تو خیریت سے ہیں۔"

بلقیس کے پاس ہی نشست پر تہہ کی ہوئی جائے نماز رکھی تھی۔لگتا تھا کہ راستے میں بھی اس نے نماز قضا نہیں کی ہے۔وہ کافی بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔

میں نے کہا۔"میں ایک بار پھر آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں۔ان دونوں اموات میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔میں بالکل بے قصور ہوں۔پتا نہیں مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔"

"بس اللہ سے معافی مانگنی چاہئیے۔"اس نے بہ ظاہر عام سے لہجے میں کہا۔

لیکن یہ عام لہجہ نہیں تھا اور یہ فقرہ بھی عام نہیں تھا۔میں نے محسوس کیا کہ یہ فقرہ ایک خاص سمت میں اشارہ کر رہا ہے۔ان دنوں کی طرف۔۔۔۔۔جب ہمارے درمیان ایک مواصلاتی رابطہ تھا اور ہم ایک تیز بہاؤ میں بہتے جا رہے تھے۔اور ان سارے واقعات کی طرف جو اس "دورِ جنوں" میں رونما ہوئے۔

اسی دوران میں مجھے جیپ کے عقب میں ایک اور گاڑی کے آثار نظر آئے۔وہ دھول اڑاتی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔مجھے یاد آیا کہ چاچا رفاقت نے دو گاڑیوں کا ذکر کیا تھا۔یہ دوسری گاڑی شاید تھوڑی پیچھے رہ گئی تھی۔

"یہ کون آرہا ہے؟"میں نے شبیر سے پوچھا۔

"باقی کے گارڈ ہیں۔ساتھ میں چودھری عزیز بھی ہیں۔"شبیر نے بتایا پھر ذرا توقف سے بولا۔"یہ ہمارے ساتھ ہی تھے۔راستے میں چودھری عزیز کا ایک جاننے والا مل گیا تھا،وہ دو منٹ کے لیے ان کے پاس رک گئے تھے۔ہم نے ذرا آگے مغلوں کے باغ میں رک کر ان کا انتظار کرنا تھا۔"

مجھے امید نہیں تھی کہ یہاں چودھری عزیز سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ چند ہی لمحوں بعد تیز رفتار جیپ ہمارے قریب آکر رک گئی۔ اس میں اگلی نشست پر چودھری عزیز نظر آرہا تھا۔ پچھلی نشستوں پر گارڈز بھرے ہوئے تھے۔ عام طور پر حویلی کی جیپ کے ساتھ جو گارڈز جاتے تھے، وہ گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے۔ مگر کبھی کبھی راستے کی مناسبت سے گاڑی بھی استعمال کی جاتی تھی۔

میں بلقیس والی جیپ سے نکل کر چودھری عزیز کے پاس پہنچ گیا۔ چودھری عزیز بھی مجھے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ جلدی سے باہر نکلا اور مجھ سے بغل گیر ہوا۔ اس نے میرا خراشوں سے بھرا ہوا چہرہ اور میرا ابتر حلیہ دیکھا تو۔۔۔۔ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے لہرا گئے۔

"یار! یہ سب کیا ہو گیا ہے؟ اس نے ایک بار پھر مجھے گلے سے لگایا۔

۔۔۔۔ ڈکیت بارے والے واقعے کے بعد سے چودھری عزیز بہ تدریج بہت بدل گیا تھا۔ اس نے صوفی اسلم کو ہدایت کی کہ وہ اپنی گاڑی "مغلوں والے باغ" میں لے جائے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اس اجڑے ویران باغ میں داخل ہو گئیں۔ یہاں ایک دو جگہ ٹوٹی پھوٹی پرانی دیواریں اور دو چار برجیاں موجود تھیں۔ چودھری عزیز نے اپنی گاڑی کے

سارے محافظوں کو گاڑی سے باہر نکال دیا۔ اب صرف وہ اور میں گاڑی میں تھے۔ شام کے سائے گہری تاریکی میں بدلتے جا رہے تھے۔

چودھری عزیز نے اپنی چھوٹی چھوٹی داڑھی میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ "میں تو رات دن دعا ہی کر رہا تھا کہ کسی طرح تم سے ملاقات ہو جائے۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا ہے۔"

پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوا ہوں اور کیسے یہاں پہنچا ہوں۔ چودھری عزیز کو بتا دینے میں حرج تو نہیں تھا مگر خطرہ اس بات کا تھا کہ کل کلاں کہیں چودھری بھی پولیس کی تفتیش میں نہ جکڑا جائے۔ میں نے کاچھو والی کا نام نہیں لیا اور اسے یہی بتایا کہ ابھی یہاں وہاں بھٹک رہا ہوں اور تیمور بھی میرے ساتھ ہے۔

چودھری عزیز کی آنکھوں میں تشویش کے گہرے سائے دکھائی دیتے تھے۔ اس نے میرا کندھا دبایا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ایک بات پتھر پر لکیر ہے۔۔۔۔ اور تم بھی اس کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لو۔ اگر اس موقع پر تم نے گرفتاری دی تو پولیس نے تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا۔ پورا پروگرام بنا ہوا ہے۔ مجھے ساری بات کا پتا ہے۔"

یہ کیا کہہ رہے ہو چودھری؟"

"وہی جو سچ ہے۔ یہ تو اللہ کا کوئی خاص کرم ہے جو میری تمہاری ملاقات ہو گئی ہے۔ میری تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔" چودھری کی آواز بہ دستور لرز رہی تھی۔ اس نے لہجہ مزید دھیما کرتے ہوئے کہا۔ "اندر خانے موکھلوں اور لمبڑوں میں پورا گٹھ جوڑ ہو چکا ہے۔ میاں وارث نے ان کو یقین دلایا ہے کہ وہ اس ہلے گلے میں تمہیں ہر صورت پار کر دے گا۔ گرفتاری کے وقت پولیس مقابلہ بنا دینا یا حراست سے دوبارہ فراری کا ڈرامہ رچانا ان کے لئے بالکل مشکل نہیں۔"

"یہ تم نئی بات بتا رہے ہو چودھری عزیز۔۔۔۔ میں تو آج کل میں پیش ہونے کا سوچ رہا تھا۔ تیمور کا بھی یہی خیال تھا۔"

"مجھے بھی اسی بات کا ڈر لگا ہوا تھا۔۔۔۔ یہ دیکھو، میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اس طرح کا خیال بھی ابھی ذہن میں نہیں لانا ہے۔ وہ خبیث میاں وارث بالکل زہری ناگ بنا ہوا ہے۔ دو دن پہلے قلعہ والا میں تمہارے سسر آصف جاہ سے بھی مل کے آیا ہے۔ لمبی رقم لی ہے اس نے۔۔۔۔ بلکہ خانہ خراب دونوں طرف سے پیسہ کھا رہا ہے۔ اس کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں گھسی ہوئی ہیں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"دونوں طرف سے پیسہ کھا رہا ہے۔۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔۔؟"

چودھری عزیز نے فوراً سے میرا چہرہ دیکھا۔ "تمہیں بلقیس نے بتایا نہیں کہ ہم کہاں سے آ رہے ہیں۔؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ چودھری عزیز نے پوچھا۔ "تمہاری والدہ اور بہن کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا؟" میں چونک گیا اور ایک بار پھر نفی میں جواب دیا۔

چودھری عزیز نے کہا۔ "آج صبح سویرے پانچ بجے کے قریب انہیں پھر پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ نو دس بجے بلقیس نے اور میں نے بڑی مشکل سے ان کی جان چھڑوائی ہے۔ میاں وارث نے پورا ستر ہزار روپیہ لیا ہے۔"

میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ جی چاہا کہ خود کو مار لوں یا میاں وارث اور اس جیسے سارے دشمنوں کو ختم کر ڈالوں۔ "اب وہ دونوں کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

چودھری عزیز بولا۔ "میاں وارث سے اتنا معاملہ طے ہوا ہے کہ وہ دونوں عورتوں کو بے جا تنگ نہیں کرے گا اور اگر ان سے تفتیش کی ضرورت پڑی بھی تو ہم انہیں خود اپنے ساتھ لے کر آئیں گے اور لے جائیں گے۔ میاں وارث کی طرف سے تسلی ہونے کے بعد ہم تمہاری والدہ اور بہن کو بچے سمیت ایک قریبی موضع کیکراں والی چھوڑ آئے ہیں۔ ابھی ہم ا

نہیں چھوڑ کر ہی آ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ بڑی رازداری سے ہوا ہے۔ ان دونوں نے ٹوپی والے دیسی برقع پہن رکھے تھے۔ شبیر کے سوا کسی محافظ کو بھی پتا نہیں کہ یہ عورتیں کون ہیں۔ یہاں بلقیس کی ایک خالہ زاد بہن خدیجہ رہتی ہے۔ اس کے گھر میں وہ بالکل حفاظت اور آرام سے رہیں گی۔"

"وہاں راجوال میں کوئی مسئلہ تھا؟"

"سب سے بڑا مسئلہ تو یہ موکھل اور لمبڑ ہی ہیں۔ خاص طور سے لمبڑ آصف جاہ۔ بلقیس کو اور مجھے ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ آصف جاہ تمہارے گھر والوں کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ وہ بالکل آگ بگولہ ہو رہا ہے۔ اس کے کندھے سے ہر وقت رائفل لٹکی رہتی ہے اور وہ علاقے میں جیپ بھگاتا پھرتا ہے۔ اس کے دو نہایت خطرناک کارندے بھی ہر وقت اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔"

چودھری عزیز نے مجھے آصف جاہ کے بارے میں اور بھی کئی باتیں بتائیں جن سے پتا چلتا تھا کہ اس نے میری تلاش میں دن رات ایک کئے ہوئے ہیں۔

چودھری عزیز سے پندرہ بیس منٹ تک بات چیت ہوئی ہے۔ اس بات چیت کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل تھا کہ اپنی گرفتاری پیش کرنے کا فیصلہ نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

چودھری عزیز نے میرا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ "لیکن خاور۔۔۔۔۔ تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جوں جوں وقت گزرے گا، حالات ٹھیک ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اور اگر نہ ہوئے تو تم کچھ دنوں کے لئے بالکل روپوش ہو جانا۔ ہم تمہاری جان کا خطرہ کسی طور مول نہیں لے سکتے۔ تمہارا نقصان جاگیر کا نقصان ہے۔ ابھی والی جی کی جاگیر کو اور ہم سب کو تمہاری بہت ضرورت ہے یار۔" اس نے ایک بار پھر جذباتی انداز میں میرا کندھا دبایا۔

اس نے مجھے ڈسکے کا ایک ٹیلی فون نمبر دیتے ہوئے کہا۔ "اس نمبر پر فراست علی نام کا ایک بندہ ہو گا۔ تم اس کو میرے لئے جو بھی پیغام دو گے۔ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے مل جائے گا۔ گاؤں کی تازہ ترین صورتِ حال بھی تمہیں فراست سے معلوم ہوتی رہے گی۔ تم جہاں بھی جاؤ وقتاً فوقتاً فراست کو فون کرتے رہنا۔ میں نے بھی تمہیں کوئی پیغام دینا ہو تو فراست کے ذریعے دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری یہ بات ٹھیک ہے کہ مجھے ابھی کچھ عرصے کے لئے روپوش رہنا چاہئے لیکن اس معاملے کو زیادہ لمبا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ کسی بڑے پولیس افسر یا پھر معتبر سیاسی بندے کے ذریعے گرفتاری دی جائے۔ وہ ہمیں اس بات کی ضمانت دیں گے کہ ہمارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہو گا۔ مجھے یقین ہے چودھری عزیز کہ اگر ہم عدالتوں تک پہنچ گئے تو کامیاب ہو جائیں گے۔ ہماری بے گناہی ثابت ہو جائے گی وہاں۔"

"تم درست کہہ رہے ہو، پر اس کے لئے تھوڑا وقت چاہئے۔ میں اپنے طور پر بھی کچھ ایسے ضامن ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں جو گرفتاری دینے میں ہماری مدد کر سکیں لیکن جب تک ہمیں تسلی بخش ضامن نہیں ملیں گے ہم نے میاں وارث کے قریب نہیں پھٹکنا۔"
چودھری عزیز کا لہجہ حتمی تھا۔

اس نے بلقیس والی جیپ میں جا کر اس سے بھی پانچ دس منٹ مشورہ کیا۔ پھر آخر مجھے بتایا۔ "خاور! تم اماں جی اور بہن عارفہ کی طرف سے بالکل بے فکر رہو۔ ہمارے ہوتے کوئی ان کی طرف میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ بس تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ بلکہ میرے خیال میں تو

کوشش کرو کہ کچھ عرصے کے لئے اس علاقے سے ہی نکل جاؤ۔" میں نے چودھری عزیز سے کہا کہ وہ کسی بھی طرح میرے سسر آصف جاہ سے ملاقات کرے اور میری طرف سے اس کا ذہن صاف کرنے کی کوشش کرے۔ چودھری عزیز نے کہا کہ وہ اگلے چند دن میں خود یا کسی بندے کے ذریعے آصف جاہ سے ضروری بات کرے گا۔

اس مزید غم زدہ کر دینے والی ملاقات کے بعد بلقیس، چودھری عزیز اور ان کے گارڈز اپنے راستے پر آگے بڑھ گئے۔ جبکہ میں تانگے کی طرف واپس آ گیا۔ وہاں سخت سردی میں تیمور اور اچھو میرا انتظار کر رہے تھے۔

رات کو انگیٹھی کے گرد بیٹھ کر ہاتھ سینکتے ہوئے میں نے چاچا فاقت کو بلقیس اور چودھری عزیز سے ملاقات کی پوری تفصیل بتائی۔ یہ بات چاچا فاقت کو بھی پسند آئی کہ بلقیس نے میری والدہ اور بہن کی جان پولیس والوں سے چھڑا کر انہیں ڈیک نالے کے کنارے ایک دور دراز گاؤں میں پہنچا دیا ہے۔

کے ٹو کی واپسی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔اس کے حوالے سے مختلف اندیشے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔کے ٹو پر ہمیں پورا اعتبار تھا اس پر کسی طرح کا شبہ کرنا بہت مشکل تھا۔بس ذہن میں بار بار یہی خیال ابھر رہا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی معاملہ نہ ہو گیا ہو۔

رات کو پریشانی کے عالم میں، میں دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ تیمور سو گیا تھا۔ نیند کی حالت میں بھی اس کے چہرے پر پریشانی اور تکلیف کے سائے لہرا رہے تھے۔وہ بس میری دوستی کی سزا بھگت رہا تھا۔میں انہی خار دار راستوں پر چلتے چلتے کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک پیارے دوست باگو کو کھو چکا تھا،اب دوسرا نشانے پر تھا۔اگر تیمور بنگلا ٹائیگر والے کیس کی تاریخ پر نکلتے ہوئے میرا اہم سفر نہ ہوتا تو شاید آج اس حالت کو نہ پہنچتا۔

اچانک کچھ مدھم آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔میں لحاف سرکا کر اٹھا اور ننگے پاؤں آوازوں کی سمت گیا۔یہ آوازیں چاچار قاقت کے کمرے سے ابھر رہی تھیں۔یوں لگتا تھا کہ چاچے کی بیمار بیوی اس سے جھگڑ رہی ہے۔میں کچھ اور آگے بڑھ کر دروازے کے پاس آیا تو آوازیں ذرا وضاحت سے سنائی دینے لگیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

چاچی کہہ رہی تھی۔"ہونا ہوانا کچھ بھی نہیں ہے۔ان کے ساتھ تمہیں بھی ہتھکڑیاں لگنی ہیں اور مجھے یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا ہے۔کوئی چھوٹا موٹا جرم ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔ تم خود بتا رہے ہو کہ ان پر قتل کا معاملہ بنا ہوا ہے۔ٹھیک ہے کہ اس کے پپو سے تمہاری یاری دوستی تھی، پر اس یاری دوستی کے لئے اپنا آپ برباد کر لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔۔۔۔۔"

"او آہستہ بول اللہ دی بندی! وہ سن نہ لیں۔"

"سن لیں سنتے ہیں تو۔مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔جو جمع پونجی تھی وہ تو تم نے ان کے ہاتھ مجھے تھما دی ہے وکیل کرنے کے لئے۔۔۔۔۔اب اور لوٹ پڑے گی تو بھینس اور گھوڑے بیچنا شروع کر دینا۔" چاچے کی بیوی تڑخ کر بولی۔

"میں کہتا ہوں چپ کر جا۔تو میرے معاملوں میں نہ بول۔"

"کیوں نہ بولوں۔" چاچے کی بیوی نے فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔یوں لگتا تھا کہ اس کا دم الٹ گیا ہے۔چاچار فاقت اسے پانی وغیرہ پلانے میں مصروف ہو گیا۔

صبح ابھی گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز ابھری نہیں تھی میں اور تیمور بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے محسن چاچے رفاقت کے گھر سے نکل آئے۔ چاچے رفاقت کے گھر سے ہم نے دو کسیوں کے سوا کچھ نہیں لیا تھا۔ یہ کسیاں ہمارے کندھوں پر تھیں۔ ہم نے گرم چادروں کی بکلیں مار رکھی تھیں اور کاشت کاروں ہی کے انداز میں کھیتوں کے درمیاں تنگ پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

"ایک دم کیوں چھوڑ دیا گھر؟" تیمور نے پوچھا۔

"بس مجھے کل سے پریشانی سی لگی ہوئی ہے۔ بلقیس اور عزیز کے ساتھ کوئی ایک درجن محافظ بھی تھے۔ ان محافظوں نے بھی مجھے یہاں دیکھ لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ جگہ اب ہمارے لئے کچھ زیادہ محفوظ نہیں رہی۔ پھر ابھی تک کے ٹوکا بھی کوئی پتا نہیں چل رہا۔" میں نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہا۔

"اب کہاں جانا ہے؟" تیمور نے پوچھا۔

"رات کو میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ لیاقت کالے کا چاچا ایم پی اے امین چودھری کافی اثر رسوخ والا بندہ ہے۔ سنا ہے اگلے مہینے وزیر بھی بننے والا ہے۔ اوپر تک اس کے رابطے ہیں۔ اس کا رویہ ہمارے ساتھ دوستی والا رہا ہے۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" تیمور نے تائید کی۔ "خاص طور سے تمہارے ساتھ اسے کافی لگاؤ ہے۔ تمہیں ہر وقت قیمتی مشورے دینے کی فکر میں رہتا ہے۔"

"تو کیوں نہ اسے ایک اور مشورے میں شامل کر لیا جائے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم اس کے مشورے سے اور اس کے ذریعے گرفتاری دیں۔"

بات تو سمجھ میں آتی ہے۔" تیمور نے ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"ہم منہ اندھیرے کاچھووالی سے روانہ ہوئے تھے۔ دس بجے کے قریب ہم قلعہ والا کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ یہ کڑاکے کی سردی کا ایک ابر آلود دن تھا۔ یخ ہوا چل رہی تھی۔ قلعہ والا سے قریباً دو میل پہلے ہی ایم پی اے امین چودھری کا ڈیرا آجاتا تھا۔ علاقے کا واحد

ٹیوب ویل امین چودھری کے ڈیرے پر تھا۔ یہاں بہت سے درخت تھے اور نیم پختہ عمارت بھی بنی ہوئی تھی۔

میں ایک دفعہ پہلے بھی یہاں آچکا تھا مگر تب حالات اور تھے۔ اب تو میں اور تیمور کھیت مزدور کے حلیے میں تھے اور پولیس سے اپنی جان بچاتے پھر رہے تھے۔ قلعہ والا وہ علاقہ تھا جہاں ہمیں دہرا خطرہ لاحق تھا۔ ایک پولیس کا دوسرے لمبڑ آصف جاہ کا۔ ڈیرے کے دروازے پر ایم پی اے امین کی ہری نمبر پلیٹ والی جیپ کھڑی تھی۔ گیٹ کا مسلح محافظ پہلے تو مجھے پہچاننے میں ناکام رہا۔ تاہم میرے تعارف کرانے پر اس کے چہرے پر شناسائی اور حیرت کے تاثرات ابھر آئے اس کا نام سعید شاہ تھا۔

وہ مصافحہ کرنے کے بعد مجھے اور تیمور کو تیزی سے اندر لے گیا اور بیٹھک میں بٹھا دیا۔ اپنی کسیاں ہم نے باہر ہی رکھ دی تھیں۔ ابھی دن کا آغاز ہی ہوا تھا اس لئے بیٹھک خالی پڑی تھی۔ میں نے سعید شاہ سے کہا۔

"ابھی یہاں کسی کو میرے آنے کی خبر نہیں ہونی چاہئے۔ سب سے پہلے میں امین صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔" سعید شاہ نے کہا اور باہر نکل گیا۔

درحقیقت یہاں آکر میں نے جرات مندی سے خطرہ مول لیا تھا۔ اس جرات مندی کی بنیاد اس یقین پر تھی کہ امین چودھری کی سوچ لمبڑ آصف جاہ کی سوچ سے مختلف ہو گی۔ امین ٹھنڈے دل ودماغ سے میرے بات سنے گا اور مشورہ دے گا۔

قریباً پانچ منٹ بعد سعید شاہ واپس آیا۔ اس نے کہا۔

"چودھری خاور! آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔۔۔۔۔ میں دراصل ابھی ڈیوٹی پر آیا ہوں۔ دوسرے ساتھی نے بتایا ہے کہ چودھری جی ذرا باہر نکلے ہوئے ہیں۔"

"لیکن ان کی گاڑی تو دروزے پر ہی ہے۔"

"شاید پیدل نکل گئے ہیں۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ ناشتا کریں گے؟"

"نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔

سعید شاہ نے دوبارہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور دروازہ برابر کر کے باہر چلا گیا۔۔۔۔۔ دس پندرہ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ پھر میں نے ایک عورت کو دیکھا۔ وہ اچھے لباس میں

تھی۔ وہ ایک گول تھالی میں گرم دودھ سے لبالب بھرا ہوا گلاس لے کر نمودار ہوئی اور ہمارے سامنے سے گزر کر ایک طرف او جھل ہو گئی۔

عورت کی صورت مجھے جانی پہچانی لگی۔ ذہن پر تھوڑا سا زور دیا تو اچانک یاد آ گیا۔ اسے کافی عرصہ پہلے دیکھا تھا، مگر کچھ صورتیں ایسی ہوتی ہیں جو تادیر حافظے پر نقش رہتی ہیں۔ شروع شروع میں جب لیاقت کالے نے مکھن وال جانے والا راستہ بند کر دیا تھا اور میں اس سے وجہ پوچھنے اس کے ڈیرے پر پہنچا تھا تو وہاں ایک لڑکے کے لئے رحم کی درخواست کر رہی تھی۔ اس عورت کا مسکین چہرہ ابھی تک میرے ذہن پر نقش تھا۔ یہ وہی عورت تھی۔ اس نے لیاقت کے کارندوں سے کہا تھا کہ ہم بہت جلد قرضہ واپس کر دیں گے۔ وہ اس لڑکے کو چھوڑ دیں۔

آج وہ عورت یہاں لیاقت کالے کے چاچے ایم پی اے امین کے ڈیرے پر نظر آئی تھی۔ پچھلے برسوں میں اس کے ساتھ پتا نہیں کیا ہو چکا تھا۔ شاید وہ تھوڑے سے قرضے کی پاداش میں یہاں عمر قید کی سزا بھگت رہی تھی۔ اس کی عمر اب پینتالیس کے قریب نظر آتی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

دو منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوئی۔ اس نے آواز دی۔

"شاہین بیٹی!"

کہیں اندر سے آواز آئی۔ "آئی امی۔"

پھر ایک اکیس بائیس سال کی لڑکی ہاتھ میں ڈونگا سا پکڑے ماں کے پیچھے او جھل گئی۔ اطراف میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ صبح کا وقت تھا۔ ابھی ڈیرے پر ویرانی ہی نظر آ رہی تھی، مجھے الجھن سی ہونے لگی، امین صاحب سے ملاقات کیوں نہیں ہو پا رہی تھی؟ کہیں ہمارے لئے کوئی مسئلہ تو کھڑا ہونے والا نہیں تھا؟

تیمور وہیں بیٹھا رہا۔ میں اٹھا اور ٹہلنے والے انداز میں ایک راہداری میں چلا گیا۔ ہمت کر کے تھوا آگے گیا تو مجھے کچھ مدھم آوازیں سنائی دیں۔ ان آوازوں میں امین چودھری کی بھاری آواز میں نے صاف پہچان لی۔

اس کا مطلب تھا کہ امین چودھری ڈیرے پر ہی تھا لیکن مجھ سے ملنے سے کترا رہا تھا۔ میں اپنے اندرونی تجسس کو دبا نہ سکا اور آوازوں سے قریب تر ہو گیا۔ ایک دروازے کے عقب

سے سعید شاہ کی آواز ابھری۔ "اس نے آپ کی گاڑی دیکھ لی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ امین صاحب کی گاڑی تو ادھر ہی ہے۔"

"تو کیا۔۔۔۔۔ میں کہیں پیدل نہیں جا سکتا۔" چودھری امین نے غصے سے کہا۔ "جاو، اس سے کہہ دو کہ وہ ایک دوست کی گاڑی پر گئے ہیں۔ شاید جلدی نہیں آئیں گے۔"

"اور اگر دوبارہ آنے کا کہے؟"

دیکھو شاہ! میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اسے ٹرخا دو۔ بلکہ اس سے کہہ دو کہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو آفت میں نہ ڈالے۔ یہاں ہر طرف آصف جاہ کے بندے اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ بے موت مارا جائے گا۔" چودھری امین کے لہجے میں سخت بے زاری تھی۔ پھر تھوڑے سے توقف کے ساتھ اس نے کہا۔ "تمہارے سوا اور کسی نے دیکھا ہے اسے یہاں؟"

کریم اور فضلو نے بھی دیکھا ہے، پر پہچانا صرف میں نے ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے تمہارے سوا کسی کو اس بارے میں پتا نہیں چلنا چاہئے۔ اور جاؤ۔۔۔۔۔ اسے چلتا کر دو یہاں سے۔"

سعید شاہ دروازے کی طرف آ رہا تھا میں خود کو اس کی نظر سے بچانے کے لئے کمرے کی عقبی سمت چلا گیا۔ جاگیر درانہ اور وڈیرانہ انداز کے مطابق ڈیرے کی کھڑکیاں رنگ برنگے شیشوں کی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک کھڑکی کے شیشے کا سبز پینٹ ایک جگہ سے ذرا سا اکھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سوراخ میں سے آنکھ لگائی تو اندر کمرے کا نصف حصہ دکھائی دینے لگا، امین چودھری صرف ایک دھوتی میں تھا۔ وہ پلنگ پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ رات کی شراب نوشی کا خمار ابھی تک اس کی آنکھوں میں تھا۔ وہی لڑکی جس نے ابھی تھوڑی دیر قبل "آئی امی جی" کہا تھا، ذرا شرمائی لجائی ہوئی امین کی آغوش میں بیٹھی تھی اور اپنے نازک ہاتھوں سے اس کے چوڑے چکلے چہرے کی شیو بنا رہی تھی۔ صابن سے لتھڑے ہوئے جبڑے پر اس کے ہاتھ روانی سے چل رہے تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ اس طرح کی "خدمت گزاریاں" اس کا روز کا معمول ہیں۔

میں کھڑکی سے نظر ہٹا کر واپس بیٹھک میں پہنچ گیا۔

سعید شاہ وہاں تیمور کے قریب موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا چونکا۔ "کہاں چلے گئے تھے آپ؟" اس نے پوچھا۔

"تمھیں ہی دیکھ رہا تھا۔ تم ہمیں یہاں بٹھا کر غائب ہی ہو گئے تھے۔"

"میں چودھری امین صاحب کا ہی پتا کر رہا تھا۔ وہ کسی دوست کے ساتھ اس کی گاڑی میں گئے ہیں۔ وہ شاید اب جلدی نہیں آئیں گے۔ آپ کو بے کار میں انتظار کرنا پڑے گا۔" سعید شاہ کے لہجے میں رکھائی تھی۔

میں نے تیمور سے اٹھنے کا اشارہ کیا اور سعید شاہ سے کہا۔

""ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ پھر ہم چلتے ہیں۔"

سعید شاہ نے میرے قریب آ کر ذرا رازداری سے کہا۔

""ویسے یہاں آپ کے لیے خطرہ بہت ہے۔ وڈے لمبڑ آصف جاہ صاحب کے بندے مسلسل آپ کی تلاش میں ہیں۔"

"اطلاع کا شکریہ!" میں نے کہا اور باہر نکلنے سے پہلے مفلر ایک بار پھر چہرے سے لپیٹ لیا۔ تیمور نے بھی اپنا چہرہ جزوی طور پر گرم چادر میں چھپا لیا۔

ڈیرے سے باہر نکلے تو اکا دکا ملازم چلتے پھرتے نظر آئے۔ ایک نوجوان اور ایک ادھیڑ عمر شخص سخت سردی میں معمولی سے کپڑے پہنے بھینسوں کے لیے گتاوا تیار کر رہے تھے۔ میری نظر نوجوان کے چہرے پر پڑی اور میں ایک بار پھر چونکا۔ یہ غریب صورت نوجوان چند سال پہلے کا وہی لڑکا تھا جسے میں نے لیاقت کالے کے ڈیرے پر سزا بھگتتے دیکھا تھا۔ شاید اس کی سزا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اب اس کی ماں اور بہن بھی اس "سزا" میں شریک ہو چکی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے جس لڑکی کو امین چودھری کی شیو بناتے دیکھا تھا، وہ یقیناً اس کی بہن تھی۔

جاگیرداروں اور وڈیروں کے گرد مزارعوں اور ملازموں کی ایسی کہانیاں موجود ہی رہتی ہیں۔۔۔۔۔ ان لمحوں میں نہ جانے کیوں میرا ذہن اماں دلشاد کی بیٹی گڈی اور والی جی کی طرف منتقل ہو گیا۔ گڈی کی کہانی بھی تو اس سے ملتی جلتی ہی تھی۔ وہ کمسن۔۔۔۔۔ والی جی کی ملازمہ خاص تھی۔ اسے ہر خدمت کے لیے طلب کیا جاتا تھا۔ اور پھر وہ ایسی خدمت کے لیے بھی مجبور ہو گئی جس نے اسے توڑ پھوڑ کر قبر کی تاریکی میں پہنچا دیا۔ گڈی اور شاہین اور ایسے ناموں والی نہ جانے کتنی لڑکیاں اب بھی ان جاں سوز مرحلوں سے گزر رہی تھیں۔

اب سرما کی زرد کمزور دھوپ اپنی جھلک دکھانے لگی تھی۔ ہم دونوں ڈیرے سے قریباً دو میل دور آنے کے بعد گھنی جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے درمیان ایک ہموار جگہ پر بیٹھ گئے۔ بھوک اور تھکن سے برا حال تھا۔ بھوک میں سردی بھی ضرورت سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ تیمور بھی جان چکا تھا کہ ایم پی اے امین نے اپنے ڈیرے پر موجود ہونے کے باوجود ہم سے ملاقات نہیں کی۔

وہ آزردہ لہجے میں بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ یہاں بھی لمبڑ آصف جاہ کے ڈر نے کام دکھایا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہ دنیا ویسے بھی بڑی جلدی آنکھیں پھیرتی ہے۔ مصیبت میں کسی کے ساتھ کھڑے ہونا اور ڈٹ جانا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔"

"لیکن یار! یہ امین تو بڑا دبنگ بندہ ہے اور آج کل تمہاری دوستی کا دم بھی بھر رہا تھا۔ اس سے یہ امید نہیں تھی۔"

"آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

"خیر اتنی دوستی تو اس نے ضرور نبھائی ہے کہ ہمیں اپنے ڈیرے پر ہی پکڑوا نہیں دیا۔" تیمور نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

اچانک کچھ آوازوں نے مجھے چونکایا۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ یہ کتوں کی آوازیں تھیں۔۔۔۔۔ ہوا کی لہروں پر ڈوبتی ابھرتی یہ آوازیں قریباً ایک کلو میٹر دور سے آ رہی تھیں۔ یکایک میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ میرا دھیان آصف جاہ کے خطرناک سلوکی ہاؤنڈز کی طرف چلا گیا تھا۔ کہیں یہ وہی خطرناک کتے تو نہیں؟ یہ سوال ایک دہکے ہوئے نیزے کی طرح میرے دماغ میں گڑ گیا۔

آوازیں بتدریج نزدیک آتی گئیں اور پھر ایک جگہ رک گئیں۔ میں نے سرکنڈوں کے اندر سے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ سرکنڈے اور درخت قدرے بلندی پر تھے۔ مجھے اپنے عقب میں قدرے دور تک کھیت اور درخت نظر آئے۔ ان کھیتوں اور درختوں کے بیچ ایک ہموار میدان سا تھا۔ اس میدان کے منظر نے میرے دل و دماغ میں زلزلہ برپا کر دیا۔ یہاں دو بڑی جیپیں موجود تھیں اور ان جیپوں کے نزدیک وہی آٹھ عدد خوفناک کتے منڈلا رہے

تھے جو میں نے دو تین ماہ پہلے آصف جاہ کی حویلی میں دیکھے تھے۔اتنی دور سے بھی میں کتوں کی متحرک دُموں اوران کی لپلپاتی زبانوں کی خطرناکی کو محسوس کر سکتا تھا۔

تیمور بھی سرکنڈوں سے سر اٹھا کر نشیب میں میدان کا منظر دیکھنے لگا۔"یہ کیا ہے؟"اس نے کمزور آواز میں پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ ہمارے تارے پوری طرح گردش میں ہیں۔ان دونوں جیپوں میں سے ایک کو میں بڑی اچھی طرح پہچانتا ہوں۔یہ لمبڑ آصف جاہ کی ہے۔"

لمبڑ آصف جاہ کا نام سن کر تیمور کا چہرہ زرد ہو گیا۔اس کے ہونٹ پہلے ہی خشک تھے، کچھ اور خشک نظر آنے لگے۔"اس کا کیا مطلب ہے؟کیا امین چودھری نے کام دکھایا ہے؟"تیمور نے لڑکھڑاتے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔سعید شاہ کا بھی کام ہو سکتا ہے یا پھر۔۔۔۔۔کوئی تیسرا بندہ۔۔۔۔"

دور میدان کا منظر تہلکہ خیز تھا۔اب میں نے آصف جاہ کو بھی پہچان لیا تھا۔وہ بوسکی کی شلوار قمیض میں تھا۔وہ ہاتھوں کے اشارے سے اپنے بندوں کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔پھر میں نے دیکھا کہ مسلح افراد سے بھری ہوئی ایک جیپ دائیں رخ پر مڑ گئی۔تین گھڑ سوار بھی

ساتھ تھے۔دوسری جیپ جس میں آصف جاہ خود بیٹھا تھا اور جس کے آگے چار گھڑ سوار آٹھ عدد کتوں کے ساتھ اچھالے مار رہے تھے، سرکنڈوں کی طرف بڑھی۔

اب اس امر میں شبہے کی ذرہ بھر بھی گنجائش نہیں تھی کہ آصف جاہ کو کسی طرح ہماری یہاں موجودگی کی اطلاع ہو گئی ہے اور وہ سراپا قہر ہماری طرف لپک رہا ہے۔عین ممکن تھا کہ ان لوگوں نے پیچھے آنے میں ہمارے قدموں کے نشانوں سے بھی مدد لی ہو۔

میں نے تیمور کو اشارہ کیا۔تیمور نے اپنی گرم چادر کے نیچے اپنی سیون ایم ایم رائفل کو تیار حالت میں کیا۔میں نے بھی اپنے پسٹل کا سیفٹی کیچ ہٹایا۔ہم جھک کر دس بارہ فٹ اونچے سرکنڈوں کے اندر ہی اندر بھاگتے مخالف سمت میں بڑھے۔کتوں کی آوازیں تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی آوازیں تھیں۔کچھ ماہ پہلے میں نے ایک خرگوش کی لٹکتی ہوئی انتڑیاں دیکھی تھیں۔شاید آج ایسا کچھ ہمارے ساتھ ہونے والا تھا۔"کیا کرنا ہے؟"تیمور نے بھاگتے بھاگتے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کچھ پتا نہیں۔بس بھاگتے چلو۔"

یوں لگتا تھا جیسے پیچھے آنے والے پھیل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ چند کتوں کی آوازیں انتہائی دائیں جانب سے آ رہی تھیں۔ ایک جیپ کی مدھم آواز بائیں جانب سے سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز خاصی قریب تھی۔ بیس پچیس منٹ پہلے جب ہم تھکن سے چور ہو کر ان سرکنڈوں میں بیٹھے تھے، ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا ہمارے ساتھ ایسا ہونے والا ہے۔

ہم سرکنڈوں اور جھاڑیوں سے نکل کر دوسری طرف پہنچے۔ یہاں ایک سوئے (چھوٹی نہر) کے کنارے ایک چھوٹا سا تانگا کھڑا نظر آیا۔ یہ بالکل مختصر سا "ریسی تانگا" تھا۔ ایک نوجوان لڑکا تانگے کے صحت مند گھوڑے کے سامنے چارا ڈال رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ بری طرح چونکا پھر پسٹل میرے ہاتھ میں دیکھ کر وہ مزید ڈر گیا۔ لڑکے کو ایک طرف دھکیل کر، ہم جست لگاتے ہوئے تانگے پر سوار ہو گئے۔ لڑکے کا رنگ ہلدی تھا، وہ معمولی سی مزاحمت بھی نہیں کر سکا۔ میں نے لگام کو مخصوص جھٹکا دیا۔ گھوڑا تو جیسے اشارے کا منتظر تھا۔ وہ مڑا اور تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگا۔ آصف جاہ کی جیپ اور اس کے کتوں کو سرکنڈوں سے نکلنے میں تھوڑی سی تاخیر ہوئی، اس وقت تک ریسی تانگے کا گھوڑا سرپٹ ہو چکا تھا۔ سوئے کے ساتھ ساتھ راستہ خاصا ہموار تھا۔ گھوڑے کو برق رفتاری دکھانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

لیکن کچھ بھی تھا، ریسی تانگا، جیپ اور کتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ کتے دم بہ دم تانگے کے قریب پہنچ رہے تھے۔ پھر جیپ پر سے تانگے پر پہلا فائر ہوا۔ گولی ایک تیز سیٹی کے ساتھ ہمارے سروں پر سے گزری۔

میں ہر گز نہیں چاہتا تھا کہ میری ملاقات میرے سسر آصف جاہ سے ایسے حالات میں ہو۔ میں تو اس کے روبرو بیٹھنا چاہتا تھا۔ اپنی آنکھوں میں سچی نمی لے کر اسے اصل حالات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر یہاں جو ہو رہا تھا وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ سلوکی ہاؤنڈز کتوں کا تانگے کی طرف بڑھنے کا منظر لرزہ خیز تھا۔ یہ کتے ایک دفعہ تانگے کے قریب آ جاتے تو پھر انہوں نے پلک جھپکتے میں اوپر چڑھ آنا تھا، یا پھر گھوڑے کو زخمی کر کے گرا دینا تھا۔۔۔۔ شاید ان حالات میں وہ اپنے مالک کا اشارہ بھی بروقت قبول نہ کرتے اور ہمیں چیر پھاڑ کر رکھ دیتے۔ "اب کیا کرنا ہے خاور؟ گولی چلاؤں؟" تیمور نے پوچھا۔

"چلانی پڑے گی۔" میں نے کہا۔

اسی دوران جیپ سے دو مزید فائر ہوئے۔ میری بائیں ران میں انگارہ سا اتر گیا۔ اگلے دو ہاؤنڈز تانگے سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ ان کی لپک دل ہلا دینے والی

تھی۔شدید ترین خطرے میں گھرنے کے بعد تیمور کی ساری حسیں پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں۔اس نے اپنی سیون ایم ایم سے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور دو کتے لڑھکنیاں کھاتے ہوئے گرے۔ان میں سے ایک سوئے کے مٹیالے پانی میں گرا تھا۔۔۔۔دو کے "ہٹ" ہونے کے باوجود تربیت یافتہ کتوں کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی۔وہ اسی جوش و خروش سے تانگے کی طرف بڑھتے گئے۔تاہم اب ہمیں تھوڑا سا وقت ضرور مل گیا تھا۔پچھلے کتوں کا تانگے سے فاصلہ چالیس پچاس میٹر سے کم نہیں تھا۔

"گاڑی کے ٹائر پر فائر کردو۔" میں نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

تیمور نے ٹائر پر گولی چلانے کے لیے رائفل سیدھی کی مگر اس کے گولی چلانے سے پہلے ہی یکے بعد دیگرے تین چار فائر ہوئے۔ان میں سے ایک گولی تیمور کی کلائی میں لگی، دوسری جوان سفید گھوڑے کی گردن چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔بدقسمت جانور پوری رفتار سے بھاگتا ہوا منہ کے بل گرا۔ہم ویسے بھی ایک ڈھلوان جگہ پر تھے۔اب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ریسی تانگے کے فضا میں اچھلنے اور ہمارے دور تک لڑھکنے کا منظر کیا ہوگا۔

چند سیکنڈ کے لیے ارد گرد کا منظر گڈ مڈ ہو گیا۔میں ہوا میں اڑتا ہوا سرکنڈوں میں گرا۔بائیں ران میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں۔اس کے علاوہ پشت پر بھی شدید چوٹ کا احساس ہوا۔میں نے ریس کے تانگے کو گھوڑے سے علیحدہ ہوتے اور ٹوٹ کر سوئے کے پانی میں گرتا دیکھا۔

"بھاگو خاور۔" تیمور کی آواز مجھے اپنے بالکل پاس سنائی دی۔

میں اپنی پوری قوت مجتمع کرکے اٹھا اور زخمی ٹانگ کے ساتھ بھاگنے لگا۔کتوں کی آوازیں ہمارے عقب میں بہ مشکل تیس چالیس قدم کے فاصلے پر تھیں۔وہ خوں خوار جانور کسی بھی وقت ہمیں چھاپ سکتے تھے۔اور پھر مجھے پہلے کتوں کی غضیلی آواز اپنے بالکل عقب میں سنائی دی۔اس آواز کے تاثر کو لفظوں میں بیان کرنا بے حد مشکل تھا۔بالکل یہی لگ رہا تھا کہ موت مجھ پر جھپٹ رہی ہے۔میں بھاگتے بھاگتے پلٹا۔نہایت دبلے منہ اور دبلی کمر والا برق رفتار سلوکی ہاؤنڈ مجھ سے فقط چند قدم کی دوری پر تھا۔میں نے اس پر پسٹل سے فائر کیا۔گولی اس کی ٹانگ میں لگی۔وہ ڈگمگایا اور کئی لڑھکنیاں کھا گیا۔

میں نے دیکھا، ایک دوسرا کتا تیمور پر جھپٹ رہا تھا۔ تیمور نے بھاگتے بھاگتے رائفل کے آہنی بیرل کو کتے کے منہ پر لٹھ کی طرح رسید کیا۔ اس کے دانت ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کریہہ آواز نکال کر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

یہ وہی جگہ تھی جو نکووال اور شام پور کے راستے میں آتی تھی۔ میں دو چار دفعہ پہلے بھی یہاں سے گزر چکا تھا۔ مجھے وہ پرانا مورچا نظر آ رہا تھا جو غالباً 65ء کی نشانی تھا۔ ہم بغیر کسی منصوبے یا فیصلے کے اندھا دھند دوڑتے ہوئے مورچے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا۔ ہمیں اپنے پیچھے آنے والے خونی جانوروں سے بچنا ہے۔ مورچے کے داخلی راستے پر لکڑی کا ایک عارضی سا دروازہ نظر آیا۔ ہم نے دروازے میں گھسنا چاہا، وہ اندر سے بند تھا۔ تیمور نے پیچھے ہٹ کر اپنے کندھے کی بھرپور ضرب دروازے کو لگائی۔ اندر کنڈی ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ تیمور اندر کی طرف گرا۔ یہی وقت تھا جب ایک سلوکی ہاؤنڈ نے سرکنڈوں سے نکل کر مجھ پر جست لگائی۔ میں نے پھرتی سے خود کو بچایا تاہم میری گرم چادر کتے کے جبڑوں میں آگئی۔ اس کی بہ ظاہر دبلی گردن میں غیر معمولی طاقت تھی۔ اس نے مجھے جھٹک کر زمین پر گرانا چاہا تاہم میں دروازے کے اندر گھس گیا۔ میرے اندر آتے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہی تیمور نے پوری طاقت سے دروازہ بند کیا لیکن کتے کا جسم رکاوٹ بن گیا۔ وہ اپنی تھوتھنی اور گردن اندر گھسانے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آواز سے مورچے کا اندرونی خلا گونجنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنے عقب میں کسی عورت کے چلانے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ میں نے اپنی پشاوری چپل سے چند شدید ٹھوکریں کتے کے منہ پر لگائیں اور تیمور دروازہ بند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اوپر کی کنڈی تو ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے درمیان والا آہنی کھٹکا چڑھا دیا۔

چند ہی لمحے بعد اس پناہ گاہ کے چاروں طرف غصیلی انسانی اور حیوانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک کہرام سا برپا ہو گیا۔ ایک کہرام اس پناہ گاہ کے اندر بھی تھا۔ لالٹین کی روشنی میں ایک جواں سال عورت بستر کی چادر لپیٹے کھڑی تھی۔ اس کے بال بکھرے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایک نیم برہنہ شخص لرزتے ہاتھوں سے اپنی پھٹی پرانی لنگی باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیچے ایک چٹائی پر ڈیڑھ دو ماہ کا شیر خوار بچہ گلے کی پوری قوت سے دہائی دینے میں مصروف تھا۔

ایک لحظہ کے لیے محسوس ہوا کہ دہشت زدہ مرد اور عورت بچے سمیت دروازہ کھول کر باہر بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ تیمور رائفل ان کی طرف سیدھی کرتے ہوئے گرجا۔ "خبر دار !بیٹھ جاؤ نیچے۔۔۔۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

لڑکی نما عورت نے شیر خوار بچے کو اٹھایا اور سینے سے چمٹا کر اپنے خاوند کے پہلو میں سہمی ہوئی بیٹھ گئی۔ یہ دونوں شکل سے بھیک منگے لگتے تھے۔ مورچے میں روزمرہ ضرورت کی بہت سی چیزیں بکھری ہوئی تھیں اور ان میں عورت کا لباس بھی تھا۔ تب میری نظر ایک اور بچے پر پڑی۔ یہ چار پانچ سالہ لڑکا، ارد گرد برپا ہونے والی قیامت سے بے خبر ابھی تک کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔

اسی اثنا میں دھماکوں سے دو گولیاں مورچے کے چوبی دروازے میں لگیں اور دو سوراخ بناتی ہوئی دیوار سے ٹکرائیں۔ پھر بپھرے ہوئے کتے دیوانہ وار دروازے سے ٹکرانے لگے۔۔۔۔ یوں لگا کہ وہ چند سیکنڈ اسی طرح ٹکراتے رہے تو شیشم کے تختوں کا یہ دروازہ اپنی جگہ برقرار نہیں رہ سکے گا۔ جوابی فائر ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے پسٹل کو مورچے کے پختہ فرش پر رکھ کر دروازے کی نچلی درز سے گولیاں چلائیں۔ اس فائرنگ سے کسی جانور کو نقصان پہنچا یا نہیں، اس کا پتا تو نہیں چلا تاہم کتوں کا غضب ناک شور ایک دم فاصلے پر چلا گیا۔ مورچے میں موجود رخنوں میں سے ایک رخنے میں تیمور نے اپنی رائفل رکھ دی اور جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ اس فائرنگ سے مورچے پر آنے والا زبردست دباؤ ایک دم کم ہو گیا۔ یوں لگا کہ کتوں کے ساتھ کتوں کے مالک بھی کچھ پیچھے ہٹ گئے ہیں اور اپنی پوزیشنیں درست کر رہے ہیں۔

عورت نے عاجزی سے بتیسی نکالی اور اپنے سانولے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "کھدا کا واسطہ ہے، اساں کو جانے دو۔ اساں بے کسور ہیں۔ کھام کھاہ اس لڑائی میں اساں کا نقصان ہو جائے گا۔"

مرد نے بھی کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر میں نے اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔ "دیکھ نہیں رہے، باہر شکاری کتے گھوم رہے ہیں۔ دو سیکنڈ میں چیر پھاڑ دیں گے تم سب کو۔"

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اس کے گلے میں منکوں کا ہار تھا اور بالوں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔

"اچھا جی! تساں جو کہو گے، اساں ویسا ہی کریں گے۔۔۔۔پر۔۔۔۔۔ مینڈی جنانی (بیوی) کو جرا کپڑے پا لینے دیں۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"تو پہن لے کپڑے۔ ہم نہیں دیکھ رہے اس کی طرف۔" میں نے کہا۔

عورت نے اپنا شیر خوار بچہ شوہر کی گود میں دیا۔ یہ دراصل ایک دبلی پتلی بچی تھی۔ پھر وہ لرزتی کانپتی جھکی۔۔۔۔۔ اپنی چولی، گھاگرا اور اوڑھنی وغیرہ لے کر مورچے کے ایک نیم تاریک گوشے میں چلی گئی۔

میری ٹانگ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ تکلیف ناقابل برداشت تھی۔ تیمور کی کلائی بھی خون اگل رہی تھی تاہم وہ اپنی رائفل کے پیچھے موجود تھا اور گاہے بہ گاہے سرکنڈوں کی طرف فائر کر رہا تھا۔ ایک رخنے میں سے دو تین فائر میں نے بھی کیے۔ یہ کسی کو نشانہ بنانے کے لیے نہیں تھے۔ یہ دفاعی فائر تھے۔ مقصد یہی تھا کہ بپھرے ہوئے حملہ آور ہم سے دور رہیں۔

"کتنی گولیاں ہیں تمہارے پاس؟" میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

"سو کے قریب ہوں گی۔" تیمور نے اپنے جسم سے بندھی ہوئی "بلٹ اسٹریپس" کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اور تمہارے پاس؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"بیس کے قریب رہ گئی ہیں۔" میں پھر کراہا۔

"لگتا ہے تمہیں تکلیف زیادہ ہے؟"

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"کسی طرح آصف جاہ سے میری بات ہو جائے تو شاید یہ آفت ٹل جائے۔۔۔۔۔ یا کم از کم ہمیں کچھ وقت ہی مل جائے۔"

"لیکن بات ہو کیسے؟"

میں ایک رخنے کی طرف بڑھا۔ یہ رخنے فائرنگ وغیرہ کے لیے ہی بنائے گئے تھے اور زمین سے قریباً پانچ فٹ بلند تھے۔ میں نے ایک رخنے سے منہ لگایا اور پوری قوت سے پکار کر کہا۔ "آصف جاہ صاحب! میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ایک دفعہ میری بات سن لیں، پھر آپ جو سزا دیں گے میں مان لوں گا۔ بس ایک دفعہ مجھے موقع دیں۔"

پتا نہیں کہ میری آواز مطلوبہ لوگوں تک پہنچی یا نہیں لیکن دو گولیاں ضرور پہنچ گئیں۔ایک گولی میرے چہرے کے بالکل قریب مورچے کے کنکریٹ میں لگی۔دوسری اوپر سے پرواز کر کے گزر گئی۔میں رخنے سے پیچھے ہٹ گیا۔خوں خوار کتے مسلسل شور مچا رہے تھے تاہم اب انہیں فائرنگ کی زد سے دور ہٹالیا گیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر کوشش کی اور پکار کر کہا میں آصف جاہ صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

یہ کوشش بھی ناکام گئی۔

ایک دن پہلے چودھری عزیز سے اپنی ملاقات میں، میں نے چودھری عزیز اور بلقیس سے کہا تھا کہ وہ آصف جاہ سے بات کرنے کی کوشش کریں اور میری طرف سے ان کا ذہن صاف کریں۔مگر لگتا تھا کہ یا تو وہ ابھی تک بات نہیں کر سکے یا پھر آصف جاہ نے حسبِ توقع ان کی بات کو اہمیت نہیں دی۔میں نے تیمور کو رائفل سمیت رخنے کے سامنے رہنے دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ وقفے وقفے سے گولی چلاتا رہے تاہم یہ بھی کہا کہ کسی پر وہ نشانہ لے کر فائر نہ کرے۔خود میں نے ایک بلیڈ کی مدد سے اپنی شلوار نیفے کے نیچے سے پھاڑی اور ران کے زخم کو دیکھا۔خودکار رائفل کی گولی ران کا گوشت پھاڑ کر نکل گئی تھی۔خون بہنے کی وجہ سے نیچے کی ساری ٹانگ لہولہان ہو رہی تھی۔میں نے ایک کونے میں موجود چولہے میں

سے کچھ راکھ لی اور اس کے ذریعے خون بند کرنے کی کوشش کی۔پھر ایک پھٹے پرانے کپڑے، کی پٹی میں نے کس کر زخم پر باندھ دی۔

آصف جاہ کے بندے مورچے کے چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ان کی مدھم آواز ہم تک پہنچ رہی تھیں۔"کہیں، اب یہ لوگ پولیس کا انتظار تو نہیں کر رہے" تیمور نے کہا۔

"ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔"

"کیا مطلب"

"کیا پتا کہ یہ لوگ خود ہی ہمیں پکڑنا اور اپنے کسی ڈیرے شیرے پر لے جانا چاہتے ہوں۔"میں نے کہا۔

"یا پھر یہیں مار کر ڈھیر کرنے کا ارادہ ہو۔" تیمور نے لقمہ دیا۔تیمور کے دونوں ہونٹ پھٹے ہوئے تھے۔یہ چوٹ تانگے سے گرنے کے سبب آئی تھی۔اسی طرح کی کئی چوٹیں اور خراشیں ہم دونوں کے پورے جسم پر موجود تھیں۔

چار پانچ سالہ بچہ بھی اب اٹھ بیٹھا تھا اور اپنی دو ماہ کی بہن کی آواز سے آواز ملا کر ریں ریں کر رہا تھا۔جواں سال عورت نے اب اپنے کپڑے پہن لئے تھے۔اس کی سیاہ آنکھوں میں دہشت کے گہرے سائے تھے۔اپنی ریں ریں کرتی بچی کو چپ کرانے کے لئے اس نے بچی کا

منہ چھاتی سے لگایا اور اوپر اوڑھنی ڈال دی۔ اس کے مرد نے ایک بار پھر سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "اساں کو جانے دو جناب! اساں آپ کو دعائیں دیں گے۔ مینڈے چھوٹے چھوٹے بچوں پر ترس کھاؤ جی۔"

میں نے اسے سر تا پا گھورا۔ وہ بس ایک ڈرپوک مسکین بھک منگا ہی دکھائی دیتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ چار پانچ ماہ پہلے اس نے یہ ویران مورچا خالی دیکھ کر اپنی گرہستی بنالی تھی۔ سردی سے بچنے کے لئے پکی لکڑی کا دروازہ بنالیا تھا اور کچھ رخنوں کے آگے پولیتھین کے ٹکڑے کیلوں سے تان دیئے تھے۔ ایسی ویران جگہیں اکثر اسی طرح آباد ہو جایا کرتی ہیں۔ کبھی کبھی علاقے کے کسی معتبر شخص سے اس کی رسمی اجازت بھی لے لی جاتی ہے۔

میں نے اس شخص سے نام پوچھا۔ اس نے اپنا نام ناجا بتایا۔ میں نے کہا۔ ""ناجے! ہم تجھے اور تیرے بچوں کو باہر نکال دیتے ہیں لیکن اس کے بدلے تو نے ہمارا ایک کام کرنا ہوگا۔"

"تساں جو حکم کرو گے میں کروں گا جی۔" وہ بتیسی نکال کر بولا۔

"جو حکم نہیں۔۔۔۔۔ بس ایک کام ہے۔ تم یہ دروازہ کھول کر باہر نکلو اور جو لوگ ہم پر گولی چلا رہے ہیں انہیں بتاؤ کہ ہم ان سے لڑنا نہیں چاہتے۔ انہیں بتاؤ کہ یہ سب کچھ شاہ خاور نے کہا ہے۔"

پپ۔۔۔۔۔ پر یہ کون ہیں جی۔۔۔۔۔ کہیں یہ اساں کو تو گولی نہیں مار دیں گے"

"جیسے میں کہہ رہا ہوں، ویسے نکلو گے تو کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں ساری بات سمجھا دیتا ہوں۔" میں نے کہا

دو تین منٹ کے اندر ناجا تیار ہو گیا۔ میں نے مورچے کا دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ پہلے ناجے نے اپنی بیوی کی سفید اوڑھنی ہوا میں لہرائی اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر رکھے تھے۔

میں نے ایک بار پھر رخنے سے منہ لگایا اور پکار کر کہا۔

"آصف جاہ صاحب۔۔۔۔۔ ہم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

"آپ میری آواز سن رہے ہیں۔۔۔۔۔"

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ وہ ہوا جس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ ناجا ابھی دروازے سے فقط ایک قدم ہی آگے گیا تھا، تڑتڑ کی لرزہ خیز آواز سے رائفل کا برسٹ چلا۔۔۔۔۔ میں نے ناجے کو ہوا میں اچھلتے اور مورچے کی دیوار سے ٹکراتے دیکھا۔ اس کے جسم میں قریباً نصف درجن سوراخ ہو گئے تھے۔ مورچے کی دیوار سے ٹکرانے کے بعد وہ کئی فٹ تک نشیب میں لڑھک گیا۔

ناجے کی بیوی نے بھی یہ ہولناک منظر دیکھ لیا، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور روتی ہوئی چلائی اور اپنے خاوند کے خونچکا جسم پر جا گری۔ چھوٹی بچی اس کی گود میں تھی۔ وہ اسے جھنجوڑ نے لگی۔ "ناجے۔۔۔۔۔ ناجے۔۔۔۔۔ ہائے میں مر گئی۔۔۔۔۔ ناجے۔" اس کا نوحہ دل دہلا دینے والا تھا۔

یقیناً عورت کے لئے قیامت آگئی تھی لیکن یہ قیامت صغریٰ تھی۔ اس سے بڑی قیامت ابھی آنے والی تھی۔ اچانک مورچے کی چھت پر ایک سلو کی ہاؤنڈ کی غصیلی آواز سنائی دی۔ پھر ہم نے سلو کی ہاؤنڈ کو نوحہ کناں عورت پر جھپٹتے دیکھا۔ عورت اس نئی آفت کے بعد اپنے مرد کے خونچکاں جسم کو بھول گئی تھی اور چلاتی ہوئی مخالف سمت میں بھاگی لیکن وہ سلو کی ہاؤنڈ سے تیز کہاں بھاگ سکتی تھی۔ چند قدم بعد ہی کتے نے اسے جالیا۔ اس کے بعد کا منظر دیکھنا آنکھوں کا عذاب تھا۔ بچی عورت کے ہاتھوں سے گر گئی۔ کتا اس پر جھپٹا۔۔۔۔۔ اب ایک طرف بچی، کتے کے منہ میں تھی دوسری طرف ماں کے ہاتھ میں تھی۔ جانور نے اسے اپنی طرف کھینچا ماں نے اپنی طرف۔۔۔۔۔ وہ شیر خوار تھی۔ ابھی اس کے جسم میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ اس بے پناہ کھینچا تانی کو جھیل سکتی، چند ہی ساعتوں میں اس کا ایک بازو جسم سے علیحدہ ہو گیا۔

یہی لمحے تھے جب ایک تیسرا سانحہ ہوا۔ میں اور تیمور سکتے کی کیفیت میں باہر دیکھ رہے تھے۔ چار پانچ سالہ بچہ بھی روتا ہوا مورچے سے نکل گیا اور اپنی ماں کی طرف بھاگا۔ تیمور نے آخری لمحوں میں اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ معصوم بچے کو کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کس جان لیوا آفت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اسے صرف اپنی ماں نظر آئی تھی۔

کتے نے بچے کی آواز سنی تو شیر خوار بچی کو چھوڑ کر بچے کی طرف پلٹا۔ یہ سارا بس دو تین سیکنڈ کا کھیل تھا۔ کتے کے کان لمبے بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور آنکھوں میں قاتل چمک تھی۔ میں جیسے ہوش میں آیا۔ پسٹل میرے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر کئے۔ ایک گولی کتے کے سینے میں لگی ایک سر میں۔ وہ کریہہ آواز نکال کر سرکنڈوں میں گر گیا۔ بچہ بھاگتا ہوا اماں کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ موت سے کتنا قریب سے ہو کر گزرا ہے۔

ماں کے سینے سے خون آلود لوتھڑا چمٹا ہوا تھا۔ یہ وہ بچی تھی جس کے زندہ رہنے کے امکان اب بہت کم تھے۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنے بچے کا بازو پکڑا اور روتی کرلاتی ہوئی ۔۔۔۔۔ مخالف سمت میں بھاگتی چلی گئی۔

"یار! یہ کیا ہو گیا؟" تیمور کراہا۔

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر ایک طویل برسٹ نے مجھے خاموش کرا دیا۔ کنکریٹ کے بہت سے ٹکڑے اڑ کر مورچے کے اندر آ گرے۔ اچانک ہی مورچے پر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ یوں لگا کہ ایک اور کتا مر جانے کے طیش نے۔۔۔۔۔ گھیرا ڈالنے والوں کو تابڑتوڑ فائرنگ پر مائل کر دیا تھا۔ چاروں طرف چنگاریاں سی بکھرنے لگیں۔ لکڑی کے دروازے میں اور پولیتھین کے ٹکڑوں میں درجنوں سوراخ مزید ہو گئے۔ ہم دونوں خود کو بمشکل بچا پا رہے تھے

میں نے لمبڑ آصف جاہ کے غیض وغضب کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ آج اس غیض وغضب کا خوفناک تجربہ ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہماری موت سے کم کسی چیز پر تیار نہیں ہے۔ موت اور فوری موت، اسی جگہ پر۔ وہ کسی اور جھمیلے میں پڑنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ثبوت وہ لاش تھی جو مورچے کے چھلنی دروازے سے آٹھ دس قدم کی دوری پر پڑی تھی۔ ناجے کے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی اس پر اندھا دھند فائرنگ کر دی گئی تھی۔ غالباً گھیرا ڈالنے والوں کو یہی لگا تھا کہ ہم دونوں میں سے کوئی باہر نکلا ہے۔ اگر میرے گمان میں یہ بات ہوتی کہ آصف جاہ کی طرف سے ایسی وحشت اور اندھے پن کا مظاہرہ کیا جائے گا تو میں ناجے نام کے اس بندے کو کبھی باہر نہ بھیجتا

میں نے باہر رخنے سے منہ لگایا اور پکار کر کہا۔ "آصف جاہ! تم ظلم کر رہے ہو۔۔۔۔۔ تم ظلم کر رہے ہو۔ تم ہماری صفائی سنے بغیر ہمیں مار دینا چاہتے ہو۔ یہ کوئی انصاف نہیں ہے۔" میرے لہجے میں اب آتش تھی اور آصف جاہ کے لئے شدید غم وغصہ تھا۔

پہلے کی طرح دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ بس صرف آصف جاہ کے ہرکاروں کی بہت مدھم دور افتادہ آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ وہ اپنی پوزیشن تبدیل اور گھیرا مضبوط کر رہے تھے۔ گاہے بہ گاہے ایک دو فائر مورچے کے دروازے کی طرف کر دیئے جاتے تھے۔ یہ بالکل ویران جگہ تھی۔ اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ پولیس سمیت کوئی ہماری مدد کو آسکے گا۔ شہوار کا باپ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اپنے بے گناہ داماد کے گرد موت کا گھیرا قائم کر چکا تھا۔ اس کے جنون نے اسے سراپا قہر بنا دیا تھا۔

میں بے دم سا ہو کر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک رخنے کے اندر سے کتے کے ساتھ ساتھ ناجے کی لاش بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کی منکوں والی مالا اس کی سانسوں کی ڈور کی طرح ٹوٹ کر بکھر چکی تھی، ابھی کچھ دیر پہلے یہ شخص زندگی کی تمام تر حرارت اور توانائی سے معمور تھا اور یہ مورچا اس کا مسکن تھا۔ میں نے ایک بار پھر مورچے کا جائزہ لیا۔ یہ کافی کشادہ تھا اور اس کے دو حصے تھے۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اس مورچے میں پناہ گزیں ہو چکا تھا۔ لیکن اس وقت اور حالات تھے۔ ساتھی بھی اور تھا، کیفیت بھی اور۔۔۔۔۔ نکووال سے

آتے ہوئے میں اور بلقیس شدید بارش میں گھر گئے تھے اور تاجو سمیت اس پناہ گاہ میں گھس گئے تھے۔ پھر تاجو مجھے اور بلقیس کو تنہائی فراہم کرنے کے لئے چھتری لے کر باہر صوفی اسلم اور شبیر کے پاس چلی گئی تھی۔ کتنے خوبصورت لمحے تھے وہ۔ تابڑ توڑ برستی بارش میں اس ویران پناہ گاہ میں سرگوشیاں گونجتی تھیں۔ ہماری تیز سانسیں ایک دوجے میں گڈمڈ ہوئی تھیں۔ اس سامنے والی دیوار کے ساتھ کھڑے تھے ہم۔ اس دائیں طرف والے رخنے کے کنارے بلقیس نے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا لمس جیسے ابھی تک اس کنارے پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ جیسے کل کی بات تھی کہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ اور ہمارے دلوں میں انہونیوں کی آس تھی۔ مگر اب وہ سب کچھ گزرے زمانے کی بات ہو گئی تھی اور ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ تھا۔ اور اب موت کے اس گھیرے میں آنے کے بعد تو یوں لگ رہا تھا جیسے اب میں کبھی اس چہرے کو دیکھ ہی نہیں سکوں گا۔ یہاں سے میری اور تیمور کی گولیوں سے چھلنی لاش برآمد ہو گی۔ ہمیں راجوال کے نواحی قبرستان میں کہیں دفنا دیا جائے گا۔ علاقے کے مکین کچھ عرصے تک اس واقعے کو یاد رکھیں گے پھر سب کچھ بھلا دیا جائے گا۔ کبھی کبھی بے بے جی اور عارفہ قبرستان کا رخ کیا کریں گی ورنہ کسی کو یاد بھی نہیں ہو گا کہ یہاں جاگیر کا سابقہ سالار شاہ خاور دفن ہے۔۔۔۔ جسے کسی وقت کچھ لوگوں نے بڑی محبت سے جاگیر کا نجات دہندہ قرار دیا تھا۔ بلکہ شیر شاہ کا خطاب دے ڈالا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"یار! بچی کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا افسوس ہوا ہے۔ پتا نہیں کہ بچتی بھی ہے یا نہیں۔"
تیمور کی افسر آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔

میں نے کہا۔ "بچی کے زخمی ہونے میں تو اس کی ماں کی اپنی غلطی بھی شامل ہے۔ اسے ایک دم باہر نہیں نکلنا چاہئے تھا لیکن اس بندے کی موت تو سراسر ہماری وجہ سے ہوئی ہے۔"

میں نے بڑے تاسف سے چند قدم دور پڑی لاش کو دیکھا۔ خون کچی زمین میں جذب ہو گیا تھا اور ناجے کی بے نور آنکھیں افق کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"خیر غیب کا علم تو کسی کو نہیں ہوتا۔" تیمور نے میری ڈھارس بندھائی۔ "اگر ہمیں غیب کا علم ہوتا تو شاید امین چودھری کے ڈیرے کا رخ ہی نہ کرتے۔" پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ "مجھے تو روپے میں سے چودہ آنے یقین ہے کہ امین چودھری نے ہی لمبڑ کو ہمارے پیچھے لگایا۔ اگر اس نے۔۔۔۔"

تیمور کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ کم از کم چھ گولیوں کا ایک برسٹ مورچے کی دیوار سے ٹکرایا۔ دو گولیاں ایک رخنے سے گزر کر اندر ہی گھس آئیں۔ ایک گولی نے میلے کچیلے واٹر کولر میں سوراخ کر دیا اور پانی فرش پر بہنے لگا۔ دوسری گولی بچی کے چھوٹے سے فیڈر کے آر پار ہو گئی۔ بچا کھچا دودھ سوراخوں سے بہہ گیا۔ شاید یہ اس بات کا شگون تھا کہ اس فیڈر کو استعمال کرنے والی ننھی سی جان بھی اس دنیا میں نہیں رہی۔

کتے کے بچی پر جھپٹنے کا منظر نگاہوں میں گھوما اور سینے میں انگارے سے دہک گئے۔ برسٹ کے بعد تیمور نے بھی دو جوابی فائر کئے۔ جواب میں ایک برسٹ چلا اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

اگر امین چودھری نے واقعی مخبری کی تھی پھر وہ ہرگز قابلِ معافی نہیں تھا۔۔۔۔ لیکن قابلِ معافی ہونے یا نہ ہونے کا سوال تو اس پیدا ہوتا تھا جب ہم یہاں سے نکل سکتے۔ اور فی الحال ایسا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" تیمور نے پوچھا۔ "ہمارے پاس زیادہ گولیاں نہیں ہیں۔ بہت ہوا تو دو ڈھائی گھنٹے انہیں مزید روک سکیں گے۔ اس سے بہتر نہیں ہے کہ فائر کرتے کرتے باہر نکلیں اور جان بچانے کی ایک کوشش کریں؟"

"میرے اپنے ذہن میں بھی یہی خیال ہے لیکن اس کے لئے ہمیں تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔۔۔۔ دو بج گئے ہیں۔ ڈھائی تین گھنٹے میں شام ہو جانی ہے۔ اندھیرا ہو گیا تو پھر ہمارے بچ نکلنے کا چانس بڑھ جائے گا۔ دائیں طرف سے سرکنڈے بالکل پاس ہیں۔ ہم کسی طرح سرکنڈوں میں گھس گئے تو کسی نہ کسی طرح رستہ نکل آئے گا۔"

"لیکن کیا شام تک یہ خبیث ہمیں زندہ رہنے دیں گے؟"

"بات پھر وہی غیب کے علم کی آ جاتی ہے جو تمہارے پاس ہے نہ میرے پاس۔" میں نے کہا۔

ران کا زخم ٹھنڈا ہونے کے بعد تکلیف دے رہا تھا۔ کچھ یہی کیفیت تیمور کی بھی تھی۔ لمبڑ آصف کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہم بے حد تھکے ہوئے تھے اور بھوک محسوس ہو رہی تھی مگر اب موت کے گھیرے میں آنے کے بعد تھکن اور بھوک ایک گھمبیر و اذیت ناک اندیشے کے نیچے دب گئی تھیں۔ سامنے ایک پتیلی میں ابلے ہوئے سفید چاول پڑے تھے۔ ایک پیالے میں آلو کا سالن بھی موجود تھا مگر ہماری توجہ ان چیزوں کی طرف بالکل نہیں تھی۔ بس ہم تھوڑا تھوڑا پانی پی کر اپنے خشک گلے تر کر رہے تھے۔

سردیوں کا سورج تیزی سے مغربی افق کی طرف بھٹکتا چلا جا رہا تھا۔ سائے طویل ہو رہے تھے۔ بیش قیمت کتے کی لاش پر چند کوے منڈلا رہے تھے۔ باقی کتوں کی آوازیں کچھ فاصلے سے آ رہی تھیں۔ یقیناً انہیں کسی درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا اس ویران جگہ پر ان آوازوں کے سوا مکمل خاموشی تھی۔ اچانک میں اور تیمور بری طرح چونکے۔ مورچے کی چھت پر سے چند خشک ٹہنیاں اڑتی ہوئی آئیں اور دروازے کے قریب گریں۔ ابھی ہم کچھ سمجھ نہ پائے تھے کہ مزید شاخیں دروازے کے سامنے گرنے لگیں ایک پوری کی پوری جھاڑی بھی جیسے جڑوں سے اکھاڑ کر دروازے کے سامنے پھینک دی گئی تھی۔

"کہیں۔۔۔۔ یہ آگ وغیرہ لگانے کے چکر میں تو نہیں۔۔۔۔"

تیمور کی ہراساں آواز ابھری۔

"لگ تو۔۔۔۔ایسا ہی رہا ہے۔" میں نے تائید کی۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی پیشانیوں پر پسینا چمکنے لگا۔

تیمور نے ایک گہری سانس لی۔ اور پھر خود کو جیسے آنے والے حالات کے لئے تیار کرنے لگا، میرے اندر کا خوف بھی اب بے پناہ طیش میں بدلنے لگا تھا۔ مجھے موت کے خوف سے انکار نہیں لیکن موت کے خوف سے چوہے کی موت مرنا بھی مجھے ہرگز قبول نہیں تھا۔۔۔۔ اور شاید یہی کیفیت تیمور کی بھی تھی۔ اس کے نتھنے غیر محسوس طور پر پھول گئے تھے اور آنکھوں میں ہیجانی لہر نمودار ہو رہی تھی۔

لمبڑ آصف جاہ نے اپنے جنونی ہونے کا پورا پورا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ وہ ہمیں اسی تنگ وتاریک جگہ میں جلا کر راکھ کر دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ان ویران درختوں میں وہ خود ہی مدعی، خود ہی جج اور خود ہی جلاد بن گیا تھا۔ اس کے ہرکاروں نے دیکھتے ہی دیکھتے مورچے کے ارد گرد خشک ٹہنیوں اور جھاڑیوں کا انبار سا لگا دیا۔ مورچے کی چھت ایک طرف سے زمین کے برابر تھی۔ وہ اس طرف سے آتے تھے اور چھت پر کھڑے ہو کر سامنے کی طرف ٹہنیاں اور جھاڑیاں پھینک دیتے تھے۔

میں نے آخری کوشش کے طور پر ایک بار پھر اپنی آواز ان سفاک ہرکاروں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ میں نے ایک سوراخ سے منہ لگایا اور پکار کر کہا۔ "میری بات آصف جاہ سے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کرواؤ۔ میں اسے اس کی بیٹی کے قاتل کا نام بتانا چاہتا ہوں۔ تم ہمیں بے گناہ مار رہے ہو۔ تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میری آواز سن رہے ہو تم؟"

خبر نہیں کہ وہ سن رہے تھے یا نہیں لیکن جواب کوئی نہیں آیا۔

دور فاصلے پر مجھے لمبڑ کے کارندوں کی حرکت نظر آئی۔ وہ مورچے کے عین سامنے خود کو چوکس کر رہے تھے۔ مقصد یقیناً یہی تھا کہ اگر ہم آگ سے بچنے کے لئے مورچے سے باہر نکلیں تو وہ ہمیں کامیابی سے گولیوں کی باڑ پر رکھ سکیں۔

شام کے سائے طویل ہو رہے تھے اور یہ بات ظاہر تھی کہ وہ ہمیں تاریکی سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہتے۔ نازک ترین لمحے پہنچ گئے تھے۔ اب کسی بھی وقت خشک ٹہنیوں کے انبار کو اور ارد گرد کے سرکنڈوں کو آگ لگائی جا سکتی تھی اور ہم دم گھٹ کر یا کوئلہ ہو کر مر سکتے تھے۔ ہم دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو پیغام دیا کہ اب باہر نکلنا ہے۔ مرنا ہے یا مار دینا ہے۔ میں نے آرزدہ لہجے میں کہا۔ "یار تیمور! یہ سب کچھ میری وجہ سے ہو رہا ہے۔

میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تم سب کو بڑے دکھ دیئے ہیں۔۔۔۔ بڑے بھائی کو، ماں جی اور عارفہ کو۔۔۔۔ باگو کو اور اس کے گھر والوں کو۔۔۔۔"

"خبردار۔۔۔۔ میں منہ توڑ دوں گا تمہارا۔" تیمور نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا اور میرے گلے سے لگ گیا۔

ہم کچھ دیر تک اسی طرح ایک دوسرے سے پیوست کھڑے رہے۔ہم نے اپنے ہتھیار فل لوڈ کر لئے۔چہروں پر کپڑوں کے منڈاسے باندھ لئے۔۔۔۔۔اور باہر نکلنے کے لئے تیار ہو گئے۔اس تیاری کے دروان میں یا اس سے پانچ دس منٹ پہلے میں نے اور تیمور نے ایک اور قابل تحیر منظر دیکھا۔۔۔۔طاقتور رائفل کا ایک برسٹ چلا اور سلو کی ہاؤنڈ کی لاش پر منڈلاتے ہوئے دو تین کوئے اور ایک گدھ پھڑ پھڑا کر زمین پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ان پرندوں کو آصف جاہ کے چہیتے پالتو کی لاش پر چونچ مارنے کی سزا ملی تھی۔اس سے آصف جاہ اور اس کے کارندوں کی وحشت کا اشارہ ملتا تھا۔

تو میں بات کر رہا تھا اس مورچے سے باہر نکلنے کی جو اب تک ہماری پناہ گاہ بنا رہا تھا اور جس نے اپنی دیواروں پر ہمارے نام کی بے شمار گولیاں پچھلے چار گھنٹے میں برداشت کی تھیں۔ہم دروازے کی طرف بڑھے اور پھر انہی لمحوں میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ان آوازوں کا رخ کچھ عجیب سا تھا۔

"کیا چکر ہے؟" تیمور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"لگتا ہے یہ فائر دائیں طرف کے درختوں سے ہو رہے ہیں۔"

ہم کچھ دیر مزید ان آوازوں پر غور کرتے رہے۔اب بائیں طرف سے بھی آوازیں ابھر رہی تھیں۔"کہیں۔۔۔۔۔یہ آپس میں تو نہیں لڑ پڑے۔" تیمور نے پُرامید لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، میں نے دور ایک درخت پر سے کسی بندے کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔دیکھتے ہی دیکھتے فائرنگ میں شدت آ گئی۔باہر نکلنے کے لئے یہ موقع بہترین تھا۔اگر ہم نہ نکلتے تو یہ ہماری بہت بڑی حماقت ہوتی۔ہم نے دروازہ کھولا اور ناجے کی لاش پھلانگ کر جھک کر بھاگتے ہوئے دائیں طرف کے سرکنڈوں کی طرف بڑھے۔دو تین گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے بالکل پاس سے گزریں۔ہم دونوں نے بھی جوابی فائر کیے اور سرکنڈوں میں گھس گئے۔مجھے اندازہ ہوا کہ ایک گولی تیمور کو لگی ہے مگر کہاں؟اس کا جواب نہیں ملا۔۔۔۔۔بھاگنے سے میری ران میں ناقابلِ برداشت ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر یہ ان ٹیسوں پر دھیان دینے کا وقت نہیں تھا۔

سرکنڈوں میں گھسنے کے فوراً بعد ہمیں اوندھے منہ گرنا پڑا۔ہمیں نشانہ بنایا جا رہا تھا۔گولیاں مسلسل ہماری طرف آ رہی تھیں۔بدبودار کیچڑ میں کرالنگ کرتے ہوئے ہم آگے بڑھنے لگے۔

اچانک مجھے کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ایک کار نظر آئی۔ اس کار کے عقب سے مورچے کے سامنے والے درختوں کی طرف فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں اس کار کو یہاں دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ اس مونگیا رنگ کی کار کو میں پہچانتا تھا۔ یہ اللہ بخشے چودھری نشاط کے چھوٹے بھائی شاہنواز کے استعمال میں ہوا کرتی تھی۔ اب شاہ نواز اشتہاری تھا اور اس کے تایے کے پتّر یہ کار استعمال کرتے تھے۔ میرے ذہن میں فوراً آیا کہ کار یہاں ہے تو ہو سکتا ہے شاہنواز بھی یہاں ہو۔

میں اور تیمور رینگتے ہوئے دس پندرہ قدم مزید آگے گئے۔ تب میں نے پکار کر کہا۔

"شاہنواز۔۔۔۔۔ میں خاور ہوں۔۔۔۔۔ شاہنواز!"

میری پکار کا جواب میری توقع سے بھی زیادہ جلدی ملا۔ یہ شاہنواز کی آواز تھی۔ فائرنگ کے ساعت شکن شور میں بھی میں نے اس آواز کو بہ آسانی پہچان لیا۔

وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "خاور ہم نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ ہم گاڑی کے پیچھے ہیں۔ تم اسی طرح لیٹے لیٹے آگے آؤ۔ کھڑے نہیں ہونا۔"

اس آواز نے ہمارے مردہ جسموں میں نئی زندگی دوڑا دی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں اس ویرانے میں نشاط کے بھائی شاہنواز سے ملاقات ہو گی۔ ہم اسی طرح رینگتے اور گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے آگے بڑھے اور کار تک پہنچ گئے۔ شدید فائرنگ کے سبب ایک طرف کے سرکنڈوں میں آگ لگ گئی تھی۔ اور دھوئیں کے مرغولے شام کے جھٹپٹے کو گہرا کر رہے تھے۔ ہمارے لیے گاڑی کے ایک طرف کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ ہم اسی طرح جھکے جھکے گاڑی میں داخل ہو گئے۔ ہم دونوں پچھلی نشست پر گئے تھے۔ جونہی میں نے گاڑی کا دروازہ بند کیا وہ ایک جھٹکے سے حرکت میں آ گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر خود شاہنواز موجود تھا۔ اس کا ایک ساتھی رائفل سمیت پہلو والی نشست پر موجود تھا اور گاہے بہ گاہے مورچے کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔

گاڑی دھوئیں کے مرغولوں میں سے برق رفتاری کے ساتھ گزری اور کچے راستے پر آ گئی۔ یہ وہی راستہ تھا جو سوئے کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔

"تم ٹھیک ہو نا؟" شاہنواز نے ڈرائیونگ کرتے مڑ کر دیکھا۔

"ہاں، میں تو ٹھیک ہوں۔" میں نے تیمور کو ٹٹولا۔ "کہاں لگی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ زخم کندھے سے ذرا نیچے تھا۔ یہ گولی کا نہیں کارتوس کے موٹے چھرے کا زخم تھا۔ خون نکل رہا تھا میری ران کا زخم بھی تازہ ہو کر پھر سے خون اگلنے لگا تھا۔ "کوئی پیچھے تو نہیں آ رہا؟" میں نے کراہتے ہوئے شاہنواز سے پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں۔" اس نے تیزی سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے مڑ کر دیکھا، دھوئیں کے مرغولے ایک گھٹا کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ شاید یہ دھواں ہی تھا جس نے ہمیں آصف جاہ کی نظروں سے اوجھل رکھا تھا۔ دھوئیں کے اندر شعلوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ غالباً سرکنڈوں کے ساتھ ساتھ خشک ٹہنیوں کے انبار نے بھی آگ پکڑ لی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور تیمور ایک بہت پرانے قبرستان میں ایک چھوٹے سے ڈھارے میں موجود تھے۔ ڈھارے میں ایک ملنگ نما شخص موجود تھا اور چٹائی پر بھنگ گھوٹنے کا ساز و سامان بکھرا ہوا تھا۔ شاہنواز اور اس کے دو ساتھیوں نے ملنگ کے ساتھ مل کر ہماری مرہم پٹی کی۔ ہمیں دیسی گھی ڈال کر گرم دودھ پلایا اور درد کم کرنے کے لیے ڈسپرین وغیرہ دی گئی۔ ڈھارے کے اندر سرسوں کے دو دیے روشن تھے۔

شاہنواز کی عمر اٹھائیس سال کے قریب تھی، اس کی شکل چودھری نشاط سے زیادہ نہیں ملتی تھی۔ چہرے پر ایک دو پرانے زخموں کے نشان اس کی آتش مزاجی اور مہم جو طبع کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ وہ جو کچھ بھی تھا لیکن اس وقت ہمارے لیے زندگی کی نوید بن کر آیا تھا۔ کسی قریبی کمرے سے کسی عورت کے رونے کی مدھم آواز آئی۔ اس کے رونے میں بلا کا کرب تھا۔ "کون ہے یہ؟" میں نے شاہنواز سے پوچھا۔

"وہی جس کی اطلاع پر ہم وہاں پہنچے اور تمہیں نکالا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"یہ اس بندے کی زنانی ہے جو وہاں مورچے میں آصف جاہ کے کارندوں کے ہاتھوں مرا ہے۔ جب یہ وہاں مورچے سے نکلی تو اسے آصف جاہ کے بندوں نے پکڑ لیا اور ایک جیپ میں بٹھا کر دروازہ بند کر دیا۔ پر یہ موقع دیکھ کر وہاں سے نکل گئی اور بھاگ کر یہاں آگئی۔ یہ کوئی دو گھنٹے پہلے کی بات ہے۔"

"یہاں کیوں آئی؟" میں نے پوچھا۔

"بس۔۔۔۔اس کو چھپنے کے لیے کوئی جگہ چاہیے تھی۔ اس کا بندہ ناجا یہاں دو تین بار چاچے ملنگے کے پاس بھنگ پینے آیا تھا۔ یہ چاچے کے پاس آگئی۔" شاہنواز نے لمبے بالوں اور گہرے سانولے رنگ والے ادھیڑ عمر ملنگ کی طرف اشارہ کیا۔

"تمھیں مورچے کا کیسے پتا چلا؟" میں نے پوچھا۔

"اس عورت نے ہی ہمیں ساری بات بتائی۔ تم نے اس بندے ناجے کے سامنے اپنا نام لیا تھا۔ جب اس نے تمہارا نام بتایا تو مجھے شک ہو گیا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں مورچے پر پہنچا۔ وہاں لمبڑ آصف جاہ کی جیپ اور اس کے کتے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ سورے اور جوائی (سسر اور داماد) میں "میچ" پڑا ہوا ہے۔۔۔۔۔وہاں مورچے کو آگ لگانے کی تیاری

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہو رہی تھی۔ مجھے آصف جاہ کے زہریلے پن کا پتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو تمہارا سورا تمھیں اندر ہی بھون ڈالے گا۔ اوپر والے کا شکر ہے کہ ہم کامیاب ہو گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ کسی بندے کی جان بھی نہیں گئی۔ بس چار پانچ زخمی ہوئے ہیں۔"

اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ شاہنواز کا کردار واقعی دلیرانہ تھا۔ اچانک میرا دھیان ناجے کی زخمی بچی کی طرف گیا۔ "زخمی بچی کا کیا بنا؟" میں نے شاہنواز سے پوچھا۔

"وہ تو رستے میں ہی مر گئی تھی۔ جب وہ یہاں پہنچی تو ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس کے لیے پچھواڑے قبر کھود دی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں دفنا دیں گے۔" شاہنواز نے بے پروائی مگر تاسف سے کہا۔

میرے سینے میں دھواں سا بھر گیا۔ جواں سال ناجے کی لاش بھی نگاہوں میں گھومنے لگی۔ امکان تھا کہ اس کا چھلنی جسم بھی سرکنڈوں کی آگ میں جل کر کوئلہ ہو گیا ہو گا۔

عورت کا دردناک نوحہ پھر سنائی دیا۔ وہ کبھی بلند اور کبھی دھیمی آواز میں رو رہی تھی۔ چند ہی گھنٹوں کے اندر اس کی مانگ اور گود دونوں اجڑ گئی تھیں۔

شاہنواز کے بعد میں نے مختصر لفظوں میں اسے اپنی روداد سنائی اور اسے بتایا کہ کس طرح میں امین چودھری کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اس کے پاس گیا اور کیسے وہاں جا کر مایوسی ہوئی اور پھر آصف جاہ ہمارے پیچھے لگا۔

ساری روداد سننے کے بعد شاہنواز بھی کچھ الجھن میں نظر آیا۔ اس نے کہا۔ "یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ امین چودھری نے تم سے ملنے سے انکار کر دیا۔ مگر آصف جاہ کو اطلاع دینے والی بات شاید درست نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سعید شاہ نے کام دکھایا ہو۔ ویسے بھی وہ آصف جاہ کی برادری میں سے ہے۔"

عورت پھر سے نوحہ کرنے لگی۔ غالباً اپنی شیر خوار بچی کی لاش پر رونے والی وہ اکیلی ہی تھی۔ تیمور نے کہا۔ "یار میرا تو خون کھول رہا ہے۔ جی چاہتا ہے رائفل لوڈ کر کے قلعہ والا پہنچ جاؤں اور کچھ نہیں تو آصف جاہ کے کتوں کو تو ضرور چھلنی کر دوں۔ ایسے خطرناک جانوروں کو اس طرح جیتے جاگتے انسانوں کے پیچھے چھوڑنا سنگ دلی کا اخیر ہے۔"

شاہنواز نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں بھئی۔ اس وقت تو تم دونوں کو اپنا آپ بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ آصف جاہ کا رویہ تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔

پولیس علیحدہ تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔ کل رات باغ والے ڈیرے پر تایا عزیز سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ تایا بھی تمہاری طرف سے بہت پریشان ہیں۔ انہیں پکا یقین ہے کہ میاں وارث تم دونوں کو پولیس مقابلے میں پار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے بندے سادہ کپڑوں میں دن رات تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ کئی جگہوں پر ناکے بھی لگے ہوئے ہیں۔"

"تمہاری کیا رائے ہے؟" میں نے پوچھا۔

شاہنواز نے سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر خاص انداز میں ایک طویل کش لیا اور بولا۔ "سچی رائے پوچھتے ہو یا بس گزارے مافق۔"

"میں تم سے سچی رائے کی توقع ہی رکھتا ہوں۔"

"سچی رائے تو یہ ہے کہ ہم جیسے لوگوں کے لئے اس دنیا سے نبھا کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ مکر فریب اور جوڑ توڑ کی دنیا ہے۔ یا تو ہم اپنا آپ مار لیں اور دنیا کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کے لئے اپنا سر جھکا لیں یا پھر دوسرا راستہ یہ ہے۔۔۔۔۔" شاہنواز نے اپنی گود میں رکھی ہوئی روسی ساخت کی رائفل کو تھپتھپایا۔

میں شاہنواز کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ وہ جذباتی بات کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مسئلہ یہ ہے شاہنواز کہ میں یہ دونوں راستے اختیار نہیں کر سکتا۔ لیکن ایسی بات بھی نہیں کہ ہے کہ میں خود سے ہونے والی زیادتی کو خاموشی سے سہہ لوں گا۔ مجھ پر دو انسانوں کی جان لینے کا جھوٹا الزام ہے۔ مجھے ہر صورت اپنی صفائی دینی ہے۔"

"صفائی دینے کے لیے زندہ ہونا بھی تو ضروری ہوتا ہے اور میں نے کل جو اندازہ لگایا ہے وہ یہی ہے کہ ان لوگوں نے تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا۔ یہ بڑی دیر سے موقع کی تلاش میں تھے۔ اب قدرت کی طرف سے انہیں یہ موقع مل گیا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق تھانیدار وارث کے ساتھ موکھلوں کا پورا مک مکا ہو گیا ہے۔"

"جاگیر کے عام لوگ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"یہ سوچ بھی الٹ گئی ہے۔ خاص طور سے اماں دلشاد کی بیٹی کی موت کے بعد یقین ہو گیا ہے کہ تم نے شہوار کے قتل کی چشم دید گواہ کو ختم کیا ہے۔ جو لوگ تمہارے بہت زیادہ حمایتی تھے وہ بھی چپ ہو گئے ہیں۔ رہی سہی کسر موکھلوں کے پروپیگنڈے نے پوری کر دی ہے۔ تایا عزیز بتا رہے تھے کہ آج کل یہ پروپیگنڈا زوروں پر ہے۔ دلشاد کی یتیم بیٹی ثمینہ کی موت

کو بہت زیادہ اچھالا جا رہا ہے۔ اس بات کی گواہیاں بھی مل گئی ہیں کہ ثمینہ کے قتل کے بعد تم دیوار پھاند کر فرار ہوئے تھے۔ ثمینہ کے چاچے کے پتر اور اس کی بیوی نے تمہیں دیوار پھاندتے ہوئے دیکھا ہے اور پہچانا بھی ہے۔"

میں شاہنواز کو اس بارے میں ساری تفصیل پہلے بھی بتا چکا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ ثمینہ کو صرف اس لئے مارا گیا ہے کہ وہ میرے خلاف اپنا بیان بدلنے والی تھی۔

کوئی دو گھنٹے بعد گہری تاریکی میں ناجے کی کٹی پھٹی بچی کو ایک چھوٹے سے قبر میں دفن کر دیا گیا۔ دکھیاری عورت اپنے سر کے سائیں کی لاش بھی چاہتی تھی تاہم شاہنواز نے اسے سمجھایا کہ وہ لاش ابھی اسے نہیں مل سکتی۔ غم زدہ عورت نے ایک بار بھی پولیس کے پاس جانے کی بات نہیں کی۔۔۔۔۔نہ ہی وہ کسی اور طرح دادرسی چاہ رہی تھی۔ اپنے جیسے بے شمار لاچار لوگوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ ظلم کرنا، طاقتور کا حق اور ظلم سہنا کمزور کا مقدر ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہم دو دن تک وہیں ملنگے سائیں کی کٹیا میں رہے اور اپنے زخموں کی بری بھلی مرہم پٹی کرتے رہے۔ میری ران کا زخم زیادہ تکلیف دہ تھا۔ روز رات بخار ہو جاتا تھا اور میں درد سے تڑپتا رہتا تھا۔ اس قدیم قبرستان میں شاہنواز اپنے قریباً آٹھ ساتھیوں سمیت روپوش تھا۔ ملنگے کی کٹیا کے پیچھے دو تین کچے کمرے تھے۔ یہ لوگ عارضی طور پر آج کل یہیں مقیم تھے۔ شاہنواز کے چچازاد بھائی دو تین بار اس سے ملنے کے لیے یہاں آئے تھے اور خورد و نوش کا بہت سا سامان دے کر گئے تھے۔ قبرستان کی دو خالی قبروں کو ان لوگوں نے خفیہ پناہ گاہ کی حیثیت دے رکھی تھی۔ اگر کسی وقت خطرہ ہوتا تو شاہنواز اور اس کے دو مفرور ساتھی اس خفیہ پناہ گاہ میں چلے جاتے۔

یہ تیسرے روز آدھی رات کی بات ہے۔ شاہنواز کا ایک چچازاد بھائی اکرم اس سے ملنے آیا۔ وہ اپنے ساتھ سلور کے دو ڈبوں میں بہت سا دیسی گھی اور میٹھی دال یعنی بھانڈا وغیرہ لایا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ایک نہایت اہم اور تکلیف دہ خبر بھی تھی۔ اس کا پتا مجھے اکرم کے جانے کے بعد شاہنواز سے لگا۔ میں اور تیمور اکرم کے سامنے نہیں آئے تھے۔

مٹی کے دیے کی روشنی میں شاہنواز کا چہرہ دکھ اور پریشانی کی آماج گاہ نظر آتا تھا۔ اس نے کہا۔

"شاہ خاور! وہی کچھ ہوا ہے جس کا مجھے ڈر تھا۔ آج شام موکھلوں نے راجوال کی عزت خاک میں ملا دی۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" میں اور تیمور ایک ساتھ بولے۔

"قریباً دو سو بندوں نے گاؤں پر ہلا بولا ہے۔ ان میں لمبڑوں کے گھڑ سوار بھی شامل تھے۔ انہوں نے لوگوں کو مارا پیٹا عورتوں کو بے عزت کیا ہے اور کوئی پچاس بھینسیں ہانک کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔"

"پر راجوال کے گھڑ سوار کہاں تھے؟"

"یار! گھڑ سوار تو تب لڑتے ہیں جب ان کو کوئی لڑانے والا ہو۔ بیگم بلقیس میں تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ گھوڑے پر چڑھ کر میدان میں آجاتی۔ تایا عزیز بیمار پڑا ہے۔ نصر اللہ ہی تھا۔ اس نے تھوڑا بہت مقابلہ کیا پھر ڈھے گیا۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر گولیاں لگی ہیں۔ دو بندے جان سے گئے ہیں۔ پندرہ بیس زخمی ہوئے، باقی بھاگ گئے۔ لمبڑوں اور موکھلوں نے خوب لوٹ مچائی۔ گاؤں کے قریباً سو بندوں کو حویلی کے سامنے زمین پر لٹا کر جوتے مارے ہیں۔"

میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ "پر یہ ہوا کس وجہ سے ؟"

"بس ان کو کوئی بہانہ چاہیے تھا۔ وہ مل گیا۔ اتوار کی رات موکھلوں کے گاؤں میں رسا گیری کی واردات ہوئی ہے۔ ایک زمیندار کی دس پندرہ بھینسیں چوری ہوئی ہیں۔ ان میں سے چار بھینسیں راجوال کے ایک کسان کے ڈیرے سے ملی ہیں۔ بس اسی بات کا بتنگڑ بنایا گیا اور پھر جھگڑے کو لڑائی میں بدل دیا گیا۔ بہت بے عزتی ہوئی ہے لوگوں کی۔ عورتوں کے سروں سے دوپٹے کھینچے گئے ہیں۔ انہیں تھپڑ مارے گئے ہیں۔ بندوں سے لکیریں نکلوائی گئی ہیں۔۔۔۔ پولیس نے بس تماشا دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ میرا تو دل رو رہا ہے یار!"

"پولیس نے کیوں کچھ نہیں کیا؟"

"ان کے پاس کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے ہزار بہانے ہوتے ہیں۔ وہ موقع پر اس وقت پہنچے جب موکھل اور لمبڑ اپنا کام کر چکے تھے۔ بعد میں رسا گیری کے کیس کو بہانہ بنا کر پولیس نے بھی مخالف پارٹی کی طرف داری کی۔ حویلی کے اندر گھس کر بیگم بلقیس اور تایا عزیز کو ڈرایا دھمکایا گیا۔۔۔۔ اس دوران میں موکھل پاشا نے حویلی کے سامنے کھڑے ہو کر ہوائی فائرنگ کی اور اعلان کیا کہ اس سے پہلے بھی ہمارے گاؤں میں رسا گیری ہوتی رہی ہے اور

ہمارے مویشی چوری ہو کر جاگیر میں ہی آتے رہے ہیں۔ اس نے حکم صادر کیا کہ گاؤں میں سے کم از کم سو بھینسوں کا انتظام کیا جائے اور یہ بھینسیں ابھی ان کے حوالے کی جائیں۔ کچھ لوگ بیچ بچاؤ کے لیے درمیان میں آئے اور پچاس بھینسوں پر راضی نامہ ہوا۔ حویلی میں جو پندرہ بھوری بھینسیں لی گئیں، وہ اس کے علاوہ تھیں۔"

"ان باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔" تیمور نے تاسف سے سر ہلایا۔

"جب دشمن کا وار چل جاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا۔ اکرم نے بتایا ہے، راجوالیوں نے اپنی بھینسیں اپنے ہاتھوں سے میدان میں پہنچائیں اور پھر ٹرکوں پر چڑھائیں۔"

میرے سینے میں آگ بھڑکنے لگی۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ ابھی کچھ دیر پہلے شاہنواز نے جو بات کہی تھی، اس پر پھر سے غور کروں۔ شاہنواز کی طرح ہی رائفل تھام لوں اور ویرانوں میں نکل جاؤں۔ اس کے بعد دشمنوں کو چن چن کر پکڑوں اور بدلہ لوں مگر شاید یہ سب کچھ میرے خون میں شامل نہیں تھا۔ میں موت اور مصیبت سے ڈرتا نہیں تھا مگر آخری وقت تک صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بے بے جی نے بچپن سے جو نصیحتیں کانوں میں ڈالی تھیں، وہ کسی الوہی صدا کی طرح سماعت میں گونجتی رہتی تھیں۔

یہ اگلی رات کا واقعہ ہے۔ میں ایک کمرے میں بیٹھا اپنی زخمی ران کی پٹی خود ہی بدل رہا تھا۔ ملنگے سائیں نے دو چار جڑی بوٹیوں سے ایک سیاہی مائل مرہم بنایا تھا جو میں اور تیمور دونوں لگا رہے تھے۔ اس سے افاقہ تھا۔ شاہنواز کے ساتھیوں میں ایک ادھیڑ عمر شخص تیز دھار چاقو سے گولی نکالنا جانتا تھا۔ اس نے اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ کیا تھا اور تیمور کی کلائی میں سے گرم چاقو کی مدد سے گولی نکال دی تھی۔ تاہم اس کوشش میں کچھ رگیں کٹ گئی تھیں اور تیمور کا ہاتھ ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔

اسے رات کو شدید درد بھی تھا۔ درد سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہ کثرت سے شراب پی رہا تھا۔ اپنی ران کی پٹی بدلتے ہوئے میں نے تکلیف سے سسکاری لی تو وہ بولا۔ "تھوڑی سی پی لو۔ درد سے لڑائی آسان ہو جائے گی۔"

"مجھے ایسی آسانی نہیں چاہیے۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "میں جو کچھ چھوڑ چکا ہوں، وہ چھوڑ چکا ہوں۔"

"اور جس کے لیے چھوڑ چکے ہو وہ تمہیں چھوڑ چکی ہے۔ اس نے اب کبھی پلٹ کر تمہاری طرف دیکھنا نہیں ہے۔ میری بات یاد رکھنا۔" تیمور نے شرابیوں کے انداز میں ہاتھ لہراتے

ہوئے کہا۔ "اول تو وہ شادی کرے گی نہیں اور اگر کرے گی تو اپنی برادری کے کسی اُچے شملے والے سے کرے گی۔"

"اور میرا خیال ہے کہ تمہیں کچھ زیادہ چڑھ گئی ہے۔" میں نے شراب کی بوتل اس کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔

"یار! تیری ساری زندگی برباد ہو گئی ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اگر۔۔۔۔ اگر تیرے دل میں اس کے لئے اتنی ہی تڑپ ہے تو پھر مجھے بتا۔۔۔۔۔ مجھے بتا یار۔۔۔۔۔ میں تیرے لیے سب کچھ کر گزروں گا۔ اسے راجوال سے اٹھا کر لے آؤں گا یہاں۔۔۔۔۔ پھر تم دونوں کہیں دور نکل جانا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔"

"تو اپنی زبان بند نہیں کر سکتا؟" میں نے اسے جھڑکا۔

"دیکھ خاورے! آج میری زبان سے سچی باتیں نکل رہی ہیں۔ مجھے پتا ہے تیرے دل سے وہ آج بھی نہیں نکلی ہے۔ اگر تو اس کے بغیر مر گیا نا تو مرنے کے بعد تیری روح بھی اس کے لیے تڑپتی رہے گی۔"

اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر کمرے سے نکل جاتا، ایک آواز نے مجھے چونکایا۔ یہ گاڑی کے انجن کی آواز تھی اور قبرستان کے بالکل پاس سے آ رہی تھی۔ ایسی کسی آواز کو سنتے ہی شاہنواز اور اس کا اشتہاری دوست زیر زمین جانے کو تیار ہو جاتے تھے تاہم اس مرتبہ ایسی کوئی نوبت نہیں آئی۔ معلوم ہوا کہ آنے والا کوئی غیر نہیں اپنا ہے۔ یہ شاہنواز کا چچازاد اکرم ہی تھا۔ اکرم کے ساتھ ایک اور نہایت اہم شخص بھی یہاں پہنچا تھا۔ یہ چودھری عزیز تھا۔

چودھری عزیز کی یہاں اچانک آمد نے ہمیں حیران کیا۔ بند کمرے میں میری اور چودھری کی ملاقات ہوئی۔ چودھری کے چہرے پر ہیجانی تاثرات تھے۔ اس نے کہا۔ "میں چار پانچ دن سے بیمار ہوں لیکن یہاں تمہارے پاس آنا بھی بہت ضروری تھا۔ تم پہلے بھی بہت مصیبت میں ہو، میں تمہیں اور مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو چودھری عزیز۔"

اس نے کہا۔ "ماضی میں بہت کچھ ہوتا رہا ہے خاور! کبھی ہم دوست بنے، کبھی دشمن۔۔۔۔۔ لیکن ایک بات میں تسلیم کرتا ہوں اور سچے دل سے کرتا ہوں۔ تم نے جاگیر اور حویلی کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ تمہاری کئی برسوں کی مسلسل کوششوں سے جاگیر کی دیواریں پکی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہوئی ہیں۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ جاگیر کی بنیادیں اور دیواریں مضبوط کرنے والا اب خود ریت کی دیوار بن جائے۔ تمہارے ارد گرد حالات بہت خراب ہو چکے ہیں خاور۔۔۔۔۔ گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ پولیس، موکھل اور لمبڑ یہ تینوں ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ تمہیں تین چار دن سے زیادہ دیں گے اور ایسا بھی صرف اس لئے کہ ہم نے تمہاری والدہ اور بہن کو محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے ورنہ ان لوگوں نے تمہیں مجبور کر دینا تھا کہ تم خود ان کے سامنے پیش ہو جاؤ۔"

"اب تمہاری کیا رائے ہے چودھری عزیز؟"

"رائے نہیں ہے، فیصلہ ہے اور تمہیں اس فیصلے پر ہر صورت عمل کرنا پڑے گا۔" چودھری نے اپنائیت بھرے تحکم سے کہا۔

"کیسا فیصلہ؟"

"تم تیار رہو۔ میں نے تمہیں یہاں سے نکالنے کا پورا انتظام کر لیا ہے۔ تم والی جی کے ایک پرانے دوست غلام خان کے ساتھ آزاد علاقے میں جا رہے ہو۔ تمہیں شاید پتا ہو، غلام خان کا اپنا ٹرک ہے اور وہ اس کی ڈرائیوری بھی خود ہی کرتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ ساری

بات کرلی ہے۔پرسوں صبح تین چار بجے کے قریب تم اور تیمور ایک ٹریکٹر ٹرالی میں پکی سڑک تک پہنچو گے۔وہاں سے غلام خان ٹرک پر سوار کرے گا۔وہ پسرور سے کچھ فرنیچر وغیرہ لے کر کرم ایجنسی کے علاقے ٹل میں جارہا ہے۔وہ تم دونوں کو اپنے سامان میں اس طرح چھپالے گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ٹل سے آگے تم لوگ لوکل بس میں سفر کروگے اور افغانستان کے بارڈر کی طرف نکل جاؤ گے۔غلام خان ہر قدم پر تم دونوں کے ساتھ ہوگا اور جب تک تمہاری طرف سے مطمئن نہیں ہو جائے گا واپس نہیں آئے گا۔"

اگلے ایک گھنٹے میں ہمارے درمیان یہی بات ہوئی کہ ہم نے یہاں سے کس طرح نکلنا ہے اور قبائلی علاقے میں کس طرح چند ماہ کے لیے خود کو روپوش کرنا ہے۔اس گفتگو میں شرکت کے لیے میں نے تیمور اور شاہنواز کو بھی بلالیا تھا۔شاہ نواز کو بھی چودھری عزیز کے خیالات سے مکمل اتفاق تھا۔اسے بھی لگ رہا تھا کہ جس طرح کے حالات بن گئے ہیں، مجھے آٹھ دس مہینوں یا پھر ایک ڈیڑھ سال کے لیے قبائلی علاقے میں روپوش ہو جانا چاہیے۔

ہمیں قریباً پچھتر فیصد رضامند کرنے کے بعد چودھری عزیز اور اکرم واپس چلے گئے۔

چودھری عزیز سے دو دن پہلے والی لڑائی کے حوالے سے کچھ مزید خبریں ملیں۔مجھے اپنے تین چار ساتھیوں کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی۔اس کے علاوہ حامد کے سر پر بھی لاٹھیاں لگی تھیں۔جب موکھل پاشا اور اس کے ساتھی دندناتے ہوئے حویلی میں داخل ہوئے اور ملازموں کو زدوکوب کیا تو حامد کم عمر ہونے کے باوجود رائفل پکڑ کر باہر نکل آیا۔بلقیس اسے پکڑتی ہی رہ گئی۔اس کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر موکھل پاشا کے ساتھی چکمادے کر اس کے عقب میں چلے گئے اور لاٹھی کی دو تین ضربیں اس کے سر پر لگا کر رائفل اس سے چھین لی۔ رونق علی کے معمولی زخمی ہونے کی اطلاع بھی مجھے ملی۔یہ ساری خبریں دکھی کرنے والی تھیں۔میں مورچے والے واقعے کے بارے میں بھی جاننا چاہ رہا تھا۔مجھے یہ تجسس تھا کہ ناجے کی لاش کا کیا بنا۔

اس کے بارے میں چودھری عزیز یا اکرم کوئی خاص اطلاع فراہم نہیں کرسکے۔بس یہی پتا چلا کہ وہاں سے ایک کوئلہ لاش ملی تھی۔جسے لاپتا قرار دے کر پولیس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔خیال ظاہر کیا جارہا تھا کہ یہ ملزموں کے کسی ساتھی کی لاش ہے۔

اگلے چوبیس گھنٹے میں نے شدید تذبذب کے عالم میں گزارے۔۔۔۔۔میں جیسے ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ایک راستہ فرار کا تھا،دوسرا خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے کا۔ دونوں راستوں پر خطرات موجود تھے لیکن میں دونوں میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کرتا اس سے پہلے میں ایک بار بے بے جی اور عارفہ سے ملنا ضرور چاہتا تھا۔میں بے بے جی کی پائنتی کی طرف بیٹھ کر دیر تک ان کی ٹانگیں دبانا چاہتا تھا اور ان کی مامتا کو اپنے سارے دکھڑے سنانے کے بعد ان کی رائے اور ان کی دعائیں چاہتا تھا۔ماں کے پاؤں پکڑ کر مجھے جو سکون ملتا تھا۔اس کو بیان کرنے کے لیے میرے الفاظ بالکل ناکافی ہیں۔

"کس سوچ میں ہو یار؟" تیمور نے دودھ پتی والی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وہی جو تم سوچ رہے ہو۔کس طرف جانا چاہیے؟" میں نے خود کو کھدر کے لحاف میں لپیٹ کر جواب دیا۔

"میں تو گرفتاری دینے کے حق میں نہیں ہوں۔آگے جیسا تم کہو گے ویسا کروں گا۔"

"یار! میں کچھ بھی کرنے سے پہلے ایک اور کام کرنا چاہتا ہوں۔بس ایک بار ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"دل تو میرا بھی بہت چاہتا ہے۔پر میری ماں تو اب قبر میں ہے۔" تیمور نے عجیب لہجے میں کہا پھر لمبی سانس لے کر بولا۔"یار! یہ کیا بات ہے۔بندہ جب کسی سخت مصیبت میں پھنستا ہے تو چاہے وہ کتنا بھی برا ہو،اسے ماں کی گود ایک بار ضرور یاد آتی ہے۔میرا دل بھی چاہتا ہے کہ ماں میرے سامنے ہو اور میں ایک بار اس کی گود میں سر رکھ کر اچھی طرح رو لوں۔"

"تو پھر ہم دونوں چلیں گے یار۔۔۔۔۔ماں تو ہمارے پاس ہے نا۔سمجھو کہ وہ ہم دونوں کی ماں ہے۔"

اسی دوران میں شاہنواز ایک میلی سی لالٹین لیے اندر داخل ہوا۔غالباً اس نے ہمارے آخری فقرے سنے تھے۔وہ پریشان لہجے میں بولا۔"میں ایک بار پھر کہتا ہوں،جو قدم اٹھانا بہت سوچ کر اٹھانا۔سمجھو ہر جگہ شکاریوں نے جال بچھائے ہوئے ہیں تمہارے لیے۔۔۔۔۔میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ ابھی ملنے ملانے والے خیال ذہن میں نہ لاؤ۔زندگی رہی تو یہ سب کچھ بعد میں بھی ہو جائے گا۔"

شاہنواز کی ہمدردی اور اس کا خلوص اپنی جگہ تھے۔ مگر میرے اندر کی تڑپ اپنی جگہ تھی۔ نہ جانے کیوں ہر گھڑی مجھے لگ رہا تھا کہ ایک نادیدہ ڈور مجھے کھینچ رہی ہے۔ اس ڈور کا تعلق میری ماں اور اس کی ممتا سے تھا۔

سردیوں کی اس طویل یخ بستہ رات میں، میں نے اپنے سارے اندیشوں کو ایک طرف رکھ دیا اور کچے راستوں پر ایک طویل سفر طے کر کے اپنی ماں سے ملنے ڈیک نالے کے کنارے واقع اس کیکراں والی گاؤں میں پہنچ گیا۔ میں اور تیمور دو گھوڑوں پر یہاں پہنچے تھے۔ ویسے تو شاہنواز ٹریکٹر کا انتظام کر کے بھی دے رہا تھا مگر میری سمجھ کے مطابق گھوڑوں کا سفر زیادہ محفوظ تھا۔ ہم نے کھیتوں اور درختوں کے درمیان سے گزرنے والے بالکل اندرونی راستے استعمال کیے تھے اور خیر خیریت سے کیکراں والی پہنچ گئے تھے۔ صرف ایک جگہ راستے میں ہمیں چند پہرے داروں نے للکارا اور بعد ازاں ہوائی فائر بھی کیا تاہم ہم گھنی جھاڑیوں میں گھس کر آگے نکلنے میں کامیاب رہے۔ ان لوگوں نے سخت سردی میں پیچھے آنے کی ضرورت نہیں سمجھی یا پھر ہمت نہیں کی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کیکراں والی کافی بڑا گاؤں تھا اور شاداب تھا۔ درخت کثرت سے تھے۔ شاید اسی وجہ سے نام کیکراں والی پڑ گیا تھا۔ میں نے چودھری عزیز سے اس گھر کا اتا پتا پوچھ لیا تھا جہاں والدہ اور عارفہ رہائش پذیر تھیں۔ یہ ایک حویلی نما گھر تھا۔ دستک دینے پر ایک ادھیڑ عمر ملازم نے دروازہ کھولا۔ اس کے کندھے پر دیسی ساخت کی رائفل تھی اور سردی کے سبب منہ سے بھاپ خارج ہو رہی تھی۔ ہمارے چہرے مفلروں میں چھپے ہوئے تھے۔ ملازم ہمیں دیکھ کر قدرے پریشان ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اختر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ شوکت اختر، بلقیس کی خالہ زاد خدیجہ کا شوہر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک زمیندار ٹائپ گنجا شخص دروازے پر نمودار ہوا اور ہم سے بات چیت کرنے لگا۔

دس منٹ بعد ہم دونوں ایک گرم کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ یہاں بڑے سائز کی لالٹین روشن تھی۔ مٹی کی صاف ستھری دیواروں پر رنگ دار پھول بوٹے بنے ہوئے تھے۔ گھر کے سارے مکین سوئے پڑے تھے۔ انہیں جگانے میں کچھ دیر لگی۔ پانچ دس منٹ بعد میں نے عارفہ کو دیکھا وہ لپکتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔ وہ میرے گلے سے لگی اور

ہچکیوں سے رونے لگی۔ میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ وہ سسکتے ہوئے بولی۔ "بھابھی چلی گئی بھائی جان۔۔۔۔۔ ظالموں نے اسے ہم سے چھین لیا۔ یہ کوئی اس کے مرنے کی عمر تھی۔"

میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد عارفہ کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو میں نے پوچھا۔ "بے بے جی کہاں ہیں؟"

"وہ جاگ گئی ہیں لیکن میں نے ابھی انہیں کچھ بتایا نہیں۔ خوشی سے ان کے دل کو کچھ ہو نہ جائے۔" عارفہ نے کہا۔

وہ مجھے لے کر ایک دوسرے کمرے میں آ گئی۔ یہاں بے بے جی بستر پر حیران پریشان سی بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت نمودار ہوئی۔ میں بستر پر بیٹھ کر ان سے لپٹ گیا۔ یہ بڑی جذباتی ملاقات تھی۔ وہ روتے ہوئے بار بار میرا منہ چومنے لگیں۔
"ہائے میرے پتر! کیا حال ہو گیا ہے تیرا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے میرا سوہنا۔ اللہ کرے دن چڑھنے سے پہلے مر جائیں تیرے سارے ویری دشمن۔ تجھ پر جھوٹے الزام لگانے والے تجھے دربدر کرنے والے۔ اللہ کرے، کسی کی آئی، ان کو آئے۔"

ماں نے مجھے بانہوں میں چھپا لیا جیسے وہ اپنے ارد گرد پولیس کو دیکھ رہی ہو، آصف جاہ کو دیکھ رہی ہو اور موکھلوں کو۔ وہ مجھے ان سب کی نظروں سے اوجھل کر دینا چاہتی تھی۔ مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ میرے جیسی ناسمجھ اولاد کبھی انہیں اپنے رویے سے دکھی بھی کرتی ہے مگر ان کے دلوں سے پھر بھی دعا ہی نکلتی ہے۔ شاید ماں ہی کا دوسرا نام دعا ہے۔ دعا جو لرزتے کانپتے سوکھے ہونٹوں سے نکلتی ہے اور فرش سے عرش تک اس کے رستے میں آنے کی جرات کوئی نہیں کر پاتا۔

وہ میرے لیے بڑی یادگار رات تھی۔ میں اور تیمور دیر تک ماں کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر تیمور ساتھ والے کمرے میں سونے چلا گیا۔ میں ماں کے پاس بیٹھ گیا اور لحاف میں ہاتھ ڈال کر ان کے پاؤں دبانے لگا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ اپنے سارے اندیشے اور دکھ انہوں نے مجھ سے بیان کر ڈالے۔ یہ اندیشے اور دکھ میرے حوالے سے ہی تھے۔ شہوار کے ساتھ ساتھ ثمینہ کی موت کا بھی انہیں شدید دکھ تھا۔ میں نے انہیں اپنے جسمانی زخموں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا مگر ماں تو بتائے بغیر بھی بہت کچھ جان جاتی ہے۔ "تیری ٹانگ پر چوٹ لگی ہوئی ہے نا؟" انہوں نے کچھ دیر بعد اچانک پوچھا۔

میں گڑبڑا کر رہ گیا۔بس گول مول جواب دے دیا۔انہوں نے مجھے گلے سے لگا کر جذباتی انداز میں کہا۔"دیکھ خاورے! یہ میرا خون ہے۔اس خون کو مجھ سے پوچھے بغیر گرائے گا ناتو میں تجھ سے ایک ایک قطرے کا حساب لوں گی۔"

"نہیں بے بے جی۔۔۔۔۔بس چھوٹا سا زخم لگا ہے۔"

"چھوٹا سا زخم لگنے سے رنگ اس طرح پیلا پھٹک نہیں ہو جاتا۔جا ذرا شیشے میں شکل دیکھ اپنی۔"انہوں نے ناراض ہو کر کہا۔

میں نے ہر کسی کو بتایا تھا کہ سچائی کیا ہے۔اپنے ہر ہمدرد کو یقین دلایا تھا کہ شہوار اور ثمینہ کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔لیکن یہ صفائی ماں کے سامنے پیش کر کے جو سکون حاصل ہوا، وہ اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔میں خود کو بہت حد تک ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

جب میں نے ماں کو بتایا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس چلا جاؤں گا تو وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔"بالکل نہیں۔خبردار ایسی بات کی تو۔میں نے تجھے کہیں نہیں جانے دینا۔زیادہ نہیں تو پانچ چھ دن تجھے اور تیرے دوست کو ضرور اپنے پاس رکھوں گی۔پتا نہیں کہاں کہاں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

خجل ہو رہے ہو۔روکھی سوکھی کھا کر ہڈیاں نکل آئی ہیں۔تم دونوں کو اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلاؤں گی۔دیکھنا، دو چار دن میں ہی چہرے کی رونق واپس آ جائے گی۔"

وہ ماں کی زبان بول رہی تھیں مگر مجھے حالات کی زبان سمجھنی پڑ رہی تھی۔میں نے انہیں اپنی مجبوریاں بتائیں اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔وہ بہت آزردہ خاطر ہوئیں۔عارفہ بھی اپنے بچے سمیت آ گئی اور میرے بازو سے چمٹ کر بیٹھ گئی۔آخر ہمارے درمیان طے ہوا کہ میں آج رات نہیں جاؤں گا۔کل بھی سارا دن ان کے پاس رہوں گا اور رات کو دس گیارہ بجے یہاں سے نکلوں گا۔

رات کافی ہو چکی تھی لیکن عارفہ اسی وقت ہمارے لئے گڑ والے چاول پکانے میں مصروف ہو گئی۔میں بے بے جی کے پاس بیٹھا رہا اور ان سے باتیں کرتا رہا۔ان کی ممتا کی گرمی لحاف کے راستے میرے جسم میں منتقل ہو رہی تھی اور عجیب سا سکون بخش رہی تھی۔میں نے بڑے محتاط لفظوں میں اور بڑی نرمی کے ساتھ بے بے جی کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ مجھے کچھ عرصے کے لیے یہاں سے باہر جانا پڑے گا۔

"کہاں؟"بے بے جی کے چہرے پر پھر اندیشوں کے سائے لہرا گئے۔

"شاید کراچی یا پھر کوئٹہ وغیرہ کی طرف۔" میں نے جان بوجھ کر قبائلی علاقے کا نام نہیں لیا تھا۔ میرے جانے کی خبر نے ان کی آنکھوں میں نمی بھر دی۔ میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بے بے جی! دیکھیں، لوگ برسوں کے لئے دبئی کویت وغیرہ چلے جاتے ہیں۔ یہ تو چند مہینوں کی بات ہے اور پھر کسی نہ کسی طرح آپ تک اپنی خیریت بھی پہنچاتا رہوں گا۔ چودھری عزیز اور بلقیس وغیرہ کا آپ سے رابطہ رہے گا۔"

"لوگ، دبئی، کویت وغیرہ جاتے ہیں تو وہ اپنی خوشی سے جاتے ہیں۔ تو تو جان بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا ہے۔ تیرے پیچھے پلس لگی ہوئی ہے۔ میں کس منہ سے تجھے کہوں کہ تو جا چلا جا۔" ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

میں نے کہا۔ "بے بے جی! آپ پریشان نہ ہوں میں کوئی ابھی چل تو نہیں پڑا ہوں۔ ابھی تو بس سوچ رہے ہیں۔"

انہوں نے جذباتی انداز میں مجھے اپنے ساتھ لگالیا۔ "نہ جا پتر! ایسے جانے والے بڑی مشکل سے واپس آتے ہیں۔"

انہوں نے مجھے اپنے گاؤں ہی کی ایک دو مثالیں دیں۔ میں جانتا تھا کہ بے بے جی جو کہہ رہی ہیں وہ درست ہے۔ سر پر دہرے خون کا الزام لے کر دربدر بھٹکتے پھرنا اور چھپنا کوئی سہل کام نہیں تھا۔ پھانسی کا پھندا لگ جائے تو جان چھوٹ جاتی ہے، سر پر جھولتا رہے تو بندہ مر مر کر جیتا ہے۔ سردیوں کی طویل رات بہت جلد گزر گئی۔ صبح بے بے جی نے اپنے ہاتھ سے ناشتا تیار کیا۔۔۔۔۔ دیسی گھی کا پراٹھا انڈوں کا آملیٹ جس میں پیاز اور ٹماٹر تھے۔ گھی سے تربتر حلوہ جس میں چینی کے بجائے گڑ ڈالا گیا تھا اور ثابت بادام جھلک دکھا رہے تھے۔ ساتھ میں دہی کی گاڑھی لسی جسے ادرڑھکا کہا جاتا ہے۔ ماں کے ہاتھ کی یہ نعمتیں کسی اور وقت میسر ہوتیں تو ان کا مزہ کچھ اور ہوتا۔ یہ بڑے دگرگوں حالات تھے پھر بھی ہم دونوں نے دل جمعی سے ناشتا کیا۔ خدیجہ اور اس کا زمیندار شوہر بھی ہماری تواضع میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھ رہے تھے۔ یہ زندہ دل اور جی دار لوگ تھے۔ خدیجہ کے خدوخال میں کہیں کہیں بلقیس کی جھلک ملتی تھی اور میں نہ چاہنے کے باوجود اسے یاد کرنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ میں ذہن کو اس سے دور رکھنے کی بہت کوشش کرتا تھا مگر وہ کسی نہ کسی بہانے، کسی نہ کسی حوالے سے یاد آتی ہی رہتی تھی۔ اسے مکمل طور پر بھول جانا شاید میرے بس میں ہی نہیں تھا۔

دس گیارہ بجے کے قریب گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ خدیجہ کا شوہر تو کھیتوں میں جا چکا تھا۔ خدیجہ نے دروازہ کھولا۔ اندر آنے والا چودھری عزیز کا خاص ملازم انورا تھا۔ ساتھ میں اس کی بیوی بھی تھی۔ انورے کی آمد غیر متوقع تھی۔

انورا بھی مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ گرمجوشی سے ملا۔ جب سے چودھری عزیز کا رویہ بدلا تھا انورا بھی میری عزت کرنے لگا تھا۔ یہ انورا چودھری عزیز کا وہی گن مین تھا جو فاضل کے گھر ڈکیت بارے سے ملنے آیا تھا جس کی آمد کے سبب ہم نے چودھری عزیز کو بھی پکڑ لیا تھا۔ اس واقعے کو اب قریباً دو برس گزر چکے تھے۔

انورے کے پاس سامان کی ایک گٹھڑی تھی۔ اس گٹھڑی میں نئے کپڑے، جوتے اور استعمال کی کچھ دوسری چیزیں تھیں۔ یہ سامان چودھری عزیز نے میری والدہ اور بہن کے لیے بھیجا تھا۔ اس سے پہلے بھی انورا یہاں کے ایک دو چکر لگا چکا تھا۔ اس صورتِ حال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بلقیس اور چودھری عزیز بے بے جی اور عارفہ کا ہر طرح سے خیال رکھ رہے ہیں۔ گٹھڑی میں کچھ چیزیں بلقیس کی طرف سے بھی تھیں۔ ان میں اشیائے

خورد و نوش بھی تھیں۔ باداموں والا گڑ اور چاول کی پٹیاں وغیرہ۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا ٹرانسسٹر ریڈیو عارفہ کے لیے اور خوبصورت فراک وغیرہ اس کے بچے کے لیے تھی۔

انورے کی بیوی اس سے آٹھ دس سال چھوٹی تھی۔ اس کا نام عابدہ پروین تھا مگر یہ اپنے نام کی بالکل الٹی تھی۔ نہ عابدہ تھی اور نہ ہی نیک پروین تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس کا بھی والی جی اور چودھری نشاط سے تعلق واسطہ رہا تھا۔ بہرحال اب وہ انورے کی بیوی تھی اور دو بچوں کی ماں ہو کر تھوڑی سی سنجیدہ بھی ہو گئی تھی۔ اورا گر دیکھا جاتا تو انورا بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ رونق علی نے مجھے بتایا تھا کہ جب جاگیر میں ناچ گانا اور رنگ بازی عروج پر تھی تو انورا چودھریوں کے لیے نت نئی لڑکیاں ڈھونڈ کر لاتا تھا۔ ان میں سے کئی لڑکیوں کو آگے بھیجنے سے پہلے خود آزماتا تھا۔ ان کی نوک پلک ٹھیک کرتا تھا اور انہیں پیش ہونے کے آداب سکھاتا تھا۔

انورے کی طرح اس کی بیوی پروین نے بھی میری خیر خیریت پوچھی۔ اس کی آنکھ کے نیچے سیاہ نشان سا نظر آ رہا تھا۔ "یہ تجھے کیا ہوا ہے پینو؟" میں نے پوچھا۔

وہ انورے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔"بس یہ اسی مار کٹائی کی نشانی ہے جی جو موکھلوں اور لمبڑوں نے راجوال میں کی تھی۔ ایک شرابی موکھل نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ ایک نے اس کی بہن کے کپڑے پھاڑ ڈالے تھے۔ انہوں نے بڑی زیادتی کی ہے جی۔ پورا گاؤں سوگ میں ڈوبا ہوا ہے۔"

پروین نے بڑی اپنائیت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"چودھری جی! آپ کے آنے کے بعد تو ہم لاوارث سے ہو گئے ہیں۔ دل کرتا ہے کہ گاؤں ہی چھوڑ جائیں۔"

"یہ سب کچھ وقتی ہے۔ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اسے تسلی دی

اس نے اپنی سرمہ لگی آنکھوں کو جھپکایا اور اپنے چمکیلے دوپٹے کو سر پر درست کیا۔ وہ بھرپور جسم کی مالک تھی اور ان عورتوں میں سے تھی جو لباس جسم چھپانے کے لیے نہیں نمایاں کرنے کے لیے پہنتی ہیں۔

انورا مجھے گاؤں کے حالات سے آگاہ کرنے لگا اور ان خطرات کے بارے میں بتانے لگا جو پولیس اور آصف جاہ کے ہرکاروں کی صورت میرے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ اس نے بتایا

کہ آصف جاہ کے چار قیمتی کتوں کی موت علاقے میں اسی طرح مشہور ہوئی ہے جس طرح قریباً دو سال پہلے بنگالی شیر کی موت مشہور ہوئی تھی۔

ہماری گفتگو کے دوران میں عارفہ کا بچہ کھیلتا ہوا پینو کی گود میں چلا گیا۔ وہ اسے بار بار چوم رہی تھی۔ نظر شناس عورت بچے کو پیار بھی اسی انداز سے کرتی ہے کہ اس میں بچی کی دلچسپی کا سامان موجود ہوتا ہے۔

مجھے یہ انداز اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ بے بے جی، اپنے نواسے کو پینو کی گود سے لینے کے لیے جھکیں۔ انہوں نے بچے کو اٹھایا ۔ پینو کا رنگین دوپٹا بچے کی مٹھی میں تھا۔ بچہ گود سے نکلا تو دوپٹا بھی کھینچ گیا اور تب میری نظر پینو کے سر کے کلپ پر پڑی۔ چاندی کے اس کلپ میں ایک چھوٹا سا ہشت پہلو نیلم لگا ہوا تھا۔ میں چونک سا گیا۔ مجھے شک پڑا کہ یہ نیلم میں نے کہیں دیکھا ہوا ہے۔ پتا نہیں کہ یہ اصلی تھا یا نقلی لیکن میں نے دیکھا ہوا تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا مگر کچھ بھی سمجھ نہیں آیا۔

میں انورے اور تیمور کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھا اور ان سے باتیں کرتا رہا مگر نہ جانے کیوں میرا دھیان اس چھوٹے سے نیلے پتھر کی طرف ہی رہا۔ انورے نے مجھے اور تیمور

کو بڑی رازداری سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔"کل رات ٹرک والے غلام خان سے چودھری صاحب کی ساری بات ہو گئی ہے۔وہ کل رات اپنا ٹرک لے کر مقررہ جگہ پر پہنچ جائے گا۔ اس نے ہر طرح تسلی دی ہے۔"

"اور ٹریکٹر؟" تیمور نے پوچھا۔

"وہ تو ہمارے ہاتھ کا کام ہے۔اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" انورے نے کہا۔

باتیں کرتے کرتے اچانک میرے ذہن میں پھلجڑی سی چھوٹ گئی۔اس چھوٹی سی پھلجڑی میں اتنی روشنی تھی کہ میرا دماغ روشنی سے بھر گیا۔مجھے یاد آگیا تھا کہ یہ چھوٹا سا ہشت پہلو نیلا پتھر میں نے کہاں دیکھا تھا۔یہ شہوار کے اس ہلکے پھلکے ہار میں تھا جو وہ کبھی کبھی رات کے وقت پہنتی تھی۔کیا یہ واقعی وہی نیلم تھا؟

اگر یہ وہی تھا تو پھر انورے کی بیوی کے کلپ میں کیسے آیا؟

اور اگر یہ وہی تھا تو پھر۔۔۔۔؟

ایک دم بہت سے چنگھاڑتے ہوئے سوالوں نے میرے ذہن پر یلغار کر دی۔مجھے اپنے جسم میں ایک نہایت تیز سنسناہٹ رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔میری آنکھوں کے سامنے اس خاص بناوٹ کے نیلم کے سوا کچھ نہیں تھا اور میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ نیلم شہوار کے ہار کا ہی ہے۔

"کہاں جا رہے ہو؟" تیمور نے پوچھا۔

"آتا ہوں دو منٹ میں۔" میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل کر صحن میں آگیا۔میرے اندر ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔میں نے اس سے پہلے شہوار کے قتل کے حوالے سے بہت سے لوگوں کے بارے میں سوچا تھا، کئی ایک پر شک بھی تھا مگر عجیب بات تھی کہ ابھی تک میرا ذہن انورے یا چودھری عزیز وغیرہ کی طرف نہیں گیا تھا۔شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں کافی عرصے سے چودھری میں مثبت تبدیلیاں محسوس کر رہا تھا اور کچھ موقعے ایسے بھی آئے تھے جب اس نے موقع مہیا ہونے کے باوجود میرے ساتھ دشمنی نہیں کی تھی۔ لیکن آج سردیوں کے اس بیمار بیمار سی دھوپ والے اداس دن میں ایک چھوٹے سے اشارے نے میرے دل و دماغ کی ساری کیفیتیں بدل ڈالی تھیں۔انورا اور اس کا آقا

چودھری عزیز ایک دم ہی ایک نئے رنگ میں میرے سامنے آرہے تھے۔ میں نے رات کو چلے جانے کا پروگرام بنایا تھا مگر اب سب کچھ بدل گیا۔ بے بے جی اور عارفہ کو میرے ساتھ کچھ مزید وقت گزارنے کو مل رہا تھا۔ وہ خوش ہوئیں۔ سارا دن ہماری خاطر مدارت ہوئی۔ ہمارے کپڑے دھوئے گئے۔ بے بے جی نے اپنے ہاتھوں سے میرے سر میں تیل لگایا اور پردیس میں رہنے کے طور طریقے بتائے۔ میں اب بھی ان کے لیے بچہ ہی تھا۔

رات گئے تک باتیں کرنے اور دودھ پتی پینے کے بعد سب سو گئے۔ انورے اور تیمور نے دودھ پتی کے بجائے لال پری سے شغل کیا تھا اس لیے وہ پہلے ہی سو گئے۔ میرے لیے یہ موقع اچھا تھا۔ میں نے اشارے سے پینو کو چھت پر بلایا۔ پہلے تو وہ پریشان ہوئی مگر جب اس نے میرے چہرے پر کسی غلط تاثر کے بجائے گہری سنجیدگی دیکھی تو کچی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کمرے میں چلی آئی۔ یہاں پرالی کے بہت سے گٹھے اور کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ میں برآمدے میں جلتی ہوئی لالٹین اوپر لے آیا تھا تاہم اس کی بہت لو بہت نیچی رکھی تھی۔ کمرے کی نیم تاریکی میں پہنچ کر پینو نے پریشان نظروں سے مجھے دیکھا۔ "جی سالار جی۔۔۔۔ مم۔۔۔۔ میرا مطلب ہے چودھری جی۔۔۔۔ کیا بات ہے۔" اس کے سرخی لگے ہونٹ کانپے۔

میں نے اس کا چمکیلا دوپٹا پیچھے کیا۔ اس کا نقرئی کلپ لالٹین کی روشنی میں چمکنے لگا۔ میں نے کلپ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ نیلا نگ سچا ہے یا جھوٹا؟"

وہ ایک دم تھرا گئی۔ میں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔ "کون سا نگ جی؟" وہ گڑبڑائی۔

"یہ نیلے والا۔ یہ کہاں سے لیا ہے تونے؟" میرا لہجہ سپاٹ تھا۔

"وہ جی۔۔۔۔ سنیارے نے ہی لگا کر دیا تھا کلپ میں۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ آپ کیوں؟"

میرے دل نے گواہی دے دی کہ پروین عرف پینو کی گھبراہٹ اور تھرتھراہٹ بے معنی نہیں ہے۔ ایک دم ہی میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میرے سامنے مرد ہے یا عورت۔ میں نے اڑنگا لگا کر پینو کو پرالی کے ڈھیر پر گرا دیا۔ میرا ایک گھٹنا اس کے پیٹ پر اور دوسرا اس کی گردن پر اس طرح آیا کہ اس کا منہ پورا کھل گیا مگر آواز نہیں نکل سکی۔ میں نے اپنے گلے کا مفلر اندر تک اس کے گلے میں گھسیڑ دیا۔ اور اوپر ہتھیلی رکھ دی۔۔۔۔ اب اگر وہ بھرپور کوشش بھی کرتی تو آواز نہیں نکال سکتی تھی۔

میں نے اپنی قمیص کے نیچے سے گراری دار چاقو نکال کر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ "مجھے سچ سچ بتادے۔۔۔۔۔ یہ نگ میری بیوی کے ہار کا ہے نا؟" میں پھنکارا۔

وہ مسلسل مزاحمت کرتی رہی اور گلے سے غوں غاں کی آوازیں نکالتی رہی۔ میں نے اس کی گردن پر چاقو کا دباؤ بڑھایا اور پھر زہریلی سرگوشی کی۔ "سر کو ہاں میں ہلا کر جواب دے۔۔۔۔۔ یہ نگ شہوار بیگم کے ہار کا ہے نا؟"

اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ تاہم وہ ڈھیٹ پنے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔۔۔۔۔ میرے جسم کا سارا خون جیسے میرے دماغ کو چڑھنے لگا۔ قریب ہی ایک بوتل پڑی تھی۔ اس میں لالٹینوں میں ڈالنے کے لیے مٹی کا تیل تھا۔ میں نے بوتل پکڑی اور سارا تیل پینو کے جسم پر انڈیل دیا۔ وہ میرا ارادہ بھانپ کر مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ میں نے جیب سے لائٹر نکال کر جلا لیا۔ لائٹر کا شعلہ اس کی آنکھوں سے چند انچ کے فاصلے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے جلا کر کوئلہ کر دوں گا۔ یہ آخری موقع ہے۔ بالکل آخری موقع۔۔۔۔۔ اپنا سر ہلا کر بتادے کہ یہ شہوار کے ہار کا نگ ہے؟"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ان لمحوں میں، میں واقعی ہر حد تک جانے کو تیار ہو گیا تھا۔ میری آواز میں کچھ ایسی درندگی تھی کہ پینو کا رنگ بالکل ہلدی ہو گیا۔ اس نے پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھا۔ اور پھر اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ رونے لگی اور اس کی سرمہ لگی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرنے لگے۔ پورے کمرے میں مٹی کے تیل کی بو پھیل گئی تھی۔ تاہم مجھے امید تھی کہ یہ بو نیچے نہیں پہنچے گی۔ میں نے کہا۔ "دیکھ، میں تیرے منہ سے کپڑا نکال رہا ہوں لیکن اگر تو نے ہلکی سی آواز بھی نکالی نا تو اسی جگہ جان سے مار ڈالوں گا تجھے اور خون کے الزام تو مجھ پر پہلے ہی لگ چکے ہیں، اب ایک اور بھی لگ جائے گا تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ میری بات سمجھ رہی ہے نا؟" جلتا ہوا لائٹر بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔

اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے لائٹر بجھایا اور جیب میں ڈال لیا۔ تیز دھار چاقو بدستور میرے دوسرے ہاتھ میں موجود تھا۔ اس کا آٹھ انچ لمبا پھل لالٹین کی زرد روشنی میں دمک رہا تھا۔ میں نے مفلر پینو کے منہ سے نکال لیا اور اسے حکم دیا کہ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جائے۔

"ہاں، اب بتا۔ شہوار کے ہار کا یہ نگ تیرے پاس کیسے پہنچا؟" میں نے کلپ اس کے بالوں سے کھینچتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں پتا، یہ کس کا ہار تھا۔ انورے نے اسے نمک دانی میں نمک کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھ لیا۔ اس کا یہ ایک نگ پہلے ہی اترا ہوا تھا۔ میں نے لے لیا۔"

وہ اپنے بیان سے مکر رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے سر ہلا کر اقرار کیا تھا کہ یہ شہوار کے ہار کا نیلم ہے۔ اب کہہ رہی تھی کہ اسے پتا نہیں۔

میں نے چاقو پھر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ "مجھے صرف ایک بات بتا۔ یہ نیلم، شہوار کے ہار کا ہے یا نہیں؟"

"میں سچ کہتی ہوں۔ مجھے نہیں پتا وہ کس کا ہار تھا۔ انورے نے اسے نمک دانی۔۔۔۔۔"

"یہ بکواس تو پہلے کر چکی ہے۔ مجھے بتا اب وہ ہار کہاں ہے؟" میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑے۔

کلپ اڑنے کی وجہ سے وہ بکھر چکے تھے۔

"مجھے نہیں پتا۔۔۔۔۔ میں سچ کہتی ہوں۔ ایک دن میں نے دیکھا تو ہار وہاں لون دانی (نمک دانی) میں نہیں تھا۔" وہ رو رہی تھی اور اس کا سرمہ اس کے رخساروں کو سیاہ کر رہا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ انورے نے ہار کہیں بیچ دیا ہے۔۔۔۔۔ اور تم یہ بھی بتانا چاہ رہی ہو کہ انورے کو اس بات کا پتا نہیں کہ تم نے ہار میں سے ایک نگ لیا تھا؟"

اس نے ان دونوں سوالوں کے جواب تقریباً اثبات میں دیے۔ وہ کافی موٹی کھال کی عورت تھی اور یہ بات صاف صاف ماننے کو تیار نہیں تھی کہ کلپ کا نیلا نگ جس ہار سے اترا ہے وہ شہوار کا ہار تھا۔ بہر حال، اس کا یہ اقرار بھی کافی تھا کہ یہ نگ سونے کے ہار سے اتار گیا ہے اور یہ ہار انورے نے گھر کی ایک فالتو نمک دانی میں نمک کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی آہٹ ہوئی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی رد عمل ظاہر کرتا، دروازہ کھلا اور خدیجہ کے شوہر اختر کا سراپا نظر آیا۔ اس نے ٹارچ روشن کی اور ہم دونوں اس کے روشن دائرے میں آ گئے۔ یقینی بات تھی کہ چند ساعتوں کے لیے اختر بھونچکارہ گیا ہو گا۔ اس کو بہ ظاہر یہی لگا ہو گا کہ میں یہاں انورے کی شوخ شنگ بیوی کے ساتھ شاید کسی

طرح کی زبردستی کر رہا ہوں۔تاہم میرے سنجیدہ اور گھمبیر تاثرات دیکھ کر وہ کسی حد تک سنبھل گیا۔۔۔۔

"کیا بات ہے خاور بھائی؟" وہ ہکلایا۔

"میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔پہلے تم میری تھوڑی سی مدد کرو۔" میں نے کہا۔"یہ اچھا ہوا تم یہاں آ گئے۔"

اختر دروازہ بند کر کے اندر آ گیا۔دو تین منٹ کے اندر ہم نے پینو کے ہاتھ اس کے دوپٹے سے اور پاؤں میرے مفلر سے باندھ دیے۔اس کے منہ میں ایک کپڑا اس طرح ٹھونس دیا گیا کہ وہ واویلا نہ کر سکے۔ویسے اس کی امید اب کم ہی تھی کہ وہ ایسا کرے گی۔

میں نے اختر کے ساتھ مل کر اسے پرالی کے گٹھوں پر لٹا دیا اور سردی سے بچانے کے لیے اس پر ایک پھٹا پرانا کمبل ڈال دیا۔اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر وہ کچھ دیر کے لیے یہاں چپ چاپ پڑی رہے گی تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کے بعد ہم نیچے آئے اور تیمور کو جگا کر اسے سب کچھ بتایا۔یہ ساری روداد اس کے لیے بھی سخت تعجب کا باعث بنی۔وہ بڑبڑایا۔" کبھی کبھی میرا ذہن انورے اور چودھری عزیز کی طرف جاتا تھا مگر پھر میں خود ہی اپنے خیال کو غلط کر دیتا تھا۔"

"اب کیا کرنا ہے؟" اختر نے مجھ سے پوچھا۔

"اس حرامی کو الٹا لٹکانا ہے اور اس وقت تک لٹکانا ہے جب تک اس کے اندر سے سب کچھ باہر نہ آ جائے۔" میرا اشارہ انورے کی طرف تھا۔

انورے کا قد چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہی تھا۔وہ شراب پی کر سویا تھا لہذا نیند کی حالت میں بھی اس کے سخت گیر چہرے پر لعنت برس رہی تھی۔منہ تھوڑا سا کھلا تھا اور ہر بدبودار سانس کے ساتھ مونچھیں تھوڑا سا پھڑ پھڑا جاتی تھیں۔وہ عیاشیوں کے حوالے سے راجوال کے چودھریوں کا درمیانی آدمی یعنی مڈل مین تھا۔چودھریوں کے لیے عورتوں کا انتخاب کرتے نہ جانے کتنی عورتوں کو اپنے چوڑے چکلے جسم کے نیچے روند چکا تھا۔

ہم نے انورے کے پاؤں حالتِ نیند میں ہی ایک رسی سے باندھ دیے۔وہ بس تھوڑا سا کسمسایا اور دوبارہ خراٹے لینے لگا۔جب ہم رسی کی مدد سے اسے چارپائی کے ساتھ باندھ رہے تھے تو

وہ جاگ گیا اور ہمیں گھورنے لگا۔ پھر اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر تب تک رسی کے تین چار بل اسے چارپائی کے ساتھ جکڑ چکے تھے۔ "یہ۔۔۔۔ یہ کیا ہے؟" وہ ہکلایا۔

"ابھی تجھے تیرے سارے سوالوں کے جواب دے دیتے ہیں۔" تیمور نے مضبوط سی رسی کو چارپائی کے گرد ایک اور چکر دیتے ہوئے کہا۔

اس کا رنگ فق ہو گیا پھر یوں لگا کہ وہ چلانے کا ارادہ کر رہا ہے۔ اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے تیز دھار چاقو اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔ "آواز نکالے گا تو آواز کے ساتھ ہی تیرے گندے خون کا فوارہ بھی نکلے گا۔" میرا لہجہ دوٹوک تھا۔

انور تھرا کر رہ گیا۔ شاید اسے وہ وقت یاد آ گیا تھا جب ہم نے اسے باغبان فاضل کے گھر میں سلطانی گواہ بننے کی رعایت دی تھی۔۔۔۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد تین نامی گرامی ڈکیتوں کو عبرت ناک طریقے سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور یہ سب کچھ اس کی گواہی پر ہوا تھا۔

انورے سے پوچھ تاچھ شروع کرنے سے پہلے ہم نے باقی گھر والوں کو جگایا اور انہیں اوپر کے کمروں میں بھیج دیا۔ وہ سب پریشان تھے۔ خاص طور سے بے بے جی کی آنکھوں میں کئی

ڈرے ہوئے سوال تھے۔ "کیا بات ہے خاورے! تو مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے کوئی نئی مصیبت گلے نہ پڑ جائے۔"

میں نے انہیں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کریں بے بے جی اب کوئی نئی مصیبت نہیں پڑے گی، اب شاید مصیبتیں ٹلنے کا وقت آ گیا ہے۔ آپ بس دعا کریں۔"

ان کے خشک ہونٹ دعائیہ انداز میں ہلنے لگے۔ میں انہیں دیگر گھر والوں کے ساتھ اوپر چھوڑ آیا۔ شاید ان حالات میں یہ جو خوشگوار کروٹ محسوس ہو رہی تھی اس کا سبب بے بے جی ہی تھیں۔ بے بے جی کا پیار ہی تو مجھے یہاں کیکراں والی کے اس گھر میں کھینچ لایا تھا۔ اور پھر انورے کی بیوی کے سر پر اوڑھنی یوں سرکی تھی جیسے دستِ قدرت نے کسی راز پر سے پردہ ہٹایا ہو۔

جب سب اوپر چلے گئے تو ہم نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور انورے کی چارپائی کو انورے سمیت اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ انورے سے میرا پہلا سوال یہی تھا کہ شہوار کا قیمتی ہار اس کے پاس کیسے آیا؟ میں نے نیلے رنگ والا کلپ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے تین بار یہ سوال پوچھا۔

ایک پکے اور ڈھیٹ مجرم کی طرح انورے نے ایسے کسی بھی ہار سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ بہرحال اس نے اپنی زوجہ کا ہئیر کلپ ضرور پہچان لیا تھا۔ انورے کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ ابھی تک اسے بھی اس بات کا پتا نہیں ہے کہ کلپ میں یہ نیلا نگینہ کہاں سے آیا ہے اور کس نے لگایا ہے۔ مگر انورے کی اس لاعلمی سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میرے لیے یہ بات تقریباً صاف ہو چکی تھی کہ شہوار کا ہار انورے کے پاس موجود رہا ہے اور یہ ہار اس نے اپنے گھر کی ایک نمک دانی میں چھپایا ہوا تھا۔ دیہات میں نمک دانی یا لون دانی لکڑی کے اس مستطیل ڈبے کو کہا جاتا تھا جس میں نمک، مرچ، ہلدی وغیرہ کے لیے چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوتے ہیں۔

میرے دو تین زوردار ٹھوکروں کی وجہ سے انورے کے منہ سے خون رسنے لگا اور وہ کراہ رہا تھا۔۔۔۔ میں نے کہا۔ "دیکھ انورے! تو پہلے کی طرح سلطانی گواہ بن جا۔ اس رات میرے گھر میں میری بیوی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ بتا دے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں۔ تجھے پولیس کے روبرو بھی سلطانی گواہ بنا دوں گا۔"

انورے نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔ "میں سچ کہتا ہوں، چودھری خاور! اس بار تمہیں بڑی سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم مجھ سے ایسے سوال پوچھ رہے ہو جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔"

"کیا تو اس بات سے انکار کرتا ہے کہ تو نے نیلے نگ والا ہار گھر کی نمک دانی میں چھپا رکھا تھا؟"

کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد وہ بولا۔ "نہیں۔۔۔۔۔ یہ بات صحیح ہے۔ مجھے یہ ہار ایک صبح اپنے گھر کی چھت پر پڑا ہوا ملا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ رولڈ گولڈ ہے۔ کسی میلے وغیرہ سے خریدا گیا ہوگا۔ پھر بھی مجھے شک تھا۔ میں نے اسے گھر میں چھپا دیا۔"

"اب وہ ہار کہاں ہے؟"

"میں اسے گوجرانولہ لے گیا تھا۔ وہاں ایک سنیارے کو دکھایا۔ وہ سونے کا نکلا۔ میں نے۔۔۔۔۔ بیچ دیا۔۔۔۔۔ دراصل مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔"

"تجھے پتا نہیں چلا کہ ہار میں ایک نگ نہیں ہے؟"

"میں قسم کھاتا ہوں میں جو کچھ بتا رہا ہوں سچ بتا رہا ہوں۔ مجھے بالکل پتا نہیں کہ میری بیوی نے نمک دانی میں یہ ہار دیکھا تھا اور اس نے ہار میں سے کوئی نگ وغیرہ نکالا ہے۔ میں نے سنیارے کو ہار بیچتے ہوئے اس میں نگ کی خالی جگہ ضرور دیکھی تھی۔"

"تیرے دماغ میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ تو اس ہار کے مالک کا پتا کرے؟"

"مم۔۔۔۔ میں نے سوچا تو تھا مگر پھر میری ضرورت نے مجھے مجبور کر دیا۔"

"تو نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ ہار تیرے گھر کی چھت پر کیوں پھینکا گیا اور کس نے پھینکا۔ ان دنوں ہی میری بیوی کا قتل ہوا تھا۔ کیا تیرا دھیان اس واردات کی طرف نہیں گیا؟"

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "میں نے بتایا ہے نا کہ میں کافی دنوں تک اسے رولڈ گولڈ ہی سمجھتا رہا مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ اصلی ہے۔"

"تجھے سب پتا ہے انورے۔۔۔۔ اور تو اب بھی سب کچھ جانتا ہے لیکن بتانا نہیں چاہتا۔" تیمور نے اس کے سر پر پشاوری چپل کی ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ میری جان بھی لے لو گے تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" وہ باقاعدہ رونے لگا۔

ایک عجیب سی مایوسی میرے رگ وپے میں اترنے لگی۔ کچھ دیر پہلے امید کی جو کرن روشن ہوئی تھی وہ ناامیدی کی تاریکی میں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بہر حال، ہم انورے سے پوچھ تاچھ میں لگے رہے۔ اس دوران میں ہم نے ایک دوبارا سے سیدھا کر کے پانی بھی پلایا۔

رات پچھلے پہریوں لگا کہ انورے کی ہمت جواب دینا شروع ہو گئی ہے پھر اس کے منہ سے ایک دو سوالوں کے الٹے سیدھے جواب بھی نکلے۔۔۔۔

درست کہتے ہیں کہ انسان بڑی پیچیدہ شے ہے۔ اس کے اندر کا حال جاننا بہت بہت مشکل ہوتا ہے۔۔۔۔ وہ انورا جو کوئی بھی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ صبح تقریباً چار بجے کے قریب سب کچھ مان گیا۔۔۔۔ ڈھائی تین بجے کے قریب تیمور کے ہاتھوں زبردست پھینٹی کھانے کے بعد اس نے جزوی طور پر اس بات کا اعتراف کر لیا کہ وہ جانتا ہے کہ نیلے نگوں والا ہار سونے کا ہے اور اس کا تعلق مقتولہ شہوار سے ہے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ یہ بھی مان گیا کہ شہوار کے قتل میں چودھری عزیز کا ہاتھ ہے۔۔۔۔ اور چار بجے کے لگ بھگ وہ سب

کچھ تسلیم کر گیا۔ تب تک اس کی حالت بہت پتلی ہو چکی تھی۔ مسلسل الٹا لٹکے رہنے سے اس کا چہرہ نیلگوں ہو گیا تھا۔ ایک آنکھ سوجھ کر تقریباً بند ہو چکی تھی۔ ناک اور منہ سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ تیمور نے پلاس کی مدد سے اس کے پاؤں کی دو انگلیاں قریب قریب کچل کر رکھ دی تھیں۔

وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں۔۔۔۔ ہم نے بھی بڑے زوروں سے خود کو انورے سے منوایا تھا۔ ایک اسٹیج ایسی آئی کہ وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح فر فر بولنے لگا۔ اب ہم نے اس کے منہ میں سے خون آلود کپڑا نکال کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور اس کی زبان روانی سے چل رہی تھی۔ تاہم وہ ابھی تک الٹی چارپائی کے ساتھ الٹا بندھا ہوا تھا۔

میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے اور پوچھا۔

"جب تم گھر میں گھسے تھے تو کیا وقت تھا؟" وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں بولا۔ "مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔"

"اور کون تھا تمہارے ساتھ؟"

"بس فیاض ہی تھا وہ باہر کھڑا رہا تھا۔"

"جب تم نے شہوار کو دبوچا تھا تو اس نے شور مچایا؟"

"نہیں جی۔۔۔۔۔ بی بی اس وقت نیند میں تھی اور۔۔۔۔۔"

وہ ایک بار پھر بلند آواز میں رونے لگا اور روتے روتے بولا۔ "میں بے قصور ہوں جی۔ میری بی بی جی سے کوئی دشمنی نہیں تھی، کوئی بیر نہیں تھا۔ وہ تو میرے چھوٹے بچے سے بڑا پیار کرتی تھی۔ مم۔۔۔۔۔ میں نے تو بس چودھری عزیز کا حکم مانا۔ میں نہ مانتا تو وہ مجھے برباد کر دیتا۔ آپ سب جانتے ہو، ہم نوکروں کے لیے حکم نہ ماننا کتنا مشکل ہوتا ہے۔"

تیمور نے اس کے سر پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلایا۔ تیمور پھنکارا۔ "تیری صفائیاں ہم بعد میں سنیں گے۔ پہلے ہمیں پوری تفصیل بتا۔ تو نے شہوار بی بی کو کیسے مارا اور پھر ثمینہ کی جان کیسے لی۔"

وہ ایک بار پھر زور و شور سے نفی میں سر ہلانے اور واویلا کرنے لگا۔ "میں نے اس کو نہیں مارا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے تو کئی ماہ سے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اسے کس نے مارا مجھے کچھ پتا نہیں۔" اس کا اشارہ ثمینہ کی طرف تھا۔

وہ بڑی کلاس کا غنڈا تھا۔ مگر مچھ کی طرح ڈھیٹ اور لومڑی کی طرح شاطر۔۔۔۔۔ دو گھنٹے پہلے تک وہ شہوار کے قتل سے بھی اس طرح انکار کر رہا تھا مگر ناقابلِ برداشت اذیت کے شکنجے میں جکڑے جانے کے بعد اس نے یہ قتل مان لیا تھا۔ تیمور نے ایک بار پھر پلاس کا منہ کھولا اور انورے کے جسم کے نازک حصوں کا امتحان لینا چاہا مگر میں نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔ میں نے انورے کے منہ پر چھینٹے دیتے ہوئے کہا۔ "اچھا چل، شہوار کے بارے میں بتا۔۔۔۔ جو کچھ بتا رہا ہے۔"

اس کے بعد انورے نے اذیت سے کراہتے ہوئے اور رک رک کر ٹوٹے پھوٹے فقروں میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

شہوار کے کمرے میں گھس کر اس کو بے دردی سے قتل کرنے والا انورا ہی تھا۔ اس قتل کے بارے میں چودھری عزیز کی منصوبہ بندی تو شاید پہلے سے جاری ہو مگر اس کا فوری پروگرام میرے اور شہوار کے جھگڑے کے فوراً بعد بنا۔ چودھری عزیز بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا تھا۔ اس کے اندر کئی برس سے انتقام کا عفریت پرورش پا رہا تھا۔۔۔۔۔ یہ عفریت کسی مناسب ترین موقع کی تلاش میں تھا۔ اس رات یہ مناسب ترین موقع اسے مل گیا۔ شہوار کے ساتھ

جھگڑے کے دوران میں، میں جذباتی ہوا تھا اور طیش کے عالم میں میرے منہ سے اسے مار دینے کی دھمکی نکل گئی تھی۔ چودھری نے اس صورتِ حال سے فوری فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ایک ہی گھنٹے کے اندر اپنے خاص خدمت گار انورے کو موت کے فرشتے کا روپ دے دیا۔

انورے نے نہایت بے دردی سے شہوار کے نازک جسم پر چاقو کے پے در پے وار کیے تھے۔ اس نے شہوار کا سر اپنی بغل میں لے کر اس کا منہ اتنے زور سے دبائے رکھا تھا کہ وہ بدقسمت آواز تک نہیں نکال سکی تھی۔ بعد میں جب انورے کو یقین ہو گیا کہ اس کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تو وہ اسے گھسیٹ کر قریبی کمرے میں لے گیا اور لاش چارپائیوں کے پیچھے ڈال دی۔ اس کے بعد اس نے کمرے میں واپس آ کر اپنی انگلیوں کے نشان وغیرہ صاف کیے۔ اسی کاروائی کے دوران میں اس کی نگاہ طلائی ہار پر پڑی اور اس نے وہ موقع سے اٹھا لیا۔۔۔۔۔ دکھ کی بات یہی تھی کہ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا، میں صرف چند قدم کے فاصلے پر دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔۔۔۔

انورے کے تفصیلی بیان سے سارے زخم تازہ ہو گئے۔ دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔۔۔۔۔ میں بڑی حسرت سے سوچنے لگا، اگر خود پر حملے کے وقت شہوار تھوڑی بہت آواز نکال پاتی تو شاید میں جاگ جاتا اور اس کی مدد کو پہنچ جاتا۔ بہر حال، اس قسم کے بڑے المیے کے بعد اس طرح کے خیال تو ذہن میں آتے ہی ہیں۔

شہوار کے قتل کے بعد جو کچھ ہوا، چودھری عزیز اور انورے وغیرہ کی منشا کے عین مطابق تھا۔ الزام میرے اوپر آیا۔ پھر ایک اور گڑبڑ ہوئی۔ میں نے بہ وجوہ میاں وارث کو گرفتاری نہیں دی اور تیمور سمیت پولیس کی حراست سے نکل گیا۔

ثمینہ کے بیان نے میرے خلاف کیس مزید مضبوط کر دیا۔ وہ بے چاری وہی کچھ بتا رہی تھی جو اس نے دیکھا مگر اس کے دیکھنے اور اصل واقعے میں بہت فرق تھا۔ اب شہوار کے قتل کو تو انور امان گیا تھا مگر ثمینہ کی موت ابھی تک معما تھی۔ میں نے اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں کافی کوشش کی مگر انورا اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکا وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا۔ "ہو سکتا ہے کہ یہ قتل بھی چودھری عزیز نے ہی کرایا ہو مگر میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا، نہ ہی چودھری نے مجھے کچھ بتایا ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ثمینہ کے قتل کے علاوہ ایک دو مزید سوال بھی حل طلب تھے۔ چودھری عزیز نے ایک خطرناک ترین گیم کھیلا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو ایک دو موقع ایسے آئے تھے جب وہ پولیس کے ہاتھوں مجھے گرفتار کروا سکتا تھا۔۔۔۔۔ یا مجھ پر بھی قاتلانہ حملہ کرا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ دوسرے وہ بے بے جی اور عارفہ کو پناہ بھی فراہم کر رہا تھا۔ اگر اس کا ارادہ ہوتا تو چند گھنٹے کے اندر پولیس یہاں کیکراں والی پہنچ سکتی تھی۔ والدہ اور عارفہ کو گھسیٹ کر تھانے لے جایا جا سکتا تھا۔ چودھری ان کو تحفظ کیوں فراہم کر رہا تھا؟

کیا یہ بھی اس کی سیاست بازی کا حصہ تھا؟

وہ میری بربادیوں کے حوالے سے اپنے ہاتھ صاف رکھنا چاہتا تھا؟
بلقیس اور دیگر لوگوں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس نے آخر تک میرا اور میرے گھر والوں کا ساتھ دیا ہے؟

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ انورے کو ہم جتنا نچوڑ سکتے تھے، نچوڑ چکے تھے۔ اس سے زیادہ اس کے اندر سے کچھ نکلنے والا نہیں تھا اور اس کی جان ہم نکالنا نہیں چاہتے تھے، یہ عدالت اور قانون کا کام تھا۔

ہم نے ایک گھنٹے میں تیزی سے چند فیصلے کیے اور میں واپس اپنی پناہ گاہ یعنی سائیں ملنگے کے پاس قبرستان جانے کو تیار ہو گیا۔ تیمور کو یہیں اختر کے گھر میں رہنا تھا اور انورے کو بیوی سمیت اپنی نگرانی میں رکھنا تھا۔ لیکن آخری وقت فیصلہ بدل گیا اور انورے کی نگرانی اختر اور اس کے ایک نوکر کے سپرد ہو گئی۔ رات کے آخری حصے میں ہم نے پھر گھوڑوں پر ایک طویل سفر کیا اور واپس اپنی پناہ گاہ پہنچ گئے۔ قبرستان کے اندر جنتر کے بے شمار درختوں میں سائیں ملنگے کی کٹیا پوری طرح چھپی رہتی تھی۔ وہ صبح منہ اندھیرے باداموں والی بھنگ گھوٹنے میں مصروف تھا۔ ڈنڈے سے بندھے ہوئے گھنگرو چھن چھنا کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ یہاں بیٹری سے چلنے والا ایک ریکارڈر ٹیپ بھی موجود تھا۔ سائیں کا ایک چیلا اشتیاق رانجھا اس ٹیپ پر بلھے شاہ کی کافیوں کی کیسٹ چلاتا رہتا تھا یا پھر لوک گیت ہوتے تھے۔ اس وقت بھی ٹیپ چل رہا تھا اور آواز گونج رہی تھی۔

سدا نہ باغیں بلبل بولے، سدا نہ باغ بہاراں

سدا نہ ماپے، حسن جوانی، سدا نہ صحبت یاراں

میری آمد کے ساتھ ہی میرا محسن شاہ نواز بھی جاگ گیا۔ ہم دونوں علیحدہ کمرے میں جا بیٹھے۔ میں نے شاہ نواز کو ساری بات بتائی اور اس کی آنکھیں بھی حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ شاہ نواز کے خیالات چودھری عزیز کے بارے میں کبھی بھی اچھے نہیں رہے تھے مگر۔۔۔۔ عزیز اور شاہ نواز کے بڑے بھائی نشاط میں اچھے تعلقات تھے اس لیے شاہ نواز اس حوالے سے خاموش رہنا ہی پسند کرتا تھا۔

پوری روداد سن کر شاہ نواز کی آنکھیں بھی جلنے لگیں۔ میری طرح اس کے ذہن میں بھی وہی سوال پیدا ہوئے۔ وہ کہنے لگا۔ "اگر عزیز اس حد تک چلا گیا ہے تو پھر اس نے تمہیں پکڑوانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ دوسری بات کہ وہ تمہاری والدہ اور بہن کی بھی پوری حفاظت کر رہا ہے۔"

"یہ ساری باتیں وہ خود ہی بتائے گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ وہ تمہیں مارنے کے بجائے یہاں سے بھگانے میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ شاید اس میں عزیز کو اپنے کچھ فائدے نظر آتے ہوں۔"

میں نے اور شاہ نواز نے اسی وقت مشورہ کیا۔اس مشورے کے بعد شاہ نواز نے ایک بندے کو فوری طور پر پیغام دے کر راجوال چودھری عزیز کی طرف بھیجا۔اس بندے کے پاس میرے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مختصر خط بھی تھا۔اس خط میں، میں نے چودھری عزیز کو بتایا تھا کہ میں اس کے پروگرام کے مطابق غلام خان کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔ مگر اس سے پہلے میں ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں، کچھ ضروری باتیں کرنی ہے۔اگر آج کسی طرح وہ تھوڑی دیر کے لیے آجائے تو اس کی بہت مہربانی ہو گی۔

توقع کے عین مطابق ہماری اس کوشش کا نتیجہ مثبت نکلا۔چودھری عزیز کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کل رات کیکراں والی گاؤں میں میری ملاقات اس کے ہرکارے انورے سے ہو چکی ہے اور انورے نے رات بھر الٹا لٹکنے کے بعد بہت کچھ اگل دیا ہے۔

چودھری عزیز شام کے فوراً بعد ہی ہمارے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔وہ ایک دوست کی کار میں آیا تھا۔رونق علی بھی اس کے ہمراہ تھا۔کار ڈرائیور کے طور پر فیاض میواتی آیا تھا۔رونق علی کو ہلکا بخار تھا۔تہ در تہ گرم کپڑوں کی وجہ سے وہ اور بھی موٹا نظر آ رہا تھا۔وہ جھپی بلکہ جن جھپا ڈال کر مجھ سے ملا اور بہت دیر تک گلے لگا رہا۔

"یار خاورے! یہ سب کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔تم کیا گئے ہو؟ ساری رونقیں شونقیں ہی اپنے ساتھ لے گئے ہو۔اب کون مجھے پرہیزیں شرہیزیں بتائے گا اور میرے صحت کا خیال شیال رکھے گا؟"

"پرہیزیں بتانے سے بھی تمہارا کون سا بھلا ہو جاتا تھا رونق بھائی۔۔۔۔بس تمہارا مزہ ہی کرکرا ہوتا تھا۔"

"چلو، کچھ ہوتا ہی تھا نا۔اب سنا ہے کہ تم کہیں اور جا رہے ہو؟"

"میں کہاں جا رہا ہوں، یہ تمہارے سامنے کھڑے ہیں بھیجنے والے۔" میں نے چودھری عزیز کی طرف اشارہ کیا۔

چودھری بڑے تدبر سے بولا۔"میں بھی کہاں بھیج رہا ہوں، بس حالات بھیج رہے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ عارضی ہے خاور۔بہت جلد ہم یہاں سب کچھ ٹھیک کر لیں گے۔"

"مجھے تو نہیں لگتا کہ اب جلد ہی کچھ ہو سکے گا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکے گا یار!" چودھری نے میرا کندھا تھپکا۔ "ہم نے یہاں کوئی آرام سے تھوڑا بیٹھنا ہے۔ سمجھو ایک ایک دن گن گن کر کاٹنا ہے۔ ہماری کوشش ہونی ہے کہ جلد سے جلد تمہاری بے گناہی ثابت ہو سکے اور کوئی ٹھوس ثبوت مل جائے۔"

"ثبوت ملنا ہی تو مشکل ہوتا ہے چودھری۔ لوگ بڑی صفائی سے کام کرتے ہیں۔ اپنے پیچھے نشان تک نہیں چھوڑتے۔"

"لیکن یہ بھی تو کہا جاتا ہے نا کہ ہر مجرم کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔" چودھری نے ایک بار پھر تدبر سے سر ہلایا۔ "موکھلوں یا لمبڑوں نے بھی کہیں نہ کہیں کوئی نشان چھوڑا ہو گا۔"

"پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم موکھلوں اور لمبڑوں پر شک کرتے رہیں مگر یہ ہمارے اندر کے ہی کسی بندے کا کام ہو۔"

میں نیم تاریکی میں چودھری کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ نہیں دیکھ سکا لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ رنگ ضرور بدلا ہو گا۔ اس نے بڑی محبت سے ایک بار پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"خاور! تم ان باتوں کے لیے اپنے دماغ کو پریشان نہ کرو۔ جن لوگوں نے تمہارے خلاف

سازش کی ہے انہوں نے دراصل ہمارے خلاف کی ہے، حویلی کے خلاف اور جاگیر کے خلاف کی ہے۔ ہم انہیں کسی صورت معاف نہیں کر سکتے۔ یہ تو بس ایک عارضی انتظام ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ جس طرح تیز آندھی میں درخت ذرا جھک جاتے ہیں، ہم بھی جھکے ہیں۔"

"بالکل ایسا ہی ہے یار!" رونق نے توند اور سر کو ایک ساتھ ہلا کر تائید کی۔

رونق اور چودھری عزیز کی باتوں سے مجھے پتا چلا کہ پچھلے چند دن میں راجوال کے اندر بہت کچھ تبدیل ہوا ہے۔ راجوال میں لمبڑوں اور موکھلوں کی مار دھاڑ کے بعد لوگ بے حد مایوس تھے۔ خود بلقیس بھی مایوسی کا شکار تھی۔ اس نے بڑوں کے اکٹھ میں کہا ہے کہ وہ جاگیر کا انتظام چلانے میں بڑی مشکل محسوس کر رہی ہے۔ ایک عورت ہونے کی وجہ سے وہ علاقے کے زمینداروں سے زیادہ میل جول بھی نہیں رکھ پاتی۔ اس لیے وہ چاہتی ہے کہ "کارِ مختار" کی کرسی کسی اور کو سونپ دی جائے۔ کم از کم تب تک جب تک حامد اسے سنبھالنے کے قابل نہیں ہوتا۔

"پھر کیا فیصلہ ہوا ہے؟" میں نے چودھری عزیز سے پوچھا۔

"ابھی کچھ نہیں۔یقین کرو خاور! مجھے اب "کارِ مختاری" کا کوئی شوق نہیں رہا۔لوگ جب مجبور کرتے ہیں تو میرا دل ہولنے لگتا ہے۔ مگر جب آلے دوالے دیکھتا ہوں تو کوئی ایسا نظر بھی نہیں آتا جسے ذمے داری دے سکوں۔" کسی اداکار کی طرح عزیز آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی لے آیا۔۔۔۔ جیسے والی جی کا غم پھر اس کے دل میں تازہ ہو گیا ہو۔

میرے سینے میں آگ بھڑکنے لگی۔چودھری وہی کچھ کر رہا تھا جس کی اس سے توقع تھی۔ ابھی میں یہاں سے "فرار" نہیں ہوا تھا۔چودھری نے پہلے ہی جاگیر کی کرسی پر اپنے پنجے گاڑ لیے تھے۔

میں خاموش رہا تو چودھری نے کہا۔"تمہارا کیا خیال ہے خاور! اگر بلقیس نے واقعی مختاری چھوڑ دی تو پھر کیا کیا جائے؟"

"ایسے میں تو تمہارے سوا کسی اور کا نام ذہن میں نہیں آتا۔" میں نے چودھری کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہرحال، اس بارے میں تفصیل سے بات کر لیتے ہیں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ہاں ایک دو باتیں مجھے۔۔۔۔۔ بھی پوچھنی ہیں۔ایک دو قانونی نکتوں کے بارے میں تم سے بات کرنی تھی اور کچھ زمین کا معاملہ بھی تھا۔"

"چلو آؤ۔۔۔۔۔ یہاں کافی سردی ہے۔اندر ذرا تسلی سے بیٹھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

میں، چودھری عزیز، تیمور، رونق، شاہ نواز اور سراج وغیرہ سائیں ملنگے کی کٹیا سے نکل کر پیچھے واقع کمروں میں چلے گئے۔یہاں بڑے کمرے میں پکے کوئلوں والی انگیٹھی دہک رہی تھی۔زمین پر مونگ پھلی کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے اور کھونٹیوں سے کپڑے لٹک رہے تھے۔یہاں لکڑی کی ایک بڑی جالی دار ڈولی کے پیچھے وہ چور راستہ تھا جو بہ وقت ضرورت شاہ نواز اور اس کے ساتھی سراج کو دو کھوکھلی قبروں کے اندر پہنچا دیتا تھا۔ان دونوں قبروں کو ملا کر قریباً آٹھ ضرب چھ فٹ کی جگہ بن جاتی تھی۔

چودھری نے اپنی گرم چادر کے نیچے ہاتھ ڈالا اور پھر کسی اندرونی جیب سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر مجھے تھما دی۔"یہ تم دونوں کے خرچے وغیرہ کے لیے ہے۔اور کوئی ضرورت پڑے گی تو غلام خان انتظام کر دے گا، بے فکر رہو۔" اس نے بڑی محبت سے کہا۔

پھر اس نے دو امام ضامن نکالے۔ ایک میری طرف اور دوسرا تیمور کی طرف بڑھا دیا۔ "ان کو بازوؤں پر باندھ لو۔ ہمارے جدی پیر عطا اللہ جہلمی صاحب نے دیے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہر آسمانی آفت سے محفوظ رہو گے۔"

"مگر زمینی بلاؤں کا کیا بنے گا؟" میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

"زمینی بلا؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"زمینی بلا۔۔۔۔ جیسے تم۔" میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

وہ ہکا بکا سا میری طرف دیکھنے لگا۔ "تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

میرا جواب ایک نہایت زوردار تھپڑ کی صورت میں تھا۔ چودھری کے مکار چہرے پر لگنے والے اس تھپڑ نے اس کی گرم ٹوپی اچھال کر دور گرا دی اور وہ خود بھی ایک پہلو پر جھک گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں اور اس کے ساتھ ہی نیچے والا ہونٹ بھی۔

"یہ۔۔۔۔ یہ کیا ہے؟" وہ سکتہ زدہ آواز میں بولا۔

اس کا جواب ایک اور تھپڑ کی صورت میں تھا۔ چٹاخ کی آواز پورے کمرے میں گونجی۔ اس بار رونق علی بھی چپ نہیں رہ سکا۔ وہ چلایا۔ "یہ کیا کر رہے ہو خاور؟"

"تم چپ رہو۔ تمہیں ابھی کچھ پتا نہیں۔" میں نے کہا اور لرزتے کانپتے چودھری عزیز کو گریبان سے پکڑ کر چارپائی سے اٹھا لیا۔

چودھری کے ساتھی فیاض میواتی نے پستول نکالنے کے لیے اپنی گرم چادر کے نیچے ہاتھ ڈالنا چاہا مگر شاہنواز اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے فیاض کا بازو پکڑ لیا اور تیمور نے اس کو پستول سے محروم کر دیا۔ دوسری طرف چودھری عزیز نے دو زناٹے کے تھپڑ کھا کر ذرا تن فن دکھائی۔ اس نے خود کو مجھ سے چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ ایک بار تو یہی لگا کہ وہ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مگر پھر اپنے زور میں وہ خود ہی گر گیا۔ انگیٹھی الٹ گئی اور انگارے کچے فرش پر بکھر گئے۔ میں نے چودھری کی گردن پر پاؤں رکھا اور سراج نے اس کی قمیص کے نیچے لگے ہولسٹر میں سے بھرا ہوا ماؤزر نکال لیا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے خاور؟" رونق نے تھر تھر کانپتے ہوئے پوچھا۔

"یہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہے رونق۔ اس کنجر نے روپ بدل رکھا ہے۔ شہوار کو اپنے پالتو غنڈے انورے سے مروانے والا یہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ثمینہ کی جان بھی اسی نے لی ہے۔"

رونق کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

چودھری نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر اس کی چربی دار گردن میرے پاؤں کے نیچے تھی۔ اس کی آواز اس کے گلے سے باہر نہیں آسکی۔ ہاں، یہی وہ آستین کا سانپ تھا جس نے پہلے دن سے مجھے اپنا "دشمن اول" سمجھا اور مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔۔۔۔ قریباً پانچ منٹ بعد کمرے کا منظر یہ تھا کہ ہم نے چودھری عزیز کی مشکیں کس دی تھیں اور وہ کسی حوالاتی کی طرح زمین پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے نچلے ہونٹ سے بہنے والے خون نے اس کی کلف لگی سفید قمیص کو ہی لہولہان نہیں کیا تھا اس کی شلوار بھی داغ دار ہو گئی تھی۔

میں نے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔ "چودھری عزیز! تم ایک بہت کمینے اور کینہ پرور بندے ہو۔ اپنی اسی کینہ پروری کی وجہ سے تم آج پھر اسی مقام پر آ گئے ہو جہاں چند سال پہلے تھے۔

تب بھی یہی سین تھا نا۔ تم بندھے ہوئے تھے اور میرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ریوالور میں دو گولیاں تھیں۔ اس وقت تم نے زمین پر ناک رگڑی تھی۔"

چودھری عزیز واویلا کرنے لگا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔ تم کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ ایسا؟ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔"

"تم نے خود کچھ نہیں کیا ہے لیکن کروایا تم نے ہی ہے سب کچھ۔ اور جن سے کروایا ہے، وہ گواہی دے چکے ہیں۔ سب کچھ بک دیا ہے انہوں نے۔" میں نے اس کے سینے پر لات رسید کی۔ وہ بری طرح کھانسنے اور ابکائیاں لینے لگا۔

میں رونق کو کمرے سے باہر لے گیا اور دو چار منٹ کے اندر اسے انورے اور پروین کے اقبالی بیانات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ رونق علی بھی ششدر رہ گیا۔

"یار خاور! یقین نہیں آ رہا۔ اگر واقعی یہ سب کچھ بھائیا عزیز نے کیا ہے تو پھر یہ بہت بڑا بہروپیا ہے۔ ہمارے درمیان رہتے ہوئے۔۔۔۔ اس نے ہم کو ذرا بھی شک نہیں ہونے دیا۔"

"اس نے اونٹ والا کینہ دکھایا ہے رونق بھائی۔ ہم نے دو ڈھائی سال پہلے اس سے زمینوں کے کاغذوں پر دستخط انگوٹھے کرا لیے تھے اور اسے پوری طرح دبا بھی لیا تھا لیکن یہ خبیث اندر ہی اندر سلگتا رہا ہے۔ اوپر سے کچھ اور ہو گیا مگر اندر سے وہی زہری ناگ رہا جو اپنا "زہر" اپنے اندر جمع کرتا رہتا ہے۔"

"یا خدا! ہم تمہاری وو ہٹی کے قاتل کو موکھلوں اور لمبڑوں میں ڈھونڈتے رہے ہیں اور یہ ہمارے ساتھ ساتھ بیٹھ کر ہمیں مشورے دیتا رہا ہے۔"

اگلا آدھ گھنٹا چودھری عزیز کے لیے بڑا سخت تھا۔ میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہی دکھتی رگ جس نے پہلے بھی اسے ہاتھ پاؤں جوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے اچھی طرح گدڑ کٹ لگانے کے بعد میں نے ریوالور میں وہ گولیاں ڈال لیں اور چودھری کو خوشخبری سنائی کہ میں اب چرخی گھما گھما کر اس کی کنپٹی پر چھ فائر کروں گا۔ اگر وہ قدرتِ الٰہی سے بچ گیا تو اسے چھوڑ دوں گا۔

چودھری عزیز جیسے لوگ حساب کتاب کے ماہر ہوتے ہیں۔ اسے پتا تھا کہ چھ بار ریوالور کا گھوڑا دبانے کا سیدھا سیدھا مطلب یہی ہے کہ کل صبح نو دس بجے کے لگ بھگ اس کی نماز

جنازہ ادا ہو جائے گی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو گیا اور لگا کہ اسے بڑا تسلی بخش قسم کا ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ میں نے اسے تھوڑی سی مہلت دی اور ایک بار پھر سوچنے کا موقع دیا۔

اس "مہلت بریک" کے بعد جب چودھری عزیز سے پوچھ گچھ کا سلسلہ دوبارہ جوڑا گیا تو وہ ہتھیار ڈال چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ درحقیقت اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، اتنا آناً فاناً تھا کہ وہ اندر سے کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ قریب دس پندرہ منٹ بعد چودھری عزیز نے چند بڑی بڑی قسمیں کھانے کے بعد یہ اعلان کیا کہ ثمینہ کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اس نے مان لیا کہ شہوار کا قتل اسی نے کروایا ہے۔

"تو پھر کس کا ہاتھ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ثمینہ کو موکھل پاشا نے مارا ہے۔" چودھری عزیز کا انکشاف دھماکا خیز تھا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"وقت پڑنے پر ثبوت بھی دے دوں گا۔" چودھری عزیز نے اپنے خون آلود ہونٹ پونچھتے ہوئے کہا۔

"کیوں مارا گیا ہے اسے ؟"

"موکھل پاشا کو پتا چل گیا تھا کہ لڑکی اپنا بیان بدلنے والی ہے۔"

"اسے کیسے پتا چلا؟"

"جب ثمینہ تم سے ملی، پاشا کے بندے تمہارے آس پاس موجود تھے۔انہوں نے تمہاری اور ثمینہ کی کچھ باتیں سن لی تھیں۔"

میری آنکھوں کے سامنے وہ بارش کی رات آگئی جب میں آخری بار ثمینہ سے ملا تھا۔اس رات کے سارے مناظر نگاہوں میں گھومنے لگے۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ موکھل پاشا کا کام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے مخبر ملی۔۔۔۔۔نے ٹوہ لگائی تھی۔" چودھری عزیز نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے انداز نے واضح طور پر گواہی دی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔وہ اب بھی بہت کچھ چھپا رہا ہے۔

تیمور نے میرے اشارے پر چودھری کو تھوڑی سی مار اور لگائی۔یہ تھوڑی سی مار بھی اس کے لیے بہت تھی۔اس کی ناک سے خون رسنے لگا اور جبڑا چٹخنے کی آواز بھی آئی۔وہ کمرے کے کچے فرش پر مٹی اور خون میں لت پت تھا۔اس کا سر ہماری ٹھوکروں کی زد میں تھا۔کچھ دیر پہلے جب وہ مجھے الوداع کہنے کے لیے میواتی کے ساتھ گاڑی سے اتر رہا تھا،اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اس کی ساری شان و شوکت خاک میں ملنے والی ہے اور وہ اس انجام سے دوچار ہونے والا ہے۔

ایک دم اس پر غشی طاری ہوگئی۔میں نے تیمور کو ہاتھ روکنے کا اشارہ کیا۔اپنے چودھری کی یہ درگت بنتے دیکھ کر میواتی بھی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آچکی تھی کہ وہ اور اس کا چودھری اس قبرستان میں بری طرح پھنس چکے ہیں اور اب کوئی معجزہ ہی انہیں بدترین انجام سے بچا سکتا ہے۔

یہ فیاض میواتی نامی بندہ کچھ سمجھ دار لگتا تھا۔اس نے سخت قسم کی مار پیٹ کا شکار ہونے سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیے اور جو کچھ اسے معلوم تھا بتانے کے لیے تیار ہوگیا۔وہ خاص لہجے کی

اردو بولتا تھا۔ وہ بولا۔ "ہمار کو جو کچھ بھی معلوم ہے، ہم آپ کو بتادیوت ہے۔ پر آپ نے ہمار کو مارنا نہیں۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ نہیں ماریں گے۔

"ہم آپ سے دوسرے کمرے میں جاکر بات کرنا چاہوت ہے۔"

"ٹھیک ہے آجاؤ۔"

دوسرے کمرے میں جاکر میواتی نے لرزتے کانپتے لہجے میں انکشاف کیا کہ چودھری عزیز ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ثمینہ کو مارنے میں اس کا ہاتھ نہیں، اسے موکھل پاشانے ہی مارا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ پچھلے کئی مہینے سے موکھل پاشااور چودھری عزیز میں رازداری سے رابطہ قائم تھا۔

موکھل پاشااور چودھری عزیز کے درمیان رابطے کی بات میرے دماغ میں بھی پرورش پارہی تھی اب میواتی نے انکشاف کیا تو میرا شک ایک دم پختہ ہوگیا۔

میں جانتا تھا کہ موکھل پاشا ان لوگوں میں سے ہے جو اپنے انتقام کی خاطر ہر حد تک جانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف چودھری عزیز کی خصلت بھی اب بالکل واضح ہوگئی تھی۔۔۔۔۔ وہ طویل عرصے سے نہایت ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ اپنے منصوبے پر عمل پیرا تھا۔ اور منصوبہ یہی تھا کہ وہ مجھے اپنے انتقام کا ایندھن بنا کر نظروں سے اوجھل کرنا اور راجوال کی گدی دوبارہ سنبھالنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ ابلیس سے بھی ہاتھ ملا سکتا تھا، موکھل پاشا تو پھر بھی انسان تھا۔۔۔۔ یا کہہ لیں کہ "انسان نما" تھا۔

میں نے میواتی سے کہا۔ "تم کہہ رہے ہو کہ ثمینہ کو موکھل پاشانے مارا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتارہے ہو کہ موکھل اور عزیز کے درمیان خفیہ رابطہ تھا۔" میواتی نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے پوچھا۔ "تو پھر تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ ثمینہ کے قتل میں عزیز کا ہاتھ نہیں؟"

"ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے جی کہ ثمینہ کو مارن کا پھیسلہ موکھل پاشانے اپنے طور پر کیا تھا۔ دراصل۔۔۔۔۔ جب۔۔۔۔۔ موکھل پاشانے آپ کو ثمینہ سے بات کرتے ہوئے سنا

اوراس کو پتا چل گیا کہ اب ثمینہ اپنا بیان بدل لیوے گی تو اس نے بہتر جانا کہ وہ اس کو ختم کر دے اور اس کی موت کا الزام بھی آپ پر آجاوے۔ بعد میں۔۔۔۔"

"ہاں کہو کہو۔۔۔۔۔رک کیوں گئے ؟"

"بعد میں جی۔۔۔۔موکھل پاشا اور چودھری عزیز میں تھوڑا سا اختلاپھ بھی ہوا تھا۔ چودھری کہوت تھا کہ اس لڑکی کا خون ہمار کو اپنے سر نہیں لینا چاہیے تھا لیکن پھر بعد میں چودھری نے اپنے رائے پاسا کی رائے سے ملالی تھی۔"

حالات کی کڑیاں بڑی تیزی کے ساتھ آپس میں مل رہی تھیں اور یہ سیدھے سادے حالات تھے۔ وہی چودھراہٹ کا گھمنڈ، وہی بدلے کی آگ اور وہی اونچی پگ کی ہوس! لیکن ایک بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ چودھری عزیز نے اب تک مجھے کیوں مسلسل معاف کیا تھا؟ نہ صرف مجھے معاف کیا تھا بلکہ میری ماں اور بہن کو بھی محفوظ پناہ گاہ دی ہوئی تھی۔ اس نے انسپکٹر میاں وارث کو ستر ہزار روپیا نقد ادا کر کے تھانے کچہری سے بے بے جی اور عارفہ کی جان چھڑائی تھی۔ اور اب بھی بہ ظاہر ان کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ ایک دم میرا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ذہن بلقیس کی طرف چلا گیا۔ کیا وہ بلقیس کے مجبور کرنے پر ایسا کر رہا تھا۔۔۔۔لیکن بلقیس اسے کیسے مجبور کر سکتی تھی؟ وہ تو منت سماجت ہی کر سکتی تھی؟

پھر میرا دھیان ان رجسٹریوں کی طرف چلا گیا جو چودھری کی نیک چلنی کی ضمانت کے طور پر میرے پاس محفوظ تھیں۔ تو کیا ان رجسٹریوں کا جادو اپنا کام دکھا رہا تھا؟ شاید ایسا ہی تھا۔

وہ رجسٹریاں بلقیس کے نام تھیں اور بلقیس ہی چاہتی تو وہ ساری زمین واپس چودھری عزیز کو مل سکتی تھی۔ اس لیے چودھری کے لیے ضروری ہو چکا تھا کہ وہ بلقیس سے بنا کر رکھے۔ بلقیس اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی مگر چودھری تو جانتا تھا۔

تو کیا وہ بلقیس کی خاطر میری جان بخشی کر رہا تھا اور میرے گھر والوں کو پناہ دے رہا تھا؟

پھر میرا دھیان ابھی تھوڑی دیر پہلے کی اس بات کی طرف چلا گیا جو چودھری نے کہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "تم نہ بھی بلاتے تو میں نے آنا تھا۔ ایک دو قانونی نکتوں کے بارے میں تم سے بات کرنی تھی اور کچھ زمین کا معاملہ بھی تھا۔"

غالباً وہ اپنی زمین کی بات کر رہا تھا، وہ رجسٹریاں میرے پاس تھیں اور وہ مجھے الوداع کہنے سے پہلے ان رجسٹریوں کا مستقبل جاننا چاہتا تھا۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔

میواتی سے آدھ گھنٹا مزید گفتگو ہوئی اور بہت سی باتیں کھل کر سامنے آگئیں۔ یہ نہایت انکشاف انگیز گفتگو تھی۔۔۔۔ جسم میں سنسناہٹ اور سینے میں جلن محسوس ہونے لگی۔ میرا ایک اور اندازہ بالکل درست ثابت ہو گیا۔ میواتی نے ڈرامائی انداز میں بتایا۔ "پچھلے منگل راجوال میں موکھلوں اور لمبڑوں نے جو مار دھاڑ کی اس کا چودھری عزیز کو پہلے سے پتا تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق موکھل پاسا نے چودھری کو پہلے سے بتا دیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے گاؤں والوں کو ذلیل کرنے کا کام بھی ملی بھگت سے ہوا؟"

"میں نے کہا نا جی کہ چودھری عزیز اور پاسا کی لائن آپس میں ملی ہوئی تھی۔ چودھری کی طرح پاسا بھی یہی چاہوت تھا کہ جاگیر کی کار مختاری بیگم جی کے ہاتھ میں نہ رہے۔ اور ان کا مقصد تقریباً پورا ہو گیا ہے جی۔ کچھ دن پہلے بیگم جی نے خود کہہ دیا ہے کہ وہ مختاری چھوڑنا چاہوت ہیں۔"

جی چاہ رہا تھا کہ شہوار اور ثمینہ کے قاتل چودھری عزیز کو اس کی ساری خونی کدورت سمیت اسی جگہ گولیوں سے چھلنی کر ڈالوں۔

مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا اور اگر کرتا بھی تو اپنا ہی نقصان کرتا۔ پھر اپنا گناہ قبول کر کے میری بے گناہ کا ثبوت کون دیتا؟

مجھے اکرم کی بات یاد آئی۔ اس نے بتایا تھا کہ جس دن راجوال پر موکھلوں نے ہلا بولا اور خون خرابا ہوا چودھری عزیز بیمار پڑا تھا۔۔۔۔ یقیناً وہ بیمار ہوا نہیں تھا، بیمار بنا تھا۔۔۔۔ وہ دونوں طرف سے سچا ہونا چاہتا ہو گا۔

میواتی بے حد خوفزدہ تھا اور جان بخشی کے لیے بار بار میرے پاؤں پکڑ رہا تھا۔ میں نے اسے تھوڑی بہت تسلی دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ابھی اس کے مزید تعاون کی ضرورت ہے۔ اسے ایک مسلح بندے کی تحویل میں چھوڑ کر میں واپس چودھری عزیز کے پاس آگیا۔

چودھری عزیز اب ہوش میں آگیا تھا۔ اس کا رنگ اب بھی ہلدی تھا اور وہ ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر دہشت سمٹ آئی۔۔۔۔ بندے کا جذبہ انتقام اور زیادہ سے زیادہ کی ہوس اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ اگر دیکھا جاتا تو چودھری کے پاس کیا نہیں تھا۔ اس کی زیادہ تر زمین اس کی اپنی ملکیت میں ہی تھی۔ جو ساڑھے تیرہ مربعے میرے پاس تھی، وہ بھی میں نے بس ضمانت کے طور پر اس سے بلقیس

کے نام لکھوار کھی تھی۔اور اگر وہ ٹھیک ٹھیک چلتار ہتا تو یہ بھی اس کو ایک دن واپس ہی مل جانی تھی۔اس کی دو تجوریاں پیسوں سے بھری ہوئی تھیں۔دنیا کا ہر عیش و آرام اسے حاصل تھا لیکن اس کے باوجود آج وہ ایک قاتل بن گیا تھا اور بربادیوں کی طرف اس کے سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں چودھری عزیز سے پھر بات چیت شروع کرتا،رونق علی نے مجھے اشارے سے باہر بلایا۔میں باہر گیا تو رونق علی کے ہاتھ میں ٹیپ ریکارڈر نظر آیا۔یہ بیٹری سے چلنے والا وہی ٹیپ ریکارڈر تھا جس پر سائیں ملنگا اور اس کے ساتھی کافیاں اور لوک گیت وغیرہ سنتے تھے اور سر دھنتے تھے۔رونق پُر جوش لہجے میں بولا۔"مجھے لگتا ہے خاور۔۔۔۔۔تیرے اور تیمور کے سارے دلدر دور ہونے والے ہیں۔آج جو کچھ سامنے آیا ہے۔یہ جاگیر کے لوگوں کی آنکھیں کھول دے گا۔میرا مشورہ ہے کہ بھائیا عزیز جو بھی بات شات کرے وہ ہم اس پر ریکارڈ کر لیں۔یہ ایک بڑا پکا ثبوت ہو گا۔"

"بڑا مناسب مشورہ ہے۔"میں نے تائید کی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میں تو کہتا ہوں خاور! یہ بڑا سنہری موقع ہے۔اس کا بیان شیان ریکارڈ کرنے کے بعد اس کو گاڑی پر بٹھاتے ہیں اور راجوال پہنچ جاتے ہیں۔آج سے گاؤں کا میلہ شروع ہے۔صبح نو دس بجے تک وہاں کافی خلقت جمع ہو گئی ہو گی۔دوسرے پنڈوں کے لوگ بھی جمع ہوں گے۔ان سب کے سامنے عزیزے کا کچا چٹھا کھول دیتے ہیں۔مجھے تو لگتا ہے کہ اس کمینے کو پولیس کے حوالے شوالے کرنے کی ضرورت شرورت ہی نہیں ہو گی۔لوگ وہیں مار مار کر اس کا اور انورے کا چھلوس نکال دیں گے۔۔۔۔۔اور ہاں،انورا کہاں ہے؟"رونق نے پوچھا۔

"کاچھو والی میں ہے۔اس کنجر کی مشکیں بھی بندھی ہوئی ہیں۔"میں نے بتایا۔

اگلا آدھ گھنٹا کافی سنسنی خیز تھا۔میں،رونق، تیمور اور شاہنواز کمرے میں موجود تھے اور چودھری عزیز ہمارے سامنے اپنا کالا کارنامہ بیان کر رہا تھا۔اس کی زبان میں روانی تھی اور اگر زبان کہیں اٹکتی بھی تھی تو تیمور کی دہشت کا موبل آئل اسے پھر رواں دواں کر دیتا تھا۔چودھری کو غالباً معلوم نہیں تھا کہ اس کے بالکل پاس رکھے ہوئے کمبل کی اوٹ میں ٹیپ ریکارڈر موجود ہے جو اس کی آواز کو محفوظ کر رہا ہے۔

اس دوران میں اچانک شاہ نواز کا ساتھی سراج باہر سے آیا۔اس کا چہرہ متغیر تھا۔اس نے مجھے اور شاہ نواز کو ایک ساتھ باہر آنے کا اشارہ کیا۔میں نے ریوالور قمیص کے نیچے اڑسا اور شاہ نواز کے پیچھے پیچھے باہر آیا۔بلا کی سردی تھی۔اب سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔اندھیرے میں اجالے کی آمیزش اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ ملنگے کی کٹیا کے ساتھ ساتھ دور تک پرانی قبریں نظر آنے لگی تھیں۔ان قبروں میں اُگے ہوئے جنتر، کیکر اور بیریاں۔۔۔۔اور ان درختوں کے پیچھے دور تک خودرو جھاڑیاں اور راج بہا کی طرف جاتا ہوا کچا راستہ اور اوپر آسمان پر اڑتی ہوئی پرندوں کی ڈاریں۔۔۔۔سب کچھ دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔سراج نے ایک دیوار کی اوٹ میں رہتے ہوئے ایک طرف انگلی سے اشارہ کیا اور بولا۔"وہ دیکھو جی۔"

مجھے قبرستان کی چار فٹ اونچی کچی دیوار کے پیچھے دو سائے حرکت کرتے نظر آئے۔پھر میری نگاہ کچی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے گئی اور میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔دیوار کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں کے پیچھے۔۔۔۔اور قبروں کے کچے پکے کتبوں کے عقب میں درجنوں مسلح افراد کی موجودگی ثابت ہو رہی تھی۔یہ ایک خوفناک گھیرا تھا جو رات کی

تاریکی میں ہمارے ارد گرد نہایت خاموشی اور ہوشیاری سے بنایا گیا تھا۔میں سناٹے میں رہ گیا۔"یہ کیا ہوا ہے یار؟"میں نے شاہ نواز سے کہا۔

"مجھے بھی اتنا ہی پتا ہے جتنا تمہیں۔"شاہ نواز نے جواب دیا۔"اور میرا خیال ہے کہ یہ پولیس ہے۔"

مجھے لگا کہ حالات ایک دم پھر پلٹا کھا گئے ہیں۔یہ کیسی صبح طلوع ہوئی تھی جس نے روشنی کی ہر کرن کو گہرے اندھیرے میں بدل دیا تھا۔جب میرے اور تیمور کے پاس اپنی بے گناہی کے نہایت ٹھوس ثبوت آ گئے تھے۔۔۔۔اور ہم اپنے خیر خواہوں اور چاہنے والوں کے سامنے سرخرو ہونے کے قابل ہوئے تھے، میاں وارث اور اس کے بے شمار ہرکاروں نے ہمیں گھیر لیا تھا اور ان سے کسی خیر کی توقع نہیں تھی۔وہ لوگ صرف اور صرف ہماری لاشیں گرانا چاہتے تھے اور یہ لاشیں اپنے آقاؤں کو دکھا کر ان سے نقد داد وصول کرنے کے خواہش مند تھے۔وہ بہت دنوں سے شب و روز جس موقع کے منتظر تھے، وہ آج اس ویران قبرستان میں انہیں مل گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کچھ دیر بعد تیمور بھی ہمارے پاس آن کھڑا ہوا اور خاموشی سے موت کے اس حصار کو دیکھنے لگا جو بڑی ہوشیاری سے ہمارے ارد گرد بنا دیا گیا تھا۔

"لگتا ہے کوئی مخبری ہوئی ہے۔" تیمور نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"جو بھی ہوا۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔" شاہ نواز نے دانت پیسے۔

ہم نے چند سیکنڈ تک مشورہ کیا اور پھر اپنی اپنی پوزیشنوں کی طرف دوڑے۔ شاہ نواز کے سارے ساتھیوں میں بھی ہلچل مچ گئی تھی۔ شاہ نواز نے کہا۔ "خاور! میں نہیں چاہتا کہ ہماری مارا ماری میں چاچے ملنگے اور اس کے ساتھیوں کو کوئی نقصان پہنچے۔ ان کا قصور بس اتنا ہے کہ انہوں نے ہمیں پناہ دی ہے۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"میرا خیال ہے کہ ان کو باہر بھیج دیا جائے۔ یہ ہاتھ اٹھا کر باہر چلے جائیں تو پولیس والے ان پر گولی نہیں چلائیں گے۔"

میرے ذہن میں فوراً پانچ دن پہلے کا واقعہ آ گیا۔ جب ہم مورچے میں گھرے ہوئے تھے، بد قسمت ناجا اس طرح ہاتھ اٹھا کر باہر نکلا تھا اور گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔ ملنگے اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" شاہ نواز نے پوچھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میری رائے ہے کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں پولیس کا ارادہ معلوم کر لینا چاہیے۔ مطلب یہ کہ وہ ہماری گرفتاری چاہتے ہیں یا پھر پولیس مقابلہ بنا کر ہماری لاشیں گرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"مجھے تو تمہاری دوسری بات ہی ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔"

"پھر بھی ہمیں تصدیق کرنی چاہیے۔"

"اور تصدیق کرنے کا طریقہ کیا ہو گا؟" شاہنواز نے ذرا ترش لہجے میں پوچھا۔

"ایک طریقہ ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم ان سے کہتے ہیں کہ ہم گرفتاری دینے کو تیار ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ انتظامیہ کا کوئی اعلیٰ عہدے دار یہاں آئے اور ہمیں ضمانت دے دے کہ ہمارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہو گا۔"

"تمہاری بات تو سمجھ میں آ رہی ہے لیکن۔۔۔۔۔"

ابھی شاہ نواز کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ یخ بستہ صبح کا سناٹا فائرنگ کی لرزہ خیز تڑتڑ سے گونج اٹھا۔ کئی گولیاں ارد گرد کے درختوں میں پیوست ہوئیں اور بے شمار پرندے شور مچاتے ہوا میں پرواز کر گئے۔ اس کے ساتھ ہی میگا فون پر ایک کرخت آواز گونجی۔ میاں وارث کی یہ آواز میں بہ آسانی پہچان گیا۔ وہ مخصوص انداز میں بولا۔ "یہاں سے کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو بے موت مارا جائے گا۔ تم چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں ہو۔ جان بچانا چاہتے ہو تو ہاتھ اٹھا کر اور قطار بنا کر باہر آ جاؤ۔ میں اپنا اعلان ایک بار پھر دہراتا ہوں۔ یہاں سے کسی نے بھاگنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔"

میاں وارث کی دھمکاتی ہوئی آواز قبرستان میں گونج رہی تھی اور فضا کو سراسیمہ کر رہی تھی۔

میں نے شاہ نواز کے ساتھی سراج کو اشارہ کیا اس کی آواز خاصی پاٹ دار تھی۔ وہ میرے اور شاہنواز کے قریب آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ میاں وارث کو کیا جواب دے۔

سراج نے بہ آواز بلند پکار کر کہا۔ "ہم گرفتاری دینے کو تیار ہیں انسپکٹر وارث لیکن اس کے لیے ہم کو یہ تسلی ہونی چاہیے کہ۔۔۔۔۔"

"تم اپنی شرطیں نہ سناؤ۔ یہ بتاؤ گرفتاری دے رہے ہو یا نہیں؟" سراج کی بات تیزی سے کاٹ دی گئی۔

"ہم گرفتاری دے رہے ہیں۔ پر ہمیں اپنی جان کا خطرہ ہے۔" سراج نے کہا۔

"تمہیں ہماری طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ اگر کوئی خطرہ ہے تو تمہاری اپنی بے وقوفی سے ہے۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ اگلے پانچ منٹ کے اندر اندر تم لوگ فیصلہ کر لو کہ تمہیں باہر آنا ہے یا ہم اندر آ جائیں اور میں ایک بار پھر کہتا ہوں شاہ خاور! تم اس بار کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔۔۔۔۔ ورنہ بری موت مارے جاؤ گے۔"

اس نے مجھے مخاطب کر کے یہ جتایا کہ وہ میری موجودگی کے بارے میں پُر یقین ہے۔

میاں وارث کا رویہ توقع کے عین مطابق بہت سخت تھا۔اسے اس بات کا مان تھا کہ اس نے ہمارے گرد بہت مضبوط گھیرا بنالیا ہے اور اب ہم اس سے کوئی بھی بات منوانے کے قابل نہیں ہیں۔

صورتِ حال ہماری توقع سے زیادہ سنگین تھی۔شاہنواز نے ہمیں پناہ دی تھی اور اس کی غیرت کا تقاضا تھا کہ وہ ہمیں بچانے کی ذمے داری کو شدت سے محسوس کرے۔۔۔۔اور وہ محسوس کر رہا تھا۔مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔"شاہ خاور! میرا خیال ہے کہ تم نیچے چلے جاؤ تیمور کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔اس وقت میاں وارث کا اصل نشانہ تم دونوں ہی ہو۔۔۔۔"

"نہیں شاہ نواز! تمہیں پتا ہی ہے مجھے چھپنا کبھی پسند نہیں رہا۔میں اب بھی نہیں چھپوں گا۔۔۔۔اور نیچے تو کسی صورت نہیں جاؤں گا۔" نیچے سے مراد وہ دونوں کھوکھلی قبریں تھیں جن کا تذکرہ میں کر چکا ہوں۔

اسی دوران میں ایک دو انجنوں کا شور سنائی دیا۔غالباً یہ پولیس کی جیپیں تھیں جو کچھ اور نزدیک آ گئی تھیں۔

میں نے کہا۔"شاہنواز! میری رائے ہے کہ ہم چاچے ملنگے اور اس کے تینوں ساتھیوں کو نیچے بھیج دیں۔ان کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ہمارے قصوروں کی سزا ان کو نہ ملے تو اچھا ہے۔"

مشورے کے بعد ہم نے اس پر عمل کرنے کا سوچا مگر اس سے پہلے کہ پوری طرح عمل ہو پاتا صورتِ حال ایک دم ہی سنگین تر ہو گئی۔پانچ منٹ پورے ہونے سے پہلے ہی میاں وارث کی طرف سے ایک بار پھر میگافون پر اعلان کیا گیا اور ابھی اعلان جاری ہی تھا کہ دائیں جانب سے اچانک تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی ہے۔مجھے یوں لگا، جیسے کسی نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی ہے اور پولیس والوں نے اسے جھاڑیوں میں دیکھنے کے بعد نشانہ بنایا ہے۔

اس کے دو منٹ بعد ہی اندھا دھند گولیاں برسنے لگیں۔تھری ناٹ تھری کی ایک گولی کھڑکی توڑتی ہوئی آئی اور شاہنواز کے ایک بھائی کی ٹانگ میں لگی۔وہ وہیں کچی زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ایک دوسری گولی اس صراحی کو توڑ گئی جس میں تازہ بھنگ گھوٹ کر ڈالی گئی تھی۔

ہم نے مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے لیں لیکن ابھی تک ہماری طرف سے کوئی گولی نہیں چلائی گئی تھی۔ پولیس پر جوابی گولی چلانا ایک بڑا مشکل کام ہوتا ہے کیونکہ جس وقت پہلی گولی چلائی جاتی ہے۔اسی وقت یہ پولیس مقابلہ بن جاتا ہے اور کیس کی صورت میں ارادہ قتل اور دوسری سنگین دفعات لاگو ہو جاتی ہیں۔

۔۔۔۔ مگر یہاں اب صورتِ حال ایسی ہو چکی تھی کہ جوابی گولی کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ پھر یہی گولی شاہنواز کی طرف سے چلائی گئی۔اس کے بعد سراج نے فائرنگ شروع کی، پھر ہم سب شریک ہو گئے۔

"وہ دیکھو۔۔۔۔ادھر سے وہ بالکل پاس آ گئے ہیں۔" تیمور دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے چلایا۔

"سور کے بچے!" شاہنواز نے دانت پیسے اور اپنی رائفل کا رخ دائیں جانب کر کے چھوٹے چھوٹے دو برسٹ چلائے۔ قبروں کی مٹی ہوا میں اڑتی نظر آئی۔

ان برسٹوں کے بعد فائرنگ میں ایک دم شدت آ گئی۔ گولیاں ہم پر مینہ کی طرح برسنے لگیں۔ یہ گولیاں درختوں کے تنوں میں پیوست ہو رہی تھیں، پتوں اور شاخوں سے ٹکرا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

رہی تھیں، کچی دیواروں میں گھس رہی تھیں۔ایک دم ہی کہرام سا مچ گیا تھا۔ میں اپنی سیون ایم ایم رائفل سے سنگل شاٹ فائر کر رہا تھا۔ تیمور میرے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا، اس کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔اچانک ایک گولی آئی اور تیمور کے سر پر سے ہوتی ہوئی پیچھے کھڑے سراج کے چہرے پر لگی۔ وہ رائفل کے میگزین میں گولیاں بھر رہا تھا۔ پشت کے بل گرا اور گرنے کے فوراً بعد ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کی جھلک دیکھی اور اس کی پیشانی کا سیاہی مائل سوراخ دیکھا۔

شاہنواز نے بھی یقیناً یہ منظر دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخ شعلوں کی لپک دکھائی دی۔ "مار دیا۔۔۔۔ حرام زادو مار دیا۔" وہ عجیب آہنگ میں دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی وہ رائفل سونت کر اندھا دھند گولیاں چلانے لگا۔ پورے کمرے میں گولیوں کے گرم خول بکھر گئے۔ مجھے لگا کہ وہ اسی طرح فائر کرتا ہوا برآمدے میں نکل جائے گا۔ میں نے اسے کمر سے پکڑ لیا۔ "نہیں شاہنواز! یہ ٹھیک نہیں۔"

وہ چھڑانے کے لیے زور لگانے لگا۔ میں نے تیمور سے مل کر اسے بہ مشکل نیچے بٹھایا۔

دوسرے کمرے سے شاہنواز کے ساتھی فیروز نے پکار کر کہا۔ "سراج صاحب! یہ لوگ مزار کی طرف سے آگے آرہے ہیں۔ آپ کے بالکل دائیں طرف ہیں۔"

فیروز نامی یہ بندہ نہیں جانتا تھا کہ سراج سننے اور سمجھنے کی حد سے گزر چکا ہے۔ گولی اس کی عین پیشانی پر لگی ہے اور اس نے اس قسم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ سراج کے بجائے فیروز کو میں نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے فیروز! میں نے دیکھ لیا ہے۔ ہم ان کو روکتے ہیں، تم اپنی سائیڈ پر دھیان رکھو۔ ابھی ان پر سیدھا فائر نہ کرو لیکن ان کو پاس بھی نہ آنے دو۔"

"کیوں سیدھا فائر نہ کرو۔۔۔۔ کیوں نہ کرو۔" شاہنواز گرجا۔ اس نے گالی دی اور بولا۔

"وہ ہماری چھاتیوں پر مار رہے ہیں۔ ہم ان کے پیروں پر کیوں ماریں؟"

وہ رائفل سونتتا ہوا دوسرے کمرے میں فیروز کے پاس چلا گیا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں پولیس مقابلہ کرنا نہیں چاہتا تھا، نہ ہی ڈکیت یا قاتل بننا چاہتا تھا۔ قدرت نے میری اور تیمور کی رہائی کا ایک بہترین سبب پیدا کر دیا تھا۔ چودھری عزیز اور انورا ہمارے قبضے میں آگئے تھے اور انہوں نے اپنے جرموں کا اعتراف بھی کر لیا تھا لیکن عین اس وقت جب سب کچھ ہمارے حق میں ہونے والا تھا، یہ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

پولیس والے بلائے ناگہانی بن کر ٹپک پڑے تھے۔ یہ سب کچھ میرے لئے بے حد تکلیف دہ تھا۔ اب اگر میرے یا تیمور کے ہاتھوں کوئی پولیس والا مر جاتا تو ہم میں اور شاہنواز یا سراج میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا تھا۔ وہی پھانسی کا تختہ یا ان کاؤنٹر والی فوری موت!

میواتی کی چلائی ہوئی آواز نے میرے خیالوں کو درہم برہم کر دیا تھا۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ شاید اسے گولی وغیرہ لگ گئی ہے مگر وہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ "چودھری صیب۔۔۔۔۔ چودھری صیب!" وہ دل دوز آواز میں پکارا۔ "اوئے یہ کیا ہو گیا۔۔۔۔ ارے کوئی کچھ کرو۔۔۔۔۔"

"میرا خیال ہے کہ چودھری عزیز کو کچھ ہوا ہے۔" تیمور نے سرگوشی کی۔

میں جھک کر چلتا ہوا اس کمرے کی طرف گیا جہاں چودھری عزیز کو رکھا گیا تھا۔۔۔۔ چودھری عزیز کی طرف جاتے ہوئے مجھے ایک کھڑکی کے سامنے سے گزرنا تھا۔ اس وقت یہ کھڑکی پوری طرح فائرنگ کی زد میں تھی۔ کھڑکی کی آہنی سلاخوں سے مسلسل پگھلا ہوا لوہا ٹکرا رہا تھا اور چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ تیمور نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں کہنیوں اور پیٹ کے بل رینگتا ہوا یہ سات آٹھ فٹ کا نہایت خطرناک فاصلہ طے کر گیا۔

میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ چودھری عزیز اوندھا پڑا تھا۔ گولی اس کی کھوپڑی توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ بائیں طرف سے گولی جہاں سے داخل ہوئی تھی معمولی سا سوراخ تھا مگر دائیں جانب سر میں ایک بڑا روشن دان بن گیا تھا۔ چودھری کے خون سے وہ سارے نوٹ بھیگ گئے تھے جو کچھ دیر پہلے اس نے بڑی مکاری سے مجھے "رخصتِ سفر" کے طور پر دینے چاہیے تھے۔ میں سکتے میں رہ گیا۔

میواتی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پیلی پڑ رہی تھیں۔ "یہ کیا ہو گیا جی۔ ایک منٹ میں ہمارے سامنے سب کچھ ختم ہو گیا۔"

"اگلے منٹ میں تم بھی ختم ہو جاؤ گے۔ اپنا سر نیچے رکھو۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

دو گولیاں سنسناتی ہوئی میواتی کے پاس سے گزریں اور وہ تقریباً سجدے کی حالت میں چلا گیا۔

تیمور بھی فوجی انداز میں کہنیوں کے بل رینگتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ چودھری عزیز کی خون اگلتی لاش دیکھ کر اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ "او خدایا! مر گیا یہ۔۔۔۔۔ اب کیا ہو گا؟" اس نے جیسے خود ہی سے پوچھا۔

فائرنگ کچھ دیر کے لئے تھم سی گئی۔ اندازہ ہوا کہ قبرستان کے اندر پولیس والوں کی پیش قدمی نہیں ہو سکی۔ درحقیقت سراج کو گولی لگنے کے بعد شاہنواز اور اس کے ساتھیوں نے بے دریغ سیدھی فائرنگ کی تھی۔ اس اندھادھند فائرنگ نے پولیس فورس کو محتاط ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

میری رائفل کا چوبیس گولی والا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ میں نے نیا میگزین رائفل سے اٹیچ کیا۔ اس دوران میں میری نگاہ مسلسل چودھری عزیز کی لاش کا جائزہ لیتی رہی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ابھی تک بندھے ہوئے تھے۔ چہرے پر نیل تھے اور چوٹوں کے نشان تھے۔ یہ سب اس مارپیٹ کا نتیجہ تھا جو تیمور نے اس سے کی تھی اور جس کے نتیجے میں چودھری اپنی زبان کا تالا کھولنے پر آمادہ ہوا تھا۔ اب وہ یوں پڑا تھا جیسے کبھی زندہ ہی نہیں تھا۔ زیادہ کی ہوس نے اسے زندگی سے ہی محروم کر دیا۔ وہ اپنے ساڑھے تیرہ مربعے کے چکر میں اپنی سانسوں سے ہی محروم ہو گیا تھا۔ اب وہ ساڑھے تیرہ مربعے اور زیورات اور انعامی بانڈوں سے بھری ہوئی دو تجوریاں، پانچ ٹیوب ویل دو طویلے اور نہ جانے کیا کچھ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا وہ سب کچھ اس کے لئے بے کار تھا۔ اب وہ چند گز لٹھے اور دو گز زمین کے سوا کسی شے کا حق دار نہیں

تھا۔ میں نے اس شخص پر اعتماد کیا تھا۔ اس نے میرے بے مثال اعتماد کو توڑا تھا اور اس کے علاوہ بھی اس نے اپنی مکاری سے نہ جانے کیا کیا توڑا اور برباد کیا تھا۔ اس نے اپنا کینہ، کسی قیمتی شے کی طرح اپنے دل میں رکھا تھا۔ آج اس شخص کی ساری سیاہ کاریوں کا حساب اس کمرے کے کچے فرش پر چکتا ہو گیا تھا۔ خون پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ گردن کا اکڑاؤ ایک حسرت ناک ڈھیلے پن میں بدل گیا تھا۔

اچانک میرا دھیان اس ٹیپ کی طرف چلا گیا جس پر ہم تھوڑی دیر پہلے چودھری کی آواز ریکارڈ کر رہے تھے۔ یہ ٹیپ ریکارڈر ہم نے چودھری کے اس ہی ایک کمبل کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ میں لپک کر کمبل تک پہنچا لیکن کمبل کے نیچے کچھ نہیں تھا۔ ٹیپ ریکارڈر وہاں سے اٹھایا جا چکا تھا۔

میں نے رونق علی کو آواز دی۔ "رونق بھائی! کہاں ہو۔"

جواب نہیں آیا۔ رونق کے بجائے شاہنواز نے دوسرے کمرے سے پوچھا۔ "کیا بات ہے خاورے؟"

"ٹیپ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں پتا۔" شاہنواز نے بھی پکار کر جواب دیا۔

"اور رونق بھائی؟"

"اس کا بھی نہیں پتا۔"

میواتی نے کانپتے لہجے میں کہا۔ "ہمار کا خیال ہے کہ ٹیپ ریکارڈر رونق بھائی کے پاس تھا۔ وہ اس کو لے کر جھاڑیوں کی طرف جاوت تھے۔"

"پھر؟"

"ہم۔۔۔۔۔ ہمار کو ٹھیک سے معلوم نہیں جی۔ ہمار کو لگتا ہے کہ ان کو۔۔۔۔۔ ہمار کا مطلب ہے کہ ان کو۔۔۔۔۔ گگ۔۔۔۔۔ گولی لگ گئی ہے۔ یا پھر وہ پکڑت گئے ہیں۔"

"کیا بکتے ہو؟" میں دہاڑا

"وہ سروع (شروع) میں ایک دم جھاڑیوں کے اندر جو پھائر نگ ہوئی تھی وہ چودھری رونق پر کی گئی تھی۔ ساتھ میں ایک اور بندہ تھا۔ ہمار کو نہیں معلوم اس کا کیا بنا۔"

جو خبر بھی مل رہی تھی، بد سے بد تر مل رہی تھی۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ چودھری عزیز کی لاش سامنے پڑی تھی اور ٹیپ ریکارڈ میں ہم نے اس کا جو اقبالی بیان محفوظ کیا تھا اور وہ شاید میاں وارث کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

تیمور نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "اگر رونق بھائی پکڑا گیا ہے تو پھر شاید پولیس کیکراں والی بھی جا پہنچے گی اور اگر وہاں پہنچی تو پھر ہمارا آخری آسرا بھی ختم ہو جائے گا۔"

میں تیمور کا اشارہ سمجھ رہا تھا۔ وہ چودھری کے ہرکارے انورے کی بات کر رہا تھا۔ اب آجا کے انورا ہی رہ گیا تھا جس کا اقبالی بیان ہمیں شہوار اور ثمینہ کے قتل سے بری الذمہ کر سکتا تھا یا ایسا کرنے میں ہماری مدد کر سکتا تھا لیکن ابھی میں ٹیپ ریکارڈر کی طرف سے بھی پوری طرح مایوس نہیں ہوا تھا اور یہ ٹیپ ریکارڈر ایک ایسا ثبوت تھا جس کو بڑی سے بڑی عدالت بھی جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ ان دنوں عدالتوں میں ایسے مواد کی اہمیت آج سے بہت زیادہ تھی۔

شروع میں جنتر کی گھنی جھاڑیوں کی طرف پولیس نے اندھا دھند فائرنگ کی تھی۔ یہ جھاڑیاں ہمارے دائیں طرف تھیں۔ سورج نکلتے ہی چاروں طرف ہلکی دھند پھیل گئی تھی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اور دس پندرہ قدم سے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ صورتِ حال ہمارے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر رونق علی واقعی ان جھاڑیوں کی طرف گیا تھا اور پکڑا نہیں گیا تھا بلکہ زخمی ہوا تھا تو پھر عین ممکن تھا کہ وہ ابھی تک ٹیپ ریکارڈر سمیت وہیں موجود ہو۔

میں نے تیمور سے کہا۔ "تم یہیں رکو، میں ابھی آتا ہوں۔"

"کیا ارادہ ہے؟" اس نے مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا۔

"یار! اس وقت ہیڈ ماسٹر بننے کی کوشش نہ کرنا۔ میں جو کرنا چاہتا ہوں، مجھے کرنے دو۔" میں نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔ اور پیٹ کے بل رینگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

میں بھی ساتھ آؤں؟" تیمور نے آخری حربہ استعمال کیا۔

"نہیں، تم یہاں رک کر اکا دکا فائر کرو ورنہ پولیس والے آگے آجائیں گے۔ کوشش کرنا کسی کو گولی نہ لگے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"یار! مجھے نہیں لگتا کہ رونق بھائی وہاں ہو گا۔" تیمور نے کہا۔ تیمور کی سنی ان سنی کر کے میں آگے بڑھا۔ قبروں کے درمیان میں پیٹ کے بل رینگ رہا تھا۔ دھند اور اوس کے سبب

زمین گیلی تھی اور گیلاہٹ سینے کے راستے پورے جسم میں سرایت کر رہی تھی۔ پولیس اہلکار چاروں طرف موجود تھے مگر دکھائی نہیں دیتے تھے۔ بس ان کی مدھم آوازیں ہی وقفے وقفے سے کانوں تک پہنچتی تھیں۔ وہ غالباً اپنی پوزیشنیں بہتر کر رہے تھے۔ ان کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ کسی طرح کی رعایت نہیں دیں گے۔

شدید خطرہ مول لے کر میں ان گھنی جھاڑیوں تک پہنچ گیا جہاں رونق علی کو آخری بار دیکھا گیا تھا۔ ٹھنڈی زمین پر اوندھے لیٹے لیٹے میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ رونق نظر نہیں آیا۔ نہ ہی کہیں ٹیپ ریکارڈر کے آثار تھے۔ پھر ایک چیز نے میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑا دی۔ یہ خون کے دھبے زمین پر اور ارد گرد کی شاخوں پر نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ گیلی زمین پر کسی کو گھسیٹے جانے کا واضح نشان تھا۔ تو کیا رونق علی کو ٹیپ ریکارڈر سمیت زخمی حالت میں پکڑ لیا گیا تھا؟ آثار سے تو یہی نظر آ رہا تھا مگر۔۔۔۔ صورتِ حال مختلف بھی ہو سکتی تھی یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ خون کے دھبے رونق کے بجائے اس دوسرے بندے کے ہوں جو اس کے ساتھ بھاگا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

جھاڑیوں میں ایک جگہ کوئی سیاہی مائل شے نظر آئی۔ میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ یہ ٹیپ ریکارڈ بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے حوصلہ جمع کیا اور پیٹ کے بل رینگتا ہوا مزید آگے کی طرف گیا۔ پولیس والوں سے میرا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ تب میں ان کے ہتھیاروں کی کھڑ کھڑاہٹ بھی سن سکتا تھا۔ میری حسیں پوری طرح بیدار تھیں اور میں ہر خطرے سے نمٹنے کے لئے سو فیصد تیار تھا۔ قریباً سات آٹھ میٹر آگے جانے کے بعد میں اس شے کو ٹھیک سے دیکھنے کے قابل ہوا۔ اس شے کو پہچان کر مایوسی کا اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا۔ یہ ٹیپ ریکارڈر نہیں تھا۔ کالے رنگ کی شال تھی اور میں اس شال کو بہ آسانی پہچان گیا۔۔۔۔ یہ رونق علی ہی کی تھی۔۔۔۔ اس مطلب تھا کہ وہ ٹیپ ریکارڈر سمیت پکڑا جا چکا ہے یا پھر ویسے ہی "پار ہو گیا ہے۔

شاید اس نے بھاگ کر غلطی کی تھی۔ وہ بیمار تھا اور اپنے موٹاپے کے سبب زیادہ تیزی سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لئے ممکن نہیں تھا کہ پولیس والوں کو چکما دے کر نکل جاتا۔ دکھ کی ایک گہری لہر نے میرے پورے سراپا کو جکڑ لیا۔

اور یہی وقت تھا جب مجھے اپنی بائیں جانب حرکت کا احساس ہوا۔ میں نے تیزی سے پلٹا کھا کر اپنی جگہ چھوڑی۔ ایک شخص اڑتا ہوا سا میرے پہلو میں گرا۔ یہ ایک نہایت تنومند باوردی پولیس اہلکار تھا۔ میں نے رائفل کے دستے سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگائی۔ اس کی ٹوپی اچھل کر دور جا گری۔ ایک دوسرے اہلکار نے دائیں طرف کی جھاڑیوں سے اپنی جھلک دکھائی۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ "خبردار"۔۔۔۔۔ وہ چنگھاڑا ابھی بس یہی لفظ اس کے منہ سے نکلا تھا کہ میں نے اس کی رائفل کا بیرل پکڑ کر اوپر اٹھا دیا اور سر کی بھرپور ضرب اس کے سینے پر رسید کی۔ وہ اوغ کی آواز نکالتا ہوا ایک شکستہ قبر پر گرا۔ ایک سفید پوش اہلکار سامنے سے جھپٹا۔ جھپٹنے کے ساتھ ساتھ وہ ہولسٹر میں سے اپنا ریوالور برآمد کر رہا تھا۔ ابھی وہ مجھ سے آٹھ دس قدم دور ہی تھا کہ یکایک لڑکھڑا گیا۔ اس کی ایک ٹانگ ران کے بالائی سرے تک ایک کھلی قبر میں دھنس گئی تھی۔ اس سنہری موقعے سے فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر رائفل کی شدید ضرب سفید پوش کی کلائی پر لگائی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہوا میں اڑتا دکھائی دیا۔ اس نے قبر سے نکلنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں اس کی دوسری ٹانگ بھی اندر چلی گئی۔

"میاں جی۔۔۔۔۔ میاں جی۔۔۔۔۔" وہ گلے کی پوری طاقت سے چلایا۔

میں واپس پلٹا۔۔۔۔۔ ذہن میں زلزلہ سا برپا تھا۔ میرے اندر سوال ابھرا۔۔۔۔۔ "کیا یہ قدرت کی طرف سے اشارہ ہے کہ میں یہاں سے بھاگنے کی ایک بھرپور کوشش کروں؟"

میں حتی الامکان حد تک جھک کر مخالف سمت میں دوڑا۔ روشنی پھیل چکی تھی لیکن گاڑھی سفید دھند نے نظر کا راستہ مسدود کیا ہوا تھا۔ رونق علی ایسی دھند کو سفید اندھیرا کہا کرتا تھا۔

"دیکھو۔۔۔۔۔ کوئی حرامی جانے نہ پائے۔" انسپکٹر میاں وارث کی کڑکتی ہوئی آواز مجھے قبرستان کے مشرقی کنارے سے سنائی دی۔ اس کے ساتھ کچھ قاتل گولیاں سیٹیاں بجاتی میرے دائیں بائیں سے گزر گئیں۔ گولی کا بوسہ تو ظالم ہوتا ہی ہے اس کا آس پاس سے گزر جانا بھی کوئی کم آفت نہیں ہوتا۔

میں اوندھے منہ گر گیا۔ چند فٹ کرالنگ کرنے کے بعد پھر اٹھا اور جھک کر بھاگتا ہوا قبرستان کی چار فٹ اونچی کچی دیوار تک پہنچ گیا۔ اس دیوار کو میں نے جست لگا کر پار کیا۔ یہ جست بالکل ویسی ہی تھی جیسی پیراک پانی میں کودتے ہوئے لگاتا ہے۔ میں جھاڑیوں کے درمیان اگی ہوئی لمبی گھاس میں گرا۔ ایک قریباً ساڑھے چھ فٹ لمبا ہیڈ کانسٹیبل بڑے غضب سے مجھ

پر جھپٹا۔ میرے جسم میں جیسے بجلی بھری گئی تھی۔ میں نے کانسٹیبل پر چھلانگ لگائی اور اسے اپنے ساتھ لیتا بیس پچیس فٹ نشیب میں لڑھک گیا۔۔۔۔اور یہاں سرکنڈے تھے۔ سرکنڈے جو ہمیشہ سے چھپنے والوں کو پناہ فراہم کرتے رہے ہیں۔ کوئی بھی چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا جاندار ہو۔ سرکنڈا اسے اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔۔۔۔یہ خودرو پودا بعض اوقات پندرہ سولہ فٹ تک لمبا ہوتا ہے۔۔۔۔عام طور پر یہ ہر وقت لہلہاتا رہتا ہے۔اس کے اندر چھپنے اور بھاگنے والے کی حرکت کو نوٹ کرنا آسان نہیں ہوتا۔

سرکنڈوں میں گرنے کے بعد میں نے ہیڈ کانسٹیبل کی شکل دیکھی تو ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ یہ وہی خبیث تھا جو چند روز پہلے میرا دھکا کھا کر کنوئیں میں گرا تھا۔اس کے کنوئیں میں گرنے کے بعد میں اور تیمور فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے کنوئیں میں گرنے کے بعد جو واویلا مچایا تھا۔ وہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ میں نے اس کے تھوبڑے پر ایک زوردار مکا رسید کرتے ہوئے کہا۔" مجھے لگتا ہے کہ تم نے میرے ہاتھوں سے ہی مرنا ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ چلا کر رہ گیا۔ میں نے رائفل کی نال اس کی گردن سے لگا دی اور اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا قبرستان کی مخالف سمت میں بڑھا۔ مجھے امید تھی کہ اب مجھ پر اندھا دھند گولی نہیں چلائی جائے گی۔

قبرستان کی طرف سے شور مچاتی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

"اس طرف گیا ہے۔"

"نہیں۔ ادھر ہے۔"

"سوچ کیا رہے ہو۔۔۔۔ گولی چلاؤ۔"

"نہیں نہیں۔۔۔۔۔رحمت اللہ بھی ساتھ ہے، گھیر کر پکڑو۔۔۔۔"آخر میں گالیاں تھیں۔ رونق کی موت کے خیال نے میرے اندر انگارے بھر دیئے تھے۔ جی چاہ رہا تھا ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ دوں۔ پولیس والوں پر سیدھی فائرنگ کروں۔ انہیں مارتا کاٹتا ہوا یہاں سے نکل جاؤں یا پھر ان سرکنڈوں کے اندر ہی ختم ہو جاؤں۔

میرے انداز نے رحمت اللہ کو مسمرائز سا کر دیا تھا۔ وہ گن پوائنٹ پر بے چون وچرا میرے ساتھ چلا آرہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کی اونی جرسی کے گریبان میں تھا۔ یہ سرکنڈے بہت آگے تک چلے گئے تھے۔ شاید اگر میں چاہتا تو دو تین فرلانگ تک ان سرکنڈوں کے اندر ہی چل سکتا تھا۔

ایک جگہ زمین بہت دلدلی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل پھسل کر پہلو کے بل گر گیا۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور رائفل کے وزنی دستے کی دو طوفانی ضربیں اس کے سر اور گردن پر لگائیں۔ گردن پر لگنے والی ضرب زیادہ کارآمد ثابت ہوئی۔ ہیڈ کانسٹیبل رحمت اللہ قریباً بے سدھ ہو گیا۔ میں نے جلدی سے اس کی جرسی اور قمیض اتاری۔۔۔۔ اور خود پہن لی۔ پتلون اتارنے کا وقت نہیں تھا۔ موت کے ہرکارے تیزی سے میرے قریب آرہے تھے۔ رحمت اللہ کی سرکاری ٹوپی سر پر رکھنے کے بعد میں ایک بار پھر آگے بڑھا۔ گہری دھند معاون ثابت ہو رہی تھی۔ لیکن یہی گہری دھند دشمن بھی ثابت ہوئی۔ کوئی جانور تیزی سے میری طرف بڑھا۔ میں اسے تب دیکھ سکا جب وہ مجھ سے صرف آٹھ دس قدم کی دوری پر تھا شروع میں، میں نے اسے کتا سمجھا لیکن وہ جنگلی سور تھا بلکہ سورنی تھی۔ جنگلی سورنی اپنے بچوں کے ہمراہ

زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ وہ تیر کی طرح میری طرف آئی۔ میں نے فقط دو تین فٹ کے فاصلے سے اس پر فائر کیا۔ گولی اس کی قاتل تھوتھنی میں لگی۔ وہ لہرا کر گری۔ اس کے عقب میں اس کے بچے تھے۔ میں نے بچوں کو تو دیکھا لیکن دھند اور سرکنڈوں کی وجہ سے اس نر کو نہ دیکھ سکا، جس نے بائیں پہلو سے حملہ کیا۔ یہ عین یہی لگا جیسے کسی نے ہتھوڑے سے میرے کولہے پر ضرب لگائی ہو۔ چند سال پہلے مجھے پاشا کے بنگالی شیر نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا تھا جتنا اس خبیث جانور نے پہنچا دیا۔ میں کئی فٹ دور بدبودار پانی کے ایک گڑھے میں گرا۔ چند لمحے کے لئے رائفل بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر نکل سکتا مجھے اپنی تین اطراف سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔

"اس طرف گیا ہے۔۔۔۔ اس طرف ہے۔" یہ چنگھاڑتی ہوئی آواز میاں وارث کی تھی پھر کسی نے مجھے دیکھ لیا اور للکارا۔ "خبردار اوئے۔ گولی مار دیں گے۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔۔۔۔ بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کم از کم چار رائفلیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ابھی مزید اہلکار آرہے تھے۔ نر سور مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچا کر اوجھل ہو چکا تھا۔

اب مزاحمت کا مطلب خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے بھیگی ہوئی کیچڑ آلود رائفل ایک طرف پھینک دی۔ مجھے گریبان سے پکڑ کر گڑھے سے باہر کھینچا گیا اور تلاشی لی گئی۔ میاں وارث کا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ اس نے میرے بالائی جسم پر رحمت کے کپڑے دیکھ لئے تھے۔ "رحمت اللہ کہاں ہے؟ وارث نے مجھے سر کے بالوں سے جکڑ کر پوچھا۔

میں نے عقب میں سرکنڈوں کی طرف اشارہ کیا۔

"مار دیا ہے اس کو بھی؟" وارث نے میرے سر کو وحشیانہ جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔

نہیں۔ وہ صرف بے ہوش ہے۔"

میری ران کا چند دن پرانا زخم پھر خون اگلنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ جہاں جنگلی سور کی خوفناک ٹکر لگی تھی وہاں بھی زخم ہو گیا تھا اور مسلسل خون رس رہا تھا۔

میری تلاشی لینے کے بعد پولیس اہلکاروں نے مجھے بے دردی سے رائفلوں کے ہٹ مارے اور گالیوں کی بوچھاڑ کی۔ پھر رحمت اللہ کی قمیص ٹوپی اور جرسی میرے جسم سے علیحدہ کر لی

گئی۔ مجھے یخ بستہ زمین پر اوندھا لٹایا گیا اور میرے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی سے جکڑ دیئے گئے۔ اب تک کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا جب مجھے باقاعدہ ہتھکڑی لگی۔

پولیس اہلکار مجھے دھکیلتے اور گاہے بہ گاہے رائفل کے بٹ مارتے ہوئے قبرستان کی طرف لے چلے۔ جس سورنی کو میری گولی لگی، وہ اپنے ہی خون میں لت پت تھی اور ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ نیم بے ہوش رحمت اللہ کو اٹھا کر سرکنڈوں سے باہر لے جایا جا رہا تھا۔

سرکنڈوں سے باہر لے جا کر مجھے ایک بند جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ تین رائفل بردار میرے ارد گرد بالکل چوکس تھے۔ ان کی آنکھوں میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ پاس ہی ایک دوسری جیپ کھڑی تھی۔ یہ چھت کے بغیر تھی۔ اس میں پولیس کی آہنی ٹوپیوں، رائفلوں اور ایمونیشن کی چوٹی پیٹیوں کے ساتھ ساتھ مجھے وہ ٹیپ ریکارڈر بھی نظر آیا جو رونق علی سے چھینا گیا تھا۔ ایک مسلح حوالدار ٹیپ ریکارڈر کے پاس موجود تھا۔ میرا اور ٹیپ ریکارڈر کا فاصلہ بمشکل تیس فٹ ہو گا لیکن اب یہ ناقابلِ عبور فاصلہ بن چکا تھا۔ ایک اور لرزہ خیز منظر دو لاشوں کا تھا۔ یہ لاشیں زمین پر پڑی تھیں اور ان پر کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ خون کے دھبے کپڑے

پر بھی نظر آرہے تھے۔ان میں سے ایک لاش کافی فربہ تھی۔میرا دل رونق کے خیال سے کٹ کر رہ گیا۔

میاں وارث نے مجھ پر ایک قہرناک نظر ڈالی۔۔۔۔اور اپنے اہلکاروں سے مخاطب ہو کر بولا۔"میں آرہا ہوں پانچ منٹ میں۔۔۔۔بالکل چوکس بیٹھو۔۔۔۔تمہیں پتا ہی ہے یہ نویں زمانے کا شیر شاہ سوری ہے۔

بے فکر رہیں جناب اس کی ساری شیر شاہی ناک کے راستے نکال دیں گے۔یہ بلی کی میاؤں میاؤں نہ کرے پھر ہم آپ کے نوکر تو نہ ہوئے۔"ایک لمبے تڑنگے اے ایس آئی نے بھاری مونچھوں پر ہاتھ پھر کر کہا۔

ایک ہیڈ کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر میری ہتھکڑی چیک کی اور اطمینان سے سر ہلایا۔

میاں وارث کے قبرستان کی طرف جانے کے بعد ایک بار پھر فائرنگ میں تیزی آگئی۔یہ تیزی چار پانچ منٹ تک برقرار رہی۔پھر خاموشی چھاگئی۔پولیس والے اب قبرستان میں کچھ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اور آگے چلے گئے تھے۔انہوں نے شاہ نواز کے ایک زخمی ساتھی کو پکڑ لیا تھا اور اسے کھینچتے ہوئے جیپوں کی طرف لا رہے تھے۔دو افراد اس سے پہلے پکڑے جا چکے تھے۔

کچھ دیر بعد میاں وارث واپس آیا تو میں نے اس سے کہا۔"اگر تم کہو تو میں اندر موجود لوگوں سے بات کرتا ہوں۔وہ لڑنا نہیں چاہتے۔وہ گرفتاری دینا چاہتے ہیں۔بس انہیں ڈر ہے کہ۔۔۔۔"

میرا فقرہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ میاں وارث نے ہاتھ گھمایا اور الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ میرے چہرے پر لگا۔میں نشست پر ہی ایک طرف کو جھک گیا۔منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا۔وارث دہاڑا۔"ہمیں کسی کتے سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔"

پھر اس نے اپنے ساتھی ایس آئی کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور اچھل کر جیپ میں بیٹھ گیا۔چند ہی لمحے بعد جیپ کچے راستے پر دھول اڑاتی تیزی سے سرکنڈوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔قبرستان میں ہونے والی فائرنگ کی آوازیں پیچھے جا رہی تھیں۔سردیوں کی کمزور دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر چمک رہی تھی۔گہری دھند مسلسل اس دھوپ کا راستہ

روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا بالائی جسم عریاں تھا، ہوا برچھیوں کی طرح جسم پر لگ رہی تھی۔ کولہے کی چوٹ تکلیف دے رہی تھی۔

"کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟" میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ "گھبرا مت، جہاں بھی لے جائیں گے وہ جگہ تیری شان کے مطابق ہو گی۔" میاں وارث نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "آخر تو کوئی معمولی بندہ نہیں ہے۔ اپنی ہوشیاریوں کی وجہ سے بہت بڑا چودھری بن چکا ہے۔ بڑی اونچی پگ ہے تیرے سر پر اور پھر تو ایک بہت بڑے خاندان کا جوائی بھی تو ہے۔ ہم نے تجھ سے کوئی گستاخی کر کے اپنے پیٹوں پر لات تھوڑی مارنی ہے۔ پوری پوری عزت دیں گے تجھے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ جیپ ہوا میں اڑتی رہی۔ ابھی دن کی عام چہل پہل شروع نہیں ہوئی تھی۔ اکثر راستے سنسان تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے کسی قریبی تھانے یا چوکی میں لے جایا جا رہا ہے۔ وہاں جا کر کیا ہو گا؟ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔۔۔۔ لیکن اگلے آدھ گھنٹے میں جو کچھ ہوا وہ میری توقع کے بالکل برخلاف تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

پولیس کی جیپ درختوں کے ایک ویران جھنڈ میں رکی۔ یہاں ایک نیلی ڈاٹسن کار موجود تھی۔ کار پر گوجرانوالہ کا نمبر تھا۔ اس کے شیشے رنگ دار تھے۔ قریب ہی دو مسلح دیہاتی موجود تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے ان میں سے کم از کم ایک بندے کو کہیں دیکھا ہوا ہے۔ مجھے کھینچ تان کر پولیس جیپ سے اتارا گیا اور کار میں سوار کر دیا گیا۔ لیکن کار میں سوار کرنے سے پہلے میری جوتی اتروا لی گئی۔ اس کے علاوہ مجھے ایک کچے راستے پر تھوڑا چلایا بھی گیا۔ ان دونوں "حرکات" کی وجہ چند گھنٹے بعد میری سمجھ میں آئی۔

کار میں سوار ہونے کے فوراً بعد مجھے کچھ اندازہ ہو گیا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کار نے تیزی کے ساتھ سفر کیا۔ کار کے اندر مکمل خاموشی اور شدید تناؤ تھا۔ ایک سفید پوش پولیس اہلکار بھی کار میں موجود تھا۔

میں نے ایک بار پھر پوچھا۔ "کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟"

وہ اطمینان سے بولا۔ "ڈسکے۔۔۔۔ وہاں تمہیں سیخ کباب اور تکے وغیرہ کھلائیں گے۔"

"لیکن یہ راستہ تو قلعہ والا کو جاتا ہے۔"

پولیس والے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "دراصل تمہیں اپنی بیوی سے محبت ہی اتنی تھی کہ ہر راستہ تمہیں اپنے سسرال کا راستہ لگتا ہے۔ واہ! میاں بیوی میں سلوک ہو تو ایسا۔۔۔۔ یہ تو شکر کا مقام ہے کہ جوان جہان بیوی کی اچانک موت نے تمہیں دیوانہ نہیں کر دیا۔۔۔۔ ورنہ بہت سے لوگ تو ایسی موت کے بعد کسی کام کے نہیں رہتے۔"

اب قلعہ والا کی آبادی سامنے نظر آ رہی تھی۔ جلد ہی ہم آصف جاہ کی مشہور و معروف حویلی میں داخل ہوئے اور احاطے میں درختوں کے نیچے رک گئے۔ شکاری کتوں کی لرزہ خیز آوازیں ایک بار پھر میرے کانوں میں پڑنے لگی تھیں۔ یہ وہی سلوکی ہاونڈز تھے جن کی خون آشامی میں نے پانچ چھ دنوں پہلے دیکھی تھی۔ ان میں سے چار کتے تو میرے اور تیمور کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ اندازہ تھا کہ ان کتوں کی تعداد پھر پوری کر لی گئی ہو گی۔ یعنی اب وہ پھر آٹھ ہوں گے۔

مجھے گاڑی سے اتارا گیا اور کچھ دیر بعد ہی حویلی کے ایک شاندار اندرونی کمرے میں آصف جاہ کے روبرو تھا۔ اپنے ڈیل ڈول کی طرح آصف جاہ کا چہرہ بھی بہت بڑا اور دبنگ تھا لیکن اس

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وقت تو یہ چہرہ کچھ اور بھی دبنگ بلکہ ہولناک نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ نشے سے نقوش بگڑے ہوئے تھے۔ بیڑی کا دھواں اس کے ارد گرد پھیلا ہوا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب جنونی کیفیت ابھری۔ وہ اپنے کارندوں سے گرج کر بولا۔ "اوئے! کیا کرتے ہو؟ کیوں پکڑا ہوا ہے ان کو۔۔۔۔ پتا نہیں ہے۔ یہ اس حویلی کے جوائی ہیں۔ چھوڑ دو ان کو۔۔۔۔ پلنگ پر سفید کھیس بچھاؤ ان کے لئے۔"

مجھے فوراً چھوڑ دیا گیا۔ میرے ہاتھ بدستور میری پشت پر ہتھکڑی میں جکڑے رہے۔ ایک کارندہ جلدی سے گیا اور بالکل نیا نکور سفید کھیس لے آیا۔ کھیس پلنگ پر بچھا دیا گیا۔

"بیٹھو داماد جی۔" آصف جاہ نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ میں جھجکتا ہوا بیٹھ گیا۔

میرے پاؤں ابھی تک ننگے اور گرد میں لتھڑے ہوئے تھے۔ آصف جاہ نے کہا۔ "اوہو داماد جی! تمہارے پاؤں کا تو ستیاناس ہو رہا ہے۔" پھر وہ اپنے ملازموں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اوئے! دیکھتے کیا ہو۔ بیٹا جی کے پاؤں شاؤں دھلواؤ۔"

نہیں جی۔ آپ تکلیف نہ کریں میں خود دھو لیتا ہوں۔

نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم اس حویلی کے لئے عزت کی جگہ پر ہو۔ تمہاری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ یہاں کے ملازم تو تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیئیں تو بھی کم ہے۔ تم ان کی چھوٹی بی بی کے مجازی خدا ہو۔۔۔۔۔اور مجازی خدا تو پھر مجازی خدا ہی ہوتا ہے۔" آصف جاہ کے لہجے میں بے شمار زہر تھا۔

"دیکھیں آصف صاحب ! میں آپ سے اکیلے میں بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"او باتیں وغیرہ بھی ہوتی رہیں گی داماد جی۔۔۔۔ پہلے ذرا سانس تو لے لو۔ تھوڑا سا کھا پی لو۔ ہم لوگ جوائیوں کی خاطر میں کسی طرح کی کمی نہیں رہنے دیتے اور کمی رہنی بھی نہیں چاہئے۔ سچی بات یہ ہے کہ جوائی جو ہوتا ہے نہ اس کے ساتھ معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ جوائی کے ماتھے پر ذرا بل آجائے تو سمجھو بیٹی کے لئے بلکہ سارے گھرانے کے لئے خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ بیٹی کی شادی کے بعد اس کی غمی خوشی کا سارا اختیار جوائی کے پاس ہی چلا جاتا ہے اور جن کی بیٹیاں ذرا زیادہ لاڈلی ہوتی ہیں، ان کی جان تو ہر وقت جوائی اور جوائی کے گھر والوں کے شکنجے میں رہتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں آصف صاحب ! آپ کا غم بہت بڑا ہے۔ میں اسی بارے میں آپ سے ایک بالکل خاص بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو۔۔۔۔۔"

"یار جی ! پھر وہی بات کرتے جا رہے ہو۔ میں تمہیں بتا تو رہا ہوں کہ تسلی سے ساری بات کریں گے۔ بالکل بے فکر رہو۔"

اسی دوران میں دو لڑکیاں ایک پیتل کی پرات لے کر آ گئیں۔ ساتھ میں گرم پانی کے دو بڑے بڑے لوٹے تھے۔ جب میں پچھلی دفعہ والدہ کے ساتھ یہاں آیا تھا تو بھی رسم کے مطابق ملازماؤں نے والدہ کے پاؤں پرات میں رکھ کر دھوئے تھے۔ بعد ازاں میرے بہت انکار کے باوجود میرے پاؤں بھی دھوئے گئے تھے۔

اب پھر وہی عمل ہو رہا تھا۔ مگر اس مرتبہ اس عمل کے پیچھے میز بانی کے بجائے شدید قسم کا طنز اور طیش پوشیدہ تھا۔ آصف جاہ کے اصرار پر مجھے اپنے پاؤں پیتل کی پرات میں رکھنا پڑے۔ پاؤں واقعی گندے ہو رہے تھے۔ خوبرو ملازمہ نے پہلے اپنے ہاتھوں سے تھوڑی سی مٹی جھاڑی پھر گرم پانی والا لوٹا پاؤں کی طرف بڑھایا۔ ایک لحظہ پہلے مجھے احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ ملازمہ پلاسٹک کے لوٹے کو ٹونٹی کی طرف سے پکڑ

کر میرے پاؤں پر انڈیل چکی تھی۔ یہ تقریباً ابلتا ہوا پانی تھا۔ میں نے تڑپ کر پاؤں پیچھے ہٹا لئے۔ مگر تب تک پانی اپنا کام کر چکا تھا۔ پاؤں کی اوپر کی کھال کباب ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد کھال کا کافی حصہ اوپر سے اتر گیا۔

آصف جاہ نے چلا کر ملازمہ سے کہا۔ "او کڑیئے! یہ کیا کر دیا تو نے۔ خانہ خراب! تو نے دیکھا نہیں تھا پانی کو؟"

وہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ وہی کچھ کر رہی تھی جو اس سے کہا گیا تھا۔

آصف جاہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "چلو تم سب لوگ باہر جاؤ۔ یہ کیا مجمع لگا رکھا ہے یہاں۔" اس کا اشارہ فالتو ملازموں کی طرف تھا۔

وہ سب باہر چلے گئے۔ فقط آصف جاہ کے دو خاص الخاص کارندے وہاں رہ گئے۔ مجھے ان کے نام شیر افگن اور مولوی مظفر معلوم ہوئے تھے۔

آصف جاہ نے منہ سے چچ چچ کی آواز نکالی۔۔۔۔ اور بولا۔۔۔۔ "یہ ساری اس الو کی پٹھی کی غلطی ہے میں اسے الٹا لٹکواؤں گا۔" پھر اس نے اپنے بڑے سائز کے سفید رومال سے

میرے گیلے پاؤں کو پونچھا تو پاؤں کی بالائی کھال بھی رومال کے ساتھ لگ گئی۔ آصف جاہ نے ایک بار پھر چچ چچ کی آواز نکالی اور تاسف سے سر ہلایا۔

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ آصف جاہ صاحب! آپ مجھ سے جہاں اور جتنی بڑی قسم چاہیں لے لیں شہوار کے قتل میں۔۔۔۔ میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں نے تو۔۔۔۔"

"پتر جی! کہا تو ہے کہ تم سے ساری بات سنوں گا۔" آصف نے ایک بار پھر تیزی سے میری بات کاٹی۔ پھر دونوں کارندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "ان کو ذرا جا لینے دو پھر اپنے دکھڑے کہتے ہیں" اس کے بعد آصف جاہ نے میرے زخمی پاؤں پر برنال وغیرہ لگا کر پاؤں کی مرہم پٹی کروائی۔ یہاں پھر ایک قابل ذکر واقعہ ہوا۔ دونوں پاؤں پر پٹیاں باندھ کر انہیں آپس میں بھی ایک دوسرے سے باندھ دیا گیا۔ یعنی دونوں پاؤں جکڑ دیئے گئے۔ یہاں احتجاج کا موقع تھا اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ تھا۔

اسی دوران میں دو ملازم کھانا لے آئے۔ اب دوپہر ہونے والی تھی۔ میں نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔ اس کے باجود بھوک کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ ذہن مسلسل قبرستان کے معرکے میں الجھا ہوا ہے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ تیمور اور دیگر ساتھیوں کا کیا بنا ہے۔

کھانا بڑے اہتمام سے لایا گیا تھا۔ دو بڑے بڑے گول ٹرے تھے جن میں پھول دار خوان بچھے ہوئے تھے۔ گرم پلاؤ سے بھاپ اڑ رہی تھی۔ مختلف اقسام کے سالن تھے۔ ساتھ میں تلی ہوئی مچھلی کے بڑے بڑے ٹکڑے تھے۔ آصف جاہ بولا۔ "چلو، پہلے تھوڑی سی پیٹ پوجا کر لیں۔ میں نے بھی صبح بس تھوڑی سی شروائی ہی پی تھی۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ پاؤں کی جلن ناقابلِ برداشت تھی۔

"کھانا شروع کرو گے تو بھوک بھی لگ جائے گی داماد جی۔۔۔۔۔اور پھر مچھلی بھی ہے۔ یہ تو تمہاری پسندیدہ شے ہے۔ کوئی فارمی مچھلی نہیں ہے یہ۔۔۔۔۔فارمی مچھلی ہم ساری کتوں کو ڈال دیتے ہیں۔ یہ اصلی راوی دریا کی رہو ہے۔"

"اس وقت میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔"

"پتر جی! کیسی بات کرتے ہو، ایسی سردی میں تو تمہارے جیسے جوان جہاں بندے مچھلی پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور پھر سسرال میں تو مچھلی اور ککڑ بٹیر وغیرہ کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔" آصف جاہ کے لہجے کی تہ میں طنز آمیز نفرت کی آگ پھنکار رہی تھی۔

مجبوراً مجھے کھانے میں شریک ہونا پڑا۔ ذہن میں۔۔۔۔۔ان گنت اندیشے کلبلا رہے تھے۔ پتا نہیں تھا کہ آصف جاہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے جا رہا ہے۔ یہ کھانا جو میں کھا رہا تھا یہ بھی مشکوک تھا۔ اس کھانے کے بعد میں کسی طرح کی بے ہوشی یا موت کا شکار بھی ہو سکتا تھا۔ آصف جاہ مجھے اصرار کر کے کھانا کھلا رہا تھا۔ میری ہتھکڑی کھول دی گئی تھی تاہم مسلح محافظ کمرے کے اندر اور باہر موجود تھے۔ میرے پاؤں مسلسل مضحکہ خیز حالت میں بندھے ہوئے تھے۔ یہ حالت ایسی تھی کہ مجھے خود اپنے آپ پر ہی ترس آنا شروع ہو گیا تھا۔ جسم زخموں سے چور تھا۔ سرکنڈوں کا کیچڑ شلوار اور بالائی جسم پر خشک ہو چکا تھا اور مجھے اسی حالت میں بے حد اصرار کے ساتھ کھانا کھانے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

پیٹ بھر گیا تو میں نے ہاتھ ہٹا لیا اور اس وقت آصف جاہ نے اصل کھیل شروع کیا۔ وہ بڑی "محبت" سے بولا۔ "اور کھاؤ داماد جی! داماد جتنا زیادہ ٹھوس کر کھاتے ہیں سسرالیوں کا دل اتنا ہی باغ باغ ہو جاتا ہے۔ چلو کھاؤ شاباش۔"

میں سمجھ گیا کہ آصف جاہ بدترین ہتھکنڈوں پر اتر رہا ہے۔ اچانک دو افراد نے مجھے دائیں بائیں سے دبوچ لیا۔ تیسرے نے پستول نکال لیا اور زہرناک لہجے میں بولا۔

"کھاؤ جناب! بڑے لمبڑ صاحب اتنی محبت سے کہہ رہے ہیں۔"

"آصف صاحب! آپ بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں، بلکہ یہ دوہری غلطی ہے۔ایک طرف آپ مجھ بے گناہ کو مار دیں گے دوسری طرف میری بیوی اور آپ کی بیٹی کے اصل قاتل آپ کے سامنے دندناتے رہیں گے۔اصل قاتل چودھری عزیز تھا اور موکھل ہیں۔۔۔۔میں آپ کو پوری تفصیل سے بتادیتا ہوں اور ثبوت بھی دیتا ہوں۔۔۔۔اگر آپ۔۔۔۔"

میری بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ آصف جاہ نے کھڑے کھڑے زوردار ٹھوکر میرے منہ پر رسید کی۔ایک بار پھر منہ کے اندر خون کا ذائقہ گھل گیا۔آطف جاہ بے پناہ قہر سے دہاڑا۔"کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔مچھلی کھلاؤ اس کو۔۔۔۔آج جتنی بھی مچھلی ہے ساری اس کو کھانی ہے۔اس کے گلے تک مچھلی ٹھونس دو۔اگر ٹکڑا بھی بچا تو میں وہ ٹکڑا۔۔۔۔"وہ اتنے طیش میں تھا کہ اپنے ملازموں کے ساتھ بھی بدزبانی پر اتر آیا تھا۔

لمحوں میں میرے لیے جیسے قیامت برپا ہوگئی تھی۔میرے پاؤں بہ دستور سفید رنگ کی سوتی پٹی میں جکڑے ہوئے تھے۔شیر افگن اور مظفر نے مجھے دائیں بائیں سے دبوچ لیا۔ایک پہلوان نما کارندے نے میرے گلے میں مفلر ڈال کر پیچھے کی طرف کھینچا۔بے ساختہ میرا منہ

کھل گیا۔ایک شخص نے میری باچھوں میں ہاتھ دیا اور زبردستی مچھلی میرے منہ میں ٹھونسنے لگا۔وہ مچھلی پوری طرح میرے منہ میں نہیں گھسیڑ سکا۔کچھ میرے نتھوں میں چلی گئی۔کچھ اس نے میرے منہ پر مل دی۔ایک اور شخص نے میری باچھوں میں انگلیاں دے رکھی تھیں اور ساتھ ساتھ پھنکار رہا تھا۔"منہ کھولو چودھری صاحب۔۔۔۔منہ کھولو جی۔"

لگتا تھا کہ وہ وحشت کے عالم میں میری باچھیں چیر کر رکھ دے گا۔پس منظر میں کتوں کا شور تھا جو کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو جاتا تھا۔

اب یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہوتا جارہا تھا۔میرے لہو میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔میں نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر سر کی ایک زوردار ٹکر پہلوان نما شخص کی ناک پر رسید کی۔وہ اس زبردست حملے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا بلکہ شاید ان میں سے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔وہ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ مجھ پر پوری طرح حاوی ہو چکے ہیں۔پہلوان ٹکر کھا کر دور جا گرا۔مجھے زبردستی مچھلی کھلانے والے کے چہرے پر میرا طوفانی گھونسا لگا۔اس کا جبڑا چٹخنے کی مدھم آواز ابھری۔اپنے دونوں جڑے ہوئے پاؤں میں نے ایک تیسرے شخص کے سینے پر رسید کئے۔

اس کے بعد کچھ دیر کے لئے حویلی کے اس کمرے میں زلزلہ سا برپا ہو گیا۔ میں نے آصف جاہ کے کارندوں کو کار گر ضربیں لگائیں۔ انہوں نے کئی بار مجھے دبوچنا چاہا لیکن میں ہر بار مچھلی کی طرح تڑپ کر ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ میری سب سے بڑی مجبوری میرے بندھے ہوئے پاؤں تھے۔ اگر میرے پاؤں آزاد ہوتے تو شاید چند لمحوں میں لڑائی کا نقشہ بدل جاتا۔ تاہم میں اب بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہا تھا۔ بعد میں تو میرے ساتھ جو کچھ ہونا تھا وہ ہونا تھا لیکن اب میں دل کی بھڑاس پوری طرح نکال لینا چاہتا تھا۔ اور میں نے حقیقی معنوں میں لمبڑ آصف اور اس کے گماشتوں کو ہکا بکا کر دیا۔ ایسی خوفناک مزاحمت کی توقع ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

اب آصف جاہ کے ہاتھ میں پستول تھا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس پستول کا کیا کرے۔ وہ چلا رہا تھا۔

"مارو اس کو۔۔۔۔۔مارو۔"

لیکن مارنے والے تعداد میں کافی زیادہ ہونے کے باوجود بے بس ہو گئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے تھوبڑے لہولہان تھے۔ ان کی آنکھوں میں ناچتا ہوا خوف اس بات کا گواہ تھا کہ

میں نے اس چھت کے نیچے مزاحمت کا حق ادا کر دیا ہے۔ اسی دوران میں پھل کاٹنے والی وہ چھری میرے ہاتھ میں آ گئی جو کھانے کی خوبصورت گول ٹرے میں رکھی تھی۔ میں نے دیوانہ وار چھری چلا کر دو افراد کو زخمی کیا۔ پھر میں نے چھری سے اپنے پاؤں کو باہم جوڑنے والی پٹی کاٹنے کی کوشش کی۔ میری پہلی کوشش جزوری طور پر کامیاب ہوئی۔ اس سے پہلے کہ میں دوسری کوشش کرتا، عقب سے کوئی وزنی شے میرے سر سے ٹکرائی۔ میں پہلو کے بل گر گیا۔۔۔۔اس کے بعد۔۔۔آصف کے کارندوں نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ کالی بھڑوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے۔ چھری میرے ہاتھ سے چھین لی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ ایک بار پھر مجھے الٹی ہتھکڑی لگانے میں کامیاب ہو گئے۔

آصف جاہ کا پارہ جیسے آسمان کو چھو رہا تھا۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا کوئی تین میٹر لمبا کوڑا تھا۔

وہ خوفناک آواز میں بولا۔ "تو نے میری بچی کو جتنا تڑپایا ہے میں اس سے ہزار گنا زیادہ تڑپاؤں گا تجھے۔۔۔۔اور ساتھ ساتھ تیرے گھر والوں کو بھی۔ ایک ایک سے گن گن کر حساب لوں گا۔۔۔۔گن گن کر حساب لوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی کوڑا شائیں کی مخصوص آواز سے حرکت میں آیا اور میری ننگی کمر پر جیسے کسی نے دہکی ہوئی سلاخ رکھ دی۔

میں سینے کی پوری قوت سے چلایا۔ "آصف! میں نے تیری بچی کو نہیں مارا۔۔۔۔ میں نے نہیں مارا۔"

"تو نے مارا ہے کتے۔۔۔۔ طریقہ کوئی بھی ہو مگر اسے موت کے منہ تک تو نے ہی پہنچایا ہے۔"

اس نے مجھ پر کوڑوں کی بارش کر دی۔ کوڑے کی مار کوئی معمولی مار نہیں ہوتی۔۔۔۔ بندے کو ایذا پہنچانے کا یہ طریقہ ان گنت زمانوں سے یونہی اتنا مقبول نہیں ہے۔ کئی چوٹیں جسم کو سن کر دیتی ہیں، کئی کچھ دیر بعد اپنا اثر کھونے لگتی ہیں لیکن یہ کوڑا تو شاید بے ہوش یا نیم مردہ شخص کو بھی اذیت کا احساس دلانے میں کامیاب رہتا ہے۔

میں قالین پر ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہا اور آصف جاہ مجھے مارتا رہا۔ میں بہت ضبط کر رہا تھا مگر کسی وقت بے ساختہ چلانے پر مجبور بھی ہو جاتا تھا۔ آخر میری ہمت جواب دے گئی اور مجھ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

غشی کی یہ کیفیت پہلے بہت گہری تھی۔ پھر اس میں کچھ کمی واقع ہونے لگی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے دہکے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا گیا ہے۔ میرے تصور نے مجھے شہوار کی شبیہہ دکھائی۔ وہ سامنے ایک زرنگار سی کرسی پر بیٹھی تھی زرق برق کپڑوں میں وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔۔۔۔ شاید شام ہونے والی تھی۔ شہوار کی آنکھوں میں خوبصورت رنگ تھے۔ ہر نوبیاہتا دلہن کی طرح اس کے نینوں میں بھی ایک محبت کا بستر بچھا ہوا تھا۔ اس کی چوڑیاں کھنکھنا رہی تھیں۔ اس کے رخسار لو دے رہے تھے۔

لیکن پھر میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا کہ ایک دم شہوار کا چہرہ بجھ گیا ہے وہ اسی زرنگار کرسی پر بیٹھی رہی۔ کہنیوں سے لدی ہوئی اور تازہ پھولوں سے مہکی ہوئی۔۔۔۔ مگر اس کے لباس پر خون کے بڑے بڑے دھبے نمودار ہو گئے۔ وہ الوداعی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو حرکت دی۔ "خدا حافظ خاور۔۔۔۔ میں جا رہی ہوں، ہمارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔"

میں تصور ہی تصور میں اس کی طرف لپکا۔اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔"نہ جاؤ شہوار ۔۔۔۔۔واپس آجاؤ۔۔۔۔۔تم چلی گئیں تو لوگ مجھے گناہ گار ٹھہرائیں گے۔میری گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیں گے۔نہ جاؤ شہوار۔۔۔۔۔"

نہیں خاور۔۔۔۔۔میں نہیں رک سکتی۔میری سانسیں بس اتنی ہی تھیں۔"اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔پھر یہ آنکھیں بند ہونے لگیں۔

میرے تصور نے مجھ دکھایا۔آصف جاہ ایک جلاد کی صورت میرے سامنے کھڑا تھا۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں پتلیوں کی جگہ دو انگارے تھے۔قدیم زمانے کے جلادوں کی طرح اس کے ہاتھ میں ایک وزنی کٹار تھی۔میں آصف کی طرف متوجہ ہوا۔اس سے پکار کر کہا۔"آصف صاحب !دیکھ لو۔۔۔۔۔آپ کی بیٹی اور میری بیوی ابھی مری نہیں ہے۔اس کی کچھ سانسیں ابھی باقی ہیں۔اس سے پوچھ لو۔۔۔۔۔میں نے اس پر کوئی ظلم نہیں کیا۔میں نے اپنی طاقت اور ہمت کے مطابق اسے خوش رکھنے کی کوشش کی ہے۔اس کے غصے اور اس کی ناراضی کو بھی جھیلا ہے۔۔۔۔۔اور میں نے اسے مارا بھی نہیں ہے اسے مارنے والے کوئی اور ہیں۔۔۔۔۔پوچھ لو اس سے۔۔۔۔۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

آصف جاہ کی آنکھوں کے انگارے اور زیادہ دہکنے لگے۔۔۔۔۔میں نے مڑ کر دیکھا تو شہوار مردہ نظر آئی۔۔۔۔۔

غشی کی یہ کیفیت نہ جانے کتنی طویل تھی تاہم اس کیفیت میں آہستہ آہستہ کمی واقع ہو رہی تھی۔اب مجھے ارد گرد کی مدھم آوازیں کسی دور افتادہ بازگشت کی طرح سنائی دینے لگی تھیں۔حویلی کے کسی حصے میں خونخوار تھو تھنیوں والے سلو کی ہاؤنڈز شور مچا رہے تھے۔پھر میرے کانوں میں آصف جاہ کی آواز پڑی۔۔۔۔۔وہ شاید مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔"ہاں، کیا پتا چلا؟"اس کی گونج دار آواز ابھری۔

جواب میں شاید مظفر نے کہا۔"چودھری خاور کی ماں بہن کا پتا چل گیا جی۔وہ دونوں کیکراں والی گاؤں میں ہیں۔۔۔۔۔یہ بیگم بلقیس کی خالہ زاد کا گھر ہے جی۔۔۔۔۔"

"پوری طرح تصدیق کر لی ہے تم نے؟"آصف جاہ کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

"بالکل لمبڑ دار جی۔"

"ان دونوں عورتوں کو یہاں لانے کے لیے تمہیں کتنا وقت چاہئیے؟"لمبڑ دار آصف جاہ نے پوچھا۔

"میں تو انہیں دو تین گھنٹوں میں یہاں لا سکتا ہوں جی۔۔۔۔۔پر مسئلہ اور ہے۔"

"کیا مسئلہ؟" آصف جاہ پھنکارا۔

"جاگیر کی بیگم جی سامنے آگئی ہیں۔ انہوں نے علی الاعلان کہہ دیا ہے کہ وہ چودھری خاور کی والدہ اور بہن کی ہر طرح حفاظت کریں گی۔ انہوں نے اپنے گارڈز اور کوئی ایک سو گھڑ سوار فوری طور پر کیکراں والی بھیج دیئے ہیں۔ اب وہاں سے ان دونوں عورتوں کو لانا آسان نہیں ہے۔"

"یہ تھانے دار وارث کس مرض کی دوا ہے؟"

"وارث صاحب بھی کچھ آگے پیچھے ہو رہے ہیں جی۔ ظاہر ہے کہ وہ بیگم جی سے پوری طرح بگاڑ تو نہیں سکتا۔ دوسرے اس نے بیگم جی اور چودھری عزیز سے کچھ پیسا بھی کھایا ہوا ہے۔"

یہ آوازیں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اتر رہی تھیں۔ آصف جاہ کا انتقام اب مجھ سے آگے میری والدہ اور بہن تک پہنچ رہا تھا۔ تو پھر کیا ایسی زندگی سے موت بہتر نہیں؟ میرا دل چاہا ایک بار پھر تڑپ پھڑک کر اس جال سے نکلنے کی کوشش کروں یا اس جال

کو توڑ دوں یا یہیں پر زندگی ہار جاؤں۔ باگو بھی تو مر گیا تھا۔ چودھری نشاط اور رونق علی بھی تو زندگی ہار گئے تھے۔ زندگی سے بھرپور جواں سال شہوار بھی چلی گئی تھی۔ دنیا میں آنے اور جانے کا سلسلہ تو ایسے ہی چلتا رہتا ہے۔ کسی ایک کے آنے یا جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

میرے چہرے اور سینے پر پانی کے چھینٹے دیے گئے۔ یخ بستہ پانی کے سبب جلد ہی میرے حواس بحال ہونے لگے۔ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں تھے۔ ہتھکڑی کی سختی میری زخمی کلائیوں کو مزید زخمی کر رہی تھی۔ میرے پاؤں کو اب بینڈج والی پٹی کی بجائے رسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ کوڑے کی مار سے میرا پورا جسم جل رہا تھا۔ میں قالین پر پہلو کے بل پڑا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ کمرے میں میرے اور آصف جاہ کے سوا کوئی نہیں۔ آصف جاہ رنگین پایوں والی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ اس کی اونچی نوک والی چمکیلی جوتی کا رخ میری طرف تھا۔ اس نے گلاس سے شراب کا گھونٹ بھرا پھر بیڑی کا ایک طویل کش لے کر بولا۔

"تجھے پتا ہے کہ اس صندوق میں کیا ہے؟"

آصف جاہ کے سامنے قالین پر ایک بڑا اٹیچی کیس پڑا تھا۔ یہ ریکسین کا بنا ہوا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

آصف جاہ نے اٹیچی کھولی۔ اس میں کچھ کھلونے تھے۔ کپڑے کی چھوٹی اور بڑی گڑیاں تھیں۔ کپڑے تھے جن کے سائز دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک جوان ہوتی بچی کے ہیں۔ کاپیاں اور کتابیں تھیں۔۔۔۔۔ پراندے اور اوڑھنیاں تھیں۔ آصف جاہ عجیب ہیجانی لہجے میں بولا۔ "یہ سب چیزیں اس بچی کی ہیں جسے میں نے پال پوس کر پور پور بڑا کیا تھا۔ میں جس کو دیکھ کر جیتا تھا اور جو آنکھوں سے اوجھل ہوتی تھی تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ میں نے اس نازوں کی پالی کو تیرے حوالے کیا تھا اور تجھے اس کے سیاہ سفید کا مالک بنا دیا تھا۔ اس وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ میں اسے ایک انسان کی بجائے ایک جانور کے حوالے کر رہا ہوں۔ وہ جانور اسے مرنے دے گا نہ جینے دے گا۔ وہ اسے مارے گا بھی اور رونے پر بھی پابندی لگائے گا۔ وہ اس کے گھر سے چوٹیں کھا کھا کر آئے گی اور میرے سامنے آنسو چھپا چھپا کر مسکرائے گی۔ کاش! وقت پر پتا چل جاتا کہ تیرے اور تیرے گھر والوں کے ہاتھوں اس کا انجام یہ ہونا ہے۔"

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "آصف جاہ! ہر کہی سنی بات سچ نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ اور بعض دفعہ تو آنکھوں دیکھی بات بھی جھوٹ نکلتی ہے۔ ہم میاں بیوی میں چھوٹے موٹے جھگڑے ضرور تھے لیکن۔۔۔۔۔ لیکن شہوار کو کسی طرح کا نقصان پہنچانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور یہ میں کوئی زبانی کلامی بات نہیں کہہ رہا ہوں آصف جاہ! میرے پاس اپنی بے گناہی کے ٹھوس ثبوت ہیں اور سب سے اہم ثبوت چودھری عزیز کا اپنا اعترافی بیان ہے۔ اس ریکارڈ شدہ بیان میں چودھری عزیز نے وضاحت سے بتایا ہے کہ اس نے شہوار کی جان کیوں اور کیسے لی۔"

"کہاں ہے وہ ریکارڈ شدہ بیان؟"

"یہی تو میری بدقسمتی ہے۔ وہ ریکارڈ شدہ ٹیپ میاں وارث کے پاس چلی گئی ہے۔ میاں وارث کی بدنیتی صاف ہے۔ وہ مجھے ہر حال میں لاش کی صورت دیکھنا چاہتا ہے اور مجھے لاش بنانے کے لیے وہ آپ سے اور موکھلوں سے دونوں سے پیسا کھا رہا ہے۔ وہ اب اس ٹیپ کو سامنے کیوں آنے دے گا؟" میں کراہ رہا تھا اور تکلیف کے سبب میری آواز بار بار ٹوٹ رہی تھی۔

آصف جاہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس سفید پوش پولیس والے سے بات کرنے گیا ہے جو میرے ساتھ یہاں موجود تھا۔ چند منٹ بعد آصف جاہ واپس آکر پھر کسی جج کی طرح رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تم بکواس کر رہے ہو۔" وہ کرخت آواز میں بولا۔ "پولیس کو خالی ٹیپ ریکارڈر ملا ہے۔ یہ ٹیپ ریکارڈر قبرستان کے بھنگیوں کا تھا۔"

"میں نے کہا تھا نا۔۔۔۔انسپکٹر وارث وہ بیان کبھی سامنے نہیں آنے دے گا۔"

آصف جاہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "تیرے بارے میں سنا تھا کہ تُو ہر فن مولا ہے۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ تیرے ایک جسم میں بہت سی گندی روحیں گھسی ہوئی ہیں۔ ان میں خرانٹ وکیل، چالباز چودھری، اور خبیث قاتل کی روحیں بھی شامل ہیں۔ میں یہ ساری روحیں ایک ایک کر کے تیرے جسم سے نکالوں گا اور بہت آہستہ آہستہ۔ اسی لیے تجھے ایک بار نہیں کئی بار مرنا پڑے گا۔"

میں نے نمبردار آصف کے منہ سے نکلتے شعلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "آصف جاہ! میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا غم اور غصہ برحق ہے لیکن اس غم و غصے میں اتنا آگے نہ چلے جاؤ کہ تمہیں بعد میں خود پچھتانا پڑے۔۔۔۔۔دیکھو، میں تمہارے ساتھ ثبوتوں کے ساتھ بات کر

رہا ہوں۔ میرے پاس دوسرا ثبوت چودھری عزیز کے خاص ملازم انورے کی صورت میں ہے۔ انورا وہ بندہ ہے جس نے اپنے ہاتھ سے شہوار کی جان لی۔ وہ قتل کا آلہ بھی برآمد کرا دے گا۔ انورے تک میرا پہنچنا کسی کرشمے سے کم نہیں ہے۔ بس یوں سمجھو کہ شہوار کا خون بولا ہے اور اس نے مجرم کے چہرے سے نقاب کھینچا ہے۔۔۔۔"

میں نے یہاں تک کہا تھا کہ ذرا ٹھٹک گیا۔ وہ نیلے نگ والا کلپ میری شلوار کی اندرونی جیب میں چند کرنسی نوٹوں اور دو تین رسیدوں کے ساتھ ہی رکھا تھا لیکن مجھے سرکنڈوں سے پکڑنے کے بعد تو پولیس والوں نے میری تلاشی لی تھی۔

"بک کیوں نہیں رہے ہو؟" نمبردار آصف جاہ نے میری خاموشی کو توڑنا چاہا۔

"میری شلوار کی جیب میں ایک چیز ہے، میں وہ تمہیں دکھانا چاہتا ہوں۔"

میرے ہاتھ ہتھکڑی میں تھے۔ آصف جاہ نے ملازم مظفر کو آواز دی۔ وہ دندناتا ہوا آیا اور آصف کے حکم پر اس نے زپ کھول کر میری شلوار کی جیب دیکھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اندیشہ بالکل درست نکلا۔ بے کار رسیدیں تو جیب میں موجود تھیں مگر کرنسی

اور کلپ موجود نہیں تھا۔۔۔۔اور مجھے خدشہ تھا کہ وہ میری اشیاء کی فہرست میں بھی نہیں لکھا گیا ہوگا۔۔۔۔ایسی قیمتی چیزیں پولیس اہلکار کم ہی لکھتے ہیں۔

"کیا بات ہے؟" آصف نے میرے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم کرشمے کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں، کرشمہ تو ہوا ہے۔اور یہی کرشمہ ہے جس کی وجہ سے میں پہلے انورے اور پھر چودھری عزیز تک پہنچا۔اور مجھے پتا چلا کہ شہوار کی جان لینے والے اصل بندے کون ہیں۔"

"اب کچھ بکواس بھی کرو گے یا پہیلیاں بجھواؤ گے۔"

میرا گلا بالکل خشک ہو رہا تھا۔میں نے پانی طلب کیا۔مظفر مجھے پانی پلا کر باہر چلا گیا۔میں نے کراہتے ہوئے کہا۔"شہوار پر چاقو کے وار کرنے اور اسے بے جان کرنے کے بعد انورے نے یونہی وہاں سے شہوار کا ایک چھوٹا ہار اٹھا لیا تھا۔میں اس ہار کو بڑی اچھی طرح پہچانتا تھا۔میں نے کچھ دن پہلے اس ہار کا ایک نیلم انورے کی بیوی عابدہ کے کلپ میں دیکھا۔یہ نیلم دیکھنے کے بعد ہی میرا دھیان انورے اور چودھری عزیز وغیرہ کی طرف گیا۔"

۔۔۔۔اس کے بعد میں نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں وہ ساری بات آصف جاہ کے گوش گزار کر دی۔میں نے اسے بتایا کہ کس طرح قبائلی علاقے کی طرف نکلنے سے پہلے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بس ایک دفعہ اپنی والدہ سے مل لوں۔کس طرح میں اور تیمور رات کے وقت قبرستان سے روانہ ہو کر کیکراں والی گاؤں پہنچے اور وہاں انورے اور اس کی بیوی سے ملاقات ہوئی۔۔۔۔

ابھی میری بات جاری ہی تھی کہ سادہ کپڑوں میں پولیس والا پھر دروازے پر نمودار ہوا اور آصف جاہ کو بُلا کر کمرے سے باہر لے گیا۔کمرے سے نکلتے ہوئے آصف اور پولیس والے نے ایک ساتھ مجھ پر خشمگیں نگاہ ڈالی۔آصف میری باتیں سن تو رہا تھا تاہم اس کے چہرے کی جنونی کیفیت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

آصف کے باہر جانے کے تھوڑی دیر بعد ایک ملازم میرے عریاں جسم کے لیے ایک قمیض اور جرسی لے کر آیا۔اس کا صرف ایک بازو تھا۔میں اسے یہاں بیرونی گیٹ پر پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔۔۔۔یہ وہی بدنصیب ماسٹر تھا جو چند برس پہلے شہوار پر ہاتھ اٹھانے کی وجہ سے آصف جاہ کے عتاب کا شکار ہوا تھا۔وہ بہت کم گو شخص تھا۔

مجھے قمیص پہنانے کے لیے میری ہتھکڑی اتارے جانے کی ضرورت تھی، لہذا مجھے سردی سے بچانے کے لیے اس نے جرسی ویسے ہی میرے خون آلود جسم کے گرد لپیٹ دی۔ ارد گرد دیکھ کر وہ آہستہ سے بولا۔ "اگر تیرے پاس کوئی پکا ثبوت شبوت ہے تو ان کے سامنے رکھ دے۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ تجھے زیادہ وقت دیں گے۔" پھر اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور کانپتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "لمبڑ دار جی کے ارادے تیرے بارے میں بڑے خطرناک ہیں۔"

"میں اپنا دل چیر کر دکھا سکتا تو دکھا دیتا۔ میں اب بھی پوری سچائی کے ساتھ کہہ رہا ہوں اور ہر ایک سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے شہوار کو نہیں مارا۔"

ملازم نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "اول تو یہ بہت مشکل کام ہے لیکن اگر تم کسی طرح یقین دلا دو کہ شہوار کا قتل تم نے نہیں کیا تو بھی نمبردار کا غصہ تمہاری جان لے سکتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تمہارا یہ قصور بھی لمبڑ دار کے نزدیک کم نہیں ہوگا کہ تم اپنی بیوی کی حفاظت میں ناکام رہے۔ اور پھر یہ بات تو سچ ہے کہ وہ تمہاری طرف سے سکھی نہیں تھی۔ تم اس سے جھگڑتے

تھے، ایک دو بار تم نے غصے میں اس پر ہاتھ بھی اٹھایا۔ یہ ساری باتیں شہوار بی بی کی ملازمہ شیداں بڑھا چڑھا کر لمبڑ دار جی کے سامنے بیان کرتی رہی ہے۔ میں تمہیں ڈرا نہیں رہا ہوں، بلکہ سمجھا رہا ہوں کہ اگر اپنی صفائی میں ان لوگوں کو کچھ بتا سکتے ہو تو بتا دو۔"

ایک دم اس ملازم کو چپ ہونا پڑا۔ آصف جاہ ایک بار پھر دندناتا ہوا اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس نے ملازم کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ملازم چلا گیا تو آصف جاہ نے ایک بار پھر تھانے داری لہجے میں مجھ سے پوچھ گچھ شروع کی۔ وہ مجھے خونی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "تمہاری شلوار کی جیب میں کیا ہے جو تم مجھے دکھانا چاہ رہے تھے؟"

"یہ وہی کلپ تھا جس کا میں بتا رہا ہوں۔ اب وہ جیب میں نہیں ہے۔"

"ٹیپ ریکارڈر کی طرح وہ بھی پولیس والوں نے جیب سے نکال لیا ہوگا؟" آصف جاہ کے لہجے میں طنز کی شدید کاٹ تھی۔

"بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ انہوں نے مجھے پکڑنے کے بعد تلاشی لی تھی۔ اگر تم اپنے طور پر پوچھو تو ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں بتا دیں۔ اس کلپ پر جو چھوٹا نیلم لگا ہوا ہے، وہ شہوار کے ہار کا ہے۔ انورا خود اس بات کو قبول کر چکا ہے۔"

"انوار اب کہاں ہے؟" آصف جاہ کے انداز میں بہ دستور زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے۔

"وہ وہیں کیکراں والی میں ہے۔ اس کی بیوی عابدہ عرف پینو بھی ساتھ ہے۔ آپ مجھے وہاں لے چلیں یا ان دونوں کو یہاں بلالیں۔ وہ سب کچھ آپ کے سامنے بک دیں گے۔"

"لیکن کیکراں والی میں اس گھر پر تو تمہاری بلقیس بیگم نے پہرا بٹھایا ہوا ہے۔ یہ تو تم ہی اس سے گزارش کرو تو وہ کسی کو یہاں بھیج سکتی ہے۔۔۔۔ یا ہمیں وہاں جانے کی اجازت دے سکتی ہے۔" تمہاری بلقیس کا لفظ آصف نے بہت چبا کر کہا تھا۔

میں نے اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہیں پتا اس گھر پر کون پہرا دے رہا ہے لیکن اگر تم کسی طرح میرا ان سے رابطہ کروا دو تو میں ان سے بات منوا سکتا ہوں۔"

"پر کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ میاں بیوی اب بھی وہاں موجود ہوں گے؟"

"وہ کہیں نہیں جا سکتے۔ ہم نے ان دونوں کو باندھ دیا تھا۔ گھر والے ان کی پوری نگرانی کر رہے ہیں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

آصف جاہ نے مظفر کو اندر بلایا۔ اسی نے تھوڑی دیر پہلے آصف جاہ کو اطلاع دی تھی کہ میری والدہ اور بہن کیکراں والی میں چودھری اختر کے گھر موجود ہیں۔

آصف جاہ نے میرے سامنے ہی مظفر سے پوچھا۔ "وہاں بلقیس کی بہن کے گھر میں اور کون کون ہے؟"

مظفر نے کہا۔ "لمبڑدار جی۔۔۔۔ جہاں تک میری اطلاع ہے چودھری خاور کی بے بے جی اور بہن دونوں وہاں ہیں۔ یہ بالکل پکی خبر ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ اور کون کون ہے؟" آصف جاہ نے تڑخ کر پوچھا۔

"اس کے علاوہ چودھری اختر ہے۔ اس کی بیوی خدیجہ ہے۔ دو بچے ہیں۔ باقی ایک دو نوکرانیاں ہیں۔"

"اس کے علاوہ تو کوئی بندہ نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی مہمان شہمان؟"

"نہیں جی، ایسا تو کوئی نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ کہتے ہیں تو میں تھوڑا سا اور پتا کر لیتا ہوں۔ وہ بندے باہر ہی بیٹھے ہیں جو اختر کی حویلی سے ہو کر آئے ہیں۔"

"ان کو اندر ہی لے آو۔" آصف جاہ نے کہا۔

چند سیکنڈ بعد وہ دونوں اندر آ گئے۔ یہ باپ بیٹا تھے اور آج کل اختر کے کھیتوں میں ہی مزدوری کرتے تھے۔ باپ پکی عمر کا تھا، لڑکے کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہو گی۔ معلوم ہوا کہ وہ کبھی کبھی سبزی وغیرہ لے کر اختر کے گھر بھی چلا جاتا ہے۔ اسی مدثر نامی لڑکے نے اندر کی خبریں آصف جاہ کے خاص کارندے مظفر تک پہنچائی تھیں۔ مدثر نامی یہ لڑکا اور اس کا باپ شکل سے ہی لالچی اور ضرورت مند نظر آتے تھے۔ تاہم اب مخبری کرنے کے بعد وہ کافی ڈرے ہوئے بھی تھے۔

آصف جاہ نے مدثر نامی اس لڑکے سے پوچھا۔ "تمہیں پکا پتا ہے کہ اس وقت گھر میں مالک مالکن اور دو مہمان عورتوں کے سوا اور کوئی نہیں؟"

"بالکل جی! میں کل شام بھی کھیتوں سے کچھ سامان لے کر گھر گیا تھا۔ وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ ہاں، پرسوں کچھ اور لوگ بھی تھے مگر مجھے لگتا ہے کہ وہ رات کو ہی چلے گئے تھے۔"

"تم نے ان کی شکلیں نہیں دیکھیں؟"

"نہیں جی، پر میرا اندازہ ہے کہ ان میں ایک مرد تھا اور ایک زنانی۔ مرد شدید بیمار تھا۔ میں نے اس کی ہائے ہائے کی آواز سنی تھی۔"

آصف جاہ نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "ہاں، اب بتاؤ۔ تم کچھ کہہ رہے ہو، یہ منڈا کچھ اور کہہ رہا ہے اور اسے جھوٹ بکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں غلط نہیں کہہ رہا۔ انوارا اور اس کی بیوی وہیں اختر کی حویلی میں ہیں۔ یہ لڑکا تو صحن اور برآمدے سے گھوم پھر کر آ جاتا ہو گا۔ وہ دونوں کسی اندر کے کمرے میں ہیں۔ اختر اچھی طرح جانتا ہے کہ میاں بیوی کو پوری حفاظت سے رکھنا ہے۔ اسے اس سارے معاملے میں انورے کی قدر و قیمت بھی پوری طرح معلوم ہے۔ انورے نے اختر صاحب کے سامنے ہی اپنے جرم کا اقرار کیا ہے۔"

آصف جاہ نے زہریلی نظروں سے مجھے گھورا پھر مولوی مظفر کی طرف دیکھ کر تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "دیکھو بھئی! ہمارے داماد صاحب نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئیں۔ پورے پورے ثبوت ہیں ان کے پاس۔ یہ اور بات ہے کہ جب یہ اپنے ثبوت کو

ہماری ہتھیلی پر رکھنے لگتا ہے تو ثبوت غائب ہو جاتا ہے۔اب یہ انورے والا ثبوت بھی لگتا ہے کہ یونہی اُڑن چھو ہو جائے گا۔"

مظفر پھنکارا۔"چھڈو لمبڑ دار جی! ننگا کر کے دو کتے چھوڑو اس پر۔ایک منٹ میں سب کچھ بک دے گا۔ایسے بڑے پتھر بولتے ہوئے دیکھے ہیں ہم نے۔"

"کتے تو چھوڑنے ہی چھوڑنے ہیں لیکن اگر اس کی بجائے اس کے گھر والوں پر چھوڑے جائیں تو نتیجہ ذرا جلدی نکل آئے گا اور اچھا بھی نکلے گا۔میرا خیال ہے کہ تم ٹائم ضائع نہ کرو اور جو تمہیں کہا ہے اس پر عمل کرو۔"

مولوی مظفر اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔سخت سردی کے باوجود پسینا میری گردن پر چل رہا تھا اور میری ٹانگوں پر رینگ رہا تھا۔میں بھانپ رہا تھا کہ آصف جاہ میری والدہ اور بہن کو یہاں قلعہ والا میں لانے کی بات کر رہا ہے۔اس کی اس خواہش کے راستے میں بلقیس دیوار بن گئی تھی۔میں جانتا تھا کہ وہ ایک مضبوط دیوار ہے۔گزرے ماہ و سال نے اس کے اندر بہت اعتماد بھرا تھا اور یہ معاملہ میری عزت اور زندگی موت کا معاملہ تھا۔اس معاملے کو سہل

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

لے ہی نہیں سکتی تھی۔مجھے امید تھی کہ وہ اپنی ہمت کی آخری حد تک میری عزت کے سامنے سینہ تان کر کھڑی رہے گی۔لیکن کیا وہ کامیاب ہو سکے گی؟ یہ بڑا سنگین سوال تھا۔

پھر کچھ دیر پہلے ملازم کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجے۔اس نے کہا تھا۔۔۔۔کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔میں جو کرنا چاہتا ہوں جلدی کر لوں۔

میں نے ایک بار پھر نرم التجائی لہجہ اختیار کیا اور آصف جاہ سے کہا۔"آصف جاہ صاحب! آپ کسی طرح مجھے ایک بار وہاں لے جائیں یا پھر کسی طرح چودھری اختر کی بات مجھ سے کرا دیں۔انورے اور اس کی بیوی کے بارے میں اصل حقیقت کھل جائے گی۔انور آپ کے سامنے کھل کر ہر بات کا اعتراف کرے گا اور آپ کا دل گواہی دے گا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے درست کہہ رہا ہے۔"

"داماد جی! تم ہر وہ بات کر رہے ہو جو نہ ہونے والی ہو۔"آصف جاہ نے شراب کا ایک بڑا گھونٹ بھر کر بیڑی کا طویل ترین کش لیا۔"اب چودھری اختر کو آپ جناب سے گل بات کرانے کے لیے کون یہاں لائے۔۔۔۔اور کیسے لائے؟"

ملازم شیر افگن نے آگے بڑھ کر آصف جاہ کے کان میں دو چار سر گوشیاں کیں۔آصف جاہ کے شرابی چہرے کی تمتماہٹ کچھ کم ہوئی۔اس نے اثبات میں سر ہلایا اور افگن باہر نکل گیا۔قریباً پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو سفید پوش پولیس والے تھے۔انہوں نے ایک بڑا سا وائر لیس سیٹ اٹھار کھا تھا۔وائر لیس سیٹ سے مسلسل شور ابھر رہا تھا اور کسی پولیس والے کے پیغام سنائی دے رہے تھے۔

وائر لیس سیٹ کو کھڑکی کے پاس رکھ دیا گیا۔پولیس والے فریکوئنسی سیٹ کرنے میں مصروف ہو گئے۔میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ڈیک نالے کے اسی دور دراز گاؤں کیکراں والی سے رابطے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں چودھری اختر کے گھر میں انورا اور اس کی بیوی موجود ہیں۔یقیناً اب وہاں پولیس کی نفری بھی موجود تھی۔

انہیں جلد ہی کامیابی ہو گئی۔دوسری طرف سے کسی اے ایس آئی شہباز نے بات کی۔۔۔۔آصف جاہ نے اسے بتایا کہ وہ گاؤں کے زمیندار چودھری اختر سے بات کرنا چاہتا ہے۔قریباً دس منٹ بعد خدیجہ کا شوہر اختر وائر لیس سیٹ پر موجود تھا۔آصف جاہ نے میری بات اختر سے کرائی مگر بات کرانے سے پہلے اس نے مجھے بھرا ہوا پستول دکھا دیا تھا اور سختی

سے یہ ہدایت کر دی تھی کہ میں صرف انورے اور اس کی بیوی کے بارے میں ہی بات کروں گا۔کوئی بھی دوسری بات نہیں ہو گی۔

جونہی اختر نے وائر لیس سیٹ پر میری آواز پہچانی،وہ ہیجانی انداز میں بولنے لگا۔"""خاور! یہ۔۔۔۔۔یہ سب کیا ہو رہا ہے۔کہاں ہو تم؟ تیمور کہاں ہے؟ چودھری عزیز قتل ہو گیا ہے۔اس کا جنازہ راجوال کی حویلی میں پڑا ہے۔سنا ہے کہ وہاں قبرستان کے اندر شاہنواز اور اس کے یار سراج کو بھی گولیاں لگی ہیں۔سراج وہیں مر گیا ہے اور شاہنواز کی حالت نازک ہے۔کیا یہ سب صحیح ہے۔۔۔۔تم تو خیریت سے ہو؟"

اس نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوال پوچھ لیے۔

میں نے کہا۔"میں خیریت سے ہوں چودھری اختر! تم بتاؤ بے بے جی اور عارفہ کہاں ہیں؟"

"وہ یہیں پر ہیں۔کچھ لوگ منڈا سے باندھ کر آئے تھے۔وہ انہیں زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔مگر اللہ کا شکر ہے،بیگم بلقیس نے اپنے کافی سارے بندے یہاں بھیج رکھے

ہیں۔انہوں نے آنے والوں کو بھگا دیا ہے۔مجھے تو لگتا ہے کہ وہ تمہارے سسرال کے لوگ تھے۔یہاں بہت گڑ بڑ ہے یار۔"

آصف جاہ نے مجھے پستول کے ساتھ زور سے ٹہوکا دیا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ میں صرف کام کی بات کروں۔میں نے وائرلیس سیٹ پر کہا۔"اختر صاحب! باقی باتیں ہوتی رہیں گی۔مجھے یہ بتائیں کہ انور اور اس کی بیوی آپ کے پاس ہی ہیں ناں؟"

چند لمحے خاموشی رہی پھر اختر کی حیرت زدہ آواز ابھری۔"کیا کہہ رہے ہو خاور! انورے اور عابدہ کو تو تم نے بلا لیا تھا۔"

"میں نے بلا لیا تھا؟ یہ کیا بات کر رہے ہو؟ وہاں سے آنے کے بعد تو تمہارے ساتھ میری بات ہی نہیں ہوئی۔"

"لیکن۔۔۔۔تم نے کے ٹو کو بھیجا تھا یار۔اس نے کہا تھا کہ انورے اور اس کی بیوی کو فوراً یہاں سے نکالنا ہے۔انہیں ایس پی صاحب کے سامنے پیش کرنا ہے۔"

"میں نے کے ٹو کو بھیجا تھا؟"میرا دماغ چکرا گیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ کوئی زبردست دھوکا ہو گیا ہے۔آصف جاہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔انورا اور عابدہ وہاں اختر کے گھر میں موجود نہیں تھے۔

"کب آیا تھا کے ٹو تمہارے پاس؟"میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"پرسوں شام کے بعد۔تمہارا پرانا یار اعجاز بھی اس کے ساتھ تھا۔وہ رات کو بارہ بجے کے قریب انورے اور عابدہ کو ٹویوٹا گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے۔"

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔یہ بات میں محاورتاً کہہ رہا ہوں۔ورنہ میرے دونوں ہاتھ تو ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔کے ٹو کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔اس کی گمشدگی مجھے اور تیمور کو مسلسل پریشان کرتی رہی تھی۔اس کے پاس کافی روپے بھی تھے جو وکیل کرنے کے لیے دیے گئے تھے۔ہمارا خیال تھا کہ کے ٹو کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔۔۔۔مگر اب انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ تو خود ہی مصیبت کا روپ دھار چکا تھا۔وہ ہمارا پرانا یار تھا اور ہمارا خیال تھا کہ ہم اس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔لیکن آج پتا چلا رہا تھا کہ جس کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ ہوتا ہے وہ بھی کبھی بالکل اجنبی نکلتا ہے۔

بے بے جی کہا کرتی تھیں۔ "مصیبت اکیلی نہیں آتی۔ اور مصیبت کے وقت ہی چہروں کی اصل پہچان ہوتی ہے۔"

پچھلے کچھ دنوں میں، میں نے بہت سے چہروں کا اصل روپ دیکھا تھا۔ قتل کے الزام کی سیاہی میرے چہرے پر تھی لیکن شکلیں دوسروں کی بدل گئی تھیں۔ راجوال میں بے شمار لوگ ایسے تھے جو میرے پسینے پر خون گرانے کا دعویٰ کرتے تھے مگر پچھلے دنوں میں نے ان کو اجنبیوں کی طرح پاس سے گزرتے دیکھا ہے۔ اور اب یہ کے ٹو۔۔۔۔ یہ بھی بے وفائی کر گیا تھا۔ انورے اور عابدہ کے بارے میں میری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور وہ میرا نام لے کر انہیں وہاں سے نکال گیا تھا۔ یہ کام یقیناً اس نے کسی اچھی نیت سے نہیں کیا تھا۔ اب یہ عین ممکن تھا کہ یہ میاں بیوی بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے یا پھر انہیں کہیں لا پتا کر دیا جاتا۔ اس کے پیچھے یقیناً موکھلوں کا ہاتھ تھا یا چودھری عزیز کا۔

آصف جاہ نے میرے کیچڑ آلود بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔ "ہاں، اب تیرے پاس کہنے کو کچھ اور ہے یا نہیں۔۔۔۔ اگر نہیں تو وائرلیس بند کر دوں؟"

میرے پاس واقعی کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ دوسری طرف سے اختر کی نہایت پریشان آواز ابھری۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے خاور! اور تم کس تھانے میں ہو۔۔۔۔ مجھے بتاؤ، میں بلقیس کو اطلاع پہنچاتا ہوں۔"

وہ وائرلیس کی وجہ سے سمجھ رہا تھا کہ میں کسی تھانے میں ہوں۔

"حرام زادہ!" آصف جاہ نے دانت پیستے ہوئے وائرلیس سیٹ بند کر دیا۔ پھر شرابیوں کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولا۔ "کتے کا بچہ۔۔۔۔ کتنے درد سے کہہ رہا تھا، میں بیگم بلقیس کو اطلاع پہنچاتا ہوں۔ وہ کیوں کہہ رہا تھا ایسے۔۔۔۔ کیوں کہہ رہا تھا؟" اس نے میرے بال جھنجھوڑے، سر سے رستا ہوا خون اور تیزی سے رسنے لگا۔

آصف جاہ نے جنونی انداز میں خود ہی جواب دیا۔ "وہ اس لیے کہہ رہا تھا۔۔۔۔ تیری اصل بیوی وہی ہے۔۔۔۔ وہ حرام زادی تیری اصل گھر والی ہے۔ تو ہمیشہ اس کے اشاروں پر ناچتا رہا ہے اور اب بھی ناچ رہا ہے۔ اس کتیا کا کلیجہ ٹھنڈا کرنے کے لیے تُو نے شہوار کی جان لی ہے۔ اسے تڑپا تڑپا کر مار دیا ہے۔ پر میں تجھ سے پوچھتا ہوں خاورے۔۔۔۔ میں تجھ سے پوچھتا ہوں۔ اگر وہ تیری اصل گھر والی یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی تھی اور نہ تُو کر سکتا

تھا تو پھر میری پھول سی بچی کی زندگی برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی تم دونوں کو۔۔۔۔۔ کیا ضرورت تھی؟" آخر میں وہ اتنے زور سے گرجا کہ دیواریں گونج اٹھیں اور اس کے ہاتھ کے گلاس سے سنہرے رنگ کی وھسکی اچھل کر دور جا گری۔

میں نے منہ میں جمع ہو جانے والا خون تھوکتے ہوئے کہا۔ "آصف جاہ! تم میرے جسم کے ٹکڑے بھی کر دو گے تو ہر ٹکڑے سے یہی آواز آئے گی کہ میں شہوار کا قاتل نہیں ہوں۔"

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ بس اپنی بہکی ہوئی رُو میں بولتا چلا گیا۔ اس کا لہجہ نشے سے چور تھا۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں۔۔۔۔۔ تم نے شہوار سے شادی کا ناٹک کیوں رچایا۔۔۔۔ اس میں تمہیں ایک نہیں تین تین فائدے نظر آئے۔۔۔۔۔ ہاں تین تین۔۔۔۔۔ تم کروڑوں کی جائیداد کے مالک بنے۔ اس شادی سے تم نے موکھلوں کو الگ تھلگ کر دیا اور پھر تیسرا سب سے بڑا فائدہ۔۔۔۔۔ ہاں سب سے بڑا فائدہ۔۔۔۔۔ میری بچی تمہارے اور بلقیس کے گناہوں کے لیے ڈھال بن گئی۔ ہاں تین تین فائدے!" اس نے ہاتھ کی تین انگلیاں کھڑی کر کے میری آنکھوں کے سامنے لہرائیں۔

وہ بولتا چلا گیا۔ "تم اس کے ساتھ راجوال کی حویلی میں رنگ رلیاں مناتے رہے۔۔۔۔۔ گناہ کے اندھیرے میں اس کا بستر گرم کرتے رہے اور میری بچی تمہاری ایک محبت بھری نظر کو ترستی رہی۔ تم نے اگر کبھی اسے بچی کھچی محبت دی بھی تو یہ وہی محبت تھی جو ایک بدتمیز بچے کو کھلونے سے ہوتی ہے۔ وہ اس کو توڑتا مروڑتا ہے اور اس کو برباد کر کے خوش ہوتا ہے۔ تم نے دو دو مزے حاصل کیے۔ ایک طرف تمہاری معشوقہ دوسری طرف کچھ نہ کہنے والی اور ہر زخم خاموشی سے سہہ جانے والی بیوی۔۔۔۔۔ تم نے اس کے ساتھ کھیلا اور آخر میں اس ناگن کی خاطر اس کی زندگی سے ہی کھیل گئے۔"

"تم انتقام میں اندھے ہو رہے ہو آصف جاہ! تمہیں میرے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا۔" میں کراہا۔

وہ رواں دواں لہجے میں بولا۔ "مجھے تمہارے علاوہ تمہاری ماں اور بہن بھی نظر آ رہی ہے۔ اور وہ گندی عورت بھی نظر آ رہی ہے جس کی وجہ سے میری بچی کی جان گئی۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ یہ تینوں عورتیں یہاں ہوتیں یا کم از کم تیری ماں اور بہن ہی ہوتیں۔ میں انہیں تیری موت کا تماشا دکھا کر بتا سکتا کہ کسی پیارے کی موت کا غم کیا ہوتا

ہے۔۔۔۔۔ مگر اب لگتا ہے کہ یہ آخری خواہش مشکل سے ہی پوری ہو گی۔ وہ گندی زنانی جسے بیگم بلقیس کہتے ہیں، ہوشیار ہو گئی ہے۔ اس نے وہاں بڑا پکا انتظام کر لیا ہے۔ پھر بھی میں ایک آخری کوشش کر کے دیکھوں گا۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ دندناتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں کسی بے بس پرندے کی طرح جکڑا ہوا وہیں یخ بستہ قالین پر پڑا رہا۔ آصف جاہ نے جو کچھ کہا تھا، وہ کانوں میں انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔ وہ میرے گھر والوں کے لیے اور بلقیس کے لیے نہایت گھٹیا الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ شراب کے نشے اور انتقام کی آگ نے اسے ہر حد بھلا رکھی تھی۔ اب خدا کے بعد میری ساری امیدیں بلقیس سے وابستہ تھیں۔ دیکھنا یہ تھا کہ وہ کس حد تک اس زبردست دباؤ کا سامنا کر سکتی ہے۔۔ کہاں تک بے بے جی اور عارفہ کے سامنے دیوار بن سکتی ہے۔

مجھے اس طرح بندھی ہوئی حالت میں تین بندوں نے اٹھایا اور حویلی کے پچھواڑے ایک چھوٹی سی کچی کوٹھڑی میں پہنچا دیا۔ یہاں اس طرح کی چار پانچ کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس یخ بستہ کوٹھڑی میں فقط پرالی کے اوپر چادر بچھا کر ایک بستر سا بنا دیا گیا تھا اور ایک میلا سا لحاف رکھا تھا۔

میں اس کوٹھڑی میں تقریباً دس گھنٹے بھوکا پیاسا زخمی حالت میں پڑا رہا۔۔۔۔۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ جنونی آصف جاہ کے ہاتھوں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ والدہ اور عارفہ کے خلاف کیا کاروائی کرنے والا ہے۔ اس نے نشے کی حالت میں بتایا تھا کہ وہ میری والدہ اور عارفہ کو یہاں لانے کے لیے ایک آخری کوشش کرنے والا ہے۔ خبر نہیں کہ وہ کوشش کیا تھی۔ اپنی اس حالت میں تو میں بس گڑگڑا کر دعا ہی کر سکتا تھا کہ وہ اپنے ارادوں میں ناکام رہے۔

شام کے وقت مجھے اندازہ ہوا کہ شاید آصف کی کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی۔۔ کوٹھڑی کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور آصف جاہ طوفان کی طرح اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں تین میٹر لمبا وہی چرمی کوڑا تھا جو میرے جسم پر بے شمار جلتے ہوئے نشان بنا چکا تھا۔

اندر آتے ہی وہ پھنکارا۔ "میں تجھے بڑی بری موت ماروں گا۔ میں بوٹی بوٹی کر دوں گا تیری۔"

اس کے ساتھ ہی اس کا کوڑا ہوا میں لہرانے لگا۔ شائیں شائیں کی مخصوص آواز ابھری اور میرے زخمی جسم پر ایک بار پھر دہکی ہوئی سلاخیں رکھی جانے لگیں۔ میں پرالی پر لوٹتا رہا اور حتی الامکان ضبط بھی کرتا رہا۔ مگر پھر بے ساختہ میرے ہونٹوں سے کراہیں نکلنے لگیں۔ یہ کراہیں آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئیں۔ آصف جاہ ہیجانی انداز میں پھنکار رہا تھا۔ "وہ تیری بڑی پکی سہیلی ہے۔ تجھ پر اپنے درجنوں بندے ہی نہیں، اپنی جان بھی فدا کر سکتی ہے۔ بڑی گہری عشق معشوقی ہے تم دونوں میں۔ ٹھیک ہے کرتی رہے عشق۔ میں بھی اس کے عشق اور عاشق کے ٹوٹے کر کے چھوڑوں گا۔"

ہنٹر مارنے سے تسلی نہیں ہوئی تو اس نے مجھے وزنی جوتی کی ٹھوکروں پر رکھ دیا۔ میں اذیت کی انتہا سے گزر رہا تھا۔ وہ مار مار کر ہانپ گیا تو بلند آواز میں دہاڑا۔

"ادھر آؤ۔ اٹھاؤ اس بیگم کے عاشق کو اور لے جاؤ طویلے میں۔"

دونوں ہٹے کٹے کارندے اندر داخل ہوئے۔ آصف جاہ نے گالیاں بکنے کے بعد میری طرف تھوکا اور پاؤں سے زمین کو کوٹتا ہوا باہر نکل گیا۔

جس جگہ کو طویلا کہا گیا تھا وہ ایک ہال نُما کچا کمرا تھا۔ یقیناً اسے گھوڑے یا بھینسیں وغیرہ باندھنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہو گا۔ اس کی کھڑکیوں پر سرد ہوا سے بچانے کے لیے کپڑے کے پردے لگائے گئے تھے۔ اس مستطیل کمرے کے کچے فرش پر جو منظر نظر آیا، اس نے میرا دل دہلا دیا۔ یہ سارے بندے نوجوان یا درمیانی عمر کے تھے۔ ان سب کے جسموں پر مارپیٹ کے نشان تھے اور لباس بہت میلے کچیلے ہو چکے تھے۔ ان میں سے بیشتر کی داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔

حیرت ناک بات یہ تھی کہ ان سب کے گلے میں جانوروں کی طرح زنجیریں نظر آ رہی تھیں۔ ان زنجیروں کی وجہ سے ان میں سے بیشتر کے گلے زخمی تھے۔

میرے ساتھ آنے والے افراد نے میری الٹی ہتھکڑی کھول دی۔ میری طرف کم از کم تین رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں اور رائفل برداروں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے کوئی رعایت نہیں کریں گے۔

آخر میں میرے پاؤں کی رسی کھولی گئی تاہم رسی کھولنے سے پہلے ایک زنجیر میرے گلے میں بھی پہنائی گئی۔ زنجیر کے بالائی حصے پر لوہے کی موٹی پتری کا حلقہ سا تھا جس میں باقاعدہ

جندری یعنی چھوٹا تالا لگتا تھا۔اس کے بعد مجھے اس طویلے میں دھکیل دیا گیا۔طویلے کا دروازہ لوہے کی موٹی چادر کا تھا۔کھڑکیوں میں بھی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔پہلے سے موجود افراد مجھے سخت حیرت سے دیکھنے لگے۔ان میں سے دو چار شاید مجھے پہچانتے تھے۔ان کی سوالیہ نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔

"تم چودھری خاور ہو نا؟" ایک کمزور چہرے والے شخص نے میرے ابتر حلیے کو بڑے تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، تیس بتیس سال کی عمر کا ایک شخص تنک کر بولا۔"ہاں جی، یہی ہے جس کی وجہ سے یہاں ہماری اتنی عزت کی جا رہی ہے۔یہ سارا اسی چودھری صاحب کا کیا دھرا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا طویلے میں موجود سارے افراد کی توجہ دروازے کے پاس والی دو کھڑکیوں کی طرف چلی گئی۔کھڑکیوں کی آہنی سلاخوں کے اندر سے روٹیاں اندر پھینکی جا رہی تھیں۔یہ روٹیاں اس کھڑکی نما جگہ میں ہی پھینکی جا رہی تھیں، جہاں مویشی چارہ وغیرہ کھاتے ہیں۔ان روٹیوں کو دیکھتے ہی زنجیروں میں بندھے ہوئے سارے بندے ایک طرف

جھپٹے۔میں نے ایک تکلیف دہ منظر دیکھا۔یہ لوگ جانوروں ہی کی طرح ایک دوسرے سے روٹیاں چھیننے لگے۔شاید روٹی جان بوجھ کر کم پھینکی گئی تھی۔ایک نوجوان لڑکے نے درمیانی عمر کے ایک شخص کو زور سے دھکا دیا، وہ پھسل کر دیوار سے جا ٹکرایا۔اس کی مٹھی میں دبی ہوئی ایک چوتھائی روٹی بھی ایک دوسرے بندے نے چھین لی۔درمیانی عمر کا شخص جس مائع شے سے پھسل کر گرا تھا، وہ کچھ اور نہیں پیشاب تھا۔اس پیشاب کی بُو پورے طویلے میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں سکتہ زدہ کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔یہ کون لوگ تھے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نیم گنجے سر والے نے کہا تھا کہ یہ سارا میرا ہی کیا دھرا ہے۔میں نے کیا کیا تھا جس کی وجہ سے ان لوگوں کو یہ تکلیف پہنچ رہی تھی؟

سلاخ دار کھڑکیوں میں سے روٹیاں پھینکنے والے جیسے تماشا دیکھ رہے تھے۔پھر وہ اوجھل ہو گئے۔زنجیروں سے بندھے ہوئے افراد بالکل جانوروں کا سا رویہ اپنائے ہوئے تھے۔ان کے ناخن بڑھ چکے تھے چہرے اور سر کے بال جھاڑ جھنکاڑ بنے ہوئے تھے۔ان کے چہرے فاقہ زدہ تھے اور آنکھوں میں عجیب سا ہراس جم چکا تھا۔اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کم و بیش چار ماہ سے

یہاں بند ہیں۔تاہم ان میں سے دو چار ایسے بھی تھے جنہیں شاید اس بندی خانے میں زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ان کی حالت قدرے بہتر تھی۔

طویلے میں عجیب سی سرانڈ اور بُو تھی۔دماغ پھٹا جا رہا تھا۔میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ایک قمیص اور جرسی مجھے دے دی گئی تھی،وہ میں نے پہن لی تھی۔مگر سردی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔اس کی وجہ اس طویلے کا گیلا پن اور کچے فرش کی نمی تھی۔نیم گنجے سر والا شخص اپنی لمبی زنجیر کو ہاتھ سے سیدھا کرتا ہوا میرے پاس آ بیٹھا اور زہر خند لہجے میں بولا۔"آخر آ گئے ہو نا تم یہاں۔مجھے پتا تھا ایک دن تم ضرور آؤ گے۔یہ سارے میری بات نہیں مانتے تھے پر میں اچھی طرح جانتا تھا۔مجھے پتا تھا کہ نمبردار آصف جاہ کے سر میں اگر دماغ کی جگہ آگ بھری گئی ہے تو اس کی وجہ صرف تم ہو،یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔"وہ لہجے سے کچھ پڑھا لکھا لگتا تھا۔

"پتا نہیں تم کون ہو اور کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"میں بکواس نہیں کر رہا۔وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے۔"وہ اپنی بڑی بڑی ذہین آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر بولا۔"یہ تم ہی ہو جس نے آصف جاہ کی بیٹی سے شادی کی اور پھر

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کو دکھ دیے پھر اس کو جان سے مارا۔۔۔۔اور آصف جاہ کو نفسیاتی مریض بنایا۔۔۔۔اب وہ اپنے جنون میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔"

"لیکن میری سمجھ میں سب کچھ آ رہا ہے۔آصف جاہ نے ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا۔وہ ہم سب کو مار دے گا۔اور بڑی بری موت مارے گا۔"

"لگتا ہے کہ تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔"میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"ہوش میں تم نہیں ہو۔"وہ تڑخ کر بولا۔تمہیں نئی نئی چودھراہٹ کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔اور عاشقی معشوقی نے اس نشے کو دوآتشہ کر دیا تھا۔دوآتشہ سمجھتے ہو نا تم؟"

مجھ سے اور برداشت نہیں ہوا۔بے ساختہ میرا ہاتھ گھوما اور ایک زوردار مکا نیم گنجے شخص کے چوڑے تھوبڑے پر پڑا۔وہ اس وار کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔وہ پشت کے بل گیلی زمین پر گرا۔اس کا ایک ساتھی چنگھاڑتا ہوا میری طرف آیا۔میرے دماغ میں بھی انگارے بھرے ہوئے تھے۔میں ذرا سا نیچے جھکا اور اس شخص کو اپنے سر کے اوپر سے اچھال کر آہنی

کھڑکی پر دے مارا۔ نیم گنجا شخص گالیاں بکتا ہوا اٹھا۔اس مرتبہ میں نے اس کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی اور پھر چہرے پر گھٹنے کی ضرب لگا کر اسے دور پھینک دیا۔

ایک اور دراز قد شخص آگ بگولا ہو کر نیم گنجے کی حمایت میں اٹھا لیکن تب ایک دوسرے شخص نے اس کا راستہ روک لیا اور گریبان سے پکڑ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

چند سیکنڈ کے اندر طویلے میں موجود افراد کے دو گروپ بن گئے۔۔۔۔۔اور پوری شدت سے آپس میں دست و گریباں ہو گئے۔ نیم گنجے اور اس کے دو ساتھیوں کو ٹھیک ٹھاک مار پڑی۔ نیم گنجے کا سر لہولہان ہو گیا۔اور اس کی ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ قیدیوں کی زنجیریں آپس میں بری طرح الجھ گئیں۔ایک فاقہ زدہ نوجوان کی گردن زنجیر کے گھیرے میں آگئی اور وہ دم گھٹنے سے بے ہوش ہو گیا۔

اس ساری کاروائی کے دوران میں باہر سے کوئی مداخلت نہیں ہوئی۔ دو پہرے دار سلاخ دار کھڑکی میں سے دیکھتے رہے اور طنزیہ انداز میں مسکراتے رہے۔ان کے رویے سے ظاہر تھا کہ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اندر موجود افراد میں سے کوئی مرتا ہے یا جیتا ہے۔ سب افراد نے خود ہی اپنی الجھی ہوئی زنجیروں کو سلجھایا اور ہانپتے کانپتے ہوئے بیٹھ

گئے نیم گنجے شخص کا نام ارشد تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ محکمہ انہار میں کلرک تھا اور اس کی شادی حال ہی میں قلعہ والا گاؤں کی ایک لڑکی سے ہوئی تھی۔

اس کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ درد سے بری طرح کراہ رہا تھا۔اس کا سارا دم خم ختم ہو چکا تھا۔اس کے دونوں ساتھی بھی کونوں میں سمٹے ہوئے گُم صُم بیٹھے ہوئے تھے۔اور اپنی لال لال آنکھوں سے دیگر ساتھیوں کو گھور رہے تھے۔

میری مدد کے لیے سب سے پہلے اٹھنے والے شخص کا نام غازی محمد تھا۔ یہ شخص مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے غازی کے ساتھ مل کر نیم گنجے شخص کو دیکھا۔اس کی ہڈی ٹوٹی ضرور تھی مگر اپنی جگہ سے زیادہ ہٹی نہیں تھی۔ میں نے اپنے اندازے کے مطابق اسے ٹھیک بٹھایا اور دو پرانے کپڑوں کی گدیاں سی بنا کر کندھے کے دونوں طرف رکھ دیں۔۔۔۔۔ باہر سے ایک پہرے دار نے تھوڑی سی روئی بھی پھینک دی تھی۔ ارشد ہائے ہائے کر رہا تھا۔

غازی نے کہا۔"اوئے گھبرانہ باؤ۔۔۔۔۔اپنے سالار صاحب ہر فن مولا بندے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک کر لیتے ہیں۔ تیری ہڈی تو کوئی شے ہی نہیں ہے۔"

میں نے اچھی طرح پٹی باندھ دی اور ارشد کو ایک گدیلے پر لٹا کر اوپر لحاف ڈال دیا۔

ارشد کے چہرے پر ابھی بھی سخت ناراضگی تھی۔ بہر حال، وہ تکلیف کی وجہ سے چپ تھا۔ ایک پہرے دار نے سلاخ دار کھڑکی سے افیم کی ڈلی اندر پہنچائی۔ ہم نے وہ ارشد کو کھلا دی۔ وہ کچھ دیر کر ہتا رہا اور پھر سو گیا۔

غازی نے مجھے بتایا۔ "اس کی شادی کوئی آٹھ دس ماہ پہلے ہوئی تھی۔ یہ طبیعت کا ذرا سخت ہے۔ بیوی سے جھگڑا ہو گیا۔ وہ میکے آگئی۔ یہ کچھ دن بعد اسے زبردستی ساتھ لے گیا۔ یہ خبر لمبڑ دار آصف جاہ تک پہنچ۔ اس نے راتوں رات اسے اٹھوا لیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس واقعے کو اب چاہ پانچ مہینے ہو چکے ہیں۔ اس چار دیواری سے باہر کسی کو پتا نہیں ہو گا کہ باؤ ارشد اب کہاں ہے؟"

"کسی کے گھریلو جھگڑے میں نمبر دار کو کودنے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی اس طرح کہ بندہ ہی غائب کر کے یہاں پہنچا دیا گیا۔" میرا لہجہ دھیما تھا۔

غازی نے عجیب لہجے میں کہا۔ "یہاں آپ کو مجھ سمیت جتنے بھی نظر آ رہے ہیں، ان کی کہانی اس سے ملتی جلتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"وہ جو سامنے بلی آنکھوں والا ہے نا، قلعہ والا گاؤں کا ہی ہے۔ اس نے اپنی بیوی سے جھگڑے کے بعد اپنی ساس کے ماتھے پر سٹیل کا گلاس مارا تھا جس سے اس کا خون نکل آیا تھا۔ اس جرم کی سزا میں یہ بھی رات کے اندھیرے میں اٹھایا گیا اور یہاں پہنچا دیا گیا۔ اس کی بہت لمبی لمبی مونچھیں تھیں۔ نمبر دار نے اس کی مونچھوں کو گدھے کے پیشاب سے نرم کر کے منڈوا دیا تھا۔ اور وہ جو تیسرے نمبر پر اونچی ناک والا بیٹھا ہے، اسے دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں، اس نے کیا کیا ہے؟"

"اس کی شادی بھی دو تین مہینے پہلے ہوئی تھی۔ اپنے سسرالیوں کا اس سے جھگڑا ہوا۔ اس نے بیوی پر پابندی لگا دی کہ وہ اپنے میکے کے کسی شخص سے نہیں ملے گی۔ اس کی ساس نے نمبر دار تک شکایت پہنچائی کہ وہ بیمار ہے اور اپنی بچی کو دیکھنے کے لیے ترس رہی ہے۔ نمبر دار نے اس وقت تو کوئی کارروائی نہیں کی مگر آٹھ دس دن بعد جب یہ اشفاق نامی بندہ ہار دانہ خرید کر گوجرانوالہ سے واپس آ رہا تھا، کچھ لوگوں نے اسے کھیتوں میں دبوچ لیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو یہ اس طویلے میں تھا۔ یہ تقریباً ایک مہینے سے اس طویلے میں ہے۔ پانچ چھ دن پہلے

اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوا۔اللہ ایسا وقت کسی کو نہ دکھائے جی۔۔۔۔" غازی نے کانپ کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"کیا ہوا؟"

"بس چھوڑیں جی،ایسی باتوں سے دل دکھتا ہے۔بس سمجھیں جی کہ ہم سب یہاں ایک بہت بڑی مصیبت کے گھیرے میں ہیں۔ہمارے ساتھ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔نمبر دار آصف جاہ کی ذہنی حالت آپ نے دیکھ ہی لی ہو گی۔وہ بالکل جنونی ہو چکا ہے۔اوپر سے ہر وقت شراب کی بوتل اس کے منہ سے لگی رہتی ہے۔اولاد کے مرنے کا غم واقعی بڑا غم ہوتا ہے لیکن اس غم کی وجہ سے اَن جان لوگوں کو جیتے جی مار دینا اور زندگی موت کے درمیان لٹکا دینا کہاں کا انصاف ہے؟"

"شاید تم شہوار کی موت کی بات کر رہے ہو۔شہوار کی موت کی وجہ سے تم لوگوں پر ظلم ڈھانے کا کیا مطلب؟"

"بس یہی بات تو سمجھ میں نہیں آئی۔لیکن جب غور کریں تو تھوڑی تھوڑی سمجھ میں آتی بھی ہے۔اب میری طرف ہی دیکھیں۔میری بیوی شروع سے بدزبان تھی۔چار پانچ سال میں

نے جیسے تیسے گزارے۔جن دنوں مچھلی فارم والے رقبے کے لیے موکھلوں سے دوسری بار لڑائی ہوئی تھی،میں بھی آٹھ دس دوسرے بندوں کے ساتھ گرفتار ہوا تھا۔

ڈیڑھ سال جیل میں رہا۔اس دوران میں اس نے میرے ماں باپ کو بہت تنگ کیا۔۔۔۔میرے گھر سے سامان اور روپیہ پیسہ چرا چرا کر اپنے ماں پیو کا گھر بھرتی رہی۔میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔میں نے اسے طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔دنیا میں یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر میرے لیے یہ ایک بہت بڑا جرم بن گیا۔ایک روز میں اپنے سسر سے ملنے کے لیے قلعہ والا آیا تو واپس نہ جا سکا۔رات کو کچھ ڈھاٹا پوش بندوں نے مجھے گھوڑی سے اتار کر مارا اور بے ہوش کر کے یہاں پہنچا دیا۔" غازی کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

"کب سے ہو یہاں؟"

"پورے چار مہینے ہو گئے ہیں۔میری بہن کی شادی ہونے والی تھی۔والدہ بھی بیمار تھی۔مجھے اپنے پچھلوں کی کچھ خبر نہیں ہے۔اب تو لگتا ہے کہ یہاں سے زندہ نکلنا ہی نصیب نہیں ہو گا۔سورج کی روشنی دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔نہائے ہوئے مدتیں گزر گئیں۔سردی اور بھوک ہڈیوں کو گُھلا رہی ہے۔ہمیں چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار کھانا دیا جاتا ہے

اور وہ بھی جانوروں کی طرح۔ دس بارہ دن پہلے ایک قریبی پنڈ جل پور کا لڑکا بھوک اور نمونیے سے مر چکا ہے۔ اس کی گردن میں زنجیر کی وجہ سے گہرا زخم بن گیا تھا۔"

زخم کا تصور کر کے غازی نے جھرجھری سی لی۔

"اس سارے معاملے کی تمہیں کیا سمجھ آ رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی، پہلے پہلے تو کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ ہر کوئی اپنے ذہن کے مطابق اس مصیبت کے پیچھے کوئی نئی وجہ ڈھونڈتا تھا لیکن اب سب کو پتا چل گیا ہے۔" غازی نے ایک گہری سانس لی۔

"کیا پتا چل گیا ہے؟"

"آپ کو یہ بات عجیب سی لگے گی۔ لیکن یہ ہے ویسے ہی جیسے میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ میرے خیال میں اگر میں آپ کو نہ بھی بتاؤں گا تو ایک دو دن میں آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا۔" غازی محمد نے ایک بار پھر طویل سانس لی اور بولا۔ "دراصل اس منحوس طویلے میں آپ کو جتنے بندے نظر آ رہے ہیں۔ ان کا قصور صرف اور صرف یہ ہے کہ ۔۔۔۔۔ یہ داماد ہیں۔"

"داماد؟"

"جی ہاں ۔۔۔۔۔ داماد۔ نمبردار آصف جاہ اپنے دیوانے پن میں داماد کے لفظ سے ہی بدترین نفرت کرنے لگ گیا ہے۔ یہ لفظ اور یہ رشتہ اس کے سینے میں زہر سے بجھے تیر کی طرح لگتا ہے اور وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اس نے یہاں اپنے دیوانے پن کا ایسا ایسا تماشا دکھایا ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔"

لالٹین کی مدھم روشنی میں ہم ایک گوشے میں سمٹے مدھم آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ باقی افراد میں سے زیادہ تر بالکل لاتعلق بیٹھے تھے۔ اپنی اپنی کہانی میں گُم ۔۔۔۔۔ اپنی اپنی سوچوں کے گھیرے میں ۔۔۔۔۔ ان میں سے ایک شخص نے مجھے ایک بوسیدہ سا کوٹ بھی دیا۔ بعد ازاں پتا چلا کہ یہ ایک مرنے والے قیدی کے جسم سے اترا تھا۔

اسی دوران میں ارشد جسے یہاں ارشد باؤ کہا جاتا تھا، اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے کندھے کی تکلیف اب کچھ کم تھی۔ لڑائی، مار کٹائی کے بعد اس کے چہرے پر دوستانہ تاثرات کی جھلک تھی۔ غازی نے اسے اپنے قریب بلا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی ٹھنڈی ٹیک لگا کر ہمارے ساتھ گفتگو میں شریک ہو چکا تھا۔

اس نے اپنی بڑی بڑی ذہین آنکھیں میرے چہرے پر گاڑیں اور نحیف آواز میں بولا۔ "شاہ خاور! پتا نہیں کیوں میرے دل میں یہ وہم بیٹھا ہوا تھا کہ تم بھی ضرور اس طویلے میں نظر آؤ گے۔ نمبر دار تمہیں بھی کسی نہ کسی طرح پھنسا کر یہاں لے آئے گا۔۔۔۔۔اور میری اس بات کا برا نہ ماننا، جب میں یہ کہتا ہوں کہ نمبر دار کا اصل شکار تم ہی ہو۔۔۔۔۔اور ہم سب صرف اس لیے شکار ہوئے ہیں کہ تم اس کی پہنچ سے دور تھے۔۔۔۔۔تو میں کوئی غلط نہیں کہتا۔ تم اپنے دل میں جھانک کر بتاؤ، کیا میں غلط کہتا ہوں؟"

"سچی بات یہ ہے کہ میں ابھی تک اس سارے معاملے کو سمجھ نہیں سکا ہوں۔"

"یہ کوئی حساب کا ایسا پیچیدہ سوال نہیں ہے شاہ خاور۔۔۔۔۔یہ سب جانتے ہیں کہ شہوار، نمبر دار آصف جاہ کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ بچپن سے اسے بے حد پیار کرتا تھا۔ آصف جاہ کی ساری محبتیں اپنی بیٹی میں ہی اکٹھی ہو گئی تھیں۔ وہ اس کے لیے بہتر سے بہتر بَر کی تلاش میں تھا اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی تو تم رشتوں کی بھیڑ میں اسے ایک چڑھتے سورج کی طرح نظر آئے۔ اس نے اپنی لاڈلی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے

ہے۔ ایک ایسی کہانی بن گئی جس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ ہاں۔۔۔۔۔یہاں میں تمہیں ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں جو شاید تمہیں پتا نہ ہو۔"

اس نے ذرا توقف کیا اور اپنے زخمی کندھے کو دبانے کے بعد بولا۔ "آصف جاہ کی بہن بھی بس ایک تھی اور وہ بھی گھر والوں کی بہت لاڈلی تھی۔ بد قسمتی سے اس لڑکی کی گھریلو زندگی بھی بڑی تلخ گزری۔ شادی کے پانچ چھ ماہ بعد ہی اس کے زمیندار شوہر نے اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ بعد میں اس لڑکی نے کنویں میں کود کر جان دے دی اور اس کا شوہر باہر کے ملک فرار ہو گیا۔"

ارشد نے ذرا توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھی۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت آصف جاہ کے اندر جو جنون نظر آ رہا ہے، اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اپنی بیٹی کی موت کے بعد وہ بالکل دیوانہ ہو گیا ہے۔ اب وہ ہر اس بندے سے انتقام لے رہا ہے جس میں اسے "جوائی پن" کی کوئی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ ایک خطرناک نفسیاتی بیماری ہے۔ اگر تم ایسی بیماریوں کو تھوڑا بہت سمجھتے ہو تو شاید تم میری بات سمجھ جاؤ۔"

یہ سب انوکھی صورت ِ حال تھی۔ آصف جاہ کے جنون نے یہاں کچھ ایسے لوگوں کو جمع کر لیا تھا جو تقریباً بے قصور تھے۔ وہ گھریلو جھگڑوں میں ملوث تھے۔ ایسے جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔ کہیں ان کی شدت کم ہوتی ہے کہیں زیادہ۔ مگر آصف جاہ نے ایسے جھگڑوں میں ملوث لوگوں کو مجرم گردانا تھا اور اپنی شدید نفرت کے گھیرے میں لے لیا تھا۔

یہاں سوچنے کی بات اور بھی تھی۔ اگر وہ ان لوگوں کو صرف اس لیے بدترین غضب کا شکار بنا رہا تھا کہ ان میں اسے میری یا اپنے بہنوئی کی جھلک نظر آتی تھی تو پھر وہ مجھے کس سلوک کا مستحق ٹھہرا سکتا تھا۔ شاید اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ میری موت کو بہت مشکل بنا دے گا۔

اچانک ہم سب کو بری طرح چونکنا پڑا۔ کسی عورت کے رونے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں کسی بند کمرے سے بلند ہو رہی تھیں۔ غازی اور ارشد کے رنگ زرد ہو گئے۔۔۔۔ اونچی ناک والا نوجوان بھی ایک دم مضطرب نظر آنے لگا۔

"یہ کیا چکر ہے؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"یہ وہی چکر ہے جو میں نے آپ کو بتایا تھا۔" غازی نے سرگوشی میں کہا۔

میری سوالیہ نظریں بدستور غازی کے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ اونچی ناک والے کی طرف اشارہ کر کے ہولے سے بولا۔ "اس کا نام اشفاق ہے۔ نمبر دار آصف کے کارندے اس کی والدہ کو یہاں ساتھ والے کمرے میں لے کر آئے تھے۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے قریب ہے۔ بے چاری عورت کے کپڑے اتار دیئے گئے اور اسے سخت سردی میں کئی گھنٹے سردی میں کھڑا رکھا گیا۔ وہ بیٹھتی تھی تو اس کی ٹانگوں پر بید کی چھڑی سے چوٹیں لگائی جاتی تھیں۔ جب وہ نڈھال ہو گئی تو نمبر آصف جاہ آ گیا۔ اس نے اپنے سامنے اسے ہنٹر سے بری طرح پٹوایا۔ وہ اسے لعنتی ساس کا خطاب دے رہا تھا۔ جب وہ بے ہوش ہو کر گر گئی تو اسے اٹھا کر باہر لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ آج پھر وہی ہونے والا ہے۔"

میں سمجھ گیا ابھی تھوڑی دیر پہلے غازی نے جس اندوہناک واقعے کا ذکر کر کے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔۔۔۔ وہ یہی تھا۔

اونچی ناک والا اشفاق جس کی ماں کے ساتھ یہ بہیمانہ سلوک ہوا تھا۔۔۔۔ اور شاید پھر ہونے جا رہا تھا۔۔۔۔ ہلدی کی طرح زرد دکھائی دیتا تھا۔

مگر پھر چند سیکنڈ بعد وہ قدرے نارمل نظر آنے لگا۔ غازی، ارشد اور دیگر افراد کے تاثرات بھی کچھ بدلے بدلے دکھائی دیے۔

ارشد نے سرگوشی میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ اشفاق کی والدہ کی آواز نہیں ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے یہ کوئی جوان لڑکی ہے۔" غازی نے خیال ظاہر رکھا۔

رونے چلانے کی آوازیں قریب آتی گئیں۔ طویلے میں موجود افراد ایک کھڑکی کے آگے سے کپڑا اہٹا ہٹا کر ساتھ والے کمرے میں جھانک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد نسوانی آوازیں فلک شگاف ہو گئیں۔ وہ لڑکی یا عورت جو بھی تھی، اب ساتھ والے کمرے میں تھی۔ میں اور غازی بھی کھڑکی کی طرف گئے۔ سلاخ دار کھڑکی کے آگے کپڑے کو کیلوں سے ٹھونک دیا گیا تھا تاکہ طویلے میں سرد ہوا کی آمد و رفت کچھ کم ہو سکے۔ کپڑے کو ایک طرف سے ہٹا کر میں نے ساتھ والے کمرے میں جھانکا تو دماغ چکرا کر رہ گیا۔

یہاں ایک لڑکی موجود تھی۔ اس کے جسم پر بہت تھوڑا لباس تھا۔ اس کے بال ایک شخص کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ اسے کھینچتا ہوا کمرے کے وسط میں لا رہا تھا۔ پھر اس نے اسے گھما کر پرالی پر پھینک دیا۔ لڑکی کی ایک آنکھ نیلی ہو رہی تھی۔ چہرے اور جسم کے مختلف

حصوں پر چوٹیں تھیں۔۔۔۔۔ یہاں لانے سے پہلے اسے اتنی مار لگائی گئی تھی کہ بے چاری کا دم خم ختم ہو چکا تھا۔ زیادہ دردناک منظر یہ تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

"بچاؤ۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔ کوئی ہے۔" لڑکی چلا رہی تھی۔

ہٹے کٹے شخص نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ اس کے بال بکھر گئے اور وہ بالکل نڈھال سی ہو گئی۔ کوشش کے باوجود میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکا۔ میں اپنے گلے کی زنجیر کو کھینچتے ہوئے کھڑکی کے پاس آیا اور سلاخوں سے منہ لگا کر زور سے بولا۔ "اوئے۔۔۔۔۔ خدا کا خوف کر۔۔۔۔۔ چھوڑ دے اس کُڑی کو۔ میں کہتا ہوں چھوڑ دے۔"

ہٹے کٹے شخص نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ وہ بدستور روتی چلاتی لڑکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ ایک دوسرے پہرے دار کی آواز دروازے کی طرف سے آئی۔ مجھے اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ایک نہایت زہریلا فقرہ میرے کانوں میں اتارا۔ وہ بولا۔ "شیر

شاہ صاحب! ابھی اتنا اچھلنے کی ضرورت نہیں۔ جب تمہاری بہن یہاں آئے گی تب جتنا مرضی چلا لینا۔"

میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی۔ جی چاہا کہ اپنی اس زنجیر کو اتنی زور سے جھٹکے دوں کہ وہ دیوار ہی اکھڑ جائے جس سے یہ پیوست ہے۔ تڑپ پھڑک کر خود ختم ہو جاؤں یا ان بے رحم رکاوٹوں کو ختم کر دوں۔ یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ میں ایک بار پھر چلایا۔ "حرامزادے! تیری اپنی ماں بہن بھی تو ہو گی۔ اس کے ساتھ ایسا ہوا تو کیا کرے گا۔۔۔۔ چھوڑ دے اس کو۔"

وہ شخص تو جیسے اندھا بہرا ہو چکا تھا۔ اس درندے کی طرح جو اپنے پنجوں میں آئے ہوئے شکار کے علاوہ کچھ دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے۔ وہ شراب کے نشے میں دھت تھا۔ ہماری آنکھوں کے عین سامنے وہ لڑکی کو تاراج کرنے پر تلا ہوا تھا۔۔۔۔

اچانک ایک آواز نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہ طویلے کے اندر سے ہی بلند ہوئی تھی۔ "نہیں۔۔۔۔ خدا کے لیے نہیں۔۔۔۔ چھوڑ دو اسے۔۔۔۔ یہ بے قصور ہے۔ میری جان لے لو۔ چھوڑ دو اسے۔" ایک نوجوان پوری طاقت سے پکار رہا تھا۔

میں نے مصیبت زدہ لڑکی کی صورت دیکھی تھی۔ اس روتے کرلاتے نوجوان کو دیکھ کر میں ایک لحظے میں سمجھ گیا کہ یہ اس کی بہن یا قریبی کزن ہو گا۔

وہ اپنی زنجیر کو دیوانہ وار جھٹکے دینے لگا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ اس کی گردن خوفناک انداز میں ایک طرف مڑ جاتی تھی۔ مجھے بہ عین یہی لگا کہ وہ اپنی دبلی پتلی فاقہ زدہ گردن تڑوا بیٹھے گا۔ دو تین افراد نے نوجوان کو پکڑ لیا۔ وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے لیکن ناکام رہے۔ نوجوان نے تڑپ کر شیشے کی ایک بوتل اٹھائی۔ اسے دیوار پر مار کر توڑا، یہ ایک خطرناک ہتھیار بن گئی۔ پلک جھپکتے میں نوجوان نے یہ بوتل اپنی گردن پر مار لی۔ خون کی دھار نکلنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ خود پر دوسرا اور زیادہ سنگین وار کرتا، میں نے لپک کر اس کا بوتل والا ہاتھ تھام لیا۔ وہ چلانے لگا۔ "چھوڑ دو مجھے۔۔۔۔ مر جانے دو۔۔۔۔ مجھے مر جانے دو۔۔۔۔"

پھر وہ ایک دم تیورا کر پرالی یعنی چاول کی چھال پر گر گیا۔ اس کا رنگ بالکل زرد ہو گیا تھا۔ پتلیاں اوپر چڑھ گئی تھیں۔ جسم اینٹھنے لگا۔ اسے ہارٹ اٹیک ہو رہا تھا یا کسی طرح کا

اعصابی دورہ پڑ گیا تھا۔اس کے ساتھی واویلا کرنے لگے۔غازی اس کی گردن کا خون روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

یہ سفاکی کی انتہا تھی۔اس ساری صورتِ حال کے باوجود ساتھ والے کمرے میں ہٹا کٹا شخص بدستور روتی چلاتی لڑکی سے گتھم گتھا رہا۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے بس ہو گئی۔دروازے پر کھڑے پہرے دار نے جس کی شکل مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی،ایک کمبل لڑکی اور مرد کے اوپر پھینک دیا۔اس کے بعد کے مناظر دیکھنا میرے بس میں نہیں تھا۔شاید کسی کے بس میں بھی نہیں تھا۔متحرک کمبل کے نیچے اس روئے زمین کا بدترین فعل انجام دیا جارہا تھا۔اسے کون انجام دے رہا تھا؟وہی اشرف المخلوقات جسے ملائک نے سجدہ کیا تھا۔جسے قدرت نے تمام جانداروں میں سے بہترین صلاحیتیں دے کر نہایت لطیف جذبوں سے نوازا ہے۔

دوسرے کمرے سے ابھرنے والی آوازوں کو سماعت تک پہنچنے سے روکنے کے لیے بیشتر افراد نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لی تھیں۔شاید میں بھی ٹھونس لیتا۔مگر پھر یہ آوازیں خود ہی ناپید ہو گئیں۔شاید روتی بلکتی لڑکی ہوش وحواس سے بے گانہ ہو گئی تھی۔ایک طرف

فاقہ زدہ بھائی بے ہوش پڑا تھا۔دوسری طرف کمزور ناتواں بہن تھی۔دونوں کے زخموں سے رستا ہوا لہو پرالی کو داغ دار کر رہا تھا۔

نوجوان کے جسم میں اکڑاؤ کی کیفیت اب ختم ہو گئی تھی۔سانس میں آنے والے جھٹکے بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔تاہم وہ بھی مکمل بے ہوش تھا۔اس کی نہایت زرد پیشانی پر پسینے کی بوندیں تھیں۔

وہ رات بڑی اذیت میں گزری۔رات پچھلے پہر بدقسمت بہن کے بدنصیب بھائی کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ وہ کسی بھی وقت خودکشی کی کوشش کر سکتا تھا۔بہر حال،اس کے ساتھیوں نے اسے سنبھالا ہوا تھا۔ساتھ والے کمرے میں اب کوئی نہیں تھا۔وہ لڑکی اب نہ جانے کہاں اور کس حال میں تھی۔نہ چاہنے کے باوجود میرا ذہن بار بار اپنے گھر والوں کی طرف جارہا تھا۔سینے میں کچھ ہونے لگتا تھا۔ایک سلگتی ہوئی آگ الاؤ بننے لگی تھی۔یہ الاؤ اس وقت کچھ اور بھی بلند ہو جاتا تھا جب پہرے دار کا کہا ہوا زہریلا فقرہ کانوں میں گونجتا تھا۔۔۔۔

اس نے کہا تھا۔"ابھی اتنا اچھلنے کی ضرورت نہیں۔جب تمہاری بہن یہاں آئے گی تب جتنا جی چاہے شور مچالینا۔"

مجھے لگتا تھا کہ میری اذیت، میری برداشت سے باہر ہو جائے گی۔

صبح نو بجے کے قریب آصف جاہ کی شکل ایک کھڑکی سے باہر نظر آئی۔اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھیں حسبِ معمول کبوتر کے خون کی طرح سرخ تھیں۔دو محافظ اس کے عقب میں تھے۔ان محافظوں کے ہاتھوں میں قیمتی زنجیروں سے بندھے ہوئے دو شکاری کتے تھے۔وہی خوفناک مصری سلو کی ہاؤنڈز۔

آصف جاہ نے بیڑی کے چند طویل کش لے کر ارد گرد کی فضا کو دھوئیں سے مکدر کیا اور زہر خند لہجے میں طویلے کے قیدیوں کو مخاطب کر کے بولا۔"ہاں بھئی! جاگ گئے ہیں سارے داماد؟"

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیشتر سر جھکائے بیٹھے رہے۔وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔"تم ہی کچھ بولو، ہمارے داماد صاحب۔"

میں نے بھی منہ پھیر لیا۔

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔"لگتا ہے کہ دامادوں کو رات والی لڑکی کا تماشا زیادہ پسند نہیں آیا۔کیوں مظفر! یہی بات ہے نا؟"اس نے اپنے خوفناک صورت محافظ کی تصدیق چاہی۔

"ہاں جی! ایسا ہی لگتا ہے۔"

آصف جاہ نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔"یار! وہ کوئی لڑکی تھوڑی تھی۔وہ تو نند تھی۔صرف نند تھی۔لمبی زبان والی، سخت ہڈ پیر والی۔ایسی کراری نندیں بڑی بھیڑی شے ہوتی ہیں۔اپنی بھابیوں کا جینا حرام کر دیتی ہیں۔جب تک وہ اپنے گھر کی نہیں ہو جاتیں، بھابیوں کی جان سولی پر لٹکتی رہتی ہے۔ایسی نندوں کو تو رول رول کر مارنا چاہئیے۔"آصف جاہ کے لہجے میں ہیجان تھا۔

میں نے آصف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔"آصف! تجھے تیری نفرت نے بالکل اندھا کر دیا ہے۔کیا تُو نے یہ بھی سوچا ہے جس کو تُو نند کہہ رہا ہے وہ صرف نند نہیں تھی۔وہ کسی کی بیٹی بھی ہے اور بہن بھی ہو گی۔جس طرح تُو شہوار کو چاہتا تھا، کوئی اس لڑکی کو بھی چاہتا ہو گا۔۔۔۔"

ایک لحظے کے لیے نمبر دار کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ مگر پھر فوراً ہی اس نے بیڑی کو مٹھی میں دبا کر دو مزید کش لیے اور بولا۔ "تم مجھے کتابی باتیں نہ بتاؤ۔ مجھے وہ بتاؤ جو تم نے میری بیٹی کے ساتھ کیا اور جو تمہاری ماں بہن نے کیا۔۔۔۔اور پھر تمہاری معشوقہ نے بھی۔ میں کچھ بھی بھولا نہیں ہوں۔ ایک ایک زیادتی میرے سینے پر لکھی ہوئی ہے۔ یہاں۔۔۔۔ یہاں!" اس نے سینے پر زور سے دو دفعہ ہاتھ مارا اور اس کی آنکھوں میں قہر لشکارے مارنے لگا۔

"میں نے کہا ہے نا۔۔۔۔ اس میں تیرا قصور نہیں ہے۔ تجھے نفرت اور انتقام نے اندھا کر دیا ہے اور اس اندھے پن کی سزا تجھے یہ مل رہی ہے کہ تیری بیٹی کے اصل قاتل تیرے ارد گرد دندنا رہے ہیں اور تو بے گناہوں کو پکڑ پکڑ کر اپنا اعمال نامہ کالا کر رہا ہے۔"

"ابھی کالا کہاں ہوا ہے۔ ابھی تو ایک دو نقطے پڑے ہیں اس پر۔ اگر شہوار کی ساس اور نند یہاں پہنچ گئیں تو پھر شاید یہ کالا ہو جائے۔" اس کے لہجے میں خوفناک دھمکیاں پوشیدہ تھیں۔

اور یہی خطرات تھے جو مجھے ہر پل انگاروں پر لوٹا رہے تھے۔ میرے دل کی کیفیت کچھ عجیب ہو رہی تھی۔ میں ساری زنجیریں توڑ کر ساری دیواریں ڈھا کر اپنی ماں اور بہن کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ان کے گرد اپنے بازوؤں کا ایسا آہنی حصار باندھنا چاہتا تھا جس سے ٹکرا کر ہر خطرہ پاش پاش ہو جائے۔

لیکن یہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ آصف جاہ نے اس طویلے کو ایک ایسے بندی خانے کا روپ دے دیا تھا جس کی دیواروں سے ٹکرایا تو جا سکتا تھا، رہائی حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس جگہ کو انسانی اصطبل کہا جاتا تو غلط نہ ہوتا۔ انسان گھوڑوں ہی کی طرح بندھے ہوئے تھے۔ یہاں وہی بدبو اور نمی تھی جو مویشی خانوں کا خاصا ہوتی ہے۔

ہر قیدی کی زنجیر کی لمبائی بیس پچیس فٹ کے قریب تھی۔ یہ زنجیریں ہر وقت عجیب سا شور برپا رکھتی تھیں۔ اور بعض اوقات آپس میں الجھ بھی جاتی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ چھوٹا سا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ اس کوٹھڑی کا تھا جس میں یہ قیدی ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے جاتے تھے۔۔۔۔

ان میں سے بیشتر افراد اپنی زندگی سے عاجز آ چکے تھے۔ شام کے وقت آہنی سلاخوں کی دوسری طرف سے ان دامادوں کو اسی طرح روٹی پھینکی گئی جیسے کل پھینکی گئی تھی۔ بھوک سے بے حال افراد زیادہ روٹی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔۔۔۔روٹی کے ساتھ کسی بھی طرح کا سالن نہیں تھا۔ بہر حال کل کی نسبت آج روٹی کچھ زیادہ تھی۔ پینے کے پانی کے دو گھڑے رکھے تھے۔ان میں سے ایک گھڑا کل کی دھینگا مشتی میں ٹوٹ چکا تھا۔ایک اونچا مٹکا اس کوٹھڑی میں تھا جسے باتھ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

رات کے وقت جب اس زنداں کے مدقوق قیدی بے چارگی اوڑھ کر سو گئے تو میں جاگتا رہا۔ سینے میں نیلے شعلے بھڑک رہے ہوں تو نیند آنکھوں سے دور چلی جاتی ہے۔ میں کبھی بیٹھ جاتا، کبھی اٹھ کر ایک دیوار کے ساتھ ٹہلنے لگتا۔ مجھے یہاں سے نکلنا تھا۔اس سے پہلے کہ میرے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ ختم ہو جاتی اور میں بھی یہاں موجود دوسرے افراد کی طرح اس پنجرے کو ہی گھر سمجھنے لگتا، مجھے یہاں سے نکلنے کی ایک سر توڑ کوشش کرنا تھی۔اس کوشش کا انتظام میں نے کل رات ہی کر لیا تھا۔ کل جس نامعلوم لڑکی کو ساتھ والے کمرے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں تاراج کیا گیا تھا۔۔۔۔اس کی بے بسی نے جہاں میرے دل پر گہرے چرکے لگائے تھے ،وہاں مجھے ایک ہتھیار بھی فراہم کر دیا تھا۔ یہ ہتھیار ایک "ہیئر پن" کی صورت میں تھا۔ شرابی مرد کا تھپڑ کھا کر لڑکی پرالی پر گری تھی اور اس کے منتشر بالوں سے یہ ہیئر پن جدا ہو کر کھڑکی کے قریب آ گئی تھی۔ سلاخ دار کھڑکی کی اونچائی زمین سے ڈھائی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ کل رات ہی میں نے سلاخوں کے اندر سے بازو گزار کر یہ ہیئر پن اٹھا لی تھی۔

میں ہر فن مولا تھا یا نہیں لیکن ایک بات تھی، میں جو کام کرتا تھا پوری دل جمعی اور یکسوئی سے کرتا تھا۔ وہ کام کرتے ہوئے مجھے باقی سب کام تقریباً بھول جاتے تھے۔ کام جیسا بھی ہوتا تھا میں اس میں کھو جاتا تھا اور خود کو یقین دلاتا تھا کہ یہ کام میں نے ہی کرنا ہے اور کسی کی بھی مدد کے بغیر۔ اور اکثر وہ کام ہو جاتا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ میری صلاحیتوں سے زیادہ میرے یقین کی بات تھی۔ میرے یقین کے سبب قدرت بھی میری مدد کرتی تھی۔

میں نے کل رات والی بدنصیب لڑکی کی ہیئر پن کو موڑ کر ایک تار کی شکل دے دی اور اس تار سے وہ چھوٹا سا تالا کھولنا شروع کر دیا جسے عام زبان میں جندری کہا جاتا ہے۔ یہ تالا میرے

گلے کی آہنی پٹی کو مقفل کرتا تھا۔ میں لیٹا رہا اور بڑی خاموشی سے کوشش کرتا رہا۔ لالٹین کی روشنی بہت دھیمی تھی۔ سلاخ دار کھڑکیوں سے باہر پہرے دار اونگھ رہے تھے۔ ایک طویل سرد رات نے قلعہ والا کے نشیب و فراز پر اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھے۔ مہیب سناٹے میں بس کبھی کبھی کسی پہرے دار کی آواز گونجی تھی۔ "جاگدے رہو۔" یا پھر گاؤں کی گلی میں کوئی ٹھٹھرا ہوا کتا اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔

میرے جلے ہوئے دونوں پاؤں پر آبلے پڑ گئے تھے۔۔۔۔ اور سر کی ایک جانب دو گومڑ بنے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اندرونی بیرونی بہت سی چوٹیں تھیں۔ دبے پاؤں سے گزرتی ہوئی رات میں عجیب سافسوں تھا۔

اچانک "کلک" کی ایک دھیمی آواز امید کی کرن بن کر ابھری۔ تالے کے ساتھ میری مسلسل چھیڑ چھاڑ بالآخر رنگ لے آئی تھی۔ میری گردن کا طوق کھل گیا۔ چوبیس گھنٹے میں ہی اس منحوس طوق نے میری گردن پر خراشیں ڈال دی تھیں۔ گلے سے زنجیر نکلنے کے بعد یہی لگا کہ جیسے میری گھٹی ہوئی سانسیں بحال ہو گئی ہیں۔ آزادی اور غلامی کا فرق بھی معلوم ہوا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

جس طویلے میں ہمیں رکھا گیا تھا اس کی چوڑائی بیس فٹ اور لمبائی ساٹھ فٹ کے لگ بھگ تھی۔ چھت شہتیروں اور بالوں کی تھی۔ اس چھت میں دو جگہ چھوٹے چھوٹے چوکور خلا تھے۔ یہ خلا روشنی اور ہوا وغیرہ کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ دیہات میں اسے "مکھ" کہا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ مکھ کھلے ہوتے ہیں لیکن اس طویلے کے دونوں مکھوں میں تین تین آہنی سلاخیں تھیں۔۔۔۔ میرا اندازہ تھا کہ مٹی میں لگی ہوئی یہ سلاخیں زیادہ مضبوط نہیں ہیں اور انہیں کوشش کر کے اکھاڑا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنے قریب لیٹے غازی محمد کو جگایا۔۔۔۔ اور بڑی دھیمی آواز میں اسے بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت حیران ہوا۔ نیند سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "خاور صاحب! مجھے آپ کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ہمارے گلے میں جو زنجیر ہے وہ کسی صورت ہمیں اس مکھ تک نہیں پہنچنے دے گی۔"

"لیکن اگر زنجیر نہ ہو تو؟" میں نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

میں نے اسے اپنی گردن کا آہنی حلقہ کھول کر دکھایا۔اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔میں نے اسے بتایا کہ پچھلے ڈھائی تین گھنٹے کی میری کوشش کس طرح رنگ لے آئی ہے۔میں نے کچھ دیر غازی کی زنجیر کے تالے کے ساتھ بھی کوشش کی مگر یہ کام ایسا آسان نہیں تھا اور نہ ہی اتنی جلدی ہونے والا تھا۔

غازی بولا۔"مجھے چھوڑیں خاور صاحب!آپ یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔آپ یہاں سے نکل گئے تو شاید ہمارا بھی کچھ ہو جائے۔"

"شاید کیوں کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔یہ ضرور ہو گا۔یہ میری ذمے داری ہے۔تم نے سُنا نہیں تھا ارشد کیا کہہ رہا تھا۔نمبر دار کا اصل قصوروار تو میں ہوں۔تم سب اس لیے آفت میں ہو کہ میں نمبر دار کے ہتھے نہیں چڑھ رہا تھا۔اور ارشد نے یہ کوئی غلط بات نہیں کہی ہے۔۔۔۔"

ہمارے درمیان چند منٹ مشورہ ہوا۔پھر طویلے کی اکلوتی لالٹین ہم نے بجھا دی۔مکمل اندھیرا چھا گیا۔غازی صحت مند اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔وہ ایک مکھ کے عین نیچے کھڑا ہو گیا۔میں اس کے کندھوں پر چڑھا۔پھر اس کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔میرے ہاتھ مکھ تک پہنچنے لگے۔میرے ہاتھ میں وہی ٹوٹی ہوئی بوتل تھی جس سے ایک

دن پہلے نوجوان نے اپنی گردن زخمی کی تھی۔میں نے اس کے ہاتھ سے یہ بوتل چھین کر پرالی کے نیچے چھپا دی تھی۔اب یہ بوتل میرے لیے مٹی کھودنے کا ایک مناسب اوزار تھی۔مکھ کی دو سلاخوں کو اکھاڑنا میرے لیے توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا۔شاید میرے اندر کی وہ توانائی بھی بھرپور کام کر رہی تھی جس کا ماخذ میرے سینے میں بھڑکنے والے نیلے شعلے تھے۔تھوڑی سی خوش قسمتی بھی شاملِ حال رہی۔ہماری کاروائی کے دوران میں کسی پہرے دار نے مداخلت نہیں کی۔یقیناً انہیں اس قسم کی کسی حرکت کی توقع ہی نہیں تھی۔۔۔۔

میں نے بازوؤں کے زور پر اپنے جسم کو اوپر اٹھایا اور چھت کے سوراخ میں سے باہر نکل آیا۔چھت پر اوندھے لیٹ کر میں نے سر اوپر اٹھایا۔تاریک آسمان پر ٹھٹھرے ہوئے تاروں کا منظر عجیب لگا۔ہوا کی ٹھنڈک رگوں میں خون جما دینے والی تھی مگر میرے اندر کی بے پایاں تپش نے اس ٹھنڈک کو بے اثر کر دیا۔میں نے چھت پر اوندھے لیٹے لیٹے ہی اس جگہ کا پورا جائزہ لے لیا۔فی الحال میرے پاس واحد ہتھیار مٹی کے تیل کی وہی ٹوٹی ہوئی بوتل تھی۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ چھت سے نیچے اترا اور دیوار کے ساتھ ساتھ بیرونی چار دیواری کی طرف بڑھا۔ یہاں درخت تھے جو مجھے بہترین آڑ فراہم کر رہے تھے۔ مگر پھر اچانک یوں ہوا کہ رکھوالی کے کتوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ مجھے ان کی گونجتی ہوئی آوازیں مین دروازے کی طرف سے آئیں۔ اس کے ساتھ ہی پہریداروں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس سے پہلے کہ میں بیرونی چار دیواری تک پہنچتا اور اسے پھلانگنے کی کوشش کرتا، دو انسانی سائے مجھ پر جھپٹے۔

"خبردار اوئے!۔۔۔۔گولی مار دیں گے۔" ایک شخص للکارا۔ میں نے آواز پہچان لی۔ یہ آصف جاہ کا خاص کارندہ مولوی مظفر ہی تھا۔

میرے جسم میں اضافی توانائی کی بلند لہریں تھیں۔ اس سے پہلے کہ مظفر کے ہاتھ میں پکڑی رائفل شعلہ اگلتی، میں جست لگا کر اس پر جا پڑا۔ میرے ہاتھ اس کی رائفل پر آئے اور میرے سر کی طوفانی ضرب عین اس کی ناک پر لگی۔ وہ ڈکراتا ہوا پودوں میں گرا۔ رائفل پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے کرخت ہاتھوں سے جدا ہو گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

دوسرے پہرے دار نے پہلو کی طرف سے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے رائفل کا دستہ گھما کر اس کے چہرے پر مارا۔ دانت ٹوٹنے کی واضح آواز آئی اور وہ شخص بھی پشت کے بل گرا۔ مظفر سنبھل کر پھر میری طرف آیا۔ اس شخص کے لیے میرے دل میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔۔۔۔اس کا کہا ہوا زہریلا فقرہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں نے اس پر سیدھا فائر کیا۔ گولی اس کی ران میں لگی اور وہ تڑپ کر دہرا ہو گیا۔ دوسری گولی میں نے اس کی دوسری ٹانگ میں ماری۔ وہ اپنی تمام طاقت، پھرتی اور وحشت سمیت ایک کیاری میں گر کر تڑپنے لگا۔

میں اندھادھند گیٹ کی طرف بھاگا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ تین چار سلوکی ہاؤنڈز پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے میری طرف آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے شور مچاتے پہریدار تھے۔ مجھے دیکھ کر گیٹ کے قریب کھڑا پہرے دار بالکل چوکس ہو گیا۔ اس نے بے دریغ مجھ پر فائر کیا مگر یہاں میری قسمت نے یاوری کی۔ دو گولیاں مجھے چھوئے بغیر گزر گئیں۔ تیسری پہرے دار کی رائفل میں ہی پھنس گئی۔ میں نے بھاگتے بھاگتے اس پہریدار کی گردن پر

رائفل کا وزنی دستہ مارا۔ یہ چوٹ اسے کسی ایسی جگہ لگی کہ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گیٹ کے سامنے انگیٹھی کے قریب گرا اور بے حرکت ہو گیا۔

"پکڑو۔۔۔۔۔ پکڑو" کتوں کے عقب میں بھاگتے ہوئے پہریدار چلا رہے تھے۔

میں نے گیٹ کا وزنی کھٹکا کھولنا چاہا مگر پہلی کوشش میں ناکام رہا۔ اس دوران میں کتے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ مجھے لگا کہ اب میں یہاں سے نکل نہیں سکوں گا، شاید ابھی رہائی کا وقت نہیں آیا تھا۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے اپنا رخ پھیرا اور پشت گیٹ کے ساتھ لگا کر رائفل سیدھی کر لی۔ میری چلائی ہوئی پہلی گولی ہی اگلے سلوکی ہاؤنڈ کے چہرے پر لگی۔ وہ چلایا اور لڑھکنیاں کھاتا ہوا درخت میں گرا۔ دوسری گولی دوسرے کتے کو چاٹ گئی۔

باقی دو کتوں کی رفتار ایک دم کم ہوئی اور وہ خطرہ محسوس کر کے چند لحظوں کے لیے رک گئے۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے ہوائی فائر کیے اور دوسرے سے گیٹ کا کھٹکا کھول دیا۔ گیٹ سے نکلتے ہی میرے ذہن نے بروقت کام کیا اور میں نے باہر سے گیٹ کا کھٹکا چڑھا دیا۔ کتے ایک نہایت مختصر وقفے کے بعد پھر برق رفتاری سے گیٹ کی طرف آئے۔ گیٹ کے نیچے خلا موجود تھا، مگر اتنا زیادہ نہیں تھا کہ سلوکی ہاؤنڈ اس کے نیچے

سے نکل سکتا۔ انہوں نے اپنی تھوتھنیاں گیٹ کے نچلے خلا میں گھسیڑ دیں اور پوری قوت سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی آوازیں فلک شگاف تھیں۔

میں اس تھان کی طرف دوڑا جہاں گھوڑے بندھے رہتے تھے۔ تھان کے اندر سے ایک سایہ دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ میں نے اس کی ٹانگ پر فائر کرنے کے لیے رائفل سیدھی کی مگر اس کی صورت دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یہ وہی ایک بازو والا ماسٹر تھا جسے کچھ سال پہلے نمبردار کی طرف سے بازو کاٹے جانے کی سزا ملی تھی۔ لبلبی پر رکھی ہوئی میری انگلی رک گئی۔

"بھاگ جاؤ ماسٹر صاحب۔" میں پھنکارا۔

اپنی آواز کی بے پناہ وحشت خود مجھے بھی واضح طور پر محسوس ہوئی۔ ماسٹر جی کی ذہانت نے اسے سمجھا دیا کہ اگر اس نے اپنی نوکری بچانے کے لیے کسی بھی طرح کی نمک حلالی دکھانے کی کوشش کی تو وہ گولی کا نشانہ بن جائے گا۔

اس نے اپنا اکلوتا ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی پسپائی کا اشارہ دیا اور تیزی سے ایک طرف او جھل ہو گیا۔ مجھے دو ہی گھوڑے ایسے نظر آئے جن پر کاٹھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ایک گھوڑا سنبھالا اور اصطبل سے نکل کر بڑی تیزی سے کھیتوں میں آگیا۔

تب تک حویلی کے محافظ حویلی کے پہلو کی طرف سے دیوار پھاند پھاند کر باہر آ چکے تھے۔مجھے فوری خطرہ ایک جیپ سے ہو سکتا تھا جو اصطبل کے سامنے کھڑی تھی اور میرے تعاقب میں آسکتی تھی۔

میں نے بھاگتے بھاگتے دو فائر مزید کیے اور اس کا ایک اگلا ٹائر برسٹ کر دیا۔رات کی ٹھٹھری ہوئی تاریکی میری معاون ثابت ہو رہی تھی۔ایک جانب سے کچھ افراد کی چلاتی ہوئی آوازیں آئیں۔۔۔۔اور دو فائر ہوئے تاہم میں محفوظ رہا۔میں مکئی کے کھیتوں میں گھسا اور اندھا دھند گھوڑا بھگاتا چلا گیا۔مجھے امید تھی کہ گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈالتے ڈالتے یا حویلی کے اندر سے کسی گاڑی کے نکلتے نکلتے میں محفوظ فاصلے پر پہنچ جاؤں گا۔مولوی مظفر سے چھینی ہوئی رائفل میرے ہاتھ میں تھی،میرے اندر ایک طوفان پل رہا تھا۔اس طوفان نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔شاید یہ وہی حالت تھی جس میں بندہ مرنے یا مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔میرا رُخ ڈیک نالے کی طرف تھا۔وہی ڈیک نالہ جس کے ایک دور افتادہ کنارے پر کیکراں والی گاؤں آباد تھا۔جہاں میری والدہ،بہن اور اس کا بچہ موجود تھے۔۔۔۔اور ان کے گرد سنگین خطرات منڈلا رہے تھے۔گھوڑا بھگاتے ہوئے میرا ذہن بار بار ایک دن پہلے

کے اس واقعے کی طرف جا رہا تھا۔جب آصف جاہ دندناتا ہوا ایک کوٹھڑی میں داخل ہوا تھا اور جھلائے ہوئے انداز میں مجھ پر ہنٹروں کی بارش کر دی تھی۔اس کی جھلاہٹ سے اندازہ ہوا تھا کہ میری والدہ اور بہن پر ہاتھ ڈالنے کی اس کی ایک اور کوشش ناکام ہوئی ہے۔اس موقعے پر اس نے جو فقرہ کہا تھا،وہ بھی ابھی تک میری سماعت میں تازہ تھا۔اس نے کہا تھا۔"وہ تیری بڑی پکی سہیلی ہے۔تجھ پر اپنے درجنوں بندے ہی نہیں،اپنی جان بھی فدا کر سکتی ہے۔"

اس کا اشارہ بیگم بلقیس کی طرف تھا اور یقیناً وہاں کیکراں والی میں کوئی ایسی کشمکش ہوئی تھی جس میں آصف جاہ کو منہ کی کھانی پڑی تھی۔

تاریک نشیب و فراز میں گھوڑا دوڑ رہا تھا۔میں عام راستوں سے ہٹ کر کھیتوں اور چھوٹی پگڈنڈیوں کو استعمال کر رہا تھا۔مقصد یہی تھا کہ پیچھے آنے والوں سے بچا رہوں۔اور میں ابھی تک اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔مجھے اپنے ارد گرد کے حالات کا کچھ پتا نہیں تھا۔معلوم نہیں تھا کہ میرا مددگار شاہنواز بھی زندہ بچا ہے یا

نہیں۔۔۔۔۔اس کے زخمی ہونے کی خبر تھی مگر تیمور کی تو کوئی خبر ہی نہیں تھی۔میرے پکڑے جانے کے بعد قبرستان میں جو کچھ ہوا، وہ میری نظروں سے یکسر اوجھل تھا۔

ایک دھول سے اٹے ہوئے راستے کے کنارے ایک گاڑی کی عقبی سرخ بتیاں نظر آ رہی تھیں۔رات کے اس پہر یہ پولیس کی گاڑی بھی ہو سکتی تھی۔ بہر حال، یہ ایسی جگہ تھی کہ مجھے اس گاڑی کے قریب سے ہی گزرنا پڑا۔یہ ایک کار تھی۔اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا اور ایک شخص گرم چادر میں لپٹا لپٹایا کار کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈال رہا تھا۔دوسرا شخص پاس کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ٹارچ کی روشنی میں مجھے ریڈی ایٹر پر جھکے ہوئے شخص کی مختصر سی جھلک نظر آئی اور میں بری طرح چونک گیا۔اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی اور جسم سنسنا اٹھا۔مجھے شک ہوا کہ کار کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالتا ہوا شخص کوئی اور نہیں سا جا کے ٹو ہے۔

میں گھوڑے کو سیدھا بھگاتا چلا گیا۔ سردی سے بچنے کے لیے میں نے اپنا چہرہ اچھی طرح مفلر میں چھپایا ہوا تھا۔اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ گاڑی کے پاس موجود افراد کو مجھ پر کسی طرح کا شبہ ہوا ہو گا۔میں نے قریباً ایک فرلانگ آگے جا کر گھوڑا ایک کماد کی آڑ میں روک

دیا۔میرا دل پوری شدت سے گواہی دے رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے جس شخص کو دیکھا ہے، وہ کوئی اور نہیں سا جا کے ٹو ہے۔۔۔۔۔اگر وہ واقعی کے ٹو ہی تھا تو پھر میں کیکراں والی کی طرف اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔پہلے کے ٹو سے ملاقات کرنی تھی۔

ابھی مجھے وہاں بلند قامت کماد کے عقب میں کھڑے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ کار کے انجن کا شور ابھرا ہوا اور وہ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھنے لگی۔وہ میری طرف ہی آ رہی تھی۔قریباً تین چار منٹ بعد وہ میرے پاس سے گزری۔ایک اچھا اتفاق تھا کہ اس کی اندرونی بتی جل رہی تھی۔میں نے اس مدھم روشنی میں کار کی اگلی نشست پر جس شخص کو دیکھا، وہ کے ٹو کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔اسے دیکھ کر میرا سینہ جل اٹھا۔کار کی عقبی سیٹ پر غالباً ایک یا دو عورتیں تھیں۔وہ پردے میں تھیں، مجھے ان کی صورتیں نظر نہیں آئیں۔

کار کچھ فاصلے پر چلی گئی تو میں نے بھی گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی لگام کو ہلکا جھٹکا دیا اور کار کی ہچکولے کھاتی سرخ بتیوں کا پیچھا کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں کماد اور مکئی کے کھیتوں کے عین درمیان واقع ایک گھر کے سامنے موجود تھا۔ یہ کچا گھر تین چار کمروں، ایک برآمدے اور وسیع صحن پر مشتمل تھا۔ بیرونی دیوار قریباً چھ فٹ اونچی تھی۔ گھر کے صحن میں ایک بڑا کتا چکرا رہا تھا۔ کار صحن میں پہنچ چکی تھی، تاہم اس کے چاروں دروازے کھلے تھے اور ٹیپ زور و شور سے بج رہا تھا۔ ایک پنجابی گانے کی دھنا دھن فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

منڈا شہر لہور دا، میرے دل تے تیر چلا دے

میں نے گھوڑے کو ایک کیکر سے باندھ دیا۔۔۔۔ اور رائفل کو چیک کرنے کے بعد احتیاط سے گھر کی بیرونی چار دیواری کے قریب پہنچ گیا۔ گھر کے پہلو میں کچھ درخت تھے اور کنوئیں کے آثار بھی دکھائی دیتے تھے۔ میں نے بیرونی چار دیواری کے اوپر سے احتیاط کے ساتھ اندر جھانکا۔۔۔۔ گھر کے برآمدے میں لالٹینوں کی روشنی نظر آئی۔۔۔۔ اور باتوں کی مدھم آواز بھی کانوں تک پڑی۔

بے شک یہ ساجے کے ٹو کی آواز تھی۔ وہ نشے میں تھا اور اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ "اوئے گامے! ایک بوتل اور کھول لے۔ آج کوئی کسر نہ رہ جائے۔ بعد میں بڑ بڑ کرے گا۔"

"اونئیں یار۔۔۔۔ بس ٹھیک ہے۔ زیادہ چڑھ گئی تو پھر کسی کام کا نہیں رہوں گا۔" گامے نے ہاتھ لہرا کر کہا۔

ان دونوں کے قریب ہی دو عورتیں کھڑی تھیں۔ فاصلے سے ان کی عمر اور صورت کا اندازہ لگانا مشکل تھا، تاہم اپنے لباس سے وہ بازاری دکھائی دیتی تھیں۔

کے ٹو کچھ زیادہ ہی ترنگ میں تھا۔ اس نے لہک کر کہا۔

"ادھر آ میری سوہنی۔"

پھر اس سے پہلے کہ سوہنی اس کے پاس آتی، وہ خود ہی اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے اسے اٹھا کر کندھے پر لادا اور موسیقی کی دھنا دھن پر الٹا سیدھا ناچنا شروع کر دیا۔ اس کی نقل کرتے ہوئے اس کے ساتھی نے بھی اپنے حصے کی عورت کو اٹھایا۔۔۔۔ اور ناچنے کی کوشش کی مگر اس کی ٹانگ میں کوئی نقص تھا، وہ ٹھیک سے ناچ نہیں سکا اور گر گیا۔

کے ٹو اور دونوں عورتیں ہنس ہنس کے دہری ہونے لگیں۔ کے ٹو کی مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ گامے سے کہہ رہا تھا۔ "اوئے! اس دوسری کو بھی میرے کندھے پر لاد دے۔ دونوں کو اٹھالوں گا۔"

رکھوالی کے کتنے نے شاید میری موجودگی محسوس کرلی تھی۔اس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ مضطرب ہے۔مگر کے ٹو اور اس کا ساتھی اپنی حرکتوں میں اتنے مگن تھے کہ انہوں نے خطرے کی اس گھنٹی کو بالکل اہمیت نہیں دی۔پھر میں نے دیکھا کہ کے ٹو نے بے صبری کے انداز میں ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اپنے والی لڑکی کو کندھے پر لادے لادے اندر گھس گیا۔

اس کا ساتھی گاما دوسری لڑکی کے ساتھ برآمدے میں ہی ایک چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔حالانکہ سردی تھی مگر مجھے لگتا تھا کہ شراب اور شباب کی گرمی نے اس کے لیے سردی کو بے اثر کر رکھا ہے۔

دفعتاً مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ صحن میں موجود بے چین کتے نے اپنی زنجیر کھونٹے سے اکھاڑ لی تھی۔وہ تیزی سے دیوار پھلانگ کر میری طرف آیا۔میری سمجھ میں یہ بالکل نہیں آیا کہ اس نے دیوار کس طرح پھلانگی۔میں نے اس کی پرچھائیں کو اپنی طرف لپکتے دیکھا۔میرے بوسیدہ کوٹ کی جیب میں ابھی تک وہ ٹوٹی ہوئی بوتل موجود تھی جسے میں نے طویلے میں سے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ایک ہتھیار کے طور پر لیا تھا۔کتے پر فائر کرنے کی بجائے میں نے اسے تیز دھار بوتل سے نشانہ بنانا بہتر سمجھا۔

میری یہ کوشش توقع سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔کتے نے مجھ پر جست لگائی۔میں نے بوتل کے ٹوٹے ہوئے حصے سے اس کے سینے کو نشانہ بنایا۔باقی کا کام کتے کے آگے بڑھتے ہوئے جسم نے خود ہی کر دیا۔بوتل کے تیز دھار کنارے نے کتے کے پیٹ کو قریباً دو فٹ تک پھاڑ کر رکھ دیا۔کتا مکئی کے پودوں میں گرا اور بری طرح تڑپنے لگا۔اسے اس کے حال پر چھوڑ کر میں نے دیوار پھاندی اور کچے صحن میں کُود گیا۔وسیع صحن کے دوسرے کنارے پر نیم روشن برآمدہ نظر آ رہا تھا۔گاما نشے میں بالکل ہی بے سدھ ہو گیا تھا۔یہاں تک کہ جو عورت وہ اپنی رنگ رلیوں کے لیے لایا تھا،وہ بھی اس کے لیے بیکار ہو گئی تھی۔وہ عورت نُما لڑکی اسے ہلا کر اٹھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔"اوئے اٹھ جا۔۔۔۔تُو تو شیر بننے سے پہلے ہی بکری ہو گیا ہے۔"

گاما چارپائی پر اوندھے منہ پڑا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب عورت نُما لڑکی نے گھوم کر عقب میں دیکھا۔ میں رائفل بدست اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا مگر میں بالکل قریب تھا۔ میں نے رائفل کی لمبی نال اس کے منہ میں ڈال دی۔ "خبردار۔۔۔۔۔ آواز نہ نکالنا۔" میں نے کہا۔

میرے لہجے کی وحشت نے اسے جیسے ہپناٹائیز کر دیا۔ گاما اس کی گود میں سر رکھے غفیل ہو چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "چلو اترو چارپائی سے۔"

وہ لرزتی کانپتی اتر گئی۔ رائفل کی نال اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر منہ سے نکال دی تھی۔

چاردیواری سے باہر کھیت میں کتا جان کنی کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ اس کی مدھم آوازیں برآمدے تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے اس ستائیس اٹھائیس سال کی جواں سال عورت کو دھکیل کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ اس کے بھڑکیلے لباس اور بھاری میک اپ سے عیاں تھا کہ وہ بازاری ہے۔

"اگر آواز نکالو گی تو کل کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔" میں نے رائفل اس کی گردن میں دھنساتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی اطاعت مندی کا یقین دلایا۔ وہ مسلسل کانپ رہی تھی۔ رائفل کی نال کی رگڑ سے اس کے تالو سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اپنے دوپٹے سے مسلسل ہونٹوں تک آنے والا خون پونچھ رہی تھی۔

اسے کمرے میں بند کر کے، میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ ایک نہایت زوردار لات مار کر میں نے لکڑی کا یہ دروازہ کھول دیا۔ آہنی کنڈی اکھڑ کر دور جا گری۔ سامنے لالٹین کی روشنی میں ڈرامائی منظر نظر آیا۔

لڑکی عریاں تھی اور کے ٹو نیم عریاں۔ رنگین پایوں والے نواڑی پلنگ پر چادر کی جگہ پر بہت سے نوٹ بکھرے ہوئے تھے۔

لڑکی زور سے چلائی اور اس نے کچھ نوٹ اٹھا کر اپنے بالائی جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے یہاں یہ نوٹ ہی چادر اور بچھونے کا کام کر رہے تھے۔۔۔۔۔ کے ٹو کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ اس کے جسم پر فقط ایک دھوتی تھی۔ میرے چہرے پر ابھی تک ڈھاٹا تھا۔ وہ مجھے پہچاننے میں ناکام تھا لیکن بھری ہوئی رائفل تو سب کے لیے قابلِ شناخت ہوتی ہے اور اس سے نکلنے والی گولی کا مطلب بھی ہر ایک کو معلوم ہوتا ہے۔

کے ٹو کو دیکھ کر میرے لیے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سینے پر بڑے زور سے لات رسید کی۔ وہ اچھل کر دیوار سے ٹکرایا۔۔۔۔قریب ہی اس کا پستول لٹک رہا تھا۔ ایک لحظے کے لیے محسوس ہوا کہ وہ پستول کی طرف لپکنا چاہ رہا ہے۔ میں نے اس کے پاؤں کے پاس فائر کیا۔ کے ٹو دھماکے کے ساتھ ہی اچھلا اور کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

لڑکی زمین پر بیٹھ گئی اور میری طرف سے رخ پھیر کر قمیض پہننے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیوار سے کے ٹو کا پستول اتار لیا اور کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

"کون ہو تم؟" بدحواسی کے سبب شاید کے ٹو میری آواز پہچان نہیں سکا تھا۔

"تمہیں لالچ اور ہوس نے اندھا کیا ہوا ہے۔ تم کسی کو کیسے پہچان سکتے ہو۔" میں نے منڈاسا چہرے سے اتار دیا۔

ساجا کے ٹو سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ اگلے ایک منٹ میں، میں نے کے ٹو کی ساتھی لڑکی کو بھی کمرے میں بند کر دیا۔ کمرے میں ایک سلاخ دار کھڑکی کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کے ٹو

کے ساتھ والی لڑکی ہاتھ جوڑ کر گھگیائی۔ "ہمارا کوئی قصور نہیں ہے جی۔۔۔۔ہم تو پیٹ کی خاطر یہ سب کرتے ہیں۔ ہم مہینا دیتے ہیں جی۔ کبھی ناغہ نہیں کیا۔"

وہ اس بھتّے کی بات کر رہی تھی جو غالباً پولیس والوں کو دیا جاتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ مجھے بھی سادہ کپڑوں میں کوئی پولیس والا ہی سمجھ رہی ہے۔

میں نے انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی اور دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ گاما بے سدھ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے اپنے حواس میں نہیں آئے گا اور اگر ہم اس کے سرہانے ڈھول بھی پیٹتے رہے تو وہ اسی طرح مردار بن کر پڑا رہے گا۔

دونوں عورتوں کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے کے ٹو والے کمرے کا دروازہ کھولا۔۔۔۔رائفل بالکل تیار حالت میں اور میری انگلی لبلبی پر تھی۔

کے ٹو کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے پلنگ پر بیٹھا تھا۔۔۔۔یہ وہی پلنگ تھا جس پر اس نے اپنی خود نمائی اور عیاشی کے لیے نوٹ بچھا رکھے تھے۔ کم ظرف لوگ ایسی حرکتیں اس وقت کرتے ہیں جب ان کے پاس اچانک کہیں سے بہت ساری دولت آجاتی ہے۔

میں نے کہا۔ "کے ٹو! مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ دنیا بھر کے غداروں کا مقابلہ کرایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ تُو پہلے نمبر پر آ جائے گا۔"

"تُو پہلے۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میری پوری بات سن لے۔ تجھے غلط فہمی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔"

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میں نے رائفل کا دستہ گھما کر اس کے منہ پر مارا۔ وہ الٹ کر نوٹوں کی چادر پر جا گرا۔ اس کے ہونٹوں سے بہنے والا خون نوٹوں کو رنگین کرنے لگا۔ یقیناً ان بہت سے نوٹوں میں وہ نوٹ بھی شامل ہوں گے جو چاچے رفاقت کی جمع پونجی تھے اور اس نے بڑے ایثار کے ساتھ یہ نوٹ اس کے حوالے کیے تھے تاکہ وہ میرے لیے کوئی بہت اچھا وکیل ڈھونڈ سکے۔

میں نے رائفل کی نال بے دریغ کے ٹو کی کنپٹی سے لگا دی۔ "کے ٹو! کل تک ہم یار تھے لیکن آج بد ترین دشمن ہیں اور مجھ سے کسی رعایت کی توقع نہ رکھنا۔ اگر تُو نے اپنے کالے کرتوتوں میں سے کوئی ایک کرتوت چھپانا چاہا تو میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں، آج تجھے یہاں اسی جگہ مار کر گاڑ دوں گا۔"

"لیکن پہلے۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میری پوری بات تو۔۔۔۔۔ سن لو۔۔۔۔۔" وہ ہکلایا۔

"مجھے کچھ نہیں سننا کے ٹو۔۔۔۔۔ اور نہ میرے پاس وقت ہے۔ تیرے جیسے حرامزادوں کی وجہ سے میں اس سخت مصیبت میں ہوں۔ میرے گھر والوں کی جان خطرے میں ہے اور ان کو خطرے سے نکالنے کے لیے میں آج رات تیرے جیسے دس غداروں کا قتل بھی کر سکتا ہوں۔ اور یہ کوئی زبانی دعویٰ نہیں ہے کے ٹو۔۔۔۔۔ میں جو کہہ رہا ہوں کر کے بھی دکھاؤں گا۔"

"مم۔۔۔۔۔ میں ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔۔۔۔۔ دراصل جب میں چاچے رفاقت کے گھر سے پیسے لے کر نکلا۔۔۔۔۔"

اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے ایک اور ٹانگ اس کے سینے پر رسید کی۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ "تم کسی مصیبت میں نہیں پھنسے تھے کے ٹو۔۔۔۔۔ تم اب پھنسے ہو اور یہ اتنی بڑی مصیبت ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ تمہیں اچھی طرح پتا ہے جب میں کسی بندے سے کچھ اگلوانے پر آ جاؤں تو پھر اسے اُگلنا ہی پڑتا ہے۔"

میں ایک دم اس پر پل پڑا۔ وہ مجھ سے کم طاقت ور نہیں تھا مگر میرے اندر کچھ ایسی وحشت لہریں لے رہی تھی کہ میں نے لمحوں میں کے ٹو کو دھنک کر رکھ دیا۔ کمرے کی کئی اشیاء ٹوٹ

گئیں۔ پلنگ پر بچھے ہوئے پچاس، سو اور پانچ سو کے نوٹ پورے فرش پر چکرانے لگے۔ باہر صحن میں گاڑی کے اندر موسیقی کی دھنا دھن جاری تھی۔ گلوکارہ اپنی سریلی آواز میں کسی کو دعوت دے رہی تھی۔

گڈی وانگوں اج مینوں بجناں۔۔۔۔۔اڑائی جا اڑائی جا۔۔۔۔۔

میں نے لہولہان کے ٹو کو گھما کر فرش پر پٹخا اور رسی سے اس کے بازو پشت پر باندھنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک دم آخری زور لگایا۔ تڑپ کر میری گرفت سے نکلا۔ اس کی ٹانگ بڑے زور سے میری ران پر لگی۔ یہ وہی ران تھی جس پر چند دن پہلے گولی کا زخم آیا تھا۔ یہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ میں چند لمحے کے لیے تلملا کر رہ گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا، کے ٹو میری گرفت سے نکل کر تیر کی طرح دروازے کی طرف گیا۔ میں لنگڑاتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔

وسیع صحن پار کر کے وہ باہر نکل گیا۔ میں نے حتی الامکان تیزی سے اس کا پیچھا کیا۔ کے ٹو کی طرح میرے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ گھر سے نکل کر کے ٹو بائیں طرف مڑا۔ شاید وہ

گنے کی بلند قامت فصل کے اندر گھسنا چاہتا تھا۔ جو رسی میں اسے باندھنے لگا تھا، وہ ابھی اس کی ایک کلائی پر ہی بندھ سکی تھی۔ یہ رسی اس کے پیچھے گھسٹتی جا رہی تھی۔

اچانک کے ٹو کا پاؤں پھسلا۔ یہ پھسلن دراصل اس پانی کی وجہ سے تھی جو چھوٹے کنوئیں (کھوئی) کے ارد گرد موجود تھا۔ کے ٹو پھسلا تو سیدھا کھوئی کے اندر گیا۔ میں نے جست لگا کر اس کے عقب میں گھسٹتی ہوئی رسی تھام لی۔ یوں وہ کھوئی کی گہرائی میں گرنے سے بچ گیا۔

کھوئی میں گرتے ہوئے وہ دردناک انداز میں چلایا تھا۔ وہ اب بھی چلا رہا تھا۔ "
پکڑو۔۔۔۔۔بچاؤ۔۔۔۔۔اوئے پکڑو۔"

اور میں نے واقعی اسے پوری طاقت سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ کھوئی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، عام کنوؤں سے بہت گہری ہوتی ہے۔ پانی اس کی تہ میں کسی تارے کی طرح نظر آتا ہے اور اس کا گھیرا بھی عام کنوؤں کی نسبت بہت کم ہوتا ہے۔ ایسی کھوئیوں سے طویل رسی اور بوکے وغیرہ کے ذریعے پانی کھینچا جاتا ہے۔ جان بچانے کی کوشش میں کے ٹو بھاگا تھا اور خود ہی ایک سنگین خطرے کا شکار ہو گیا تھا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ وہ کھوئی میں لٹک رہا تھا اور میں نے آٹھ دس فٹ لمبی رسی کی مدد سے اسے تھاما ہوا تھا۔

ایک دم مجھے احساس ہوا کہ شاید دستِ قدرت نے میری مدد کی ہے اور بد باطن ساجا کے ٹو خود ہی پوچھ گچھ کے لیے مناسب ترین جگہ پر آ گیا ہے۔

بہت گہری کھوئی کے اندر لٹک جانے کی دہشت نے کے ٹو کا پتا پانی کر دیا تھا۔۔۔۔ وہ پکار رہا تھا۔ "خاورے۔۔۔۔۔ رسی نہ چھوڑنا۔۔۔۔ مجھے اوپر کھینچو خاورے۔۔۔۔"

میں اوندھے منہ آگے کو کھسک کر کھوئی کے بالکل کنارے پر آ گیا۔ کے ٹو تقریباً پانچ فٹ نیچے لٹک رہا تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ ایک تبدیلی مزید آئی تھی۔ رسی کے ٹو کی کلائی سے کھل گئی تھی۔ اب اس نے رسی کو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔

بازوؤں کے زور پر کسی شے سے لٹکنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ لمحوں میں ہاتھ اور کندھے شل ہونے لگتے ہیں۔ کے ٹو کا حال بھی کچھ یہی تھا۔ وہ چند سیکنڈوں میں موت کے دہانے پر آ گیا تھا۔

"خاور! میں گر رہا ہوں۔" وہ کربناک آواز میں بولا اور پھسلتی ہوئی رسی کو ہاتھ کے گرد لپیٹنے کی کوشش کی۔ وہ دو تین بل دینے میں کامیاب رہا مگر خطرہ بدستور موجود تھا۔

"ٹُو ایک ہی صورت میں باہر نکل سکتا ہے کے ٹو۔۔۔۔ مجھے بتا کہ انوارا اور اس کی بیوی کہاں ہیں۔ ٹُو انہیں کن کے کہنے پر اختر کے گھر سے لے گیا تھا؟"

"میں انہیں بچانا چاہتا تھا۔ میں نے۔۔۔۔"

میں نے رسی کو ذرا ڈھیل دی۔ کے ٹو ایک خوفناک جھٹکے سے مزید تین چار فٹ نیچے گیا۔ اس کی آواز ذبح ہونے والے جانور سے مشابہ تھی۔ میں دہاڑا۔ "کے ٹو! مجھے اصل بات بتا دے ورنہ تو جا رہا ہے نیچے۔"

"مم۔۔۔۔ مجھے باہر نکالو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں سب کچھ۔"

"نہیں کے ٹو! یہ نقد و نقد کا سودا ہے۔ ابھی بتانا پڑے گا یا نیچے جانا پڑے گا۔"

"خدا کے لیے۔" کے ٹو بلکا۔ اس کی آواز نے گونج کر کھوئی کی اتھاہ گہرائی بتائی۔ کھوئی کی چرخی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ عرصے سے بند پڑی ہے۔ اسی اتھاہ گہرائی میں زہریلی گیسیں جمع ہو جاتی ہیں اور نیچے جانے والے کم کم ہی اوپر آتے ہیں۔ کے ٹو بھی اچھی طرح جانتا تھا اس کے پاس مہلت نہایت کم ہے۔ زندگی پر سے اس کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔ "بتاؤ۔۔۔۔انورے اور عابدہ کو کس کے کہنے پر اختر کے گھر سے غائب کیا؟"

"مم۔۔۔ مجھے۔۔۔۔ چچ۔۔۔۔ چودھری عزیز نے کہا تھا۔"

"اب وہ کہاں ہیں؟" وہ چپ رہا۔ میں دہاڑا۔ "اب وہ کہاں ہیں؟"

"وہ اب۔۔۔۔ نہیں ہیں۔" کے ٹو نے جان کنی کے عالم میں جواب دیا۔

"مار دیا ہے ان دونوں کو؟"

"نہیں۔۔۔۔ میں نے نہیں مارا۔۔۔۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

"چودھری عزیز سے تیرا رابطہ کب سے ہے؟"

"میں سب کچھ بتا دیتا ہوں تجھے۔ مجھے اوپر آنے دے۔"

میں نے رسی کو چند فٹ مزید چھوڑا۔ کے ٹو کے چلانے کی آوازیں ہولناک تھیں۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز کھوئی کی عمیق گہرائی سے نکل کر عجیب تاثر پیدا کرتی تھی۔۔۔۔ جیسے کوئی بدروح نوحہ کر رہی ہو۔

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ کے ٹو نے بلکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا رابطہ دو تین سال سے تھا۔۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔۔ اب مجھے۔۔۔۔ باہر نکالو۔۔۔۔ میرے ہاتھ چھوٹ رہے ہیں۔۔۔۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اب وہ کسی بھی وقت کھوئی کی مہلک گہرائی میں گر سکتا تھا۔ میں نے زور لگا کر اسے چند فٹ اوپر کھینچا پھر اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر نکال لیا۔ وہ خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا واپس مکان میں لے آیا۔

اگلا آدھ گھنٹا بہت انکشاف انگیز تھا۔ سب سے پہلا انکشاف تو یہ ہوا کہ میری والدہ اور بہن اب کیکراں والی میں نہیں تھیں۔ یعنی میرا کیکراں والی جانا بالکل بیکار تھا۔ وہ دونوں واپس راجوال پہنچ چکی تھیں۔

"کون لے کر گیا تھا انہیں؟" میں نے کے ٹو سے پوچھا۔ کے ٹو کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

"بیگم بلقیس۔۔۔۔ ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اگر تمہاری والدہ اور بہن کیکراں والی میں رہیں تو نمبر دار آصف ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ وہ راتوں رات بڑی خموشی سے انہیں

واپس لے گئیں۔سنا ہے کہ اُس رات نمبر دار نے ان دونوں کو وہاں سے اٹھوانے کا پکا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔چودھری اختر کے دو تین ملازم بھی اس منصوبے میں شامل ہو گئے تھے۔ان میں ایک مدثر نام کا لڑکا اور اس کا باپ بھی ہیں۔"

اس حوالے سے کے ٹو نے مجھے کچھ اور تفصیل بھی بتائی۔اب میری سمجھ میں یہ بات آرہی تھی کہ پرسوں رات نمبر دار آصف اچانک سخت مایوس اور آگ بگولا کیوں ہو گیا تھا۔اس نے کوٹھڑی میں گھس کر مجھے بے دریغ ہنٹروں سے پیٹا تھا اور بلقیس کو بھی بے نقط سنائی تھیں۔

میں نے کے ٹو سے پوچھا۔"چودھری عزیز میرا اتنا ہی دشمن تھا تو پھر وہ میری والدہ اور بہن کی حفاظت کیوں کر رہا تھا؟ اگر وہ مجھے قتل کیس میں پھنسائے رکھنے کے لیے انورے اور اس کی بیوی کو وہاں سے نکالنے کا حکم دے سکتا تھا تو میری والدہ اور عارفہ کو بھی ہر طرح کا نقصان پہنچا سکتا تھا۔"

"مجھے نہیں پتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔میں نے تو وہی کچھ کیا جو اس نے کہا تھا۔نہ اس سے کم نہ زیادہ۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"یعنی تم اس کے حکم کے غلام تھے لیکن کبھی تمہارے دماغ میں یہ بات نہیں آئی کہ میرا دشمن ہونے کے باوجود چودھری عزیز مجھے اور میرے گھر والوں کو پولیس سے کیوں بچا رہا ہے؟"

کے ٹو چند لمحے خاموش رہا۔اس کے جسم کا لرزہ ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔مجھے پتا تھا کہ یہ سگریٹ کے بغیر مر رہا ہے۔میں نے اس کی جیب سے نکلا ہوا سگریٹ سلگا کر اس کے ہونٹوں سے لگایا۔اس نے تین چار لمبے کش لیے۔میں نے سگریٹ نکال کر ایک طرف رکھ دیا۔

وہ میرے سوال کے جواب میں بولا۔"جہاں تک میرا اندازہ ہے خاور۔۔۔۔۔چودھری عزیز تجھے مروانا یا پکڑوانا نہیں چاہتا تھا۔اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ تُو کسی طرح جاگیر سے چلا جائے۔۔۔۔۔ہمیشہ کے لیے نظروں سے دور ہو جائے۔"

"ایسا کیوں چاہتا تھا وہ؟"

"میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔۔۔۔۔ہاں، مجھے یہ پتا ہے کہ۔۔۔۔۔نمبر دار اور موکھل پاشا تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔اور اس کے ساتھ ساتھ تمہارے گھر والوں سے بھی ہر برے سے برا سلوک کر سکتے ہیں۔"

"اس بات کا پتا مجھے تمہارے بتائے بغیر بھی ہے۔ مجھے وہ بات بتاؤ جو مجھے معلوم نہیں۔ نمبردار آصف اور پولیس کو کیسے پتا چلا کہ میری والدہ اور بہن کیکراں والی میں اختر کے گھر ہیں؟"

"مجھے اس کا کچھ پتا نہیں۔ میں نے تو بس اتنا ہی کام کیا جتنا چودھری عزیز نے مجھ سے کہا۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں کے بارے میں نمبردار کو بتانے والے اختر کے اپنے ہی کارندے ہیں۔ شاید وہ لڑکا مدثر ہی ہو۔ وہ اختر کے گھر کی ہر بات جانتا تھا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس جیسے غدار اور یار مار تو ہر جگہ موجود ہیں۔"

میرے طنز کا یہ تیر سیدھا کے ٹو کے سینے میں لگا اور اس کا رنگ کچھ اور بھی ہلدی نظر آنے لگا۔

کے ٹو کے ساتھ قریباً ایک گھنٹے کی جو گفتگو ہوئی، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ چودھری عزیز نے کوئی ڈھائی تین سال پہلے کے ٹو کو اپنے دام میں پھنسایا تھا۔ شروع میں کے ٹو کا رابطہ بس انورے کے ساتھ تھا بعد میں عزیز سے بھی ہو گیا۔ انورا کے ٹو کو مال کھلاتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی عیاشی کے لیے بہترین سامان بھی مہیا کرتا رہا۔ ایک موقعے پر کے ٹو نے

چودھری عزیز سے دو لاکھ روپے قرض لیا اور یوں پوری طرح اس کے شکنجے میں آ گیا۔ ہمارے اندر کی بے شمار باتیں کے ٹو کے ذریعے ہی انورے اور چودھری عزیز تک پہنچتی رہیں۔ کے ٹو کا کردار صحیح معنوں میں "یار مار" کا تھا۔

چند دن پہلے چاچے رفاقت نے وکیل کرنے کے لیے کے ٹو کو جو رقم دی تھی وہ بھی لاہور کی ایک فلمی ڈانسر کے شباب پر خرچ ہو چکی تھی۔

آخر میں، میں نے کے ٹو سے پوچھا۔ "انورے اور اس کی بیوی کا کیا کیا تم نے؟"

اس نے ایک بار پھر بڑی شدومد سے انکار میں سر ہلایا۔

"میں نے ان کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ میں نے بس اتنا کام کیا جتنا چودھری عزیز نے مجھے کہا۔ میں نے ان دونوں کو ڈسکے میں بابر خان نامی بندے کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد میرا کام ختم ہو گیا۔"

"پر تم کہتے ہو کہ وہ مارے گئے ہیں؟"

کے ٹو نے سر جھکا لیا۔ "ہاں۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ وہ زندہ نہیں بچے ہوں گے۔ بابر نام کا یہ بندہ بہت خطرناک ہے اور جہاں تک مجھے پتا چلا ہے کہ اس کو کرائے کا قاتل بھی کہتے ہیں۔ آگے اللہ بہتر جانے۔"

"تیمور کے بارے میں تمہیں کیا پتا ہے؟"

"میں سچ کہتا ہوں، مجھے کچھ پتا نہیں۔ وہاں قبرستان سے چار لاشیں راجوال آئی تھیں۔ ان میں چودھری عزیز اور سراج کی لاشیں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ پتا نہیں۔ بس سنی سنائی بات ہے کہ وہاں دو پولیس والوں سمیت آٹھ دس بندے مارے گئے ہیں۔"

"شاہنواز اور سائیں ملنگا وغیرہ؟"

"شاہنواز کو گولیاں لگی ہیں اور وہ ہسپتال میں ہے۔ پولیس نے سائیں اور اس کے ساتھیوں کو دو کھوکھلی قبروں کے اندر سے نکالا تھا۔ وہ بھی گرفتار ہیں۔"

بات کرتے کرتے کے ٹو اچانک چونکا۔ اس نے ایک طرف لکڑی کی میز پر پڑا ہوا ٹائم پیس دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوئے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے دوائی کھانی تھی۔"

"ابھی تجھے بہت کچھ ہونا ہے کے ٹو۔۔۔۔۔ کس کس چیز کی دوائی کھائے گا۔ بہتر ہے کہ ایک ہی دفعہ پستول کی گولی کھا لے۔ تیرے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔"

وہ مجھ سے نظر ملا نہیں پا رہا تھا۔ چہرے پر لعنت برس رہی تھی۔ مجھے کے ٹو کی کچھ باتیں ہمیشہ بری لگتی تھیں مگر میں تیمور اور باگو کی وجہ سے چپ رہتا تھا۔

ایک آواز نے مجھے چونکایا۔ یہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز تھی۔ چند لمحے بعد بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ "کون ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ شش۔۔۔۔۔ شاید رفیق ہو گا۔"

"رفیق کون ہے؟"

"میرا ایک یار ہے گوجرانوالے کا۔"

کے ٹو کے منہ سے "یار" کا لفظ مجھے زہر لگا۔ جی چاہا اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کروں۔

دستک پھر ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے مست لہجے میں کہا۔ "اوئے بوہا کھولو یار۔ مجھ کو بھی صلح مارلو۔۔۔۔۔ کہ اکیلے اکیلے ساری کھیر کھا جاؤ گے؟"

میں نے کے ٹو کو بالکل خاموش رہنے کی ہدایت کی اور کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل کر کے بیرونی دروازے پر پہنچ گیا۔ رائفل میری گرم چادر کے نیچے تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک لمبا تڑنگا شخص کھڑا تھا۔ وہ دیہاتی لباس میں تھا، کندھوں پر گرم چادر تھی۔ اس نے ایک شاپر میں بھنی ہوئی مرغی کے پیس ڈالے ہوئے تھے، دوسرے شاپر میں کتلمے تھے۔ کتلمہ میلوں ٹھیلوں میں عام دیکھا جا سکتا ہے اور دیہات میں بہت شوق سے کھایا جاتا ہے۔ اسے ہم پرانے دور کا پیزا بھی کہہ سکتے ہیں۔"

"تم کون ہو؟" نووارد نے شرابی انداز میں میرے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے میرے چہرے کے زخموں اور ابتر حلیے کو ذرا غور سے دیکھا تھا۔

"یار ہوں کے ٹو کا۔ اور تم شاید رفیق ہو۔ اس نے شام کو تمہارا ذکر کیا تھا۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ ہاں رفیق ہوں۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ پھر آنکھ مار کر بولا۔ "کدھر ہے شہزادہ؟"

"اندر ہے شہزادی کے ساتھ۔" میں نے بھی آنکھ مار کر کہا۔

"اور گاما؟"

"وہ سامنے لیٹا ہوا ہے۔ زیادہ پی لی ہے۔ کچھ موج میلہ کیے بغیر ہی سو گیا ہے۔"

"اور دوسری کڑی؟" رفیق نے پوچھا۔

میں نے جلدی سے بات بنائی۔۔۔۔۔ "وہ بھی اندر ہی ہے۔"

رفیق کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھری۔ "شاوا بھئی شاوا۔۔۔۔۔ ایک کمرے میں دو دو کڑیاں۔۔۔۔۔ دو دو پلیٹوں سے کھیر کھا رہا ہے اپنا شہزادہ۔ شاوا بھئی شاوا۔" پھر وہ نشے میں لہراتا ہوا بند دروازے تک پہنچا اور ہانک لگائی۔ "اوئے میں قربان جاواں تیرے اوپر۔۔۔۔۔ سب کچھ اکیلا ہی ہڑپ کر جائے گا۔ اوئے دو چار چمچیاں ہمارے منہ میں بھی جانے دے۔۔۔۔۔ اور ذرا چھیتی کر۔ تیرے لیے ایک بڑی کڑاکے دار خبر بھی لایا ہوں

راجوال سے، کل سویرے وہاں بڑالمبا کھڑاک ہونے والا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ موکھلوں نے سارے اگلے پیچھے بدلے چکا دینے ہیں راجوالیوں سے۔۔۔۔۔آجا ذرا جلدی سے ویلا ہو کے باہر۔"رفیق نے لوفرانداز میں کہا۔

اسے اندر کی صورتِ حال کا کچھ پتا نہیں تھا۔وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا یار کے ٹو اندر موج میلا کر رہا ہے اور نوٹ لٹارہا ہے۔اسے پتا نہیں تھا کہ وہ اندر بندھا پڑا ہے۔

اندر سے ایک عورت نے واویلا شروع کر دیا۔"بچاؤ۔۔۔۔۔کوئی ہے۔۔۔۔۔بچاؤ۔"

نشے میں دھت رفیقے نے عورت کی اس پکار کو بھی موج میلے کا حصہ سمجھا اور ہاتھ لہرا کر بولا۔"اوئے ذرا ہتھ ہولا رکھ۔کھیر کو کھیر سمجھ کر کھا۔"

پھر اس نے گامے کو ذرا جھنجھوڑانے اور جگانے کی کوشش کی۔گاما بس کسمسا کر اور بڑبڑا کر رہ گیا۔

گامے کے قریب پڑی بوتل سے رفیقے نے شراب کے دو گھونٹ مزید لئے اور برآمدے میں ہی ایک چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔اس نے راجوال کے بارے میں جو بات کی تھی اس نے میرے کان کھڑے کر دیئے تھے۔میں نے اس کے قریب بیٹھ کر دو سگریٹ سلگائے

ایک اس کے منہ سے اور دوسرا اپنے منہ سے لگایا۔قریب رکھی ہوئی انگیٹھی گھسیٹ کر پاس کر لی۔"یہ راجوال کی کیا بات کر رہے تھے تم؟"میں نے رفیق سے پوچھا۔

"سنا ہے وہاں زبردست پھڈا ہونے والا ہے۔تمہیں وہاں کے جھگڑے کا تو پتا ہی ہوگا۔بڑی دیر سے موکھلوں اور راجوالیوں میں مچھلی فارم والے رقبے کا معاملہ چل رہا تھا۔اس رقبے کے معاملے میں تو راجوالئے جیت گئے تھے۔فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تھا۔مگر اب موکھلوں نے اس کا بدلہ دوسری جگہ لینے کا ارادہ کیا ہے اور مجھے پکی اطلاع ملی ہے یہ ارادہ کل سویرے ہی پورا ہو جانا ہے۔"

"کیا کہنا چاہ رہے ہو۔"

"سویرے راجوال کے میلے کا آخری دن ہے۔پیر فضل حق کے مزار پر اور میلے کی جگہ پر موکھل بھی اپنا حق جتاتے رہے ہیں۔اٹھارہ بیس سال پہلے جب والی جی کا باپ زندہ تھا۔اس مزار کی ملکیت پر کئی جھگڑے ہوئے تھے۔دو تین سال پہلے بھی اس معاملے پر پنچائیت بیٹھی تھی۔اس وقت معاملہ ٹھنڈا ہو گیا تھا کیونکہ راجوال والے زور میں تھے۔سالار شاہ خاور کا تو پتا ہو گا تمہیں؟میں نے اثبات میں سر ہلایا۔وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔"ان دونوں

سالار خاور بھی زور میں تھا۔ لوگ اس کے پیچھے تھے۔ اس کی آواز پر سب ایک ہو جاتے تھے۔ پر اب تو بھٹہ ہی بیٹھ چکا ہے۔ خاور پر دہرے قتل کا الزام ہے۔ وہ پولیس سے اور اپنے سسر سے چھپتا پھرتا ہے۔ عام لوگ اس کا نام سننا بھی پسند نہیں کر رہے۔ موکھلوں کے لئے یہ بڑا چنگا موقع ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس بار انہوں نے راجوالیوں کو ادھیڑ کر رکھ دینا ہے۔ چھ سات دن پہلے جو کچھ ہوا اس کا پتا ہے تمہیں؟

میں نے ان جان بن کر نفی میں سر ہلایا۔

"موکھلوں نے بڑی بے عزتی خراب کی ہے راجوالیوں کی۔ ادھے پنڈ کو چھتر مارے ہیں۔ عورتوں کو گھسیٹا ہے۔ ان کے بہت سارے ڈنگر چھین کر لے گئے ہیں۔ اب ان کا حوصلہ اور بڑھ گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب مزار والی جگہ انہوں نے راجوالیوں کے پاس نہیں رہنے دینی۔ اب تو پولیس بھی پوری سائیڈ لے رہی ہے موکھلوں کی۔"

"میرے ذہن میں چلتی ہوئی آندھی تند و تیز ہو گئی۔ طوفان کی شکل اختیار کر گئی۔ جب میں نے سنا تھا کہ موکھلوں نے راجوال پر ہلا بولا ہے اور مویشی وغیرہ ہانک کر لے گئے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب کوئی اس سے بڑی کاروائی کریں گے اور آج رات یہاں اس نامعلوم

چار دیواری میں ایک ٹھٹھری ہوئی تاریکی میں یہ یقین درست ثابت ہو گیا تھا۔ میرے دل نے پکار کر کہا۔ خاور! تم اپنی زندگی کے ایک نازک ترین موڑ پر کھڑے ہو۔ اگر تم اب کچھ نہ کر سکے تو بدترین پچھتاووں کے سوا کچھ تمہارے حصے میں نہیں آئے گا۔ جس جاگیری کی دیواروں کو تم نے اپنے خون پسینے سے اٹھایا ہے۔ جس کی خوشحالی اور بہتری کے لئے تم نے اپنی بہترین توانائیاں صرف کی ہیں۔۔۔۔۔ وہ جاگیر ٹوٹ پھوٹ کر تاراج ہونے والی ہے۔ جو تم نے ذرہ ذرہ کر کے جوڑی تھی، ریزہ ریزہ ہونے والی ہے۔ وہ سارا اعتماد اور حوصلہ بکھرنے والا ہے جو پچھلے برسوں میں ہزار تکلیفیں سہہ کر پورا پروان چڑھایا گیا تھا۔

"میں یہ ہونے نہیں دوں گا۔" میں نے دل ہی دل میں تہیہ کیا۔ "اگر اس کے لئے بہت بڑی قربانی بھی دینا پڑی تو دے دوں گا۔"

رفیقے نے ایک بار پھر نشیلے انداز میں ہانک لگائی۔

"اوئے کے ٹو! کیا کھیر کی پوری دیگ کھا کر باہر نکلے گا۔ آ جا اب تو رات ڈھلنے والی ہے شہزادے۔"

شہزادے نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ دے بھی کیسے سکتا تھا۔وہ کھیر نہیں کھا رہا تھا۔ہری مرچیں چبا رہا تھا اور میں نے اسے سی سی کرنے سے بھی منع کر رکھا تھا۔

میں رفیقے کو مزید ٹٹولنا چاہ رہا تھا۔میں نے کہا۔"سنا ہے نمبر دار آصف،خاور کی ماں اور بہن کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔بڑے خطرناک ارادے ہیں اس کے۔"

"ارادے تو واقعی خطرناک ہیں۔پر حق بات یہ ہے کہ بیگم بلقیس کی بھی تعریف کرنی پڑتی ہے۔پہلی دفعہ یوں لگا ہے کہ وہ جاگیر کی والی وارث ہے اور جاگیر کو سنبھال سکتی ہے۔وہ اپنے پرانے یار کی ماں اور بہن کی حفاظت کا ذمہ لے چکی ہے اور اب اس ذمے کو پوری ہمت سے نبھا رہی ہے۔۔۔۔کیکراں والی گاؤں میں نمبر دار آصف نے بڑا زور مارا ہے پر بیگم نے اس کی ایک چلنے نہیں دی۔دونوں طرف سے تین تین بندے مرے بھی ہیں۔جب بیگم نے دیکھا کہ خطرہ بڑھ گیا ہے،تو وہ بھیس بدل کر خود کیکراں والی پہنچی اور خاورے کے گھر والوں کو بڑی ہوشیاری سے واپس راجوال لے گئی۔کہتے ہیں نمبر دار آصف کو اس بات کی بڑی سخت تکلیف پہنچی ہے کہ دونوں عورتیں واپس راجوال پہنچ گئی ہیں۔"

"سنا ہے کہ بیٹی کی موت کے بعد آصف بالکل جنونی ہو گیا ہے۔دیوانوں جیسی باتیں کرتا ہے۔بے گناہ لوگ بھی اس کے ہاتھوں نقصان اٹھا رہے ہیں۔وہ ہر ایک کو اپنا قصوروار سمجھ رہا ہے۔

"کہنے والے تو یہی کہہ رہے ہیں۔"رفیقے نے سر ہلا کر تائید کی اور شاپر میں سے بھنی ہوئی مرغی کی ران نکال کر چبانے لگا۔وہ اس مصیبت سے بالکل بے خبر تھا جو میری صورت میں اس کے بالکل قریب موجود تھی۔

دفعتاً اندر سے پھر رونے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔اس مرتبہ یہ آواز نسوانی نہیں مردانہ تھیں۔یہ یقیناً ساجا کے ٹو تھا اور کسی مشکل میں تھا۔

رفیقے نے پھر لوفرانہ انداز میں ہانک لگائی۔"کیا بات ہے کے ٹو شہزادے۔۔۔۔کھیر زیادہ تتی (گرم) ہے؟"

مجھے اس کمرے میں روشنی نظر آئی جہاں کے ٹو بند تھا۔یہ آگ کی روشنی تھی۔میں رائفل سنبھالتا ہوا کمرے کی طرف لپکا۔دروازہ کھولا تو منظر ہولناک تھا۔کے ٹو کو تو آگ لگی ہوئی تھی۔اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور زمین پر لوٹیں لگا رہا تھا۔اس کی دونوں ٹانگیں

پوری طرح آگ کی لپیٹ میں تھیں۔ میں نے بھاگ کر اس پر کمبل ڈالا اور گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ دوسرے کمرے میں بند عورتوں نے بھی شدید واویلا شروع کر دیا تھا۔

رفیقا بھاگ کر گیا اور اس نے پانی کا گھڑا کے ٹو پر الٹ دیا۔ گاڑھے دھوئیں نے ہر شے کو لپیٹ میں لے لیا۔ آگ اب پورے کمرے میں پھیل گئی تھی اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آگ میں وہ کرنسی نوٹ بھی جلنا شروع ہو گئے تھے جو کے ٹو نے پورے کمرے میں بکھیر رکھے تھے۔ اور یہ سارے نوٹ اس کے نہیں تھے۔ ان میں چاچے رفاقت کی جمع پونجی تھی۔ میں دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور بہت سے نوٹ جلنے سے بچا لیے۔

دوسرے کمرے میں دھواں جمع ہو گیا تھا۔ دونوں طوائفوں کے کھانسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ چلاتی ہوئی باہر نکلیں اور جدھر منہ اٹھا بھاگتی چلی گئیں۔ میں نے انہیں روکنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اس شور قیامت نے مردار پڑے گامے کو بھی جگا دیا تھا۔ وہ ہکا بکا دم بدم پھیلتی آگ کو دیکھنے لگا۔ کچھ ایسی ہی حیرت اور ہراس کی کیفیت رفیقے یا فیقے کی آنکھوں میں بھی تھی۔

کے ٹو کی دھوتی جل کر مکمل طور پر ناپید ہو گئی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگوں کا برا حشر تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ "اوئے میں مر گیا۔۔۔۔۔ اوئے میرا کچھ کرو۔"

اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ دیکھ کر فیقے کی حیرت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ وہ کانپتی آواز میں بولا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔ ہو رہا تھا؟"

"تمہاری سمجھ میں نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

گاما بدحواسی میں تڑپتے ہوئے کے ٹو کے ارد گرد ناچ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ کے ٹو کی عریاں ٹانگوں سے چربی بہہ رہی تھی۔

"اب اس کا کیا کرنا ہے۔؟" رفیقے نے پھٹی پھٹی آواز میں مجھ سے پوچھا۔ ساتھ ساتھ وہ کے ٹو کے ہاتھوں کی ادھ جلی رسی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "بہتر تو یہ ہے کہ اس پر تھوڑا سا اور تیل ڈال کر اسے آگ ہی لگا۔۔۔۔۔ اور اگر دل نہیں مانتا اور یاری جوش مارتی ہے تو پھر ڈالو کسی ریڑھے پر اور لے جاؤ کسی اسپتال

میں۔"میرے لب و لہجے نے گامے اور رفیقے کو کچھ اور ششدر کر دیا تھا۔وہ بھونچکے دکھائی دینے لگے تھے۔

کے ٹو کے ہاتھوں کی ادھ کھلی جلی رسی اور کمرے میں ٹوٹی ہوئی لالٹین دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ کے ٹو نے اپنی فطرت کے مطابق ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تھی۔اس نے پہلے لالٹین کی چمنی توڑی تھی پھر اپنے ہاتھوں کی رسی کو لالٹین کی لو سے جلانے کی کوشش کی تھی۔اسی دوران میں لالٹین الٹ گئی اور پاس رکھے ہوئے لحافوں اور کرنسی نوٹوں وغیرہ نے آگ پکڑ لی۔

اب کے ٹو کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مشکل سے بچ پائے گا اور اگر بچ بھی گیا تو اس کی ایک یا دو ٹانگوں کا نقصان تو ہو جائے گا۔

آگ پھیلتی جا رہی تھی۔جب گاما اور رفیقا اپنے یار کو اٹھا کر آگ سے دور لے جا رہے تھے۔میں خاموشی سے گنے کے کھیتوں میں داخل ہو گیا۔میرا رخ اپنے گھوڑے کی طرف تھا جو کھیتوں سے پار بندھا ہوا تھا۔مردہ کتے کے پاس سے گزر کر میں گھوڑے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔آگ کی روشنی دور تک پھیل رہی تھی۔اس سرخ روشنی میں دھوئیں کے بادل بھی

شامل ہو رہے تھے۔یقیناً کھیتوں میں رات کے وقت کام کرنے والے اکا دکا مزدور اس آگ کو دیکھ چکے تھے اور اب کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والے تھے۔میں نے کرنسی نوٹ ایک بڑے رومال میں باندھ کر اپنی کمر سے باندھ لئے اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قریباً ایک گھنٹے بعد میں ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ایک راستہ ڈسکے کی طرف جاتا تھا اور دوسرا راجوال کی طرف۔۔۔۔۔راجوال جہاں میری والدہ تھی اور۔۔۔۔۔بلقیس تھی۔میری زندگی کے سارے جواز راجوال میں تھے اور زندگی بھی شاید وہیں تھی۔بلقیس نے اب تک بڑی ہمت سے میرا اور میرے گھر والوں کا دفاع کیا تھا۔اس نے تعلق کی پائیداری اور طاقت کو ثابت کیا تھا۔اب میں اسے مزید امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔اب میں اپنے سارے بوجھ خود اٹھانا چاہتا تھا۔اور یہی نہیں۔میں جاگیر کو بچانا بھی چاہتا تھا۔مجھے محسوس ہوتا تھا کہ جاگیر ایک زندہ شے کی طرح ہے۔وہ مجھے دیکھتی ہے،میرا انتظار کرتی ہے،اسے

میری کمی محسوس ہوتی ہے،اس کے سنہرے کھیت اس کے سر سبز باغ اس کے کچے پکے راستے سب میری راہ دیکھتے ہیں۔خاموشی کی زبان میں پکارتے ہیں۔"

ہمیں تم پر بڑا بھروسہ ہے شاہ خاور۔۔۔۔۔تم ہمارا مان ہو۔۔۔۔۔تم نے ہمیں نئی زندگی دی تھی۔ہماری بے جانی میں روح پھونکی تھی۔اب ہمیں تنہا نہ چھوڑنا۔ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔۔۔۔"

مگر دوسری طرف میں دیکھتا تھا کہ میں خود ایک بے وسیلہ شخص کا روپ دھار گیا ہوں۔مجھے دہرے قتل کے الزام کا سامنا تھا۔پولیس میرا پیچھا کر رہی تھی۔میرے سسرالی میرے خون کے پیاسے تھے۔اور ابھی تک اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت میں حاصل نہیں کر سکا تھا۔۔۔۔میں جانتا تھا نہایت ٹھوس ثبوتوں کے بغیر مجرم ہوں۔قانون کی نظر میں بھی اور جاگیر کے عام لوگوں کی نگاہ میں بھی۔حقیقت تلخ تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ عام لوگوں کی نگاہ میں،میں وقعت کھو چکا ہوں۔بہت کم لوگ ہوں گے جو اب بھی میرے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہوں گے۔

تو پھر کیا کروں؟کس طرف جاؤں؟

یہ سوال بے پناہ شدت سے بار بار میرے اندر سے اٹھ رہا تھا اور مجھے بے حال کر رہا تھا۔اگر میں جاگیر جاتا اور پھر جاگیر کے لئے کچھ کر بھی نہ سکتا تھا تو یہ دہرا نقصان تھا۔لوگوں کے دل میں میرے لئے رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو جاتا۔اور عین ممکن تھا کہ پولیس یا میرے دوسرے دشمن مجھے پھر چھاپ لیتے۔میں اپنے لئے کچھ کر سکتا،نہ گھر والوں کے لئے،نہ جاگیر کے لئے!

تو پھر کیا کروں؟کیا ابھی چند دن ایک طرف رہ کر حالات کا رخ دیکھوں؟یہ جاننے کی کوشش کروں کہ انورا اور اس کی بیوی ختم ہو چکے ہیں یا زندہ ہیں۔اور بالفرض اگر زندہ ہیں تو کہاں ہیں؟

ذہن نے خود اس خیال کو رد کیا۔ایسا کرنا مشکل تھا۔جاگیر اور جاگیر کے باسیوں کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔

تو پھر؟سوال ذہن کو جھنجھوڑ رہے تھے۔جی چاہا گھوڑا دوڑاتا جاگیر پہنچوں۔راجوال کے بڑے چوراہے میں حویلی کے سامنے بنے چبوترے پر چڑھ جاؤں۔پکار پکار کر لوگوں کو اپنی طرف بلاؤں۔ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دوں۔اور اگر وہ پھر بھی مجھے مجرم

گردانیں تو ان سے کہوں، ٹھیک ہے۔ میں دشمنوں کے ہاتھوں ذلیل موت مرنا نہیں چاہتا۔ وہ مجھے خود ہی اس جگہ اپنے ہاتھوں سے مار دیں۔

میں کچھ دیر تک ہانپتے ہوئے گھوڑے پر سوار خاموش کھڑا رہا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ پھر ایک کشش۔۔۔۔ایک نامعلوم کشش مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی۔

یہ وہی کشش تھی جو میری زندگی کی سب سے بڑی توانائی بن چکی تھی۔ یہ صحیح تھی، غلط تھی یا بہت بڑا گناہ تھی۔ لیکن جو بھی تھی یہ موجود تھی۔ آج بھی پہلے دن والی آب وتاب اور طاقت کے ساتھ!

اور یہ وہی کشش تھی جو کسی رکاوٹ، کسی مجبوری اور دلیل کو نہیں مانتی۔

یہ کچے گھڑے پر تیرتی ہے اور امر ہو جاتی ہے۔

یہ آگ میں کودتی ہے اور اسے گلزار بناتی ہے۔

یہ زہر کا پیالہ پی کر جینا سکھاتی ہے۔

یہ شیشے سے پتھر کو توڑنے کا دعویٰ کرتی ہے۔۔۔۔اور پھر توڑتی بھی ہے۔

میں نے ایک طویل سانس لی۔ سب خیالوں کو ذہن بدر کیا۔ گھوڑے کی لگامیں موڑیں اور برق رفتاری سے راجوال کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میں گھوڑے پر سوار تھا۔ یہ ایک تیز رفتار گھوڑا تھا۔ تاہم میرا ذہن اس سے بھی زیادہ رفتاری کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جو کچھ راجوال میں ہونے والا تھا اس کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے تھا اور میں سوچ رہا تھا، میں راجوال کو ایک برے انجام سے بچانے کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ مگر سوال پھر وہی تھا کہ کیا راجوال والے میری آواز پر اٹھ کھڑے ہوں گے؟ کیا وہ ایک بار پھر یک جان ہو کر میرا ساتھ دیں گے اور اپنے دشمنوں کے دانت کھٹے کریں گے؟

ذہن جو جواب دے رہا تھا وہ گہری مایوسی کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ تاہم میں اس دھند کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

۔۔۔۔صبح صادق کے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید ابھی اس روشنی کے دکھائی دینے میں دیر تھی۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ آسمان پر گہرے بادل بھی موجود ہیں۔

تاریک راتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے بادل آسمان پر پہرے بنائے کھڑے رہتے ہیں اور بندے کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ پتا تب چلتا ہے جب اچانک تابڑ توڑ بارش شروع ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ اچانک تیز بارش شروع ہو گئی۔ میں نے کچھ دور تک ایسے ہی سفر کیا مگر پھر گھوڑے کا پاؤں پھسلنے لگا۔ مجھے اپنی، راجوال والی پسندیدہ گھوڑی یاد آ گئی۔ وہ بھی تو مچھلی فارم کے نواح میں ایسے ہی پھسل کر اپنا پاؤں تڑوا بیٹھی تھی۔ میں دھیمی رفتار سے سفر کرتا رہا پھر مجھے ایک جگہ چھوٹے سے گاؤں کی دو چار روشنیاں نظر آئیں۔ میں نے گھوڑے کا رخ ادھر موڑ دیا۔ اب میں جاگیر کے نواح میں پہنچ چکا تھا۔ شام پور یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ لیکن بارش چونکہ تیز ہو گئی تھی۔ اس لئے رکنا پڑا۔ میں نے دروازہ کھٹکٹایا تو ایک نوجوان نے دروازہ کھولا

"کیا بات ہے بھرا جی؟" اس نے مجھے سرتاپا دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بارش تیز ہو گئی ہے بس تھوڑی دیر کے لئے رکنا چاہتا ہوں۔"

اس نے ایک بار پھر میرا جائزہ لیا اور دیہاتی خوش اخلاقی سے بولا۔ "آ جاو جی۔۔۔۔۔ گھوڑا ادھر باندھ دو درخت کے نیچے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں نے شکریہ ادا کر کے گھوڑا باندھ دیا اور نوجوان کے ساتھ گھر کے اندر چلا گیا۔ گھر میں نوجوان اور اس کی بوڑھی والدہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ نوجوان کا نام شریف تھا اور وہ کھیت مزدوری کرتا تھا۔

وہ مجھ سے دو چار باتیں کر کے سو گیا۔ اس کی والدہ جاگتی رہیں۔ وہ تہجد کے لئے بیدار ہو چکی تھیں۔ ان کی باتوں کے انداز اور شکل وصورت میں مجھے بے بے جی کی جھلک نظر آئی۔ شاید ساری مائیں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ مجھے پتر کہہ کر بلاتی رہیں، میں انہیں ماں جی کہتا رہا۔ انہوں نے مجھے اپنے بیٹے کے کپڑے دیئے اور میرے گیلے کپڑے نچوڑ کر آگ کے سامنے پھیلا دیئے۔ انہوں نے مجھے کاڑھنی کا گرم دودھ بھی پلایا۔

بارش اب رک گئی تھی، تاہم بادلوں کی وجہ سے صبح کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے اپنے کپڑے پہنے اور اماں سے جانے کی اجازت طلب کی۔

کچھ ہی دیر بعد میں گھوڑے پر سوار ایک بار پھر ویران جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے درمیان سفر کر رہا تھا۔ مگر اب دل کا موسم کچھ اور تھا۔ میں نے فی الحال حالات کے سامنے پسپائی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی مناسب جگہ پر گھوڑا چھوڑ دوں گا

اور بس وغیرہ کے ذریعے گوجرانوالہ پہنچنے کی کوشش کروں گا۔وہاں رشید بٹ کے ذریعے کچھ دن بعد بلقیس سے رابطہ کروں گا اور اس سے کہوں گا کہ وہ کسی طرح میری والدہ اور بہن کو گوجرانوالہ پہنچادے۔اس کے بعد ان دونوں کو لے کر جنوبی پنجاب کے کسی دور دراز گاؤں کی طرف نکل جاؤں گا۔جاگیر کو۔۔۔۔۔جاگیر والی کو اور جاگیر کے لوگوں کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دوں گا۔اس کے بعد اگر مناسب محسوس ہوا تو کسی وقت خود کو قانون کے سامنے پیش کروں گا۔

انہی خیالات کے ہجوم میں، میں گھوڑا دوڑاتا ایک کچے راستے پر آگے بڑھتا چلا گیا۔دل پر عجیب افسردگی تھی۔آسمان پر بادل تھے تاہم صبح کا اجالا نمودار ہو چکا تھا۔ارد گرد کا ہر منظر دھلا دھلایا اور صاف نظر آرہا تھا۔اچانک مجھے گھوڑے کی رفتار دھیمی کرنا پڑی۔میں اپنے سامنے ایک تانگہ دیکھ رہا تھا۔تانگہ بان ایک بوکے کے ذریعے گھوڑے کو پانی پلا رہا تھا۔تانگے پر دو تین سواریاں موجود تھیں۔ان سواریوں کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ان میں منشی منظور اور حامد کو میں نے صاف طور پر پہچان لیا۔تیسرا شاید حامد کا گن مین تھا۔میں ٹھٹک کر رک گیا۔میں اب ان کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا نہیں

چاہتا تھا۔اب چھبتی ہوئی نظریں اور ان نظروں میں سے جھانکتے ہوئے الزامات میری برداشت سے باہر ہو چکے تھے۔

تانگے والے بھی دھیان سے میری طرف دیکھ رہے تھے ا۔س سے پہلے کہ وہ پوری طرح مجھے پہچان سکتے، میں نے گھوڑے کا رخ موڑا اور ایک بغلی راستے پر ہو لیا، گھوڑے کو ایڑ لگا کر میں نے اس کی رفتار تیز کر دی۔اچانک میں بری طرح چونک گیا۔ایک باریک گونجتی ہوئی آواز نے میرا پیچھا کیا۔"ماسٹر چاچا۔۔۔۔۔ماسٹر چاچا۔۔۔۔۔"

بلاشبہ یہ حامد کی آواز تھی۔میں گھوڑا دوڑاتا رہا۔میرا خیال تھا کہ جلد ہی یہ آواز پیچھے رہ جائے گی مگر چند سیکنڈ بعد اتنے ہی فاصلے سے یہ آواز دوبارہ ابھری۔

"چاچا۔۔۔۔۔رک جاؤ ماسٹر چاچا۔۔۔۔۔میری بات سنو۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔حامد اندھا دھند دوڑتا ہوا میرے پیچھے آرہا تھا۔وہ دھاری دار سویٹر اور شلوار قمیض میں تھا۔اس کے عقب میں گن مین باجوہ تھا۔۔۔۔۔

میں نے دل کڑا کر کے گھوڑا بھگانا جاری رکھا۔نوخیز حامد کی ہانپتی اور پکارتی ہوئی آواز میرا پیچھا کرتی رہی۔

وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کھیتوں میں اور پگڈنڈیوں پر پوری رفتار سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔ گن میں باجوہ ذرا فربہ ہونے کے سبب چالیس پچاس قدم پیچھے رہ گیا تھا۔ آخر میں حامد کے اس طرح اندھا دھند بھاگنے کا منظر برداشت نہیں کر سکا۔ میں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔

حامد ہاتھ لہراتا اور بھاگتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ اس کے پاؤں سے جوتی اتر چکی تھی۔ وہ ننگے پاؤں میرے سامنے کھڑا تھا۔ مشقت سے اس کا رنگ زرد تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

میں گھوڑے سے اترا اور آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ کچھ بولا نہیں لیکن جب میں نے اسے خود سے جدا کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"آپ بھاگ کیوں رہے تھے چاچا؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میری قسمت میں اب شاید بھاگتے رہنا ہی لکھا ہے۔" میں نے آزردگی سے کہا۔

گن مین باجوہ بھی اب ہانپتا ہوا ہمارے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا۔

اس سے پہلے میں نے باجوہ کو تب دیکھا تھا جب بلقیس اور چودھری عزیز میری والدہ اور بہن کو کیکراں والی کی محفوظ پناہ گاہ میں چھوڑ کر آ رہے تھے اور مغلوں والے باغ کے پاس میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے باجوہ کی آنکھوں میں بھی وہی اجنبیت اور دوری نظر آئی تھی جو دیگر محافظوں کی نگاہوں میں تھی۔۔۔۔ لیکن آج صورتِ حال کچھ اور لگی۔ باجوہ کے سلام میں عقیدت کی جھلک نظر آئی اور اس کی آنکھوں میں ایک دبا دبا جوش تھا۔

"آ۔۔۔۔ آپ کہاں جا رہے تھے چودھری جی؟" باجوہ نے پوچھا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے جوابی سوال کیا۔

ہم تو چھوٹے مالک کو ڈسکہ لے کر جا رہے ہیں۔ ان کے دانت میں درد ہے۔ دوائی لے کر دینی ہے۔"

"کیا ہوا ہے حامد؟" میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ سنی ان سنی کر کے بولا۔"آپ کہاں چلے گئے ہیں۔۔۔۔۔آپ حویلی کیوں نہیں آتے؟ میں آپ کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔امی بھی کرتی ہیں۔وہ روتی رہتی ہیں۔آپ کیوں کر رہے ہیں ایسا؟"وہ سادہ دلی سے بولتا چلا گیا۔

"میں ابھی کچھ دنوں تک نہیں آسکتا۔مجھے کچھ کام ہیں۔"میں نے کہا۔

باجوہ کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی وہ میری طرف دیکھ کر عجیب انداز میں بولا۔"چودھری خاور!کل سے راجوال میں حالات بڑے بدل گئے ہیں۔شاید آپ کو پتا نہیں چلا۔"

"کیا مطلب؟"

"چودھری رونق نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے جی۔"

"رونق؟رونق تو قبرستان میں۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے،وہاں اسے گولی لگی تھی۔۔۔۔۔"

"نہیں جی۔۔۔۔۔کچھ نہیں ہوا تھا رونق صاحب کو۔بس بازو پر ایک زخم آیا ہے۔وہ بالکل بچ گئے ہیں۔وہ ایک دو دن کہیں چھپے رہے۔پھر کل سویرے اچانک راجوال میں

آگئے۔انہوں نے آتے ساتھ ہی پنچائیت بلائی اور سب کو چودھری عزیز کی وہ آواز سنائی جس میں انہوں نے اپنی زبان سے اپنا جرم مانا ہے۔اب تک تو شاید راجوال کا ہر بندہ یہ آواز سن چکا ہو۔"

مجھے اپنے کانوں پر بھروسہ نہیں ہوا۔رگ وپے میں ایک عجیب سی سنسنی تیرنے لگی۔میں نے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔"مگر۔۔۔۔۔مگر وہ آواز سنانے والی ٹیپ تو پولیس والوں کے پاس رہ گئی تھی۔۔۔۔۔"

"جی۔۔۔۔۔ٹیپ رہ گئی تھی۔آواز والی کیسٹ تو چودھری رونق بھائی کے پاس تھی۔"

یکایک ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔اس کے ساتھ ہی سینے میں شادیانہ سا بج اٹھا۔یوں لگا کہ میں کئی دنوں سے جو ایک پہاڑ جیسا بوجھ سر پر اٹھائے پھر رہا تھا،وہ اچانک اتر گیا ہے اور میں ہوا کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں۔لیکن ابھی مجھے باجوہ کی بات پر پوری طرح یقین نہیں آیا تھا۔میں اس سے مزید تفصیل جاننا چاہتا تھا۔میرے پوچھنے پر اس نے سب کچھ بتا دیا۔

رونق علی نے وہ کام کر دکھایا تھا جس کی مجھے اس سے توقع نہیں تھی۔اس نے اپنی ساری سستی اور کاہلیوں کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔جب قبرستان میں پولیس اندھادھند فائرنگ کر رہی

تھی، رونق علی نے ٹیپ ریکارڈر میں سے کیسٹ نکالی تھی اور دھند کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ پولیس اسے اور کیسٹ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہو گی۔ وہ ایک دو روز کے لیے مکھن وال میں چھپا رہا تھا اور کل صبح سویرے کیسٹ سمت راجول پہنچ گیا تھا۔ پہلے اس نے بڑوں کے اکٹھ میں یہ کیسٹ سنائی پھر عام لوگوں تک بھی اس کیسٹ کی آواز پہنچ گئی۔ باجوہ کو امید تھی کہ اب تک اس کیسٹ سے دو تین مزید کیسٹیں تیار ہو چکی ہوں گی۔ آج سالار نصر اللہ، چودھری یعقوب اور رونق وغیرہ کا پروگرام تھا کہ اس کیسٹ کو میلے میں لاؤڈ اسپیکر پر سنوایا جائے گا۔

میں نے باجوہ سے اپنی والدہ اور بہن کی خیر خیریت دریافت کی۔

باجوہ نے کہا۔ "بیگم جی نے انہیں اپنی جان سے لگا کر رکھا ہوا ہے جی۔ تھانے دار وارث ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گیا تھا، پر بیگم جی نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ دوسری طرف آپ کے سسر لمبڑ آصف جاہ نے بھی بڑے ہاتھ مارے ہیں مگر بیگم جی ان کے سامنے ڈھال بنی رہی ہیں۔ شاید آپ کو پتا ہی ہو، کیکراں والی میں تو ٹھیک ٹھاک لڑائی بھی ہوئی ہے۔ لمبڑ آصف کے کارندے آپ کے گھر والوں تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد بیگم جی راتوں

رات خود کیکراں والی پہنچیں۔ وہ عام کپڑوں میں تھیں اور ان کے ساتھ صرف ایک گارڈ تھا جس نے رائفل کپڑوں کی گٹھڑی میں چھپائی ہوئی تھی۔ وہ آپ کی والدہ اور بہن کو بڑی حفاظت سے لے کر راجوال واپس آ گئیں۔

اس بارے میں، میں اس سے پہلے کے ٹوکے یار فیقے سے بھی سن چکا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ بلقیس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر بے بے جی اور عارفہ کو واپس راجوال پہنچایا ہے۔ باجوہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اور سچ پوچھیں جی تو اللہ بخشے چودھری عزیز نے بھی اس معاملے میں بیگم جی کا پورا ساتھ دیا تھا۔ انہوں نے ہر طرح سے آپ کے گھر والوں کی حفاظت کی۔"

میں خاموش رہا، اس بارے میں میرا ذہن اب بھی الجھن کا شکار تھا۔ چودھری کو مجھ سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی؟

میں نے باجوہ سے پوچھا۔ "اب راجوال میں حالات کیا ہیں؟ موکھلوں کی طرف سے کوئی نئی شرارت تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں جی ابھی تک تو خیریت ہی ہے۔"

باجوہ کے جواب سے پتا چلتا تھا کہ وہ آنے والے خطرے سے بے خبر ہے۔

میں نے کہا۔ "موکھلوں کے بندے میلے میں تو نظر آتے رہے ہوں گے؟"

"ہاں جی، میلے میں تو آتے رہتے ہیں۔ چھوٹا موکھل بھی آیا تھا۔ اس نے کبڈی دیکھی تھی اور اپنے ہتھ سے انعام شنام بھی دیے تھے۔"

"کوئی بات تو نہیں کہی اس نے؟"

"نہیں جی، کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔" پھر جیسے ایک دم باجوہ کو یاد آیا۔ وہ بولا۔ "موکھل پاشا اور اس کے بندے مزار کے اندر گئے تھے۔ انہوں نے متولی جی کے ساتھ تھوڑی بدتمیزی بھی کی تھی۔ اس سے کہا کہ وہ چندے کا پورا حساب کتاب رکھے کیونکہ یہاں صرف جاگیر کا نہیں، سارے علاقے کے لوگوں کا چندہ اور نذرانے جمع ہوتے ہیں۔ اس کو سارا حساب کتاب دینا پڑے گا۔"

"اس کے علاوہ؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے اپنا ایک خادم بھی مزار میں رکھ چھوڑا ہے۔ کہا ہے کہ یہ بھی جھاڑ پونچھ کیا کرے گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ان باتوں سے تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟"

باجوہ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "ہو سکتا ہے جی۔۔۔۔ کہ موکھل کچھ دنوں بعد مزار کی ملکیت والا جھگڑا کھڑا کریں۔"

"کچھ دنوں بعد نہیں۔۔۔۔ آج ہی۔۔۔۔ بلکہ ابھی، بس دو گھنٹے کے اندر۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

باجوہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ ہکلایا۔

"مجھے پکی اطلاع ملی ہے۔ آج موکھلوں نے ہلا بولنا ہے۔ مزار پر قبضہ کرنا ہے اور وہاں اپنا متولی بٹھانا ہے۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آرہے ہیں۔"

باجوہ کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ "اب کیا ہوگا؟" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

اس کے گندمی چہرے پر اندیشوں کے گہرے سائے تھے مگر پھر بہ تدریج یہ سائے چھٹتے چلے گئے۔۔۔۔چند سیکنڈ کے اندر اندر اس کے چہرے پر امید کا اجالا نظر آنے لگا۔اس نے میری طرف دیکھا۔۔۔۔اس کے دیکھنے کے انداز میں انتہا درجے کا والہانہ پن تھا۔اس کی آنکھیں جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھیں۔

شاہ خاور! تم سب کچھ کر سکتے ہو۔

ہم سب کو تم پر پورا بھروسہ ہے۔

ہم سب تمہاری آواز پر ایک ہو سکتے ہیں۔

ہر ان ہونی کو ہونی کر سکتے ہیں۔

تم ہمارے درمیان ہو گے تو ہمیں کوئی ڈر نہیں۔کوئی فکر نہیں۔

میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آرہا تھا۔ذہن دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔اہم ترین سوال یہی تھا کہ کیا واقعی راجوال میں سب کچھ بدل چکا ہے؟ کیا مجھے راجوال پہنچ جانا چاہیے؟ کیا میں وہاں پہنچ کر ایک بار پھر اپنے چاہنے والوں کی امیدوں پر پورا اتر سکوں

گا؟ ذمہ داری کا ایک نادیدہ بوجھ میرے کندھوں کو توڑنے لگا۔مجھے اپنے قدموں میں لرزش محسوس ہوئی لیکن ایک بار پھر۔۔۔۔ایک بار پھر اسی ان دیکھی توانائی نے سہارا دیا جو۔۔۔۔راجوال میں گزرے پچھلے برسوں میں پل پل میرے ساتھ رہی تھی۔

دل دریا سمندروں ڈونگے

کون دلاں دیاں جانے ہو

میں نے حامد کا ہاتھ پکڑ لیا۔میں راجوال جانے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہم کوشش کے باوجود ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے راجوال نہیں پہنچ سکے۔راجوال کے نواح میں پہنچ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔میں نے دیکھا، باجوہ کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔راجوال کی طرف سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔

"یا اللہ خیر۔" باجوہ کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

حامد بھی پریشان نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

ہم قدرے تیزی سے آگے بڑھے۔۔۔۔۔اور پھر ہمارے اندیشے حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔سب سے پہلے راجوال کے ہی چند افراد نظر آئے۔وہ ریڑھے پر سوار تھے۔ان میں دو عورتیں، دو مرد اور چند بچے تھے۔وہ دائیں طرف سرپٹ جا رہے تھے۔باجوہ نے انہیں دیکھ کر آواز لگائی۔"رحمت۔۔۔۔۔رحمت۔۔۔۔۔بخشو۔۔۔۔۔بات سنو یار!"

انہوں نے سنتے ہوئے بھی کچھ نہیں سنا اور دیکھتے دیکھتے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ابھی ہم تھوڑی دور مزید گئے تھے کہ ہمیں راجوال ہی کا ایک شخص نظر آیا۔اس کی ٹانگ پر کلہاڑی کا گہرا وار لگا ہوا تھا۔ران کے اوپر میلی سی پٹی باندھی گئی تھی اور پٹی سے مسلسل خون رس رہا تھا۔اس شخص کا نام رشید تھا۔رشید کا رنگ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔دو ادھیڑ عمر افراد اسے دونوں طرف سے سہارا دے کر لے جا رہے تھے۔وہ خود بھی تھوڑے زخمی تھے۔

میں نے ان میں سے ایک شخص کو پہچان کر کہا۔"کیا ہوا چاچا کریم؟"

کریم نے پہلے مجھے دھیان سے دیکھا، پھر پہچان لیا اور اس کے چہرے پر ہیجانی آثار نظر آنے لگے۔وہ کراہتے ہوئے بولا۔"اب کیا لینے آئے ہو تم؟انہوں نے سب کچھ برباد کر دیا ہے۔پنڈ کا شاید ہی کوئی بندہ پھٹل ہونے سے بچا ہو۔بہت سوں کی جان چلی گئی ہے۔ظالموں نے آگ لگا دی ہے آدھے پنڈ میں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"یقین نہیں تو جا کر دیکھ لو۔جو لڑائی تم نے چھیڑی تھی اس کا انجام بڑا برا ہوا ہے سالار خاور! موکھلوں نے پورا پورا بدلہ لیا ہے۔وہ ہماری زنانیوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔مزار پر قبضہ کر لیا ہے۔پتا نہیں کتنے بندوں کی جان لے لی ہے۔"چاچے کریم کی آواز بھراتی چلی جا رہی تھی۔

میرے تن بدن میں آگ بھڑک گئی تھی۔سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے۔میری آنکھوں کے سامنے موکھل پاشا کا چہرہ اپنی پوری نحوست کے ساتھ جلوہ گر ہو گیا۔اس کی بھوری آنکھوں کی مکروہ چمک، اس کی فاتحانہ ہنسی۔اس نے مجھے کہا تھا کہ مچھلی

فارم والی زمین کے بدلے مجھے بہت کچھ دینا پڑے گا اور سہنا پڑے گا۔ شاید آج اس نے اپنا کہا پورا کر دکھایا تھا۔

یہ کیا ہو رہا تھا میرے ساتھ؟ حالات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ میرا دماغ ان کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے باجوہ نے مژدہ سنایا تھا کہ چودھری عزیز والی کیسٹ، راجوال کے بہت سے کانوں تک پہنچ گئی ہے۔ وہ اصل مجرموں کے چہرے پہچان گئے ہیں اور اب وہ ہر طرح میرا ساتھ دینے پر تیار ہوں گے۔ مجھے امید کی روشن کرنیں نظر آئی تھیں مگر اب صرف ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے پتا چل رہا تھا کہ راجوال میں ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔

میں نے ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پوری رفتار سے راجوال کی طرف بڑھا۔ راستے میں مجھے دل دوز مناظر دیکھنے کو ملے۔ عورتیں اور بچے کھیتوں میں بھاگتے ہوئے محفوظ جگہوں کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ لوگ اپنے ڈور ڈنگر اندھا دھند ہانک کر آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے دو چار پائیاں دیکھیں۔ انہیں حواس باختہ افراد نے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا اور پتا نہیں کس طرف دوڑے جا رہے تھے۔ چار پائیوں پر موجود افراد

زخموں سے چور تھے۔ پتا نہیں وہ زندہ تھے یا دم توڑ چکے تھے۔ چار پائیوں سے ٹپکنے والا لہو، چار پائیاں اٹھانے والوں کے کپڑے داغدار کر رہا تھا۔ ایک جلی ہوئی عورت پگڈنڈی پر پڑی تھی، اس کے گرد کئی عورتیں بین کر رہی تھیں۔ مجھے ایک نوجوان بھی نظر آیا۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی مگر وہ دو ننھے بچوں کو اٹھائے کھیتوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے گر جائے گا۔

میں نے یہ سارے مناظر دیکھے مگر رکا کہیں نہیں۔ میرا گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا راجوال کے اندر داخل ہوا۔ راجوال کا دایاں حصہ آگ کی لپیٹ میں تھا اور اس کی حدت پوری آبادی کو متاثر کر رہی تھی۔ آگ کے قریب میں نے دو گھوڑوں کی لاشیں بھی دیکھیں۔ مزار اس آگ کی دوسری طرف کھلی جگہ پر واقع تھا۔ میں نے میلے کے بہت سے شامیانوں اور آسمانی جھولوں کو بھی آگ کی لپیٹ میں دیکھا۔

میں نے لگامیں موڑیں اور حویلی کی طرف بڑھا۔ مجھے گلیاں سنسان اور کھڑکیاں دروازے بند نظر آئے۔ تاہم حویلی کے گرد بہت سے مسلح افراد موجود تھے۔ ان میں مجھے نصراللہ، برکت اور شبیر کی صورتیں بھی دکھائی دیں۔ ان میں سے اکثر لوگ زخمی نظر آ رہے

تھے۔اس سے پہلے کہ وہ مجھے پوری طرح پہچان پاتے اور میرے گرد جمع ہو جاتے، میں گھوڑا دوڑاتا ہوا حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے حویلی کے وسیع احاطے کو گھوڑے پر ہی پار کیا اور رہائشی حصے میں پہنچ گیا۔

یہاں بھی پہرا تھا۔ قریباً بیس پچیس افراد چوکس کھڑے تھے۔ تاہم ان کے چہرے دھوئیں کے اندر دھواں نظر آرہے تھے۔ حفاظت کی غرض سے رہائشی حصے کے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا تھا۔

"کون؟" حویلی کے عباس نامی جاں نثار نے میرے سامنے آتے ہوئے پوچھا۔

پھر مجھے پہچان کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ "خاور صاحب۔۔۔۔۔آپ؟" اس نے بے پناہ حیرت سے کہا اور اس کی رائفل کی نال جھک گئی۔

"دروازہ کھولو۔" میرے لہجے میں تحکم تھا۔

عباس ایک لمحے کے لیے تذبذب میں نظر آیا مگر پھر فوراً ہی اس نے جیب سے چابی نکال کر زنان خانے کا بھاری بھرکم قفل کھول دیا۔ میں گھوڑے سے اتر کر اندر چلا گیا۔ اندر سہمی ہوئی نوکرانیاں اور پڑوسی عورتیں دکھائی دیں۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں بھی

ہیجانی کیفیت نظر آنے لگی تھی۔ میں برآمدے کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ میرے ہاتھ میں رائفل تھی اور کمر میں گولیوں والی بیلٹ۔ میرے اندر کی آگ میری آنکھوں کو جلا رہی تھی اور میری رگوں میں چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ "بیگم بلقیس کہاں ہیں؟" میں نے ایک عورت سے پوچھا۔

اس نے انگلیوں سے اشارا کیا۔ میں نشست گاہ میں داخل ہوا۔ نشست گاہ میں بلقیس کے بڑے ماموں یعقوب موجود تھے۔ اس کے علاوہ بلقیس کے دو بھائی اور ایک دو کزن بھی تھے۔ بلقیس بھی ایک طرف صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ ایک کاغذ پر جلدی جلدی کچھ لکھ رہی تھی۔ (بلقیس، حامد سے لکھنا پڑھنا سیکھ چکی تھی)۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، مجھے دیکھ کر سب اچانک کھڑے ہو گئے۔

"خاور! تم کہاں تھے؟" چودھری یعقوب نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"بس کہیں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"تمہیں پتا ہے، یہاں کیا ہو گیا ہے؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں اور نہ میں آپ لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں صرف بلقیس سے دو منٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اس کی اجازت عنایت فرمائیں گے؟" میرے لہجے میں زہر گھلتا جا رہا تھا۔

چند لمحے کے لیے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ آخر بلقیس کا منجھلا بھائی چودھری جمشید بولا۔ "تمہیں جو مشورہ کرنا ہے خاور۔۔۔۔۔ ہمارے سامنے ہی کرو۔ ہو سکتا ہے کہ ہم بھی کوئی اچھا مشورہ دے سکیں۔"

میں پھٹ پڑا۔ "تم لوگ کوئی مشورہ دینے یا کچھ کرنے کے قابل ہوتے تو آج یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ تم لوگ صرف آپس میں جھگڑ سکتے ہو۔ ایک دوجے کی پراپرٹیاں چھین سکتے ہو اور اپنی عیاشیوں میں نوٹ لگا سکتے ہو۔ اس جاگیر کے لیے اور اسے چلانے والوں کے لیے تم نے صرف مصیبتیں کھڑی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے۔ مجھے تمہارا مشورہ نہیں چاہیے۔ میں صرف بلقیس سے بات کرنا چاہتا ہوں اور اگر تم نہیں چاہتے تو میں چلا جاتا ہوں یہاں سے۔"

چودھری یعقوب نے جلدی سے کہا۔ "نہیں نہیں۔۔۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ تم بات کرو۔ میں ان کو باہر لے جاتا ہوں۔"

بلقیس کے ایک جوشیلے چچازاد نے کچھ کہنا چاہا مگر چودھری یعقوب نے اسے اشارے سے خاموش کر دیا اور ان چاروں پانچوں کو لے کر باہر چلا گیا۔

بلقیس نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں غم اور ہزیمت کے بوجھ سے سرخ تھیں۔ مجھے صاف لگا کہ وہ اس بات پر ناخوش نہیں ہے کہ میں نے اس کے ماموں اور بھائیوں کو باہر نکالا ہے۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ لرزتی آواز میں بولی۔ "تم کہاں تھے خاور! دیکھو ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ شاید موکھل یہ چاہ رہے ہیں کہ اب ہم سانس لینا بھی چھوڑ دیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے بغیر کسی وجہ کے۔۔۔۔۔ بغیر کسی جھگڑے کے گاؤں پر ہلا بولا ہے۔ کوئی آدھے گھنٹے تک گولیاں چلتی رہی ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ کتنے مرے ہیں اور کتنے زخمی ہوئے ہیں۔" اس کا گلا رندھ گیا اور آنسو گرنے لگے۔

"پولیس نے کچھ نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو خاور! میاں وارث اور اس کا ڈی ایس پی موکھلوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں پورا پورا موقع دے رہے ہیں۔۔ میاں وارث تو ویسے ہی چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ ڈی ایس پی کا پتا نہیں کہ وہ کس جگہ پر ہے۔"

"راجوال تھانے کی پولیس کہاں مر گئی؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں۔ ابھی نصر اللہ بتا رہا تھا، بس چودہ پندرہ سپاہی آئے تھے۔ انہوں نے موکھلوں کو روکنے کے لیے دکھاوے کی ہوائی فائرنگ بھی کی مگر پھر تتر بتر ہو گئے۔ اب کہیں کوئی بھی پولیس والا نظر نہیں آ رہا۔"

"انہوں نے نظر آنا بھی نہیں ہے بلقیس۔ اگر کچھ کرنا ہے تو ہمیں خود ہی کرنا ہے۔"

"اب کرنے کو کیا رہ گیا ہے خاور! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں حویلی میں گھس آئیں گے۔ یہاں لوٹ مار کریں گے۔ عورتوں کو بے عزت کریں گے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ان کی یہ ہمت نہیں ہے بلقیس!" میری آواز میں گرج تھی۔ "میرے ہوتے ہوئے وہ آنکھ اٹھا کر بھی ادھر نہیں دیکھ سکتے۔ وہ میری لاش گرا کر ہی حویلی میں آ سکتے ہیں، اس کے بغیر نہیں۔"

"لیکن میں تمہاری لاش نہیں دیکھنا چاہتی۔ بالکل نہیں چاہتی۔" وہ سسکی۔ ایک آنسو ناک کے کوکے میں اٹک گیا۔ "خدا کے لیے خاور۔۔۔۔ خدا کے لیے، میری بات مان لینا، انکار نہ کرنا۔ تم بے بے جی اور عارفہ کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ مجھے ان کی طرف سے بہت ڈر ہے۔ مجھے پتا ہے، اندر سے یہ موکھل اور لمبڑ آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ موکھلوں میں آصف جاہ کے بندے بھی ہوں۔ آصف جاہ کے کارندے ہر صورت تم تک اور تمہارے گھر والوں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی بڑی مشکل سے انہیں بچایا ہے۔ تم ان کو لے کر چلے جاؤ خاور! دیکھو۔۔۔۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

میں نے بڑے سکون سے کہا۔ "مجھے پتا ہے تم یہی کہو گی بلقیس! لیکن یہ ہو نہیں سکتا۔ اب ہمارا جینا مرنا ساتھ ہے اور ساتھ رہے گا۔۔۔۔ اب جو بھی ہونا ہے، ہم سب کے ساتھ ہونا ہے۔"

آگ کی تپش بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ صبح نو دس بجے کا وقت تھا لیکن گاڑھے سیاہ دھوئیں کی وجہ سے شام محسوس ہو رہی تھی۔ "بے بے جی اور عارفہ کہاں ہیں؟" میں بلقیس سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، ایک طرف سے عارفہ نمودار ہوئی۔ اس کی گود میں اس کا بچہ تھا۔ وہ بچے سمیت مجھ سے لپیٹ گئی۔ میرے جسم کا حصہ بن گئی۔ پھر والدہ نمودار ہوئیں اور انہوں نے بھی روتے ہوئے مجھے گلے سے لگایا۔ "میرا پتر! تو کہاں چلا گیا تھا؟ کیوں چھوڑ گیا تھا ہمیں اس طرح؟ دیکھ یہاں ویروں نے ہمارا جینا مشکل کر دیا ہے۔ یہ کڑی بلقیس نہ ہوتی تو شاید اب تک ہم بھی دوسروں کی طرح قبر میں پہنچ گئے ہوتے۔" بے بے جی نے بلقیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، دھماکے کی گونج دار آواز آئی۔ پتا چلا کہ گاؤں کے جلتے ہوئے اسکول کی چھت گر گئی ہے۔

میں نے کھڑکی میں سے دیکھا، زنان خانے کے بہت سے محافظ دروازے کے سامنے جمع تھے۔ ان میں نصر اللہ بھی تھا۔ یہ سب لوگ اب یہاں میری موجودگی سے آگاہ ہو چکے

تھے اور مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب تھے مگر وہ تب ہی مل سکتے تھے جب میں زنان خانے سے باہر آتا۔

میں نے ایک ملازمہ سے کہہ کر صرف نصر اللہ کو اندر بلایا۔ نصر اللہ کچھ دن پہلے بھی زخمی ہوا تھا۔ اب پھر اس کے سر پر تازہ زخم دکھائی دے رہا تھا۔ تاہم ہمیشہ کی طرح اس کا حوصلہ جوان تھا۔ میرے گلے سے لگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ میں نے کہا۔ "نصر اللہ! باہر کی کیا صورتِ حال ہے؟"

"صورتِ حال ٹھیک نہیں ہے جی۔ موکھلوں نے مزار شریف پر قبضہ جما لیا ہے۔ راجوال کے لوگوں کو مار کر وہاں سے بھگا دیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے کئی جگہ آگ بھی لگائی ہے۔ ان سب نے شرابیں پی رکھی ہیں اور بھنگڑا ڈال رہے ہیں۔ ابھی تو وہ ایک جگہ رکے ہوئے ہیں مگر زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔ وہ ایک بار تو حویلی تک ضرور آئیں گے۔"

"تمہارے پاس کتنے بندے ہیں؟"

نصر اللہ کا چہرہ بجھ گیا۔ "اس وقت تو بس جتنے بھی ہیں، آپ کو نظر آ رہے ہیں۔ باقی سب تتر بتر ہو گئے ہیں۔ چالیس پچاس کے قریب تو زخمی ہوئے ہوں گے۔ کم از کم آٹھ دس لاشیں بھی گر چکی ہیں۔ ایک پولیس والا بھی مرا۔"

"پولیس والا۔۔۔۔اسے کس نے مارا ہے؟"

"پتا نہیں جی۔ پر مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے کسی کی گولی اسے نہیں لگی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی موکھلوں اور میاں وارث کا کوئی ڈراما ہے۔ ایک پولیس والے کی جان لے کر یہ سارا ملبہ ہمارے اوپر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔"

میں نے باہر نظر دوڑائی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ نصر اللہ کے ساتھ فی الوقت تیس چالیس سے زیادہ بندے نہیں ہیں اور جو ہیں وہ بھی حوصلہ چھوڑے بیٹھے ہیں۔ ان میں نصر اللہ سمیت بہت سے زخمی بھی تھے۔

اسی دوران میں حامد بھی ہانپتا کانپتا ہوا پہنچ گیا۔ بلقیس اسے دیکھ کر مزید پریشان ہوئی۔ غالباً اسے یہ تسلی تھی کہ اس مشکل ترین وقت میں حامد راجوال میں نہیں ہے۔ اس

نے حامد کو دانت کی دوا کے لیے ڈسکے روانہ کیا ہوا تھا۔ اب وہ اچانک واپس آ گیا تھا اور موجودہ خطرات میں شامل ہو گیا تھا۔

میں نے نصر اللہ سے رونق علی کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولا۔ "وہ یہیں کہیں ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر لاتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی وہ باہر نکل گیا۔

میں نے کہا۔ "بلقیس! ایک بات تو طے ہے کہ ہم راجوال کے مزار کو ان کے حوالے نہیں کریں گے اور نہ ہی پیچھے ہٹیں گے۔ اب میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور دو موتی پھر اس کی آنکھوں سے جھڑ گئے۔ "نہیں خاور! یہ دلیری نہیں بے وقوفی ہو گی۔ اگر یہ لوگ حویلی کی طرف نہیں آتے تو پھر ہمیں بھی ابھی خاموش رہنا چاہیے۔ دیکھنا چاہیے کہ بات کس طرف جاتی ہے۔"

"یہ بھول ہے بلقیس! میں ان کتوں کو بڑی اچھی طرح جان چکا ہوں۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ یہ مزار لینے کے بعد آرام سے بیٹھ جائیں گے تو ہم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے

ہیں۔ یہ حویلی کی طرف ضرور آئیں گے۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ ان کے سر پر خون سوار ہے۔ یہ آج بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا خاور۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

عارفہ نے بھی بلقیس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "بھاجی! اس وقت حویلی سے باہر نکلنا بالکل ٹھیک نہیں۔ آپا بلقیس صحیح کہہ رہی ہیں۔ ہم کو انتظار کرنا چاہیے کہ مکھن وال اور شام پور سے لوگ یہاں پہنچ جائیں یا پھر پولیس ہی کچھ کرے۔"

"تم چپ رہو۔ کوئی کچھ نہیں کرے گا۔ پولیس کو تو بھول جاؤ۔ مکھن وال اور شام پور سے بھی کوئی تب ہی آگے بڑھے گا، جب ہم کچھ کرنے کے قابل ہوں گے۔ ہارنے اور بھاگنے والے کا ساتھ کوئی نہیں دیتا۔"

"پر بھاجی! آپ۔۔۔۔۔"

"تم چپ رہو عارفہ! تمہیں کچھ پتا نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ پھر میں نے بلقیس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "سنا ہے کہ رونق علی نے چودھری عزیز والی کیسٹ پنچایت میں سنائی ہے اور دوسرے لوگوں میں بھی؟"

"ہاں، وہ کیسٹ تو تقریباً سب نے سن لی ہے۔ کوئی دو گھنٹے پہلے جب موکھلوں نے ایک دم ہلا بولا، اس وقت بھی میلے میں لاؤڈ اسپیکر پر یہی کیسٹ چل رہی تھی اور بہت سے لوگ اکٹھے ہو کر سن رہے تھے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میری بے گناہی والی بات لوگوں تک پہنچ گئی ہے۔"

"کم از کم راجوال کے لوگوں تک پہنچ گئی ہے۔ ان کے سامنے بالکل چانن ہو گیا ہے۔ جب کچھ دیر پہلے یہ کیسٹ چل رہی تھی، بہت سے لوگ تمہارے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔"

میں نے گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے بلقیس! اگر میرے لوگ میرے بارے میں دوسری طرح سوچنے لگے ہیں تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے پورا بھروسا ہے کہ وہ میرے لیے باہر نکلیں گے۔۔۔۔۔ ضرور نکلیں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی مجھے جانے دو۔"

"کہاں؟" تین آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ ان میں بے بے جی اور عارفہ کی آوازیں بھی تھیں۔

"میں موکھلوں سے بات کروں گا۔" بے بے جی نے مجھے بانہوں میں لے کر میرا راستہ روک لیا۔ عارفہ بھی میرے سامنے آ گئی۔

"نہیں بے بے جی۔۔۔۔ میں نہ گیا تو پھر بہت کچھ ختم ہو جائے گا۔ مجھے جانا ہے۔" میرے اندر بھڑکتی ہوئی نیلی آگ روشن تر ہو رہی تھی۔

بے بے جی چلائیں۔ "بلقیس! یہ تمہاری بات مانتا ہے۔ تم روکو اسے۔"

بلقیس روتے ہوئے بولی۔ "نہیں خاور! وہ مار دیں گے تمہیں۔ تم نہیں جا سکتے ہو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے آوازیں دیں۔ "نصر اللہ۔۔۔۔ نصر اللہ۔۔۔۔ برکت!"

مگر میں کسی کے آنے سے پہلے ہی خود کو چھڑا چکا تھا۔ میں انہیں روتا چلاتا چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کو تیزی کے ساتھ باہر سے بند کر دیا۔ وہ دروازہ کوٹنے لگیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

بلقیس مسلسل محافظوں کو آوازیں دے رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ محافظ اس وقت بلقیس سے زیادہ میری آواز کو اہمیت دیں گے۔ وہ سب جانتے تھے۔۔۔۔ یہ میرا وقت ہے۔ اس وقت جو بھی کرنا ہے، مجھے کرنا ہے۔ اب یہاں جو کچھ بھی اچھا یا برا ہونا تھا، اس کا دارومدار مجھ پر تھا۔

میں بگولے کی طرح باہر نکلا۔ بھری ہوئی رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میرے تاثرات دیکھ کر نصر اللہ اور دیگر محافظ چونک گئے۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟" نصر اللہ نے پوچھا۔

"مزار پر۔"

نصر اللہ کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر وہ ایک دم سنبھل کر بولا۔ "اگر آپ نے جانا ہی ہے تو پھر آپ اکیلے نہیں جائیں گے۔ ہم بھی ساتھ چلیں گے۔"

"نہیں ابھی کسی کی ضرورت نہیں۔' میں دہاڑا۔ "ابھی مجھے اکیلا جانے دو۔ جب ضرورت ہو گی۔ تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔"

نصر اللہ اور دیگر محافظوں کو سکتہ زدہ چھوڑ کر میں حویلی کے بڑے احاطے میں پہنچ گیا۔ میرے عقب میں ابھی تک بے بے جی، عارفہ اور بلقیس کی چلاتی آوازیں آرہی تھیں۔ جلد ہی میں حویلی کے بڑے دروازے سے باہر تھا۔ میرے سامنے دھوئیں سے آلودہ سنسان گلیاں تھیں۔ کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔۔۔۔ جیسے کسی دیو زاد کی دہشت ان کوچوں کی رونق چاٹ گئی ہو۔ میں راجوال کے چوراہے میں پہنچ گیا۔ مزار گاؤں سے باہر تھا مگر موکھلوں کے گھوڑے چوراہے کے آس پاس تک دندنا رہے تھے۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ میں براہِ راست موکھل پاشا سے ٹکرانا چاہتا تھا۔ ایک کے مقابلے میں ایک۔ اگر کسی طرح ایسا ہو جاتا تو میرا راستہ آسان ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں موکھل پاشا کو زیر کر لوں گا اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ پاشا کے ساتھیوں کو اس کی ہار کسی طور پر قبول نہیں ہوگی۔ وہ پاشا کو گرتے دیکھ کر بیچ میں کود پڑیں گے اور اگر وہ بیچ میں کود پڑتے تو پھر بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھی میری مدد کو آگے بڑھ سکتے تھے اور گاؤں کے لوگ بھی اشتعال میں آ سکتے تھے۔۔۔۔ اگر گاؤں کے عام لوگ ایک بار نکل پڑتے تو پھر موکھلوں کے لیے پاؤں جمائے رکھنا ممکن نہیں تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں دیوانہ وار آگے بڑھتا رہا۔۔۔۔ لیکن اگلے تین چار منٹ میں جو کچھ ہوا، وہ میری توقع اور پلاننگ کے بالکل خلاف تھا۔ ابھی میں مزار سے کافی دور تھا کہ ایک دم دائیں طرف سے دو افراد نمودار ہوئے۔ یہ دونوں موکھل کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ ایک موکھل نے بھڑک مار کر میرے رائفل والے ہاتھ پر کلہاڑی کا وار کیا۔ شاید مجھے سیکنڈ کے دسویں حصے کی تاخیر بھی ہوتی تو میرا ہاتھ رائفل سمیت کٹ کر میرے جسم سے جدا ہو جاتا۔ کلہاڑی کا بلیڈ میری کلائی کو چھوتا ہوا گزرا۔ میں نے اپنے سر کی بھرپور ضرب کلہاڑی بردار کے چہرے پر لگائی، وہ ڈکراتا ہوا ایک فروٹ والی ریڑھی پر جا گرا۔

دوسری کلہاڑی اٹھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ شخص دو تین قدم اٹھاتا اور اس کی کلہاڑی میرے سر کو نشانہ بناتی، میں نے اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی اور وہ کلہاڑی سمیت گر گیا۔ مگر یہی وقت تھا جب سائیڈ کے شامیانے سے ایک شرابی موکھل طوفان کی طرح آیا اور میری رائفل چھڑانا چاہی لیکن وہ جونک کی طرح چمٹ گیا تھا۔ یکایک دو تین افراد مزید مجھ سے لپٹ گئے۔ شاید وہ مجھے گرا لیتے، تاہم میرے جسم میں بھڑکتی ہوئی آگ نے میرے اندر ایسی توانائی بھر دی تھی کہ میری قوتِ بر

داشت کئی گنا ہو گئی تھی۔ اس توانائی اور برداشت نے مجھے گرنے نہیں دیا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا رکھا۔ رائفل تو میرے ہاتھ سے نکل گئی لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا اور ان سے بھڑ گیا۔ اگلے ایک دو منٹ میں، اس دھواں دھواں گلی میں، ان جلتے ہوئے شامیانوں کے درمیان اور اس لہریں مارتی سنسنی میں، میرے اور حملہ آوروں کے درمیان ایک زبردست لڑائی ہوئی۔

وہ لوگ جانتے تھے کہ مجھے زیر کرنا اتنا آسان نہیں۔ اس لیے وہ اپنی تمام تر طاقت استعمال کر رہے تھے۔ میرے ارد گرد گالیوں اور للکاروں کی بوچھاڑ تھی۔ پھر میں نے کچھ فاصلے سے ایک اور موکھل کی للکارتی آواز سنی۔ وہ حملہ آواروں کو حوصلہ دیتے ہوئے پکارا۔ "شاوا جوانو۔۔۔۔ آج جانے نہ پائے۔ یہیں قیمہ کر دو اس کتے کا۔"

اس کے عقب سے ایک آواز آئی۔ "گولی نہیں چلانی۔ زندہ پکڑو اس کو۔"

میرے گرد حملہ آور بڑھتے جا رہے تھے لیکن میں ہار ماننے کے لیے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس اندھا دھند جدوجہد میں، میں نے موکھل پاشا کو بھی چند تسلی بخش ضربیں لگائیں۔۔۔۔ میں زخمی ہو گیا تھا مگر پوری طاقت سے مزاحمت کر رہا تھا۔ ایک لاٹھی کے

زوردار وار سے بچ کر میں نیچے جھکا تو چھوٹے دستے کی ایک کلہاڑی میرے ہاتھ آ گئی۔ ہاتھ میں کلہاڑی آنے کے بعد میری مزاحمت کی شدت کم ہونے کی بجائے بڑھ گئی۔ اپنے کندھے اور بازو سے بہنے والے خون کی پروا کیے بغیر میں اندھا دھند کلہاڑی چلاتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ میں گر گیا تو اس کے ساتھ راجوال کے ہر شخص کی ہمت بھی گر جائے گی۔ وہ مجھ پر بے تحاشا بھروسا کرتے تھے۔ شاید میری صلاحیتوں سے بھی بڑھ کر بھروسا کرتے تھے۔ میں جانتا تھا جاگیر کے ہر گھر میں میری دلیری اور بے خوفی کی باتیں کی جاتی ہیں۔ مجھے ایک انوکھے شخص کے روپ میں دیکھا جاتا ہے میرے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ میں جو کام بھی کرنا چاہوں کر گزرتا ہوں۔ ان گنت نوجوانوں مجھے ایک آئیڈیل کی طرح اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے۔

تو پھر کیا ہو گا؟

کیا آج وہ میری بے بسی دیکھ کر خون کے آنسو بہائیں گے؟

کیا آج میں ان کے سامنے بے دست و پا ہو کر اپنے ہی لہو میں ڈوب جاؤں گا؟

کیا ان کا شیر شاہ آج ہزیمت کی مٹی میں دفن ہو جائے گا؟

۔۔۔۔۔ میں لڑ رہا تھا اور یہ خیالات انگاروں کی طرح میرے ذہن میں دہک رہے تھے۔۔۔۔۔ کسی شخص کے اعتماد کا بوجھ اٹھانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ یہ بوجھ کندھے توڑ دیتا ہے اور جسم کو پیس ڈالتا ہے۔۔۔۔۔ اور پھر جب اعتماد کرنے والے ایک دو نہ ہوں، سینکڑوں، ہزاروں ہوں تو قیامت گزر جاتی ہے۔

میں دیوانہ وار لڑ رہا تھا لیکن میرا گھیرا ٹوٹنے والا نہیں تھا۔ ہر سانس کے ساتھ سینے میں دھواں اتر رہا تھا اور ذہن میں دھند بھر رہی تھی اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ راجوال کی سنسان گلیوں میں۔۔۔۔۔ بند دروازوں اور کھڑکیوں سے آگے، پُرہول سناٹے کو توڑتا ہوا ایک شخص برآمد ہوا۔ یہ کوئی جوان رعنا نہیں تھا۔۔۔۔۔ نہ ہی کوئی کڑیل محافظ تھا۔ یہ ایک لڑکھڑاتا ہوا، خستہ حال بوڑھا تھا۔ یہ چاچا عسکری تھا جو مدت سے بسترِ علالت پر پڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ چاچے عسکری کے ہاتھوں میں کلہاڑی ہے اور سر پر سرخ رنگ کی بوسیدہ پگڑی جو وہ کبھی سالار کی حیثیت سے پہنتا تھا۔ وہ اپنی کلہاڑی سے گلی کے بند دروازوں کو کوٹتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کی دور افتادہ آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ اپنی

بوڑھی آواز میں پکار رہا تھا۔ "اوئے باہر نکلو۔۔۔۔۔ اوئے کہاں مر گئے ہو سب؟ اوئے دیکھو وہ مار رہے ہیں اس کو۔ دروازہ کھولو۔۔۔۔۔ باہر نکلو۔ اوئے باہر نکلو۔"

پھر لڑتے لڑتے میں نے دیکھا کہ ایک گھڑ سوار موکھل تیزی سے چاچے عسکری پر حملہ آور ہوا۔ چاچے نے جھک کر اس کا وار بچایا اور اپنی کلہاڑی سے گھوڑے کی ٹانگ کو زخمی کیا۔ گھوڑا اور گھڑ سوار دونوں گرے اور دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ یہ بوڑھے شیر کی شاید آخری جھپٹ تھی۔ اس کے بعد میں چاچے عسکری کو نہیں دیکھ سکا۔ ہاں، اپنے مدِّمقابلوں سے لڑتے ہوئے مجھے یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ چاچا عسکری بھی مجھ سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر ہے اور موکھلوں سے لڑ رہا ہے۔ یہ سب واقعات تین چار منٹ کے اندر اندر وقوع پذیر ہوئے۔

اسی دوران میں مجھے بائیں طرف ہلچل محسوس ہوئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ نصراللہ نے اپنے بیس تیس ساتھیوں سمیت ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر مزار پر ہلا بول دیا ہے۔ فائرنگ کی آواز سے مزار کے آس پاس کا علاقہ گونجنے لگا۔ لیکن جس ملے کا میں انتظار کر رہا تھا، یہ وہ نہیں تھا۔ وہ کوئی اور تھا۔ جب ایک عام شخص کے سینے میں چنگاری بھڑکتی ہے۔ جب وہ کسی

مقصد، کسی نظریے یا منزل کی طرف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور یہ کوئی ایک چنگاری نہیں ہوتی۔۔۔۔ یہ ہزارہا چنگاریاں ہوتی ہیں جو ایک ہی انداز میں، ایک حدت کے ساتھ ایک ہی جیسے ان گنت سینوں میں بھڑکتی ہیں۔۔۔۔ اور چنگاریاں نہیں ہوتیں، در حقیقت یہ ایک آگ کا طوفان ہوتا ہے جو اپنی راہ میں آنے والی ہر زندہ و بے جان شے کو خاکستر کر دیتا ہے۔

اور مجھے اسی آگ کا انتظار تھا۔

۔۔۔۔ اور پھر میں نے دھواں دھواں گلی میں دو تین دروازے کھلتے دیکھے۔ چند متحرک سائے نظر آئے۔۔۔۔ پھر ان میں کچھ اور۔۔۔۔ میرے بازوؤں میں نئی توانائی بھرنے لگی۔ جیسے کسی نے بجھتے ہوئے دیے میں مزید تیل ڈال دیا ہو۔ میرے لوگ آ رہے تھے۔۔۔۔ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ زخموں سے چور ہونے باوجود میں نے حتی الامکان مزاحمت جاری رکھی۔ موکھلوں نے مجھے دبوچ لیا تھا اور اب مجھے گھسیٹے اور کھینچے ہوئے مزار کی طرف لے جا رہے تھے۔

میرے ذہن میں دھند بھر رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ میری ہمت جواب دے جائے گی۔ میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر میں نے بہت سی للکارتی ہوئی آوازیں سنی

۔۔۔۔ یہ آوازیں بڑی تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔ یہ راجوال کے عام لوگوں کی آوازیں تھیں۔۔۔۔ یہ میرے لوگوں کی آوازیں تھیں۔ میرا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ میں نے چند شدید جھٹکوں کے ساتھ خود کو آہنی ہاتھوں سے آزاد کرا لیا اور اس کلہاڑی کی طرف جست لگائی جو کچھ دیر پہلے میرے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔

ایک کاشت کار کی کڑکتی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "تگڑے ہو جاؤ سالار جی! ہم آ گئے ہیں۔"

۔۔۔۔ ہاں، یہی وہ چنگاری اور یہی وہ آگ تھی۔ راجوال کے لوگ نکلے تو نکلتے چلے گئے۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی، وہ بھڑکیں مارتے اور لاٹھیاں، کلہاڑیاں لہراتے مزار کی طرف بڑھنے لگے۔۔۔۔ لڑائی میں ایک دم شدت آ گئی۔ حویلی کے وہ محافظ جو زخمی ہو کر یا بد دل ہو تتر بتر ہو گئے تھے، بدلی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر پلٹ پڑے۔ ہر طرف گرد نظر آنے لگی۔ قریباً چار پانچ منٹ تک گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ یہ جگہ مزار سے تقریباً ایک سو گز دور تھی۔ موکھل خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ لیکن اب ان کا مقابلہ صرف حویلی کے

محافظوں سے نہیں تھا۔۔۔۔ان کے سامنے راجوال کے لوگ تھے اور ان کی تعداد میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔یہ خلقِ خدا تھی اور خلقِ خدا کا راستہ کوئی کب روک سکا ہے؟

کہیں دور سے موکھل پاشا کی للکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔"گولی چلاؤ۔۔۔۔بھون ڈالو حرامزادوں کو۔"

اس کے ساتھ ہی مزار کی طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔چند لمحوں کے لیے لگا کہ لوگ منتشر ہو رہے ہیں۔وہ بغلی گلیوں کی طرف سمٹ گئے لیکن یہ صورتِ حال آٹھ دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں رہی۔وہ پلٹے اور ایک بار پھر ریلے کی شکل اختیار کر گئے۔پچھلے چند ہفتوں میں موکھلوں نے ان پر بہت سے ستم توڑے تھے۔ان کے مویشی ہانک کر لے گئے تھے،ان کو گلیوں میں گھسیٹ گھسیٹ کر رسوا کیا تھا اور آج ان کی عورتوں پر بھی ہاتھ ڈال دیا تھا۔اب یہ سارا ستم طیش بن کر رگوں میں دوڑ گیا تھا اور آگ بن کر آنکھوں سے نکل رہا تھا۔ظلم جہاں بھی ہو،اس کا ردِّ عمل ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔

بہت جلد موکھلوں کی طرف فائرنگ بند ہو گئی۔میں نے اور نصراللہ نے موکھلوں کو مزار سے پیچھے ہٹتے اور پھر بھاگتے دیکھا۔وہ مکمل طور پر پسپا ہو رہے تھے لیکن بہت سے

موکھل ابھی تک مزار کے پچھلے احاطے میں موجود تھے اور انہیں بھاگنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔وہ لوگوں کے سیلابی ریلے کو خود سے دور رکھنے کے لیے بار بار گولی چلاتے رہے تھے۔۔۔۔تاہم اب ان کی فائرنگ جارحانہ نہیں دفاعی تھی۔۔۔۔یقیناً وہ بھی جانتے تھے کہ وہ بہت سارے لوگوں کو مار کر بھی زندہ نہیں رہ سکیں گے۔راجوال کے لوگوں نے اندھا دھند باہر نکل کر ان کے سارے اندازے غلط ثابت کر دیے تھے۔

"وہ دیکھو۔۔۔۔وہ بھاگ رہا ہے موکھل پاشا۔"

نصراللہ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے چلایا۔

میں نے بھی سیاہی مائل دھوئیں کے اندر سے دیکھ لیا۔

وہ پاشا ہی تھا۔تین چار گھڑ سوار اس کے ساتھ تھے۔وہ گوریکے کی طرف جا رہا تھا۔یہ شخص معصوم صورت والی ثمینہ کا قاتل تھا۔شہوار کے قتل میں بھی اسی کے مشورے شامل رہے تھے۔یہ چھوڑے جانے کے قابل نہیں تھا۔اس کی کم از کم سزا پھانسی کا پھندا ہونی چاہیے تھی۔میں برکت،شبیر اور دیگر تین چار ساتھیوں کے ہمراہ تیزی سے پاشا کے پیچھے گئے۔کھیتوں کے درمیان پھسلواں راستے پر ہم نے برق رفتاری سے پاشا اور اس کے

ساتھیوں کا پیچھا کیا۔ انہوں نے بھی ہمیں تعاقب کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ شارٹ کٹ استعمال کرنے لگے۔ ہم نے بھی ان کے پیچھے کھیتوں میں گھوڑے ڈال دیے۔ کچھ دیر پہلے تک جاری رہنے والی بارش کے سبب زمین اس گھڑدوڑ کے لیے مناسب نہیں تھی۔ تاہم پنجابی کی یہ مثال ہم پر صادق آرہی تھی کہ بھاگنے والوں کے لیے واہن (ہل چلے کھیت) ایک جیسے ہوتے ہیں۔

اگر ہماری رفتار کم تھی تو پاشا اور اس کے ساتھیوں کی بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ ہم آگے پیچھے بھاگتے راجوال سے قریباً چار میل آگے آگئے۔ ایک جگہ پاشا کا ایک ساتھی پھسلنے سے گر گیا۔ میرے دو ساتھیوں نے گھوڑے روک کر اسے چھاپ لیا۔ ہم نے پاشا کا تعاقب جاری رکھا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ پاشا کا رخ اپنے گاؤں گوریکے کی طرف نہیں ہے۔ پھر وہ کہاں جارہا تھا؟

اسی دوران میں شبیر نے بھی گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے یہی بات کہی۔ وہ بولا۔ "چودھری خاور! مجھے لگتا ہے کہ موکھل پاشا کہیں اور جارہا ہے۔"

"کیا اندازہ ہے؟"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"پتا نہیں جی۔"

اچانک مجھے اپنے جسم کا سارا خون سر کو چڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جوشِ تعاقب میں ہم ایک بڑی غلطی کر چکے ہیں۔ جونہی ہم چارے کے ایک کھیت میں سے باہر نکلے، مجھے اپنے عین سامنے دو تین گاڑیاں نظر آئیں۔ ان میں میرے سسر آصف جاہ کی جیپ صاف پہچانی جارہی تھی۔ ان جیپوں کے ارد گرد گھوڑے اور کارندے موجود تھے۔ پس منظر میں سلو کی ہاؤنڈ کتوں کی خونی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہی آٹھ عدد مہلک جانور جن کے پنجے اور جبڑے کسی بھی ذی روح کو سیکنڈوں میں ادھیڑ سکتے تھے۔

پاشا اور اس کے ساتھی تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ان گاڑیوں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ ہم نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں۔ یہ تذبذب کے لمحے تھے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہاں رکیں یا تیزی سے واپس ہو جائیں۔ اسی اثنا میں ہمارے سامنے آصف جاہ کے مسلح کارندے نمودار ہو گئے۔ ان کی تعداد درجنوں میں تھی۔ جب تک ہم پوری طرح سنبھل سکتے، کئی رائفلیں ہماری طرف اٹھ چکی تھیں۔

یہ ایک ڈرامائی موڑ آیا تھا۔یوں لگ رہا تھا کہ لمبڑ آصف جاہ اس کاروائی سے آگاہ تھا جو آج موکھلوں نے راجوال کے میلے میں کی تھی۔ عین ممکن تھا کہ آصف جاہ کے کچھ لوگ بھی اس کاروائی میں شریک ہوں۔خود آصف جاہ اور اس کے ساتھی یہاں کسی زمیندار کے ڈیرے پر موجود تھے۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے آصف جاہ کے کارندوں نے صورتِ حال کو پوری طرح سمجھ لیا تھا۔انہوں نے حرکت کی اور ہمارے قریب آ گئے۔اگر ہم اس موقع پر پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کرتے تو وہ یقیناً ہم پر فائر کھول دیتے اور ڈھیر کر دیتے۔پھر ہمیں آصف جاہ کی صورت نظر آئی۔اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ شراب کی حدت سے تمتما رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح بیڑی اس کی انگلیوں میں دبی تھی۔اس کے پیچھے دو مسلح محافظ تھے۔وہ بڑے اعتماد سے چلتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"تو آخر تم دوبارہ نظر آ ہی گئے؟"اس نے عجیب لہجے میں کہا۔

"آصف جاہ! پاشا ہمارا مجرم ہے۔اس کو ہمارے حوالے کر دو۔"میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اٹل لہجے میں کہا۔رائفل پر میری گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔آج میں ہر حد تک جانے کے لیے تیار تھا۔

آصف جاہ نے ایک بار پھر سنسنی خیز لہجے میں کہا۔"تم پاشے کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔"

"کیوں نہیں لگا سکتا؟"

"بس نہیں لگا سکتے۔"وہ بولا۔

تب میں نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔لمبڑ آصف جاہ کے دو تین صحت مند کارندوں نے پاشے کو بری طرح دبوچا ہوا تھا اور اسے کھینچتے ہوئے آصف جاہ کی طرف لا رہے تھے۔پاشا مزاحمت کر رہا تھا اور بلند آواز میں کچھ بول رہا تھا۔اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔کارندوں نے پاشے کو آصف جاہ کے سامنے لا کھڑا کیا۔"یہ کیا ہو رہا ہے آصف جاہ؟"اس کی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔

اس کے بعد کا منظر بھی حیران کن تھا۔ آصف جاہ کا بھرپور تھپڑ پاشے کے گال پر پڑا اور وہ کارندوں کی گرفت میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔

پاشے کے ساتھ یہاں پہنچنے والے گھڑ سواروں میں سے دو افراد نے اس بدلی ہوئی صورتِ حال میں ایک دم بھاگنے کی کوشش کی، تاہم آصف جاہ کے کارندوں نے ان کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ انہیں بھی پکڑ لیا گیا اور رائفل کے کنڈوں سے مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج آصف جاہ کی آنکھوں کے سامنے سے وہ پردہ ہٹ گیا ہے۔ شاید میری توقع کے مطابق، راجوال میں سنائی جانے والی کیسٹ کی گونج آصف جاہ کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔

آصف جاہ کی آواز نے مجھے چونکایا۔ وہ پاشے کا گریبان تھامے ہوئے بولا۔ "تم اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے ہو شاہ خاور! اسے میں ہاتھ لگاؤں گا۔۔۔۔ کیونکہ یہ میرا مجرم ہے ۔ شہوار کو مارنے کے مشورے میں یہ حرامزادہ بھی پوری طرح شامل تھا۔ میں سب جان گیا ہوں۔"

شہوار کا نام لیتے ہوئے آصف جاہ کے لہجے میں عجیب سا کرب سمٹ آیا تھا اور اس کے ساتھ اس کی آواز میں ایک جنونی کیفیت در آتی تھی۔ اس کا تعلق یقیناً اس بے پناہ وابستگی سے تھا جو وہ اپنی مرحومہ بیٹی سے رکھتا تھا۔ اس نے ابھی تک اپنی بیٹی کے بچپن کی چھوٹی چھوٹی اشیاء کو سینے سے لگا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک غیر معمولی کردار تھا۔

آصف جاہ نے اشارہ کیا اور اس کے آٹھ دس کارندوں نے پلک جھپکتے میں پاشے کو زمین پر گرا کر رسی سے باندھ دیا۔ یہ بڑی اچانک اور سنسنی خیز صورتِ حال تھی۔ "آصف جاہ! یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ تمہیں اس کا بہت برا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ تمہارے گاؤں میں لاشیں بچھ جائیں گی۔" پاشا دہاڑا۔

"جو کچھ بھی ہو گا پاشے۔۔۔۔ لیکن اب تم کچھ نہیں دیکھ سکو گے۔" آصف جاہ کی آواز میں قہر اور جنون تھا۔ "تمہیں آج، ابھی اور اسی جگہ اپنے سارے کالے کرتوتوں کی سزا بھگتنی پڑے گی۔"

"تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ تمہیں پتا نہیں تم کیا کر رہے ہو۔ تمہارے بڑھاپے کی مٹی پلید ہو جائے گی آصف! تم موت کو ترسو گے۔" پاشے نے پھر گرج کر کہا۔

آصف جاہ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔ کوئی آواز، کوئی منظر اس کے حسیات پر اثر نہیں کرتا تھا۔ وہ بس اپنے سرخ انگارہ چہرے کے ساتھ بیڑی کے طویل کش لیتا جا رہا تھا۔

پاشے نے جب دھمکیوں کو بے اثر دیکھا تو ایک دم اپنا لہجہ نرم کر لیا۔۔۔۔اس نے دوسرے انداز سے وار کرنے کی کوشش کی۔ وہ سمجھانے والے لہجے میں بولا۔ "آصف جاہ! اگر تمہارے دماغ میں چودھری عزیز والی کیسٹ ہے تو تم دھوکے میں آ رہے ہو۔ وہ جعلی کیسٹ ہے۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ چودھری عزیز کی آواز نہیں ہے۔ وہ سارا ان نوسر بازوں کا رچایا ہوا ڈراما ہے۔۔۔۔وہ ڈراما ہے آصف جاہ۔"

پاشے کی اس بات کا جواب ایک بھرپور ٹھوکر کی صورت میں تھا۔ آصف کی یہ ٹھوکر پاشے کے چہرے پر لگی اور وہ خون اگلنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ٹھوڑی اور گردن لہولہان ہو گئی۔ یہی وقت تھا جب آصف جاہ کے چار پانچ محافظ سلوکی ہاؤنڈ کتوں کی زنجیریں تھامے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان مصری کتوں کی دمیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں اپنے اندر "تاریک براعظم افریقا" کی ساری پُراسراریت اور ہلاکت آفرینی سمیٹے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہوئے تھیں۔ یہ بڑی خوفناک آنکھیں تھیں۔ انہیں دیکھ کر جسم میں جھرجھری جاگتی تھی۔ یقیناً ان آنکھوں کو دیکھ کر موکھل پاشا کا پتّا پانی ہو گیا۔۔۔۔مدھم دھوپ میں، میں نے دیکھا کہ پاشا کا رنگ بالکل ہلدی ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی اذیت ناک موت کو بالکل اپنے سامنے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اضطراری طور پر اٹھنے اور بھاگنے کی کوشش کی مگر اس کے ہاتھ پاؤں سن کی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ اور یہ رسی نہ بھی ہوتی تو بھی وہ پوری طرح کارندوں کے نرغے میں تھا۔ وہ بے بسی کی انتہا کو چھو گیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ ڈری ڈری آوازیں نکلیں۔ ہاں، یہی وہ بھوری سرد آنکھوں والا پاشا تھا جو بے رحمی اور سفاکی میں نام رکھتا تھا۔ اس نے ایک معمولی گناہ کی پاداش میں ایک پورے خاندان کو آتش بازی کے بارود سے اڑا دیا تھا۔ اس کے رائل بنگلہ ٹائیگر نے کئی بے گناہوں کے جسم ادھیڑے تھے اور ثمینہ جیسی کئی لڑکیاں اس کے پنجوں میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑائی تھیں اور رہائی کی بھیک مانگتی رہی تھیں۔۔۔۔آج وہ خود موت کے پنجے میں تھا اور پھڑپھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زندگی کس کو پیاری نہیں ہوتی؟ پاشا جیسے لوگوں کو بھی پیاری ہوتی ہے۔

میں تیزی سے آگے بڑھا۔ "نہیں آصف جاہ! آپ اس کے خون سے ہاتھ نہ رنگو۔ اسے قانون کے حوالے کرو۔ یہ پھانسی کے پھندے سے بچ نہیں سکے گا۔"

"تم پیچھے ہٹ جاؤ خاور۔" آصف جاہ دہاڑا۔ "تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا یا کرتا، آصف جاہ کا اشارہ پا کر اس کے کارندوں نے پاشے کو دھکیل کر چند قدم دور ایک چھوٹے سے گڑھے میں پھینک دیا۔ کتوں کے رکھوالوں نے منہ سے مخصوص آوازیں نکالیں اور کتوں کی زنجیریں کھول دیں۔ یہ سب پلک جھپکتے میں ہو گیا۔ خوں خوار کتے بجلی کی طرح گڑھے کی طرف لپکے۔ پاشے کی آخری آوازیں بڑی دردناک تھیں۔ آٹھ عدد کتوں نے ایک لمحے میں پاشے کے جسم کو ڈھانپ لیا۔ اس کے بعد کا منظر دیکھنا میرے بس میں نہیں رہا۔ میں نے اپنا رخ پھیر لیا۔ شاید میری طرح اور کئی افراد نے بھی یہی کیا ہو گا۔ بس ہمارے کانوں تک "مصروفِ کار" کتوں کی گھمبیر آوازیں ہی پہنچ رہی تھیں۔ لمبڑ آصف جاہ مستحکم قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے بوتل منہ سے لگا کر شراب کے چند بڑے گھونٹ لیے اور جنونی لہجے میں بولا۔ "ابھی میرا بدلہ پورا نہیں ہوا ہے خاور۔۔۔۔ ابھی نہیں ہوا ہے۔" اس کا گریبان شراب سے بھیگ رہا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اب کیا رہ گیا ہے؟"

"اب رہ گیا ہے چودھری عزیز اور اس کا گماشتہ جس نے شہوار کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔ اسے تڑپا تڑپا کر مارا۔"

"لیکن وہ دونوں تو قبر میں پہنچ چکے ہیں۔"

"گھبراتا کیوں ہے۔ انہیں قبر سے نکالوں گا اور ان کے ساتھ بھی یہی کروں گا جو اس بد بخت کے ساتھ کیا ہے۔"

آصف جاہ! یہ بہت زیادہ ہے؟"

"تم مجھے زیادہ یا کم بتانے والے کون ہوتے ہیں؟ تم تو خود مجرم ہو۔۔۔۔ ہاں، تم بھی مجرم ہو۔ تم اس کے شوہر تھے۔ وہ ہر طرح سے تمہاری ذمہ داری تھی۔ میں نے اسے تمہارے حوالے کیا تھا، تم اس کی حفاظت میں ناکام رہے۔ وہ اپنے بابل کے گھر سے دور ایک آن جان چار دیواری میں ایک درندے کے ہاتھوں جان ہار گئی اور تم بے خبر پڑے رہے۔ کسی وقت تو جی میں آتا ہے کہ تمہیں بھی گولی مار دوں۔" اس نے وحشت کے عالم میں رائفل میری طرف سیدھی کر لی۔ یہ دونال امپورٹڈ رائفل تھی۔

میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔۔۔۔اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔"آصف جاہ! اگر وہ تمہاری بیٹی تھی تو میری بیوی بھی تھی۔۔۔۔مجھے بھی اس کی موت کا دکھ ہے۔۔۔۔گہرا دکھ ہے۔"وہ پھنکارا۔"یہ سکہ بند دامادوں والی وہی رٹی رٹائی بات ہے جو داماد ایسے موقعوں پر کرتے ہیں۔اگر تم اسے بیوی سمجھتے اور تمہاری ماں اسے بہو اور تمہاری بہن اسے بہن سمجھتی تو وہ اس طرح بے آسرا ہو کر اپنی زندگی نہیں ہارتی۔"

"تو ٹھیک ہے۔اگر تم واقعی مجھے قصور وار سمجھتے ہو تو پھر مار دو گولی۔اگر شہوار کی روح اس طرح خوش ہو سکتی ہے تو اسے خوش کرلو۔"میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔میرے دل میں سچائی تھی۔شہوار کا شوہر بننے کے بعد میں نے اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی تھی۔اس کی بہت سی تلخیاں بھی برداشت کی تھیں۔میرا دل مطمئن تھا اور گواہی دے رہا تھا کہ بے حد جذباتی ہونے کے باوجود آصف جاہ اب مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔۔۔۔اور اس نے نہیں پہنچایا۔اس کی رائفل کئی سیکنڈ تک میری طرف اٹھی رہی۔اس کی آنکھیں شعلہ فشاں بنی رہیں مگر اس نے فائر نہیں کیا۔

اس نے ہوا میں کئی گولیاں چلائیں اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔وہ گرجا۔"جاؤ۔۔۔۔میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے وہ یاد آتی ہے۔جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے۔ابھی تمہیں کچھ نہیں کہہ رہا۔۔۔۔پر چھوڑوں گا تمہیں بھی نہیں۔نہیں چھوڑوں گا۔"

پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ تیزی سے مڑا اور گاڑیوں کی طرف چلا گیا۔اس کے پاؤں سے جیسے اب بھی بگولے بندھے ہوئے تھے۔

کتوں کے رکھوالے اب انہیں سنبھال رہے تھے۔ان کی گردنوں میں زنجیریں ڈال رہے تھے۔کتوں کی پتلی پتلی تھوتھنیاں پاشے کے خوں سے سرخ تھیں۔میں گڑھے کے دل دوز منظر سے نگاہ بچانا چاہ رہا تھا، پھر بھی میری اچٹتی ہوئی سی نظر پڑ ہی گئی۔گڑھے میں خون اور انسانی گوشت کے لوتھڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔۔۔۔ایک لوتھڑے پر گھنے بال تھے۔یہ شاید پاشے کے پُر غرور سر کی کھال تھی۔

دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میں تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس راجوال پہنچا۔ یہاں کچھ اور ہی منظر تھا۔ ہزاروں لوگ راجوال کی گلیوں میں جمع تھے۔ انہوں نے مزار کو بھی گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ لڑائی میں موکھلوں کے قریباً ساٹھ بندے پکڑے گئے تھے۔ ان سب کو مزار کے بیرونی جنگلے کے ساتھ ساتھ رسیوں اور کپڑوں سے باندھا گیا تھا۔ ہر خاص و عام نے جوتوں اور ڈنڈوں سے ان کی تواضع کی تھی اور یہ تواضع اب بھی جاری تھی۔ جاگیر کے لوگ اس توہین کا خاطر خواہ بدلہ لے رہے تھے جو کچھ دن پہلے ان پر مسلط کی گئی تھی۔

دو برادریوں میں ہونے والی اس شدید لڑائی میں مرنے والوں کی تعداد اڑتالیس کے قریب تھی۔ سو کے قریب زخمی ہوئے تھے۔ لاشوں کو چارپائیوں پر دو قطاروں کی صورت میں رکھ دیا گیا تھا اور ان پر چادریں وغیرہ ڈال دی گئی تھیں۔ بیشتر مکانوں کی آگ اب بجھ چکی تھی۔ کچھ ادھ جلے گھروں پر لوگ اب بھی پانی وغیرہ پھینک رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک چارپائی کو مزار کے احاطے میں رکھا گیا تھا اور اس کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔۔۔۔ مجھے دیکھ کر نصراللہ تیزی سے میرے قریب آیا۔ اس کے چہرے پر فتح مندی

کی چمک اور پیشانی پر لہو کے چھینٹے تھے۔ میں نے چارپائی کی طرف اشارا کرتے ہوئے پوچھا۔ "وہاں کیا ہے؟"

وہ جذباتی انداز میں بولا۔ "چاچے عسکری کی میت!"

میں تیزی سے احاطے میں داخل ہوا اور۔ بوڑھا شیر چارپائی پر ساکت پڑا تھا۔ اس کی کمزور گردن اور استخوانی کندھوں پر کلہاڑی اور برچھی کے کئی وار تھے۔ اس کی سالار والی سرخ پگڑی اس کے سینے پر پھیلا دی گئی تھی۔ وہ خود تو زیادہ نہیں لڑ سکا ہو گا مگر وہ دوسروں کو لڑنے کا حوصلہ دے گیا تھا، وہ بیش بہا تھا۔

لوگوں نے مجھے دیکھا تو میرے گرد اکھٹے ہو گئے۔ پھر ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ وہ فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ ان نعروں میں میری ستائش تھی۔ موکھلوں کے لیے نفرت تھی اور ان سے انتقام کا مطالبہ تھا۔

لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر مجھے رونق علی نظر آیا۔ وہ مجمع چیرتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے کوئی بدمست ہاتھی گنے کی فصل روندتا ہوا آ رہا ہو۔ اس کے چہرے پر بلا کی چمک تھی۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کے انداز میں بے پناہ گرم جوشی تھی۔

"خاور! ہم کامیاب ہو گئے۔" وہ جذباتی انداز میں بولا اور مجھے جھنجوڑ دیا۔

"تم ٹھیک ہو نا؟" میں نے اسے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

"تم ٹھیک ہو تو میں بھی ٹھیک شیک ہوں۔"

لوگوں کے شور میں کان پڑتی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے بلند آہنگ میں پوچھا۔ "جن عورتوں کو موکھلوں نے پکڑا تھا، ان کا کیا بنا؟"

"وہ زیادہ نہیں تھیں۔ بس تین تھیں۔ انہیں حاجی فیروز کے گھر کے پاس ہی ایک کمرے میں بند کیا گیا تھا۔ انہیں چھڑا لیا ہے لوگوں نے۔"

لوگوں کے نعرے فلک شگاف ہوتے جا رہے تھے۔ وہ موکھل پاشا کو گالیاں دے رہے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ اسے پکڑنے اور جان سے مارنے کے لیے ابھی اور اسی وقت موکھلوں کے پنڈ پر ہلا بول دیا جائے۔

میں لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا اس چبوترے پر چڑھ گیا جو حویلی کے عین سامنے واقع تھا۔ میں نے کبھی تقریر نہیں کی تھی۔ نہ ہی تقریر کا ڈھنگ آتا تھا۔ میں نے

ہاتھوں کے اشارے سے لوگوں کو خاموش ہونے کا اشارا کیا اور جب بار بار درخواست کے بعد وہ خاموش ہوئے تو میں کہا۔ "میرے ساتھیوں! ہم نے جوش کے وقت جوش دکھایا ہے اور ہمیں دکھانا بھی چاہیے تھا لیکن اب ہوش کا وقت ہے۔ جو غلطی موکھلوں نے کی وہ ہمیں نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں فی الحال یہاں سے نکلنے اور ان کے گھر میں گھسنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور جہاں تک موکھل پاشا کی بات ہے تو آپ سب کے لیے میرے پاس ایک اچھی خبر ہے۔۔۔۔"

ہجوم میں چہ میگوئیاں ابھریں اور سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ "قدرت نے ہماری مدد کی ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا ہے۔ قلعہ والا کے لمبڑ آصف جاہ کو بھی پتا چل گیا ہے کہ اس کی بے گناہ بیٹی کے قاتل کون ہیں۔۔۔۔ آپ سب کو سن کر بڑی حیرانی ہو گی کہ موکھل پاشا اپنے برے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مارا گیا ہے۔"

ہجوم میں شور ابھرا۔ یہ خبر سب کے لیے حیرت ناک تھی کسی نے پکار کر کہا۔ "کہاں مرا۔۔۔۔ کس نے مارا ہے؟"

"اس کی لاش یہاں سے چار پانچ میل دور رکھ پور کے ایک زمیندار کے ڈیرے پر پڑی ہے۔ میں خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا ہوں۔"

مجھے ہجوم کے چہرے تمتماتے ہوئے نظر آئے۔ شاید یہ وہی تمتماہٹ تھی جو خوں خوار بنگالی ٹائیگر کی موت کے وقت نظر آئی تھی۔

کسی نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔ "کس نے مارا ہے اسے ؟"

میں نے جان بوجھ کر آصف جاہ کا نام وضاحت سے نہیں لیا۔ میں نے کہا۔ "وہ بھاگ رہا تھا۔ لمبڑوں نے اپنے کتے اس کے پیچھے لگا دیے۔ انہوں نے چیڑ پھاڑ دیا۔ ٹوٹے کر دیا۔"

اس خبر نے لوگوں میں جوش بھر دیا۔ انہوں نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو ابھی اور اسی وقت پاشے کی مسخ لاش دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ زوردار نعرے لگانے لگے۔"

راجوال کا میلہ بری طرح اجڑ گیا تھا مگر جب دل میں خوشی ہو تو اجڑے ہوئے میلے بھی اداس نہیں کرتے اور لوگوں کے دلوں میں خوشی تھی۔ ارد گرد موجود لاشوں اور زخمیوں کے باوجود خوشی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میرا جسم زخموں سے چُور تھا۔ اب تک تو حالات کی سنگینی مجھے بھگاتی پھر رہی تھی اور میں اپنی جسمانی حالت سے غافل تھا۔ مگر اب، جب سوچنے اور محسوس کرنے کی مہلت ملی تھی، میرے سارے درد ابھر کر سامنے آگئے تھے۔

نصراللہ اور چودھری یعقوب وغیرہ کو ضروری ہدایات دینے کے بعد جب میں حویلی کے مہمان خانے میں پہنچا تو والدہ اور عارفہ میری حالت دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ خاص طور سے والدہ کی حالت تو غیر ہوگئی۔ وہاں ایک آئینے میں، میں نے دیکھا تو خود مجھے بھی اپنی حالت پر یقین نہیں آیا۔ قلعہ والا میں لمبڑ آصف جاہ کے بہیمانہ سلوک نے میرا حلیہ بگاڑ رکھا تھا۔ چہرے پر نیل اور غیر معمولی ورم تھا۔ پورے جسم پر کوڑوں کی مار کے نشانات تھے اور ان میں سے کچھ نشان ابھی تک انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ میرے پاؤں نہایت گرم پانی سے جلا دیے گئے تھے۔ ان پاؤں کے آبلے بھاگ دوڑ میں پھوٹ چکے تھے اور خون رس رہا تھا۔ ران کا پرانا زخم بھی تازہ ہو گیا تھا اور قبرستان کے قریب جنگلی سور کی خوفناک ٹکر سے لگنے والی چوٹ بھی اپنی موجودگی کا پتا دیتی تھی۔

مجھے یقین نہیں آیا کہ میں پچھلے اڑتالیس گھنٹے میں اسی جسمانی حالت کے ساتھ ساری بھاگ دوڑ کرتا رہا ہوں۔ بے بے جی میرے زخموں پر مرہم لگاتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔ "اللہ کرے کچھ نہ رہے ان ظالموں کا۔ میرے پتر کو خوناں خوں کر دیا ہے۔ کوئی اس طرح تو ڈور ڈنگروں کو بھی نہیں مارتا۔"

عارفہ سسک کر بولی۔ "آپ اسپتال چلے جاؤ بھاجی! وہاں زیادہ اچھا علاج ہو جائے گا۔"

میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "بے بے جی کے ہاتھ سے زیادہ میرے لیے کسی ہاتھ میں شفا نہیں ہے۔ یہ تو مجھے خالی مٹی بھی لگاتی رہیں تو میں دو چار دن میں بھلا چنگا ہو جاؤں گا۔"

بے بے جی اور عارفہ نے رات تک میرے لیے بہت کچھ کیا۔ گرم وٹے اور نمک ٹکور کی، ہلدی ملا گرم دودھ پلایا۔۔۔۔ مولوی بشارت کا دیا ہوا مرہم لگایا اور ساتھ ساتھ بے بے جی نے بہت سی سورتیں بھی پڑھ کر پھونکیں۔

ابھی تک بلقیس کی صورت نظر آئی تھی۔ تاہم مجھے امید تھی کہ وہ بہت جلد یہاں کا چکر لگائے گی۔

فی الوقت میرے ذہن میں دو پریشانیاں زیادہ ہلچل مچا رہی تھیں۔ میرے نگاہوں کے سامنے رہ رہ کر قلعہ والا کے اس عقوبت خانے کے مناظر گھوم رہے تھے جہاں سے میں نکل کر آیا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے وہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کے ساتھ دیکھا ہے۔

زنجیروں میں بندھے ہوئے وہ افراد جو جانوروں جیسی زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں جانوروں کے طویلے میں ہی رکھا گیا تھا اور ان کو بدترین اذیت دی جا رہی تھی۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ شومئیِ قسمت آصف جاہ کی وحشت کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ آصف جاہ کے جنون نے ان لوگوں کو صرف "داماد" کے روپ میں دیکھا تھا۔ اب یہ افراد نہ صرف خود غیر معمولی تکلیف کا شکار تھے بلکہ ان کی رشتے دار خواتین کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ لمبڑ آصف کے نزدیک یہ خواتین صرف خواتین نہیں تھیں، یہ نندیں اور ساسیں وغیرہ تھیں۔ عجب دیوانہ پن تھا۔ اور طویلے میں بند باؤ ارشد جیسے لوگوں کا کہنا تھا کہ اس دیوانے

پن کی اصل وجہ میں ہوں۔ یہ میں ہی ہوں جو آصف جاہ کی لاڈلی بیٹی کو اپنے گھر میں خوش نہ رکھ سکا اور آصف جاہ کے سینے میں پلتی ہوئی وحشت پھیلی چلی گئی۔

مجھے دوسری فکر موکھل پاشا کی طرف سے تھی۔ وہ مر گیا تھا لیکن اس کے پاس اماں دلشاد کی بیٹی شاداں کی نازیبا تصویریں موجود تھیں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ پاشا کی موت کے بعد وہ تصویریں کہاں ہوں گی؟ اور محفوظ بھی رہ سکیں گی یا نہیں۔ پاشا کی موت سے لرزہ خیز مناظر بھی بار بار میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

رات تقریباً دس بجے کا وقت ہو گا۔ میں ہلکی غنودگی میں تھا۔ دروازے کی مدھم آواز سنائی دی۔ یہ وہی آواز تھی جو برسوں سے براہِ راست میرے دل کے تاروں کو چھیڑتی تھی۔ بلقیس، میری بہن عارفہ سے کہہ رہی تھی۔ "اچھا۔۔۔۔ میں پھر آ جاؤں گی۔"

"نہیں آپا۔۔۔ وہ ویسے ہی لیٹے ہوئے ہیں۔ تم جاؤ گی تو جاگ جائیں گے۔"

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلنے کی مدھم آواز آئی اور بلقیس اندر آ گئی۔ میں نے آنکھوں کی باریک جھری میں سے دیکھا، وہ مخمل کے چمکیلی تاروں والے لباس میں تھی۔ گرم شال کے ہالے میں چہرے کی چاندنی جھلک دکھاتی تھی۔

میں نے خود کو سویا ہوا ظاہر کیا اور چت لیٹا رہا۔ وہ میرے قریب آ کر تذبذب میں کھڑی رہی۔ پھر جیسے اس نے مجھے جگانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

میرے چہرے اور گردن کی چوٹیں دیکھ کر اس کے چہرے پر حزن و ملال کی عجیب سی زردی پھیل گئی۔ آنکھوں میں شاید نمی تھی۔ میں اپنی آنکھوں کی جھری سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ رات کا گہرا سناٹا تھا اور گیس لیمپ کی ہلکی سی روشنی تھی۔ اس نے ارد گرد دیکھا پھر اس کا دودھیا ہاتھ میرے سر کے بالوں کی طرف بڑھا۔ یوں لگا جیسے وہ اشک بار انداز میں میرے سر کے بالوں کو چھونا چاہتی ہے۔ لیکن ہاتھ میرے بالوں کے بالکل قریب پہنچ کر واپس چلا گیا۔

وہ واپس جانے کے لیے مڑی تو میں نے آواز دے کر روک لیا۔ "بلقیس!"

وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اپنی شال درست کرتے ہوئے بولی۔۔۔۔ "میں سمجھی تم سو رہے ہو۔"

"نہیں، بس غنودگی سی ہو رہی تھی۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔"

وہ رنگین پایوں والی نواڑی کرسی پر بیٹھ گئی اور منہ پھیر کر آنسو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

"کیا ہوا بلقیس؟"

"تم اتنی بری حالت میں بھی، ہمیں کمرے میں بند کر کے موکھلوں سے لڑنے چلے گئے۔ کچھ خیال نہیں آیا۔ کہ ہم پر کیا گزرے گی؟"

"لیکن میں نہیں جاتا تو پھر جو کچھ ہونا تھا وہ بھی تمہارے سامنے تھا بلقیس۔"

"پر اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو؟"

"تو کیا؟ زندگی موت کا ساتھ تو ہمیشہ سے ہے۔ کسی کے مرنے سے دنیا کے کام رکتے تو نہیں۔ حیاتی کی گاڑی ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔"

"تمہیں نہیں پتا تم ہم سب کے لیے کتنے قیمتی ہو۔ اس جاگیر کے بچے بچے کو تمہاری ضرورت ہے۔"

"میں تو بیکار پتھر تھا بلقیس۔۔۔۔اب اگر میری تھوڑی بہت قیمت ہے تو وہ کسی کی نظر کی وجہ سے ہے۔ بس وہ اگر مجھے قیمتی سمجھتی رہے، مجھے کسی دوسرے کی کوئی پروا نہیں۔"

"چودھری عزیز والی کیسٹ تمہارے ہاتھ کیسے لگی؟" وہ موضوع بدل کر بولی۔

میں نے بلقیس کے اس سوال کا جواب پوری تفصیل اور سیاق وسباق کے ساتھ دیا۔ میں نے اس منحوس رات کے بارے میں بھی سب کچھ بتایا جب شہوار زخم زخم ہو کر موت کی آغوش میں پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسے اپنی اور شہوار کی لڑائی اور پھر صلح کے بارے میں بتایا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ثمینہ کو مجھ پر قاتل ہونے کا شبہ کیونکر ہوا۔ کس طرح اس نے مجھے شہوار کے ہاتھ سے خنجر چھینتے دیکھا اور یہ سمجھ بیٹھی کہ میں اس کو مارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بعد میں انوارے اور اس کی شوخ بیوی کے ذریعے اصل مجرم چودھری عزیز تک پہنچنے کا ماجرا بھی میں نے بلقیس کے گوش گزار کیا۔

وہ سب کچھ توجہ سے سنتی رہی۔ اس دوران میں ایک بار عارفہ اندر آئی اور ہمارے سامنے چائے کی پیالیاں رکھ کر چلی گئی۔ باتوں کے دوران میں، میں نے اچانک گہری نظروں

سے بلقیس کو دیکھا۔وہ میرے اس طرح دیکھنے پر چونک گئی۔اس کے چہرے پر بڑی پیاری سی حیرت نمودار ہوئی۔"کیا بات ہے؟"اس نے پوچھا۔

"مجھے ایک بات بالکل سچ سچ بتاؤ بلقیس۔۔۔۔۔بتاؤ گی نا۔۔۔۔؟"

"ہوں۔"اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"میں کئی دنوں سے سخت الجھن میں ہوں۔چودھری عزیز کے بارے میں باقی تو سب کچھ صاف ہو گیا ہے۔وہ کبھی میرا اسجن تھا ہی نہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ مجھے مارنے یا پکڑوانے کے بجائے، بھگانے میں کیوں دلچسپی رکھتا تھا؟اس کے علاوہ اس نے بے بے جی اور عارفہ کو میاں وارث اور آصف جاہ سے بچانے میں بھی تمہارا پورا ساتھ دیا۔"

بلقیس کچھ دیر تک خاموش رہی۔لگتا تھا کہ وہ تذبذب کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔پھر اس نے ایک لمبی سانس لی۔ایسا کرتے ہوئے اس کی شفاف گردن میں سامنے کی طرف گڑھا سا پڑ گیا۔وہ ہولے سے بولی۔"۔۔۔۔یہ سب کچھ طے تھا خاور!"

"میں سمجھا نہیں۔"

"بس وہی کچھ لینے اور دینے والا معاملہ۔۔۔۔بھائیا عزیز اپنی وہ ساڑھے تیرہ مربعے زمین مجھ سے واپس چاہتا تھا جو تم نے میرے نام کرا رکھی ہے۔دوسری طرف میں تمہاری اور ماں جی وغیرہ کی حفاظت چاہتی تھی۔میں جانتی تھی خاور۔۔۔۔بھائیا عزیز کی مدد کے بغیر یہ سب کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔شہوار کے مرنے کے بعد جب تم اور تیمور روپوش ہوئے تو سب کچھ ہی بھائیا جی کے ہاتھ میں آ گیا۔وہ ان دنوں میں ایک طرح سے سیاہ اور سفید کا مالک بن گیا تھا بلکہ اس سے پہلے بھی بہت کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔اس نے مجھے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ جب چاہے تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا ہے اور جب چاہے آصف جاہ کے ہاتھوں ماں جی اور عارفہ کی زندگی ختم ہو سکتی۔اور وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔اس نے جوڑ توڑ کر کے بڑا زور پیدا کر لیا تھا۔"

"پھر تم نے کیا کیا بلقیس؟"

"میں نے عزیز سے طے کر لیا کہ وہ تمہیں حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکلنے میں مدد دے گا۔اس کے علاوہ وہ ماں جی اور عارفہ پر بھی کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔حالات بہتر ہوتے ہی وہ ان دونوں کو تمہارے بڑے بھائی کے پاس کویت بھجوا دے گا۔جب تم خیر

خیریت کے ساتھ یہاں سے چلے جاؤ گے اور ماں جی اور عارفہ کویت پہنچ جائیں گی تو میں وہ ساڑھے تیرہ مربعے زمین واپس اس کے نام لکھ دوں گی۔"

"تم نے اسے کچھ لکھ کر تو نہیں دیا تھا؟"

"نہیں، اسے میری زبان پر بھروسا تھا۔ ویسے بھی اسے پتا تھا کہ سب کچھ اس کے ہاتھوں میں ہے، میں اپنی بات سے مکرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔۔۔۔"

میری نگاہیں بلقیس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ گیس لیمپ کی روشنی اس کے آدھے چہرے کو روشن کر رہی تھی۔ آدھا چہرہ تاریکی میں تھا۔ عجیب اندھیرے اجالے کا منظر تھا۔ پتا نہیں مجھے لگ رہا تھا کہ بلقیس اب بھی مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے۔ کوئی ادھوری بات ہے جو اس لبوں تک نہیں آئی۔۔۔۔ لیکن وہ بات موجود ہے، کافی عرصے سے موجود ہے۔

میں نے کہا۔ "بلقیس! میری طرف دیکھو۔"

اس نے دیکھا۔ آنکھوں میں نمی تھی، نگاہیں ایک لمحے کے لیے مجھ سے ٹکرا کر جھک گئیں۔ نہ جانے کیوں چہرے پر رنگ سا لہرایا۔

میرے دل و دماغ میں کافی عرصے سے ایک شبہ موجود تھا۔ شاید ڈیڑھ دو سال سے۔۔۔۔ لیکن آج اس سرد رات میں، گیس لیمپ کی روشنی میں ان پھول دار پردوں والے کمرے میں بلقیس سے باتیں کرتے ہوئے یہ شبہ ایک دم نمایاں تر ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر بلقیس کو دیکھا۔ اس کا چہرہ میرے لیے شیشے کی طرح تھا اور کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ میں اس کے آر پار دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے کہا۔ "بلقیس! سچ بتانا۔ کیا اتنی ہی بات تھی یا اس کے علاوہ بھی کچھ تھی؟"

"کیا مطلب؟" اس کے ہونٹوں کی پنکھڑیاں لرزیں۔

"بلقیس! تم نے وعدہ کیا تھا کہ کچھ چھپاؤ گی نہیں۔۔۔۔ کیا چودھری عزیز اس کے علاوہ بھی کچھ چاہتا تھا؟"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ ایک دم روہانسی ہو گئی۔

"لیکن مجھے پتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور مجھے یہ بھی اچھی طرح پتا ہے کہ چودھری عزیز کے بارے میں تمہارے خیالات کیا تھے۔ تمہارے بس میں ہوتا تو تم اس کی صورت دیکھنا گوارہ نہیں کرتیں، اس کی آواز سننا بھی پسند نہیں کرتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک ہی

حویلی میں رہنا تمہاری اور والی جی کی مجبوری تھی۔ وہ جاگیر کے ایک بڑے حصے کا مالک تھا۔ میں سب جانتا ہوں بلقیس! میں صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا چودھری عزیز تم سے اپنی زمینوں کی واپسی کے علاوہ بھی کچھ چاہتا تھا؟"

بلقیس میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت پیشانی پر کرب کی سلوٹیں تھیں۔ پھر دو تین آنسو اس کی آنکھوں سے جھڑے اور گود میں رکھے ہاتھوں پر گر گئے۔ اس نے ایک چھوٹی سی آہ بھر کر اثبات میں سر ہلایا۔ "تم ٹھیک سمجھ رہے ہو خاور!"

"تمہارا جواب آدھا ہے۔"

"ہاں خاور۔۔۔۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"اور تم نے اقرار کر لیا؟"

بلقیس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ ایک آنسو اس کے خوبصورت کوکے میں چند منٹ کے لیے اٹکا پھر گود میں گر گیا۔ میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ بلقیس کی خاموشی ہی اس کا اقرار تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تم نے ایسا کیوں کیا بلقیس؟"

"میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔" وہ سسکی۔ "اگر میں ایسا نہ کرتی تو وہ شاید اسی دن تمہیں مروا دیتا جب تم ہمیں کیکراں والی کے راستے میں ملے تھے۔ وہ ہم پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا خاور!"

"اس کا مطلب ہے کہ اگر میں کچھ عرصے کے لیے قبائلی علاقے میں نکل جاتا اور عزیز کے ساتھ بھی وہ سب کچھ نہیں ہوتا جو ہوا تو تم اس کے نکاح میں چلی جاتیں۔ اس شرابی بھینسے کی بیوی بن جاتیں؟"

وہ عجب رسان سے بولی۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، میں تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ کر سکتی ہوں۔۔۔۔ سب کچھ کر سکتی ہوں۔

"لیکن۔۔۔۔ لیکن میری محبت اور چاہت کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو۔ میرے پیار کی جھولی میں ڈالنے کے لیے تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے بڑے کرب سے کہا۔

وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔"یہ اور بات ہے۔۔۔۔۔میں اس کا جواب تمہیں دے چکی ہوں خاور! کچھ بھی ہے، میں ایک کمزور عورت ہوں۔ میں اس راہ پر نہیں چل سکتی جو میرے خاندان اور میری برادری سے ٹکراتا ہو۔"

"شاید تمہارا یہ سچ بھی پورا سچ نہیں ہے۔ شاید تم کچھ چاہتی ہی نہیں ہو۔ تم بس۔۔۔۔۔تم بس یہ چاہتی ہو کہ کوئی ساری عمر تمہارے لیے تڑپتا رہے۔ تمہاری یادوں کو سینے سے لگا کر روتا سسکتا رہے۔ اپنی زندگی کی آخری سانس تک تمہاری راہ دیکھتا رہے اور تمہیں سکون رہے کہ۔۔۔۔۔ہاں کوئی ہے جو تمہارے لیے آنسو بہاتا ہے، تمہاری راہ دیکھتا ہے۔۔۔۔۔شاید تمہارے نزدیک اسی کا نام محبت ہے۔"

"مجھے غلط مت سمجھو خاور! میری مجبوریوں کو سمجھو۔ میں زمانے سے ٹکرا نہیں سکتی۔ جگ ہنسائیاں نہیں سہہ سکتی۔"

"تو پھر وہ سب کیا تھا جو تم نے کئی سال پہلے شروع کیا تھا۔۔۔۔۔کیوں میرے دل میں امیدوں کا بیج ڈالا؟ کیوں خوشیوں کی آس دلائی؟"

"وہ ہماری غلطی تھی خاور۔۔۔۔۔بلکہ۔۔۔۔۔میری غلطی تھی۔ میں اس کے لیے تم سے ہزار بار معافی مانگتی ہوں۔ اس کے لیے تم مجھے مرنے کی سزا بھی دو تو وہ بھی قبول ہے۔" آنسو اب تواتر سے اس کے رخساروں سے بہہ رہے تھے۔

"لیکن بلقیس! سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ سزا ہی تمہارا یا میرا مقدر کیوں ہے؟ کیا اب تک جو میں کاٹ رہا ہوں وہ سزا نہیں ہے؟ تم سے دن رات محبت کی ہے اور تم سے دور رہا ہوں۔ اپنے من کو مارنے کی ہزار کوششیں کی ہیں، اپنی سوچوں کو بدلنے کے لیے بے شمار جتن کیے ہیں لیکن جو کچھ میرے بس میں نہیں ہے، اس کا کیا کروں؟ اوپر والے سے ہزاروں لاکھوں بار تمہیں مانگا ہے اور یہ بھی مانگا ہے کہ اگر تم مقدر میں نہیں ہو تو پھر میرے دل کو سکون ہی مل جائے لیکن کچھ نہیں ہوتا۔۔۔۔۔کوئی راستہ نہیں نکلتا۔"

میرا لہجہ بوجھل تر ہو گیا اور آواز بھرا گئی۔ اس نے جلدی سے میری طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ وہ میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنا چاہتی ہے۔ مجھے چھو کر مجھے تسلی دینا چاہتی ہے لیکن پھر ایسا کرتے کرتے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹ گیا۔ شاید اب وہ مجھے چھونا بھی گناہ سمجھتی تھی۔ شال اس کے سر پر تھی اور وہ لپٹی لپٹائی بیٹھی تھی۔۔۔۔۔اور وہ کوکا جو کبھی

میرے ہونٹوں سے مس ہوتا تھا، میرے گالوں پر چبھتا تھا، مجھ سے ہزاروں لاکھوں سال کی مسافت پر تھا۔

میں نے اسی جذباتی لہجے میں کہا۔ "مجھے بس ایک بات بتادو بلقیس! اگر تمہاری شادی عزیز سے ہوسکتی تھی تو مجھ سے کیوں نہیں؟"

"اسے شادی کیوں کہتے ہو خاور! وہ تو، ایک جان کو عذاب دینے والا سمجھوتا ہوناتھا۔ لیکن جو کچھ بھی تھا، اس سمجھوتے کے راستے میں ذات برادری نہیں تھی۔۔۔۔اور خاور۔۔۔۔ذات برادری کی طاقت کو شاید تم مجھ سے زیادہ سمجھتے ہو۔ میرے جیسی عورت اس طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔۔۔۔ہاں مر سکتی ہے۔" بلقیس کے لہجے کا کرب دل کو کاٹ دینے والا تھا۔

اچانک بے بے جی کی چپل کی آواز آئی۔ بلقیس ٹھٹک کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ "اچھا، میں چلتی ہوں۔ تم آرام کرو۔"

آرام۔۔۔۔کا لفظ اس کے جانے کے بعد بھی بڑی دیر تک میرے کانوں میں گونجتا رہا اور سماعت میں اذیت دیتا رہا۔

۔۔۔۔تیسرے روز سہ پہر کے وقت مجھے ایک ایسی صورت حویلی کے مہمان خانے میں نظر آئی جس کے نظر آنے کی مجھے ہرگز امید نہیں تھی۔ اس صورت کے نظر آنے سے ایک بہت بڑا بوجھ میرے ذہن سے اتر گیا۔ یہ موکھل پاشا کی سوتیلی بہن مکھاں کی صورت تھی۔ مکھاں کو آج میں نے کئی برسوں بعد دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہوگئی تھی اور زیادہ کڑیل نظر آتی تھی۔ مکھاں سے میری آخری ملاقات بے حد سنگین ماحول میں ہوئی تھی۔ اس واقعے کی تلخ یادیں ابھی تک میرے ذہن میں موجود تھیں۔ جب موکھل پاشا نے، بہت کوشش کے باوجود شاداں کی عریاں تصویریں واپس کرنے سے انکار کر دیا تھا اور شاداں کی چھوٹی بہن ثمینہ کو بلیک میل کرنا جاری رکھا تھا تو مجھے اور تیمور کو راست اقدام کرنا پڑا تھا۔ اس اندھیری رات میں ہم مکھاں کے گھر میں گھسے تھے اور جوابی کاروائی کے طور پر اس کی عریاں تصویریں اتار لی تھیں۔ یہ جوابی کاروائی غلط۔۔۔۔یا صحیح تھی مگر اس سے یہ ضرور ہوا تھا کہ پاشا کی بلیک میلنگ مکمل رک گئی تھی۔

اور آج پاشا کی موت کے بعد اس کی سوتیلی بہن مکھاں ایک چادر میں لپٹی لپٹائی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ چادر میں سے بس اس کی آنکھیں اور پیشانی ہی دکھائی دے رہی تھیں۔

اس کے میرے پاس آنے سے پہلے ملازمہ تاجو نے اچھی طرح اس کی تلاشی لے لی تھی، ایسا حفاظت کی غرض سے کیا گیا تھا کیونکہ کچھ بھی تھا، مکھاں حویلی کے ایک ایسے دشمن کی بہن تھی جو صرف دو دن پہلے اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچا تھا۔

میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ میرے سامنے نواڑی کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مجھے وہ دبنگ عورت ایک دم بدلی ہوئی نظر آئی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں بالی۔ "میں کوئی پچھلی بات دہرانا نہیں چاہتی، نہ ہی کوئی لمبی چوڑی گل کرنا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں تب جو کچھ بھی ہوا، اس میں زیادہ قصور میرے ہی بھائی کا تھا۔ گروہ تمہارے پنڈ کی کڑی کے ساتھ برا سلوک نہیں کرتا تو شاید میرے ساتھ بھی ایسا نہ ہوتا۔ جو کچھ بھی ہے، اب وہ سب پرانی باتیں ہیں۔ میں اب تین بچوں کی ماں ہوں۔ اپنے دوسرے خاوند کے ساتھ میری بڑی اچھی گزر رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی کبھی کسی وقت ان تصویروں کی وجہ سے میری زندگی میں کوئی طوفان آجائے۔" اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"تو اب تم کیا چاہتی ہو مکھاں؟"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میں اپنی تصویریں تم سے واپس چاہتی ہوں اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کہ ان تصویروں کی وجہ سے میری زندگی میں کبھی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔"

"پر تمہیں میری شرط کا تو پتا ہو گا، یہی شرط میں نے تمہارے بھائی کے سامنے بھی رکھی تھی۔"

"ہاں سالار خاور! میں اس کڑی کی تصویریں لے آئی ہوں۔ پرسوں بھائی کے مرنے کے بعد میں نے اس کے سامان سے سب سے پہلے یہ تصویریں ہی نکالی تھیں۔" اس نے لرزتے لہجے میں کہا اور کانپتے ہاتھوں سے موٹے مومی کاغذ کا ایک لفافہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اس لفافے کی تہیں، گواہ تھیں کہ یہ برسوں کسی صندوق میں سامان وغیرہ کے نیچے پڑا رہا ہے۔۔۔۔۔

میں نے لفافہ کھولا۔ کارڈ سائز کی تصویروں پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ یہ شاداں کی بڑی واہیات تصویریں تھیں۔ کہیں کہیں وہ نیم بے ہوش نظر آتی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس سے زبردستی کی گئی ہے۔ شاید نیم بے ہوش ہونے کے باوجود اس نے مزاحمت کی تھی اور اسے ڈرایا دھمکایا گیا تھا۔ تصویروں اور نیگیٹیو بھی لفافے میں موجود تھے۔ تصویروں اور

نیگٹیو وغیرہ کی حالت دیکھ کر میرے دل نے گواہی دی کہ یہی لفافہ ہے جس کی واپسی کے لیے شاداں اور ثمینہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہیں اور پاشے کی چیرہ دستیوں کا سامنا کرتی رہیں۔

میرے اور مکھاں کے درمیاں چند منٹ مزید گفتگو ہوئی۔ پھر میں بستر سے اٹھ کر گیا اور مکھاں والی تصویریں لے آیا۔ یہ تصویریں بھی ایک مومی لفافے میں بند تھی بلکہ یہ ایک ڈبل لفافہ تھا۔ اندر کا لفافہ کاغذ کا تھا۔ یہ تصویریں میرے ایک صندوق میں سامان کے نیچے پڑی رہتی تھیں۔ شاید قارئین کو تعجب ہو کہ میں نے انہیں اتنی بے پرواہی سے رکھا ہوا تھا لیکن یہ تصویریں دراصل تصویریں تھیں ہی نہیں۔ یہ تو کئی برس پہلے ختم ہو چکی تھیں بلکہ میں نے انہیں ختم کر دیا تھا۔

میں نے لفافہ مکھاں کے سامنے کر دیا۔ اس نے اپنی چادر میں سے ہاتھ نکال کر لفافے کو دیکھا اور اسے دبا کر ان میں تصویروں کی موجودگی کا اندازہ کرنا چاہا۔ تب اس کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔ اس نے جلدی سے لفافہ کھولا اور کانپتی آواز میں بولی۔ "یہ کیا ہے؟"

لفافے میں راکھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "یہ تمہاری تصویریں اور ان کے نیگٹیو ہیں مکھاں۔ میں نے چار پانچ سال پہلے ہی انہیں جلا ڈالا تھا۔ تمہارے بھائی کی طرح سنبھال کر نہیں رکھا ہوا تھا۔۔۔۔ کم از کم میں تو ایسا نہیں کر سکا تھا۔"

"مم۔۔۔۔۔میں کچھ سمجھی نہیں۔"

میں نے لفافے کی راکھ ایک کاغذ پر الٹ دی۔ تصویریں اتارنے کے بعد جب پاشا سے ٹینشن بڑھی تھی تو میں نے فلم رول ڈویلپ کرا لیا تھا مگر تصویریں صرف دو ہی بنوائی تھیں، باقی نیگٹیو کی شکل میں تھیں۔ پھر ایک دن میں نے یہ سب کچھ جلا دیا تھا۔ مجھے یہ بالکل گوارا نہیں تھا کہ میں یہ تصویریں اپنے پاس رکھوں اور یہ ایک عورت کی عزت کے لیے مسلسل رسک بنی رہیں۔"

مکھاں حیرت سے کاغذ پر پڑی راکھ کو دیکھ رہی تھی۔ اس راکھ میں تصویروں کے ادھ جلے کونے تھے۔ اس کے علاوہ نیگٹیو بھی جل کر ختم نہیں ہو جاتے۔ ان کی بھی چرمر قسم کی راکھ ہوتی ہے۔ وہ راکھ بھی موجود تھی۔

"میں کیسے یقین کر لوں؟" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"جیسے میں نے یقین کیا ہے کہ پاشے کے پاس بس یہی تصویریں تھیں اور اس نے ان کی کاپیاں وغیرہ نہیں بنوائی ہوئی تھیں۔"

وہ لاجواب سی ہو گئی۔ ایک عجیب جذبے کے تحت میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "جاؤ مکھاں! بالکل بے فکر ہو کر جاؤ۔ اب یہ تصویریں کبھی تمہاری زندگی میں نہیں آئیں گی۔ کیونکہ یہ ہیں ہی نہیں۔۔۔۔ بلکہ یہ بہت عرصے پہلے سے ہی نہیں تھیں۔"

مکھاں نے کچھ بولنا چاہا مگر بول نہیں پائی۔ بس دو آنسو اس کے رخساروں پر لڑھکے اور کہیں چادر کی تہوں میں گم ہو گئے۔ ہاں، وہ کافی بدل گئی تھی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے پاشے کی منہ پھٹ جھگڑالو بہن نہیں بلکہ ایک گھریلو عورت نظر آئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ رخصت ہو چکی تھی۔ یہ ایک ابر آلود دن تھا۔ سردی معمول سے زیادہ تھی۔ میرے قریب برادے والی گول انگیٹھی دہک رہی تھی۔ میں نے موٹے مومی کاغذ والا لفافہ کھولا اور شاداں کی تصویریں ایک ایک کر کے انگیٹھی میں جھونکنے لگا۔ ایک دیرینہ کہانی انجام کو پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جاگیر اور آس پاس کے حالات دگرگوں تھے۔ حالانکہ راجوالیوں نے موکھلوں کے دانت بہت اچھی طرح کھٹے کر دیے تھے مگر اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ وہ جوابی کاراوئی کریں گے۔ بہر حال، فوری طور پر تو ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ گوجرانوالہ اور ڈسکہ سے پولیس کی بھاری نفری پہنچ چکی تھی۔ دونوں طرف کے تقریباً تین سو بندے پکڑے گئے تھے۔ تین چار دیہات سے پولیس نے ہر طرح کا اسلحہ اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور علاقے میں کرفیو کی سی کیفیت تھی۔ مختلف دفعات کے تحت جو پرچے درج ہوئے تھے، ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ جلد یا بہ دیر میاں وارث مجھے گرفتار کرنے پہنچ جائے گا لیکن دو تین دن گزر جانے کے باوجود ایسا نہیں ہوا۔

میں بہ دستور بستر علالت پر تھا۔ زخموں سے چور جسم کا علاج مقامی طور پر ہو رہا تھا۔ موکھلوں کی اندھادھند مار پیٹ کے سبب بائیں بازو میں ایک فریکچر بھی ہوا تھا۔ بلقیس نے کھڑے سے ایک ڈاکٹر بلوایا تھا، اس نے پلاستر تو نہیں چڑھایا تاہم پٹی باندھ دی اور مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔

چوتھے یا پانچویں روز ایک شخص مجھ سے ملنے آیا اور مجھے پتا چلا کہ ابھی تک میں گرفتاری سے کیوں بچا ہوا ہوں۔ یہ بارعب صورت والا ایک اڑتیس چالیس سالہ شخص تھا۔ وہ عام کپڑوں میں تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ پولیس کے محکمے میں ہے اور میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے۔

"میرا نام امتیاز ہے۔۔۔۔ ایس پی امتیاز گوندل۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ ڈکیت بارے کی موت کے وقت تم سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"ہاں، مجھے یاد آگیا ہے۔" میں نے تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا۔

ایتاز گوندل بولا۔ "تمہیں شاید یاد نہ ہو، اس کے پولیس اسٹیشن میں بیٹھے ہوئے میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ بارے کے سر پر جو انعامی رقم مقرر ہے، اس میں سے تمہیں بھی معقول حصہ ملے گا اور تعریفی سند وغیرہ بھی۔"

"ہاں، کچھ کچھ یاد ہے، کچھ کچھ بھول گیا ہوں۔۔۔۔ بلکہ بھلا دیا ہے۔"

"میں نے پچھلے سالوں میں کئی بار تم سے رابطہ کرنا چاہا پر نہیں کر سکا۔ شاید ہر کام کا اپنا ایک وقت ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس موقع پر تم سے زیادتی ہوئی۔ بارے کو گھیرنے اور

مارنے کا سارا کام تم نے کیا۔۔۔۔ اور کریڈٹ ہم نے خود لے لیا۔ لیکن یہ مجھ اکیلے کا کام نہیں تھا۔ ہم دو تین انسپکٹر اس میں شامل تھے۔ اور کئی موقع ایسے ہوتے ہیں شاہ خاور جب بندے کو دوسروں کی رائے کے ساتھ اپنی رائے ملانی پڑتی ہے۔ بہر حال، میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ میں آج سچے دل سے تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت بارے کو مار کر تم نے جو یادگار کام کیا، اس کا سب سے زیادہ فائدہ شاید مجھے ہی پہنچا۔ میں اس وقت سب انسپکٹر تھا۔۔۔۔ اب ایس پی ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے کندھے پر جو پھول نظر آ رہے ہیں، ان پر تمہاری دلیری اور ہمت کی چھاپ ہے۔"

"اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی مہربانی ہے۔ بہر حال اب یہ سب پرانی باتیں ہیں۔"

"باتیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں خاور! وقت اپنے آپ کو دہراتا رہتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت ہے کہ میں تمہارے احسان کا بدلہ کسی حد تک چکاؤں اور انسپکٹر میاں وارث کی طرف سے تمہارے ساتھ جو ناانصافی ہو سکتی ہے۔ اس کا راستہ روکوں۔"

"آپ کو انسپکٹر وارث کا کیسے پتا چلا؟"

"پولیس والا ہوں۔ اگر میں پتا نہ رکھوں گا تو اور کون رکھے گا؟ آج سے دس سال پہلے میں اور وارث ایک ہی ٹریننگ سینٹر میں تھے۔ میں اس کی فطرت کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"ویسے آپ کی دعا ہے۔۔۔۔ مجھے اب توقع نہیں ہے کہ وارث بھی کچھ زیادہ ہاتھ پاؤں چلائے گا۔ اس نے ہوا کا رخ دیکھ لیا تھا اور جان لیا ہے کہ لوگ ایک بار پھر میرے ساتھ ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لڑائی والے دن لوگ جس طرح تمہارے پیچھے نکلے ہیں، اس نے سب کو حیران کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ لوگ تم سے بد ظن ضرور ہوئے تھے مگر ان کے دلوں سے تمہاری قدر کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنا رویہ بدلنے کے لیے بس کسی چھوٹے سے واقعے کے منتظر تھے۔"

ایس پی امتیاز گوندل سے ہونے والی یہ ملاقات میرے لیے خاصے اطمینان کا باعث بنی۔ مجھے لگا کہ حالات میرے اور میرے گھر والوں کے لیے صحیح رخ پر جا رہے ہیں۔ شاید دانا ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ کرم یعنی عمل کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں انسان کی طرف

لوٹتا ہے۔ گزرے دنوں میں یہ پھانس اکثر میرے دل میں چبھتی رہی تھی کہ بارے اور اس کے ساتھیوں کی موت کا سارا کریڈٹ پولیس والوں نے خود لے لیا ہے۔

اگلے روز صبح سویرے ایک اور واقعے کا پتا چلا اور قلعہ والا میں بند بے گناہ افراد کے بارے میں میری پریشانی اور بڑھ گئی۔ رونق علی میرے لیے بکرے کے پائے یعنی کھراوڑوں کا سالن لے کر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے جو چوٹیں لگی ہیں ان کے لیے کھراوڑوں کا سالن اکسیر ثابت ہوگا۔ میرے لیے یہ سالن اکسیر ثابت ہوتا یا نہیں لیکن رونق علی کے لیے نکسیر ضرور ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ سالن لاتا تو میرے لیے تھا مگر اس کا زیادہ حصہ خود رونق کے پیٹ میں "رونق افروز" ہوتا تھا۔ وہ کھاتا جاتا اور ساتھ ساتھ اپنے "بلڈ پریشل" کا رونا بھی روتا جاتا تھا۔

تاہم اس روز ناشتے کے موقع پر رونق علی کچھ سنجیدہ تھا۔ اس نے کہا "تمہیں پتا ہے کہ رات کو کیا ہوا؟"

"نہیں۔"

"ابھی کسی کو بھی پتا نہیں۔ پر ایک دو گھنٹے میں یہ خبر سارے علاقے میں پھیل جانی ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، بہت برا ہوا ہے۔"

"کچھ بتاؤ بھی۔"

رونق نے لرزاں آواز میں کہا۔ "رات کو کچھ لوگوں نے عزیز کی لاش کو قبر سے نکالا ہے۔ اس کا کفن پھاڑا ہے اور کلہاڑی شلہاڑی سے اس کے ٹوٹے کر دیے ہیں۔"

میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ دھیان فوراً چند دن پہلے کی اس ملاقات کی طرف گیا جو میرے اور آصف جاہ کے درمیان ہوئی تھی۔ پاشے کی موت کے بعد آصف جاہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ شہوار کے قاتلوں کی لاشوں کو بھی معاف نہیں کرے گا۔

رونق علی نے کہا۔ "یہ سب تمہارے سسر کا کام ہے۔ بیٹی کے غم میں وہ بالکل جنونی ہو رہا ہے۔ اب تو اس کے اپنے بندے بھی اس سے خوف کھانے لگے ہیں۔"

مجھے سخت بے چینی محسوس ہوئی۔ میرا خیال ایک بار پھر ان افراد کی طرف گیا جنہیں آصف جاہ نے صرف داماد ہونے کی پاداش میں پکڑ رکھا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اپنے طیش کے بہاؤ میں ان کی زندگی سے بھی کھیل سکتا تھا۔ میری نگاہوں میں غازی محمد اور باؤ ارشد وغیرہ کے

چہرے گھومنے لگے۔ خاص طور سے غازی محمد نے مجھے اس عقوبت خانے سے نکالنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ میں نے وہاں سے نکلتے ہوئے غازی محمد سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے اور باقی افراد کو اب زیادہ دیر یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ مجھے فرار میں مدد دینے کی پاداش میں غازی محمد کا حشر خراب ہو سکتا ہے۔

یہ سارے خیالات اتنی شدت سے میرے ذہن میں آئے کہ میں اپنے زخمی جسم کو سنبھالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا خاور؟ یار، ناشتا تو کرو۔" رونق حیران ہو کر بولا۔

"نہیں، ابھی کچھ دل نہیں چاہ رہا۔" میں نے کہا اور لنگڑاتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔

اگلے ایک گھنٹے میں، میں نصر اللہ کے ذریعے ایس پی امتیاز گوندل سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ امتیاز گوندل ابھی شہر واپس نہیں گیا تھا۔ وہ ڈسکے کے قریب اپنے ایک زمیندار دوست کے پاس ٹھہرا ہوا تھا اور اس نے علاقے کے حالات پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس کی مہربانی کہ وہ میری درخواست پر فوراً راجوال چلا آیا۔

میں نے ایس پی امتیاز کو قلعہ والا کے حوالے سے ساری تفصیل بتائی اور اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔اس تفصیل نے ایس پی امتیاز کو بھی حیران کیا۔ بہر حال، آج جو کچھ راجوال کے قبرستان میں ہوا تھا،اس کے بعد آصف کے حوالے سے کسی بھی بات پر یقین کیا جاسکتا تھا۔ گاؤں کے چند لوگوں نے عزیز کی کٹی پھٹی لاش کو خاموشی سے دوبارہ دفن کر دیا اور بلقیس کی ہدایت پر قبر پر پہرا بٹھا دیا گیا تھا۔

ایس پی امتیاز کی مجبوری تھی۔اس نے خود تو فوری طور پر ایک دن کے لیے لاہور جانا تھا تاہم اس نے دو انسپکٹروں کو حویلی بلا لیا۔علاقے کے تین تھانوں سے پولیس کی بھاری نفری طلب کر لی گئی۔ میاں وارث کا قائم مقام تھانیدار آفتاب خان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ہم پوری تیاری کے ساتھ قلعہ والا کی طرف روانہ ہوئے۔

میرے حویلی سے نکلنے سے پہلے ہی بہت سے افراد بیرونی دروازے پر جمع ہو گئے،ان کے چہرے پریشان تھے۔ میں نے نصر اللہ سے پوچھا۔"یہ کیوں اکٹھے ہوئے ہیں؟"

"آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔انہیں پریشانی ہے کہ آپ ایسے حالات میں گاؤں سے کیوں جا رہے ہیں؟ دراصل انہیں ڈر ہے کہ آپ شاید پھر کہیں نکل جائیں گے۔"

میں لوگوں کے پاس پہنچا۔گاؤں کا عمر رسیدہ ماسٹر مختار آگے آیا۔اس نے مدبرانہ انداز میں کہا۔"بیٹا خاور! ابھی چند دن تک تمہیں پنڈ سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔تم دیکھ ہی رہے ہو یہاں جو حالات ہیں۔موکھل کسی بھی وقت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"پر ماسٹر جی۔۔۔۔۔میں کہیں جا تو نہیں رہا۔بس قلعہ والا تک جانا ہے۔شام سے پہلے واپس آجاؤں گا۔

امام مسجد مولوی نیاز محمد نے کہا۔"سچی بات یہ ہے پتر جی کہ لوگ ہر گھڑی تمہیں اپنے درمیان دیکھنا چاہتے ہیں اب۔تم اِدھر اُدھر ہوتے ہو تو فکر پڑ جاتی ہے۔"

میں نے لوگوں کے چہرے دیکھے ان میں سے ہر چہرے پر مختلف لفظوں میں ایک یہ بات لکھی تھی۔"ہمیں چھوڑ کر نہ جانا چودھری خاور۔"

میں نے دلاسا دینے والے انداز میں کہا۔"میں کہیں نہیں جا رہا۔یہیں پر ہوں،آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔باقی رہی موکھلوں والی بات تو ان کی طرف سے بھی ہمیں فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔آپ جانتے ہیں دونوں دیہاتوں کے درمیان میں پولیس بیٹھی ہوئی ہے۔ دونوں طرف کا اسلحہ بھی جمع ہو چکا ہے۔"

میرے چند الفاظ سے لوگوں کو کچھ تسلی ہوگئی۔ ہم قلعہ والا کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس وقت دن کے دس بج رہے تھے۔

آصف جاہ کی دہشت علاقے میں موجود تھی۔ اسے ایک سخت مزاج اور من موجی چودھری کے روپ میں جانا جاتا تھا۔ اس کی عزت اس وجہ سے تھی کہ لوگ اس سے خوف کھاتے تھے۔ پولیس بے شک پوری تیاری کے ساتھ قلعہ والا پہنچی، اس کے باوجود دونوں انسپکٹر تذبذب کا شکار تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ حویلی پر ریڈ نہ کرنا پڑے۔ شاید وہ جھیل میں رہ کر مگرمچھ سے بیر ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

یقیناً ہمارے گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہی لمبڑوں کو ہماری آمد کی خبر ہوگئی تھی۔ لوگ چھتوں اور گلیوں کی نکڑوں پر جمع تھے۔ تاہم حویلی کے بڑے دروازے کے سامنے پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ کوئی پہرے دار بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ پراسرار خاموشی تھی۔ انسپکٹر کرامت علی نے آگے بڑھ کر بار بار دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کہیں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی۔

میں نے گاؤں کے ایک معزز شخص کو بلا کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ صادق نامی اس بندے نے بتایا۔ "دراصل جی، کل افواہ پھیل گئی تھی کہ پاشے کی موت کا بدلہ لینے لیے موکھل یہاں

قلعہ والا پر ہلا بولنے والے ہیں۔ پھر کسی نے یہ کہا کہ دو چار بندے چوری چھپے یہاں کسی گھر میں گھس گئے ہیں اور وہ رات کو حویلی میں گھس کر آصف جاہ کو مارنے کی کوشش کریں گے۔ بس ایسی ہی خبروں کی وجہ سے پھاٹک اور دوسرے دروازے بند کردیے گئے تھے۔"

ممکن تھا کہ یہ بات درست ہو لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ لمبڑ آصف جاہ اب تک یہاں پولیس کی آمد سے بے خبر ہو۔ وہ یقیناً جان چکا تھا کہ پولیس کی بھاری نفری اس کے د روازے پر پہنچ چکی ہے۔ اب وہ دروازہ کیوں نہیں کھول رہا تھا؟

میں خود بھی گاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں نے انسپکٹر سے کہا۔ "کرامت صاحب! میگافون پر اعلان کریں کہ ہم دروازہ کھولنے کے لیے تین چار منٹ کا وقت دیتے ہیں اس کے بعد دروازہ توڑ کر اندر گھس جائیں گے۔"

انسپکٹر کرامت نے میگافون پر یہ اعلان دو بار کیا۔ اندر مسلسل خاموشی رہی۔ لگتا تھا کہ آصف جاہ اور اس کے ساتھی قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ یہ لکڑی کا کافی وزنی اور بڑا دروازہ تھا۔ اس پر گولیوں کے وہ نشان موجود تھے جو چند دن پہلے مجھ پر چلائی گئی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس دروازے کا آہنی کھٹکا ان نشانات سے سات آٹھ انچ اوپر ہے، تین منٹ پورے ہونے کے

بعد میری ہلاشیری پر انسپکٹر کرامت نے ایک ہیڈ کانسٹیبل سے دروازے پر سیون ایم ایم رائفل سے دو تین برسٹ چلوائے۔اس فائرنگ نے دروازے کا قریباً ایک مربع فٹ حصہ توڑ کر رکھ دیا۔

انسپکٹر کرامت نے دلیری دکھائی اور جیپ کو تیزی سے چلاتا ہوا اندر لے گیا۔دروازہ اس کا راستہ نہیں روک سکا۔ایک گاڑی کے پیچھے دوسری اور پھر تیسری بھی اندر چلی گئی۔پولیس اہلکاروں نے ان گاڑیوں کے پیچھے پوزیشنیں لے لیں۔باقی گاڑیاں اور گھڑ سوار دروازے کے سامنے نیم دائرے کی شکل میں پھیل گئے۔

ایک دم حویلی کے اندر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔پولیس اہلکاروں نے گاڑیوں کے عقب سے فائرنگ کی۔ایک منٹ کے اندر حویلی کی کئی کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے اور مختلف جگہوں پر سائے حرکت کرتے نظر آئے۔اس فائرنگ میں ایک کانسٹیبل کی ٹانگ میں گولی لگی،دوسری طرف کیا نقصان ہوا اس کا علم نہیں تھا۔

"اگلی دو گاڑیاں آگے لے جاؤ۔"انسپکٹر کرامت نے بلند آواز میں حکم دیا۔

اگلی دو گاڑیاں حرکت میں آگئیں۔میں نے انسپکٹر کرامت سے کہا۔"میں اگلی گاڑی میں جاتا ہوں،مجھے یہاں کے نقشے کا پتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ انسپکٹر مجھے روک سکتا یا کوئی اعتراض کرتا،میں جھک کر بھاگتا ہوا اگلی گاڑی میں پہنچ گیا۔ان لمحوں میں اپنی جسمانی چوٹوں کی تکلیف میرے ذہن سے بالکل نکل چکی تھی۔ایک بار پھر حویلی کے مختلف حصوں سے فائرنگ ہوئی۔پولیس کی طرف سے اس فائرنگ کا جواب دیا گیا۔جلد ہی یہ فائرنگ ختم ہو گئی۔حویلی کے اندر سے توقع سے کم مزاحمت ہوئی تھی۔میں نے لمبڑ آصف جاہ کے کچھ کارندوں کو چھت پر سے بھاگ کر غائب ہوتے دیکھا۔برآمدے کے ستونوں کے پیچھے سے گولیاں چلانے والے دو افراد کو انسپکٹر امجد نے پکڑ لیا۔ان میں سے ایک آصف جاہ کا خطرناک صورت والا کارندہ مولوی مظفر تھا۔اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے۔میں جیپ کو رہائشی عمارت کے عقب سے گزار کر اس جگہ لے گیا جہاں کیکر اور ٹاہلی کے بہت سے درخت تھے۔ان درختوں کے نیچے مویشی باندھنے کی جگہیں تھیں اور وہ منحوس طویلہ بھی جہاں آصف جاہ نے بے گناہ افراد کو بند کر رکھا تھا اور انہیں اذیتیں پہنچا رہا تھا۔

درحقیقت آصف جاہ ان لوگوں میں سے تھا جو زندگی کے کسی دکھ کو برداشت کرنے کے بجائے اسے نفسیاتی مرض بنا لیتے ہیں۔ ماضی میں آصف جاہ کی اکلوتی بہن کی ازدواجی زندگی تلخ ہوئی تھی، حال میں اس کی اکلوتی بیٹی کو مشکل ازدواجی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کوئی ایسی انہونی نہیں تھی۔ زندگی میں ایسے ناخوشگوار اتفاقات ہوتے رہتے ہیں۔ مگر آصف جاہ نے ان حالات سے بددل ہو کر چند "رشتوں" کو اپنا بدترین دشمن جان لیا تھا جن میں شاید سسر اور داماد کا رشتہ سرفہرست تھا۔

ہم طویلے کے سامنے پہنچے۔ وہاں موجود افراد نے بالکل مزاحمت نہیں کی اور پولیس کی بھاری نفری دیکھ کر راہ فرار اختیار کر لی۔ میں نے اپنے ہاتھ سے طویلے کو لگے ہوئے آہنی تالے پر پستول سے تین فائر کیے۔ تالا ٹوٹ گیا۔ سب سے پہلے میں ہی اندر داخل ہوا۔ اندر کا منظر میرے لیے جانا پہچانا تھا۔ آہنی سلاخوں کے پیچھے قریباً بارہ تیرہ بدحال افراد نظر آ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر گمان ہوتا تھا جیسے وہ مست حال سادھوؤں کا ٹولہ ہو۔ طویلے کے اندر تعفن اٹھ رہا تھا۔ سب سے پہلے مجھے غازی محمد نے ہی پہچانا۔ اس کے چہرے پر جوش لہرایا۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ "سالار جی!"

اندرونی دروازے کو بھی قفل لگا تھا۔ ارشد نے پکار کر کہا۔ "چابی پچھلی دیوار پر لٹکی ہوئی ہے جی۔"

میں نے چابی اتاری اور وہ دروازہ کھول دیا جو ان مصیبت زدگان پر کئی ماہ سے بند تھا۔ اب ان کے گلے کی زنجیریں کھولنے کا مرحلہ تھا۔ پولیس والے یہ منظر دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ غازی محمد، باؤ ارشد اور اشفاق وغیرہ مجھ سے لپٹ گئے۔ باقی افراد کے چہروں پر بھی دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ایک بے یقینی کی کیفیت بھی تھی۔ شاید انہیں بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ ان کے جرمِ بے گناہی کی سزا ختم ہونے والی ہے۔

میں نے غازی محمد سے پوچھا۔ "تم خیریت سے تو ہو؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اندازہ ہوا کہ وہ فرار میں مدد دینے کے الزام سے بچ گیا ہے۔

جلد ہی پولیس اہلکاروں نے چھوٹی چابیوں کا وہ وزنی گچھا بھی ڈھونڈ لیا جس سے محبوس افراد کی گردنوں کے کڑے کھولے جا سکتے تھے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے ہاتھ سے غازی محمد کی گردن کا کڑا کھولا۔ اس کی گردن پر بھی سیاہ نشان پڑ چکا تھا۔ میں نے اس نشان کو محبت سے سہلایا۔ "میں نے کہا تھا نا غازی۔۔۔۔ میں آؤں گا۔"

غازی کی آنکھوں میں ستارے چمک گئے۔ وہ ایک بار پھر میرے گلے سے لگ گیا۔ اسی دوران میں ایک اے ایس آئی دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے اطلاع دی۔ "لگتا ہے جی، لمبڑ آصف جاہ صاحب دوسری منزل پر ہیں۔ وہاں کے سارے دروازے بند ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" انسپکٹر کرامت نے پوچھا۔

"حویلی کی نوکرانیاں بتا رہی ہیں۔"

ہم تیزی سے حویلی کے رہائشی حصے کی طرف گئے۔ یہاں اب کوئی مزاحمت کار نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھریلو ملازم چونکہ نہتے تھے اس لیے پولیس کو ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ان سب کو ایک طرف زمین پر بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ تین نوکرانیاں موجودہ آفت کے سبب زار و قطار رو رہی تھیں۔ ان میں لگائی بجھائی کرنے والی شیداں بھی شامل تھی۔ اس نے میری اور شہوار کی زندگی کو مسلسل تلخ کیے رکھا تھا۔ اب مجھے دیکھ کر اس کی نگاہیں زمین میں گڑ گئیں۔

پولیس اہلکار بالائی منزل کی طرف جانے والے دروازے کو کوٹ رہے تھے۔ آخر چند اہلکار ایک چھوٹی سی سیڑھی کے ذریعے ایک بالکونی میں داخل ہو گئے اور بالائی منزل کا دروازہ

کھول دیا۔ ہم ہتھیار بدست اندر داخل ہوئے۔ یہاں ہر قدم پھونک کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ ان کمروں میں آصف جاہ کے ذاتی محافظ موجود ہو سکتے تھے۔

ہم قدم قدم آگے بڑھے۔ ایک جگہ مجھے بہت مدھم آوازیں سنائی دیں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے کرامت کے کان میں سرگوشی کی۔ "مجھے لگتا ہے یہاں کہیں پاس ہی آصف کے کتے بھی ہیں۔"

ہم قدم قدم بڑی احتیاط سے آگے بڑھتے رہے۔ ایک جگہ کرامت نے اعلان کیا۔ "آصف صاحب! تم چاروں طرف سے گھیرے میں ہو۔ بہتر یہی ہے کہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ۔"

جواب میں فقط کتوں کی دو چار آوازیں آئیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنی زخمی ٹانگ سے ایک دروازے کو کھولا اور اپنی جگہ جما کھڑا رہ گیا۔ اندر کا منظر تحیر خیز تھا۔ لمبڑ آصف جاہ قالین پر بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد اس کے آٹھ سلو کی ہاؤنڈز تھے۔ وہ بھی سب بیٹھے تھے۔ بس ان کی دمیں حرکت کر رہی تھیں۔ بارہ بور کی ایک گولی آصف جاہ کی کنپٹی میں داخل ہوئی تھی اور کھوپڑی توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ بندوق آصف جاہ کی گود میں پڑی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے خود کشی کر لی ہے۔ اس کے قریب ہی اس کی پسندیدہ بیڑیاں بھی بکھری ہوئی تھیں۔

یہ آصف جاہ کا خاص کمرہ تھا۔ آج اس کمرے کا قالین آصف کے خون سے داغدار تھا۔ انسپکٹر کرامت نے ذرا آگے بڑھنا چاہا تو کتوں کے کان کھڑے ہو گئے اور ان کی آنکھوں کی وحشت بڑھ گئی۔ وہ جیسے اپنے مردہ مالک کی حفاظت کر رہے تھے۔

میں نے کرامت کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے آصف جاہ کے کمرے میں ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ دیواروں پر شہوار کی کئی تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں اس کے بچپن سے لے کر جوانی تک کی تصویریں تھیں۔ وہ صندوق بھی قریب ہی رکھا ہوا تھا جس میں سے ایک روز آصف نے مجھے شہوار کے کھلونے اور دیگر اشیاء نکال کر دکھائی تھیں۔۔۔۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ ایک غیر معمولی شخص، اپنے غیر معمولی جذبات سمیت اپنے غیر معمولی انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اس کی موت پر کسی بھی طرح کا تبصرہ کرنا مجھے مشکل معلوم ہو رہا تھا۔

"لاش کو کیسے نکالیں گے؟" انسپکٹر امجد نے پوچھا۔

"یہ کام کتوں کے رکھوالے کریں گے۔ اگر ہم کریں گے تو خطرناک ہو گا۔" میں نے کہا۔

اسی دوران میں ایک اے ایس آئی نے بتایا کہ چار مزید بندوں کو حویلی سے فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ ان میں سے دو کتوں کے رکھوالے ہیں۔

"انہیں لے کر آؤ۔" میں نے کہا۔

چند منٹ بعد چاروں افراد ہمارے سامنے تھے۔ ان میں سے ایک سعید شاہ بھی تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے چودھری امین کے ڈیرے پر میری مصیبتوں میں گوناگوں اضافہ کیا تھا۔ میں وہاں پناہ کے لیے گیا تھا لیکن اس شخص نے میری آمد کی اطلاع لمبڑ آصف جاہ تک پہنچا دی تھی۔ اب وہ ایک مجرم کی طرح میرے سامنے کھڑا تھا۔ جی چاہا کہ اس شخص کی ایک آدھ ہڈی تو ضرور توڑ ڈالوں۔ تاہم پھر کسی نہ کسی طور خود کو سنبھال لیا۔ مصیبت میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے، یہ تو پھر ایک عام انسان تھا۔ بعد میں سعید شاہ نے مخبری کا اعتراف کر لیا اور رو دھو کر معافی بھی مانگی۔ سعید شاہ کے بیان سے یہ بھی پتا چلا کہ مجھے پکڑوانے میں چودھری امین کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اس کا قصور بس اتنا تھا کہ اس نے مصیبت کے وقت مجھ سے منہ موڑا تھا اور یہ کوئی قصور تو نہیں یہ تو رواجِ زمانہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

موکھلوں کے بعد چار پانچ دن کے اندر ہی لمبڑوں کا زور بھی ٹوٹ جانا، جاگیر کے لیے بڑا اچھا شگون ثابت ہوا۔ بہت سے کام آپوں آپ ہی ٹھیک ہونے لگے۔ انسپکٹر میاں وارث نے بلقیس کو خیر سگالی کے پیغام بھجوائے اور پھر حویلی میں آکر میری خیر خیریت دریافت کی۔ وہ بڑا انچرا انسان تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے اپنی ٹانگیں دونوں کشتیوں میں رکھی ہوئی تھیں کہ جو کشتی بہتر چلے گی، اس میں سوار ہو جائے گا اور اب وہ جاگیر والی کشتی میں آنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

میاں وارث راہِ راست پر آیا تو تیمور کے بارے میں بھی پتا چل گیا۔ وہ قبرستان میں سے شاہ نواز اور فیاض میواتی وغیرہ کے ساتھ ہی زخمی حالت میں گرفتار ہوا تھا۔ پولیس نے اسے پوچھ گچھ کے لیے ایک نجی جگہ پر رکھا ہوا تھا۔ میاں وارث نے بتایا کہ اب تیمور کو ڈسکے کے سرکاری اسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے اور وہ روبہ صحت ہے۔ میاں وارث نے ایک اور قابلِ ذکر کام کیا اور وہ یہ کہ اس نے ستر ہزار میں سے پچاس ہزار روپے بڑے اصرار کے

ساتھ بلقیس کو واپس کر دیے جو اس نے رشوت کے طور پر لیے تھے۔ اس کے بہ قول وہ باقی بیس ہزار ماتحتوں پر خرچ کر چکا تھا۔

مزار پر بھی حالات بالکل ٹھیک ہو گئے تھے۔ راجوال اور جاگیر کے دیگر دو دیہات میں زندگی کا نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو رہا تھا۔ سب ٹھیک جا رہا تھا مگر میرے اندر کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ ایک نکیلے پنجوں والا جانور جیسے ہر وقت میرے سینے کو اندر سے کھرچتا رہتا تھا۔ یہ کیسی اذیت تھی جو کسی طور پر میرا پیچھا چھوڑتی نہیں تھی۔ بلقیس سے چند دن پہلے ہونے والی ملاقات کے بعد یہ اذیت اور بڑھی تھی۔

میرے زخم بہ تدریج ٹھیک ہو رہے تھے۔ بازو کی چوٹ بھی بہتر تھی۔ بے بے جی اور عارفہ دن رات میری دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے ساجے کے ٹو کے بارے میں تجسس تھا۔ ساجے کے ٹو کی غداری کا انعام اسے خوب ملا تھا۔ بہت سے دیگر واقعات کی طرح وہ یخ بستہ رات بھی میرے ذہن میں نقش تھی۔ کے ٹو نوٹوں کے بستر پر ایک یلغاری لڑکی کے ساتھ دادِ عیش دے رہا تھا جب میں نے اسے پکڑا تھا۔ بعد میں وہ اپنی ہی غلطی کے سبب خود کو آگ لگا بیٹھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں بری طرح جھلس گئی تھیں۔ بہت سے کرنسی نوٹ جل گئے

تھے۔ تاہم کچھ ابھی تک میرے پاس چاچے رفاقت کی امانت کے طور پر موجود تھے۔ اس واقعے کے بعد سے کے ٹو کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ لیکن پھر ایک دن جاگیر کے پرانے مخبر رملی کی زبانی پتا چل گیا۔

رملی مجھ سے ملنے آیا تو اس نے بتایا۔ "چودھری جی! آپ کا یار کے ٹو گوجرانوالہ میں ہے۔ اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئی ہیں۔ ایک گوڈے کے اوپر سے دوسری گوڈے کے پاس سے۔ بڑی مشکل سے جان بچی ہے جی اس کی۔ سنا ہے کہ اب علاج کے لیے وہ اپنا آدھا مکان بھی بیچ رہا ہے۔"

کے ٹو کے لیے میرے دل میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ وہ اپنا بویا ہوا کاٹ رہا تھا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ وہ کسی کی ہلاشیری پر میرے خلاف کیس وغیرہ درج کرانے کی کوشش کرے مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ میں نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔

ایک دن ایس پی امتیاز گوندل مجھ سے ملنے آیا۔ وہ جب بھی آتا تھا، بہت سا فروٹ اور مٹھائی وغیرہ لاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی باور کراتا تھا کہ یہ چیزیں حق حلال کی کمائی سے ہیں۔ ترقی

ملنے کے بعد وہ عام پولیس والوں سے کافی مختلف ہو گیا تھا۔ میرے ساتھ اس کا ملنا ایک طرح سے ارد گرد کے تھانیداروں کے لیے تنبیہ تھی کہ وہ میرے ساتھ بگاڑنے کی کوشش نہ کریں۔

ایس پی امتیاز نے کہا۔ "آج میرے پاس تمہارے لیے دو خاص خبریں ہیں۔ پہلی تھوڑی سی دردناک ہے، دوسری تھوڑی خوشی والی ہے۔ پہلے کونسی سنو گے؟"

"رونق کا خیال ہے کہ نمک والی شے میٹھی شے سے پہلے کھا لینی چاہیے۔"

امتیاز گوندل نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اس بندے کا پتا چل گیا ہے جس کے حوالے چودھری عزیز نے انورے اور اس کی بیوی کو کیا تھا۔"

"واقعی؟" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"لیکن اب تمہیں ان دونوں سے کیا؟ تمہاری بے گناہی تو ثابت ہو ہی چکی ہے۔" امتیاز گوندل نے کہا۔

"مگر وہ دونوں ہیں کہاں؟"

"جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ کم از کم انورا تو وہیں پر ہے۔ اس کی بیوی کا ابھی ٹھیک سے پتا نہیں۔"

"پوری بات بتاؤ۔"

"عزیز نے میاں بیوی کو ڈسکے کے بابر خان نامی بندے کے حوالے کیا تھا۔ وہ بڑا پرانا کرائے کا قاتل ہے۔ اس نے انورے کو تو فوری طور پر مار کر اور ٹوکے سے اس کے ٹوٹے کر کے اسے نہر میں بہا دیا تھا۔ اس کی بیوی پروین عرف پینو کو اس نے اپنے پاس رکھا تھا مگر عزیز کو یہی بتایا تھا کہ اسے بھی پار کر دیا ہے۔ وہ اور اس کے دو دوست پینو کے ساتھ دس پندرہ دن تک رنگ رلیاں مناتے رہے پھر وہ بھاگنے کی کوشش میں گھر کی سیڑھیوں سے گر گئی اور اس کی کمر میں چوٹ آئی۔ وہ بڑی مشکل سے چل پھر سکتی تھی۔ بابر خان یہ کہتا ہے کہ اس نے پینو کو اسی حالت میں دو قبائلیوں کے ہاتھ پانچ ہزار میں فروخت کر دیا تھا۔ ابھی اس کے اس بیان کی تصدیق باقی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔"

"اوہ خدایا!" میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ حرص و ہوس بندے کو اتنی دور لے جا کر مارتی ہے جہاں پانی نہیں ملتا۔" امتیاز گوندل نے کہا۔

میری نگاہوں میں انورے اور پینو کے چہرے گھومنے لگے اور پینو کے بالوں میں لگا ہوا رنگ دار کلپ جس میں ایک قیمتی نیلم لگا تھا۔ اس نیلم نے ان میاں بیوی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

میں کافی دیر اس خبر کے اثر میں رہا۔ امتیاز گوندل نے مجھے اس بارے میں دیگر تفصیلات بھی بتائیں۔ آخر میں نے پوچھا۔ "اور دوسری خبر؟"

"دوسری خبر یہ ہے کہ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ میری تبدیلی ہو رہی ہے گوجرانوالہ میں۔ اب بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ ارد گرد کے سارے معاملے ٹھیک ہو جائیں گے۔"

امیتاز گوندل خوش تھا مگر میں خوش نہیں ہوا بلکہ مجھے امتیاز گوندل کی بات سن کر جھٹکا سا لگا۔ میں نے جیسے چونک کر سوچا۔ امتیاز گوندل یہاں کس کے پاس آنے کی بات کر رہا ہے؟ میں نے تو شاید یہاں ہونا ہی نہیں ہے۔ میری منزل تو شاید اب بہت جلد بدلنے والی ہے۔

میرے اندر جو افسردہ کر دینے والی تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں، ان کا پتا صرف مجھے تھا، کسی اور کو نہیں تھا۔

چند دن بعد جب میری طبیعت کچھ بہتر ہو گئی تو حویلی میں ایک بڑے اکٹھ کا انتظام کیا گیا۔ جاگیر اور ارد گرد کے تمام اہم زمیندار اور چودھری وغیرہ اس میں شریک ہوئے۔ ایک بار پھر راجوال کی حویلی سے باہر سجے سجائے تانگوں اور گھوڑوں وغیرہ کی قطار لگ گئی۔ کئی گاڑیاں بھی ان سواریوں میں شامل تھیں۔ بہت سے ایسے زمیندار جو اب تک تذبذب میں تھے کہ علاقے کی چپقلش میں موکھلوں کی طرف داری کریں یا جاگیر کی۔۔۔۔ اب بڑے جوش و خروش سے جاگیر کے اکٹھ میں شریک ہوئے اور انہوں نے ہمیں ہر طرح سے اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ سچ کہتے ہیں کہ جیتنے والے کا ساتھ ہر کوئی دینا چاہتا ہے اور چڑھدے سورج کی پوجا کا رواج ازل سے رہا ہے۔ اس اکٹھ میں جاگیر کے چودھریوں نے برملا میری تعریف کی اور تہ دل سے میری ساری کوششوں کا اعتراف کیا۔ جاگیر کے رواج کے مطابق مجھے ایک سرخ اور سبز پٹی والی خاص پگ پہنائی گئی۔ اس پگ کو مقامی طور پر ایک عجیب سا

نام دیا جاتا تھا۔ یہ پتا نہیں کس زبان کا لفظ تھا، پر اس کا مطلب تھا کہ بڑے رکھوالے کی پگڑی! اس پگڑی کا پہننا ایک اعزاز تھا۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ تھا، اس کے باوجود میں محسوس کرتا تھا کہ میرے اور جاگیر کے چودھریوں کے درمیان ایک فاصلہ سا موجود ہے۔ در حقیقت یہ فاصلہ ہمیشہ سے موجود رہا تھا۔ یہ وہی ذات برادری کا پیدا کیا ہوا فاصلہ تھا۔ بے شک میں بھی زمیندار طبقے سے تھا مگر برادری کے لحاظ سے جاگیر کے چودھری مجھے اپنے سے کم تر جانتے تھے۔ جب ایک موقع پر بلقیس سے میری شادی کی بات چلی تھی تو یہی طبقہ تھا جس نے سخت برا منایا تھا اور اس بات کو ابھرنے سے پہلے ہی سختی سے دبا دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان دنوں بلقیس کو بھی اندر خانے زبردست دباؤ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس دباؤ کے بعد ہی بلقیس نے میری شادی کے بارے میں سوچنا شروع کیا تھا اور بالآخر میرے لئے شہوار کا رشتہ ڈھونڈا گیا تھا۔ میں اس تناؤ کو آج بھی اسی طرح محسوس کر رہا تھا۔ جاگیر کے لیے سب کچھ کرنے کے باوجود میں آج بھی یہاں کے چودھری طبقے کے لیے "گھس بیٹھیا" یا آؤٹ سائیڈر رہی تھا۔

اس اکٹھ کے دوران میں، میں نے نوٹ کیا کہ حامد موجود نہیں ہے۔ میں نے قریب بیٹھے چودھری یعقوب سے پوچھا۔ "آپ کے بھانجے صاحب نظر نہیں آرہے؟"

"وہ کہیں گیا ہوا ہے۔" چودھری یعقوب نے مختصر جواب دیا۔

میں منتظر ہی رہا کہ شاید وہ کچھ اور بتائے لیکن وہ کسی اور سے بات میں مصروف ہو گیا۔ قریب بیٹھی بلقیس نے بھی یہ سب کچھ سنا تھا۔۔۔۔ اور شاید محسوس کیا تھا کہ اس کے بھائی کے ادھورے جواب نے مجھے افسردہ کیا ہے۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ اس روز رات کے کھانے کے بعد وہ میرا احوال پوچھنے حویلی کے مہمان خانے میں آگئی۔ مہمان خانے میں پہلے دن والی ملاقات کے بعد وہ کبھی میرے سامنے اکیلی نہیں آئی۔ شاید وہ چاہتی ہی نہیں تھی کہ میں کوئی سنجیدہ موضوع چھیڑوں۔ اس وقت عارفہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ بلقیس شال میں لپٹی لپٹائی تھی۔

چند رسمی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔ "حامد کہاں ہے؟"

"اسے میں نے گجرات بھیج دیا ہے، اس کی بڑی پھوپھی کے پاس۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ کچھ مہینے وہیں رہے جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو آجائے گا۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "جاتے ہوئے مجھ سے مل تو جاتا۔ بڑا کورا ہو گیا ہے وہ۔"

"بالکل کورا نہیں ہے بلکہ سچ پوچھو تو وہ ہر وقت تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہتا تھا خود کبھی کبھی میرا دل بھی چاہتا تھا کہ وہ تمہارے قریب رہے، تم سے کچھ سیکھے۔ پڑھائی میں بھی جتنا اچھا تم اسے پڑھا سکتے ہو، شاید کوئی اور نہ پڑھا سکے۔ تمہاری ہر بات مانتا ہے وہ لیکن تم بھی جانتے ہو کہ مجبوریاں ہیں۔ یہاں اس کے لیے بہت خطرے ہیں۔"

"میری سمجھ میں یہ بات پوری طرح نہیں آئی۔ بہر حال، یہ تم لوگوں کا اندرونی معاملہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم نے ٹھیک ہی کیا ہو۔"

وہ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر عارفہ کے ساتھ ہی چلی گئی۔ وہ گھر میں بالکل سادہ لباس پہنتی تھی۔ چہرے کو بھی بالکل سادہ رکھتی تھی۔ جیسے یہ ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ دنیا کی رنگینی میں اس کی دلچسپی ختم ہو چکی ہے اور اب وہ ایک اور طرح کے طرزِ زندگی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ لیکن ایسا سوچتے ہی میرے ذہن میں یہ خیال کچوکے لگانے لگتا تھا کہ وہ اس ساری سادگی کو ایک طرف رکھ کر چودھری عزیز سے شادی کی ہامی بھر چکی تھی۔ بلاشبہ یہ فیصلہ اس نے میرے لیے کیا تھا لیکن کیا تو تھا۔ یعنی وہ میری خاطر کسی دوسرے کے پاس جا سکتی تھی لیکن میری

خاطر میرے پاس نہیں آسکتی تھی۔ میں ایسے سوچتا تو پھر مجھے اپنا یہ خیال غلط محسوس ہونے لگتا تھا کہ بلقیس کا چہرہ ایک شیشے کی طرح ہے اور میں اس کے آر پار دیکھ سکتا ہوں۔ پھر مجھے لگتا تھا کہ بلقیس کا چہرہ بھی ایک روایتی عورت کا چہرہ ہے جس پر نامعلوم زمانوں سے گہرے بھیدوں کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ مرد کتنی بھی کوشش کرے اس پردے کے پیچھے عورت اور عورت کی محبت ایک پہیلی ہی رہتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جاگیر کے حالات اب بہت بہتر تھے۔ سب کچھ اچھا جا رہا تھا۔ موکھل زبانی طور پر تو نہیں مان رہے تھے مگر ذہنی طور پر انہوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ پاشے کی اندوہناک موت نے ان کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی تھی۔ دن تیزی سے گزرتے جا رہے تھے اور میرے اندر پیدا ہونے والی افسردہ تبدیلیوں کا عمل جاری تھا۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آچکی تھی کہ مجھے یہ جاگیر چھوڑ کر جانا ہو گا۔ میں اپنے دل سے مجبور تھا۔ میں بلقیس سے دور رہ کر تو شاید زندگی کے دن پورے کر لیتا مگر بے گانوں کی طرح

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کے قریب رہ کر میرے لیے جینا ناممکن تھا۔ وہ اونچی اونچی پگڑیوں کے نرغے میں تھی۔ میں ان پگڑیوں کے پسِ منظر میں اسے دیکھتا تو میرا دم گھٹتا تھا۔ کبھی کبھی میں سوتے میں ہڑبڑا کر اٹھ جاتا۔ مجھے لگتا تھا کہ میری سانس واقعی بند ہونے لگی تھی۔

ہاں، میں جاگیر چھوڑنا چاہتا تھا لیکن کسی بے گانے کی طرح نہیں، اپنے کی طرح۔ میں چاہتا تھا کہ یہاں سے جاؤں تو اپنے پیچھے کچھ ایسے لوگ چھوڑ جاؤں جو میری کمی کا احساس نہ ہونے دیں۔ میں یہاں کے دیہات کی ہنستی بستی فضاؤں کی رونق چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ یہاں کے کھیتوں کی ہریالی، یہاں کی گلیوں کی دھوپ چھاؤں، یہاں کی ٹھٹھری ہوئی چاندنی راتوں کا سحر، یہاں کی چلچلاتی دوپہروں کی دل گداز خاموشی اور یہاں کے دہقانوں کے چہروں پر زندگی کی چمک۔۔۔۔۔ مجھے ان سب سے پیار تھا۔ میں ان میں سے کسی چیز کا نقصان نہیں چاہتا تھا۔

ایک دن میرے اور نصراللہ کے درمیان تفصیلی بات چیت ہوئی۔ نصراللہ نے مجھے اطلاع دیتے ہوئے بتایا۔

"بھرتی پوری ہو گئی ہے جی۔ڈھائی سو بندے جاگیر کے اندر سے ہوئے ہیں۔ایک سو آلے دوالے کے ہیں۔ان میں سے دو سو کے پاس لائسنسی ہتھیار ہیں۔باقیوں کا انتظام بھی ایک دو دن میں ہو جائے گا۔"

"گھوڑوں کی کیا پوزیشن ہے؟"

"گھوڑے تو جی اب ضرورت سے زیادہ ہیں۔مجھے لگتا ہے کہ اگلے ایک سال تک تو ہمیں خریداری کی ضرورت نہیں ہے۔آگے کا پتا نہیں۔"

"مال بھی اچھا ملا ہے؟"

"بالکل جی!موکھلوں کی آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔"

"یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے نصر اللہ لیکن ایک بات میں تمہیں پھر بتا دوں،اصل طاقت گھوڑے بندوقیں نہیں ہوتیں،اصل طاقت لڑنے والوں کا حوصلہ اور ان کا ہنر ہوتا ہے۔جب بھی حوصلے کی بات آئے گی،چاچے عسکری کا ذکر ضرور آئے گا۔ذرا سوچو،جب وہ لڑائی والے دن اپنی چارپائی سے اٹھ کر باہر نکلا،اس کے پاس کیا تھا؟گھوڑا نہ رائفل،نہ جسم میں

جان!بس یہ اس کا حوصلہ اور ہنر تھا جو اسے باہر لایا اور وہ موکھلوں سے بھڑ گیا۔بس یہی لوگ لڑائی جیتنے والے ہوتے ہیں۔"

"آپ کی یہ بات میں اکثر دہراتا رہتا ہوں۔"

"تیمور اور شبیر کے ساتھ مشورہ ہو رہا ہے؟"

"بالکل جی!روزانہ تقریباً ایک گھنٹا بیٹھتے ہیں۔برکت بھی ساتھ ہوتا ہے۔"

"ضرور۔۔۔۔۔اسے بھی ساتھ رکھو۔درحقیقت یہ تم چاروں ہی ہو جس پر باقی سارے لوگوں اور نئی پرانی بھرتی کا دارومدار ہے۔میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میں سے ہر کوئی ایک سالار جتنی ذمے داری محسوس کرے۔اگر کسی وقت تم اپنی ڈیوٹی پر نہ بھی ہو تو کسی کو سالار کی کمی محسوس نہ ہو۔"

"میں سمجھتا ہوں جی کہ آپ کی کوششوں اور اللہ سوہنے کے کرم سے ہم اب جتنے مضبوط ہیں پہلے کبھی بھی نہ تھے۔۔۔۔۔بلکہ میں تو۔۔۔۔۔"بات کرتے کرتے نصر اللہ ایک دم خاموش ہو گیا۔اس نے سر اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔

"کیا بات ہے۔اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں جی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور جھکا لیا۔

"نہیں، تم کوئی بات کہنا چاہ رہے تھے۔"

میں نے ذرا اصرار کیا تو وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"کہیں آپ نے۔۔۔۔کہیں جانا تو نہیں؟"

"کیا مطلب؟" میں نے اپنے تاثرات بہ مشکل چھپاتے ہوئے کہا۔

"کک۔۔۔۔کچھ نہیں۔مجھے لگتا تھا کہ شاید آپ کچھ دنوں کے لیے کہیں جانا چاہتے ہیں۔"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔لیکن اگر جانا پڑا تو تمہیں بتا کر جاؤں گا۔"

پتا نہیں نصر اللہ میرے جواب سے مطمئن ہوا یا نہیں مگر وہ خاموش ضرور ہو گیا۔

اگلے تقریباً دو مہینے میں، میں نے جاگیر کے حفاظتی نظام پر بھرپور توجہ دی۔ میں نے کوشش کی کہ نصر اللہ اور تیمور ہر معاملے میں طاق ہو جائیں۔ مجھے خاص طور سے تیمور سے

بہت امیدیں وابستہ تھیں۔ بہر حال، اپنی اندرونی کیفیت کے بارے میں، میں نے تیمور کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ رونق سے میں ہر بات کر لیتا تھا مگر اپنے پروگرام کے بارے میں، میں نے اسے بھی یکسر بے خبر رکھا۔

میں نے بھرپور کوشش کی کہ مقامی پولیس سے بھی بلقیس اور چودھری یعقوب وغیرہ کے تعلقات بہت اچھے ہو جائیں اور اس میں مجھے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس کامیابی کی ایک وجہ ایس پی امتیاز گوندل بھی تھا جو اب اپنے تمام اختیارات سمیت گوجرانوالہ میں بیٹھا ہوا تھا۔

ان ساری کوششوں کے ساتھ ساتھ میں اپنے لیے پلاننگ بھی کر رہا تھا۔ جاگیر میں اور ارد گرد اب میرے پاس کافی زمین تھی مگر جو زمین مجھے سسرال کی طرف سے ملی تھی، اس پر میں اپنا کوئی حق نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اس جگہ میں سے ایک انچ بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گا۔ ہاں جو دو ڈھائی مربعے مجھے والی جی کی طرف سے ملے تھے، ان کو فروخت کرنے کے بارے میں، میں سوچ سکتا تھا۔ اس رقم سے مجھے کہیں اور آباد ہونے میں مدد مل سکتی تھی۔ میرے ذہن میں جو منصوبہ بن رہا تھا، اس کے مطابق مجھے اپنی والدہ اور

بہن بہنوئی کے ساتھ جنوبی پنجاب میں کہیں جا رہنا تھا۔ایک دو جگہوں کے نام میرے ذہن میں تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ فروری کی ایک ٹھٹھری ہوئی چاندنی رات تھی۔ راجوال کی ایسی ہی کچھ راتیں ہمیشہ کے لیے میرے ذہن پر نقش ہو چکی تھیں، جب حویلی کے زنان خانے میں گاؤں کی خوش رنگ مٹیاریں چرخے کاتتی اور گیت گاتی تھیں۔ ترنجن کے پکوانوں کی مہک سارے میں پھیل جاتی تھی اور پھر ڈھولک کی آواز کے ساتھ بلقیس کی مسحور کن آواز بند دروازوں سے گزر میرے کانوں تک پہنچتی تھی۔ کچھ اس قسم کے لوک گیت ہوتے تھے۔

امبیاں دیاں بوٹیاں نوں لگ گیا بور نی

رات اے ملاپاں والی ماہی میرا دور نی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

یعنی آموں کے پیڑوں پر بور آگیا ہے۔ یہ حسن اور عشق کی ملاقاتوں والا موسم ہے لیکن میرا ماہی مجھ سے دور ہے۔

اور پھر وہ صوتی آلہ جسے ہم نے بمبو کاٹ کا نام دے دیا تھا۔ گرم انگیٹھی کے سامنے لحاف میں بیٹھ کر رات کے سناٹے میں کی جانے والی وہ سرگوشیاں جو دھیرے دھیرے ایک تیز بہاؤ کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ ایک ایسا بہاؤ جس میں پاؤں جمانے رکھنا ممکن ہی نہیں رہتا۔

ہاں، یہ ویسی ہی ایک سرد چاندنی رات تھی لیکن آج دل کا موسم کچھ اور تھا۔ سینے پر ایک بھاری بوجھ لیے میں بلقیس کی طرف جا رہا تھا۔ جو بات میں کہنے جا رہا تھا، وہ اس بوجھ سے بھی بھاری تھی۔ میں نشست گاہ میں بیٹھ گیا۔ ملازمہ تاجو نے بلقیس کو میرے آنے کی اطلاع دی۔ میں سہ پہر کو ہی بلقیس کو اطلاع دے چکا تھا کہ مجھے۔۔۔۔ ایک ضروری مشورے کے لیے آنا ہے۔ میں نے یونہی کہہ دیا تھا کہ عارفہ میرے ساتھ ہو گی۔

عارفہ میرے ساتھ نہیں تھی۔ مجھے اکیلا دیکھ کر بلقیس قدرے حیران ہوئی۔ "عارفہ کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس کے سر میں درد تھا۔" میں نے بہانہ بنایا۔

"اوہو۔۔۔۔۔میں تو اسے کچھ دکھانے کے لیے لائی تھی۔" اس نے کچھ تصویریں ہاتھ میں پھیلاتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا کہ یہ اس اکٹھ کی تصویریں تھیں جب مجھے سرخ اور سبز پٹی والی اعزازی پگڑی پہنائی گئی تھی۔ بہت سی اونچی پگڑیوں اور شملوں کے درمیان یہ پگڑی بالکل مختلف نظر آتی تھی۔ کچھ تصویروں میں علاقے کے زمیندار اور معزز افراد مجھے مبارک بادیں دے رہے تھے۔ لیکن اس تقریب کی اصل اور سچی خوشی مجھے ان چہروں کے بجائے راجوال کے عام لوگوں کے چہروں پر نظر آئی۔ جب میں اکٹھ سے باہر نکلا تو راجوال کے بہت سے لوگ میرے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ اس مجمع کی تصویروں میں خوشی کی اصل لہر دکھائی دیتی تھی۔ لوگوں نے مجھے ہار پہنائے تھے اور کچھ دیر کے لیے کندھوں پر اٹھایا تھا۔

ان تصویروں کو دیکھ کر بلقیس کے چہرے پر خوشی جھلملانے لگی۔ "لوگ تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ انہوں نے تم سے بہت امیدیں لگائی ہوئی ہیں خاور!" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

میں نے تصویریں ایک طرف رکھتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی اور افسردہ لیکن مستحکم لہجے میں کہا۔ "بلقیس! آج میں تمہیں ایک اہم اطلاع دینے آیا تھا۔"

"خیریت تو ہے؟" شال کے ہالے میں اس کے چہرے پر رنگ سا لہرایا۔

"میں یہاں سے جا رہا ہوں بلقیس!"

"کہاں۔۔۔۔۔کتنے دنوں کے لیے؟" اس نے ایک ساتھ دو سوال پوچھے۔

"دنوں کا تو پتا نہیں۔۔۔۔۔لیکن یہاں کا چکر ضرور لگاتا رہوں گا۔" میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

بلقیس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ "مم۔۔۔۔۔میں سمجھی نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "بلقیس! تمہیں یا چودھری یعقوب وغیرہ کو کسی بھی طرح پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ یونہی چھوڑ کر بھاگ نہیں رہا ہوں۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہو گا، اس وقت نصراللہ اور تیمور نے ہر

طرح میری کمی پوری کی ہوئی ہے۔ پھر شبیر اور برکت ہیں۔ یہ چاروں بندے اب چار ستونوں کی طرح ہیں۔ اللہ نے چاہا تو اب انہیں کوئی ہلا نہیں سکتا۔"

بلقیس کا چہرہ یوں بجھ گیا تھا جیسے چودھویں رات کا روشن تر چاند اچانک سیاہ بادل کی اوٹ میں آجائے۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو خاور۔۔۔۔ کہیں مذاق تو نہیں ۔۔۔۔ کر رہے؟"

"نہیں بلقیس! میں حتمی فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ اب بے بے جی اور عارفہ کے ساتھ خاموشی سے کسی پرسکون جگہ پر رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ جاگیر سے میرا رشتہ بالکل ٹوٹ جائے گا۔ میں کبھی کبھی یہاں کا چکر لگاتا رہوں گا۔" میں نے آخری الفاظ تسلی دینے والے انداز میں کہے۔

بلقیس کی خوبصورت آنکھوں میں نمی جاگ گئی۔ کوکے کا لشکارا ایک دم نہ جانے کہاں چلا گیا۔۔۔۔ گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ وہ لرزاں آواز میں بولی۔ "کیا تم واقعی نہیں جانتے خاور کہ تمہارے بغیر جاگیر کا کیا بنے گا؟"

"تم دور دراز کے اندیشوں میں پڑ رہی ہو بلقیس! اب کچھ نہیں ہوگا۔ جاگیر اس وقت جتنی مضبوط ہے، پہلے کبھی نہیں تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ آٹھ دس سال میں کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تب تک حامد بھی اپنے پاوں پر کھڑا ہو چکا ہوگا۔ پریشانیاں تمہارے پاس بھی نہیں پھٹک سکیں گی۔"

"یا تم اَن جان ہو یا بن رہے ہو خاور! میں اپنے ارد گرد جو دیکھتی ہوں، وہ تمہیں بھی نظر آنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم یہاں نہیں ہوگے تو آٹھ دس مہینوں میں ہی یہاں سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے گا۔ کوئی پتا نہیں کہ میرے اور والی جی کے رشتے دار آپس میں ہی لڑنا مرنا شروع کر دیں۔ میں ان کی نیتوں اور ہمتوں کو بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔۔ اور پھر اندر کے معاملے ہی نہیں باہر کے معاملے بھی ہیں۔ یہ تمہاری بھول ہے کہ نصر اللہ اور تیمور وغیرہ تمہاری کمی پوری کر سکتے ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"بلقیس! تمہیں یاد ہوگا، والی جی نے آخری وقت میں ہم دونوں کے سامنے کیا کہا تھا؟ انہوں نے کہا تھا کہ کسی کے چلے جانے سے دنیا کے کام رکتے نہیں۔ انہوں نے سچ کہا تھا۔ آج میں بھی سچ کہہ رہا ہوں۔۔۔۔ سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں۔"

میرے ٹھوس اور فیصلہ کن لہجے کو محسوس کر کے بلقیس ایک دم چپ ہو گئی۔اس کی آنکھیں میرے چہرے پر تھیں۔اس نے ایسی عجیب نظروں سے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔اس مختصر وقت میں وہ جیسے کچھ بہت اہم اور مشکل فیصلے کر رہی تھی۔آخر اس نے ایک لمبی سانس لی۔اسے سانس بھی کہا جا سکتا تھا اور ایک طویل آہ بھی! پھر وہ اٹھی اور بغیر کچھ کہے باہر چلی گئی۔اس کے جانے کے بعد مجھے بھی اٹھنا تھا۔میں بھی اٹھ گیا۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔وہ جمعے کا ایک چمکیلا دن تھا۔رونق علی طوفان کی طرح اندر داخل ہوا۔اس کا چہرہ زلزلوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔وہ آتے ساتھ ہی توپ کے گولے کی طرح مجھ سے ٹکرایا اور لپٹ گیا۔اس کے بازوؤں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ مجھے اپنی ہڈیاں کڑکڑاتی محسوس ہوئیں۔"اوہو۔۔۔۔۔بتاؤ تو سہی کیا ہوا؟"میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"نہیں،پہلے تم میرا "بلڈ پریشل" چیک کرو۔یہ خبر ایسی ہے کہ میں کسی طرح کا خطرہ شطرہ مول نہیں لے سکتا۔"اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا اور الماری سے بی پی اپریٹس نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔میں نے جلدی جلدی اس کا بلڈ پریشر دیکھا اور بتایا کہ تھوڑا سا زیادہ ہے خطرے کی کوئی بات نہیں۔

"نہیں،میں پھر بھی ایک گولی کھا ہی لوں۔"

اس نے جھٹ سے ایک گولی نگلی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔اس کے بہت بڑے چہرے پر دبے دبے جوش کی چمک تھی۔"اچھا۔۔۔۔۔اب کچھ بتاؤ بھی یا مجھے ہارٹ اٹیک کرواؤ گے۔"

اس نے ایک بار پھر مجھے اپنے جھپے میں لیا اور مجھے بالوں سے جھنجھوڑ کر بولا۔"خاور! مجھے نہیں پتا آگے کیا ہو گا اور کس طرح ہو گا پر اس وقت تو تیری خوش قسمتی کا ستارہ اونچا چلا گیا ہے۔"

"اب کچھ منہ سے بھی پھوٹو رونق بھائی۔"

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔"ابھی کچھ دیر پہلے مجھے بلقیس نے بلایا تھا۔"

"تو پھر؟"

"تیری دلی مراد پوری ہو رہی ہے۔بلقیس تم سے شادی پر راضی ہے۔"

میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔قرب وجوار گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔یہ میں کیا سن رہا تھا؟کیا واقعی ایسا ہو چکا تھا۔۔۔۔یا یہ کوئی جاگتی آنکھوں کا خواب تھا؟

اگلے آدھ گھنٹے میں میرے اور رونق علی کے درمیان تفصیلی بات ہوئی۔اس نے بتایا کہ بلقیس نے تمہارے سارے اندیشوں اور خطروں کو ایک طرف رکھ دیا ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ وہ تمہارا ہاتھ پکڑے گی۔

مجھے ابھی اس خبر پر پوری طرح بھروسا نہیں ہوا تھا پھر بھی سینے میں ایک دھیما سا شادیانہ بجنا شروع ہو گیا۔یہی جرات تھی جو میں بلقیس کی طرف سے چاہتا تھا۔ہاں،یہی توانائی،یہی حوصلہ!میں جانتا تھا کہ ہمارے دل میں سچائی ہے۔ہم آگے بڑھیں گے تو راستے ملیں گے۔۔۔۔دشواریاں تو ہر سفر میں ہوتی ہیں۔مسافر کی ہمت ہی سفر کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے۔

چودھری رونق بھی درحقیقت علاقے کے اسی زمیندار طبقے سے تھا جو برسوں گزرنے کے باوجود مجھے برابری کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے اور دل میں کدورت رکھتے تھے۔

لیکن اچھوں میں برے اور بروں میں اچھے لوگ ہوتے ہیں۔چودھری رونق علی بھی میرے لیے بروں میں ایک اچھا تھا۔پہلے دن سے آج تک وہ ہر مرحلے میں میرا دوست ہی رہا تھا۔

اس نے اپنے پانچ کلو وزنی ہاتھ سے ایک بار پھر طوفانی انداز میں میری پیٹھ تھپکی اور بولا۔

"حوصلہ چھوٹا نہیں کرنا خاور!تم دیکھنا بس دیکھتے دیکھتے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تم کہہ رہے ہو رونق بھائی!کہ برادری کے سامنے اس شادی کا اعلان بعد میں ہو گا۔کیا یہ بات تب تک چھپی رہ سکے گی۔"

"کیوں،چھپی نہیں رہے گی؟ہم اس کا پورا انتظام شنتظام کریں گے۔"

"چلو وقتی طور پر چھپ جائے گی لیکن جب اعلان ہو گا۔۔۔۔تب؟"

رونق علی نے اپنے مخصوص انداز میں حقے کا ایک طویل کش لیا اور اس کے چہرے پر مدبرانہ سنجیدگی نظر آنے لگی۔حالانکہ ایسا کم ہی ہوتا تھا۔وہ بولا۔"خاور!سچی بات یہ ہے کہ ہماری برادری کے چودھریوں اور زمینداروں نے ہمیشہ تم سے فائدہ لینے کے بارے میں ہی سوچا ہے۔وہ تمہیں برتتے رہے ہیں۔انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ تمہاری اپنی بھی کوئی زندگی ہے۔"رونق کے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔

کچھ توقف کے بعد اس نے بات جاری رکھی۔ "دیکھو خاور! غور کرنے والی بات ہے۔ تمہارا نام بلقیس کے ساتھ پہلی بار تو نہیں لیا جائے گا۔ اس سے پہلے بھی لیا جاتا رہا ہے۔ اگر ان میں اتنی ہی غیرت شیرت تھی تو پھر اب تک چپ کیوں رہے؟ اس سوال کا جواب بہت سے لوگوں کو پتا ہے۔ یہ خود کچھ کرنے شرنے کے قابل نہیں۔ یہ دوغلے ہیں۔ اپنی مجبوری کی وجہ سے تمہارے ساتھ محبت جتاتے ہیں اور تمہیں حویلی میں دیکھ کر ان کے دل میں بھانبھڑ بھی جلتے ہیں۔ تمہارے اور بلقیس کے معاملے کو انہوں نے خوامخواہ اپنی ضد بنایا ہوا ہے۔ برادری میں اس سے پہلے بھی باہر شادیاں ہوتی رہی ہیں۔ عورتوں کی دوسری شادیاں بھی ہوتی رہی ہیں۔ والی جی کی اپنی ایک بہن تھی جس کا شوہر پرانی دشمنی میں مارا گیا تھا۔ والی جی نے بہن کی دوسری شادی کی تھی۔ میں کہتا ہوں نا کہ یہ بس ضد ہے اور اگر یہ ضد ہے تو پھر ہمیں بھی ان ضدیوں کے سینے پر مونگ دل دینی چاہیے۔ جو ہوگا، دیکھا شیکھا جائے گا۔"

"مجھے ڈر اس بات کا ہے رونق بھائی! کہ کہیں کوئی فتور پیدا نہ ہو جائے۔ ہم آپس میں ہی لڑنے جھگڑنے نہ لگ پڑیں۔"

"تم دیکھ لینا خاور! کچھ نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کو اپنا عیش و آرام سب سے زیادہ پیارا ہے۔ انہوں نے جھاگ کی طرح بیٹھ جانا ہے۔"

میں رات تک اور پھر رات کے آخری پہر تک جاگتا رہا۔ میرے سینے میں ہیجان برپا تھا۔ لیکن میں ہر پہلو پر سوچ رہا تھا۔ بلقیس کی صورت بار بار نگاہوں میں آتی تھی اور میں دل کی گہرائیوں سے یہ محسوس کرتا تھا کہ میں اگر ایک بار بلقیس کو اپنے بازوؤں میں بھر لوں اور جی بھر کر پیار کر لوں اور تھوڑا سا جی لوں تو پھر شاید مرنے کا بھی کوئی قلق نہیں رہے گا۔ ہاں وہ میرے لیے کچھ ایسی ہی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک بار پھر وہی بات کہوں گا۔ دل دریا سمندروں ڈونگے۔۔۔۔

اگلے سے اگلے روز رونق علی ہی کی زبانی اس معاملے کی کچھ اور تفصیل سامنے آئی۔ رونق نے بتایا کہ بلقیس کی چھوٹی بہن کے ہاں بچے کی پیدائش ہوئی ہے۔ یہ پہلوٹھی کا بچہ بڑی منتوں مرادوں کے بعد دنیا میں آیا تھا۔ دراصل بلقیس کی اس بہن کا نام خالدہ تھا اور وہ کافی عرصہ بلقیس کے ساتھ حویلی میں بھی رہی تھی۔ خالدہ کی شادی گوجرانوالہ میں ہوئی تھی اور آج کل وہ اپنے شوہر چودھری سلیم کے ساتھ گوجرانوالہ میں ہی رہتی تھی۔ رونق نے بتایا کہ اس

خوشی کے موقع پر بلقیس چندروز کے لیے گوجرانوالہ جارہی ہے۔ وہ اپنے بہنوئی کے گھر میں رہے گی۔ یہ شادی خاموشی سے وہیں انجام پائے گی۔ بہنوئی اور بہن بلقیس کے رازدار ہیں۔ رونق نے بتایا کہ وہ خود بلقیس کے سرپرست کی حیثیت سے گوجرانوالہ جائے گا۔ نصراللہ اور بہنوئی سلیم دلہن کے گواہوں کی حیثیت سے شرکت کریں گے۔ میرے گواہوں میں تیمور اور شبیر ہوں گے۔

رونق کی باتوں سے ظاہر ہورہا تھا کہ اندرخانے بہت سا انتظام کرلیا گیا ہے لیکن میں اس سے پہلے ایک بار بلقیس سے مل کر تفصیلی بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "رونق بھائی! میں بلقیس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ "اب ایک ہی بار مل لینا۔"

میں نے کہا۔ "رونق بھائی! یہ سب کچھ بہت جلدی میں نہیں ہورہا؟"

"تم کیا شے ہو یار! جب دیر ہورہی تھی، تب بھی پریشان تھے۔ اب جلدی ہورہی ہے، تب بھی پریشان ہو۔ ایسے کاموں میں ایسے ہی ہوتا ہے یار۔ اب دیکھو نا، یہ ایک سنہری موقع ہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کہ بلقیس کو خالہ کے گھر جانا ہے۔ اگر اس موقع پر یہ کام ہوجائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی؟"

"کیا یہ تمہارا مشورہ تھا؟"

"نہیں۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جتنی بھی پلاننگ شلاننگ ہے خود بلقیس بیٹی ہی کی ہے۔ وہ اس سارے معاملے کی اونچ نیچ کو بڑی چنگی طرح سمجھ رہی ہے۔ آج سے پندرہ وی دن پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب کچھ ہوگا اور اس طرح ہوگا۔۔۔۔ میرے خیال میں بلقیس ان دنوں ہمت دکھا رہی ہے۔"

"میں نے ابھی تک بے بے جی اور عارفہ کو کچھ نہیں بتایا اور مجھے یہ بات اچھی نہیں لگ رہی۔"

"بلقیس نے آج خاص طور سے یہ بات کہی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ آج تم والدہ اور عارفہ سے بھی بات شات کرلو۔ بس یہ دھیان میں رہے کہ اس شادی کی خبر ہم کل سات بندوں کو ہونی ہے۔ چار گواہ، بلقیس کی بہن اور تمہاری بہن اور ماں جی۔ کسی آٹھویں بندے تک یہ بات نہیں پہنچنی چاہیے۔"

مجھے یہ سب بڑا عجیب لگ رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی اور بلقیس کی مجبوریوں کا بھی احساس تھا۔ شاید وہ جو کر رہی تھی اور جس طرح کر رہی تھی ٹھیک کر رہی تھی۔ ایک بار شادی ہو جاتی تو پھر بعد میں معاملات کو سنبھالا جا سکتا تھا مگر شادی سے پہلے پنڈورا باکس کھل جاتا تو شاید حالات بس سے باہر ہو جاتے۔

اس روز نہ صرف والدہ اور عارفہ سے اس بارے میں میری بات ہو گئی بلکہ میں نے شام سے پہلے بلقیس سے بھی ایک ملاقات کر لی۔ ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں جن میں ایک دو باتیں خاصی اہم تھیں۔

میں نے کہا۔ "بلقیس یہ تم ایک دم اس فیصلے پر کس طرح پہنچ گئیں؟"

وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر بولی۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"کیا جانتا ہوں؟"

"میں نے کسی بھی صورت تم کو یہاں سے جانے نہیں دینا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ضرورت۔۔۔۔ محبت سے آگے ہے؟"

"نہیں خاور! محبت آگے ہے اور اتنی آگے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ مگر میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ بہت زیادہ خوش۔"

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے بلقیس کہ میں۔۔۔۔ تم سے زبردستی کر رہا ہوں۔ بلیک میل کر رہا ہوں تمہیں۔"

"خدا کے لیے خاور۔۔۔۔ محبت کو اور محبت کے جواب کو اتنے گھٹیا نام نہ دو۔ اتنا عرصہ گزر گیا ہے، اب میں تمہارے دل میں دیکھ سکتی ہوں۔ وہاں سب کچھ صاف صاف نظر آ رہا ہے مجھے۔" وہ جذباتی انداز میں بولی۔

"لیکن۔۔۔۔ لیکن بلقیس! ایسا نہیں لگتا کہ یہ سب کچھ بہت جلدی میں ہو رہا ہے؟ کیا ہم اسے زیادہ بہتر طریقے سے نہیں کر سکتے تھے؟"

"نہیں خاور! جو میں دیکھ رہی ہوں شاید تم نہیں دیکھ رہے۔ اس جلدی میں ہی بہتری ہے۔ جو ہو رہا ہے اسے ہو جانے دو۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی گردن جھک گئی اور پھول دار شال نے پھسل کر گھونگھٹ سا بنا دیا۔

میں نے عمیق سانس لیتے ہوئے کہا۔ "چودھری یعقوب کو بھی کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں لیکن تم بے بے جی اور عارفہ کو ضرور بتا دینا۔"

"میں نے آج انہیں بتا دیا ہے۔"

"کیا کہا بے بے جی نے؟"

"کہا تو کچھ نہیں۔ بس ان کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے تھے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔"

بلقیس کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ جو کچھ ہو رہا تھا، بہت تیزی رفتاری سے ہو رہا تھا۔ اور پھر جیسے گرمی کی تپتی دوپہر اچانک کالی گھٹاؤں سے ڈھک جاتی ہے یا سرما کی ٹھٹھری ہوئی صبح کو یکا یک سنہری دھوپ کی سوغات مل جاتی ہے۔۔۔۔ یا پھر ویران شب و روز کو کسی رنگا رنگ تہوار کی آمد تہس نہس کر دیتی ہے۔۔۔۔ میری زندگی میں بھی وہ دن آ گیا جس کا گزر میرے خوبصورت سپنوں میں بھی نہیں ہوتا تھا۔

گوجرانوالہ کے نواح میں چودھری سلیم کا گھر ایک کنال کا تھا اور اس کے ساتھ ہی چھوٹا سا گودام تھا۔ گھر میں صرف دو ملازمائیں تھیں۔ انہیں چند روز کی چھٹی دے دی گئی تھی۔

پروگرام کے مطابق رونق علی، نصر اللہ، تیمور اور شبیر وغیرہ بڑی رازداری سے چودھری سلیم کے گھر پہنچ چکے تھے۔ پتا نہیں کیوں دل میں آخری وقت تک کچھ کھٹکا سا تھا کہ کچھ ہو

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

نہ جائے۔ کوئی عفریت ہماری اس خوشی کو ہڑپ نہ کر جائے۔ وہ خوشی جو ایک زمانے کے بعد اور ہزار زخموں کے صلے میں حاصل ہو رہی تھی۔ بے بے جی مسلسل مصلے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس وقت تک نہیں اٹھیں گی جب تک سب کچھ بہ خیریت انجام نہیں پا جائے۔ مولوی صاحب کی آمد بہت تاخیر سے ہوئی۔ آخر وہ عصر کی نماز کے بعد تشریف لائے۔ میں انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ دبلے پتلے سے تھے۔ عمر ساٹھ پینسٹھ سال ہو گی۔ ان کی وضع میں عجیب سی سادگی اور چہرے پر نورانیت تھی۔ بڑی دھیمی آواز میں بولتے تھے اور سحر سا طاری کر دیتے تھے۔ پتا چلا کہ مولانا یوسف نامی یہ بزرگ بلقیس کے والد کے دوست تھے اور ان کے پیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

اس گھر کی چار دیواری میں بڑی خاموشی سے میرا اور بلقیس کا نکاح ہو گیا۔ بلقیس ایک نئے لیکن سادہ لباس میں تھی۔ تیمور نے مجھے زبردستی گلاب کے پھولوں کا ایک ہار پہنا دیا تھا۔ مولانا یوسف نے اپنے ہاتھ سے مجھے تھوڑی سی خوشبو لگائی۔

بے بے جی نے ہماری دیر تک بلائیں لیں۔ اور ماتھے چومتی رہیں۔ بھائی سلیم نے اپنے گھر کی بالائی منزل ہمارے لئے مخصوص کر دی تھی۔ اس کے دو پورشن تھے۔ ایک پورشن میں بے

بے جی اور عارفہ کا قیام تھا۔ دوسرے میں میرا اور بلقیس کا۔ عروس کی شب کمرے میں ٹیوب لائیٹ کی روشنی تھی۔ میں نے پہلی بار بلقیس کو اپنی کلائی کا وہ زخم دکھایا جو قریباً آٹھ برس پہلے کی یادگار تھا۔ بلقیس کے لیے دل میں پیدا ہونے والے شدید رومانی خیالات سے خوفزدہ ہو کر میں نے خود کو لالٹین کی چمنی سے جلا لیا تھا کہ ان سوچوں کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دوں گا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے میری کلائی کو اپنی حنائی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

"میرے دیوانے پن کی ایک جھلک۔"

"کیسا دیوانہ پن؟"

قریب ہی ایک چھوٹا گول آئینہ پڑا تھا۔ میں نے وہ آئینہ اس کے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا دیوانہ پن!"

وہ سرخ ہو گئی اور ناراض نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے بانہوں میں بھر لیا اور اس کے بے مثال ہونٹوں پر اپنے پیار کی مہر ثبت کر دی۔ پھر میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ جلنے کا یہ زخم کب اور کیسے آیا تھا۔

"تم بڑے عجیب ہو خاور۔۔۔۔۔ آہستہ آہستہ تم نے مجھے بھی عجیب بنا دیا ہے۔ میں نے خود سے بڑے وعدے کیے ہوئے تھے۔ تم سے دور رہنے کی بڑی قسمیں کھائی ہوئی تھیں لیکن تم نے سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا خاور۔۔۔۔۔" اس نے تھکے تھکے انداز سے اپنا سر میرے شانے سے ٹکا دیا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں بلقیس! میں اس وقت خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا ہوں۔ تمہیں اس طرح بانہوں میں لیے لیے مجھے موت بھی آجائے تو ذرا پروا نہیں۔"

وہ اپنی تمام تر خوشبو اور گداز کے ساتھ میرے سینے میں جذب ہو گئی۔ سوئی سوئی آواز میں بولی۔ "آج مجھ سے ایک وعدہ کرو خاور! اس جاگیر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے، کتنی بڑی مشکلیں بھی کھڑی ہو جائیں، تم جاگیر کے۔۔۔۔۔ اور جاگیر والوں کے ساتھ رہو گے۔"

"ہاں، ایسا ہی ہو گا۔"

"وعدہ؟" وہ مجھ سے لپٹے ہوئے بولی۔

"ہاں وعدہ۔"

"پکا وعدہ؟"

"ہاں پکا وعدہ۔"

اس نے مجھ پر محبت کی بارش کر دی۔ اس کے دل گداز مسحور کن پیار نے مجھے ڈھانپ لیا۔ دو جسموں کے ملاپ میں اس کی وارفتگی بے مثل تھی۔ وہ جیسے ایک ہی وقت میں گھنگھور گھٹا بھی تھی اور ترسی ہوئی دراڑوں والی پیاسی دھرتی بھی۔ اس نے میرے ہوش اڑا دیے۔ اس ریشمی شب کے سناٹے میں اس ملگجے اندھیرے میں اس کی خودسپردگی نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ ہاں۔۔۔۔ میں نے یونہی تو نہیں چاہا تھا اسے۔۔۔۔۔ یونہی تو اس کے عشق میں ایک زمانہ نہیں بتا دیا تھا۔ کوئی بات تھی اس میں۔۔۔۔۔ کچھ سب سے جدا تھا۔ جب میں اس کے بالکل قریب تھا اور اس کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرے ذہن میں والی جی کا خیال آ گیا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ والی جی نے ایک مرد کی حیثیت سے بلقیس کی قرار واقعی قدر نہیں کی یا شاید وہ قدر کرنے کے دور ہی سے گزر چکے تھے۔

اس شب جب میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تھا اور ایک خوشبودار ریشم میں ڈوبتا اور دھنستا چلا جا رہا تھا، میری نگاہ اندھیرے میں چمکنے والے ایک روشن نقطے پر پڑی۔ یہ کیا تھا؟ یہ

وہی لشکارے مارتا ہوا کوکا تھا جو محبت کے اس سفر میں پل پل میرے ساتھ رہا تھا۔ جو مجھ سے اشاروں کنائیوں کی زبان میں باتیں کرتا تھا۔ حالات کیسے بھی ہوں، سفر جاری رکھنا۔ کیونکہ سفر شرط ہے اور اسی سے منزل کی امید بھی وابستہ ہے۔ میں نے اس روشن نقطے پر اپنے جلتے ہونٹ رکھ دیے۔

وہ چار پانچ دن بڑے یادگار تھے۔ یوں لگتا تھا کہ دنیا جہان کی مسرتیں اس چار دیواری میں سمٹ آئی ہیں جہاں میں، بلقیس، بے بے جی اور عارفہ رہ رہے ہیں۔ رونق علی، نصراللہ اور تیمور وغیرہ جیسے خاموشی سے آئے تھے ایسے ہی راجوال واپس جا چکے تھے۔ مولوی یوسف صاحب دو دن ہمارے ساتھ رہے پھر وہ بھی چلے گئے۔ ان کی شخصیت میں عجیب سا سحر تھا۔ بندہ جتنی دیر ان کے قریب موجود رہتا تھا، لگتا تھا کہ کسی محفوظ اور سکون بخش حصار کے اندر ہے۔ وہ بلقیس کو بڑی محبت سے پتری کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

بلقیس اب کوئی لڑکی نہیں تھی۔ اس کی عمر تقریباً 32 سال ہو چکی تھی تاہم وہ اپنی عمر سے کم از کم چار پانچ سال چھوٹی نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دل کش چہرے اور بھرپور جسم والی جواں سال عورت کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ میری عمر بھی تقریباً اتنی ہی تھی یا شاید ایک

آدھ سال زیادہ ہو۔ شادی کے بعد میں نے ایک بات فوراً محسوس کی۔ بلقیس نے گہری سنجیدگی اور قنوطیت کے جس خول میں اپنی شگفتگی کو چھپا رکھا تھا، وہ اس نے توڑ کر ایک طرف رکھ دیا۔ اس خول کے اندر سے وہی خوش گفتار، خوش گلو اور ہفت رنگ بلقیس بر آمد ہوئی جس کو میں نے کبھی دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میری ہر پیاس کو سیراب کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک پیاس اس کی آواز کی بھی تھی۔ ایک ایسا دور بھی تو آیا تھا جب سرما کی طویل راتوں میں اس نے مجھے انٹر کام پر گیت سنائے تھے۔

اب وہ سب کچھ دہرانے کی رت تھی۔ ایک شب میں نے اس کی آغوش میں سر رکھتے ہوئے کہا۔ "ہیلو۔۔۔۔ ہیلو آواز آ رہی ہے؟"

"ہاں، آ رہی ہے۔" وہ شرمیلے انداز میں مسکرائی۔

"کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔ حالانکہ وہ میرے پاس موجود تھی۔

"بستر پر بیٹھی ہوں۔"

"کیا کر رہی ہو؟"

"ایک شرارتی بچے کو سلانے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں۔ اس نے اپنا سر میری گود میں رکھا ہوا ہے۔"

"ابھی تو آدھی رات بھی نہیں ہوئی۔ ابھی سے سلانے کی کوشش شروع کر دی۔"

"وہ تو سویرے دس بجے تک سویا پڑا رہے گا۔ مجھے اٹھنا ہے، نماز پڑھنی ہے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "اچھا، اب میرے بارے میں پوچھو نا۔۔۔۔ کہ میں کیا کر رہا ہوں۔"

"ہاں جی، کیا کر رہے ہو؟" وہ شرمائی اور کھیلنے والے انداز میں بولی۔

"ایک نہایت کنجوس دلہن کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا ہوں۔"

"کنجوس۔۔۔۔ میں نے کیا کنجوسی کی ہے؟" اس نے میری ٹھوڑی کو پکڑا اور ذرا سا جھنجوڑا۔

"اتنی اچھی آواز دی ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں۔ اس میں سے ذرا سی بھی خرچ نہیں کرتی ہو۔ حتیٰ کہ اپنے بے چارے شوہر پر بھی نہیں۔"

"کیا کروں؟" وہ ناک میں گنگنائی۔

"کوئی اچھا سا گیت جو دل کے تاروں کو پھر سے چھیڑ دے۔"

"نہیں خاور! ماں جی اور عارفہ تک آواز چلی جائے گی۔"

"وہ ہماری طرح نہیں۔ وہ سو رہی ہو گی۔" میں نے تسلی دی۔

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہی۔ پھر کھنکھاری اور گلا صاف کرنے لگی۔ خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے میں اسے دشواری ہو رہی تھی۔

"چلو۔۔۔۔ شروع ہو جاؤ۔" میں نے تحکم سے کہا۔

چند لمحے بعد اس کی دلنواز آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ وہی آواز جس میں کھیتوں کی ہریالی، پرندوں کی چہچہاہٹ، ہواؤں کی سرسراہٹ اور چرغے کی کوک۔۔۔۔ سبھی کچھ شامل تھا۔

اس نے ہیر کے چند بند سنائے۔ آواز کم رکھنے کے لیے وہ گلے کے اندر گا رہی تھی۔ اس طرح گانے سے آواز کی دل کشی پوری طرح سامنے نہیں آتی۔ مگر یہ اس کا کمال تھا کہ میں پھر بھی مسحور ہو گیا۔ آخر میں وہ حسبِ عادت بولی۔

"بس؟"

گئے دنوں میں جب وہ ادا سے "بس" کہا کرتی تھی جی چاہتا تھا کہ اسے بے تحاشا پیار کروں۔ تب میں صرف سوچ سکتا تھا لیکن اب میں سوچ سے آگے بھی جا سکتا تھا۔ میں نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ اس کی چوڑیوں کی چھن چھن اور مدھم ہنسی کی کھن کھن کانوں میں گونجنے لگی۔

"تم "بس" کیوں کہتی ہو؟"

"پوچھتی ہوں کہ کہیں تم اوازار (بور) تو نہیں ہو گئے۔"

"تم صبح تک بھی گاتی رہو تو میں اسی شوق سے سنتا رہوں گا۔"

"صبح تک؟ دیکھ لو۔۔۔۔ کہیں مکر نہ جانا۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

"تم بڑی تیز ہو۔" میں نے اسے باہوں کے حصار میں لے لیا۔

وہ میرے اندر گم ہو گئی۔ اس کیفیت میں اس کے ہاتھ اور ہونٹ بڑی محبت سے میرے شانوں کو چھونے لگتے تھے۔

میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ مجھ سے بھی زیادہ میرے کندھوں پر پیار آ رہا ہے تمہیں؟"

"ہوں۔" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔

"کیوں؟"

"ان کندھوں نے پوری جاگیر کا بوجھ جو اٹھایا ہوا ہے۔" وہ عجب رسان سے کہہ گئی۔

"کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا بلقیس۔۔۔۔ یہ قدر ہی ہے جو کسی سے کوئی کام لیتی ہے، کسی سے کوئی۔ اور میں تو بڑا کمزور بندہ ہوں۔ کبھی کبھی اپنا بوجھ بھی زیادہ لگنے لگتا ہے۔"

"نہیں خاور! میں جانتی ہوں کہ تم کتنی بھاری ذمے داریاں نبھا رہے ہو۔ یقین کرو۔"

"نہیں کرتا یقین۔" میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

وہ ہنسنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ اسی کا انداز تھا جو آج میں نے اپنایا تھا۔ کمرے کے دریچوں سے باہر چاند مغرب کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ مدھم ہوا نے شبنم آلود پھولوں کے منہ چومنا شروع کر دیتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی باہوں میں تھے۔

مجھے بے بے جی اور عارفہ کے ساتھ پانچ روز بعد راجوال واپس چلے جانا تھا۔ بلقیس کو تین دن بعد آنا تھا لیکن پھر پروگرام بدل گیا۔ بلقیس نے یہاں اپنا قیام تھوڑا سا بڑھا دیا۔ وہ خالدہ کی ایک نند کی منگنی میں شرکت کرنا چاہتی تھی۔ یوں مجھے اور بلقس کو ساتھ رہنے کے لیے چند دن اور مل گئے۔

قریباً دس دن بعد جب میں نے والدہ اور عارفہ کے ساتھ راجوال واپس روانہ ہونا تھا۔ دل پر ایک دم بوجھ سا پڑ گیا۔ بلقیس نے میرے کملائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"

"سوچ رہا ہوں، اب کب ملیں گے؟"

"کیوں ابھی دل بھرا نہیں؟" وہ مسکرائی۔ "تم تو کہا کرتے تھے، بس ایک بار ہم جی بھر کر ایک دوسرے سے مل لیں پھر پوری زندگی کا سفر بھی خوشی سے کاٹ سکتا ہوں اور اب تو ایک بار نہیں ملے، کئی بار ملے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پر۔۔۔۔ تمہاری طلب اور بڑھ گئی ہے۔"

"لیکن اب تو کچھ دن دور رہنا پڑے گا۔"

"کتنے دن؟"

اس نے آہ بھری۔ "پتا نہیں۔"

"میرے خیال میں تو تم سب سے پہلے بڑے ماموں یعقوب سے بات کرنا۔ شادی کی خبر سنائے بغیر انہیں ٹٹولنے کی کوشش کرو۔ پتا چل جائے گا کہ وہ کس طرح کا رویہ دکھاتے ہیں۔ اس کے بعد۔۔۔۔"

"تم پریشان نہ ہو خاور! میں نے سب سوچ رکھا ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن اندازاً کتنے دن لگ جائیں گے؟"

"مہینا ڈیڑھ مہینا۔۔۔۔ یا شاید اس سے تھوڑا زیادہ۔"

"اور اگر بات بگڑتی نظر آئی تو؟"

"پھر سوچ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔" وہ کھوئی کھوئی سی میرے کندھے سے لگ کر بولی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اگلے روز میں، والدہ اور عارفہ کو لے کر راجوال واپس آگیا۔ بلقیس کی واپسی تین روز بعد ہوئی۔ ہم روانہ بھی اسی وقفے سے ہوئے تھے۔ بلقیس کو رونق علی لے کر آیا۔ ساتھ محافظوں کا دستہ تھا۔ آج کل ایس پی امتیاز کی طرف سے حویلی کو پولیس گارڈ بھی ملے ہوئے تھے۔

بلقیس نے مجھے مکمل طور پر خاموش رہنے کو کہا تھا۔ میں خاموش رہا اور وقت کا انتظار کرتا رہا۔ ہم حویلی کے مہمان خانے میں قیام پذیر تھے لیکن ایک ہی چار دیواری میں ہوتے ہوئے بالکل اجنبیوں کی طرح تھے۔ ملاقات بھی نہیں تھی۔

مجھے لگتا تھا کہ یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے یا شاید یہ میرا وہم تھا۔ بہر حال، میں اپنے طور پر منصوبہ بندی بھی کر رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر مقامی چودھریوں کی طرف سے اس شادی پر شدید رد عمل ظاہر ہوا تو یہ جاگیر کے عام لوگ ہی ہیں جو میری حمایت میں آواز اٹھائیں گے۔ وہ کہاں تک میرا ساتھ دے پائیں گے، یہ ایک علیحدہ بات تھی۔ اَن جانے اندیشے ہر وقت میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ بے بے جی اور عارفہ بھی فکر مند رہتی تھیں۔ تیمور، رونق اور میں اکثر اس معاملے میں صلاح مشورہ کرتے تھے۔

اسی طرح تقریباً ڈیڑھ مہینا گزرا اور پھر۔۔۔۔۔میری زندگی کا اہم ترین واقعہ ہوا۔ وہ اپریل کی بیس تاریخ تھی۔ صبح نو بجے کا وقت تھا۔ یہ سب کچھ میری ڈائری میں درج تھا۔ ایک ملازمہ حویلی کے اس پورشن میں آئی جہاں ہم رہ رہے تھے۔ اس نے بے بے جی سے پوچھا کہ بیگم جی ادھر تو نہیں آئیں؟

بے بے جی نے نفی میں سر ہلایا۔ ملازمہ پریشان تھی۔ اس نے بتایا۔ "بیگم جی اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ آلے دوالے بھی نہیں ہیں۔ انہیں کس نے حویلی سے نکلتے بھی نہیں دیکھا۔"

ایک دم ہلچل سی مچ گئی۔ ملازمین بھاگ دوڑ کرتے نظر آئے۔ میں نے چودھری یعقوب اور چودھری جمشید کو پریشانی کے عالم میں بڑے گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ یہی وقت تھا جب عارفہ کچھ پریشان سی میرے پاس آئی۔ وہ دو تین دن سے بچے سمیت بلقیس کی طرف تھی اور وہیں سو رہی تھی۔ "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ لفافہ میرے تکیے پر رکھا ہوا تھا۔ لگتا ہے کہ آپا بلقیس نے رکھا ہے۔"

لفافہ بند تھا۔ اوپر لکھا تھا شاہ خاور کے لیے!

میں نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ اندر چند صفحات پر مشتمل ایک خط تھا۔ میں دیکھتے ہی جان گیا کہ یہ بلقیس کی تحریر ہے۔ میں وہیں کھڑے کھڑے پڑھنے لگا۔ میں جوں جوں پڑھتا گیا۔ میرے ارد گرد دھند سی پھیلتی گئی۔ مجھے اپنے ارد گرد کی اشیاء گھومتی اور چکراتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ مجھے لگا کہ میں لڑکھڑا جاؤں گا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ نظریں بدستور بلقیس کے خط پر تھیں۔ مضمون کچھ اس طرح تھا۔

"خاور! ان سطروں کو حوصلے سے پڑھنا اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا۔ مجھے امید ہے کہ جب تم ٹھنڈے دل سے سوچو گے تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے جو کیا ہے، غلط نہیں کیا۔ خاور! مجھے پتا ہے کہ تم نے پچھلے ڈیڑھ دو مہینے سخت انتظار میں گزارے ہیں۔ تم چاہتے تھے کہ ہماری شادی کا جلد از جلد اعلان ہو اور ہم عام میاں بیوی کی طرح اکٹھے رہ سکیں۔ تمہارا خیال تھا کہ میں اپنے طور پر اپنے بڑوں کو منانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ شاید تمہیں یہ سن کر افسوس ہو کہ میں نے ایسی کوئی کوشش کی ہی نہیں۔ مجھے پہلے دن سے پتا تھا کہ ایسا نہیں ہونا اور نہ ہو سکتا ہے۔ خاور! اپنے خاندان کے بارے میں، جتنا میں جانتی ہوں، تم نہیں جان سکتے۔ بہت سی باتوں کا تمہیں پتا ہو گا لیکن بہت سی باتوں کا نہیں پتا ہو گا۔ یہ بڑے

ضدی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں خاور! انہیں تمہاری اور میری شادی کسی طور قبول ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ان کے سینوں پر تو اس وجہ سے سانپ لوٹتے رہتے ہیں کہ تم حویلی کے مہمان خانے میں رہتے ہو۔ یہ ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں جو میں تم تک پہنچانا نہیں چاہتی کیونکہ اس سے دل دکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا۔

"ڈھائی تین ماہ پہلے جب تم نے مجھ سے جاگیر چھوڑ جانے کی بات کی تھی تو میرے سر پر جیسے پہاڑ ٹوٹا تھا۔ میں مسلسل سوچتی رہی۔ میرے سامنے تین راستے تھے۔ پہلا یہ کہ میں تمہاری بات نہ مانوں۔ اگر میں نہ مانتی تو مجھے پتا تھا کہ تم نے چلے جانا تھا۔۔۔۔ کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھنا تھا۔ بے شک! اپنے طور پر تم بڑے مضبوط انتظام کر کے جا رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ سب کچھ چند مہینوں یا ایک آدھ سال کے اندر ختم ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ تمہارے بغیر چل ہی نہیں سکتا تھا۔

"دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں تمہاری بات مان لوں۔ ہم دونوں شادی کر لیں۔ یقین کرو خاور! تمہارے ساتھ کا خیال میرے لیے اتنا پیارا ہے کہ۔۔۔۔ مجھ جیسی ان پڑھ اسے لفظوں میں بتا نہیں سکتی۔ تمہارے ساتھ کے چند منٹوں کے لیے میں اپنی پوری حیاتی قربان کر سکتی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہوں۔ پر میں جانتی تھی کہ یہ شادی کیا طوفان مچائے گی۔ اور طوفان ہی نہیں مچنا تھا، میرے ساتھ ساتھ تمہاری زندگی بھی سخت خطرے میں آجانی تھی۔ ایک تو میری دوسری شادی اور وہ بھی برادری سے باہر۔ یہ کسی کو قبول نہیں ہونی تھی۔ اس بارے میں والی جی نے جو کہا بالکل ٹھیک کہا تھا۔

"تیسرا راستہ میرے پاس یہ تھا کہ میں ہی چپ چاپ کہیں کنارہ کر لوں۔ سب کچھ چھوڑ کر چلی جاؤں اور جاتے جاتے تمہیں یہاں رہنے کا پابند کر جاؤں۔ میں نے سوچا، جب میں تمہیں آس پاس نظر ہی نہیں آؤں گی تو پھر تمہارا دل بھی نہیں دکھے گا۔ پاس رہتے ہوئے بھی دور رہنے کا خیال تمہیں تکلیف نہیں پہنچائے گا۔۔۔۔ اور آخر میں نے یہی تیسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جب میں نے ذرا گہرائی میں جا کر سوچا تو مجھے لگا کہ میں تم سے اس طرح اچانک منہ موڑ کر تو جا بھی نہیں سکتی۔ اگر چلی گئی تو ساری زندگی تم کو "نہ ملنے" کا دکھ دیتی رہوں گی اور خود کو بھی کوستی رہوں گی۔ مجھے لگا کہ میں کئی سال سے تمہاری ڈالی ہوئی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں، جب تک تم خود ان زنجیروں کو ڈھیلا نہیں کرو گے، میں یہاں سے ہل نہیں سکوں گی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا جو پہلے ماموں رونق کے اور پھر تمہارے

سامنے آیا۔ بعد میں، میں نے اپنے طریقے سے خالدہ اور سلیم وغیرہ کو بھی اس فیصلے کے بارے میں بتایا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میرا یہ فیصلہ بالکل صحیح ہے۔ اس میں کئی غلطیاں بھی ہوں گی۔۔۔۔ بلکہ غلطیاں ہیں۔۔۔۔ لیکن خاور! اگر تمہیں میری کچھ اچھی باتیں یاد ہیں تو خدا کے لیے ان باتوں کے صدقے میری یہ غلطیاں معاف کر دینا۔

"میں آج یہاں سے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں خاور! حامد بھی میرے ساتھ جائے گا۔ یہ سطریں لکھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں۔۔۔۔ اس وقت ہاتھ جوڑ کر تم سے ایک ہی بات کہنی ہے خاور! تمہارے سر پر اب "بڑے رکھوالے کی پگ" ہے۔ تم اس جاگیر کو چھوڑ کر نہ جانا۔ یہاں کے لوگوں کی ہر بھلائی اب تمہارے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ وہ تمہیں دیکھ دیکھ کر زندہ ہیں۔ تم انہیں زندگی سے دور نہ کرنا۔ اگر تم جاگیر کو اور یہاں کے لوگوں کو خوش رکھو گے تو میں بھی جہاں ہوں گی، خوش رہوں گی۔ یقین رکھنا خاور۔ یہاں کے لوگوں کی خوشی مجھ تک ضرور پہنچے گی اور شاید اللہ بخشے والی جی تک بھی۔۔۔۔!

"ایک بات اور تم سے کہنی تھی۔ اگر تم اس وقت میرے سامنے ہوتے تو شاید میں یہ بات تمہارے قدموں میں سر رکھ کر کہتی۔ اب یہی سمجھ لو کہ میرا سر تمہارے قدموں میں ہے۔

خاور! مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔ کیونکہ میں اب ملوں گی نہیں۔ کروڑوں انسانوں کے اس ملک میں، میں کسی نامعلوم بستی کی نامعلوم چار دیواری کے اندر اپنی زندگی گزارنے والی ہوں۔ میرے ساتھ میرا ایک بزرگ سرپرست بھی ہے۔ اس لیے تمہیں کبھی کسی بھی طرح سے میرے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔

"ہاں خاور! میری تم سے منت ہے کہ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش میں اپنا وقت خراب نہ کرنا۔ کیونکہ بالفرض محال، فرض محال اگر میں کبھی مل بھی گئی تو مجھے تمہاری دنیا میں واپس نہیں آنا ہے۔ باقی میری طرف سے تم مکمل آزاد ہو خاور! اگر چاہو تو اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کر لینا۔ ایک ایسی بیوی جو جاگیر کے کاموں میں تمہارا ساتھ بھی دے سکے۔ مگر یہاں پھر ذات برادری کا چکر ہو گا۔ کوشش کرنا کہ اس بار لڑکی تمہاری اپنی برادری کی ہو۔

"اللہ بخشے بھائیا عزیز والی زمین میں اس کے وارثوں کو واپس کر رہی ہوں۔ یہ انہی کا حق ہے۔ میں نے کاغذوں پر انگوٹھے دستخط کر دیے ہیں۔ لیکن جو زمینیں میرے نام ہیں ان میں سے تقریباً آدھی کے کاغذات میں نے تمہارے نام لکھوائے ہیں۔ تمہارے پاس اپنی زمین بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جاگیر میں تمہاری حیثیت اب اور مضبوط ہو جائے گی۔ اپنی باقی کی

آدھی زمین میں سے کچھ رقبہ میں نے عید گاہ کے لیے اور کچھ جھونپڑا بستی کے لوگوں کے لیے چھوڑا ہے۔ باقی زمین وراثت میں جائے گی۔ پچھلے ڈیڑھ دو ماہ میں، میں یہی کام کراتی رہی ہوں۔"

اپنی اس تحریر میں بلقیس اپنے ملازموں، غریب رشتہ داروں اور ان بے شمار بے آسرا لڑکیوں کو بھی نہیں بھولی تھی جن کی شادیاں، اگر وہ یہاں ہوتی تو اس نے کرانی تھیں۔ اس نے ان سب کے لیے کچھ نہ کچھ چھوڑا تھا۔

خط کے آخری الفاظ یہ تھے۔۔۔۔ اب تم سے اجازت لینی ہے خاور! آخری بار تمہیں دیکھنے اور چھونے کو دل چاہتا ہے، پھر ڈرتی ہوں کہ جس دل کو بڑی مشکلوں سے سنبھالا ہوا ہے، کہیں تمہیں دیکھ کر کمزور نہ پڑ جائے۔ اب میں آگے دیکھ رہی ہوں۔ بچپن میں سنتے تھے کہ جو آگے دیکھتے ہیں انہیں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے، نہیں تو پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ میں بھی کہیں پتھر کی نہ ہو جاؤں۔ مجھے جانے دو خاور۔۔۔۔ مجھے اب جانے دو۔ اللہ تمہاری مدد کرے، اللہ ہمیشہ تمہارا نگہبان ہو۔۔۔۔

تمہاری مجبور شریکِ حیات، بلقیس خاور!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بلقیس کا یوں چلے جانا میرے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ وہ ایک خط چودھری یعقوب کے نام بھی چھوڑ گئی تھی۔ اس خط کے سارے مندرجات تو مجھے معلوم نہ ہو سکے تاہم اس خط میں اس نے اپنے لواحقین سے باہمی اتفاق اور اتحاد برقرار رکھنے کی التجا کی تھی۔ اس کے علاوہ جاگیر کے انتظامی کاموں کے حوالے سے باتیں لکھی تھیں۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے یہ سب کچھ چھوڑ کر جا رہی ہے اور اپنے اس فیصلے سے بہت مطمئن ہے۔

بلقیس نے بہت اصرار کے ساتھ مجھے لکھا تھا کہ میں اسے تلاش نہ کروں۔ لیکن میرے لیے ایسا کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں نے اگلے تقریباً چار ماہ میں سر توڑ کوششیں کیں۔ جہاں جہاں اس کا کھوج مل سکتا تھا، میں وہاں پہنچا۔ جہاں خود نہ جا سکا، وہاں ہرکارے دوڑائے۔۔۔۔ نصر اللہ کا تو ڈیوٹی پر رہنا ضروری تھا مگر میرے باقی ساتھی رونق علی، تیمور، شبیر اور فیاض میواتی وغیرہ دن رات تلاش کے کام میں مصروف تھے۔

اپنے جانے سے کچھ ہفتے پہلے بلقیس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ حامد کو اس کی پھوپی کے پاس گجرات بھیج چکی ہے تاکہ وہ یہاں کے حالات سے دور رہے۔ بلقیس کی تلاش کے سلسلے میں، میں سب سے پہلے گجرات کے اس گاؤں میں ہی پہنچا تھا۔ وہاں جا کر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ حامد اپنی بڑی پھوپی کے پاس آیا ہی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بلقیس نے یہ بات بھی مجھ سے چھپائی تھی۔ یوں لگا تھا کہ اس نے پیش آنے والے حالات کے تیور پہلے ہی بھانپ لیے تھے اور شاید لاشعوری طور پر کچھ قدم بھی اٹھا لیے تھے۔ اس نے حامد کو پہلے ہی اس نامعلوم جگہ کی طرف روانہ کر دیا تھا جہاں وہ خود جانا چاہتی تھی۔۔۔۔ یا پھر اس نے وقتی طور پر اسے کہیں اور رکھا تھا اور بعد میں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ہم بلقیس کی تلاش کے سلسلے میں اس کے دور دراز کے رشتے داروں تک بھی پہنچے مگر اس کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ تلاش کا کام میں ہی نہیں، بلقیس کے بھائی اور ماموں وغیرہ بھی پوری شدت سے کر رہے تھے مگر کسی کے حصے میں بھی ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں آیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں ایک دن بلقیس کا آخری خط تیمور کے سامنے کھولے بیٹھا تھا۔ میں نے کہا۔ "یار تیمور! بلقیس نے یہاں ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ اکیلی نہیں۔ ایک بزرگ سرپرست بھی اس کے ساتھ ہیں۔ یہ کون ہو سکتے ہیں؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کہیں یہ وہ مولوی یوسف صاحب تو نہیں جنہوں نے ہمارا نکاح پڑھایا تھا؟"

تیمور کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "ہاں، ایسا ہو بھی سکتا ہے۔"

ہم دونوں ایک سیکنڈ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند ہی منٹ بعد ہماری جیپ طوفانی رفتار سے گوجرانوالہ کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ گوجرانوالہ پہنچنے کے بعد مولوی یوسف صاحب کا ٹھکانا ڈھونڈنے میں ہمیں دو گھنٹے کے قریب لگے۔ یہ ان کے ایک مرید کا گھر تھا لیکن یہ بھی کوئی مستقل ٹھکانا نہیں تھا۔ دراصل مولوی یوسف صاحب کا کوئی مستقل ٹھکانا تھا ہی نہیں۔ وہ اکثر سفر میں ہی رہتے تھے۔ اس صورتِ حال نے ہمارا کام اور مشکل کر دیا مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ اگلے تین چار ہفتے میں ہم نے ان محترم بزرگ کے ہر ممکنہ ٹھکانے تک رسائی حاصل کی مگر یہ سب کچھ بھی بے سود رہا۔ انہی دنوں شاہنواز بھی اسپتال

میں اپنی زندگی کی بازی ہار گیا۔ قبرستان والے واقعے میں اسے کئی گولیاں لگی تھیں۔ وہ کئی ماہ تک اسپتال میں اپنی زندگی کی جنگ لڑتا رہا تھا۔ اس بے لوث مددگار کی موت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، بلقیس کی تلاش کی رفتار کم پڑتی گئی۔ اس کی یادیں مدھم پڑنے لگیں۔ یہی دستورِ زمانہ ہے لیکن دل کی دنیا کے دستور علیحدہ ہوتے ہیں۔ میری آنکھیں اب بھی ہر گھڑی اس کی اور حامد کی متلاشی تھیں۔ ہر صبح آس بندھتی، ہر شام ٹوٹ جاتی۔ مجھے جاگیر کے کاموں کے لیے بھی کافی وقت دینا پڑتا تھا مگر جونہی مجھے ذرا فرصت ملتی تو اس کی تلاش کے کام میں جت جاتا۔ بے بے جی تعویذ اور دم درود پر بھی بہت اعتماد رکھتی تھیں۔ وہ کبھی میرے اور کبھی تیمور کے ساتھ دور دراز کے عاملوں تک پہنچتیں اور مشکل کشائی کی کوششیں کرتیں۔

شروع شروع میں کچھ لوگوں نے مجھ پر بھی انگلیاں اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ مجھے بلقیس کی گمشدگی میں ملوث کرنا چاہ رہے تھے مگر جلدی بدنیتی سے اڑایا ہوا یہ غبار بیٹھ گیا۔ کچھ بھی ہے، سچ کی اپنی تاثیر ہوتی ہے اور پھر بلقیس نے حویلی کے وکیل اقبال راٹھور کی مدد سے

پراپرٹی کے جو انتظامات کروائے تھے اور خط کی شکل میں جو تفصیلی تحریر چھوڑی تھی، انہوں نے شبہات کی گنجائش کم ہی رہنے دی تھی۔ جاگیر کے عام لوگ اس بات پر ششدر تھے کہ ان کی بیگم جی اچانک اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے بچے کے ساتھ کس طرف کا رخ کر گئی ہے؟ اس بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی جاتی تھیں۔ ایک قیاس آرائی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی قریبی رشتے داروں کے لالچی رویے سے بددل ہوگئی تھی۔ گوجرانوالہ کے مولوی یوسف صاحب بھی دوبارہ کسی کو نظر نہیں آئے۔ اس لیے میرا یہ خیال تقویت پکڑ چکا تھا کہ اپنے خط میں بلقیس نے جس محترم بزرگ کا ذکر کیا، وہ مولوی یوسف ہی تھے۔

بلقیس کی اور میری شادی کا علم کل سات افراد کو تھا۔ ان ساتوں افراد نے اپنی زبانوں کو بالکل بند کر لیا تھا۔ کسی کو بھنک تک نہیں پڑنے دی تھی۔ اس کے باوجود لمبڑ برادری کے کچھ لوگوں نے خیال آرائی کی کہ شاہ خاور بیگم سے شادی کر چکا تھا۔ بہر حال، اس بات کا چونکہ کوئی ثبوت نہیں تھا، اس لیے یہ بات زور نہیں پکڑ سکی۔

میں چاہتا تو مجھے جاگیر میں سب سے بااختیار حیثیت حاصل ہو جاتی۔ مگر میں نے چودھری یعقوب اور والی جی کے چاچا زاد چودھری فراست کو کارِ مختار بنایا۔ ایک طرح سے وہ دونوں

مشترکہ طور پر جاگیر کا کام چلانے لگے مگر ایسا بہت تھوڑے عرصے کے لیے ہی ہو سکا۔ چند ماہ کے اندر اندر ان لوگوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے یہ لڑائی بڑھتی چلی گئی اور خطرہ پیدا ہوا کہ موکھل جو اب تک پوری طرح دبے ہوئے تھے، ایک بار پھر سر اٹھانا شروع کر دیں گے۔ جب حالات بہت بگڑ گئے تو راجوال کے چند بزرگ چودھریوں اور زمینداروں کے مشورے سے میں نے کارِ مختار کی کرسی خود سنبھال لی اور والی جی کی پہلی بیوی کے بیٹے کو جو قریبی قصبے میں چاولوں کا کام کرتا تھا، کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا کہ وہ میرے ساتھ مل کر جاگیر اور جاگیر کی زمینوں کا کام چلائے۔

آئندہ ایک دو سالوں کے اندر یہ تبدیلی بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ جاگیر کی زمینیں اور اس سے ملحقہ علاقہ بڑا زرخیز تھا۔ حالات ٹھیک ہوئے تو خوش حالی نظر آنے لگی۔ سب سے پہلے بجلی ہمارے ہی علاقے میں پہنچی۔ پھر سڑک کے لیے کوششیں شروع ہو گئیں۔ چھوٹے سے شفاخانے کو اسپتال کی شکل دے دی گئی۔ ان تبدیلیوں کے بعد موکھلوں نے بہتر سمجھا کہ وہ دشمنی کے بجائے ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور جو سہولتیں علاقے میں پہنچ رہی ہیں، ان میں سے اپنا حصہ حاصل کریں۔

ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن دوسری طرف بلقیس کی یادیں پل پل میرے ساتھ چل رہی تھیں۔ اسے جاگیر چھوڑے اب چار سال ہونے کو آئے تھے۔ کبھی کبھی میں تنہا بیٹھتا اور اپنی کامیابیوں پر نظر دوڑاتا تو دل میں امید سی پیدا ہونے لگتی۔ میں سوچتا کہ بلقیس جو کام میرے ذمے لگا گئی تھی، وہ میں بہ احسن طریق کر رہا ہوں۔ کیا پتا کہ وہ میری ان کامیابیوں سے آگاہ ہو۔ میری اس انتھک محنت کے صلے میں وہ میری منتظر آنکھوں کا انتظار ختم کر دے۔ کسی شام جب راجوال کے گھروں میں کھڑکیاں روشن ہو رہی ہوں وہ چپکے سے واپس آ جائے۔ عقب سے میرے گلے میں بانہیں ڈال دے اور سسک کر کہے۔

"تمہارا امتحان ختم ہو گیا خاور۔۔۔۔۔ میں اب تم سے اور دور نہیں رہ سکتی۔"

لیکن شامیں آتی رہیں، کھڑکیاں روشن ہوتی رہیں، آس کے دیے جلتے اور بجھتے رہے۔۔۔۔۔ کسی نے عقب سے میرے گلے میں بانہیں نہیں ڈالیں۔ بھیگی ہوئی آواز میں یہ نہیں کہا۔
تمہارا امتحان ختم ہو گیا خاور!

پھر کبھی کبھی جب دل کو کچھ قرار ہوتا، مجھے بلقیس کی ایک بات یاد آتی۔ شادی کے بعد جب گوجرانوالہ سے راجوال واپس آتے ہوئے میں اداس ہو گیا تھا اور میں نے بلقیس سے پوچھا

تھا،اب کب ملیں گے ؟اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔"کیوں۔۔۔۔۔ابھی دل بھرا نہیں ؟تم تو کہا کرتے تھے بس ایک بار ہم جی بھر کر ایک دوسرے سے مل لیں، پھر میں پوری زندگی کا سفر بھی خوشی سے کاٹ سکتا ہوں۔۔۔۔۔اور اب تو ایک بار نہیں، کئی بار ملے ہیں۔"

میں اس انداز سے سوچتا تو خود کو نا شکرا محسوس کرنے لگتا۔میں نے کہیں مشہور فلاسفر شیلے کا ایک قول پڑھا تھا۔"محبت کا ایک گھنٹا سو برس کی بے محبت زندگی سے بہتر ہے۔"
اور واقعی ایک دور ایسا تھا جب میں بلقیس سے صرف ایک بھرپور ملاقات کے عوض اپنی ساری زندگی بہ خوشی لٹا سکتا تھا۔اور اس نے ایک نہیں، کئی حسین ملاقاتیں میری جھولی میں ڈالی تھیں۔دس دن یعنی 240 گھنٹے اور ہزاروں منٹ۔وہ ایک ایک پل اس کی محبت سے معمور تھا۔ان دس دنوں میں شاید میں نے دس صدیوں کی زندگی جی لی تھی۔اب اور کچھ نہیں تھا لیکن ان دنوں کی حسین و جمیل یادیں تو میرے پاس تھیں۔وہ یادیں میرے لیے زندگی کا قیمتی ترین سرمایہ تھیں۔اس بارے میں سوچتے ہوئے مجھے یہ بھی یاد آتا تھا کہ شادی کے بعد گوجرانوالہ میں ہمارے قیام کا پروگرام پانچ دن تھا مگر بعد میں بلقیس نے کسی طرح

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

قیام میں پانچ دن کا اضافہ کر لیا تھا۔یقیناً وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کرنے والی ہے اس لیے زیادہ سے زیادہ وقت میرے پاس گزار لینا چاہتی تھی۔

اگلے ایک دو سال میں میرے دوستوں اور بہی خواہوں نے دو تین بار میری شادی کی بات چلانے کی کوشش کی۔تیمور اس میں پیش پیش تھا۔اس نے بے بے جی کو بھی اپنے ساتھ ملایا۔ بے بے جی اکثر آنسو بہاتی تھیں اور کہتی تھیں۔"پتر!ابھی تو تُو جوان ہے۔جب عمر ڈھل جائے گی اور ہتھ پیروں میں وہ زور نہیں رہے گا تو کون تیرا سہارا بنے گا؟تیری نسل آگے کیسے چلے گی؟"

بے بے جی کی ان باتوں کا جواب میرے پاس خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔یہی خاموشی تیمور اور دیگر خیر خواہوں کے لیے بھی تھی۔میری زندگی میں اب اور کوئی نہیں آ سکتا تھا اور نہ مجھے کوئی خواہش تھی۔وقت کا پہیا چلتا رہا۔دن اور رات ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے۔لمحے گھڑیوں میں، گھڑیاں پہروں میں اور پہر دنوں اور مہینوں میں بدلتے رہے۔
میں کارِ روز و شب میں کھویا رہا اور زندگی کا سفر طے کرتا رہا۔اس سفر میں چھوٹے چھوٹے پڑاؤ بھی آتے تھے۔کسی سنسان دوپہر کا پڑاؤ، کسی سہانی شام یا چاندنی رات کا پڑاؤ۔ایسے پڑاؤ میں،

میں کہیں کھو جاتا۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی میری آنکھیں دور افق میں کسی کو ڈھونڈنے لگتیں۔ کئی دفعہ انتظار کا انجام معلوم ہوتا ہے پھر بھی انسان انتظار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں بھی بس عادتاً انتظار کرتا۔ افق کی طرف دیکھتا رہتا لیکن وہ نہیں آئی۔ اسے نہیں آنا تھا۔ وہ رسم و رواج سے ٹکرانے کی طاقت نہیں رکھتی تھی اس لیے او جھل ہو گئی تھی۔ بالکل ایسے جیسے صبح کا تارا، جلتے سورج کے روبرو ہونے سے پہلے ہی بدن چرا کر نکل جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ان واقعات کو اب چھبیس ستائیس سال گزر چکے ہیں۔ میری عمر اب ساٹھ کے قریب ہے۔ بیشتر بال سفید ہو چکے ہیں۔ نظر بھی کچھ کمزور ہو گئی ہے۔ میری حیثیت جاگیر کے کارِ مختار کی ہے۔ والی جی کی پہلی بیوی کا بیٹا احمد نائب کی حیثیت سے میرے ساتھ ہے۔ مگر وہ اپنے مزاج کا بندہ ہے۔ اسے جاگیر کے کاموں سے زیادہ دلچسپی نہیں بلکہ اب وہ اپنے "چاولوں کے کاروبار" کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے پاس اس کی ضروریات سے بہت بڑھ کر پیسا ہے۔ اس لیے وہ پہلے سے زیادہ کاہل ہو گیا ہے۔ اس کی والدہ فوت ہو چکی ہیں۔

جاگیر کے گاؤں اب علاقے کے بہترین گاؤں شمار ہوتے ہیں بلکہ اب ان کو قصبہ جات ہی کہنا چاہیے۔ خاص طور سے راجوال میں بجلی، سڑک، فون، اسکول اور اسپتال بھی پھل پھول رہی ہیں۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے اور پھر اس "قوت پرواز" کا کرشمہ ہے جو کسی کی محبت نے دھیرے دھیرے میرے خون میں شامل کی تھی۔

دس بارہ سال پہلے جب چھوٹا موکھل چودھری بنا تو موکھلوں سے ایک بار پھر تنازعے شروع ہوئے۔ دو تین لڑائیاں بھی ہوئیں لیکن ہم نے موکھلوں کو دوبارہ سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔

میرے قریبی ساتھیوں سے رونق علی داغِ مفارقت دے چکا ہے۔ آٹھ نو سال پہلے جب وہ شراب اور حقہ نوشی چھوڑنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا، اچانک فرشتہ اجل نے آ کر اسے "ہیلو چودھری صاحب" کہہ دیا۔ اس میں کچھ قصور شاید چودھری رونق کا بھی ہو۔ وہ شراب کو مکمل طور پر چھوڑنے سے پہلے چند روز جی بھر کر پینا چاہتا تھا۔ بس "لال پری" سے یہی آخری ملاقاتیں اس کی زندگی کو فل اسٹاپ لگا گئیں۔ اس کی موت نے ایک عرصے تک مجھے غم زدہ رکھا۔ بے بے جی بھی اللہ کے پاس جا چکی ہیں۔۔۔۔۔ عارفہ اب چار بچوں کی ماں ہے اور

اپنے شوہر جمیل کے ساتھ راجوال میں ہی ہے۔اماں دلشاد کی تینوں بیٹیاں بھی نارمل زندگی بسر کررہی ہیں۔راجوال کے جدی پشتی چودھریوں میں سے کئی اہم زمیندار اپنی کہنہ قدروں سمیت مٹی میں جا چکے ہیں،ان میں چودھری یعقوب بھی شامل ہیں۔نئی نسل قدرے بہتر ہے۔

اس کہانی میں اب ایک آخری قابل ذکر واقعہ آپ کو بتانا چاہتا ہوں،اس کے بعد آپ سے اجازت چاہوں گا۔پندرہ بیس روز پہلے میں اپنی ڈائری کھولے بیٹھا تھا۔اس میں آخری چند صفحے سادہ پڑے تھے۔کئی بار خیال آتا تھا کہ ان آخری صفحات پر بھی کچھ نہ کچھ لکھ دوں اور پھر اس "پرواز" نامی روداد کو کہیں محفوظ کر دوں۔اس دن بھی شاید میں یہی سوچ رہا تھا۔۔۔۔یا شاید ویسے ہی ڈائری کے صفحات پر نگاہ دوڑا تا رہا تھا۔اچانک نصراللہ نے آکر بتایا کہ کوئی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔میں نے اسے اندر بھیجنے کو کہا۔

ایک جواں سال شخص مستحکم قدموں سے چلتا ہوا اندر آگیا۔وہ شلوار قمیص میں تھا۔اس کی پیشانی سے بال ذرا اڑے ہوئے تھے مگر چہرہ خوب روشن تھا۔اس کی عمر چالیس سے اوپر ہو گی مگر وہ اپنی صحت اور اسٹائل کی وجہ سے پینتیس چھتیس کا نظر آتا تھا۔ایک بھرپور شخص!

میں نے اسے دیکھا اور جسم میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔لگا کہ میں نے اس بندے کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔وہ بھی یک ٹک مجھے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔اس کی روشن آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نظر آئی۔پھر یکا یک میرے ذہن میں جیسے پھلجڑیاں سی چھوٹ گئیں۔میں ہکا بکا کھڑا ہو گیا۔میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔"حامد!"

اس کے ہونٹ بھی لرزے۔ہم دونوں بھاگ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ارد گرد کی ہر شے میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔میں اس کے سر اور پیشانی کو چومتا چلا گیا۔وہ بھی میرے ساتھ پیوست تھا اور مجھے اپنی مضبوط بانہوں میں جکڑتا چلا جا رہا تھا۔

ہاں،یہ حامد تھا۔آج قریباً ستائیس برس بعد میں اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔اور وہ اکیلا تھا۔ہم کتنی ہی دیر،ایک دوسرے کو دیکھ کر آنسو بہاتے رہے۔پھر میں نے پوچھا۔"تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"وہ اب دنیا میں نہیں ہے۔" حامد نے کہا۔

سینے میں چند لمحوں کے لیے گہری اتھاہ تاریکی پھیل گئی۔اس تاریکی کے سمندر سے نکلنے میں مجھے کئی منٹ لگ گئے۔آخر میں نے نم آنکھوں کے ساتھ پوچھا۔"کب گئی وہ؟"

"کوئی دو ماہ پہلے۔" حامد نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے مجھ عہد لے کر رکھا تھا چاچا خاور کہ ان کی وفات سے پہلے میں یہاں نہیں آؤں گا اور نہ کسی سے ملوں گا۔ میں نے کئی بار کوششیں کیں لیکن ان سے یہ عہد ختم نہ کرا سکا۔ آپ کو پتا ہی ہے، وہ کچھ معاملوں میں کتنی سخت ہو جاتی تھیں۔ میں ان کے سامنے بالکل مجبور تھا۔"

"کہاں رہے تم اتنا عرصہ؟" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"ملتان کے قریب ایک موہل وال نام کا گاؤں ہے۔ یہاں نانا جی کے ایک دوست رہتے تھے۔ وہ مرتے وقت اپنا گھر نانا جی کے نام کر گئے تھے۔"

"کون نانا جی؟"

"مولوی یوسف صاحب، میں انہیں نانا جی ہی کہتا تھا۔ امی ان کو ابا جی کہنے لگی تھیں۔ وہ اپنی طرز کے عجیب انسان تھے۔ انہوں نے ہم ماں بیٹے کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ بی اے پاس تھے۔ امی کے کہنے پر انہوں نے مجھے دسویں تک گھر میں ہی پڑھایا۔ بعد میں، میں شہر کے ایک کالج میں جانے لگا۔ میں نے بی ایس سی کیا، پھر ایگری کلچر میں ڈگری لی۔ مجھے ایک اچھی جاب مل گئی۔ امی کے پاس جو پیسے تھے اس سے نانا جی نے کچھ زمین لے لی تھی۔ اس

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

زمین کی آمدن سے ہماری گزر بسر بڑی آسانی سے ہوتی رہی ہے۔ یہ کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ نانا جی، حج سے واپس آئے اور چند دن بیمار رہ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے بعد امی اور زیادہ اداس رہنے لگیں۔ میں نے انہیں اکثر اپنے گھر میں چپ چاپ بیٹھے دیکھا۔ ان کی خوشی کے لیے میں نے شادی کی۔ اچھی بیوی ملی۔ اللہ نے گھر میں دو پھول بھی کھلائے۔ امی کا بھی دل قدرے بہل گیا۔ لیکن ان کے اندر کی اداسی کبھی ختم نہیں ہوئی چاچا خاور۔" حامد نے عجیب جذباتی لہجے میں کہا۔ "وہ گاؤں اور آپ سب کو بہت یاد کرتی تھیں۔" خاص طور سے۔۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر اس نے فقرہ مکمل کر دیا۔ "اور خاص طور سے آپ کو چاچا۔۔۔۔۔"

میں سکتہ زدہ بیٹھا رہا۔ ایک بیٹے کے منہ سے میں اس کی ماں کے "پیار" کے بارے میں سن رہا تھا۔ حامد کے منہ سے ایک بار بے ساختہ یہ بات نکلی تو پھر وہ کچھ نہ چھپا سکا۔ اس نے اشک بار انداز میں کہا۔ "ہاں چاچا خاور! انہوں نے آپ کو بہت چاہا ہے۔۔۔۔۔ بلکہ شاید ہر چیز سے زیادہ چاہا ہے۔ مجھے انہوں نے کچھ سال پہلے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ آپ سے شادی کر چکی تھیں۔ ان کے پاس نکاح نامے کی نقل تھی۔ انہوں نے مجھے وہ نقل بھی دکھائی تھی۔

ان کے پاس جو دو چار بہت قیمتی چیزیں تھیں، ان میں وہ نقل بھی شامل تھی۔ انہوں نے یہ نقل الماری کی ایک دراز میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ اکثر اس دراز کا تالا کھول کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اس دراز میں ایک ہار بھی تھا۔ یہ ہار آپ نے شاید کبھی انہیں تحفے میں دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک سادہ کاپی میں گلاب کے چند سوکھے پھول تھے۔ یہ پھول آپ کے ساتھ ان کی شادی کی نشانی تھے۔ اور پھر کچھ تہ کیے ہوئے روپے تھے۔ یہ روپے وہ بہت سنبھال سنبھال کر رکھتی تھیں اور پھر ایک روز انہوں نے میرے اصرار پر بتادیا تھا۔ یہ روپے آپ نے انہیں "منہ دکھائی" کے طور پر دیے تھے۔ وہ تہ شدہ روپے آج بھی اسی دراز میں پڑے ہیں۔ اور ہاں، اس کے علاوہ ایک پرفیوم تھا۔ خوشی کے موقع پر وہ یہ پرفیوم تھوڑا سا لگاتی تھیں اور خیالوں میں گم دیر تک خاموش لیٹی رہتی تھیں۔ ستائیس اٹھائیس سال گزر چکے ہیں لیکن اس شیشی میں تھوڑا سا پرفیوم، گاڑھی حالت میں اب بھی موجود ہے۔" حامد رقت آمیز انداز میں مجھے ماں کی باتیں سناتا رہا۔ خود بھی روتا رہا اور مجھے بھی اشک بار کرتا رہا۔ آخر میں نے پوچھا۔

"اس کا آخری وقت کیسا تھا؟"

"عصر کی نماز پڑھنے کے بعد وہ دیر تک مصلے پر ہی بیٹھی رہیں۔ میری بیوی سے پانی منگوا کر پیا پھر مصلے پر ہی لیٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا تو وہ جا چکی تھیں۔ دیکھنے میں یہی لگتا تھا کہ سوئی ہوئی ہیں۔" آخری الفاظ کہتے کہتے حامد کی آواز بھرا گئی۔ وہ روتے ہوئے بولا۔

"میری ماں بڑی پیاری تھی، بڑی من موہنی تھی۔۔۔۔۔ وہ تھی نا چاچا؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

میں نے اسے گلے سے لگالیا۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔ "حامد! وہ بڑی خوبصورت تھی اور اس کے اندر کی خوبصورتی باہر سے بڑھ کر تھی۔ اللہ نے اسے بڑا سوہنا دل دیا تھا۔"

ہم دیر تک اس کی باتیں کرتے رہے، آنسو بہاتے رہے۔ پتا ہی نہیں چلا، کب سہ پہر ہوئی اور کب شام ہو گئی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میں تو حامد کو کھانا بھی نہیں پوچھ سکا۔ کھانا تیار پڑا تھا، میں نے اسی وقت لگوالیا۔ ابھی تک کسی کو پتا نہیں چلا تھا کہ حویلی میں اترنے والا مہمان دراصل کون ہے۔ وہ اس حویلی کا اصل مالک تھا۔

رات کو بھی دیر تک ہم بلقیس کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے حامد سے پوچھا۔ "کیا اسے جاگیر کی خبر تھی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"ہاں چاچا خاور! کبھی کبھی نانا کے ذریعے انہیں یہاں کی خبر ملتی رہتی تھی۔ نانا کو کسی اور بندے کے ذریعے یہاں کے حالات کا پتا چلتا تھا۔ وہ جاگیر کی بہتری کے بارے میں جان کر مطمئن ہوتی تھیں لیکن وہ کبھی کرید کر نہیں پوچھتی تھیں کہ کون کیا کر رہا ہے۔ وہ جیسے ماضی کی ہر چیز سے دور رہنا چاہتی تھیں۔ کبھی نانا بتانا بھی چاہتے تو وہ کہہ دیتیں۔ "رہنے دیں ابا جی۔"

بات کرتے ہوئے حامد کی پیشانی پر چمک سی نمودار ہو جاتی تھی اور وہ تھوڑا سا آگے کو جھک جاتا تھا۔ وہی ماں والا انداز۔ میں اس کو مبہوت نظروں سے دیکھتا رہا۔ چوڑے شانے، روشن آنکھیں، لمبا قد۔۔۔۔ وہ ایک بھرپور مرد تھا۔ میں کمزور پڑ رہا تھا۔ اس جاگیر کو اب ایسے ہی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں چاچا خاور؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے چونک کر کہا اور دل ہی دل میں دعا کی کہ وہ ہر نظرِ بد سے بچا رہے۔

وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ "چاچا خاور! ایک بات کہنا چاہتا ہوں، پر ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ کو بری نہ لگے۔"

"تمہاری کوئی بات مجھے کبھی بری نہیں لگ سکتی۔" میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"میں نے آپ کو ہمیشہ چاچا کہا ہے لیکن میرے دل نے آپ کو ہمیشہ باپ کہا ہے اور باپ کی طرح ہی سمجھا ہے۔ اور سچ یہی ہے کہ مجھے باپ والی محبت اور توجہ ہمیشہ آپ سے ہی ملی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو چاچا کے بجائے اسی نام سے پکاروں جس نام سے میرا دل پکارتا ہے؟"

میں نے کچھ دیر گم صم رہنے کے بعد کہا۔ "نہیں حامد! یہ ممکن نہیں ہے۔ اور اگر ممکن ہوتا تو شاید تمہاری ماں کو بھی یہاں سے نہ جانا پڑتا۔ یہ بڑا کٹر معاشرہ ہے۔ اور جتنا کٹر ہے اتنا ہی کینہ پرور بھی ہے۔ یہ کچھ بھی بھولتا نہیں ہے لیکن میں تمہیں ایک اور نام بتا سکتا ہوں۔ اگر تم کبھی کبھی اس نام سے پکارو گے تو مجھے اچھا لگے گا اور تمہیں بھی اچھا لگے گا۔"

"کس نام سے؟"

"تم خود سوچو۔"

اس نے چند لمحے غور کیا پھر اس کی آنکھوں سے تازہ آنسو پھوٹے اور چہرے پر سرخی لہرا گئی۔

"ماسٹر چاچا!" اس نے کہا اور بے ساختہ مجھ سے لپٹ گیا۔

دو دن کے اندر ہی میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ مجھے لگا کہ میرے کندھوں سے ہزاروں من وزنی بوجھ اتر گیا ہے اور میری کمر جو جھلکتی جا رہی تھی پھر سیدھی ہو رہی ہے یا شاید میں پھر جوان ہو رہا تھا۔ جوان کڑیل بیٹا، جب بوڑھے باپ کے کندھے سے کندھا ملاتا ہے تو غالباً ہر باپ اسی طرح محسوس کرتا ہے۔

آدھی رات کے سناٹے میں میرا سر سجدے میں جھک گیا اور تا دیر جھکا رہا۔ میں نے کہا۔

"یارب! میں گناہ گار، کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں۔ تو نے مجھے سرخرو کیا ہے۔ تو نے مجھے کسی کی محبت میں سرخرو کیا ہے اور ثابت قدم رکھا ہے۔ آج جبکہ ایک عمر بیت گئی ہے۔۔۔۔ زندگی کی شام ہو گئی ہے۔ میں سینہ تان کر کہہ سکتا ہوں کہ ہاں، میں نے محبت کی اور میری محبت ہوس نہیں تھی اور نہ ہی عارضی تھی۔ اس کا آغاز جیسے بھی الٹے سیدھے طریقے سے ہوا لیکن اس کے اندر سمندروں کی گہرائی اور پہاڑوں کی استقامت تھی۔ اور تو بھی یہ سب جانتا ہے میرے مالک۔۔۔۔ اور یہ تو ہی ہے جس نے مجھ جیسے کمزور بندے کو

محبت کی لاج رکھنے کی ہمت عطا فرمائی اور یہی نہیں میرے مالک! تو نے میرے امتحان کے آخر میں میرے ناتواں بڑھاپے کو ایک محبت کرنے والے بلند ہمت بیٹے کا سہارا بھی دیا ہے۔ میں کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں۔"

ان رقت آمیز لمحوں میں، میں نے تہ دل سے محسوس کیا کہ میں بے اولاد نہیں ہوں اور نہ ہی میں بے نشان مروں گا۔ جو ایسا کہتے ہیں وہ غلط کہتے ہیں۔

اسی روز سہ پہر تک میں نے منادی کرادی اور مساجد میں اعلان کرادیا۔۔۔۔ علاقے کے ہر کس وناکس کو خبر ہو گئی کہ والی جی کا جانشین حامد اارباب جاگیر میں واپس آگیا ہے۔

اگلے روز صبح سویرے بہ ذریعہ جیپ میں حامد کے ساتھ ملتان روانہ ہو رہا تھا۔ ملتان۔۔۔۔ جہاں کے ایک نواحی قبرستان میں، کیکر اور بیری کے گھنے پیڑوں کے نیچے بلقیس ابدی نیند سو رہی تھی۔ وہ وہاں میرا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ختم شد